جھلکیاں

شہزادہ محمد نادر اور مس مہلوما حسینی کی شادی کی ایک تصویر
دولھا دلہن کے پیچھے اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ اور ملکہ حمیرا ہیں

کابل یونیورسٹی کی طالبات لیکچر سن رہی ہیں

افغانستان کے اخبارات اور رسا

قدیم طبی دانش اور جدید تحقیق
کے مطابق تیار کیا ہوا
قوت بخش ٹانک
ماء اللحم
(دو آتشہ)
ماء اللحم
(دو آتشہ)
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - ڈھاکہ - چٹاگانگ - لاہور

ہمارے نام

شبنم سبحانی

جنوری کے شمارے میں ہمارے نام کے تحت شبنم رومانی صاحب نے لکھا ہے کہ انہیں مجلہ جناح کالج کے تبصرہ میں تبصرہ نگار کی رائے سے اختلاف ہے۔ لیکن میں نے وہ مضمون پڑھا ہے اور اس سلسلہ میں تبصرہ نگار کی رائے سے میں متفق ہوں۔ "اردو غزل میں متانت آفرینی کی روایت" کیلئے میں نہیں کہہ سکتی۔ اسلئے میں شبنم صاحب کے مضمون کی منتظر ہوں تاکہ کوئی رائے قائم کر سکوں۔ (کراچی)

واحد اختر کاظمی

گزشتہ دو ماہ سے آپ نہ جانے کس مصلحت سے "آدم خور" کی قسط غائب کر دیتے ہیں۔ اصولاً آپ کا یہ طریقہ کار صحیح نہیں ہے۔ یا تو آپ مسلسل ناول شائع نہ کرتے اور جب شروع کر چکے ہیں تو یہ آپ کی صحافتی دیانت داری ہے کہ اقساط پابندی سے شائع کریں۔ کم از کم ادارہ الشجاع سے میں یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس نہ کرے۔ (حیدرآباد)

رفیق نعمانی

نئے سال کی مناسبت سے الشجاع کا سرورق مجھے بہت پسند آیا اس میں جو اشاریت ہے وہی اس کا حسن ہے۔ (لائل پور)

فرخندہ جبیں

اس بار شعری حصہ انتہائی جاندار ہے۔ رضی اختر شوق اور باقر مہدی کی نظمیں خلاصے کی چیز ہیں۔ حرمت الاکرام اور محمود سعیدی کی نظمیں اور غزلیں تو نظر سے گزری تھیں لیکن ان کی رباعیات کے مطالعہ کا پہلی بار موقع ملا۔ اور اندازہ ہوا کہ یہ دونوں شعراء اس صنف میں بھی کامیاب ہیں۔ غزلوں میں عتیق حنفی اور قمر اقبال کی غزلیں توجہ منعطف کراتی ہیں۔ ماہنامہ غزلوں کے بارے میں یہ ضرور عرض کروں گی کہ یہ الشجاع کے معیار سے ہٹ کر ہیں۔ ان کمزور غزلوں نے کسی حد تک شعری حصے کے حسن کو ماند کر دیا ہے۔ (لاہور)

پروفیسر نفیس جمال

آپ مانیں یا نہ مانیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مزاح چمن خزاں کی نذر ہو گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مزاح کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ مزاحیہ ادب کے نام پر رسالوں میں آجکل جو تخلیقات شائع ہو رہی ہیں انہیں پڑھ کر ہنسی آنے کے بجائے رونا آتا ہے۔ مشکل سے سو میں کوئی ایک مضمون ایسا ہوتا ہے جو ذہنی شگفتگی کا محرک ہو۔ اس عالم میں آپ الشجاع میں طنز و مزاح کے تحت جو تخلیقات شائع کر رہے ہیں وہ کسی حد تک قابل قبول ہیں۔ جنوری کے شمارے میں اثر فاروقی کا انشائیہ "پروفیسر تقلیب" نہ صرف پسند آیا بلکہ ہونٹ مسکراہٹ سے آشنا بھی ہوئے۔ اس انشائیہ کے پیش نظر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اثر فاروقی اچھی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اگر وہ پابندی سے اس قسم کے انشائیے لکھتے رہے تو ایک دن وہ بہ حیثیت مزاح نگار اپنی حیثیت تسلیم کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ (میرٹھ)

محمود ہاشمی

ایک عرصے کے بعد ڈاکٹر اسلم فرخی کا ڈرامہ نظر سے گزرا۔ ریڈیائی ڈرامہ ہونے کے باوجود معیاری اور دلچسپ تھا۔ اس دور میں جب کہ ڈرامے بہت کم لکھے جا رہے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ ڈاکٹر صاحب اس صنف ادب کو توانائی عطا کریں۔ (ڈھاکہ)

انیس الرحمٰن

اگر آپ برا نہ مانیں تو یہ عرض کروں کہ زیر نظر شمارے میں کوئی افسانہ بھی الشجاع کے سابقہ افسانوں کے معیار کو نہیں چھوتا۔ طاہرہ دیوی کے پردے میں قریشی صاحب بھی کوئی گل نہ کھلا سکے۔ اختر ملیح آبادی کا کارٹون افسانوی اعتبار سے بھی کارٹون رہا۔ سفید بال کا اٹھان اچھا تھا یہ دوسری بات ہے کہ انتہائی عجلت کے ساتھ ختم ہو گیا اور کوئی تاثر نہیں چھوڑ سکا۔ بنگالی کہانی "روشنی" نے البتہ افسانوی حصے کے اندھیرے کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ترجمہ محنت سے کیا گیا ہے۔ مگر مترجم کو چاہیئے کہ وہ ایسے بنگالی افسانوں کے ترجمے کریں جو انفرادی نوعیت کے حامل ہوں۔ (ملتان)

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات بموجب سرکلر نمبر ڈی ای/جی ڈی ۶۶۶۶۹ - ۸۹۴
مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۱ء

الشجاع

:ترتیب:

ایس ایم غیاث الدین ۔ سلمان ارشد

:طابع و ناشر:

ایس ایم شجاع الدین

:زیر اہتمام:

سلطان کلیم

زر سالانہ: پانچ روپے ——— فی شمارہ: پچاس پیسے
فون نمبر ۵۲۳۳۳ (پریس) ——— ۵۵۲۱۲ (شعبہ اشتہارات)

شعبہ نشر و اشاعت
ٹائمز پریس
مینسفیلڈ اسٹریٹ ۔ صدر کراچی

اس شمارے کے چند فنکار

- مخدوم محی الدین
- ڈاکٹر ست پرکاش سنگر
- سردار جعفری
- واجدہ تبسم
- حرمت الاکرام
- خورشید جامی
- نقی محمد خاں
- سحر انصاری
- رضی عزیزی
- شبنم فاروقی
- مجیب خیرآبادی
- ایوب جوہر
- رشیدہ رضویہ
- جم جونیئر
- قمر اقبال

ان کے علاوہ

اور دوسرے

مشرقی پاکستان میں
ہوائی ڈاک سے ——— فی شمارہ ۶۸ پیسے

ہمارے نام .. .. .. قارئین ۲
التماس .. .. .. ناشر ۵

تصویری فیچر

تحفہ . . . جلیل قریشی . . . ۶

مقالہ خصوصی

پاک افغان . . . حبیب اللہ بیگ . . . ۱۳

اسلامی تاریخ

استنبول . . . خواجہ جمیل احمد . . . ۱۶

شعری ادب

دو نظمیں .. . . سحر انصاری . . . ۲۵
بگولے . . . مہر اظہر . . . ۲۵
خلش .. . . شبی فاروقی . . . ۲۶
غزل . . . حرمت الاکرام . . . ۲۷
غزل .. . . خورشید جامی . . . ۲۷
غزل . . . قمر اقبال . . . ۲۸
غزل . . . مجیب خیرآبادی . . . ۲۸
غزل .. . . بدر جعفری . . . ۲۹
غزل . . . مقبول قریشی . . . ۲۹
غزل .. . . کیف اسعدی . . . ۳۰
غزل .. . . انور خلیل . . . ۳۰
غزل .. . . سعادت نظیر . . . ۳۰

افسانے

مداوا .. . . رضی عزیزی . . . ۳۱
گھاؤ .. .. .. ایوب جوہر ۳۴
بزدل .. .. .. واسن دیو ۳۸

سچی کہانی

ایسا بھی ہوتا ہے . . نقی محمد خاں ۴۱

ڈرامہ

مچھر مار کمیٹی .. . . ڈاکٹر سنگر ۴۴

سیر و سفر

بغداد کی چاندنی . . رشیدہ رضویہ ۵۱

مسلسل ناول

آدم خور .. .. . جم جونیئر ۵۴

حاصل مطالعہ

دل .. .. . واجدہ تبسم ۶۱
بلّور (نظم) .. .. . مخدوم محی الدین . . . ۷۰
رات (نظم) .. .. . سردار جعفری ۷۰

مستقل عنوانات

جائزے .. .. رخشندہ بہار ۷۱
بازگشت .. .. . ادارہ ۷۲

سرورق:- شاہ ظاہر شاہ والیٔ افغانستان۔
سرورق سے متعلق مضمون صفحہ ۱۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔

التماس

فروری کے مہینے میں اعلیٰحضرت شاہ ظاہر شاہ والئ افغانستان کی میزبانی کا فخر پاکستان کو حاصل ہو رہا ہے۔ پاکستان اور افغانستان میں جو تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی قدریں مشترک ہیں ان کی بناء پر پاکستانی عوام شاہ افغانستان کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے ہوئے ہیں۔ زیر نظر شمارے کا سرورق اسی جذبہ کا آئینہ دار ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ والئ افغانستان کا یہ دورہ دور رس نتائج کا حامل ہوگا۔ دونوں برادر ملک ایک دوسرے کے اور زیادہ قریب آجائیں گے۔ اور باہمی تعاون و اشتراک کی راہیں اور زیادہ کشادہ ہوں گی۔ دونوں ملکوں کے تعلقات پر "پاک افغان دوروتی" کے عنوان سے حبیب اللہ بیگ کا ایک خصوصی مضمون اس شمارے کی زینت ہے۔ جو یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ اس خصوصی مضمون کے علاوہ اس شمارے میں ڈاکٹر ابوالفضل کا مضمون "مکاتیب شبلی" اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی اہم اور ان حضرات کے لئے "ایک لمحہ فکریہ" ہے۔ جن کو "مکاتیب شبلی" میں صرف عشق کی چاندنی چھٹکی نظر آتی ہے۔

افسانوی اور شعری حصہ ہمیشہ کی طرح الشجاع کی روایات کے مطابق ہے۔ گزشتہ چند ماہ سے الشجاع کے بعض قارئین مطالبہ کر رہے تھے کہ الشجاع میں پابندی سے بنگالی کہانیوں کے تراجم شائع کئے جائیں ہمیں مسرت ہے کہ ہم مشرقی پاکستان کے ممتاز ادیب جناب ایوب جوہر کے مخلصانہ تعاون سے قارئین کا یہ مطالبہ پورا کرنے کے قابل ہو سکے ہیں۔

ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ جم جونیئر کی علالت کی وجہ سے "کلریا کے آدم خور" کی قسط شائع نہیں ہو سکی تھی۔ اس سلسلہ میں جن حضرات نے ہم کو شکایتی خطوط لکھے ہیں ان کو ہم یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ یہ فروگزاشت نہیں ہوگی۔

قارئین سے درخواست ہے کہ زیر نظر شمارے کے بارے میں ہمیں اپنی تفصیلی رائے ضرور لکھیں۔ تاکہ ان کی آراء کی روشنی میں ہم الشجاع کے صوری و معنوی حسن کو اور زیادہ نکھار سکیں۔

آپ کا مخلص

شجاع الدین

ناشر

تصویری فیچر

تلخیص و ترجمہ:۔ عبدالجلیل قریشی

کتنا خوبصورت گلدان ہے میرے منہ سے بیاختہ نکل گیا۔

اور واقعی گلدان تھا بھی خوبصورت مجھے بہت ہی پسند آیا۔ اسی لئے سیلزمین کو منہ مانگے دام دیکر میں نے اسے پیک کرنے کے لئے کہہ دیا۔

دوکان میں اور بھی نادر چیزیں تھیں لیکن یا تو مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آئیں یا پھر ان کی قیمتیں بہت زائد تھیں۔ ویسے دوکان کافی بڑی تھی۔ سامنے اس کا عربی مالک بھی بیٹھا ہوا تھا۔ دوکان فرانسیسی مراکو کے شہر مقینز میں پُر رونق بازار کے وسط میں واقع تھی۔

میں نے گلدان کے بنڈل کو بغل میں دبایا اور واپس ہونا چاہتا تھا کہ ہوٹل کے مالک نے پوچھا۔

"کیا تم امریکن ہو؟"

ہمیں ہنی مون منانے کے لئے آج مراکش میں ہونا چاہیئے تھا مگر وہ غائب ہے اور میں بدحواس ہوں اور انتہائی خوف زدہ۔

"ہاں،" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

لیکن میں سوچ رہا تھا کہ امریکن ہونے کی وجہ سے اسے کیوں دلچسپی پیدا ہوتی ہے، نہ معلوم یہ مجھ سے کیا گفتگو کرنا چاہتا ہے؟

میرے اثبات میں جواب دینے کے بعد اس نے بڑے اخلاق سے کہا کہ میں اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیوں۔ میرے خیال میں وہ اس بات سے خوش تھا کہ صبح ہی صبح اس کو ایک ایسا امریکن گاہک ملا جس نے منہ مانگے دام دیئے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو اس نے ایک معمولی تحفہ بھی مجھے دیا۔

اس کا نام احمد بن مراد تھا۔ وہ بوڑھا ہونے کے باوجود پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ سرخ چہرہ، سفید داڑھی، سیاہ چوغہ پہنے ہوئے وہ زمانہ سلف کا پروفیسر معلوم ہو رہا تھا۔

"جنگ نے شمالی افریقہ کو بہت سے روح فرسا تحفے پیش کئے ہیں"۔ اس نے چائے ختم ہونے کے بعد نہایت سنجیدگی سے گفتگو شروع کی: "خیر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جنگ اور پھر اس کے نتیجہ میں بربادیاں لازم ملزوم چیزیں ہیں۔ لیکن جہاں میں جنگ کی تباہ کاریوں سے نالاں ہوں وہیں اس جنگ میں ایک بات میرے لئے خوشی کا باعث بھی بنی۔ اور وہ یہ کہ جنگ کی بدولت ہی مجھے ایک بہت اچھا دوست مل گیا۔ یہ دوست بھی امریکن ہے اور اس کا نام کلیفورڈ کریگ ہے۔ یہ رائفل اسکاٹ میں سارجنٹ تھا۔ اور یونائٹیڈ اسٹیٹ فورسیز کے ساتھ یہاں آیا تھا..."

"میں بھی فیدالا پر ہی اترا تھا۔" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ تم اسے پہچانتے ہو۔" اس نے بغور میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جنگ میں بہت لوگوں سے واقفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ان میں سے بہت کم لوگ یاد رہتے ہیں۔ اس لئے یہ تو ممکن ہے کہ میں اس سے ملا ہوں لیکن وہ مجھے یاد نہیں۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم اس کو جانتے ہو یا نہیں۔ لیکن وہ بہادر انسان ہے جو امریکی سپاہ کے ساتھ ایک اجنبی ملک میں لڑنے کے لئے بھیجا گیا۔ ہم عرب لوگ خود بھی بہادر ہوتے ہیں اس لئے بہادروں کی قدر بھی کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح ہم بہادروں کی قدر کرتے ہیں اسی طرح کریگ بھی بہادروں کی قدر کرتا ہے۔ وہ شیر کی طرح بہادر ہوتے ہوئے بھی انسانی ہمدردی کو افضل سمجھتا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ زمانہ جنگ میں وہ میرے خاندان کے لئے اپنا آدھا راشن لا کر دیتا۔ حد یہ ہے کہ اگر اس کے پاس ایک سگریٹ بھی ہوتا تو بھی توڑ کر آدھی مجھے دیتا۔ اس کا برتاؤ میرے ساتھ بالکل عزیزوں جیسا ہے۔ اور وہ میری بیٹی کو اپنی بہن سمجھتا ہے ایک بار ایک شرابی نے کاسابلانکا کی سڑک پر میری جوان بیٹی کے ساتھ بدتمیزی کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ کریگ بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے شرابی کو پکڑ کر اس کی اچھی طرح مرمت کر دی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد وہ یہاں واپس آ گیا اور کئی مہینے تک میرے ہی ساتھ رہا۔ پھر اس نے کاسابلانکا میں امپورٹ ایکسپورٹ کی کمپنی کھول لی۔ وہ اکثر و بیشتر آتا رہتا ہے۔ اور ہم ایک دوسرے کو پابندی سے خط لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن خط و کتابت اگر نہ بھی ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جسمانی دوری کے باوجود روحانی طور پر ہم ایک دوسرے سے کسی وقت بھی دور نہیں ہیں۔"

ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد اس نے دوبارہ گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا۔ "تم بھی آجکل کاسابلانکا میں مقیم ہو۔ میں اس کے نام تمہیں تعارفی خط لکھے دیتا ہوں۔ ایسے شریف اور بہادر آدمی سے تم ضرور ملو۔ مجھے امید ہے کہ تم اس سے مل کر بہت خوش ہوگے۔"

اور پھر قبل اس کے کہ میں اس سے کچھ کہتا وہ خط لکھنے کے لئے دوسرے کمرے میں جا چکا تھا۔ ایسے تعارف اور سفارش کے بارے میں میرے نظریات کچھ اور ہیں۔ میرے خیال میں اس قسم کے خطوط دونوں ملنے والوں کو بلا وجہ اخلاق برتنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور میں یہ بات پسند نہیں کرتا ہوں۔ مجھے جب بھی کسی سے ملنا ہوتا ہے ہمیشہ بغیر کسی سفارش یا تعارفی خط کے ملتا ہوں۔

احمد بن مراد نے مجھے تعارفی خط لا کر دیا۔ اور میں نے مجبور ہو کر

وہ خط اپنی جیب میں رکھ لیا۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ آئندہ چل کر اس خط کی وجہ سے مجھے کن حالات سے دوچار ہونا ہے۔

جب میں کاسابلانکا واپس پہنچا تو اسٹیشن پر ہی یہ خیال آیا کہ اتنا اچھا اور قیمتی گلدان مسلسل سفر میں ٹوٹ سکتا ہے اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ اس کو گھر روانہ کر دیا جائے۔ لیکن امریکہ روانہ کرنے کے لئے کسی کمپنی میں جانا ضروری تھا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ گیلفورڈ کریگ بھی یہی کام کرتا ہے اس لئے اسی کے پاس چلنا چاہئے۔

کریگ کا دفتر ریلوے اسٹیشن سے دور بھی نہیں تھا۔ اس لئے میں اس کے دفتر کی جانب روانہ ہوا۔ لیکن جب وہاں پہنچا تو دفتر بند تھا۔ میں نے پاس کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ بڑی دیر کے بعد ایک شخص نکلا۔ جو فرانسیسی افسر معلوم ہوتا تھا۔ وہ کافی شراب پئے ہوئے تھا۔ اس نے بتایا کہ کریگ تین ہفتے سے نہیں آیا ہے۔

جب وہ سڑک پر پہنچا تو ایک چھوٹی کار نے اس کو ٹکر ماری اور کار اس کو بیس فٹ تک دھکیلتی ہوئی ایک بلڈنگ تک لے گئی۔

میرے لئے اوّل تو گلدان کا مسئلہ تھا دوسرے تعارفی خط دردِ سر بنا ہوا تھا۔ جس کو پہنچانا ضروری تھا۔ اس لئے میں اس کے ہوٹل کی طرف روانہ ہوا۔

ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد میں کلرک کے پاس پہنچا۔ یہ کلرک فرانسیسی تھا جو کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میرے پہنچنے پر اس نے انتہائی سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ لیکن میں نے اس کے رویّے کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں مانٹیر کریگ سے ملنے آیا ہوں۔ بتا سکتے ہو کہ کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔"

لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے اخبار کو اور اونچا کر کے اپنے منہ کے سامنے کر لیا۔ اس کا یہ رویّہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس لئے ہاتھ مار کر میں نے اس سے اخبار چھینا اور کاؤنٹر پر پھینک دیا۔ اور اس کا کالر پکڑ کر اسے جھٹکے کے ساتھ کھڑا کیا اور دو تین جھٹکے دینے کے بعد کرسی پر دھکیل دیا۔

فرانسیسی غصّے کی وجہ سے کانپنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اخبار اٹھایا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اگر تم کو مانٹیر کریگ سے اتنا ہی اہم کام ہے کہ لوگوں کو دھمکا کر ان کے متعلق معلوم کرنا ضروری سمجھتے ہو تو پھر سنو کہ پولیس نے ان کا نام گمشدہ لوگوں کی فہرست میں درج کر لیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"جو کچھ میں نے کہا وہی مطلب ہے۔"

"وہ کس دن آخری وقت اس ہوٹل میں تھے؟"

"مجھے یاد نہیں۔" اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ اس کے چلانے کا مطلب میں خوب سمجھتا تھا۔ وہ اس طرح سے چلا کر اپنے دوسرے کام کرنے والے لوگوں کو حمایت کے لئے بلانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے بدستور چلاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم کو ایسی ہی تلاش ہے تو پھر کسی شراب خانہ میں کیوں نہیں

تلاش کرتے ہو۔ ممکن ہے کہ وہ بیٹھا ہوا شراب پی رہا ہو۔"

میرے اوپر ان طنزیہ جملوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کی اس بدمعاشی سے مجبور ہو کر میں نے اس کو پکڑ کر کھینچا اور پھر اس کی مرمت شروع کر دی۔ کافی ہاتھ مارنے کے بعد جب اس کے دماغ کی گرمی کم ہو گئی تو پھر میں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے ان علاقائی شیؤں کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ بتاؤ کہ کاسابلانکا میں مالشیر کریگ کو کہاں تلاش کروں اور کس سے معلوم کروں؟"

معلوم ہوتا تھا کہ میرے سخت رویہ کا اس پر کافی اثر ہوا اس نے اپنی پھولی ہوئی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"وہ اکثر "بار افریقہ" میں ایک گانے والی ڈینس زارادہ کے پاس دیکھا گیا ہے۔ اگر تمہیں معلوم ہی کرنا ہے تو اس سے معلوم کرو۔ میرے مقابلہ میں وہ تمہارے لئے زیادہ مفید ثابت ہو گی۔"

میں باہر جانے کے لئے پلٹا۔ جب دروازے کے قریب پہنچا تو کلرک نے چلّاتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ مل جائے تو کہہ دینا کہ اب تک ہمارا بل ادا نہیں کیا ہے اگر بل جلدی ادا نہ کیا تو ہم اس کی چیزیں بیچ دیں گے۔"

میں کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل آیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ راستہ میں ایک پارک تھا۔ میں اس میں زیتون کے درخت کے نیچے ایک پتھر کی بنچ پر بیٹھ کر حالات پر غور کرنے لگا۔ اپنی جیب سے تعارفی خط نکال کر دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر ڈاک خانہ پہنچا۔ اور احمد بن مراد کو کریگ کی گمشدگی کے بارے میں ایک تفصیلی تار روانہ کیا۔

کریگ کی تلاش میں اسی شام میں "بار افریقہ" پہنچا۔ یہ جگہ ساحل سے قریب تھی۔ جب میں اندر داخل ہوا تو کافی ہجوم تھا۔ ساحل پر تین جہاز لنگر انداز تھے۔ ان کے تمام ملاح اور افسر اس وقت وہاں موجود تھے۔

ہال کے آخری سرے پر ایک چھوٹا پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ الالوی موسیقار ستار کی دھن بجا رہے تھے۔ اور کچھ لوگ چکنے فرش پر ڈانس کر رہے تھے۔ میزوں پر مختلف ملکوں کے لوگ بیٹھے ہوئے شراب پی رہے تھے۔

یکایک آرکسٹرا کے بازو والا دروازہ کھلا۔ اس میں سے ایک حسین نوجوان عورت نکلی۔ اور پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہو کر مجمع کا جائزہ لینے لگی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ حسینہ کون ہے؟ — ارے تم اسے نہیں جانتے؟ یہ حسین ترین عورت ڈینس زارادہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اجنبی ہو۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔

یہ سنکر میں نے فوراً ہیڈ ویٹر کے ہاتھ اس کے پاس پرچہ بھیجا۔ پرچہ پڑھنے کے بعد اس نے میری جانب دیکھا اور مسکراتے ہوئے سر تسلیم خم کیا۔ اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ اٹھلاتی ہوئی میرے پاس پہنچ گئی۔

"مالشیر؟" اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کو سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے مطلب کی بات شروع کی کہ میں کلیفورڈ کریگ کو تلاش کر رہا ہوں۔ کاسابلانکا سے وہ یکایک کیوں غائب ہو گیا؟" اور پھر اس کے جواب دینے سے قبل میں نے احمد بن مراد کا تعارفی خط نکال کر اس کے ہاتھ میں دیدیا۔

خط کو پڑھتے ہوئے اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنا شروع ہو گئی۔ آنکھوں کی چمک غائب ہو چکی تھی اور چہرہ پیلا تھا۔ وہ پڑھنے کے بعد کچھ دیر تک بالکل خاموش رہی۔ اور پھر خط مجھ کو واپس دیتے ہوئے بولی۔

"ہم دونوں کو شادی کئے ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا ہے اور پروگرام کے مطابق ہمیں ہنی مون منانے کے لئے آج مراکش میں ہونا چاہیئے تھا۔"

یکایک وہ بات کرتے ہوئے ٹھہر گئی۔ اس وقت اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھیں نمناک تھیں۔ اس نے چند لمحوں کے بعد دوبارہ سلسلہ گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا۔ "اس طرح سے کریگ کے غائب ہو جانے کی وجہ سے میں خود بھی بہت خوف زدہ ہوں..... انتہائی خوف زدہ.... اس لئے کہ اگر کوئی اہم بات نہیں تھی تو مجھے وہ ضرور کسی نہ کسی طرح اطلاع دیتا۔ میں ہر روز پولیس والوں کے پاس جا رہی ہوں لیکن بیکار۔ وہ مجھے کچھ بھی نہیں بتاتے ہیں۔ اور وہ بتائیں بھی کیسے اس لئے کہ انہیں خود بھی کچھ نہیں معلوم۔ میں اس وقت خود کو بے سہارا سمجھ رہی ہوں۔"

بات ختم کرنے کے بعد اس نے سینے پر پڑا ہوا اپنا سنہری لاکٹ کھولتے ہوئے کہا۔"

"غالباً تم نے کلیفورڈ کریگ کو نہیں دیکھا ہو گا۔ دیکھو وہ کیسا دکھائی دیتا ہے۔"

اس نے لاکٹ میرے ہاتھ میں دیدیا۔ میں نے تصویر کو بغور

دیکھا۔ تصویر کسی ۳۵ سالہ وجیہہ جوان کی تھی۔

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ مسٹر کریگ کس قسم کی تجارت کرتے ہیں؟" میں نے تھوڑی دیر کے بعد لاکٹ واپس کرتے ہوئے پوچھا۔

کوئی جواب دینے کے بجائے وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ میرے اس سوال سے پریشان ہو گئی ہے۔ چند لمحوں کے بعد وہ بولی۔

"میں نے کبھی اس کے کاروباری حالات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

میں اس سلسلہ میں ابھی اس سے کوئی مزید بات کرنے نہیں پایا تھا کہ یکایک اس کے رویّہ میں ایک عجیب تبدیلی ہو گئی۔ وہ تمام آداب و اخلاق کو ختم کرتے ہوئے کھڑی ہوئی اور سخت آواز میں "یہ وقت میرے گانے کا ہے" کہتے ہوئے اسٹینڈ کی جانب چلی گئی۔

میں "بار افریقہ" سے واپس اپنے ہوٹل پہنچا۔ جب کمرے میں گیا تو وہاں عجیب حالت تھی۔ میرے دونوں بیگ کھلے ہوئے پڑے تھے۔ تمام چیزیں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ بستر الٹا ہوا آدھا نیچے اور آدھا پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے منیجر سے اس بارے میں باز پرس کی اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں سوچنے لگا کہ کریگ کے بارے میں میری جستجو متعلقہ لوگوں کو شاید معلوم ہو چکی ہے۔ اس لئے مجھے ہر قدم پر احتیاط برتنا چاہیئے۔

دوسری صبح میں نے ڈینس زارادہ کے نجی حالات معلوم کرنا شروع کیئے۔ تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ فرانسیسی ہے۔ اس کی کریگ کے ساتھ پہلی شادی نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی وہ مراکو کے ایک متمول آدمی سے شادی کر چکی ہے۔ یہ آدمی لیبیا میں فرانسیسی فوج کے ساتھ لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔

شوہر کے مرنے کے بعد اس نے گانے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اور خدا اچھی کفیل ہو گئی تھی۔ وہ تیونس سے لے کر الگہلا اور شمالی افریقہ کے ہر کلب میں خراج تحسین حاصل کر چکی تھی۔ یہاں کاسابلانکا میں اس کا کوئی عزیز نہیں تھا اور یورپیوں کے محلے میں ایک شاندار فلیٹ میں رہتی تھی۔

میں نے کلیفورڈ کریگ کے کاروبار کے متعلق بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی ناجائز قسم کی خلاف قانون اشیاء برآمد درآمد کرتا تھا۔ اور شاید یہی وجہ اس کے غائب ہونے کی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو چوبیس گھنٹے کے اندر حالات ڈرامائی صورت اختیار کرتے چلے جا رہے تھے اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب اور کیا ظہور میں آتا ہے۔

اسی دن دوپہر کے بعد مراکو سپٹرولنگ اسکاٹ کو کلیفورڈ کریگ کی لاش مل گئی۔ یہ اسکاٹ ریجیٹ اور ستیاب کے درمیان گشت پر تھا۔ میں نے یہ خبر پڑھنے کے بعد احمد بن مراد کو اطلاع دی۔ اس نے جواب دیا کہ وہ خود آ رہا ہے۔

کریگ کی لاش دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس پر دو گولیاں بہت ہی قریب سے چلائی گئی ہیں۔ لیکن اس کی کوئی قیمتی یا معمولی چیز بھی نہیں لی گئی تھی۔ اس کو قتل کرنے کے بعد نولا کے قریب ایک اتھلی قبر کھود کر اسے دفن کیا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد معلوم ہوا کہ اسے قتل ہوئے تین ہفتے گزر چکے ہیں ——

تاریخ مقررہ پر میں احمد بن مراد کو لینے کے لئے کاسابلانکا کے اسٹیشن پر گیا۔ جب میں اس سے ملا تو اس کی حالت متغیر تھی۔ اس کو اپنے ایک دوست کے یہاں قیام کرنا تھا۔ میں بھی ساتھ ہی اس کی قیام گاہ پر گیا۔ وہاں بھی اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ کریگ کی موت کے صدمے سے نڈھال تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹہ کے بعد وہ بات کرنے کے قابل ہوا

"مجھے تمہارا ٹیلیگرام مل گیا تھا۔" اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ٹیلی گرام ملنے کے بعد میں بہت فکر مند تھا لیکن جب مجھے اس کے قتل کی خبر ملی تو میری حالت خراب ہو گئی۔ مجھے خود بھی پتہ نہیں کہ دل کی حرکت کیوں اب تک جاری ہے۔ بہرحال جو کچھ ہوا اس کا قتل انتقام چاہتا ہے۔ میں زارادہ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ وہ بیچاری بہت غم زدہ ہوگی۔"

میں اس کو سہارا دیکر سیڑھیوں سے نیچے لایا اور سڑک پر جاتی ہوئی ایک ٹیکسی کو ہاتھ کا اشارہ دیکر روکا۔ اور اس میں اسے سوار کرانے کے بعد میں رخصت ہو گیا۔ یہ احمد بن مراد سے میری آخری ملاقات تھی۔ اور یہ آخری ملاقات اس لئے تھی کہ جب وہ زارادہ سے ملنے کے بعد واپس سڑک پر پہنچا تو ایک ہرے رنگ کی چھوٹی رینالڈ کار نے اس کو

ٹکر ماری۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ بیس فٹ تک کار اس کو ڈھکیلتی ہوئی ایک بلڈنگ تک لے گئی۔

احمد بن مراد کا سر پھٹ چکا تھا اس کی کھوپڑی میں گہرا شگاف ہو گیا تھا اور ہوش میں آئے بغیر دو گھنٹے کے بعد مر گیا۔

دوپہر کے بعد میں زارادہ کے گھر گیا۔ اس کی ملازمہ نے بتایا کہ میڈم گھر پر نہیں ہیں۔ وہ بہت جلدی میں سفر پر روانہ ہو چکی ہیں۔

اور جب میں رات میں اس کو تلاش کرتا ہوا بار "افریقہ" پہنچا تو آج بار بھی بے رونق تھا۔ اور حسین مغنیہ وہاں بھی نہیں تھی۔

ہیڈ ویٹر نے بتایا کہ "جناب یہ پہلا اتفاق ہے کہ وہ یوں غیر حاضر ہوئی ہے۔ وہ کچھ دن سے پریشان دکھائی دے رہی ہے۔ لیکن انتہائی سمجھدار اور سنجیدہ ہونے کی وجہ سے اس کو یہ نہیں کرنا چاہیئے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اپنے نہ آنے کے بارے میں اس نے فون کر کے منیجر کو کیوں نہیں بتایا؟"

ہیڈ ویٹر کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ قاتل کا تیسرا شکار زارادہ ہو؟

رات جب میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا تو طرح طرح کے خیالات مجھے پریشان کر رہے تھے۔ میں خود ایک طرح کا نامعلوم خوف محسوس کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے نیند آئی۔ کتنی دیر سویا صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا۔ خیال ہے کہ چند گھنٹے سویا ہوں گا۔ کہ کسی انجانے خطرے کے احساس سے میری آنکھ کھل گئی۔ بستر کے پاس رکھی ہوئی گھڑی کو دیکھا جس کی چمکیلی سوئیاں ڈھائی بجا رہی تھیں۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس وقت کمرے میں میں تنہا نہیں ہوں۔ اس احساس کی بناء پر میرے بدن میں ایک قسم کا کھچاؤ پیدا ہونے لگا۔

مجھے کمرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس بات کا مکمل یقین تھا کہ کوئی شخص کمرے میں موجود ضرور ہے۔ میں اس کی سانس کی آواز بھی سن رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی لکڑی کے فرش کے چرچرانے کی ہلکی آواز بھی سنائی دی۔ خطرہ بالکل سر پر معلوم ہو رہا تھا اس لئے میں نے تکیہ کے نیچے سے پستول نکالنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن پستول وہاں نہیں تھا۔ یکایک مجھے یاد آیا کہ پستول تو میں نے خود بریف کیس سے نکالا ہی نہیں تھا۔ ابھی میں اپنی حفاظت کے بارے میں کچھ سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ آتی ہوئی آوازوں کی بناء پر میں نے سمجھ لیا کہ نظر نہ آنے والا ملاقاتی بستر کی طرف بڑھ رہا ہے۔

یکایک میں نے ہاتھ بڑھا کر پاس میں رکھا ہوا ٹیلی فون اٹھایا۔ اور اندازہ کر کے بڑی پھرتی سے آواز کی جانب پھینکا۔ اس طرح سے مجھے چند سیکنڈ کا وقفہ مل گیا اور میں فوراً ہی بستر سے پلنگ کے نیچے لڑھک گیا۔ بغیر دیر کئے ہوئے میں نے دیوار کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ یکایک ایک سایہ پلنگ کے سرہانے نظر آیا۔ اور پھر جھلملاتے ہوئے چاقو کی جھلک دکھائی دی۔ سایہ نے ہاتھ بلند کیا اور پھر چشم زدن میں چاقو تکیہ میں پیوست تھا۔

میں نے دیوار کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ورزش اسٹینڈ کا پایہ ہاتھ میں آگیا۔ میں نے پایہ کھینچ کر حملہ آور کے سر پر مارا اور پھر خود بھی تیزی [illegible] دبوچ لیا۔

اسٹینڈ پر رکھے ہوئے برتن زور [illegible] کے ساتھ ہی [illegible] برتنوں کے گرنے سے ایک شور برپا ہوا۔ اس شور ہنگامے کو سنکر پاس کے کمروں کے لوگ چیختے چلاتے اور دوڑتے ہوئے میرے کمرے کی طرف آئے۔ چند ہی لمحوں کے بعد انہوں نے دروازہ پیٹنا اور آوازیں دینا شروع کر دیں اور فوراً ہی دروازہ توڑنے کی آواز آئی۔ شاید کچھ سیکنڈوں میں ہی وہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ یکایک کسی نے سوئچ دبا کر روشنی کر دی۔

ایک سیکنڈ کے بعد میں نے روشنی میں دیکھا ایک چھریرے بدن کا آدمی میری گرفت میں تھا۔ اس کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ سر سے نظر ہٹانے کے بعد جب میں نے اس کا چہرہ دیکھا تو وہ کلیفورڈ ٹریگ کے ہوٹل کا فرانسیسی کلرک تھا۔

"مسٹر یہ آپ نے کیا گڑبڑ کر رکھی ہے۔ تمام شریف لوگوں کی آپ نے نیند حرام کر دی۔" منیجر نے یکایک دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اسے دیکھ رہے ہو؟" میں نے کلرک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"چور!"

الشجاع

"نہیں۔ یہ معمولی چور نہیں ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "یہ قاتل ہے۔ اور شاید یہ اس کا دوسرا قتل ہے۔"

منیجر نے فوراً ہی پولیس کو فون کیا اور کچھ دیر کے بعد ہی کلرک پولیس کی حراست میں تھا۔

دوسرے دن صبح دس بجے مجھے معلوم ہوا کہ فرانسیسی ہوٹل کے کلرک جیکس مرڈیڈ نے پولیس میں اقبالِ جرم کر لیا ہے لیکن اس نے اپنا شریک کار ڈینس نارادہ کو بھی بنا لیا ہے۔

اس نے بیان دیا کہ کلیفورڈ کریگ کے پاس دو لانچیں تھیں جن کے ذریعہ وہ سگریٹ کا ناجائز کاروبار کرتا تھا۔ لیکن اس کی لاعلمی میں وہ اور اس کی پارٹنر زارادہ سگریٹ کے بجائے ایمونیشن اور ہلکے ہتھیار بھر دیتے تھے۔ ایمونیشن اور ہلکے ہتھیار کینیا برآمد کیے جاتے تھے اور ہمیں اس کی اتنی رقم ملتی تھی جو ہمارے لئے غیر معمولی تھی۔

اتفاق کی بات ہے کہ ایک روز کلیفورڈ کریگ کی دونوں لانچوں پر سامان لادا جانے والا تھا۔ سامان کی یہ پیٹیاں کلیفورڈ کے دفتر سے روانہ ہونے والی تھیں۔ ہم دونوں نے سگریٹ کے بجائے ان پیٹیوں میں حسبِ معمول ایمونیشن اور ہتھیار بھرے تھے لیکن جس وقت یہ سامان روانہ ہونے والا تھا تو کریگ بھی وہیں موجود تھا۔ نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ اس نے ایک کریٹ کھول ڈالا۔ اس کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ سگریٹ کے بجائے ایمونیشن بھرا ہوا ہے۔ اسی بنا پر اس کا اور نارادا کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ کسی طرح بھی اس قسم کا ناجائز کاروبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں بھی اس وقت غسل خانہ میں چھپا ہوا تھا حالات بگڑنے کی وجہ سے میں باہر نکلا اور اسکے پیچھے سے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ جب وہ گر گیا تو دوسری گولی اس کے سر میں ماری۔ پھر ہم دونوں نارادا کی کار میں کریگ کی لاش لے کر گئے اور اس کو دفن کر دیا۔

احمد بن مراد کی آمد بھی ہمارے لئے بڑا خطرہ تھی۔ اس نے حالات کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ جس وقت وہ زارادہ کو دھمکی دیکر نیچے اترا تو زارادہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ احمد بن مراد کو ختم کر دے۔ چنانچہ وہ اپنی کار لے کر نکلی۔ اور فوراً ہی اسے ٹکر مار کر ختم کر دیا۔

نارادہ غائب تھی۔ ملک کے چپہ چپہ میں اس کی تلاش جاری تھی۔ جیکس مرڈیڈ کے اعتراف کے ایک ہفتہ کے بعد زارادہ کو رابط میں دیکھا گیا۔ وہ بین الاقوامی سرحد پار کر کے ٹانگیر میں داخل ہونا چاہتی تھی لیکن جب پولیس نے پیچھا کیا تو اس نے گرفت سے بچنے کے لئے اپنی چھوٹی کار کو پوری رفتار سے بھگانا شروع کیا۔ یکا یک کار ہوا میں اچھلی اور پھر گرنے کے بعد الٹ گئی۔ گرتے ہی اس میں آگ لگ گئی اور چشم زدن میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ کوشش کے باوجود پولیس نارادہ کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ جیکس مرڈیڈ کو عدالت نے موت کی سزا دی۔

نظر بچا کر

علامہ تاجور نجیب آبادی نے دیال سنگھ کالج کی عمارت سے باہر آکر ایک تانگے والے کو آواز دی اور پھر اس سے سوال کیا۔

"انارکلی جانے کے کتنے پیسے لوگے؟"

"پورا تانگہ ہوگا جناب؟" — "ہاں بھئی۔ یہ بتاؤ کتنے پیسے لوگے؟" علامہ نے کوچوان سے پوچھا۔

"ایک روپیہ جناب۔"

تاجور صاحب نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "نہیں بھائی آٹھ آنے لو۔ ہم ہمیشہ یہی دیتے ہیں۔"

کوچوان نے ایک بار علامہ کے موٹے تازے جسم کا جائزہ لیا اور پھر آہستہ سے کہا۔

"چلئے آٹھ آنے دیدیجئے گا۔ مگر مہربان ذرا گھوڑے کی نظر سے بچ کر اگلی سیٹ کے بجائے پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیے تاکہ بے زبان جانور کو اعتراض نہ ہو۔"

حبیب اللہ بیگ

پاک افغان دوستی

اس سال پاکستان کو جن ممتاز و مقتدر عالمی شخصیتوں کی میزبانی کا شرف اور فخر حاصل ہو رہا ہے ان میں اعلیٰ حضرت شاہ محمد ظاہر شاہ والی افغانستان سر فہرست ہیں جن کے سرکاری دورۂ پاکستان کا آغاز فروری کے پہلے ہفتے میں ہوا ہے۔ شاہ افغانستان بیرونی دنیا میں اور عصر جدید کے تاجداروں میں ایک ایسے بیدار مغز، ترقی پسند اور ایک جمہوری مزاج اور فکر رکھنے والے عوام دوست حکمران کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ جن کی قیادت اور سربراہی میں افغانستان ایک پسماندہ ملک کی حیثیت کو کہیں پیچھے چھوڑ کر ترقی، استحکام، اور خوشحالی کی راہ پر بڑی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ عالم اسلام اور بالخصوص مملکت خداداد پاکستان اور پاکستانی قوم کی نظر میں افغانستان اور شاہ افغانستان کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔

افغانستان وسطی ایشیا کی قدیم اسلامی سلطنتوں کی واحد یادگار اور برصغیر میں مدت دراز تک مسلمانوں کی سیاسی اور عسکری توانائیوں کا سرچشمہ رہا ہے۔ اور شاہ افغانستان اعلیٰ حضرت شاہ ظاہر شاہ دور حاضر کے ان منتخب اسلامی سربراہان مملکت میں شامل ہیں جو عالم اسلامی کی سربلندی و عظمت کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اور جن سے اتحاد بین الاسلامی کے مقدس فریضہ کو تکمیل کا جامہ پہنانے میں ایک اہم کردار ادا کئے جانے کی توقعات وابستہ ہیں۔

> **افغانستان اور پاکستان**
> میں جو قلبی، مذہبی، تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور لسانی وحدتیں پائی جاتی ہیں انہوں نے افغانستان کو پاکستان کی نظر میں بڑا محبوب مقام دے رکھا ہے۔
>
> **پاکستانی عوام**
> اور پاکستان کی حکومت افغانی عوام کے لئے انتہائی خیر سگالانہ جذبات رکھتی ہے اور ان کی ترقی، مسرت خوشحالی اور تعمیر کی دل سے خواہاں ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں نے افغانستان کو ہمیشہ سے اپنی سیاسی اور عسکری قوت اور توانائی کا سرچشمہ سمجھا ہے وہ غزنوی و غوری ہوں، ایبک ہوں، تغلق یا خلجی، افغان یا مغل، سلطان فاتحین وسط ایشیا کی اسی ایک مملکت سے آئے اور برصغیر کی عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیادیں استوار کیں۔ اس اسلامی سلطنت کے دور آخر اور طوائف الملوکی کے ہنگامے میں بھی جب بھی اسلامیان برصغیر پر نازک وقت آ سکا ان کی نگاہیں قدرتی طور پر مملکت افغانستان کی طرف اٹھیں۔ برصغیر پر رام راج کا خواب دیکھنے والے مرہٹوں کے غول بیابانی کی وحشیانہ عسکری قوت کے تار و پود بکھیر کر اس خیال خام کو چکنا چور کرنے والا مجاہد احمد شاہ ابدالی بھی مسلمانان عالم کی اسی عزیز مملکت کا فرمانروا تھا جس نے شاہ ولی اللہ کی صدائے استغاثہ پر لبیک کہا اور مرہٹوں پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ پھر سر نہ اٹھا سکے۔ محمود غزنوی سے اورنگ زیب عالمگیر تک اقتدار اسلامی کے عروج و کمال کا دور تھا جس کے دوران

کسی کو حریف بننے کی ہمت تک نہ ہوئی۔ شہنشاہ عالمگیر کے بعد سیاسی اور سیاسی انحطاط کا دور شروع ہوا جس نے طوائف الملوکی کی صورت اختیار کر کے مخالف قوتوں کو ابھرنے اور مسلمانوں کو کچل دینے اور نیست و نابود کر دینے کے منصوبے بنانے کا موقع فراہم کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر میں یہ مخالف قوتیں اب تک برسرپیکار ہیں لیکن ؎

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کے مصداق یکے بعد دیگرے مسلمانوں کو ایسے حربی اور سیاسی رہنما ملتے رہے جنہوں نے ہر بار حریف کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ احمد شاہ ابدالی، قائداعظم محمد علی جناح اور محمد ایوب خان کی شخصیتیں اسی عظیم سلسلہ میں شمار ہوں گی۔ اول الذکر نے مرہٹوں کے رام راج کے خواب کو چکنا چور کیا۔ قائداعظم نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک قومی نظریے کی بظاہر دلکش اور بباطن خوفناک برہمنی سازش سے محفوظ کیا اور محمد ایوب خان کی قیادت نے جنگ پاکستان ستمبر ۱۹۶۵ء میں سیکولرازم کا لبادہ اوڑھے ہندو فرقہ پرستی کے عفریت کے دست ہوس کو شانے سے اکھاڑ پھینکا جو ارض پاک کی طرف دراز ہوا تھا۔

بہرحال برصغیر میں اسلامی اقتدار کے انحطاط کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کو بیک وقت کئی اور آزمائشوں اور کٹھن مرحلوں سے گزرنا تھا۔ یہ مسائل صرف سیاسی زوال، سماجی اور معاشرتی خستہ حالی کے ہی نہ تھے بلکہ نظریاتی نوعیت کے بھی تھے جن سے عالم اسلامی کی اجتماعی فکر کے متاثر ہو جانے کے زبردست امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ اس صورتِ حال کا خلاصہ یہ ہے انیسویں صدی کے دوران یورپی اقوام کے مادی وسائل کی ترقی کی بنیاد پر بعض مخصوص سیاسی نظریات کی ترویج و اشاعت نے آنے والے دور پر ایک بہت دوررس اور گہرا اثر ڈالا۔ علاقائی قوم پرستی کے محدود نظریے نے جہاں نوعِ انسانی کے اجتماعی مفاد اور فلاح کے مقاصد کو نقصان پہنچایا وہاں بقول اقبال ملتِ اسلامی کے تن تہا جان کے لئے بھی کفن کا سامان کیا۔ قوم پرستی کے اس یورپی نظریاتی صنم کے "پیرہن" سے عالم اسلام کو لاحق ہونے والے خطرات کا ملت کے زعماء نے بروقت احساس کیا اور مسلمانوں کو "دیر قوم پرستی کے تنگ دائرے سے نکل کر وسعتِ الشیخ حرم

صحرا کی آفاقیت اور ہمہ گیریت کی طرف آنے کی دعوت دی۔ کیا اواخر انیسویں صدی اور موجودہ بیسویں صدی کے مادی اور سائنسی دور میں اسلام کے نام پر یہ نظریاتی دعوت فکر و عمل ممکن العمل تھی۔ یا ہو سکتی تھی؟

تحریک پاکستان اور قیام پاکستان نے یہ ثابت کر دیا کہ "ذوقِ عمل" کے آگے ناممکنات کی فولادی زنجیریں بھی پر کاہ سے کچھ زیادہ حقیقت نہیں رکھتی ہیں۔ قیام پاکستان بنفسہ کوئی منزل نہیں بلکہ ایک عظیم سفر اور ایک مہتم بالشان مہم کا آغاز تھا۔

پاکستان دنیا کی واحد اسلامی نظریاتی مملکت ہے ایک ایسی مملکت خداداد جو اسلامیانِ برصغیر نے ورثے میں نہیں پائی بلکہ جسے انہوں نے خدا اور دین متین کے نام پر حاصل کیا ہے اور جس کا حصول نہ کسی کی عنایت و الطاف کا نتیجہ تھا نہ ہی تاریخ کی قدرتی پیش رفت کا بلکہ پاکستان کا حصول اسلامیانِ برصغیر کی صد سالہ جدوجہد، کاوشوں اور قربانیوں کا نتیجہ تھا۔ اور یہ جدوجہد، کاوشیں اور قربانیاں صرف اس لئے نہیں تھیں کہ برصغیر کے مسلمانوں کو ایک گوشۂ عافیت مل جائے جہاں وہ باقی دنیا سے بے تعلق ہو کر اپنے مخصوص طرز کے مطابق زندگی گزارتے رہیں۔

تحریک و قیام پاکستان کا مقصد اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھا۔ اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پاکستان اس مقصد کے مقدس پرچم۔ اتحاد بین الاسلامی کے پرچم کو لے کر۔ ملت اسلامی کی سربلندی اور عظمت کی منزل کی طرف بڑی کامیابی سے بڑھ رہا ہے۔

اس عظیم نصب العین تک پہنچنے کے لئے پاکستان نے شروع ہی سے اپنی خارجہ پالیسی کو اس ترتیب سے ترتیب دیا اور اس انداز سے اس پر عمل پیرا ہوا کہ اپنوں اور پرایوں سبھوں ہی نے اسے بہ نظر استحسان دیکھا۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کی رہنمائی کا اصول دنیا کے سب ملکوں بالخصوص اپنے ہمسایہ ملکوں سے دوستانہ تعلقات اور دنیا کے اسلامی ملکوں سے امتیازی اور خصوصی روابط کی استواری اور ترقی ہیں اکتوبر ۱۹۵۸ء کے پرامن انقلاب کے بعد صدر مملکت نے خارجی امور کی جانب خصوصی توجہ دی اور بین الاقوامی سطح پر

پاکستان کے وقار میں اضافہ ہوا۔ صدر محمد ایوب خان کے تدبر و دانشمندی اور اسلامی اخوت کے جذبہ نے اسلامی ملکوں میں ایک بڑی اہم ضرورت کے احساس کو بیدار کر دیا۔ ٹوٹے ہوئے رشتے از سر نو استوار ہوئے ایک دوسرے کے کام آنے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے اور آپس میں مل جل کر کام کرنے کی داغ بیل پڑی۔ اسلامی ملکوں کا یہ اشتراک فکر و عمل بڑا ہمت افزا ہے۔ آیئے اس پس منظر میں اس دیرینہ ربط پر غور کریں جو افغانستان اور پاکستان میں قائم ہے۔

افغانستان جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے پاکستان کا قریبی ہمسایہ ہے۔ افغانستان کے بیرونی دنیا سے تجارتی اور کاروباری تعلقات کے سارے راستے اپنے پڑوسی ملکوں سے گزرتے ہیں جن میں پاکستان سر فہرست ہے۔ افغانستان کی سمندر کے راستے جملہ برآمدی درآمدی تجارت پاکستان کے ذریعہ ہوتی ہے۔ پاکستان نے اپنے اس برادر ملک کو سامان تجارت کے نقل و حمل اور ترسیل کی ہر ممکن سہولت دے رکھی ہے۔ افغانستان اور پاکستان میں جو نسلی، مذہبی، تاریخی، تہذیبی ثقافتی اور لسانی وحدتیں پائی جاتی ہیں انہوں نے افغانستان کو پاکستانی عوام کی نظر میں بڑا محبوب مقام دے رکھا ہے۔ پاکستانی عوام اور پاکستان کی حکومت افغانی عوام کے لئے انتہائی خیر سگالانہ جذبات رکھتی ہے۔ اور ان کی ترقی، تعمیر، مسرت اور خوشحالی کی دل سے خواہاں ہے پاکستان کو ان تمام جدید و قدیم روابط کا پورا پورا احساس ہے جو دونوں مملکتوں میں قائم ہے اور وہ ان کا خلوص دل سے احترام کرتا ہے۔

جب کبھی دو اسلامی ملکوں کے باہمی تعلقات کا ذکر ہوتا ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں تو ایک عجیب قسم کے ذہنی کرب کا احساس ہوتا ہے۔ دو اسلامی ملکوں کے خصوصی تعلقات کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل بعض صورتوں میں ضروری ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ جغرافیائی محل وقوع سے لے کر سیاسی نظریات کی ہم آہنگی تک بات کی جائے۔ کاش کہ صرف اتنا کہنا کافی ہوتا کہ دونوں اسلامی ملک ہیں۔ اور اگر ان کے باہمی تعلقات اچھے نہ ہوں گے تو پھر کس کے ہوں گے۔ مسلمانان

الشجاع

پاکستان کو اس کرب کا خصوصیت سے احساس ہوتا ہے۔ اس خطہ زمین کے مسلمانوں کی یہ روایت چلی آرہی ہے کہ مراکش سے انڈونیشیا تک کسی بھی اسلامی ملک کے اگر پھانس بھی لگ جائے تو انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے ان کی چھاتی پر بھالا مار دیا ہو۔ عالم اسلام کی آزادی کی تحریکیں اور ان کی تاریخ اس کی گواہ ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ ان دونوں پڑوسی ملکوں کے دیرینہ تعلقات بعض حلقوں کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتے رہے ہیں۔ دونوں میں تنازعات کو ابھارنے کے لئے گاہے گاہے عجیب النوع مفروضے تراشے جاتے رہے ہیں لیکن خدا کا احسان ہے کہ دو بھائیوں کے مابین تفرقہ ڈالنے کی یہ مذموم کوششیں باہمی رواداری، عاقبت اندیشی اور خلوص کو بروئے کار لانے اور بالخصوص پاکستان و افغانستان کے ایک اور عظیم اور برادر ہمسایہ ملک ایران کے فرمانروا اعلیٰ حضرت شہنشاہ پہلوی کی مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں ناکام ہو چکی ہیں۔ اور پاک افغان تعلقات روز بروز ترقی کر رہے ہیں۔ تاشقند ملاقات سے پہلے صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا دورۂ افغانستان اور اعلیٰحضرت فرمانروائے افغانستان کا موجودہ دورۂ پاکستان دونوں برادر ملکوں کے بڑھتے، ترقی کرتے، اور مستحکم تر ہوتے تعلقات کا ثبوت ہیں۔

پاکستان اور افغانستان کے تعلقات کی خوشگوار نوعیت ایک امر فطری ہے۔ دونوں ملکوں کے باہمی تقرب کا تقاضہ بھی یہی ہے اور ان کا مشترکہ مفاد بھی باہمی خوشگوار تعلقات سے وابستہ ہے۔

جواب طلب امور

کے لئے ہمیشہ کارڈ، ٹکٹ یا لفافہ ارسال کریں۔ تاکہ آپ کے مکتوب کا بروقت جواب دیا جا سکے۔ غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جب کہ ان کے ہمراہ لفافہ ہو۔ اگر ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو اطلاع دیجئے۔ آپ کی خدمت میں پرچہ مکرر ارسال کیا جائے گا۔

(منیجر)

آبنائے باسفورس اور درہ دانیال کے درمیان دنیا کا محفوظ ترین بندرگاہ قسطنطنیہ واقع ہے جو اب استنبول کہلاتا ہے۔ بحیرہ روم سے آنے والے جہاز درہ دانیال اور بحیرہ اسود سے آنے والے جہاز آبنائے باسفورس سے گزر کر یہاں پہنچتے ہیں۔ اور یہ دونوں آبنائیں اس محفوظ ترین اور شاندار شہر کے لئے دروازہ کا کام دیتی ہیں۔

لڑائی کا پانسہ پلٹ چکا تھا

ناقابل تسخیر قسطنطنیہ کی قسمت پر مہر لگ گئی۔ عثمانیوں نے مفتوح عیسائیوں کے ساتھ جو رواداری برتی وہ اسلامی روایات کے شایانِ شان تھی۔ عیسائیوں کو جلد معلوم ہو گیا کہ وہ ایسے حکمراں کی رعایا ہیں جو فاتح اور مفتوح، مسلم اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں برتتا ہے۔

قسطنطنیہ کی تاریخ

اس کے شہر کی طرح بہت قدیم اور عظیم الشان ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم نے اپنی پاک زندگی میں اس شہر کی فتح کی بشارت دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پہلی صدی ہجری سے مسلمانوں نے اس مستحکم شہر کو فتح کرنے کے منصوبے بنانے شروع کر دئے اور عربوں نے اس پر متعدد حملے کئے۔ لیکن ایسے مستحکم شہر کو جسے سمندر براعظم ایشیا سے جدا کرتا ہے اور جس کے دونوں جانب بحری راستوں پر آبنائے مثل دروازے کے واقع ہیں فتح کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ خلافت بنی امیہ اور خلافت عباسیہ میں متعدد حملے اس شہر پر کئے گئے۔ لیکن اس کی فتح کا سہرا ترکی کے سلطان محمد فاتح کے سر بندھا۔ جس نے ایک حیرت انگیز منصوبے کے تحت اس تاریخی شہر پر قبضہ کیا اور اس طرح آنحضرت صلعم کی پیشگوئی کو صحیح ثابت کر دکھایا۔ محمد فاتح کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی فتح دنیا کی عسکری تاریخ کا ایک محیر العقول اور غیر معمولی کارنامہ ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

قسطنطنیہ کو جس نے ہزاروں سال تک بڑے بڑے فاتحین کے حملوں کو ناکام بنا دیا حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے سات سو سال قبل ملاحوں نے آباد کیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ شہر بڑھتا اور ترقی کرتا رہا۔ اور روم کی طرح یہ سات نواحی پہاڑیوں پر پھیل گیا۔ جو آبنائے باسفورس کے کنارے دور دور تک چلی گئی تھیں۔

یونان کی وسیع اور عظیم الشان سلطنت جو طلوع اسلام سے قبل دنیا میں تہذیب و تمدن، علم و ادب، علوم و فنون کا سب سے بڑا گہوارہ تھی۔ آخرکار رومیوں کے ہاتھوں زوال پذیر ہوئی۔ بعد ازاں رومیوں کی وسیع سلطنت بھی دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایشیائے کوچک اور بلقان میں مشرقی رومن ایمپائر یا بازنطینی سلطنت قائم ہوئی۔ جو ایک طاقتور سلطنت تھی جسے آخرکار ترکی سلطان محمد فاتح نے ختم کر دیا۔ اسی سلطنت کے شہنشاہ قسطنطین کے نام پر قسطنطنیہ نام رکھا گیا جو جلد ہی ایک شاندار اور عظیم الشان شہر بن گیا اور مشرق میں روم اور بغداد کا ہم پلہ تصور کیا جانے لگا۔

آنحضرت محمد صلعم نے قسطنطنیہ کی فتح کی بشارت دی تھی اسی لئے اس شہر پر مسلمانوں کی خاص نظر رہی اور اس پر سب سے پہلا حملہ امیر معاویہ کے زمانہ میں ہوا۔ جس میں متعدد جلیل القدر صحابہ نے حصہ لیا

جن میں حضرت امام حسین اور حضرت امام حسن کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس حملہ میں مشہور صحابی اور میزبان رسول حضرت ابوایوب انصاری نے جام شہادت نوش فرمایا۔

عباسیوں اور سلجوقیوں کے زوال کے بعد اناطولیہ (ایشیائے کوچک) میں عیسائیوں کی نئی طاقت ابھرنا شروع ہوئی جو رفتہ رفتہ بلقان پر چھا گئی۔ اس کے سلطان بایزید یلدرم نے جو بڑھتا ہوا وسطی یورپ کے اہم ترین شہر ڈانسا کے دروازہ تک پہنچ گیا۔ عیسائیوں کی متحدہ افواج کو شکست فاش دی۔ اور ان کی طاقت کو زیر و زبر کر دیا۔ اس نے بازنطینی شہنشاہ کو بھی جو عیسائیوں سے ساز باز کرتا رہتا تھا انتباہ کیا کہ وہ قسطنطنیہ کو عیسائیوں کے حوالے کر دے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تاتاریوں کے عظیم فاتح تیمور صاحبقراں نے اس دوران میں عثمانیوں کے علاقہ پر حملہ کر دیا تھا۔ اور عثمانی سلطنت بایزید یلدرم کو مجبوراً تیمور سے مقابلہ کے لئے ایشیائے کوچک جانا پڑا۔ جس میں بایزید کو ۱۴۰۲ء میں شکست ہوئی اور اس طرح قسطنطنیہ مسلمانوں کے قبضہ میں آتے آتے رہ گیا اور یورپ ایک بار پھر مسلمانوں کے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا۔ اگر بایزید یلدرم کو تیمور کے ہاتھوں شکست نہ اٹھانی پڑتی تو یورپ کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ اور یورپ مسلمانوں کے قبضہ میں ہوتا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب یورپ مسلمانوں کے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا اور ان کے قبضہ میں آنے سے بچ گیا۔ پہلا موقع آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کو ملا تھا جب مشہور عرب فاتح موسیٰ ابن نصیر اور طارق بن زیاد ہسپانیہ کو فتح کرکے کوہ پیرینیز کو عبور کر چکے تھے اور ان کا ارادہ وسطی اور مشرقی یورپ کو فتح کرتے ہوئے دمشق پہنچنے کا تھا۔ مغربی مورخین کے قول کے مطابق یورپ ان کے رحم و کرم پر تھا اور یورپ کی کوئی حکومت انہیں روکنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن دنیائے اسلام کی یہ بڑی بدنصیبی تھی کہ ان نامور فاتحین موسیٰ اور طارق کو دربار خلافت میں فوری طور پر طلب کر لیا گیا۔ اور دونوں یورپ کی فتح کا پروگرام ترک کرکے دمشق کو روانہ ہو گئے۔

مئی ۱۴۵۳ء میں یورپ نے حیرت و استعجاب سے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ ایک اکیس سالہ نوجوان اپنے سفید گھوڑے پر سوار قسطنطنیہ کے ناقابل تسخیر شہر میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ نوجوان عثمانی ترکوں کے ساتویں سلطان محمد ثانی تھے جو تاریخ میں محمد فاتح کے نام سے مشہور ہیں۔ بہادر ترکوں کے مقابلہ میں عیسائی نہ ٹھہر سکے۔ اور چند ہی لمحوں میں انہوں نے پورے شہر پر قبضہ کر لیا۔

محمد ثانی جو عثمانی سلطان مراد ثانی کے بیٹے تھے اپریل ۱۴۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ۱۴۵۱ء میں تخت نشین ہوئے اور تیس سال کی کامیاب اور شاندار حکومت کے بعد ۱۴۸۱ء میں دار فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کر گئے۔

قسطنطنیہ کی فتح جتنی غیر معمولی ہے اتنی ہی حیرت انگیز بھی ہے۔ یہ بہادری اور عسکری منصوبہ بندی کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو تاریخ عالم میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ جس نے ترکوں کے قدم یورپ میں مستقل طور سے جما دیے۔ جہاں آج کل وہ حکمراں ہیں۔

سلطان محمد کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ قسطنطنیہ کو فتح کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور صدیوں سے اس شہر نے بڑے بڑے فاتحین کے ارادوں کو ناکام بنا دیا۔ اور اسے اس شہر کی فتح کے لئے عیسائی یورپ کی متحدہ طاقت سے نبرد آزما ہونا تھا۔ سلطان محمد نے ایڈریانوپل میں جنگی ہتھیاروں اور ساز و سامان تیار کرنے کا ایک کارخانہ قائم کیا جس میں ایک بھاری توپ تیار کی گئی جو ایک میل سے زائد دور تک تیرہ سو پاؤنڈ کے پتھر پھینک سکتی تھی۔

۱۴۵۳ء کے ابتدائی زمانہ میں عثمانی افواج قسطنطنیہ کی جانب بڑھنا شروع ہوئیں اور اس کے قریب و جوار کے قصبے اور دیہات اس کے قبضے میں آتے چلے گئے۔ سلطان نے اپنی افواج کو قسطنطنیہ کے تاریخی شہر سے پانچ میل کے فاصلہ پر روک دیا۔ اور ۱۱ اپریل ۱۴۵۳ء کو قسطنطنیہ کا یادگار محاصرہ شروع ہوا۔

عثمانیوں کی زبردست توپ شہر کی فصیل پر بھاری بھاری پتھر پھینک رہی تھی لیکن فصیل کو جو نقصان پہنچتا اسے محصورین راتوں رات درست کر لیتے۔ محاصرہ کو بمشکل تین ہفتے ہوئے تھے کہ بازنطینی محصورین کی مدد کے لئے سمندر کے راستے وینس کی کمک پہنچنی شروع ہوئی۔ عثمانی بحری بیڑے نے وینس کے جہازوں کا راستہ روکنا چاہا۔

الشجاع

لیکن وینس کے جہاز کسی طرح بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوگئے اور بازنطینی محصورین میں جا ملے۔ اور انہوں نے سمندر سے عثمانیوں کا راستہ مکمل طور پر منقطع کر دیا۔

عثمانیوں کو اب اس بات کا مکمل احساس ہو گیا تھا کہ قسطنطنیہ کے مستحکم شہر پر قبضہ کرنا اس وقت تک محال ہے جب تک اس پر سمندر اور خشکی دونوں جانب سے حملہ نہ کیا جائے۔ لیکن سمندر کا راستہ تو وینس اور بازنطینیوں کے زبردست بحری بیڑے نے روک رکھا تھا۔

سلطان محمد ثانی نے آخر کار بحری جہازوں کو خشکی کے راستے قسطنطنیہ تک پہنچانے کی ایک عجیب و غریب ترکیب سوچی۔ لکڑی کے مضبوط تختوں کو جوڑ کر دس میل لمبی ایک لکڑی کی سڑک تیار کی گئی جسے مویشیوں اور بھیڑوں کی چربی کے استعمال سے پھسلنے والی بنا دیا گیا۔ اور انہیں گھوڑوں اور بیلوں کے ذریعہ کھینچا گیا۔ ان کشتیوں میں منتخب ترکی افواج سوار تھیں۔ جو پھسلتے پھسلتے سمندر کے کنارے پہنچ گئیں۔

بحری جنگ کی تاریخ میں یہ ایک انوکھی اور لاثانی ترکیب تھی۔ خشکی کے راستے جب یہ کشتیاں شاخ زریں (گولڈن ہارن) کے پاس پہنچیں تو انہیں سمندر میں اتار دیا گیا۔ محصورین نے حیرت و استعجاب سے اس دلیرانہ منصوبہ کا مشاہدہ کیا۔

دوسرے دن وہ یادگار جنگ ہوئی جس میں عثمانی سپاہیوں ملاحوں اور توپچیوں نے قسطنطنیہ کے تاریخی شہر کو اپنے گولوں اور گولیوں کا نشانہ بنایا۔ سلطان محمد ثانی سفید گھوڑے پر سوار اپنی بہادر فوج کی کمان کر رہا تھا۔ اللہ اکبر کے نعرے سے ساری فضا گونج اٹھی تھی اور اس نعرے نے ترکوں میں وہ جوش و خروش پیدا کیا جس نے انہیں بہادری کے غیر معمولی کارناموں پر آمادہ کیا۔

یکایک ترکی فوج کا ایک دستہ جس کی کمان بہادر حسن کر رہا تھا تیروں اور پتھروں کی بوچھار میں آگے بڑھا۔ حسن اور اس کے چند ساتھیوں نے شہر کی بلند اور مستحکم فصیل پر چڑھنا شروع کیا۔ لیکن فصیل پر تعینات بازنطینی سپاہیوں نے انہیں نیچے ڈھکیل دیا۔ لیکن حسن اور اس کے ساتھیوں کی بے مثال بہادری بیکار نہیں گئی اور اپنا کام

الشجاع

کر گئی۔ عثمانی افواج سمندر کی موج کی طرح فصیل کی طرف بڑھیں۔ اور انہوں نے آناً فاناً میں اس کا محاصرہ کر لیا۔ دیکھتے دیکھتے سیکڑوں سیڑھیاں فصیل سے لگا دی گئیں۔ اور عثمانی سپاہی ان پر چڑھ کر فصیل پر پہنچ گئے اور انہوں نے بازنطینی سپاہیوں کو فصیل سے پرے ڈھکیل دیا۔

لڑائی کا پانسہ پلٹ چکا تھا اور ناقابل تسخیر قسطنطنیہ کی قسمت پر مہر لگ گئی تھی۔ عثمانی سلطان محمد ثانی اپنے سفید گھوڑے پر سوار اس تاریخی شہر میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی بہادر سپاہ تھی۔ عثمانیوں نے مفتوح عیسائیوں کے ساتھ جو رواداری برتی وہ اسلامی روایات کے شایان شان تھی۔ عیسائیوں کو جلد معلوم ہو گیا کہ وہ ایسے حکمراں کی رعایا ہیں جو فاتح اور مفتوح، مسلم اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں برتتا ہے۔

خلافت عثمانیہ کے طویل دور میں قسطنطنیہ کی شان و شوکت برابر بڑھتی رہی۔ ترکوں کی سلطنت جو مراکش سے کوہ قاف تک پھیلی ہوئی تھی اور جس میں شمالی افریقہ کے ممالک۔ مشرقی یورپ میں جزیرہ نما بلقان ہنگری اور رومانیہ کے ممالک۔ ایشیا میں عرب، عراق، شام، فلسطین اور ایشیائے کوچک کے وسیع خطے شامل تھے تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور اپنے زمانے میں دنیا کی سب سے طاقتور اور وسیع سلطنت تھی خلفائے عباسیہ کے بعد دنیائے اسلام کی خلافت اور سیادت ترکوں کے سپرد ہوئی تھی۔ دمشق اور قرطبہ، بغداد اور قاہرہ کی شان و شوکت اور علوم و فنون کی گہما گہمی اب ترکوں کے دارالسلطنت قسطنطنیہ میں مرکوز ہو گئی تھی۔ اس طرح بغداد اور قاہرہ کی جگہ اب قسطنطنیہ نے لے لی تھی۔ اگرچہ سلاطین عثمانیہ نے اپنی زیادہ تر توجہ عسکریت کی طرف مبذول کی اور علوم و فنون کی جانب وہ توجہ نہیں کی جو قرطبہ، بغداد اور قاہرہ کے سلاطین نے کی تھی لیکن پھر بھی قسطنطنیہ اپنے علوم و فنون کے لئے اپنے عروج کے زمانہ میں چہار دانگ عالم میں مشہور رہا۔

ترکوں نے اپنی عسکری قوت کو بڑھانے پر جو زیادہ توجہ دی اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکی یورپ کی حکومتوں کے درمیان تیس دانتوں میں زبان کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس کی طولانی تاریخ میں شاید ہی کوئی دس سال ایسے گزرے ہوں گے جب اس کو کوئی بڑی لڑائی نہ لڑنی پڑی ہو۔ یورپ کی عیسائی حکومتوں کی نظر میں ترکی کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا۔

اور وہاں سے نقصان پہنچانے اور ختم کر دینے کی ریشہ دوانیوں میں سرگرم مصروف رہا کرتی تھیں۔

سلیمان اعظم کے عہد حکومت میں قسطنطنیہ کی رونق اور شان و شوکت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ سلیمان اعظم اپنے زمانہ کا عظیم ترین حکمران تھا۔ اس کے دور حکومت میں عثمانیوں نے ہنگری پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور ان کی فوجیں ویانا کے دروازہ تک پہنچ گئی تھیں۔ قسطنطنیہ اس زمانے میں دنیا کا عظیم ترین شہر تھا۔ شہرہ آفاق معمار سینان نے اسے خوبصورت اور شاندار عمارتوں سے مزین کر دیا تھا۔ اور اس شہر میں بے شمار خوبصورت اور شاندار مساجد، مدرسے، ہسپتال، کارواں سرائے، محلات، مقبرے، پل، فوارے، اور غسلخانے تعمیر کیے تھے۔ ان میں سے ۲۳۵ تعمیرات صرف سینان کی مرہون منت تھیں۔ عثمانی خلفاء نے بھی اپنے سابق پیشروں کی طرح علوم و فنون کی بڑی سرپرستی کی۔ انہوں نے اپنے ممالک محروسہ میں بڑے بڑے مدارس اور کالج قائم کئے۔ قسطنطنیہ جلد ہی مشرقی علوم و فنون کا اہم ترین مرکز بن گیا۔

خلافت عثمانیہ میں تعلیمی ادارے سرکاری کنٹرول میں تھے۔ اس لئے ان کا انتظام بہت بہتر تھا۔ ان تعلیمی اداروں میں پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی جو طلباء کے لئے مستقبل میں زیادہ کار آمد ثابت ہوتی تھی۔ اساتذہ کو معقول مشاہرہ دیا جاتا تھا دنیائے اسلام میں اساتذہ کو پنشن دینے کی سب سے پہلے ابتداء ترکی میں کی گئی۔ اعلیٰ تعلیمی مدارس میں قواعد، منطق، ادب، صحافت، ریاضی، علم ہیئت اور دیگر سائنسوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ طلباء جو ایسے مدرسوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے تھے "دانشمند" کہلاتے تھے۔ ارخان نے متعدد اعلیٰ تعلیمی مدارس قائم کئے۔ سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ میں ایک عظیم الشان یونیورسٹی تعمیر کی جس کے زیر انتظام آٹھ کالج تھے۔ ہر کالج میں وسیع اقامت گاہیں یا ہوسٹل تھے۔ سلطان بایزید یلدرم نے بھی قسطنطنیہ میں متعدد اعلیٰ مدارس قائم کئے۔ سلیمان اعظم نے بھی دارالخلافہ میں متعدد کالج تعمیر کئے۔ اس کے زمانہ میں شہر کے آٹھ سو طلباء کو سرکاری وظائف دئے جاتے تھے۔ قسطنطنیہ کے متعدد اعلیٰ مدارس میں فوجی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس شہر میں دنیا کا اعلیٰ ترین فوجی

الشجاع

۲۱ کالج واقع تھا۔

جنگ عظیم اول کے زمانہ تک قسطنطنیہ مغرب و مشرق میں ایک اہم علمی مرکز تسلیم کیا جاتا تھا۔ وان ہیمر اس شہر میں واقع ۲۷۵ اعلیٰ مدارس کی فہرست دیتا ہے۔ ۱۸۸۵ء میں اس شہر میں ۱۷۱ ایسے اعلیٰ مدارس واقع تھے جن میں ۴۸ ۱۷ طلباء زیر تعلیم تھے۔ اس شہر میں ایسی متعدد شاندار مساجد تھیں جن میں بڑے بڑے اعلیٰ مدارس واقع تھے۔ آیا صوفیہ میں ایک بہت مشہور مدرسہ قائم تھا۔ محمد فاتح کی تعمیر کردہ جامع محمدیہ سے متعلق آٹھ عظیم الشان مدارس تھے۔ اور شہزادے کی مسجد سے متعلق جسے شہرہ آفاق معمار سینان نے تعمیر کیا تھا چار اعلیٰ مدارس تھے۔

ہلال بے کی زیر نگرانی آثار قدیمہ کا ایک شاہی عجائب خانہ قائم کیا تھا جو اپنی نوعیت کا ساری دنیا میں واحد تھا۔ جو زمانہ قدیم کے علمی اور فنی ذخائر کا ایک بیش بہا خزانہ تھا۔ ۱۹۲۳ء سے عثمانی آرٹ اور مشرق قدیم کے ذخائر کے دو الگ شعبوں کا اس میں اضافہ کیا گیا۔

قسطنطنیہ اپنی شاندار مساجد کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہے جن کی تعمیر میں شاہان عثمانیہ اور ان کے امراء دونوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ان مساجد سے متعلق متعدد اعلیٰ مدارس، کتب خانے، ہسپتال اور شفا خانے واقع ہیں۔ ان میں مشہور مساجد جامع صوفیہ اور جامع محمدیہ، جامع بایزید، جامع سلیمیہ، جامع سلیمانیہ، جامع شہزادہ، جامع احمدی، نور عثمانیہ اور جامع لالیل ہیں۔ جامع محمدیہ کو سلطان محمد فاتح، جامع بایزید کو سلطان بایزید یلدرم، جامع سلیمانیہ اور جامع شہزادہ کو مشہور معمار سینان نے سلیمان اعظم کے لئے تعمیر کیا تھا۔ ان کے علاوہ اس عظیم الشان شہر میں پانچ سو مزید شاندار مساجد واقع ہیں۔ گولڈن ہارن (شاخ زریں) کے کنارے حضرت ایوب انصاری کی متبرک مسجد واقع ہے۔ جس میں آنحضرت محمد صلعم کا قدم مبارک کا عکس اور پیغمبر اسلام کا عصائے مبارک رکھا ہوا ہے۔ اس مسجد میں خلفائے عثمانی کی تاجپوشی ہوا کرتی تھی۔ اور انہیں تبرکات نبوی کا پہنایا جاتا تھا۔ اس شہر میں فقراء کی سیکڑوں خانقاہیں واقع ہیں۔ اور ۱۸۸۵ء میں فقراء کی ۲۶۰ خانقاہیں یہاں پائی جاتی تھیں۔

عثمانی خلفاء کے اس صدر مقام پر متعدد عظیم الشان کتب خانے

واقع تھے جن میں نایاب مسودات اور کتابیں محفوظ تھیں۔ ثقافت اسلام میں سائنس اور طب پر اپنے مضمون میں میکس میرہاف رقمطراز ہے: "اسلامی سائنس کے خزائن ابھی کھلنا شروع ہوئے ہیں۔ صرف قسطنطنیہ میں آٹھ مساجد میں شاندار کتب خانے پائے جاتے ہیں۔ جن میں لاکھوں مسودے محفوظ ہیں ــــ"

۱۸۸۲ء میں اس شہر میں ۴۵ بڑے کتب خانے موجود تھے۔ جن میں ۱۶۲۴۶ نادر مسودات محفوظ تھے۔ قدیم سرائے اور جامع شہزادہ کے کتب خانے اپنی نادر مسودات کے لئے بہت مشہور تھے۔ سولہویں صدی عیسوی سے قدیم سرائے کا کتب خانہ اپنی یونانی اور لاطینی کتابوں کے ذخائر کے لئے مشہور تھا۔ مشہور مورخ بلاذری کی تصنیف کردہ "انساب الاشراف" جس میں شرفاء کی سوانح حیات درج ہیں اور جو چالیس جلدوں میں ہے قسطنطنیہ میں محفوظ ہے۔

قسطنطنیہ میں طبی مدارس، ہسپتالوں اور شفاخانوں کا بہت معقول انتظام تھا۔ پہلے ایسے ادارے مسجدوں سے ملحق تھے۔ بعد ازاں انہیں علیحدہ کر کے جدید طریقوں پر تعمیر کیا گیا۔ ان میں سب سے مشہور محمدیہ ہسپتال اور احمدیہ پاگل خانہ تھا۔ بعد ازاں یہاں پانچ اور طبی مدارس تعمیر کیے گئے اور غرباء کے لئے ایک عظیم الشان اقامت گاہ تعمیر کی گئی ــــ

اس شہر میں محمد فاتح کے زمانے سے ترسیل آب کا بہت اچھا انتظام کیا گیا تھا۔ مشہور معمار سینان نے سلیمان اعظم کے زمانہ میں ایک عظیم الشان ذخیرۂ آب تعمیر کیا۔ جہاں سے پائپ کے ذریعہ تمام شہر میں پانی فراہم کیا جاتا تھا۔

جنگ عظیم اول کے بعد قسطنطنیہ کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ درہ دانیال کے قریب گیلی پولی کے مقام پر بہادر ترکوں نے مصطفےٰ کمال کی سرکردگی میں اتحادیوں کو سب سے بڑی شکست دی۔ لیکن اس جنگ میں جرمنی کی شکست کی وجہ سے ان کے حلیف ترکوں کو بھی ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اتحادیوں نے قسطنطنیہ میں اپنے ڈیرے جمالئے۔ اور سیورس کے معاہدہ کے تحت ترکی کے وجود کو ختم کرنے کی سازش انگریزوں نے تیار کی اور کٹھ پتلی خلیفہ کو اپنا آلہ کار بنایا۔

قوم پرست ترکوں نے اس توہین آمیز معاہدہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور مصطفےٰ کمال اور عصمت انونو کی سرکردگی میں انہوں نے جنگ کو اناطولیہ میں جاری رکھا۔ نتیجتے ترکوں نے سکاریہ کے مقام پر یونان کی زبردست فوج کو ۱۹۲۱ء میں شکست فاش دے کر اپنے ملک کو آزاد کرالیا۔ اتحادیوں کو آخر کار قسطنطنیہ چھوڑنا پڑا۔ اور لاسینز کے معاہدہ کی رو سے ترکوں کی شرائط تسلیم کر لی گئیں۔ لیکن مصطفےٰ کمال پاشا نے قسطنطنیہ سے اپنا دار الخلافہ انقرہ کو منتقل کر دیا ــ کیونکہ اناطولیہ کے وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے انقرہ زیادہ محفوظ تھا۔

ڈاکٹر ابوالفضل

مکاتیب شبلی

اردو کے خانگی اور نجی خطوط کا پڑھنا ہر قوم و ملک اور معاشرت میں ایک اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے مگر ہر دستور اور رواج میں استثنار کا ایک ایسا پہلو نکل آتا ہے جہاں ایک ہنر اور جرم ایک خوبی بن جاتا ہے۔ اسی استثنائی شکل میں بڑی شخصیتوں کے نجی خطوط کا مطالعہ بھی آجاتا ہے کہ طرزِ جدید کی سوانح عمری مرتب کرنے میں آج کل بڑے لوگوں کے لیے خطوط اور تحریروں سے زیادہ اہم دستاویز کوئی اور نہیں سمجھی جاتیں۔ ان کی زندگی کے واقعات کی بنا و ترتیب ان کی ذہنی ساخت اور سماجی شعور کے تعین اور ان کے اعمال و افعال کے اثرات مرتب کرنے میں ان سے بے مدد ملتی ہے۔ نجی خطوط خود کلامی کے بہترین مظہر ہیں۔ تنہائی میں اپنے راز دار اور مخلص دوستوں یا اپنے نور نظر ندیموں کو خط لکھتے ہوئے انسان کسی دار و گیر یا باز پرس و تنقید کی گرفت سے آزاد ہو کر نہایت بے تکلفی اور سادگی سے اپنا دل کھول کر رکھتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی کسی اور علمی یا ادبی تحریر میں ہرگز نہ مل سکے گی۔ ایسے خطوط میں سادگی، صداقت اور خلوص ہوتا ہے۔ تصنع نام کو نہیں ہوتا۔ وہ نہایت بے تکلفی سے اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہے۔ اسے اپنا شریک راز بناتا ہے اپنے دل کی گہرائیاں اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اس سے مشورے لیتا ہے۔ اس کی باتوں پر ہنستا ہے اور افسوس بھی کرتا ہے۔ اسے اپنی مسرت اور غم کا شریک و راز دان جان کر اپنی کامیابیاں اور ناکامیاں اس سے بیان کرتا ہے بلکہ بعض اوقات اپنی کامرانیوں کی داد کا طالب ہوتا ہے اور اپنی حسرتوں کی بیداد پر اس سے مرہم کا جویا۔ یہاں اس کی زندگی کے تمام پہلو ـــ اس کی تمنائیں، اس کے ولولے اور اس کے اعمال و افعال کے خاکے جیتی جاگتی تصویروں میں بدل جاتے ہیں اس کی حیات کے سارے اسرار اور خوابیدہ پہلو جاگ پڑتے ہیں۔ گویا اس کے یہ خطوط شفاف آئینے ہیں کہ جن میں اس کے تحت الشعور کی جھلکیاں تک نمودار ہو جاتی ہیں ـــ

کسی بڑی شخصیت کی سوانح عمری کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے سوانح نگار نے کدّ و کاوش سے اس کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کو خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو جمع کیا ہے اس کے ایک ایک جملے بلکہ ایک ایک لفظ سے واقعات میں جان بھرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اگر اس کے خانگی خطوط مل جائیں جو اس نے اپنے عزیزوں، دوستوں اور ساتھیوں کو موقع بموقع لکھے تھے جن میں مختلف واقعات، جذبات یا ان کے آپسی معاملات کی گہرائی کو واضح کرنے والی عبارتوں اور تحریروں سے انہیں زینت بخشی ہے تو اس شخصیت کی مکمل تصویر ہمارے سامنے ابھر آئے گی۔ یہ بات شبلی کے خطوط میں بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئی ہے۔

شبلی کے مکاتیب سے یہ پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا عروج اور ان کو ایک بلند کردار اور اعلیٰ نصب العین رکھنے والی ایک عظیم قوم بنانا اُن کا مقصد تھا۔

اِن خطوط کے ایک ایک جملے میں ان کی روح سمائی ہوئی ہے۔ ان کی دھن، ان کی لگن ہر لفظ سے ٹپکی پڑتی ہے۔ اُن کے عکس میں وہ محض ایک شخصیت ہی نہیں ایک مکمل ادارہ معلوم ہوتے ہیں۔

خطوط میں شبلی کے مخاطب ہر قسم کے لوگ ہیں، بزرگ، خاندان، دوست جن میں دونوں اصناف شامل ہیں ـــ شاگرد اور ہم پیشہ و ہم مشرب اس لحاظ سے مختلف امور و معاملات کے علاوہ جا بجا ان کو ایسے حالات و مواقع سے دوچار ہونا ناگزیر تھا جن میں وہ خود اپنے متعلق بھی کچھ لکھتے۔ اور یہی باتیں ہمارے کام کی ہیں۔ انہیں باتوں سے ان کے دلی راز، ان کی امیدیں، ان کے ارادے، ان کی دلچسپیاں غرض ان کے حقیقی خیالات و جذبات کو ظاہر کرنے والی ایسی بہت سی چیزیں نکل آتی ہیں جن سے ان کی شخصیت کے متعین کرنے میں ہمیں بڑی مدد ملتی ہے۔

جہاں شبلی کی شخصیت کے بہت سے پہلو ان کے اس سرمایہ کے مطالعہ سے ہمارے سامنے ابھر آتے ہیں ان میں کم از کم دو پہلو نہایت شاندار اور جاندار ہیں۔ انہیں ہم کمال اور جمال سے منسوب کرسکتے ہیں۔ جہاں تک ان کی کمالی حیثیت کا تعلق ہے اس کے یوں تو کئی روپ ہیں۔ مگر سب کا مجموعہ تعلیم اور اس کے متعلقات کے علاوہ کچھ نہیں جیسے مسلمانوں کی علمی ترقی، مذہبی علوم کی اصلاح، مستشرقین کی غلطیوں کا ازالہ، درس گاہوں کی بہتری، تصانیف کی تیاری، طلباء کو ہر قسم کی امداد کا خیال، کتابوں کی خریداری، کتب خانوں سے استفادہ کی کوششیں، علوم و فنون کی ترقی کے سلسلہ میں جلسوں، کمیٹیوں اور کانفرنسوں کا انعقاد اور عام طور پر مسلمانوں کی ہمہ جہتی ترقی کے پروگرام بنانا۔ غرض ایک طوفان ہے جو ان کی زندگی کے ہر لمحہ پر چھایا ہوا ہے۔ اپنے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کبھی وہ گورنمنٹ کو نصاب تعلیم، اساتذہ، زبان اور اخلاق و مذہب کے مسائل کے بارے میں توجہ دلاتے نظر آتے ہیں۔ کبھی ملک کے لیڈروں سے تعلیم و تدریس کے معاملہ میں گرما گرم بحثیں کرتے ہیں۔ کبھی پریس والوں سے تصانیف، طباعت اور اشاعت و فروخت کی باتیں طے ہو رہی ہیں تو کبھی دور دراز کے کتب خانوں اور مصنفوں سے کتابیں حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ قلمی نسخے خریدتے ہیں اور اس قیمتی سرمایہ کے جمع ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اہل علم یا اہل ثروت کو ان کتب کے تحفے تحائف بھی دے رہے ہیں۔ بیماریوں نے عاجز کیا اور صحت حاصل کرنے کا خیال آیا تو کسی ایک صحت بخش مقام پر قیام کر رہے اور خاموشی و سکون سے زندگی گزارنے کے پروگرام بناتے ہیں۔ مگر جونہی تصانیف کی تیاری یا تلاش سند کا کی ضرورت آ پڑے تو طویل سفروں کے انتظامات میں لگ جاتے ہیں۔

ایک طرف طالب علموں کی ذہنی تربیت اور تدریس میں مصروف ہیں تو دوسری طرف کسب معیشت اور روزگار کی فراہمی میں ان کی سفارشیں کر رہے ہیں۔ اور زندگی کی دوڑ میں بھرپور حصہ لینے کے لئے انہیں مختلف طریقوں سے تیار کر رہے ہیں اور ان کی مدد پر کمربستہ ہیں۔ کبھی اہل مشرق کو ان کے جمود، تساہل اور جہالت پسندی پر برا بھلا کہا جا رہا ہے۔ تو کبھی اہل مغرب کی خباثت اور مکر کا دامن چاک کیا جا رہا ہے۔ کبھی اپنی شخصیت کے اسرار کھولے جا رہے ہیں تو کبھی اپنے مخالفین کی نفس پرستی اور کمینگی کی طرف لطیف اشارے کر رہے ہیں۔ اس تمام ہنگامے اور زندگی کی ان بیشمار و متنوع الجھنوں میں بھی ان خطوط کے ہر پڑھنے والے کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ ناسازگار ماحول، حوادث پیہم اور نارسائی بخت کے باوجود ایک عظیم شخصیت کس طرح اپنی ہستی کو سرا لجھاؤ اور ہر پیچ و خم سے باہر نکالتی ہے۔ اور کس طرح اپنی رفعت کا لوہا اہل عالم سے منواتی ہے۔ کارناموں کو سرانجام دینے کی دھن کس طرح اسے اپنے اطراف ایسے شاگردوں اور رفیقوں کے جمع کرنے میں مدد دیتی ہے۔ تاآنکہ وہی لگن وہ اوروں کے دل میں بھی پیدا کر دیتی ہے۔ یہاں پہنچکر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ علم و فن کی عظمت اور اس سے حقیقی افادہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سورج اپنے نور سے ایسی کئی کرنوں کو ضیا پاش کر دے کہ وہی آگے چل کر ماہتاب کہلائیں۔ پھر اس حاصل شدہ نور کے فیضان سے وہ اوروں کو استفادہ کرنے کا موقع دیں۔ چراغ سے چراغ جلنے کا یہی طریقہ تعلیم کا حقیقی طرز اور مقصد ہے۔

علمی مظاہر پر روشنی ڈالنے والے مکاتیب بظاہر خشک اور خالص کاروباری انداز کے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کے نہایت جاندار پہلو انہیں سے واضح ہوتے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے سے وہ کس طرح استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان لمحات کی قدر و قیمت اور ان میں صلاحیتوں کو روبہ عمل لانے سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ وہ اپنے مخاطب کی ذہنی افتاد اور اس کے جوہر کا بھی علم رکھتے ہیں جس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے شاگردوں کو لکھنے کے عجیب انداز میں ایک جگہ ان کی سستی پر طعنہ دیتے ہیں تو دوسری جگہ ان کے مضامین و کتب کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ کبھی یورپ والوں کے مقابلہ کے لئے مختلف طریقوں

سے انہیں الکسنلتیں ہیں تو کبھی اپنے علوم و آداب کی بلندی و نافادیت کا یقین ان کے دلوں میں پیدا کرتے ہیں۔ کبھی علمائے سلف کی بے مدعا طرز تحریر اور لایعنیانہ اسلوب نگارش پر جز بز ہو رہے ہیں تو کبھی ان کی انہیں غلطیوں سے مستشرقین کے فائدہ اٹھانے اور مغالطے دینے کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔

ان کے مکاتیب کے اس ضخیم حصے سے یہ پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا عروج ان کی تعلیمی و سماجی اصلاح اور ان کو ایک بلند کردار اور اعلیٰ نصب العین رکھنے والی ایک عظیم قوم بنانا ان کی زندگی کا پہلا مقصد تھا۔ اس سلسلے میں دو پہلو خاص طور پر ان کے پیش نظر تھے۔ ایک مسلمانوں کے نظام تعلیم اور ان کے مدارس کی اصلاح اور دوسرے مضامین اور کتب و رسائل کے ذریعہ اسلام کے محاسن اور اکابر اسلام کے محامد نئے طریق سے دنیا کے آگے پیش کرنا اس خصوص میں جن طریقوں سے انہوں نے اپنے ماحول میں جان بھری وہ ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ ان کی کوششوں کے جو نتائج ہمارے سامنے ہیں یہی وہ اس عظمت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ ان خطوں کے ایک ایک جملے میں ان کی روح سمائی ہوئی ہے۔ ان کی دھن اور ان کی لگن ہر لفظ سے ٹپکی پڑتی ہے۔ ان کے عکس ہیں وہ محض ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک مکمل ادارہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک مشین ہی نہیں بلکہ پورا ایک کارخانہ جس میں معمولی پرزوں سے لے کر بڑی سے بڑی قسم کی چیزیں ڈھل رہی ہیں۔ ان کی صیقل گری ہو رہی ہے۔ ان کی ترتیب اور پیچ و خم دیکھے جا رہے ہیں۔ تاکہ ایک مکمل اور کارآمد چیز دنیا کے سامنے پیش کی جا سکے۔ اور اس بناوٹ کے پورے دوران میں ان کی شخصیت ایک ماہر کاریگر ایک چابکدست صناع اور ایک ماہر دماغ، نکتہ شناس و تجربہ کار منتظم کی طرح ہر وقت اس کی نگرانی کر رہی ہے۔ اس طرح شبلی نے اپنی عظمت کے زور سے دو چیزیں تخلیق کیں۔ ایک شاگرد اور دوسری کتابیں اور دونوں جاندار۔

شاعروں کو چھوڑ بھی دیں تو دنیا میں ایسے کتنے ہیں جو اپنی زندگی کے حالات کے اظہار میں نصیب پر راضی اور حاصل پر مطمئن دکھائی دیں۔ شبلی تو فطری شاعر تھے ان کی شاعرانہ جولانیوں کو نظر انداز بھی کر دیں تو انہیں اپنی بدنصیبی، نامرادی، اور مقاصد حیات میں ناکامی کا شروع سے احساس تھا اور شدید تھا۔ اس کی وجوہات بھی تھیں۔ ماں کی موت

الشماع

سے ان پیچیدگیوں کا آغاز ہوا۔ متمول گھرانے کا فرد ہو تو بھی ماں کی تنہی حیثیت کے باعث اور زیادہ ترخود دار و حساس بلکہ فطری طبیعت کی وجہ سے اپنے آلام میں خود ہی اضافہ کا موجب ہوا۔ ان کی طبیعت کی یہ افتاد زندگی کے اور میدانوں میں بھی ان کے لئے مشکلات کا باعث بنتی رہی۔ مگر جیسا کہ خود انہیں اعتراف تھا کہ وہ اپنی فطرت سے مجبور تھے۔ بے وجہ خدا کی نعمتوں سے شادکام ہونے والوں اور بے سبب سماج میں مال و دولت کے علاوہ عزت و شہرت و اقتدار کے بلند ترین زینوں پر پہنچنے والوں پر انہوں نے کبھی رشک نہیں کیا۔ بلکہ اس کا انفعالی اثر یہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ان کی تحریریں گواہ ہیں۔ کہ ان کی ضد میں پختگی، احساس خودداری میں اضافہ اور راسخ العقیدگی میں کمال حاصل ہونے لگا۔ اس سے جہاں ان کو بعض تکلیفیں پہنچیں اور زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے خصوصاً کسب معیشت اور خاندانی معاملات میں ـــ وہیں ان کی علمی جد و جہد اور تحقیق پسندی کو بڑا فائدہ پہنچا۔ عامیانہ مضمون نویسی سے تنفر بڑھ گیا معمولی دلائل و نکات پر رضامندی سے گریز کرنے لگے۔ اور مخالفین کے دلائل و براہین سے کسی قسم کا سمجھوتہ ناممکن ہو گیا۔ ظاہر ہے محققانہ و عالمانہ شان کا بڑا حصہ اپنے نقاط نظر کی اہمیت کے احساس اور ان کے اصرار پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ شبلی کی ذات سے ثابت ہوتا ہے کہ زمانہ اور زندگی کی کوتاہ دستیاں بعض اوقات عظمت کے ان محلوں میں کیسے نقش و نگار، گل بوٹے اور پچی کاری کے حسین نمونے بنا دیتی ہیں۔ یہی بات تھی کہ شبلی کے معاملے میں بھی ان کے حوادث، ان کی ناکامیاں اور ایک نصب العینی زندگی سے ان کی دوری نے ان کے لوہے کو فولاد میں تبدیل کیا۔ ان کے آب نوشیں کو تندی کی صہبا عطا کی اور ان بے تابیوں کو بجلی کا لباس پہنایا۔

مولانا کی زندگی کی نوعیت بھی قابل مطالعہ ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ وہ اپنے ہر جذبے اور ہر خیال کو لگے بندھے طریقے سے نہیں بلکہ بالکل واضح اور بے ریا طریقہ سے لکھ جاتے ہیں۔ اگر یہ خطوط نہ چھپ سکتے تو اردو زبان، طرز ادا، جذبات نگاری اور صداقت و خلوص کی ایک اہم دستاویز سے محروم رہ جاتی۔ اور ساتھ ہی شبلی جیسے عالم کی زندگی واضح طور پر ہمارے سامنے نہ آ سکتی۔ جہاں مولویوں کو ان کی بے عقلی اور تعصب پ

ضد پر لعن طعن کیا ہے وہیں بعض اوقات کسی کو اس لئے مولوی کی شکل بنانے پر زور دینے کی ترغیب دی ہے کہ اس سے بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ابتداء پردے کے سخت موئیدین میں رہے۔ پھر ایک خاص ماحول کے اثرات کے تحت وہ روایاتی پردے کے مخالفین میں شامل ہو گئے۔ جب آزاد خیالی آئی اور عورتوں کی سماجی حیثیت بدل دینے کے خیالات پیدا ہوئے تو اس وقت بھی ندوہ کے بعض معاملات میں عورتوں کی شرکت پر اس لئے راضی نہ ہو سکے کہ مولویوں اور کٹر خیال لوگوں کی وجہ سے ایسے جھکا اقدامات بعض مفید تحریکوں کو فوراً برباد کر دیتے۔ غرض موقع شناسی اور مصلحت بینی نے بعض اوقات شبلی جیسے اکمل کھرے انسان کو بھی پابہ زنجیر کیا۔ مگر ایسے امور ان کی زندگی میں کم آئے اور وہ بھی خاص حالات اور خاص اشخاص کی وجہ سے آئے۔

ان کی زندگی کا ایک نسبتاً دلچسپ پہلو ان کے ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے بمبئی کی دو دست خواتین کے نام لکھے۔ ان خطوط کے باعث بعض ادبی رومان پسندوں کو مسالہ ہاتھ آ گیا۔ اس سلسلہ میں بعض کتابیں لکھی گئیں۔ اور رسائل میں کئی مضامین لکھے گئے جن میں شبلی کی حیات معاشقہ ترتیب دی گئی۔ مختلف طبیعتوں نے ان کی زندگی کے اس دور سے مختلف نتیجے نکالے۔ داستانیں بنیں، ان میں گل کاریاں کی گئیں۔ رنگ دلوں سے انہیں مالا مال کیا گیا۔ اس باب میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ شبلی کی یہ آخری بدنصیبی تھی جس کے اثر سے وہ مرنے کے بعد بھی نہ بچ سکے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے شبلی فطری شاعر تھے۔ لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت میں ان کا بچپن اور ابتدائی شباب گزرا۔ اس دور سے سخن سنجی کی بہت سی تصور حیات اور روایتیں انہوں نے حاصل کریں جو عمر کے آخری حصہ تک ان سے جدا نہ ہو سکیں۔ جب کبھی علمی کاموں اور مذہبی امور میں منہمک رہتے یہ جذبہ دب جاتا۔ لیکن بیچ بیچ میں ایسے ماحول نصیب ہوتے کہ جن میں یہ دبی چنگاریاں پھر سلگ اٹھتیں۔ حیدرآباد کا ماحول ملا — داغ اور امیر کی صحبتیں ملیں۔ پرانا ذوق نئے جوش سے نمودار ہوا۔ علی گڑھ میں یہ جذبہ بین بین رہا۔ ندوہ والا پھر زاہد اور مولوی بن گئے۔ اور اصل یہ ہے کہ ندوہ کے کاموں کی سنجیدگی اور وہاں کا ماحول کسی بڑے سے بڑے شاعر کو بھی وہی کرنے پر مجبور کرتا جس پر شبلی مجبور تھے۔ مگر اس سے ان کی فطری صلاحیتیں ست تو نہیں سکتی تھیں اور شبلی جب سازگار ماحول پاتے ان صلاحیتوں کو زندہ کر لیتے تھے۔ اس سے ان کی اس قدرت کا بھی پتہ چلتا ہے جو ان کو بیک وقت کئی معبودوں کی پرستش کرنے پر حاصل تھی۔ ان کے اس ملکہ کا اعلیٰ ترین ظہور اس وقت ہوا جب انہیں بمبئی کا ماحول ملا۔ یہ مختصر دور اُن کی شاعری اور ادبی نگارشات — دونوں اعتبار سے اتنا زرّین ہے کہ اردو ادب کو اس دور کے مکاتیب نے ایک بیش قیمت عطیہ ورثہ میں دیا ہے۔

وادیٔ گل کے مکاتیب سے حسن ظنی کے ماہروں کو بڑا مواد ہاتھ آیا۔ ہر ادب و سماج میں بڑی شخصیتوں کے بارے میں ایسا ہی کچھ ہوتا آیا ہے۔ سوانح نگاروں اور تنقید پسندوں کو بڑے آدمیوں کے دلچسپ واقعات محبوب مشاغل اور نگاہ سے بچائے ہوئے شوخیٔ دل کے ان بیتے ہوئے لمحات کی تلاش ہوتی ہے جن میں پاسبان عقل کی گرفت ڈھیلی ہو کر وہ دونوں تخیل کی زد میں آ جاتے ہیں۔ یہی حال وادیٔ گل میں شبلی کا ہوا۔ اور اس شاعر نے ایسے خیال کاروں کی اڑان کے لئے اتفاق سے دو پر بھی مہیا کر دیے یعنی "بوئے گل" اور "دستۂ گل"

حالات خواہ کچھ ہوں ہمیں ان تحریروں میں شبلی کی اعلیٰ پایہ شاعرانہ صلاحیتوں کے علاوہ ان کے خلوص، ایثار، آزاد منشی، خودداری، اپنی اہمیت کے احساس اور جذبۂ شوق و عمل کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ وہ دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرتے اور کھلے دل سے کرتے۔ اس کے کسی خیالی عیب یا نقص کی طرف اشارہ کرتے تو کوئی چیز لگی لپٹی نہ رکھتے۔ مثلاً جہاں عطیہ بیگم کی بہت سی خوبیوں کا ذکر بار بار کیا ہے کہ ان میں مردانہ صلاحیتیں ہیں۔ سیاسیات کی ماہر ہیں۔ بہترین مقرر ہیں۔ عمدہ انشا پرداز ہیں، عورتوں کی ترقی و فلاح کی علمبردار ہیں وغیرہ وغیرہ۔ وہیں موسیقی سے ناواقفیت پر ان کا مذاق اڑایا ہے۔ وہ تو وہ سارے اہل بمبئی کو علم موسیقی سے ناواقف اور "محض جاہل" ہونے کا الزام لگایا ہے ایک اور جگہ لکھا ہے: "تم شاید اس کو حسن طلب سمجھتی ہو اور میں شہنشاہ سے کم اس قسم کا خیال ننگ سمجھتا ہوں۔" محاورے اور روزمرہ کے غلط استعمال پر بار بار ٹوکا ہے۔ بلکہ بے محل استعمال کو "خلاف تہذیب"، "رکیک" اور "بازاری" کے الفاظ سے بھی

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

سحر انصاری

فیصلہ

تم بھی ضدّی
میں بھی سرکش

میل ہمارا دوبھر ہے گا

میرے اور تمہارے حق میں

اپنے اپنے عہدِ وفا کو
بھول جانا ہی بہتر ہوگا۔

نقالی

افلاطون بڑا دانا تھا
شعر کو نقالی کہتا تھا

میں کمرے کی میز پہ تنہا
نظموں غزلوں کی کاپی پر
سر رکھے یہ سوچ رہا ہوں
زلف کی خوشبو پیار کا جادو
دل کی دھڑکن آنکھ کے آنسو
کیا یہ سب کچھ نقالی ہے

مہر اظہر

بگولے

شب کے سینے پہ سلگ اٹھا ہے مہتاب کا داغ
ذرّہ ذرّہ مرا خاموش تماشائی ہے
بجھ گئے بزمِ تمنّا کے ضیاء پاش دیے
پھر وہی رات ہے میں ہوں وہی تنہائی ہے

کس کو معلوم کہ اک خندۂ لب کی خاطر
درد کی آگ میں جلنے کی سزا پائی ہے
میں نے چھیڑا جو مسرت کا ربابِ رنگیں
تلخیِ غم مرے ساغر میں سمٹ آئی ہے

محوِ آرائشِ گلشن ہوں میں کب سے لیکن
چشمِ بے خواب میں میری گلِ تازہ کے بجائے
خاک آلودہ بگولے ہیں فضا میں رقصاں

شبی فاروقی

خلش

اس سے پہلے کہ جھوٹ اور سچ میں
کوئی بھی فاصلہ نہیں رہتا
اس سے پہلے کہ سیلِ نفرت میں
یوں سفینہ خیال کا بہتا

اس سے پہلے کہ عہد و پیماں کی
کچّی دیواریں آپ ڈھ جاتیں
خواب آ گیں جھکی جھکی آنکھیں
تیرے باطن کا جھوٹ کہہ جاتیں

اس سے پہلے کہ تیری چاہت کا
دفعتاً اِعتبار کھو جاتا
پیرہن تیری پارسائی کا
بن چھوئے تار تار ہو جاتا

اِس سے پہلے کہ راہِ الفت میں
دو قدم چل کے تو بچھڑ جاتی
آس کے بن کھلے شگوفوں پر
ناامیدی کی اوس پڑ جاتی

اِس سے پہلے کہ یہ گھڑی آتی
اے سراپا بہارِ محبوبی
تیری زلف و مژہ کے سائے میں
اپنے خوابوں کے جال بُن لیتا
تیرے شاداب جسم سے میں بھی
اپنے حصّے کے پھول چُن لیتا

پہلے کھلتا اگر وفا کا بھرم
قصّۂ شوق مختصر ہوتا
کوبکو یوں نہ ہوتا آوارہ
آج اپنا بھی کوئی گھر ہوتا

○

جلوۂ اوّل کی ساعت کب پلٹ کر آئے ہے
ورنہ جو لمحہ ہے اپنے آپ کو دہرائے ہے

اپنا اپنا دائرہ ہے اپنی اپنی رہگزر
منزلِ گم گشتگاں میں کون کس کو پائے ہے

کس سے پہچانی گئی ہے وقت کے قدموں کی چاپ
ورنہ آہٹ بیتے لمحوں کی بھی اکثر آئے ہے

زہرہ و پرویں کہاں سے لائیں اتنا حوصلہ
زندگی کو زندگی ہی آئنہ دکھلائے ہے

فکر کے ہر موڑ پر ملتی ہے اک دنیا نئی
لیکن انساں خود غبارِ راہ میں کھو جائے ہے

دیکھنا نادیدہ جہانوں کا نہ ہو کوئی سفیر
کون سوتی رات میں زنجیرِ در کھڑکائے ہے

صبح کی مانگ اپنی کرنوں سے بھرے ہے کس لئے
مہرِ تاباں کب کسی کو راز یہ بتلائے ہے

اک وہ آنسو جس کو سعیِ رائیگانِ غم کہیں
ان کے دامن تک پہنچ کر جانے کیوں اترائے ہے

حرمت اپنی فطرتِ خارا گدازی کی قسم
تیشۂ فن سے کبھی جوئے شیر لائی جائے ہے

خورشید احمد جامی

○

کیا جانئے کیا شہر کی راتوں نے کہا ہے
دل دردِ محبت کی طرح جاگ رہا ہے

صدیوں کی سلگتی ہوئی سانسوں کا فسانہ
حالات نے ہر شخص کے چہرے پہ لکھا ہے

سو بار بھی چاہے تو کوئی ۔ موت نہ آئے
اس دور میں شاید یہی جینے کی سزا ہے

اس طرح گزرتا ہے کبھی یاد کا سایہ
جیسے کوئی ٹوٹا ہوا پیمانِ وفا ہے

آنکھوں میں لئے ایک پُر اسرار اداسی
الفاظ کے شیشوں سے کوئی جھانک رہا ہے

ہر سوچ مری جا کے رکی ہے ترے گھر پہ
ہر غم کو مرے آج ترے غم کا پتا ہے

بے برگ و خزاں دیدہ درختوں کی خموشی
جیسے کسی بیتے ہوئے موسم کی صدا ہے

دیکھا ہے کڑی دھوپ میں جلتا ہوا صحرا
یوں ہم سے ہمارا ہی تعارف تو ہوا ہے

ٹھہری ہوئی اس رات کے تاریک کنویں میں
کہتے ہیں کہ اک چاند امیدوں کا چھپا ہے

دریا کی روانی تو بہت تیز ہے جامی
اب ۔ کس کے لئے کوئی کنارے پہ کھڑا ۔

قمر اقبال

○

ہر گلی آج ہے سنسان مرے دل کی طرح
ہے مرا شہر بھی ویران مرے دل کی طرح

کوبہ کو چیختے پھرتے ہیں ہوا کے جھونکے
ہے فضاؤں میں بھی ہیجان مرے دل کی طرح

منتظر ہیں کہ ملے لمس ترے قدموں کا
پتھروں میں بھی ہیں ارمان مرے دل کی طرح

اس کی آنکھوں میں بھی لہروں کی وہی ہلچل ہے
اس کے دل میں بھی ہے طوفان مرے دل کی طرح

میں کہ دیوانہ نہیں کوئی مگر بستی میں
چاک ہے کس کا گریبان مرے دل کی طرح

کسی سورج کی تپش ہے نہ کسی جسم کی آنچ
مری تنہائی ہے بے جان مرے دل کی طرح

سنگ باری کو بھی سمجھے ہے قمر گل باری
دل نہ ہوگا کوئی نادان مرے دل کی طرح

مجیب خیرآبادی

○

محفلِ تشنہ لباں کو جانِ میخانہ کہیں
ہم بہ طرزِ نو غمِ گیتی کا افسانہ کہیں
یہ غلط بخشی بہت مہنگی پڑے گی ایک دن
اور اب کیا تجھ سے ہم اے پیرِ میخانہ کہیں
دوستو اس شہر میں اب کوئی بھی اپنا نہیں
ہائے کس دل سے بھری بستی کو ویرانہ کہیں
ہم نے جب دیکھا مجسم تشنگی پایا انہیں
آپ کہتے ہیں تو اِن آنکھوں کو پیمانہ کہیں
سرخوشی کیسی کہاں کی لذتِ کام و دہن
کیا سرِ مقتل حدیثِ جام و پیمانہ کہیں
واعظ و ناصح بپاسِ مصلحت چپ ہی گئے
ہم وہی باتیں بہ فیضِ خاصِ رندانہ کہیں
پھر کسی کافر ادا کو سونپ دیں ایمان و جاں
پھر کسی بیدادگر سے اس کا افسانہ کہیں
ہم فریبِ کم نگاہی تو نہ کھائیں گے مجیب
اب خرد والے اگر کہتے ہیں دیوانہ کہیں

بدر جعفری جے پوری

○

یوں کیا تم نے پائمال ہمیں
پھر نہ خوش آئے ماہ و سال ہمیں

آگہی سے الٰہی دور ہی رکھ
اس مصیبت میں تو نہ ڈال ہمیں

ہم تو اپنی گزار ہی لیں گے
آپ کا ہے مگر خیال ہمیں

یونہی روٹھے تھے، کوئی بات نہیں
آگیا تھا بس اک خیال ہمیں

بن پڑے تجھ سے جو بھی لا دیدے
کرنا آتا نہیں سوال ہمیں

روز مرتے ہیں روز جیتے ہیں
زندہ رہنے میں ہے کمال ہمیں

ک اُڑانے کا اب گلہ کیسا
اور محفل سے تو نکال ہمیں

اولیں وہ گناہ آدم کا
آج بھی تو ہے انفعال ہمیں

زندگی کو لگائیں کیا منہ ہم
اس کا معلوم ہے مآل ہمیں

نرمانِ شبِ الم۔ تارو!
بدر کا تو سناؤ حال ہمیں۔

مقبول قریشی

○

اب مرے سپنوں میں آوارہ خرامی کیسی
میں وہی ہوں جسے محفل سے اٹھایا تھا کبھی

چاند گہنایا فلک پر تو مجھے یاد آیا
میں تری بزم میں ایک شان سے آیا تھا کبھی

تو مرے دیدۂ نمناک سے دامن نہ بچا
میں تہِ سیلِ حوادث ترا سایا تھا کبھی

وقت نے روند دیا موجۂ خود سر کا غرور
تو تو بھولے سے بھی ساحل پہ نہ آیا تھا کبھی

آج آمادۂ غارت گری دہر ہے کیوں
تو نے اس دشت کو گلزار بنایا تھا کبھی

کیف اسعدی

○

لوگ اندیشۂ رسوائی سے گھبراتے ہیں
پھر بھی نظروں کے طلسمات میں گھر جاتے ہیں

آرزو جن کی زمانے سے تھی اے دیدۂ شوق
آج وہ سامنے آتے ہوئے شرماتے ہیں

ہم کو منظور رہے الفت میں نہیں غم اس کا
آپ دیوانہ سمجھتے ہیں تو بن جاتے ہیں

جب محبت کو ہوا کرتی ہے منزل کی تلاش
آپ کے نقشِ قدم اور ابھر آتے ہیں

آپ کی بزم میں ہم کیف کے ہمراہ کبھی
آج کے بعد نہ آئیں گے قسم کھاتے ہیں

محمد انور خلیل

○

کھل اٹھے ہیں عنایتوں کے کنول
اے دلِ زار آج تو بھی سنبھل

فصلِ گل اور گھٹی گھٹی یہ فضا
پھول بے چین ہیں صبا بے کل

بے ثباتی ثبات کا پرتو
بے خیالی خیال کا آنچل

لمحہ لمحہ اتر چلی ہے رات
شاید اس آنکھ سے ڈھلا کاجل

آج کس کا تھا انتظار خلیل
آج اس درجہ کیوں رہے بے کل

سعادت نظیر

○

تذکرہ حادثوں کا ہو جائے
کارواں پھر کہیں نہ سو جائے

کب گوارا ہے میری غیرت کو
کہ ترا جلوہ عام ہو جائے

دل سے اٹھتی رہے گی موجِ نشاط
کیا ہوا، غم اگر ڈبو جائے

کیا قیامت ہے دور کی آواز
پھر مرا دل کہیں نہ کھو جائے

ضبطِ غم سے ہے روشنی اے دل
کہیں دنیا دھواں نہ ہو جائے

کاش! منزل سے دے کوئی آواز
کہ مسافر کوئی نہ کھو جائے

غم کی شدت وہی رہے گی نظیر
چاہے دل میں خوشی سمو جائے

رضی عزیزی

مداوا

• امی اور ابا کو یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ شادی کے بعد اس کی جدائی کیسے برداشت ہوگی۔ وہ ایک مثالی گھر داماد کی تلاش میں تھے۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ پیام برائے نام ہی آ رہے تھے۔ اور پھر ہوا یوں کہ — جیسے لڑکے والے اس کے وجود سے ہی لاعلم ہو گئے ہوں۔ یہ بڑی غیر متوقع بات تھی کہ مثالی گھر داماد ملنے کی توقع ہی ختم ہو گئی۔
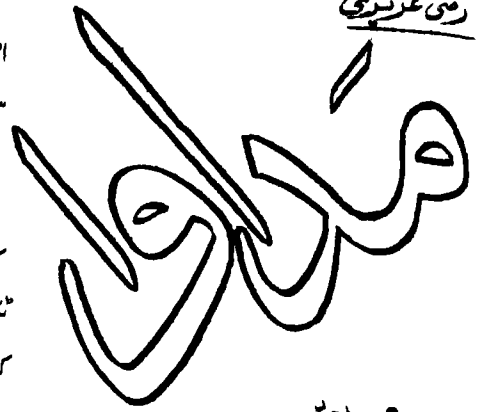
اسے ہوش آ چکا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان گنت کھنکھجورے اور بچھو اس کے تمام جسم سے چمٹ گئے ہوں۔ نس نس میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور وہ نچلا ہونٹ دبا کر اس ناقابل برداشت تکلیف کو روک بھی تو نہ سکتی تھی۔ مگر اسے یوں لگا جیسے منوں بوجھ سر سے اتر گیا ہو۔

ماضی اپنی تمام تر تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ اس کی نظروں کے سامنے بکھرنے لگا۔ اسے وہ دن یاد آئے جب وہ بنی سنوری، صاف ستھری گڑیا سی بنی ہوئی ٹکر ٹکر اپنے نصف درجن بہن بھائیوں اور پڑوس کے بچوں کو کوٹھی کے وسیع لان میں کدکڑے مارتی دیکھتی، اور پھر دالان میں بیٹھی ہوئی دادی اماں جنہیں سروتے اور پاندان سے کسی لمحہ بھی فرصت ملتی بڑبڑاتیں۔

"کم بختوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اسکول چلے جاتے ہیں تو امن رہتا ہے۔ اب کان پڑی آواز تو سنائی دے جائے۔ اور تو اور وہ لونڈھا بھی سینگ کٹا کے بچھڑوں میں جا شامل ہوتی۔"

اور پھر دبے قدموں وہ بھی اس جنڈال چوکڑی میں جا ملتی۔ مگر جلد ہی اسے محسوس ہو جاتا کہ اس سے امتیازی سلوک برتا جا رہا ہے۔ آنکھ مچولی میں اگر کبھی پکڑی بھی جاتی تو فوراً ہی اس کی باری پر دوسرا کوئی پکڑا جاتا۔ اور اسے یوں لگتا جیسے پکڑے جانے والا خود بخود سامنے آ گیا ہو۔

اور پھر امی کی ممتا بھری آواز گونجتی۔

"غزالہ بیٹی —— یہاں آ جاؤ رانی —— تمہارے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔" اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے کے بجائے وہ خود آن دھمکتیں۔ اس کی بلائیں لیتیں اور پھر یوں ہاتھ پکڑ کر لے جاتیں جیسے وہ چھوئی موئی ہو یا کوئی بہت ہی نازک کھلونا۔ پھر فوراً ہی دادی اماں بلائیں لیتیں۔ اور نہ جانے ہونٹوں میں کیا کیا بدبداتیں۔ تلے اوپر کے دو بھائیوں اور تین بہنوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ سارے گھر کا تنہا مرکز تھی۔ اور ہر گھڑی ہر ایک کو یہی خدشہ لگا رہتا جیسے وہ اب مری اور تب مری —— دنیا بھر کے تعویذ گنڈے اس کے گلے اور بازوؤں میں بندھے رہتے۔ دن بھر میں کوئی چار بار نظر اتاری جاتی۔ اور ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بقیہ بہن بھائی ذہن سے اتر گئے۔ انہیں کوئی بھی نہ پوچھتا۔ بہت ہوتا تو کوسنوں اور برا بھلا کہہ کر یاد کر لیتے جاتے۔ اور کبھی کبھی تو آپس میں اس بری طرح لڑتے کہ کپڑے پھٹ جاتے اور ایک آدھ لہولہان بھی ہو جاتا۔ ڈانٹ پھٹکار پڑتی اور پٹائی بھی مگر اس سے لڑنے جھگڑنے کی کوئی بھی جرأت نہ کر سکا۔ دادی اماں کو تو سو فیصد یقین تھا کہ ان کی اتنی لمبی عمر کی عبادت اور دعائیں رنگ لائی ہیں اور خدا نے ایک حور ان کے گھر میں بھیج دی ہے۔

اکثر اسے باہر والوں کی نظروں سے دور رکھا جاتا۔ اور اگر اتفاق سے سامنا ہو جاتا تو مہمانوں کے جانے کے بعد جلدی جلدی اس کی نظر اتاری جاتی اور جب تک مرچیں پوری طرح جل نہ جاتیں سب کے چہروں پر پرچھائیاں اڑتی رہتیں۔ اور یہ تو سارے خاندان بلکہ جن لوگوں نے بھی دیکھا تھا ان سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ حسن کے لحاظ سے وہ لاکھوں میں ایک ہے۔ اس چاؤ چونچلے اور انتہائی ناز برداری نے اسے گھر کے دوسرے بچوں سے ممتاز کر دیا تھا اور یوں لگتا جیسے وہ اس ماحول سے الگ کوئی فرد ہو۔ آبا میاں کی حالت یہ تھی کہ اول تو دورے پر جانے سے گریز کرتے اور اگر بحالتِ مجبوری جانا پڑتا تو واپسی پر سیدھے اس کو ڈھونڈنے آتے اور بوسوں کی بارش کر دیتے۔ شروع شروع تو دوسرے بہن بھائی جلتے' حسد کرتے مگر پھر رفتہ رفتہ عادی ہو گئے۔ اور ان کے لئے بھی وہ قابلِ احترام اور قابلِ محبت ہستی بن گئی۔

اسے یاد آیا حیدر آباد سے خالہ جان آئی ہوئی تھیں۔ اور بچوں کے کھیل کود اور شیطانیاں عروج پر تھیں۔ خالہ جان کے بچوں میں انیس بہت ہی نٹ کھٹ اور شرارتی تھا۔ ایک دن انیس نے اس کے ساتھ کھیلنے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ پہلے تو اس نے نرمی سے کہا مگر مزید انکار کے بعد اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اس نے غصہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور چیخ کر کہا "نہیں کھیلتی میں تمہارے ساتھ"۔ کہہ جو دیا — " اندر سے دادی اماں نے آواز دی۔

"انیس — جان مرے — کیوں کھڑا ہے غزالہ کے پاس — چل ادھر آ —"

انیس کو ایک دم غصہ آگیا اور اس نے اس کی دودھیا کلائی دبوچ کر دانت گڑو دیئے۔ تکلیف کی شدت سے وہ بے اختیار چیخ کر رو پڑی۔ سارے گھر میں طوفان آگیا۔ غزالہ بٹیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ یہ کیسی انہونی ہوئی تھی۔

دیکھتے دیکھتے اس کی کلائی پر دانتوں کے ننھے ننھے نشان خون سے بھر گئے۔ اب انیس غریب نے اتنے زور سے کاٹا بھی تو نہ تھا مگر اسے اس گڑیا کی نزاکت کا کیا علم تھا۔ اور اس دن خود خالہ جان نے انیس کو بری طرح مارا تھا۔ آنا کہ رات بھر اسے بخار چڑھا رہا۔ اور اس کے لئے ڈاکٹر بدلا گیا۔ اسے کلائی کی یہ تکلیف انوکھی سی لگی تھی۔ ننھے منے دانتوں کے نشانوں کا یہ سلسلہ اس کی کلائی پر وقت کے ساتھ ساتھ دھندلا ہونے کی بجائے گہرا اور چوڑا ہوتا گیا۔ اسے یاد آیا' انیس پڑھنے لندن گیا تھا اور پھر وہیں کا ہو رہا۔ اس نے شادی نہ کی تھی اور نہ کرنے کا ارادہ تھا۔ نہ جانے کیوں ؟ —

وہ وقت پر لگا کر اڑ گیا۔ ایک ایک کر کے سب بہنوں اور بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ اور اب اس کی پرستش کرنے والے بڑی تعداد میں ہو گئے تھے۔ میٹرک تک اس نے گھر پر ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ مس مارتھا اور مولانا قدوس اسے بڑے پیار سے پڑھاتے تھے۔ شاید وہ اسے جی وہ گھر بیٹھ کر ہی پاس کرتی مگر خود اس نے کالج میں داخل ہونے کو کہا۔ اور اب تک اس کی بات ہی کونسی ٹالی گئی تھی جو یہ ضد پوری نہ کی جاتی۔

آئینہ میں اپنا سراپا دیکھ کر وہ خود حیران رہ جاتی۔ اور جب وہ پہلی بار کالج گئی اس دن تو عجیب و غریب ٹونے ٹوٹکوں سے بری طرح اکتا گئی — شروع شروع تو کالج میں سب اسے دیکھتے جیسے کسی دوسری دنیا سے آئی ہو۔ اور اسے بڑا عجیب سا لگا۔ مگر مختصر سے عرصہ ہی میں پرنسپل' اسٹاف اور کالج کی تمام لڑکیوں کی محبوب ہستی بن گئی۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی، کالج کی تیز طرار اور سینئر لڑکیاں بھی اسے باجی کہتیں۔ اور اس سے مخاطب ہوتے وقت اس کا صد درجہ احترام ملحوظ رکھا جاتا۔ اب اس کے چہرے پر صد درجہ حسن کے ساتھ تقدس کا ایسا غازہ چھایا رہتا کہ مخاطب نظر ملا کر بات نہ کر سکتا —

یہ کالج کا دور بھی پلک جھپکتے گزر گیا۔ وہ فرسٹ ڈویژن میں بی اے پاس کر چکی تھی۔ دادی اماں اس کے ہاتھ پیلے دیکھنے کی حسرت لئے اللہ میاں کے پاس سدھار چکی تھیں۔ اور امی جان اور آبا میاں کو ہر وقت بس یہی فکر کھائے جاتی کہ شادی کے بعد اس کی جدائی کیسے برداشت ہو سکے گی۔ وہ ہر طرح سے ایک مثالی گھر داماد کی تلاش میں تھے۔ برس چھٹے مہینے اس کی دوسری بہنیں ماں باپ کے پاس آتیں۔ اور سسرال اور شوہر کے دکھڑے روتیں۔ اور جب شوہر لینے آتے تو ہنسی خوشی اپنے گھروں کو چلی جاتیں۔ کبھی کبھی بھائی بھی رخصت لے کر آ جاتے اور مہمانوں کی طرح رہ کر واپس ہو جاتے۔

اب یہ کیسی عجیب بات تھی کہ اتنی اونچا اور تعلیم یافتہ سب کا میرا وقت معیار لئے بیٹھے تھے اور پیغام بہت تمام ہی آ رہے تھے۔ یہ ایسی خبر تھی جو بات تھی کہ اچھا گھر داماد ملنے کی توقع ختم ہوگئی۔ اور پھر یوں ہوا کہ جیسے لڑکے والے اس کے وجود ہی سے لاعلم ہوگئے ہیں۔ اور پھر جب سلیم کا رشتہ آیا تو جھٹ منظور کر لیا گیا۔

اس کی شادی اس قدر دھوم سے ہوئی کہ گو خستہ سارے ریکارڈ ٹوٹ ہو گئے۔ اور جب وہ دلہن بنی حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی سلیم دبے قدموں کمرے میں آیا اور جب گھونگھٹ اٹھا کر دیکھا تو پانچ منٹ تک بے حس و حرکت بس دیکھتا رہ گیا۔ یوں لگا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اس کا حلق خشک ہو گیا تھا اور الفاظ اس کی زبان سے ادا نہ ہو پائے۔ وہ سلیم اسے کتنی دیر اس کے کتنے ہی قصیدے پڑھتا رہا۔

"غزالہ میں تمہارا غلام ہوں۔ کاش تمہارے قابل ہوتا۔ میں اپنی قسمت پر جتنا فخر کروں کم ہے — تم — تم — "اور الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

وقت کی تیز رفتاری میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ اس یکسانیت سے اکتا چکی تھی۔ ماں، باپ، بہن، بھائی، استاد، دوست اور شوہر کسی میں کوئی بھی فرق نہ تھا۔ پھر سلیم کا جب تبادلہ ہوا تو اس نے خود ہی ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ شاید اس پنجرہ سے نکل کر ماحول بدل جائے۔ مگر یہاں بھی کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ وہ ہر بات سے بے نیاز ہو کر ضرورت سے زیادہ چڑچڑی ہو گئی۔ اس کے برخلاف سلیم کی انکساری اور خاکساری میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ تو بس یوں تھا جیسے کوئی پالتو کتا۔ اسے ٹھوکر لگاؤ، لات مارو، ڈانٹو، یا ہڈی ڈالو ہر حال میں دُم ہلائے گا۔

نرس کے قدموں کی ہلکی چاپ سن کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ چند لمحے کھڑی رہی۔ پھر اسے سوتا دیکھ کر دبے قدموں واپس چلی گئی۔ ذہن ماضی کی یادوں سے نکل کر حال میں آ چکا تھا اور اسے یاد آیا کہ اس دن مہترانی بڑی اجڑی اجڑی اور اداس سی آئی تھی۔ آنکھیں سوج رہی تھیں۔ اور چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر اس نے مہترانی سے پوچھا تھا کہ کیا بات ہے۔ اور جھجکتے جھجکتے مہترانی نے اسے بتایا تھا کہ رات اس کے خاوند نے اسے بُری طرح مارا ہے۔ اور یہ

کہ وہ اکثر اسے مارتا اور ڈانٹتا رہتا ہے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ رات ذرا زیادہ مارا تھا اس لئے نیل پڑ گئے ہیں۔

"مگر آخر کیوں؟" اس کے لہجہ میں حیرت تھی۔

"بی بی جی — کہتا ہے تم بدصورت ہو —" یہ کہتے کہتے کرب کی وجہ سے اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

بس اسی دوپہر اسے اتنا یاد ہے کہ وہ نائیلون کے دوپٹہ کو اچھی طرح لپیٹ کر باورچی خانہ میں گئی تھی۔ اور پھر اس نے اپنی چیخیں سنی تھیں اور پھر سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ اٹھا اور چہرہ پر ٹک گیا۔ پٹیاں ہی پٹیاں بندھی تھیں۔ اس نے ٹٹولا۔ نچلا ہونٹ غائب تھا اور اس نے ایک آسودہ سانس لیا۔ اچانک نظر کلائی کے نشانوں پر پڑی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"غزالہ — غزالہ — تم ہوش میں آ گئیں — خدا کا شکر ہے"
سلیم نہ جانے کب آ گئے تھے۔ ان کے لہجہ میں بلا کا پیار تھا۔ سلیم کو دیکھ کر اس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ — آپ — دیکھئے اب تو میں بدصورت ہو گئی ہوں نا۔"

تلخیص و ترجمہ: ایوب جوہر — بنگالی کہانی

اور پھر اس نے ——
ان چھوٹے چھوٹے گندے لڑکوں
کی طرف دیکھا جو اپنی ٹوکری اٹھائے
صاحب کے گرد کھڑے تھے تو اُسے
یوں محسوس ہوا ——
جیسے یہ سارے گندے لڑکے اس
کے اپنے بچے ہیں۔ ——
اپنے جگر گوشے ——
اور اس خیال کے آتے ہی اس کے
لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

بازار کے داخلی دروازے پر جونہی سفر علی کھڑا ہوا ٹھیک اسی لمحہ ایک سفید پوش بابو نما اس کے سامنے سے گزر ہوا جس نے بازار کے اندر داخل ہوتے ہوئے سفر علی پر ایک حقارت کی نظر ڈالی اور ایک دکان کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن سفر علی اس حقارت بھری نگاہ سے بے نیاز نہ جانے کیا سوچ رہا۔ حالانکہ یہ بات اس کی عادت کے خلاف تھی کہ کوئی نووارد بازار کے اندر داخل ہو اور اس کی نگاہیں اس کا جائزہ نہ لیں۔ وہ تو اسی وقت چونکا تھا جب ایک بھاری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اور جب اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اسے کچھ ہی دور پر بھیڑ بھاڑ کے بیچ میں ایک نہایت ہی قیمتی سوٹ میں ملبوس صاحب نما بابو اپنی بلند آواز سے مول تول کرتا نظر آیا۔

اسے پہلی دفعہ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ اس بازار میں جہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہے اس کی گھٹی متعفن فضا میں ایک نہایت ہی اپٹوڈیٹ قسم کا بابو کیسے آسکتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اپنی آنکھوں پر یقین آگیا جب اس نے دیکھا کہ صاحب کو گندے جسم والے لیکن ناک سٹرڑ سٹرڑ کرتے ہوئے میلے کچیلے بچوں کی ایک ٹولی نے گھیر رکھا ہے۔

"ساب منتی لاگبو ساب منتی لاگبو۔ (صاحب قلی کی ضرورت ہے؟)

سفر علی نے جب دیکھا کہ گندے جسم والے بدبو دار لڑکے صاحب کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں تو اچانک اس کے منہ سے ایک گندہ جملہ نکلا۔

"کتو۔ یہ کیا بیہودگی ہے کہ کسی شریف آدمی نے داخل ہوتے ہی تم سب اس سے جونکوں کی طرح چپٹ جاتے ہو۔"

لیکن پھر اسی لمحے اسے خیال آیا کہ آخر ان لڑکوں کا کیا قصور؟ آخر ان کے بھی تو پیٹ ہیں۔ یہ بھی تو میری ہی طرح بھات کھاتے ہیں۔ اور پھر اچانک اسے طیش آگیا کہ یہ صاحب لوگ بھی تو لڑکوں کو کم مزدوری دینے کی وجہ سے اس جیسے ہٹے کٹے منتیوں (قلیوں) کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور یہ ذلیل کتے بھی ان صاحبوں کے داخل ہوتے ہی ان پر گدھ کی طرح منڈلانے لگتے ہیں۔ اسے سارا قصور ان گندے جسم والے لڑکوں کا ہی معلوم پڑا اور ذہن میں فوراً یہ بات سمائی کہ ان گندے لڑکوں کے سینوں پر چڑھ کر ان کی ٹانگیں چیر ڈالے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" ان کے وجود سے ہی پیٹ اور بھات کا مسئلہ ہے اور منتی منتی کی کرخت و زہریلی آوازیں ہیں۔ یہ نہ ہوں گے تو ہمارے سماج و معاشرے میں کوئی منتی نہ ہوگا۔ اور نہ زندگی عذاب معلوم ہوگی —— لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ ——

دفعتاً اسے اپنی بیوی اور بچوں کا خیال آیا۔ کتنی آنکھیں اپنا اپنا پیٹ پکڑے صرف اس کی راہ تک رہی ہوں گی۔ اور اس خیال کے آتے ہی جیسے اس کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

دن بھر کا تھکا ماندہ جب وہ کھانا کھانے بیٹھتا تو اس کی بیوی مٹی کی ایک پلیٹ میں بھات اس کے آگے رکھ دیتی لیکن ابھی وہ پہلا لقمہ بھی نہ کھانے پاتا تھا کہ بھات کی تھالی کے گرد اس کے لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولی حلقہ بنا کر بیٹھ جاتی۔ سفر علی کے ہاتھ سست ہو جاتے اور بچوں کے گندے ہاتھ تیزی سے چلنے لگتے۔

یہ منظر دیکھ کر اس کی بیوی زور سے چیختی۔ کمینو! ذرا تو سوچو تمہارا باپ تھکا ماندہ دو نوالے کھانے بیٹھتا تو اسے بھی سُکھ سے کھانے نہیں دیتے، خدا تمہیں غارت کرے۔ اور یہ کہہ کر وہ بچوں کو پیٹنے لگتی۔ بچوں کے شور و غل اور رونے کی کربناک آواز کی تاب نہ لا کر سفر علی بنا کچھ کھائے پیئے ہی اٹھ جاتا۔ اور کسی تنہائی میں بیٹھ کر اپنی قسمت پر اندر ہی اندر خوب روتا۔ اور پھر تھک ہار کر آسمان کی طرف دیکھتا۔ خدا تیرا شکر ہے۔ میری قسمت میں اگر یہی لکھا ہے تو میں راضی برضا ہوں۔

اور آج بھی کچھ اس کے ساتھ بازار میں یہی ہو رہا تھا ــــ وہ آسمان کی طرف دیکھ کر خدا کا شکر بجا لایا اور پھر جب اس نے ان چھوٹے چھوٹے گندے لڑکوں کی طرف دیکھا جو اپنی "جھبڑی" (ٹوکری) اٹھائے صاحب کے گرد کھڑے ہوئے تھے۔ تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ سارے گندے لڑکے اس کے اپنے بچے ہیں۔ اپنے جگر گوشے اور اس خیال کے آتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

" سفر علی گنگناتا ہوا بازار کی گہما گہمی میں کھو گیا۔" جھبڑی اس کے کاندھے پر لٹک رہی تھی لیکن ابھی تک اس جھبڑی کی قسمت نہیں کھلی تھی کہ یہ بھاری ہو اور وہ چل پڑے۔ سفر علی سوچ رہا تھا کہ کوئی نیا صاحب بازار کے اندر داخل ہو اور بہت سارا سامان خریدے اور پھر اسے اپنے ساتھ لے جائے تاکہ مزدوری زیادہ سے زیادہ ملے۔ لیکن اب تک اسے کسی نئے صاحب نے آواز ہی نہ دی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گندے بچے اس کے سامنے شکار پھانس رہے تھے اور مسکراتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ وہ بھی ان چھوٹے بچوں کی طرح کسی شکار کو دبوچ لے۔ اور ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آوازوں کے شور سے چونک گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہی صاحب جن کے گرد کچھ دیر پہلے چھوٹے چھوٹے منتیوں کی بھیڑ جمی ہوئی تھی زور سے چیخ رہے ہیں۔

ساب منتی لاگبے ساب (صاحب قلی چاہیئے صاحب)

کالے چشمے کے اندر سے صاحب نے دیدے نچاتے ہوئے معنی خیز نظروں سے لڑکوں کو گھورا۔

تمی پاربے (تم اٹھا سکو گے؟)

پارمو ساب (اٹھا سکوں گا ساب) کئی آوازیں ایک ساتھ سُنائی دیں۔ پھر تو جیسے ان آوازوں میں مقابلہ شروع ہو گیا۔

"آمی ایک مون نیتے بابو ساب، آمی دوئی مون" (میں ایک من اٹھا سکوں گا صاحب، میں دو من وغیرہ)

اور ایک لڑکے نے تو چیلنج ہی کر دیا۔

ساب' ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ آپ مال دیکر دیکھیں کون کتنا اٹھا سکتا ہے؟

لیکن صاحب ان تمام دلائل کے باوجود بھی نہ پگھل سکے۔ انہوں نے کالے چشمے کے اندر سے اپنے قریب کھڑے ہوئے سفر علی کی طرف دیکھا۔

"اوئے تُمی چھوکرا اے' تم چلو)

سفر علی اس حکم پر جیسے کانپ اٹھا۔ لیکن جب حواس بجا ہوئے تو فوراً اپنی "جھبڑی" ہاتھ میں اٹھا کے صاحب کے ساتھ ہو لیا اور ابھی صاحب بازار کے چوتھائی حصے سے ہی گزرے ہوں گے کہ سفر علی کی "جھبڑی" اشیائے خرید سے کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ بڑھتے ہوئے بوجھ کے ساتھ سفر علی کے ذہن کا بوجھ بھی بڑھتا گیا۔ کیا خریداری اب بھی ختم نہ ہوگی؟

لیکن صاحب کی خریداری ہنوز باقی ہی تھی اور سفر علی کے سر کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بڑھتے ہوئے سر کے بوجھ کے ساتھ صاحب کی دریا دلی پر بھی حیران تھا کہ صاحب دکانداروں سے صرف ایک دام پوچھتے تھے۔ اے کو تو دام؟ (اس کے کتنے دام) اور دوسرے

لے وہ پیسے گن رہے تھے۔ گو کہ سفر علی کو کئی کا بھاری نہ تھا لیکن وہ چیز بلند سے مناسب دام خریدا جانا تھا اور وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ صاحب ہر چیز بہ آٹھ دس آنے زیادہ دے رہے تھے۔ یکبارگی اس کے دل میں یہ بات آئی کہ وہ صاحب کو اس دریا دلی پر ٹوک دے۔ مگر یہ سوچ کر چپ رہا کہ صاحب یقیناً اس کی مزدوری کے سلسلہ میں بھی اسی دریا دلی کا مظاہرہ کریں گے۔

ایک گھنٹہ کی خرید و فروخت کے بعد آخر صاحب بازار سے باہر نکلے لیکن چلتے چلتے بھی انہوں نے کچھ لیموں، پودینہ اور دو چار بڑے بڑے کھیرے خرید ہی لئے ۔ اور اس کی ٹوکری میں رکھ دئیے۔

" اوئے چل اُو نیک دیر ہو گئی گیلو" صاحب نے اسے اشارہ کرتے ہوئے چلنے کا حکم دیا۔

صاحب کے اشارے پر سفر علی کو چلتے ہوئے یہ محسوس ہوا جیسے وہ کسی بیل گاڑی میں جُتا ہوا ہے۔ اور کوچبان نے بڑی بے رحمی سے اسے ایک چابک رسید کیا ہو، اور چابک کے پڑتے ہی وہ انجانے طور پر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ سفر علی نے صاحب کے الفاظ پر پھر غور کیا۔ واقعی صاحب ہی کو دیر نہیں ہوئی اسے بھی دیر ہو گئی ہے۔ ایک کھیپ میں اتنا سارا وقت ضائع ہو چکا ہے۔ پھر اس ایک کھیپ کی مزدوری ہی کیا ملے گی۔ اور وہ اتنے سارے بچوں کے خالی پیٹ کو کیسے بھرے گا۔ نہیں۔ اسے لوٹتے ہی پھر بازار لوٹنا ہو گا۔ تاکہ کم از کم دو تین بار اس کی " جھڑی" پھر بھر سکے۔

لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بازار لوٹتے لوٹتے بازار کا وقت ختم ہو جائے۔ کیونکہ اسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ صاحب کے ساتھ کہاں اور کتنی دور جانا ہو گا۔ صاحب نے کہا " اوئے چل" اور وہ مشینی انداز سے چل پڑا تھا۔ سڑک پر چلتے چلتے اچانک اسے خیال ہوا کہ کہیں وہ بھٹک تو نہیں رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنی گردن دائیں طرف موڑتے ہوئے صاحب کو دیکھنے کی کوشش کی جو پیچھے پیچھے اس کی رہنمائی کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ لیکن ابھی وہ گردن ٹھیک سے گھما بھی نہ پایا تھا کہ اسے یوں محسوس ہوا کہ گردن ہلکی سی جنبش پر اس کے جسم سے ٹوٹ کر زمین پر گر جائے گی۔ بھاری بوجھ کی بنا پر وہ اپنی گردن ہلانے سے معذور ہو چکا تھا۔ اب تک وہ صاحب کی رہنمائی پر منزل طے کرتا آ رہا تھا لیکن اچانک ایک موڑ پر اسے یوں لگا جیسے وہ صاحب سے بچھڑ گیا ہے۔ لیکن اس نے یہی سوچا کہ ہو سکتا ہے وہ ٹھیک راستہ پر چل رہا ہو اور اسی لئے صاحب نے رہنمائی کی ضرورت نہ محسوس کی ہو۔ اس خیال کے تحت وہ آگے بڑھتا رہا۔ آخر کار کافی دور چل کر دفعتاً وہ رک گیا۔

سامنے تین موڑ اور تین گلیاں نظر آ رہی تھیں اب وہ کس گلی میں داخل ہو، وہ سوچنے لگا۔ پیچھے وہ گھوم کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اسے صاحب کی رہنمائی والی کرخت آواز ہی سنائی دے رہی تھی۔

" اوئے ایدھی کے چل" (اِدھر کے ادھر چلو)

چند لمحے وہ اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہا۔ پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا بات سمائی کہ وہ ان تین گلیوں میں سے ایک گلی میں داخل ہو گیا اور آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ گلی کے اختتام تک پہنچ گیا۔ یہاں آگے کوئی راستہ نہ تھا۔ البتہ ایک عالی شان بلڈنگ سینہ تانے اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ مجبوراً اُسے پلٹنا پڑا۔ لیکن پلٹ کر جب وہ پھر تین گلیوں والے چکر پر لوٹا تو اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ صاحب کا دور دور کوئی پتہ نہ تھا۔ دفعتاً ہی اسے خیال ہوا کہ وہ راستہ بھول گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ تقریباً بجھ کر رہ گیا۔ "خدایا اب وہ کیا کرے اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ اس تذبذب کے عالم میں نہ جانے کیوں وہ واقعہ اسے یاد آ گیا جب وہ جہاز دیکھنے کے شوق میں اپنے باپ کے پیچھے پیچھے گھر سے چل پڑا تھا۔ لیکن راستہ میں ادھر ادھر کی چیزیں دیکھتے دیکھتے وہ اپنے باپ کو کھو بیٹھا تھا۔

اس کا باپ جہاز میں ایک لوڈر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ مال چڑھانا اس کا کام تھا۔ ایسے میں بھلا اپنے لڑکے کو ساتھ کیسے لاتا۔ لیکن سفر علی کو تو جہاز دیکھنے کا جیسے جنون ہو چکا تھا۔ اور اسی شوق میں اپنے باپ کے علم کے بغیر جب وہ پیچھے پیچھے چلا تو راستہ بھول گیا۔ راستہ بھولتے ہی وہ گھبرا گیا اور روتے روتے اس نے اپنا برا حال کر لیا۔ اس نے باپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور جہاز کی گودی کے چپے چپے کو کھنگالا مگر باپ نہ مل سکا۔ آخر وہ پیٹ کر جب تھکن سے چور چور ہو گیا تو سمندر کے کنارے نرم بالو پر اپنا جسم گرا کر سو گیا۔ پھر نہ جانے کہاں

تھوڑی دیر بعد ہی اس کا باپ آ پہنچا۔ اور اسے نیند سے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔
"کمبخت تو جہاز گھاٹ پر کہاں آن مرا؟"

ابھی اس واقعہ کی تصویریں اس کی نظروں میں گھوم رہی تھیں کہ ایک گرجدار آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"اے تم کہاں مر گیا تھا۔ ہم پیچھے پیچھے آ رہا ہوں اور تو لاپتہ ہو گیا۔ سفر علی نے جب ذرا سے پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھا تو دو بڑی بڑی آنکھیں کالے چشمے کے اندر سے اسے گھورتی ہوئی نظر آئیں۔ اور ابھی اس کے حواس میں وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کالے چشمے سے گن گن، کٹ کٹاک کی آواز نکلی۔ اے کھڑا منہ کیا دیکھتا ہے۔ آگے بڑھو۔ کمبخت نے میرا ٹائم برباد کر دیا۔

سفر علی میں جواباً کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ لہٰذا وہ فوراً ہی بابو صاحب کے اشارے پر چل پڑا۔ پھر تھوڑی دور چل کر بابو صاحب نے اسے رکنے کا آرڈر دیا۔

سر سے اپنا بوجھ اتارنے کے بعد سفر علی چند لمحے سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ صاحب سامان چھوڑ کر پہلے کاغذ میں لپٹی ہوئی دو بوتلیں اپنی بغل میں دابے گھر کے اندر داخل ہوئے اور سامنے ہی ایک کمرہ میں میز پر وہ بوتلیں رکھ کر باہر نکلے اور پھر پرس کھول کر اس میں سے کچھ پیسے نکال کر سفر علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اے تمہارے پیسے لو۔ —— اپنی مزدوری لینے میں سفر علی کو زیادہ دیر نہ لگی لیکن پھر صاحب نے کہا۔ اے جلدی پکڑو اور رفو چکر ہو جاؤ۔ ابھی مجھے بہت سارے کام کرنے ہیں۔

سفر علی اپنی مزدوری گننے لگا۔ ایک دو.....

"صرف چھ آنے!؟ ساب ای تو جولم (صاحب یہ ظلم ہے)

"چلو ویر بچہ" (ظالم کا بچہ) بھاگو یہاں سے۔ ایک تو میرا قیمتی وقت ضائع کیا اور اوپر سے زیادہ پیسے مانگتا ہے۔"

زیادہ پیسے!؟ سفر علی سوچنے لگا۔ صاحب نے دکانداروں سے یہ بات کیوں نہ کہی جب کہ وہ انہیں لوٹ رہے تھے۔ اور دو کی چیز دس میں خرید رہے تھے۔ پھر یہ مزدوری کے معاملہ میں صاحب دریا دلی کیوں بھول گئے؟

اس نے اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک دفعہ صاحب کو اور پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ اور پھر ذرا ہمت کر کے بولا۔

صاحب آپ نے کیا دیا مجھے۔ ایک تو سارا دن آپ کے چکر ہی میں ختم ہو گیا اور اس پر یہ مزدوری چھ آنے؟ صاحب یہ ظلم ہے۔

صاحب یہ ظلم ہے —— لیکن صاحب سفر علی کی بکواس سے بے نیاز تھے اچانک صاحب اپنی جیب سے پرس نکال کر اس کے روپے گننے لگے۔

ایک دو تین چار پھر یہ بدلتے ہوئے انہوں نے خود ہی کہا پورے ایک ہزار کافی ہیں۔ آج لطف رہے گا۔ اور پھر کنکھیوں سے انہوں نے سفر علی کو دیکھا جو ———— انہیں مسلسل گھورے جا رہا تھا

"ارے تم ابھی تک یہاں ہے؟"

"شاب۔"

"صاحب کا بچہ۔ میں کہتا ہوں۔ بھاگتا ہے کہ نہیں —— یا پولیس کو بلاؤں۔"

"شاب، میں تو......"

"کیا بکواس کر رہا ہے۔ میں کہتا ہوں تو بھاگتا ہے کہ نہیں۔ ورنہ میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں"

"پولیس؟ فون؟ —— نہیں نہیں شاب، میں جاتا ہوں۔"

جب سفر علی لوٹنے لگا تو اسے نہ جانے کیوں یہ احساس ہوا کہ کچھ دیر پہلے وہ ان صاحب سے نہیں بچھڑا تھا بلکہ اب صحیح معنی میں وہ صاحب سے بچھڑ گیا ہے اور بالکل تنہا ہے۔ بچپن کی طرح وہ ایک بار پھر اپنے باپ کو آوازیں دیتا ہوا اپنی کائنات کو اور اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا ہے۔

یکلخت اپنی تنہائی محسوس کر کے وہ آپ ہی آپ پھوٹ پڑا۔ دل کے دریچے کھل گئے۔ اور آنسوؤں کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ ہچکیاں لیتے ہوئے اس نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ اے آسمان تیرا دل بھی کیا ان ہی سفید بابوؤں کی طرح خالی ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ بظاہر میرے سر پر کوئی بوجھ نہ ہوتے ہوئے بھی کتنا زیادہ بوجھ ہے۔ اتنا زیادہ کہ کسی لمحے بھی میں گر سکتا ہوں۔ اور اس بوجھ کو پھر نہ اٹھا سکوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ خود میں دوسروں کے لئے بوجھ بن جاؤں۔ (آزاد ترجمہ)

جگن ناتھ! لونڈیا کو ہمارے حوالے کردو۔

کیوں؟

یہ ہماری ہے۔ گنگا دین نے گرج کر کہا۔

استاد! ـــ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کے بھی کوئی لڑکی ہے۔ اگر یہ آپ کی لڑکی ہے تو پھر کوئی بات نہیں۔ آپ کی لڑکی میری لڑکی ہے جگناتھ نے ہنستے ہوئے کہا۔

جگناتھ کی بات سن کر گنگا دین کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک زبردست گھونسہ جگناتھ کے مارا۔ جگناتھ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

گنگا دین اپنے شاگرد بنواری سے سر کی مالش کروا رہا تھا کہ لاؤڈ سپیکر کی آواز اس کے کان میں پڑی۔

" کیوں بے بنواری بازار میں یہ شور کیسا ہے "

" استاد بازار میں ایک ریسٹورنٹ کھلا ہے۔ افتتاح کی خوشی میں لاؤڈ سپیکر بج رہا ہے۔"

" بازار میں کوئی بات ہو اور اس کا مجھے علم نہ ہو؟ گنگا دین نے حیران ہوتے ہوئے کہا

" ہاں استاد یہی تو سوچ کر میں حیران ہو رہا تھا۔ نئے ریسٹورنٹ والا آدمی کوئی شریف دکھائی دیتا ہے۔ پھر اس سے ایسی غلطی کیوں ہو گئی۔" بنواری نے بات بناتے ہوئے کہا

" اس ریسٹورنٹ کا مالک کون ہے۔ تم نے اسے دیکھا ہے۔ کہاں کھلا ہے یہ ریسٹورنٹ؟" گنگا دین نے سوال کیا۔

" بازار میں اس گلی کی نکڑ پہ وہ جو چھوٹو نائی کی دوکان تھی نا استاد اس میں کھلا ہے معلوم نہیں اس کا مالک کہاں سے آیا ہے۔ یہ آدمی شریف دکھائی دیتا ہے۔ اور بدمعاش بھی ہو تو کیا۔ ہمارے استاد کے سامنے تو کوئی ٹھہر نہیں سکتا ہے۔ ہے کسی کی مجال جو بازار میں ہمارے سامنے چوں تک بھی کر سکے۔"

چھوڑ لے اب۔ بس ہو چکی مالش۔ چل ذرا بازار کا بھی حال دیکھ آئیں۔ لا کنگھا۔" یہ کہہ کر گنگا دین ایک دم اٹھ کھڑا ہوا پھر بنواری سے کنگھا لے کر اور جلدی جلدی سر میں پھیر کر بازار کی طرف چل دیا۔

شہر کے مین بازار اور اس کے ارد گرد کے علاقے میں گنگا دین کی بڑی دھاک تھی وہ اس علاقے کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا اور اس علاقے پر اس کی پوری حکومت تھی کوئی غنڈا اور بدمعاش گنگا دین کی مرضی کے خلاف اس حکومت میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بازار کے سیٹھ ساہوکار بھی گنگا دین کے آگے پانی بھرتے تھے۔ جب بھی وہ بازار سے گزرتا تھا تو چاروں طرف سے یہ آوازیں گونجنے لگتی تھیں۔

" شاہ جی جے رام جی کی۔"

" شاہ جی رام رام۔"

" شاہ جی کوئی خدمت۔"

اور گنگا دین ایک عظیم فاتح کی طرح بازار والوں پہ نگاہ غلط انداز ڈالتا ہوا اور کسی کے سلام کا جواب دیتا اور کسی کے سلام کا جواب نہ دیتا ہوا گزر جاتا تھا۔ گنگا دین کو جس چیز کی ضرورت ہوتی تھی وہ اسے بازار میں ایک ہی اشارے سے مل جاتی تھی۔ بانکے گو کسی بھی دکان میں کسی بھی چیز کی طرف گنگا دین انگلی اٹھا دیتا تھا وہ اس کی ہو جاتی تھی۔ بازار

میں کسی کو یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ کوئی گنگا دین کو کسی بھی چیز کے لئے انکار کر دے۔ یہی وجہ تھی کہ بازار میں کوئی بھی میلہ یا تقریب ہو گنگا دین کو سب سے پہلے مدعو کیا جاتا تھا اور سب سے آگے اسے جگہ دی جاتی تھی اس کے عوض اس علاقے کے لوگوں کو بڑے چھوٹے اور چھوٹے موٹے غنڈوں سے نجات حاصل تھی۔ گنگا دین کی اس علاقے میں کوئی پانچ چھ سال سے حکومت چلی آ رہی تھی۔ وہ کہاں سے آیا تھا کیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں نہ ہی کسی نے سوچا تھا اور نہ ہی کسی نے کھوج لگانے کی کوشش کی تھی۔

آج بازار میں نئے ریسٹورنٹ کا افتتاح تھا اور اس میں اسے مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اسی بات کو سوچ کر گنگا دین حیران ہو رہا تھا یہی سوچتے سوچتے وہ بازار میں آ گیا۔ ساتھ ہی اس کا شاگرد بنواری بھی تھا۔

گنگا دین نے دیکھا کہ نئے ریسٹورنٹ میں خوب رونق تھی نئے نئے فلمی ریکارڈ بج رہے تھے۔ ریسٹورنٹ کا مالک جگن ناتھ مسکرا مسکرا کر اور ہاتھ جوڑ کر اپنے گاہکوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ گنگا دین ریسٹورنٹ کے آگے آ کر کھڑا ہو گیا۔ جگن ناتھ کو دیکھ کر گنگا دین نے ناک بھوں چڑھائی اور پھر اپنے شاگرد بنواری کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا اور ریسٹورنٹ کے اندر گھس کر ایک کونے میں کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

بنواری نے جگن ناتھ سے بات چیت شروع کی "لالہ جانتے ہو وہ کون ہے؟" یہ کہہ کر اس نے اندر بیٹھے گنگا دین کی طرف اشارہ کیا۔ گنگا دین نے بنواری کو اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا ——— گنگا دین کا چہرہ بھرا ہوا، مونچھیں لمبی اور گھنی جو گالوں کی ہڈیوں تک پہنچتی تھیں اور اچھا خاصا ڈیل ڈول تھا۔ اسے دیکھ کر جگن ناتھ نے مسکراتے ہوئے بنواری سے کہا۔

"بھائی میں تو یہاں نیا نیا آیا ہوں مجھے تو معلوم نہیں وہ کون ہے ہاں تھوڑا تھوڑا سمجھ میں آ رہا ہے" "سمجھ لو یہ اس علاقے کا راجہ ہے۔ یہاں اسی کا چلتا ہے۔ سمجھے؟ یہاں آرام سے رہنا چاہتے ہو تو اسے خوش رکھنا پڑے گا" بنواری نے رعب جماتے ہوئے کہا۔

"کیا قیمت ہے اس دیوتا کو خوش رکھنے کی"؟

کچھ زیادہ نہیں بس جس چیز پہ وہ انگلی رکھ دے وہ اس کی ہو جاتی ہے اس کا نام گنگا دین ہے۔ گنگا دین کے ہوتے ہوئے اس علاقے میں کوئی غنڈہ یا بدمعاش نہیں گھس سکتا ہے۔ ہمارے استاد کی یہاں پوری حکومت ہے" آخری فقرہ کہتے ہوئے بنواری کی گردن فخر سے تن گئی

"پھر تو گنگا دین جی واقعی کام کے آدمی ہیں" یہ کہہ کر جگن ناتھ اپنی گدی سے اٹھا اور گنگا دین کے پاس پہنچا۔

گنگا دین دور سے دونوں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ ہی رہا تھا پاس پہنچ کر جب بنواری نے آنکھ سے اشارہ کیا تو وہ سمجھ گیا کہ تیر نشانے پر لگا تھا اور شکار پنجے میں تھا۔ جگن ناتھ نے ہاتھ جوڑ کر اور مسکراتے ہوئے گنگا دین سے کہا "استاد جی یہ ریسٹورنٹ آپ ہی کا ہے" گنگا دین کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ جگن ناتھ نے گنگا دین اور بنواری کی خوب خاطر تواضع کی اور جب گنگا دین ریسٹورنٹ سے باہر نکلا تو اس کی مونچھوں کا تاؤ اور بڑھ گیا تھا۔

"آدمی تو شریف دکھائی دیتا ہے" آخر گنگا دین نے اپنا فیصلہ بنواری کو سنایا۔

"ہاں استاد بالکل شریف آدمی دکھائی دیتا ہے۔ پاگل لگتا ہے۔ کیا غلاموں کی طرح خدمت میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ یہی تو رعب ہے ہمارے استاد کا" بنواری نے اپنے استاد کو مکھن لگانا شروع کیا

جگن ناتھ کا ریسٹورنٹ موقع پر تھا۔ اس لئے چل نکلا لیکن سب سے بڑی بات جو جگن ناتھ کی کامیابی میں تھی وہ تھی انکساری وہ ہر ایک سے محبت اور علیمی سے پیش آتا تھا اسی وجہ سے لوگ اس کی شرافت کے قائل ہو گئے تھے لیکن جگن ناتھ کی شرافت کا ناجائز فائدہ سب سے زیادہ گنگا دین اور بنواری نے اٹھایا وقت بے وقت جب بھی وہ آتے بیچ چلتے تھے اڑتا جاتے اور پیسے کچھ نہ دے جاتے تھے۔ اتنا کچھ ہونے پر بھی جگن ناتھ کے ماتھے پر تیوری نہ پڑتی تھی۔ وہ اسی طرح ان سے ہاتھ جوڑ کر اور محبت آمیز لہجے میں بات چیت کرتا تھا۔

اسی طرح بہت دن گزر گئے اور گنگا دین اور بنواری کے حوصلے اور بھی بڑھتے گئے۔

"کیا چیز بنتی ہے استاد" بنواری نے ایک دن اپنے استاد سے کہا

"چیز نہیں کا سے کہو۔ بالکل اصیل کا سونا ہے ۔۔۔ تو ۔۔۔

کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اور جب چاہو روپیہ حاصل کرو۔ گنگا دین نے ہنستے ہوئے کہا۔

دوسری طرف جب جگن ناتھ سے کسی نے گنگا دین کے بارے میں بات کی تو اس نے حسب معمول بڑی حلیمی اور انکساری سے ہنستے ہوئے کہا: چھوڑو بھی۔ مفت میں لڑائی جھگڑا مول لینے سے کیا فائدہ ہے۔ بھگوان کی دیا سے دکان اچھی چل رہی ہے ایک دو روپیہ کا مال اگر وہ کھا جائے تو کیا ہوا۔"

دیوالی کی رات تھی۔ بازار دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ رنگ برنگے بلبوں سے بازار میں چاروں طرف چراغاں تھی۔ بازار میں غیر معمولی بھیڑ ہونے کی وجہ سے خوب رونق تھی۔ دیوالی کی سب سے زیادہ سجاوٹ جگن ناتھ کے ریسٹورنٹ میں تھی۔ دیوالی کے موقع پر اس نے ریسٹورنٹ کو نئے سرے سے سجایا تھا اس لئے وہاں پر گاہکوں کی اور بھی بھیڑ تھی اور ریسٹورنٹ میں تل رکھنے کو بھی جگہ نہیں تھی۔ لالہ جگن ناتھ معمول کی طرح گدی پر بیٹھا ہوا تھا اور ہاتھ جوڑ کر انکساری سے اپنے گاہکوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا کہ اچانک ایک لڑکی دوڑ کر گلی کی طرف سے ریسٹورنٹ میں گھس آئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔

" مجھے بچاؤ، غنڈے مجھے تنگ کر رہے ہیں۔" اس لڑکی نے روتے ہوئے کہا۔

لڑکی کو روتے ہوئے دیکھ کر ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے سبھی لوگ اس لڑکی کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے

"کون ہیں وہ بدمعاش۔؟

"کہاں ہیں وہ؟"

"دوست۔ ہم ابھی دیکھ لیں گے انھیں۔"

"ہم انھیں کچا چبا جائیں گے۔"

"ہم ان کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے۔"

"ذرا بتاؤ تو وہ کون ہیں۔"

"گنگا دین اور اس کا ساتھی۔" اس لڑکی نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

گنگا دین کا نام سنتا تھا کہ سبھی لوگ اپنی اپنی جگہوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ گنگا دین کے نام سے تو سبھی لوگ تھر تھر کانپتے تھے بھلا اس سے ٹکر کون لے سکتا تھا۔

"تم کون ہو اور گنگا دین کیوں تمہیں تنگ کر رہا ہے۔" جگن ناتھ نے اپنی گدی سے اٹھتے ہوئے اس لڑکی کے پاس جا کر اس سے پوچھا

"میں کون ہوں۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں ان غنڈوں کے ہاتھوں میں پڑ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے ان کے چنگل سے بچ کر آئی ہوں۔ مجھے بچاؤ ورنہ یہ غنڈے میری عزت اور آبرو کو نیلام کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت تو تم نے اسی وقت نیلام کر دی تھی۔ جب تم نے اپنے گھر سے قدم نکالا تھا خیر گھبراؤ نہیں۔ دیکھتا ہوں ماجرا کیا ہے۔"

ابھی جگن ناتھ نے یہ الفاظ منہ سے نکالے ہی تھے کہ گنگا دین اور بنواری ہوٹل میں گھس آئے اور جگن ناتھ سے کہا۔

"جگن ناتھ! لونڈیا کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"یہ ہماری ہے۔" گنگا دین نے گرجتے ہوئے کہا۔

"استاد، مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ کے بھی کوئی لڑکی ہے۔ اگر یہ آپ کی لڑکی ہے تو پھر کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کی لڑکی میری لڑکی ہوئی۔" جگن ناتھ نے ہنستے ہوئے کہا۔

جگن ناتھ کی بات سنکر گنگا دین کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس نے آگے بڑھ کر ایک زبردست گھونسا اس کے منہ پر مارا۔ ایک لمحے کے لئے جگن ناتھ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ جب اندھیرا دور ہوا تو اس نے دیکھا کہ گنگا دین لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی کھینچ کر باہر لا رہا تھا۔

"ٹھہرو بدمعاش لڑکی کو چھوڑ دے نہیں تو برا ہوگا۔" اب جگن ناتھ گرج رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"اوں" گنگا دین نے صرف اتنا ہی کہا اور لڑکی کو کھینچ کر باہر بازار میں لے گیا۔ لڑکی نے ایک زور کی چیخ ماری۔ جگن ناتھ بھوکے شیر کی طرح گنگا دین پر جھپٹ پڑا اور وہ دونوں آپس میں لپٹ گئے۔ بنواری نے جب استاد کو جگن ناتھ سے پٹتے دیکھا تو وہ بھی آگے بڑھا۔ گنگا دین

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

ایسا بھی ہوتا ہے

اس قسم کے فقیر ہندوستان کے اکثر
بڑے شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے
بھیک مانگنے کا طریقہ بھی عجیب ہے۔ یہ بازار
میں کسی ایک دکان پر جا کر صرف دو وقت
کے کھلنے کے پیسے مانگتے ہیں۔ اگر دکاندار
نے دیدئے تو فقیر چلا جاتا ہے۔
ورنہ وہ —
گرز کی نوکیلی ڈنڈی سے اپنے جسم اور
سر کو زخمی کر کے خون نکالتا ہے اور مجبور
ہو کر دکاندار کو مطلوبہ پیسے دینا پڑتے
ہیں —

قدرت نے جو اصول قائم کئے ہیں ان میں کبھی فرق نہیں آتا۔ وہی آسمان وہی زمین ہے لیکن خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب روحانی ترقی کو مقصد حیات خیال کرتے تھے۔ اور آج مادہ پرستی اور ایٹمی ترقی کو معراج کمال خیال کرتے ہیں۔ ترقی خواہ کسی شعبہ میں ہو بہرحال ترقی ہے۔ بقول حافظ

توبہ تو بالے دما بقامت سیار
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

تجھے پہاڑ کی بلندی پسند ہے اور مجھے اپنے یار کا قد مرغوب ہے۔ یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے بعض آزاد خیال معجزات کرامات اور مافوق الفطرت واقعات کے باور کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ اور ایمان بالغیب پر یقین نہیں کرتے۔ جس واقعہ کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

صوفی عنایت خان ریاست بڑودہ کے مشہور موسیقار تھے۔ اور ہندوستان کا ہر وہ شخص جس کو موسیقی کا ذوق تھا بخوبی واقف تھا۔ آج سے اندازاً پچاس سال ہوئے نظام حیدرآباد نے ان کو طلب کیا اور گانا سنکر پسند کیا۔ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان اہل کمال کی بڑی قدر کرتے اور دل کھول کر انعام و اکرام دیتے تھے۔ صوفی عنایت خان کو ایک تھیلی اشرفیوں کی، سنہری میڈل اور ایک انگوٹھی عنایت فرمائی۔ صوفی عنایت خان کے پاس اور بھی کافی میڈل موجود تھے۔ چونکہ خواجہ غریب نواز کے عرس کا زمانہ تھا انہوں نے اجمیر شریف جانے کا قصد کیا اور یہ بھی ارادہ کیا کہ اگر کوئی بزرگ مل جائیں تو ان سے بیعت حاصل کریں۔ لیکن سلسلہ طریقت اور انتخاب پیر، یہ دو باتیں ان کے واسطے ایسی دشواریں کہ جو حل نہ ہوتی تھیں۔ بہرحال تن بہ تقدیر سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور روانہ ہو گئے۔ سفر طویل تھا۔ رات کو آرام سے سوتے رہے۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو بکس جس میں علاوہ کپڑوں اور سامان کے کثیر اشرفیاں، انگوٹھی اور تمام میڈل وغیرہ تھے غائب تھا۔ اب ان کے پاس سوائے بستر اور اچکن کے جس کی جیب میں ٹکٹ اور بٹوے میں دو چار روپے تھے اور کچھ نہ تھا —

اجمیر شریف پہنچ کر دربار میں حاضری دی اور مزار شریف کے سامنے جو سنگ مرمر کی سہ دری ہے اس میں ستون کے سہارے بستر سے کمر لگا کر بیٹھ گئے۔

اس مسافر کارہ عشق میں منشا دیکھو
سارا سامان رہے اور بے سروسامان ہو جا

ریل میں سونے سے پہلے کیا کیا ارادے تھے لیکن یہ سب قدرت کے راز ہیں اور ان کے لیے بھی اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔ [illegible]

[illegible] خان کے دل پر اثر کیا کہ دولت کی وہ قدر جو پہلے تھی وہ نہ رہی۔
[illegible] کا پہلا سبق تھا جو ان کو حاصل ہوا۔ پیر کے انتخاب کا معاملہ بھی ایسا
[illegible] کو حل نہ کر سکے تھے۔

[illegible] سر دری کے سامنے بیس پچیس مرد چھوٹے فقیر ایک حلقہ بنا کر کلمہ
توحید کا ذکر بڑی [illegible] گھوم رہے تھے جس کو وہ اپنی اصطلاح میں دھمال ڈالنا
کہتے ہیں۔ اس عمل سے ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

یہ مرد چھوٹے فقیر ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ سر کے بال مثل عورتوں کے بڑے ہوتے ہیں۔ ہاتھ میں ایک فٹ لمبا لوہے کا گرز رکھتے ہیں جس کا گولا ٹینس کی گیند کی برابر ہوتا ہے اور ڈنڈی نوکیلی ہوتی ہے۔

ان کے بھیک مانگنے کا طریقہ بھی عجیب ہے۔ گھر گھر پھر کر بھیک نہیں مانگتے بلکہ بازار میں کسی ایک دوکان پر جا کر صرف دو وقت کھانے کے پیسے مانگتے ہیں۔ اگر دوکاندار نے دے دیئے تو فقیر چلا جاتا ہے ورنہ وہ گرز کی نوکیلی ڈنڈی سے اپنے جسم اور سر کو زخمی کر کے خون نکالتا ہے۔ مجبور ہو کر دوکاندار کو مطلوبہ پیسے دینے پڑتے ہیں اور وہ چلا جاتا ہے۔

صوفی عنایت خان ان حالات سے باخبر تھے اور حقارت کی نظر سے غور کر رہے تھے کہ پیٹ کی خاطر انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ آخر یہ کیا طریقہ درویشی کا ہے۔ اور ان لوگوں میں کیا باقاعدہ پیری مریدی ہوتی ہے صوفی عنایت خان اپنے دل میں یہی غور کر رہے تھے کہ حلقہ میں جو فقیر گھوم رہے تھے ان میں سے ایک فقیر جو دوسروں کی طرح میلے کپڑے پہنے ہوئے تھا جب ان کے قریب سے گزرا تو حلقہ میں سے نکل کر صوفی عنایت خان کے پاس آیا اور یہ شعر پڑھا۔

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو مفلس اور خاکسار ہیں ان کو حقارت کی نظر سے مت دیکھ تجھے کیا معلوم اس گرد میں کوئی شہسوار ہی ہے۔
یہ شعر پڑھ کر وہ پھر حلقہ میں شامل ہو کر شغل میں معروف ہو گیا۔
عنایت خان شرمندہ ہو گئے کہ ان کو میرے خیالات کا کیسے علم ہو گیا۔ [illegible] ان لوگوں کی [illegible] تبلیغ تھی اس لئے پہچان نہ سکے۔

حلقہ ختم ہوا اور وہ لوگ منتشر ہو گئے۔ صوفی عنایت خان پھر انہیں خیالات میں محو تھے کہ وہی فقیر جس نے وہ شعر پڑھا تھا صوفی عنایت خان کے پاس آیا اور کہا کہ یہ سب قدرت کے راز ہیں ان سے [illegible] غور مت کرو۔ تمہیں ہمارے ہی طریقہ کو اختیار کرنا ہوگا اور جو کام تمہارے سپرد کیا جائے گا اس کو کرنا ہوگا۔ صوفی عنایت خان اس قدر مرعوب ہو چکے تھے کہ انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ ان بزرگ نے کہا کہ شریعت کی تمام و کمال پابندیوں کے علاوہ اس بات کا خیال رکھو کہ "خیال بردم اور نظر بر قدم" یعنی ہر سانس میں خدا کی یاد اور ہر قدم جو اٹھایا جائے۔ خدا کے واسطے یعنی نیک کام کے واسطے ہونا چاہیئے۔ اس تعلیم کے بعد انہوں نے عنایت خان کو مرید کیا اور حکم دیا کہ تم لندن میں رہ کر تبلیغ کا کام کرو۔ عنایت خان نے کہا کہ حضرت انگریزی زبان سے میں واقف نہیں۔ روپیہ پاس نہیں۔ اس بے سروسامانی میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ صرف یہ کہہ کر چلے گئے کہ خدا مسبب الاسباب ہے۔

صوفی عنایت خان کا بیان ہے کہ ان تمام پے در پے واقعات سے میرے دماغ کی عجیب حالت تھی لیکن بزرگوں کے قول کے مطابق

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزلہا

میں نے مزار پر جا کر فاتحہ پڑھی اور بستر لیکر اسٹیشن پر چلا گیا اور بنچ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسی بنچ پر ایک مسلمان سیٹھ آکر بیٹھ گیا جو عرس میں شرکت کے لئے بمبئی سے آیا تھا۔ ٹرین کے آنے میں دیر تھی۔ وہ مجھ سے میرے نام اور موسیقی کے کمالات سے واقف تھا۔ پوچھا کہاں جاؤ گے؟ میں خاموش ہو گیا۔ دوبارہ پھر پوچھا میں نے شروع سے آخر تک جو واقعات پیش آئے تھے وہ کہہ دیئے۔ سنکر وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اس کے بعد کہا کہ آپ فکر نہ کریں۔ یہ کام آپ کا میں کردوں گا۔ میرے ساتھ بمبئی چلیئے۔

صوفی عنایت خان کا بیان ہے کہ اس وقت میری حالت اس درخت سے گرے ہوئے خشک پتے کی تھی جو خود حرکت نہیں کر سکتا۔ لیکن ہوا جس طرف جاتی ہے اس کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ صوفی عنایت خان سیٹھ کے ساتھ بمبئی چلے گئے۔ دو ماہ قیام کے درمیان سیٹھ نے لندن میں ان کے قیام کا انتظام کر دیا۔ اور زادِ راہ بھی [illegible] کیا۔ اور یہ لندن پہنچ گئے۔ جس مکان میں [illegible] انہوں نے قیام کیا وہ ایک متمول ادھیڑ عمر کی بیوہ میم کا تھا۔ [illegible]

بہت متاثر ہوئی اور کچھ عرصے کے بعد مسلمان بھی ہو گئی۔ اور ان سے عقد بھی
کر لیا۔ بس محترمہ سے صوفی عنایت خان کو تبلیغی سلسلے میں بہت مدد ملی۔
ان کا تبلیغی ذریعہ کچھ تو انگریزی لٹریچر تھا اور زیادہ موثر طریقہ قوالی تھی۔
خلاصہ یہ کہ صوفی عنایت خان ڈھائی سال لندن میں رہے اور سات سو انگریز
ان کے مرید ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اس کے بعد پیر کی ہدایت کے مطابق
وہ امریکہ چلے گئے اور وہاں بھی تبلیغی سلسلے میں بہت کام کیا۔

۱۹۲۶ء میں صوفی موصوف شاہ نظام الدین اولیا کے عرس میں
شرکت کی غرض سے مع اپنی انگریز بیگم کے دہلی آئے اور قلعہ کے قریب
دریا کے کنارے ایک کوٹھی میں مقیم ہوئے۔ اہالیان دہلی اور خصوصاً خواجہ
حسن نظامی صاحب نے ان کی کافی مدارات کی۔ یکایک صوفی عنایت خان
مرض نمونیا میں مبتلا ہو گئے۔ اور دن بدن ان کی حالت گرتی چلی گئی۔ اور چند دن
بیمار رہ کر انتقال ہو گیا۔

ان کی انگریز بیگم نے ان کی زندگی کے حالات کی ایک کتاب بھی
انگریزی میں شائع کی تھی جس کی ایک کاپی خواجہ حسن نظامی صاحب نے
مجھے بھی دی تھی جس میں ان کی تصویر بھی ہے۔ لانبا قد بھرا بدن سانولا
صورت لمبی داڑھی۔

انسان کی زندگی میں کیا کیا انقلابات ہوتے ہیں۔ ان کی بیوی صوفی
صاحب کی نعش کو ولایت لیجانا چاہتی تھی لیکن خواجہ حسن نظامی صاحب کے
اصرار پر ان کو دہلی ہی میں دفن کیا گیا۔

صفحہ ۴۰ کا بقیہ ——— بزدل

نے اسے روک دیا۔

"رہنے دے بیٹے۔ میں اس سے اکیلا ہی نپٹ لوں گا۔"

لڑکی کی چیخ کی گونج تمام بازار میں گونج گئی اور ریسٹورنٹ کے
سامنے لوگوں کا ایک زبردست مجمع اکٹھا ہو گیا۔ گنگا دین اور جگن ناتھ
کو گتھم گتھا دیکھ کر سبھی حیران ہو گئے۔ کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ گنگا
دین کے ڈر کے مارے کوئی آگے نہیں بڑھتا تھا اور نہ ہی پولیس کو اطلاع
دینے کی ہمت کرتا تھا۔ البتہ سب کی ہمدردی جگن ناتھ کے ساتھ تھی
وہ سوچ رہے تھے کہ جگن ناتھ کی عقل ماری گئی ہے جو گنگا دین سے
پنجہ لڑانے کی کوشش کر رہا ہے آج جگن ناتھ کی خیریت نہیں۔ سبھی
یہی سوچ رہے تھے۔ وہ دونوں لہو لہان ہو گئے تھے۔ دونوں کے کپڑے
سڑک کی دھول اور مٹی سے خراب ہو گئے تھے۔ اچانک جگن ناتھ
نے ایک زوردار ہاتھ مارا اور گنگا دین لڑکھڑا کر سڑک پر آ گرا

اپنی قمیض کی آستین سے منہ کا خون پونچھتے ہوئے جگن
ناتھ نے لڑکی سے کہا "گھبراؤ نہیں اب یہ تمہیں کبھی تنگ نہیں کرے گا۔"

جگن ناتھ کی بات سنکر ایک نے کہا "اب تمام بات سمجھ میں آ
گئی" بازار کے ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر جگن ناتھ کی پیٹھ تھپکی اور کہا
"بیٹا تمہاری اس جرات پر ہم سب تمہارا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ تم نے
[illegible]
آج اس موذی سے پنجہ لڑا کر ہم سب کے حوصلے بڑھا دیئے ہیں۔ اس نے
اپنے آپ کو ایک ہوا بنا رکھا تھا اور ہم خواہ مخواہ اس سے ڈرتے تھے۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بھیڑ کو دیکھ کر ایک پولیس کا گشتی
دستہ موقع پر پہنچ گیا۔ جگن ناتھ اور گنگا دین کو تھانے لے جایا گیا۔ چشم
دید گواہوں کے بیانات قلمبند کر کے تھانیدار نے گنگا دین کو اغوا
اور بلوے کے الزام میں بند کر دیا۔ جگن ناتھ کو چھوڑتے ہوئے تھانیدار
صاحب نے کہا "لالہ جی۔ گنگا دین پر تو ہم بہت دیر سے ہاتھ ڈالنے کو
ترس رہے تھے لیکن کوئی موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ کم بخت بڑی صفائی سے
پولیس کے ہاتھوں سے نکل جاتا تھا۔ سارے علاقے میں اس نے اپنا ڈر
بٹھا رکھا تھا اور کوئی اس کے خلاف گواہی دینے کی جرأت ہی نہیں کرتا
تھا۔ لالہ جی آپ نے تو اسے رنگے ہاتھوں پکڑوا کر کمال کر دیا۔ ہم لوگ
تو آپ کو کنگلا سمجھتے تھے بالکل اصیل گائے۔"

تھانیدار کی بات سنکر جگن ناتھ بولا "تھانیدار صاحب۔ اس
نے میری شرافت کو کمزوری سمجھ کر میری [illegible]
کو چیلنج کیا تھا لیکن اسے معلوم نہیں کہ جب شریف آدمی [illegible]
[illegible]
[illegible] سے بھی برے انجام کو پہنچتا ہے۔" [illegible]

مچھر مار کمیٹی

شہری :- کیوں بھائی ! ندامت مچھر مار کمیٹی کا آفس یہی ہے ؟

چپراسی :- صاحب ! بورڈ دیکھ کر تو آپ کو شک نہیں ہونا چاہیئے ۔

شہری :- شک بورڈ کو نہیں تمہیں دیکھ کر ہو رہا ہے ۔ کسی دفتر کے چپراسی کو بہت عمدہ شاندار سوٹ میں نہیں دیکھا ۔

چپراسی :- ہو سکتا ہے آپ درست فرما رہے ہوں ۔ یہ سب ہمارے آفیسر جناب ندامت حسین کی مہربانی کے سبب ہے ۔ جناب ندامت حسین صاحب کا فرمانا ہے کہ صاحب چاہے پھٹے پرانے کپڑے پہن کر دفتر جائے لیکن چپراسی کی وردی فرسٹ کلاس ہونی چاہیئے اور اس کی کوالی فکیشن انٹر فیل ۔

شہری :- انٹر فیل کیوں ؟

چپراسی :- ڈاکٹر ندامت حسین مساوات کے حامی ہیں ۔ وہ خود انٹر فیل ہیں اور اس سے کم کوالی فکیشن کے آدمی کو چپراسی تعینات نہیں کرتے ۔

شہری :- دوسرے عہدہ داروں کی کیا کوالی فکیشن ہیں ؟

چپراسی :- اس کے بارے میں کچھ بتلانا میرے لئے ممنوع ہے ۔

شہری :- یہ بھی خوب رہی ۔ ہاں بھائی یہ تو بتاؤ مچھر مار کمیٹی کی تشکیل کن اصولوں پر ہوتی ہے اور اس کے فرائض کیا ہیں ؟

چپراسی :- فرائض ؟ مچھروں کے مارنے کے سوا دوسرے کیا فرائض ہو سکتے ہیں ۔ ان کو تباہ کر کے شہر کو اس موذی مرض سے نجات دلانا کا فرض ... ہے ۔ اس کمیٹی کی تشکیل شہریوں کے ذریعہ عمل میں آئی اور جناب ... حسین خاں اس کے سکریٹری ہیں ۔ کیا اس سے قبل آپ کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہے ؟

شہری :- اب تک تو نہیں ۔

چپراسی :- پھر تو ضرور ملئے ۔ آپ کی طبیعت درست ۔ میرا مطلب ہے خوش ہو جائے گی ۔

شہری :- تو اطلاع کرا دیجئے نا ۔

چپراسی :- اطلاع تو کرا دوں اگر وہ اٹھ بیٹھے ہوں ۔

شہری :- اٹھ بیٹھے ہوں !

چپراسی :- ہاں صاحب وہ گھر سے ناشتہ کر کے آتے ہیں ۔ وہاں شور و غل میں آرام نہیں کر سکتے ۔ اس لئے یہاں آ کر ایک گھنٹہ تھوڑا بہت سو لیتے ہیں ۔ دیکھیئے ان کے خراٹوں کی آواز آ رہی ہے ۔ (آواز) لیکن اب تو ایک گھنٹہ سے زائد ہو گیا ابھی جا کر جگاتا ہوں ۔

(وقفہ)

چپراسی :- اندر تشریف لائیے صاحب ۔ دیکھیئے ندامت حسین صاحب چھوٹے قد اور موٹے جسم کے انسان ہیں کرسی پر سے اٹھ نہیں سکیں گے مُبرا نہ ماننا ۔

شہری :- مجھے انھیں کوئی معانقہ نہیں مجھے تو وہ اٹھائیں گے ؟

چپراسی :- یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے ۔ آپ تشریف لے جائیے

شہری :- (اندر جا کر) کیوں ڈاکٹر صاحب ! اندر آ سکتا ہوں ؟

ڈاکٹر :- ہاں ۔ ہاں صاحب ۔ اندر تو آ ہی گئے ہو ۔ اب پوچھنے کا فائدہ ! آپ کو باہر نکالنے سے تو رہا ۔ دوسرے یہ کمیٹی کا ادارہ شہر کمیٹی پبلک کے چندے سے ...

میں پبلک کا خادم ہوں۔ آپ پبلک ہیں۔ آپ کی بات ماننی ہی پڑے گی۔ اس لئے تشریف رکھئے۔ پان پیش کروں؟

شہری :- نہیں صاحب! میں پان نہیں کھاتا۔

ڈاکٹر ندامت حسین :- پان کھاتے نہیں تو اور کیا کھاتے ہیں؟

شہری :- پان کے بجائے غم کھاتا ہوں۔

ڈاکٹر ندامت حسین :- کس کا؟

شہری :- مچھروں کا۔

ڈاکٹر ندامت حسین :- مچھروں کا — ہاہاہا — واہ مسٹر... کیا ہے نام آپ کا؟

شہری :- کچھ بھی کہہ لیجئے۔ ویسے مجھے بیکی رام ورما کہتے ہیں۔

ڈاکٹر ندامت حسین :- تو بیکی رام جی! اگر غم ہی کھانا ہے تو غم عشق کھائیے۔ مچھروں وچھروں میں کیا پڑا ہے؟

ورما :- مچھروں سے چھٹکارا پائیں تو غم عشق کی جانب قدم بڑھائیں۔

ڈاکٹر ندامت حسین :- تو مچھر آپ کی راہ میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ آپ نے اس سے پیشتر ہماری توجہ اس طرف راغب کیوں نہیں کرائی؟

ورما :- کوشش تو بندہ نے بہت کی۔

ڈاکٹر ندامت حسین :- کیسے؟

ورما :- خطوط کے ذریعہ

ڈاکٹر ندامت حسین :- خطوط یا خط؟

ورما :- خط کی جمع خطوط۔

ڈاکٹر ندامت حسین :- کسے لکھے؟

ورما :- آپ کے دفتر کو

ڈاکٹر ندامت حسین :- کتنے؟

ورما :- آدھی درجن سے ایک اوپر۔

ڈاکٹر ندامت حسین :- سمجھا۔ آپ ہی نے وہ خط لکھا تھا ایک دم سنجیدہ ہو کر! نہایت غیر واجب

ورما :- اس لئے کہ آپ کے دفتر نے اس سے پہلے تمام خطوط کا جواب نہیں دیا۔

ڈاکٹر ندامت حسین :- اس لئے کہ دفتر کو جواب دینے کے علاوہ اور بھی کام ہیں۔ آپ لوگوں نے ہمیں بے کار سمجھ رکھا ہے؟

ورما :- نہیں حضور ہم لوگوں کو شبہ ہے کہ آپ کاہل ہیں۔ آپ کے پاس تو نئی کار ہے۔

ڈاکٹر ندامت حسین :- آپ کے خیال میں کار کے بغیر اتنا بڑا کام سنبھالنا ممکن ہے؟ آپ دیکھتے نہیں کہ مجھے دفتر میں سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ میز کو دیکھ کر آپ یہ مت اندازہ لگائیے کہ فائلیں آتی ہی نہیں۔ اس کے علاوہ دن بھر ادھر ادھر بھاگنا پڑتا ہے۔ کام کے سبب ہی تو سو روپے ماہانہ کا الاؤنس ملتا ہے۔

ورما :- بہت کم الاؤنس ملتا ہے آپ کو — لیکن ندامت صاحب! میں اس لئے آیا تھا......

ڈاکٹر ندامت حسین :- ندامت صاحب نہیں۔ ندامت حسین خاں صاحب۔ کم الاؤنس اس لئے ملتا ہے کہ کار کمپنی کی ہے۔

ورما :- جی۔ اب سمجھا۔ لیکن میں........

ڈاکٹر ندامت حسین :- آپ اب بھی نہیں سمجھے۔ پبلک ہماری تکالیف کو بالکل نہیں سمجھتی۔ لیکن آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ کیسے تشریف لائے ہیں؟

ورما :- آیا تو سائیکل پر ہوں۔

ڈاکٹر ندامت حسین :- سادہ ہو۔ میں پوچھتا ہوں کس لئے تشریف لائے ہیں؟

ورما :- ہاں ڈاکٹر صاحب۔ میں یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ اس سال ہمارے محلّے میں بہت مچھر ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر ندامت حسین :- بہت مچھر ہو گئے ہیں — !ناممکن۔ ایک دم ناممکن —

ورما :- لیکن امر واقعہ یہی ہے

ڈاکٹر ندامت حسین :- میں آپ کی بات کو ہرگز نہیں مان سکتا۔

ورما :- وجہ؟

ڈاکٹر ندامت حسین :- دراصل میں آج تک کبھی کوئی پوچھنے کو آتا ہے صاحب! کیا کمیٹی نے مچھروں کا دفتر اس لئے کھولا ہے کہ

ڈاکٹر ندامت حسین: اشار ہے نا؟

ورما:- کتنا چھپا ہے؟

ڈاکٹر ندامت حسین:- واہ صاحب واہ - کیسا لگتا ہے؟ آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں - دیکھیے ابھی بتلاتا ہوں - یہ ہمارا پمفلٹ ہے، لیجیے پڑھیے یہاں سے

ورما:- اس میں لکھا ہے - ہم نے اس سال مچھروں کو مارنے کی زبردست مہم چلائی - دشمن پر حملہ کرنے کی مکمل تیاری کی - سب سے پہلے "مچھر مارو" ہفتہ منایا - اسکول کے لڑکوں کا ایک جلوس نکالا - ان کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے جن پر صاف اور بڑے الفاظ میں لکھا تھا "مچھروں" کا ناس ہو - یہی نہیں نعرے لگائے گئے - جلوس شہر بھر میں گھوما - پھر یہ فیصلہ کیا گیا کہ شہر میں ڈی ڈی ٹی کا چھڑکاؤ کیا جائے

ڈاکٹر ندامت حسین:- کیوں مانتے ہو نا؟

ورما:- خوب - اتنا کرنے کے بعد تو مچھروں کو مر جانا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر ندامت حسین:- آپ سوچ سکتے ہیں کہ کتنا خرچ آیا؟

ورما:- یہی چار پانچ سو روپے۔

ڈاکٹر ندامت حسین:- چار پانچ سو! آپ کیا بات کرتے ہیں - اتنے میں کیا ہوتا؟ پورا ایک لاکھ خرچ ہوا۔

ورما:- ایک لاکھ - مچھر مارنے پر ایک لاکھ؟

ڈاکٹر ندامت حسین:- جی جناب! آپ کیا سمجھتے ہیں؟ دشمن کو تباہ کرنے کے لئے پیسہ خرچ کرنے سے کیوں دریغ کیا جائے۔

ورما:- تو پیسہ خرچ ہوا؟

ڈاکٹر ندامت حسین:- ہوا اور خوب ہوا - اس کے بغیر مچھروں کا ناش ہی کیسے ہو سکتا تھا؟

ورما:- کتنا خرچ ہوا؟

ڈاکٹر ندامت حسین:- تیس ہزار پمفلٹ پر - تیس ہزار ڈی ڈی ٹی پر اور چالیس ہزار دوائی چھڑکنے والے مزدوروں پر۔

ورما:- ایک لاکھ خرچ کیا - یہاں کی آبادی کتنی ہے؟

ڈاکٹر ندامت حسین:- پچاس ہزار

ورما:- اور مچھر؟

ڈاکٹر ندامت حسین:- پانچ ہزار

ورما:- اگر آپ بیس روپے فی گھر کے حساب سے بانٹ دیتے تو اس سے لوگ مچھر دانی اور کونین خرید لیتے -

ڈاکٹر ندامت حسین:- اور ڈی ڈی ٹی؟

ورما:- خالص ڈی ڈی ٹی بھی خرید لیتے۔

ڈاکٹر ندامت حسین:- ہماری ڈی ڈی ٹی خالص نہیں؟

ورما:- خالص تو شاید ہوگی لیکن الٹا اثر کرتی ہے -

ڈاکٹر ندامت حسین:- وہ کیسے؟

ورما:- اس کے چھڑکنے کے بعد مچھروں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔

ڈاکٹر ندامت حسین:- آپ کیا بات کر رہے ہیں؟

ورما:- جو میں نے عرض کیا۔

ڈاکٹر ندامت حسین:- میں کبھی نہیں مان سکتا۔

ورما:- کوئی ضروری نہیں - لیکن یہ ضرور ہے کہ گزشتہ سال کی نسبت اس سال مچھروں کی تعداد اور جسامت بڑھ گئی ہے۔

ڈاکٹر ندامت حسین:- جسامت تو آپ کے خون کے اثر سے بڑھی ہوگی۔

ورما:- میں اپنے گھر کی نہیں محلے کے مچھروں کی بات کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر ندامت حسین:- ثبوت -

ورما:- ابھی پیش کرتا ہوں - میری جیب میں موجود ہے - دیکھیے اس ڈبیہ میں نمونے کے طور پر کچھ مچھر لایا ہوں۔

ڈاکٹر ندامت حسین:- یہ مچھر شہر کے نہیں ہیں۔

ورما:- اور کہاں کے ہیں؟

ڈاکٹر ندامت حسین:- یہ باہر سے آئے ہوئے ٹورسٹ مچھر ہیں۔ گھوم پھر کر لوٹ جائیں گے۔

ورما:- کہاں؟

ڈاکٹر ندامت حسین:- جہاں سے آئے ہیں۔

ورما:- کہاں سے آئے ہیں؟

ڈاکٹر ندامت حسین:- اب ایک جگہ ہو تو بتاؤں - لیکن زیادہ تر یہ مچھر دوسرے بڑے شہروں سے آئے ہیں۔

یہ تھے مسٹر ودھوا۔ مچھر کمیٹی کے چیئرمین — خوب مزیدار آدمی ہیں۔ کہتے ہیں مسز حسین کے ساتھ اسکیم ڈِس کس کرنی ہے۔ دراصل مسز حسین سے بہت مرعوب ہیں — اُن کی قابلیت کے جوہر مانتے ہیں۔ اسی لئے ان سے اکثر اسکیم ڈِس کس کرتے ہیں۔ کریں — میری بلا سے کریں۔ لیکن میں مسز حسین کے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں؟ مجھے اپنا کام بھی تو کرنا ہے۔ اپنی اسکیمیں ڈِس کس کرنی ہیں۔ اُف کس قدر کام ہے ابھی تو فائل ورک بہت کم ہے۔ ورنہ — صاحب میں تو کہتا ہوں آپ کلرک بن جائیے۔ ماسٹر بن جائیے۔ موقع ملے تو پروفیسر بھی بن جائیے لیکن ڈاکٹر مت بنیے۔ اور خصوصاً مچھروں کا ڈاکٹر۔ توبہ۔ مچھر لوگوں کا خون چوستے ہیں اور لوگ مچھروں کے ڈاکٹر کا۔

ورما۔ لیکن ندامت صاحب! مچھر کاٹتے بھی تو بہت ہیں۔

ڈاکٹر ندامت حسین۔ ندامت صاحب نہیں۔ ڈاکٹر ندامت حسین خاں صاحب۔ مچھر کاٹیں گے نہیں تو کیا دودھ دیں گے؟ لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ آپ کو نہیں کاٹتے۔ دکھلائیے اپنے ہاتھ ذرا۔

ورما۔ دیکھئے۔

ڈاکٹر ندامت حسین۔ واہ۔ واہ۔ آپ تو بہت غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں صاحب۔ آپ کے ہاتھوں پر مچھروں کے کاٹنے کے کوئی نشان نہیں۔ آپ کا چہرہ تو ماشاء اللہ اسے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مچھروں نے کبھی اس جانب رخ ہی نہیں کیا۔ جسم پر بھی کوئی نشان نہ ہوگا — ذرا قمیص اتاریئے تو۔

ورما۔ قمیص! نہیں نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے ندامت صاحب۔

ڈاکٹر ندامت حسین۔ ندامت صاحب نہیں ندامت حسین خاں صاحب۔ ہاں دیکھئے گھبرائیے نہیں۔ یہ ملیریا کے مچھر نہیں۔ آپ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔

ورما۔ لیکن صاحب کیا بتلاؤں؟ ان کی عادتوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ جس کمرے میں جاؤ مچھر لٹکتے ہوئے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ ایک سُر سے گا رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو مشاعرے کا گمان ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ندامت حسین۔ مشاعروں سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ انسان کو اپنی قوتِ برداشت کو مضبوط بنانا چاہیئے۔ ہر مصیبت کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ وہ ایسا کا ناتواں انسان کیا نصیب کی جو ٹھوکریں نہ سہہ سکے۔
ارے غفور کہاں چلا جاتا ہے؟

غفور۔ حضور یہیں ہوں۔

ڈاکٹر ندامت حسین۔ جا جلدی سے ڈبیا میں دو تین درجن پان رکھوا لا۔

بہت اچھا حضور۔

ڈاکٹر ندامت حسین۔ ہاں صاحب مچھروں کے متعلق کوئی اور شکایت؟

ورما۔ صاحب! نہ دن کو سونے دیتے ہیں نہ رات کو۔

ڈاکٹر ندامت حسین۔ دن کو سونا تو مضرِ صحت ہے لیکن رات کو سونے سے کیوں منع کرتے ہیں؟

ورما۔ کاٹتے ہیں۔

ڈاکٹر ندامت حسین۔ بہت بدتمیز ہیں لیکن آپ انہیں قریب آنے کا موقع ہی کیوں دیتے ہیں۔ مچھر دانی لگا کر سویئے۔

ورما۔ صاحب کیا بتلاؤں۔ اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ ہمیں ایک نہیں دس مچھر دانیاں چاہئیں۔ اور صرف ایک کی قیمت بیس روپے ہے۔ دوسرے ہمارے مکان کے کمرے اس قدر چھوٹے ہیں کہ دو پلنگ مشکل سے آسکتے ہیں۔ آنگن کمروں سے بھی چھوٹا ہے۔

ڈاکٹر ندامت حسین۔ رات کو پنکھا لگا کر سویئے۔

ورما۔ گھر پر دو ماہ سے ہاتھ کے پنکھے کی فرمائش ہو رہی ہے لیکن . . . .

ڈاکٹر ندامت حسین۔ ہاتھ کا نہیں بجلی کا۔

ورما۔ بجلی کا! کیا وہ چار آنے میں مل جائے گا؟

ڈاکٹر ندامت حسین۔ ہاہاہا — وہ چار آنے میں مٹر — وہ چار آنے

میں تو موت بھی نہیں ملتی۔

ورما:۔ مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔

ڈاکٹر ندامت حسین:۔ کس کا ہے؟

ورما:۔ صرف مچھروں کا' جو اس قدر پریشان کرتے ہیں۔ ملیریا پھیلنے کا بھی تو اندیشہ رہتا ہے۔

ڈاکٹر ندامت حسین:۔ ملیریا کا اندیشہ! آپ ملیریا سے کیوں ڈرتے ہیں؟ آپ کا تو ہیضہ بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

ورما:۔ میں ہیضے سے نہیں ڈرتا۔ ہاں اس طرح حوصلہ بڑھانے کے لئے آپ کا شکرگزار ہوں۔

ڈاکٹر ندامت حسین:۔ شکرگزار ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے فرض کو نبھا رہا ہوں۔ آپ لوگوں کو پتہ ہونا چاہیئے کہ تمام مچھر نقصان نہیں پہنچاتے۔

ورما:۔ کچھ تو شاید فائدہ بھی پہنچاتے ہیں۔

ڈاکٹر ندامت حسین:۔ اور لوگ ہاں اتنی سی بات کو سمجھے بغیر اور مچھروں کو اور ساتھ ہی مچھر مار کمیٹی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔

ورما:۔ برا کرتے ہیں۔ آپ کی سنہری خدمات کے صلے میں آپ کو سنہری تمغے ملنے چاہئیں۔

ڈاکٹر ندامت حسین:۔ آپ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائیے اور میری اور مچھر مار کمیٹی کی بے لوث خدمات کی انہیں یاد دلائیے۔ میں بھی لوگوں کے بیچ جاتا ہوں۔ تقاریر کرتا ہوں۔ انہیں صفائی رکھنے، مچھر دانی استعمال کرنے، کھلے ہوادار مکانوں میں رہنے اور اچھی خوراک کھانے کی تلقین کرتا ہوں۔

ورما:۔ آپ بہت اچھا کرتے ہیں۔ تقریروں سے سب دکھ دور ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اقبال کا شعر سنا ہوگا ؎

گفتار کا غازی تو وہ بنا کردار کا غازی بن نہ سکا۔

ڈاکٹر ندامت حسین:۔ اجی صاحب! اقبال کا شعر سننے کی کسے فرصت ملتی ہے۔ ہاں لوگوں کا من ضرور موہنا پڑتا ہے۔

اشتہار

ورما:۔ اس میں تو ماہر ہو گئے ہوں گے۔

ڈاکٹر ندامت حسین:۔ میں لوگوں سے کہتا ہوں۔ آپ سب کچھ کیجئے۔ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیئے۔

ورما:۔ ندامت جی! یہاں تو قسمت کچھ ایسی ہے کہ دامن ہاتھ آتا ہی نہیں۔

ڈاکٹر ندامت حسین:۔ آ جائے گا۔ ہاں' ندامت جی نہیں۔ ڈاکٹر ندامت حسین خاں صاحب۔ سمجھے۔

ورما:۔ جی۔

ڈاکٹر ندامت حسین:۔ اور دیکھئے ہم ایک جلوس نکالنے والے ہیں۔

ورما:۔ اپنا۔

ڈاکٹر ندامت حسین:۔ مچھروں کا۔ یعنی مچھروں کے متعلق اس میں نعرے لگائے جائیں گے۔ "مچھروں کا ناش ہو۔ یہ موذی انسان کے دشمن ہیں۔ مچھر دانی لگاؤ۔ اچھا کھانا کھاؤ۔ ہوادار مکان بنواؤ۔" ایسے جلوس سال میں چار پانچ مرتبہ نکالے جائیں گے۔

ورما:۔ پھر تو مچھروں کا ضرور ناش ہو جائے گا۔

ڈاکٹر ندامت حسین:۔ ہو چکا ہے۔ ہمارے پمفلٹ کے صفحہ دس پر صاف صاف لکھا ہے کہ مچھر نام کی شے کا ہم نے وجود تک مٹا دیا ہے۔

ورما:۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے بہت اچھا کیا جو کم از کم پمفلٹ پر سے اس کا وجود مٹا دیا۔ نام بھی مٹا دیتے تو اور اچھا ہوتا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب لوگوں کو پھر بھی شرم نہیں آتی۔ جب دیکھو ملیریا میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کچھ تو ایسے بے شرم ہیں جو اسے بگاڑ کر ٹائیفائڈ کا روپ دے دیتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ڈھیٹ ہیں جو اس جہان فانی سے کوچ کرنے میں بھی اپنی بھلائی سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر ندامت حسین:۔ ابھی اس سے کیا ہوتا ہے؟ چند آدمیوں کے مر جانے سے ہماری پالیسی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ پھر موت پر کس کا بس ہے؟ آپ تو ملیریا کی بات کرتے ہیں [illegible]

یہ یہاں سے اٹھ کر چلا جائے اور چھت گر پڑے تو بتلایئے
آپ کا کیا حال ہو؟

ورما:- لیکن ندامت صاحب! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میرے
اٹھ کر چلے جانے کے بعد آپ پر چھت گر جائے۔

ڈاکٹر ندامت حسین:- لاحول ولا قوۃ۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔
چھت گرے ہمارے دشمنوں پر۔ ارے غضب یاد آیا،
مجھے مسز حسین کے ساتھ شوپنگ کرنے جانا ہے۔ اچھا
مسٹر..... میں آپ کا نام بھول گیا۔

ورما:- یہ تو ٹھیک ہی ہوا، ایک مصیبت سے بچ گئے۔

ڈاکٹر ندامت حسین:- پھر بھی۔

ورما:- کچھ بھی فرض کر لیجئے ایرا غیرا نتھو خیرا۔

ڈاکٹر ندامت حسین:- اچھا مسٹر نتھو خیرا! آپ سے مل کر
بڑی خوشی ہوئی۔

ورما:- لیکن ڈاکٹر صاحب۔ مچھروں کے متعلق......

ڈاکٹر ندامت حسین:- ان کے متعلق آپ مطلق فکر نہ کیجئے۔ مچھر وچھر
سب ختم ہو چکے ہیں یا ختم ہو جائیں گے۔ ٹورسٹ پھر
واپس لوٹ جائیں گے۔ آپ کو گھبرانے کی چنداں ضرورت
نہیں۔ آخر ہم نے ایک لاکھ روپے یوں ہی تو خرچ نہیں
کئے۔ اگر آپ کو اس پر بھی تسلی نہ ہو تو یہ پمفلٹ لے جایئے۔
آرام سے رہئے۔ ماشاء اللہ آپ جیسا لحیم شحیم انسان
مچھروں سے ڈرے۔ یہ بڑی بزدلی کی بات ہے۔ اچھا
خدا حافظ۔

(کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں)

ورما:- لیکن ڈاکٹر صاحب! مچھر..... گئے چلے گئے
ارے غفور چلے گئے ---!

غفور:- اب آپ کس کا انتظار کر رہے ہیں، آیئے چلئے۔

(پردہ گرتا ہے)

صفحہ ۴۲ کا بقیہ --- مکاتیب شبلی

یاد کیا ہے۔

فصل تکرار کے نتائج پر ہمیں ان کی متنوع صلاحیتوں کو پیش نظر رکھ کر غور کرنا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ ایک عمدہ شاعر، ایک بڑا محقق، ماہر اسلامیات اور رہنمائے تعلیم بھی تھا۔ موخر الذکر صلاحیتوں کے حامل کو لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ تقریباً فرشتہ ہو۔ یا کم از کم عام انسانی جذبات اور تقاضوں سے خالی ہو۔ خشونت اور اجڈپن سے مملو ہو۔ لہٰذا شاعری کا میل اس کے ساتھ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس میں نہ شبلی کا قصور ہے اور نہ لوگوں کا۔

شبلی نے وادیٔ گل کی رنگینی سے بساط بھر فائدہ اٹھایا۔ گلزار تخیل سے جی بھر کر گل چینی کی اور ادب کے دامن کو دامانِ باغبان و کف گلفروش بنا دیا۔ خلوص و بے ریائی کی حقیقی تصویریں پیش کیں۔ ہمت افزائی اور ترتیب و توصیف کے انوکھے انداز بتلائے۔ 'ریختہ' منانے کے مناظر پیش کئے۔ رخش دل کو سرپٹ دوڑایا مگر رکاب کو پاؤں سے اور باگ کو ہاتھوں سے چھوٹنے نہ دیا۔ لکھا بھی لکھایا بھی۔ پڑھا بھی --- حسن کو دیکھ کر حسنِ معانی کی تفسیر دی۔ دلوں کو صدق و صفا کی اور نظروں کو ادب کی تنویر دی۔ غرض اس پورے سرمایہ کے مطالعہ سے عین شبلی کی عظمت میں کسی کمی کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ اس چٹان کی طرح بلند تھے جس کے چھوٹے چھوٹے قدرتی گڑھے بھی حسن لئے ہوئے ہیں کہ ان میں جمع شدہ پانی سے حسین پرندے اپنی پیاس بجھا سکیں۔ وہ اس بلند و بالا درخت کی طرح تھے کہ جس پر لگنے والی پھپھوندی کی رنگا رنگی سے درخت کی اصلیت اور اہمیت میں فرق نہیں آتا۔ بلکہ الٹا اس درخت کی عظمت سے عارضی طور پر سہی وہ پھپھوندی اپنے لئے ایک بلند مقام پیدا کر لیتی ہے۔ اور اس درخت کے شیدا کبھی کبھی اس پر بھی نظر ڈال لیتے ہیں جس سے محض عظمت سے وابستگی کے باعث اسے بھی زندگی ملتی ہے۔ لیکن حاصل شدہ مواد کی بنا پر حقیقت پسند جان لیتے ہیں کہ وہ جو بہروان خطوں کے مخاطب نے شبلی سے حاصل کیا اس غرض کے مقابل نہایت گرانقدر ہے جو اس نے شبلی کو دیا۔

رشیدہ رضویہ

بغداد کی چاندنی
یروشلم کی دھوپ

"بد دعاؤں کی بارش"

اللہ نے چاہا تو تمہاری موٹر خراب ہو جائے گی اور تم عمان نہ پہنچ سکو گے۔ یہ بد دعا "الحرم الابراہیمی" میں ایک مجاور نے دی۔ حضرت ابراہیم کے نام پر یہ مسجد خلیلیہ میں ہے۔ اس شہر کو HEBRON بھی کہا جاتا ہے۔ خلیلیہ کے متعلق ہم یہ تاثر لے کر چلے تھے کہ بیت المقدس اور بیت اللحم کی مانند پر شکوہ شہر ہوگا وقت کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ہوگا۔ بیت المقدس کی مانند یہاں بھی پان امریکن اور ایمبیسڈر جیسے ہوٹل ہونگے جو ہمارے ہوسٹل نما پناہ گاہ (گھر سے اتنی دور تھے کہ اسرائیلی یروشلم میں ہونے کا گمان گزرتا تھا) بیت المقدس میں تو ہوائی اڈہ بھی تعمیر ہو چکا ہے۔ خیال تھا کہ خلیلیہ میں ٹرین کی لائن بھی ہوگی۔ اور بیت اللحم کی مانند یہاں بھی کسی گھریلو صنعت کا کارخانہ ہوگا لیکن فلسطین کے اس تیسرے مقدس شہر میں ایسی کوئی بات نظر نہ آئی۔ سیاحوں کی تمام تر آمد و رفت بیت المقدس اور بیت اللحم میں ہونے کی وجہ سے یہی دو شہر حکومت اسرائیل کی نگاہوں کا بھی مرکز ہیں۔ خلیلیہ پر بغداد کے قصبہ مسیب کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن مسیب میں شہری زندگی کے ترقی یافتہ آثار بھی ہیں۔ یہاں وہ بات نہیں۔ فقط ایک مسجد یعنی "الحرم ابراہیمی" ہے جس پر مسجد کے بجائے مزار کا زیادہ گمان ہوتا ہے۔ یہاں شہداء

> بیت المقدس میں اذان کے وقت دودھ والا بہ زبان اردو نعرہ لگاتا تو ہمیں محسوس ہوتا کراچی میں گھر کے باہر دودھ والا چلا رہا ہے۔

حضرت ابراہیم کے پہلو میں بی بی سارہ اور اسحٰق و یعقوب کے مزارات بھی تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ حضرت یعقوب کا کنواں بھی یہیں کہیں ہوگا۔ اس کنوئیں کا یروشلم میں بہت ذکر سنا تھا اور تاثیر بھی اس کنوئیں کی وہی تھی جو اسلامی ممالک کے دیگر کنوؤں کی ہے۔ کہیں پڑھا تھا کہ انگلینڈ اور فرانس میں بھی رومن کیتھولک راہبوں اور راہبات کے معروف کنوئیں تھے جن کا پانی ہر مرض کو شفا دیتا تھا۔ اب معلوم نہیں تاثیری کنوؤں کا تصور مشرق سے مغرب میں گیا ہے یا مغرب سے مشرق میں آیا ہے۔ بہرحال حضرت یوسف کے کنوئیں کے وجود کی وجہ تو سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ان کے بھائیوں نے انہیں کنوئیں میں دھکیلا تھا لیکن حضرت یعقوب سے بھلا کونسا کنواں وابستہ تھا جو یروشلم کے شمال میں تقریباً ۴۹ میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹے سے شہر نبلوس کے قریب ہے۔ نبلوس فلسطین کے کسی قدیم مذہبی قبیلے کی عبادت گاہ ہے۔ اور زیتون کے جھنڈوں کے لئے مشہور ہے۔ لیکن خلیلیہ کچھ خشک اور بنجر سا علاقہ ہے جس کی مسجد اور مزارات میں بھی کوئی ستھراپن اور خوبصورتی نہیں۔ خلیلیہ سے آگے مشرق اور جنوب کی طرف [illegible] اسلامی شہر نہیں۔ بنجر زمین اور [illegible] اسرائیل و فلسطین کی حدود ہیں۔ اسرائیلی اپنے علاقے [illegible] حدود سے پرے نگاہیں دوڑا کر پہرہ داری کرتے ہیں۔ اور [illegible]

سکتے ہیں۔ کیونکہ ان مسجد کے شمال مغرب میں حضرت موسیٰ کا مزار ہے جسے مسلمین اپنے جدا مجد کا مزار کہتے ہیں۔ اور افسوس کرتے ہیں کہ ان کے مقدس مقامات مسلمانوں کو مل گئے۔ اور مسلمانوں کے بعض مقدس مقامات اسرائیل میں رہ گئے۔ حضرت موسیٰ کا مزار کئی مرتبہ اسرائیل نے حاصل کرنے کی بھی کوشش کی ہے لیکن مزار ہے کہ عام مسلمانوں کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہے۔ نہ محکمۂ اطلاعات اردنیہ اس کا ذکر کرتا ہے نہ کوئی فلسطینی۔

جب مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے ہم خلیلیہ میں داخل ہوئے تو جو مسرت اور تحیر مسجد اقصیٰ اور بیت اللحم کا گرجا یعنی CHURCH OF THE NATIVITY دیکھ کر ہوا تھا۔ وہ سب زائل ہو گیا۔ جیسے ہی ہم الحرم الابراہیمی کے دروازہ پہ رکے ایک ہجوم ہمارے گرد جمع ہو گیا۔ ہجوم میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے عورتیں بھی اور مرد بھی۔ یہ بات نہیں کہ چین جانے والے پاکستانی ادبا کی مانند ہمارا بھی یہاں پُرزور استقبال ہو رہا تھا۔ ان عورتوں اور بچوں کے ہاتھوں میں اپنے شہر کے پرچم اور پھولوں کے ہار نہ تھے۔ بلکہ ایک صدا ایک پکار تھی۔ بچوں کی ناک بہہ رہی تھی۔ چہرے میلے اور پاؤں ننگے تھے۔ اور ہاتھ خالی۔ یہ چاہتے تھے کہ کوئی ان کی خالی جھولی بھر دے ہمارے لئے عجیب صورتِ حال تھی۔ بڑی مشکل سے راستہ بنا کے الحرم الابراہیمی میں داخل ہوئے۔ اس کا انتظام والنصرام بھی محکمۂ اوقاف کے ذمہ ہے لیکن یہ محکمہ اوقاف بھی بڑا ستم ظریف ہے۔ کہیں تو مجاوروں کو پابند کر رکھا ہے اور کہیں کھلی اجازت دے رکھی ہے کہ جس قدر سمیٹ سکتے ہو سمیٹ لو۔ بہرحال ہم اندر داخل ہو گئے اور ہجوم چیختا چلاتا رہ گیا۔ کیونکہ بغیر پرمٹ اندر آنے کی اجازت نہیں۔ یہ مسجد ... حضرت ابراہیم کا مزار کچھ بے رنگ ہے وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان پیغمبروں کو رنگ و آرائش سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ لیکن اگر یہ مزار پاکستان کے کسی شہر میں ہوتا تو اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی۔ بغداد کے بعض مزارات اس سے بھی بُری حالت میں نظر آتے ہیں۔

فاتحہ پڑھ کر ہم باہر نکلے تو ہجوم منتظر تھا۔ مجاور نے ارشاد فرمایا کہ ہجوم کو تبرک دو۔ اب مزاروں پہ کونسا تبرک بٹا تھا کہ ہم ہجوم کو عنایت کرتے۔ بڑی دیر بعد سمجھ آیا کہ مراد دراصل فلوس سے ہے۔ اب ہم اتنے ڈھیر لوگوں کے لئے فلوس کہاں سے لاتے؟۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ کوئی ہمیں دیتا۔ کیونکہ بیروت کے حاجی صاحب سے جو رقم لی تھی وہ قریب الختم تھی۔ اور بغداد پہنچنا جوئے شیر لانا نظر آ رہا تھا۔ جانے ہمارے ہاتھوں میں سوراخ تھے یا کیا بات تھی کہ پیسہ کسی طور نہ ٹکتا تھا۔ بچپن کی سوچتے تو اور زیادہ پھسل پھسل جاتا۔

"کیسے لوگ ہو تم۔ پاکستان سے آئے ہو اور خالی ہاتھ۔ پاکستان اتنا غریب ہے کیا؟ مجاور منہ پھاڑ کر بولا اور یہیں سے ہمارے اور اس کے درمیان ایسے دلچسپ مکالمات کا تبادلہ ہونے لگا کہ اگر اردو اخبارات کے مزاح نگار وہاں موجود ہوتے تو کوئی کالم تیار کر لیتے۔ لیکن یہ مجاور بھی عجب مسخرہ تھا۔ اتنا نہ جانتا تھا کہ خلیلیہ سے پرے عمان اور بغداد میں تو خود پاکستانی ہاتھ پھیلائے پھرتا ہے۔ عمان کے عام لوگ اب بھی پاکستانیوں کو جانے کیا کچھ سمجھتے ہیں۔ البتہ اہل بغداد کا نظریہ تبدیل ہو رہا ہے۔ کیا وجہ ہے؟۔

پی آئی اے کی حالیہ سروس کے یورپ جانے والے خوش شکل اور خوش پوش پاکستانیوں کی جھلک اہل بغداد کو دکھا دی ہے۔ پاکستانیوں کے متعلق عربوں کے تبصرے سننے کے بعد جب میں اہل وطن سے عربوں کا ذکر سنتی ہوں تو بے اختیار JAMES WELCH کا مضمون

مجاور شیروں کی مانند گرج گرج کر ہمیں بددعائیں دے رہا تھا اور

وہ بھی اردو میں

تم لوگوں میں ضرور عرب خون ہے۔ ورنہ

تم سے پیشتر

جو پاکستانی آئے تھے وہ مجاوروں کے

اِشارے پر چلے۔ ہمارے غضب سے ڈرو۔

راستے میں تم لوگوں کی موٹر ضرور خراب

ہو جائے گی اور تم لوگ خود واپس آ کر

خیرات کرو گے!

"AS OTHERS SEE US" اور رابرٹ برنز کے یہ اشعار یاد آجاتے ہیں ؎

O WAD SOME POWER THE GIFTIE GIE US
TO SEE OURSELVES AS OTHERS SEE US

"پاکستان نے ہمارے لئے کیا کیا ہے؟" دورانِ مکالمات مجاور یکلخت گرم ہو گیا۔ اب تک گفتگو کا رنگ مزاحیہ تھا۔ پاکستان نے فلسطینیوں کے لئے کچھ کیا یا نہیں۔ یہ تو خود فلسطینی بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن خود عربوں نے عربوں کے لئے کیا کیا ہے۔ خانہ جنگیوں سے اپنی نسل تباہ کر رہے ہیں۔ اسرائیل کے لئے خود راستے ہموار کرتے ہیں۔ اگر یہ مزار محکمۂ اوقاف کے ہاتھ میں نہ ہوتے تو حزب البعث کے یہاں بھی ڈیرے ہوتے۔ دمشق کی سیاست یہاں بھی اپنے مخصوص رنگ میں ہوتی۔ اور قتل و غارت یہاں بھی ہوتے۔ جس سے مسجد اقصیٰ تک نہ بچ سکی تھی۔ ۲۰ جولائی ۱۹۵۱ء کو جب شاہ عبداللہ نماز جمعہ کے لئے مسجد اقصیٰ میں داخل ہو رہے تھے تو قتل کر دیئے گئے تھے۔

مکالمات میں جب گرمی آئی تو یکایک ڈرامائیت بھی پیدا ہو گئی اور ہمیں اپنے کانوں پہ یقین نہ آیا۔ بیت المقدس میں اذان کے وقت [illegible] بہ زبان اردو نعرہ لگاتا تو یہی محسوس ہوتا کہ کراچی میں گھر کے باہر [illegible] چلا رہا ہے۔ قریبی مسجد میں اذان بھی ہو رہی ہے اور گاندھی گارڈن کے شیر بھی اسی لمحہ دہاڑ رہے ہیں۔ بیت المقدس میں چڑیا گھر تھا نہ شیروں کی آواز۔ البتہ خلیلیہ کا یہ مجاور شیروں کی مانند گرج گرج کر بد دعائیں دے رہا تھا وہ بھی اردو میں۔ بھئی واہ پہلی مرتبہ فلسطین کے اس قصبہ میں معلوم ہوا کہ بد دعاؤں کے لئے اردو کس قدر موزوں اور مفید زبان ہے۔ ورنہ عربی میں تو آباء الوجہ (تیرے پیٹ میں درد ہو) آباء الشکول (تو بدصورت ہو جائے) اور قزز قرت (تیرے منہ میں شہد بھر جائے) وغیرہ وغیرہ ہی سنتے تھے۔ لیکن اس مجاور نے تو بڑے ٹھاٹھ سے کہا۔

"راستہ میں تم لوگوں کی موٹر خراب ہو جائے گی اور تم لوگ خود ایس آکر خیرات کرو گے۔"

"ہم لوگ خیرات کریں یا نہ کریں لیکن تم لوگ یونہی مجدّی (نفقیس) ہو گئے ہو۔"

"ہمارے غضب سے ڈرو" یہ جملہ عربی میں کہا، "ہمارا بد دعا اسرائیل مستجاب [illegible] کا کوئی مافوق لگتا ہے۔ ہم حضرت ابراہیم کا اولاد ہے۔"

"ہم بابا آدم کا اولاد ہے۔ ہم کو تمہارا بد دعا نہیں لگتا۔ لیکن یہ تم عرب ہو کر اسرائیل کی گولیوں سے ڈرتے ہو۔" ہم نے ہنس کر کہا اور جھنجھلا کر مجاور نے ہجوم کو منتشر کر دیا۔ اور ہم غصیلی نگاہوں سے نگاہیں چرا کر سرعت سے موٹر میں بیٹھ گئے۔ اور شیشے چڑھا دیے۔ جو کہیں ہم اس ہجوم کے ہاتھ لگ جاتے تو یقیناً ہماری دھجیاں بکھر کر رہ جاتیں۔

"تم لوگوں میں ضرور عرب خون ہے۔ ورنہ تم سے پیشتر جو پاکستانی آئے مجاوروں کے اشارے پہ چلے۔ تم نے مجاور کو خفا کر دیا ہے۔ اب دیکھنا موٹر ضرور خراب ہوگی۔" ڈرائیور نے ڈرایا۔ لیکن سنی ان سنی کر کے ہم شیشے سے باہر جھانکنے لگے۔ ہم ایک مرتبہ پھر یروشلم کی طرف جا رہے تھے۔ دھوپ تاحد نگاہ پھیلی تھی اور سورج آسمان کے عین درمیان چمکتا تھا۔ یہ مشرق کا سورج تھا اور مشرق کی ہر چیز میں تیزی اور چمک ہے۔ مشرق سے ہی تین دانشمند مشرق کے ستارے کے ساتھ ساتھ بیت اللحم پہنچے تھے۔ مشرق میں کیا کچھ نہ تھا۔ اس کے باوجود مشرق کے سیاسی افق پہ سورج مغرب سے طلوع ہوتا تھا۔ یروشلم سے آنے والی دھوپ موٹر کے شیشوں سے اندر آکر تمام جسم میں سوئیوں کی مانند چبھتی تھی۔ ان ہاتھوں کا احساس دیتی تھی جو وطن کی زمین میں کام کرنے کے بجائے بیکار ہو کر مزاروں اور مقبروں کے ارد گرد پھیلے تھے۔ یہ دھوپ آنکھوں میں اترتی تھی تو سامنے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ نگاہ اقوام متحدہ کے ضمیر کی مانند بے نور ہو جاتی تھی۔ یہی دھوپ ریت پہ چمکتی تھی تو چاندی کا ڈھیر پڑا نظر آتا تھا۔ اسرائیل نے چاندی کے اس سراب کو سچ مچ کی چاندی میں تبدیل کر دیا ہے اور اپنی نارنگیاں و ناشپاتیاں یورپ کو روانہ کر رہا ہے۔ لیکن فلسطینی ہیں ہاتھ زمین کھودنے کے بجائے ——" سوچ کا تسلسل ٹوٹ گیا کیونکہ گرد آلود راستہ پہ موٹر چلتے چلتے ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گویا صحرا کا کوئی بھوت سامنے آگیا تھا۔ لیکن موٹر خراب ہو جانے کا مژدہ دے کر ڈرائیور نے خلیلیہ پلٹنے اور خیرات کرنے کا مشورہ دیا۔ جبکہ یروشلم چند قدم پہ تھا۔ اور جب دریافت کیا کہ خلیلیہ ــ اتنی دور کیونکر جائیں گے جب کہ یروشلم تو پیدل بھی جا سکتے ہیں۔ تو جواب ملا کہ موٹر ابھی درست ہو جائے گی یہ کہکر ڈرائیور انجن کھول بیٹھا ــ "اچھا تو تم موٹر خلیلیہ لے جاؤ ہم یروشلم جا رہے ہیں" یہ کہکر ہم موٹر سے اترے تو جناب موٹر کی تمام تر خرابی فوراً دور ہو گئی اور ڈرائیور اسٹیرنگ پکڑ کر نہیں بلکہ اپنا سر پکڑ کر موٹر چلانے لگا۔ (باقی آئندہ)

مسلسل ناول

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ تقسیم برصغیر سے دو سال پہلے کا واقعہ ہے ۔ جم اپنے دوست ٹھاکر رنبیر سنگھ کے علاقہ میں شکار کھیلنے گئے۔ وہاں ایک آدم خور شیر کی اطلاع ملی۔ جس نے ایک بنجارے اور ٹھاکر صاحب کے گاؤں گلریا مہاراج پور کے ایک نوجوان گوالے کو مار دیا تھا۔ جم نے جب اس شیر کو تلاش کرکے مارنے کی کوشش کی تو ایک پراسرار منظم گروہ کی سرگرمیاں علم میں آئیں جس کا گڑھ اکبرآباد کے گھنے جنگلوں میں معلوم ہوتا تھا۔ اس انکشاف پر پولیس کے دستے جنگل میں پہنچ گئے اور چھان بین کرنے لگے۔ جم آدم خور شیر کو شکار کرکے واپس ہوئے تو سفر میں ایک پُراسرار اینگلو انڈین کا ساتھ ہوا۔ جس سے ناقابل فہم حالات میں لڑائی ہو گئی۔ اور وہ جم کو بری طرح زخمی کرکے ٹرین سے فرار ہو گیا۔ اس کے سامان سے ۷۵ بور کی ایک ایسی رائفل برآمد ہوئی جس پر نہ تو کوئی نمبر تھا اور نہ بنانے والی فرم کا نام۔ جم نے اس پراسرار ہتھیار کا تعلق بھی اس خفیہ گروہ سے سمجھا اور اس پورے معاملہ میں انہیں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اینگلو انڈین سے اس معرکہ میں وہ سخت زخمی ہو گئے اور بہت دن ہسپتال میں رہ کر تبدیلی آب و ہوا کے لئے بھوالی چلے گئے جہاں ایک دن یہ انکشاف ہوا کہ اس پراسرار گروہ نے ان کے دوست ٹھاکر صاحب کو اغوا کر لیا ہے اور یہ شرط لگا دی ہے کہ جب تک اکبرآباد کے جنگل سے پولیس نہ ہٹائی جائے گی انہیں رہا نہیں کیا جائے گا۔ یہ خبر لے کر ٹھاکر صاحب کی بیگم خود نینی تال آئی تھیں اور اس گروہ کی طرف سے اس سلسلہ میں جو خط ملا تھا وہ بھی ساتھ لائی تھیں۔ یہ خط آر آر آر نامی خفیہ تنظیم کی طرف سے تھا۔ اپنے دوست کے اغوا ہو جانے کی خبر پاکر جم نے نینی تال میں ہی اپنے ایک اور دوست آغا صادق کی مدد حاصل کی جن کا حکومت اور سرکاری حلقوں میں بڑا رسوخ تھا۔ آغا صادق نے فوری طور پر گورنر سے احکامات جاری کرا دیے کہ اکبرآباد سے پولیس واپس بلالی جائے۔ اس حکم پر فوری عمل ہوا۔ جم کو آر آر آر کی طرف سے شکریہ کا خط بھی ملا لیکن ٹھاکر صاحب کو رہا نہیں کیا گیا۔ مجبور ہو کر جم نے گورنر سے استدعا کی کہ آر آر آر کا پتہ چلانے اور متعلقہ افراد کو قانون کی گرفت میں لانے کی خدمت ان کے سپرد کر دی جائے۔ گورنر نے آر آر آر کے بظاہر پراسرار اور پیچیدہ معمّے کو حل کرنے کے لئے جم کی پیشکش منظور کر لی اور انہیں پولیس کی ایک خاص برانچ کا کمشنر مقرر کرکے خاصے اختیارات تفویض کر دیے۔ آر آر آر کی نظروں سے پوشیدہ رہنے کے لئے جم نے اپنی حادثاتی موت کا ڈھونگ رچایا۔ اور خود آغا صادق کے پٹھان دوست عیسیٰ خان کے ساتھ سادھوؤں کا بھیس بدل کر جنگل اور پہاڑوں کے راستے اکبرآباد کے جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں انہوں نے سادہ لوح پہاڑی دیہاتیوں کا دل موہ لیا۔ ان کو بے دریغ روپیہ پیسہ دیا

ان کے تعریف اور آمدنیے اور ان کو اپنی معنوی بزرگی سے گرویدہ کرتے ہوئے یہ دونوں جب ایک پہاڑی جنگل سے گزر رہے تھے تو ایک آدم خور شیر سے مڈبھیڑ ہو گئی جو ایک انگریز نوجوان کی لاش کھا رہا تھا۔ جم نے شیر کو مار دیا اور اس انگریز کی لاش سے بعض خفیہ تحریریں برآمد ہوئیں۔ جم نے وائرلیس پر آغا صادق سے رابطہ قائم کر کے لاش اٹھوانے جلانے اور خفیہ تحریریں حکام کے سپرد کرانے کا انتظام کیا اور خود آگے بڑھے۔ اور بالآخر بلند و بالا اور دشوار گزار پہاڑوں کے درمیان انہیں ایک پرانی طرز کی قلعہ نما عمارت نظر آئی جس میں مسلح افراد موجود تھے۔ ان دونوں نے ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر دیکھا کہ ایک اور مسلح انگریز گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا اور پہاڑوں کی طرف روانہ ہوا۔ جم کو بڑی تشویش ہوئی کہ یہ لوگ کون ہیں؟ ان کا اور اس انگریز نوجوان کا کیا رابطہ ہو سکتا ہے جس کو آدم خور شیر نے ہلاک کیا تھا۔ اور ان سوالوں کا جواب صرف اسی صورت میں مل سکتا تھا کہ وہ انگریز جو گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑوں کی طرف گیا تھا ان کی طرف آ نکلے اور یہ جان پر کھیل کر اسے پکڑ لیں۔ اور اس طرح ایک ایک لمحہ گزرنے کے ساتھ ان دونوں کا اضطراب بڑھتا گیا۔ اور یہ بے چینی سے آنے والے واقعات کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ گھوڑا سوار برآمد ہوا تو عیسیٰ خان نے اسے گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے اپنا نام لیفٹیننٹ پرسیول بتایا۔ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑے افسر نے اسے گرفتار کیا ہے تو اس نے اپنے بارے میں کچھ تفصیل سے نہیں بتایا۔ البتہ یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اس کے تعلق آر آر کے گروہ سے ہے۔ اور اسی راز کے افشا ہو جانے کی وجہ سے اس نے اپنی انگوٹھی میں لگی ہوئی زہریلی سوئی سے خودکشی کر لی۔ پرسیول کی خودکشی سے معاملہ اور الجھ گیا۔ غور و فکر کے بعد آخر یہ طے پایا کہ عیسیٰ خان ان کا ڈاک تک واپس جائے جہاں جم نے داد و دہش کا مظاہرہ کیا تھا اور وہاں کسی صورت سے آغا صادق سے رابطہ قائم کر کے ان کے توسط سے مزید ہدایات حاصل کر کے واپس آئیں۔ چنانچہ عیسیٰ خان چلے گئے اور جم جونیر اس کوٹھی کی نگرانی کرتے رہے۔ اس رات جم نے دیکھا کہ کوٹھی کی چھت سے سرچ لائٹ آسمان کی طرف پھینکی جا رہی ہے۔ اور ایک ڈکوٹا نیچی پرواز کر رہا ہے۔ اور آسمان و زمین کے درمیان چھاتے ہی چھاتے بکھرے پڑے ہیں۔ جم نے جب غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ان چھاتوں کے ذریعہ سامان اتارا جا رہا ہے۔ ایک ایک چھاتہ پہاڑی کے ڈھال پر گرا۔ زور کا دھماکہ ہوا اور ایک بکس لڑھکتا ہوا ڈھال پر اگی ہوئی ایک جھاڑی میں الجھ کر رک گیا۔

جم نے جلدی سے نیچے اتر کر ٹوٹے ہوئے بکس کے سامان کو دیکھا۔ بکس میں اسٹین گنیں تھیں۔ جم نے جلدی سے ایک بنڈل اٹھایا اور اسے لیکر ایک جھاڑی میں چھپ گئے۔ چند منٹ بعد کچھ آدمی اس جگہ آئے اور بکھرا ہوا سامان چھاتہ میں رکھ کر روانہ ہو گئے۔ اچانک کچھ دور چل کر یہ آدمی رک گئے۔ ایک آدمی نے جھک کر سگرٹ کا وہ بچا ہوا ٹکڑا اٹھایا جو جم نے پی کر پھینک دیا تھا۔ اس کے بعد وہ جلدی جلدی ٹارچیں گھماتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ جم کئی گھنٹے بعد آہستہ آہستہ پوشیدہ انداز میں سڑک تک واپس پہنچ گئے اور طے کیا کہ رات کو جنگل میں گھس کر کوٹھی تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت ساڑھے چھ بجے تھے۔ مکمل تاریکی میں ایک گھنٹہ کی دیر تھی اس لئے جم گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بانہوں میں سر چھپا کر بیٹھ گئے۔ تاکہ اس طرح کچھ دیر آرام کر لیں۔

پھر کیا ہوا؟ ——— یہ اب پڑھئے

میں نہیں سمجھتا کہ گھٹنوں پر سر رکھتے ہی مجھ پر غنودگی کیوں طاری ہو گئی تھی۔ ماحول تو کچھ ایسا ہی تھا۔ ہلکی ہلکی گرم گرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ شہد کی مکھیوں کی نرم بھنبھناہٹ شہد کی طرح کانوں میں گھل رہی تھی اور اس نرم کیف آور موسیقی کے علاوہ فضا پر تقریباً سکوت طاری تھا ممکن ہے اس عالم میں میرے اعصاب کا تناؤ ختم ہو گیا ہو اور مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی ہو۔ لیکن جب ایک خوفناک دھماکہ کی آواز سے میں چونکا تو وہ ہلکی ہلکی دھوپ غائب ہو چکی تھی اور شام کے اندھیرے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ دھماکہ ــ ہاں وہ دھماکہ ہی تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرے دونوں کانوں کے پردے پھٹ گئے اور کسی نے میرے سینے پر کئی من بھاری پتھر دے مارا۔ میں اچھل پڑا۔ جھاڑی میں الجھ گیا۔ گھبرا کر قدم بڑھایا تو پہاڑ کے ڈھال پر لڑھکتے لڑھکتے بچا۔ چند لمحے تو سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا ہوا تھا؟ لیکن جونہی میرے شعور نے اس بھیانک "تڑختی" تیز اور دل دہلا دینے والی آواز کو دھماکہ قرار دیا تو میں جیسا تھا ویسا ہی گم سم کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ دھماکے کی گڑگڑاہٹ بڑے بڑے پتھروں کے لڑھکنے اور گرنے کی آوازیں بڑی دیر تک آتی رہیں۔ میں ساکت و جامد پتھر کے مجسمے کی طرح کھڑا یہ سب آوازیں سنتا رہا۔ اور جب یہ سب آوازیں آنی بند

ہو گئیں تو میرے کان سن سن کرنے لگے۔ بدن میں رعشہ سا محسوس ہوا اور پیشانی پر پسینہ پھوٹ پڑا۔ میں سوچنا چاہتا تھا مگر سوچ نہ سکتا تھا۔ چلنا چاہتا تھا لیکن قدم پتھروں کی بھاری چٹانوں میں دبے معلوم ہوتے تھے۔ گردن موڑ کر ادھر ادھر دیکھنا چاہتا تھا مگر اعصاب مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ معلوم نہیں کتنی دیر یہ کیفیت طاری رہتی کہ اچانک ماؤف دماغ کے بعض نامعلوم خلیوں سے روشنی کی شعاعیں پھوٹتی محسوس ہوئیں اور پہلا خیال جو مجھے آیا وہ یہ تھا کہ اپنی زندگی میں میں نے اس سے بھی بڑے دھماکے سنے ہیں۔ بم پھٹتے دیکھے ہیں۔ پہاڑوں کی چٹانیں پھسلتی دیکھی ہیں۔ زمین شق ہوتے اور آتش فشاں پھٹتے دیکھے ہیں۔ آخر میں اس دھماکے کو سنکر اتنا ہراساں کیوں ہو گیا؟ ذہن میں قدرتی روشنی کی کرنوں کا جال بڑھتا گیا۔ میرے ہونٹ ہلے۔ زبان نے جنبش کی۔ سماعت نے گوش وا کیا اور پہلا لفظ جو میں نے سچ مچ ادا کیا یا ادا کرنا چاہا یا ویسے ہی میرے ذہن میں گونجا وہ تھا "بار ثبوت" جی ہاں بار ثبوت —— بار ثبوت مجھ پر ہی تھا۔ کیونکہ مجھے یہ ثابت کرنا ہی تھا کہ ہمالیہ کی گود میں اس پرسکون جھیل کے کنارے ایک قدیم قلعہ نما کوٹھی تھی جو ایک پُراسرار مسلح گروہ کی آماجگاہ تھی۔ اور دیکھنے والے یہ پائیں گے کہ وہاں ایک کھنڈر کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ چونکہ میں قسم کھا سکتا ہوں۔ "بار ثبوت" کی اصطلاح لبوں پر آنے سے پہلے میرے تحت الشعور میں یہ اطلاع گونج اٹھی تھی کہ وہ قلعہ نما کوٹھی کھنڈر میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ڈائنا مائٹ کے بھاری چارج نے اسے ملبے میں تبدیل کر دیا ہے۔

میں بڑی دیر تک وہیں کھڑا سوچتا رہا۔

ان لوگوں کو کرنا بھی یہی چاہیے تھا۔ میرے بچے ہوئے سگریٹوں کے بجھے ہوئے ٹکڑے پا کر میرے اور عیسیٰ خاں کے نقش پا دیکھ کر اور آدم خور شیر کا شکار ہونے والے نوجوان اور خود ساختہ لیفٹیننٹ پرسیول سے کوئی اطلاع نہ پا کر یہ لوگ یہی کر سکتے تھے کہ اپنے اس چھوٹے موٹے قلعہ کو خاک میں ملا کر غائب ہو جائیں ——! اور "بار ثبوت" مجھ پر چھوڑ جائیں۔

"غائب ہو جائیں۔" میں ایک دم اچھل پڑا۔ کون غائب ہو جائیں؟ سوال گونجا۔ وہ لوگ اتنی جلدی غائب نہیں ہو سکتے۔ کم از کم وہ لوگ جنہوں نے کوٹھی کو تباہ کرنے کے لئے ان دھماکہ خیز مادوں کے چارج اور فلیتے لگائے ہوں گے انہیں اس مقام کے ایک دو فرلانگ کے اندر اندر ہی کہیں ہونا چاہیئے۔

میں نے کشکول سے ریوالور اور اس کے کارتوس نکالے۔ مشین پستول کی چرمی اٹھائی۔ اسٹین گن اور کشکول کو اسی جھاڑی میں چھوڑا۔ اور لیٹا ہوا پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا۔ بلندی سے کوٹھی کی طرف نظریں دوڑائیں —— اس حسین وادی پر دھوئیں کا ایک زبردست بادل چھایا ہوا تھا۔ نہ جھیل نظر آ رہی تھی نہ کوٹھی۔

یہ منظر جو حسب توقع میری نظروں کے سامنے تھا خاصہ بھیانک تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جھیل پانی سے نہیں بلکہ کسی گیس سے بھری ہوئی تھی جس کے مرغولے اٹھ کر پورے ہمالہ کو چھپا دیں گے۔

تباہ شدہ کوٹھی سے جو دھول اڑ رہی تھی وہ اس بلند جگہ تک آ رہی تھی جہاں میں کھڑا تھا۔

بڑھتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ منظر اور زیادہ ہولناک ہوتا گیا اور جب میں ان نامعلوم لوگوں کی تلاش کے لئے کسی غیر متعینہ سمت کی طرف قدم بڑھانے ہی والا تھا ٹھیک اسی وقت میرے کانوں میں ایک اور مانوس آواز آئی۔ ایک ہوائی جہاز کی آواز —— دو ہوائی جہازوں کی آوازیں۔ نہیں تین..... چار..... پانچ —— اور جب میں نے اس طرف آنکھیں اٹھائیں جدھر سے یہ زبردست گھن گھناہٹ کی آواز آ رہی تھی تو فضا میں پانچ ڈکوٹہ طیاروں اور ان سے کودتے چھاتہ برداروں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"یہ چھاتہ بردار وہی تو نہیں؟" قدرتی طور پر میں سوچنے لگا۔ کل رات ڈکوٹہ طیاروں سے اسلحہ پھینکا گیا تھا۔ آج فوج اتاری جا رہی ہے۔ یہ آر آر آر تو پورے ملک کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ میں اپنے اس خیال پر خود ہی مسکرا پڑا۔ اور میری نظر کے سامنے برطانیہ اور برطانوی ہند کی قاہرا افواج کا نقشہ گھوم گیا۔ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟ مگر وہ انگریز نوجوان؟ وہ پرسیول اور وہ شخص جس کو شیر کھا گیا؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری فوجیں یہاں کسی جنگی مشق میں مصروف ہوں؟ ایک اور انوکھا سوال ذہن میں گونجا۔ لیکن ایسی صورت میں

شاید مجھے اس کا علم ہو تا۔

میں چپ چاپ کھڑا ان چھاتہ برداروں کو آہستہ آہستہ زمین کی طرف آتے دیکھتا رہا۔ ہوائی جہازوں نے دھوئیں سے بھری اس وادی کے گرد گھیرا سا ڈال دیا تھا۔ چھاتہ بردار اس کے چاروں طرف اتر رہے تھے۔ کچھ چھاتہ بردار ٹھیک اس پہاڑی پہ آ رہے تھے جس پر میں کھڑا تھا۔ میں نظریں جمائے ان کو ہی دیکھتا رہا۔ سیکنڈ منٹوں میں بھی نہ بدلے ہوں گے کہ پہلا چھاتہ بردار مجھ سے کوئی پچاس فٹ نیچے پہاڑی کے ڈھال پہ اترا۔ میں ایک قدم آگے بڑھ کر جھک کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ باقاعدہ چھاتہ بردار فوج کا سپاہی معلوم ہوتا تھا گرتے ہی وہ لوٹ کر اٹھا، چھاتے کی پیٹی کھول کر ایک طرف پھینکی اور دوسرے لمحے وہ دونوں ہاتھوں میں اسٹین گن سنبھالے پہاڑی بکرے کی طرح تیزی سے میری طرف پہاڑی پر چڑھتا ہوا آیا۔ اس کی اس پھرتی اور مشاقی پہ میں اپنے تعجب سے جانبر بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اس نے ڈپٹ کر کہا۔۔۔

"ہینڈز اپ"

"بھئی واہ" میں نے دل میں کہا۔ "یہ اچھی رہی۔"

اندھیرے کی وجہ سے اس کا رنگ روپ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر وردی، ہتھیار، ٹوپی اور چہرہ مہرہ خوب نظر آ رہا تھا۔ اور پھر لہجے سے بھی یہی اندازہ ہوا کہ ہندوستانی ہے۔

"بابا ہم فقیر لوگ ہے۔۔۔ ہمیں کیوں مارتا ہے۔"

میں نے بڑے میٹھے لہجہ میں کہا۔

"ڈیم یو" اس نے پھنکار سی ماری پھر اردو میں کہا۔۔۔

"فقیر لوگ کے پاس ریوالور کدھر سے آیا؟"

واقعی ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔۔۔ میں نے ریوالور پھینک دیا اور ہاتھ اٹھا دیئے۔

"ادھر چلو۔"

میں اس کے پاس سے ہوتا ہوا پہاڑی سے نیچے اترنے لگا وہ میرے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ہاتھ اوپر اٹھائے اٹھائے پہاڑی ڈھال پر اترنا مشکل کام تھا مگر جیسے تیسے میں راستہ پہ پہنچ ہی گیا اور ہاتھ اٹھائے چپ کھڑا ہو گیا۔

"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے جوابی سوال کیا۔

اپنے سوال کے جواب میں میں نے اسٹین گن کی نال اپنی پیٹھ پر لگتی محسوس کی۔

"کون ہو تم؟" اس نے پھر ڈپٹ کر پوچھا۔

"آر آر آر۔" میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"نان سنس ۔۔" وہ دھاڑا۔ "کیا بکواس کرتا ہے؟"

مجھے تھوڑا سا یقین ہوا کہ ان چھاتہ برداروں کا آر آر آر سے تعلق ہونا قرین قیاس نہیں تھا۔

"انڈین آرمی؟" میں نے اچانک یہ مبہم سا سوال کر ہی لیا۔

"نہیں ۔۔ تمہارے باپ کی فوج ہے۔" وہ انگریزی میں زیر لب بڑبڑایا۔۔۔ "ہاں اب بتاؤ تم کون ہو؟"۔ اس نے اردو میں کہا۔

"مجھے اپنے افسر کے پاس لے چلو۔" میں نے نہایت فصیح و بلیغ انگریزی اور انگریزی لہجہ میں کہا۔

"ڈیم یو۔۔" وہ شکایت آمیز لہجے میں بڑبڑایا۔۔۔ پھر اچانک میری پیٹھ سے اسٹین گن کی نال ہٹ گئی اور وہ جیسے بچھو کے کاٹے سے اچھل پڑا۔۔۔ "وہاٹ!۔۔۔ تم انگریزی بول سکتے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"یقیناً۔"

"اوہ ۔۔۔ پھر تو تمہیں یہ بتلانے میں عذر نہ ہونا چاہیئے کہ تم کون ہو اور یہ ریوالور لئے یہاں کن جنگی کارروائیوں میں مصروف تھے؟"

"آپ کی منطق کا جواب نہیں۔" میں نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ صرف انگریزی بولنا اس کا سبب نہیں بن سکتا کہ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں کون ہوں؟"

"ٹھیک ہے۔" اور اس نے اسٹین گن سے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

اتنے میں دو تین چھاتہ بردار اور آ گئے۔

"اسے پکڑ لو۔" اس نے ایک سپاہی سے کہا۔

دوسرے لمحے میں ان تینوں چھاتہ بردار سپاہیوں کے نرغے میں تھا۔ تینوں سپاہی ہندوستانی تھے ـــــ ایک نے میرے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی ـــ تینوں ٹھٹھک کر رہ گئے۔

"بابا آپ یہاں کیا کر رہے تھے؟" ایک نے پوچھا۔

"حوالدار تقدیر خاں، میں نے تم سے جرح کرنے کے لئے نہیں کہا ہے۔ اس بوڑھے کو فوراً کمپنی ہیڈ کوارٹر پہنچا دو۔" اس شخص نے ڈپٹ کر کہا۔

"یس سر ـــ" قدیر خاں، جس نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا ایک دم اٹین شن ہو گیا اور تینوں سپاہی مجھ کو دھکا دیتے ہوئے اس جنگل کی طرف لے چلے جہاں خود میرا ہیڈ کوارٹر تھا۔

بیس منٹ کے اندر اندر میں اس کمپنی ہیڈ کوارٹر سے اتنی دور پہنچ گیا کہ عیسیٰ خان کے چیخ چیخ کر بولنے کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ وہ پشتو آمیز اردو اور انگریزی میں زخمی شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔

"بائی گاڈ ـــ خوچہ کرنل صاب ـــــ ام بولا ـــ کوٹھی کے گولی مارو ـــ ہم صاب کو ڈھونڈو ـــــ او خدا کے بندو اگر تمہارے کسی سپاہی نے گھبرا کر گولی چلا دیا ـــ او ـــ چہ خدا کی قسم ـــ"

"ابے تو پاگل کیوں ہوا جا رہا ہے ـــ کسی دلی والے کی آواز آئی ـــ آغا صادق کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

میں ٹھٹھک گیا اور سوچنے لگا۔ کیا عیسیٰ خان اور آغا صادق نے بھی چھاتہ لگا کر ہوائی جہاز سے چھلانگ لگائی ہوگی ـــ زیادہ سوچنے کا موقع نہ ملا۔ ایک سپاہی نے رائفل کی بٹ کا ٹھلا دیا۔ اور میں ہیڈ کوارٹر کے بیچ کھڑا تھا۔

یہ ہیڈ کوارٹر ایک گھنا درخت تھا جس کے تاریک سائے میں تین چار مضطرب سائے آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے ـــ میرے اس طرح دھکیلے جانے اور اچانک ان کے درمیان پہنچ جانے سے وہ لوگ کچھ ٹھٹھکے ـــ میرے پیچھے سے آواز آئی۔

"کرنل صاحب ـــ کپتان پرتھی پال سنگھ جی نے ان بابا کو پکڑ کر بھیجا ہے۔"

اچھا تو مجھے گرفتار کرنے والے کپتان پرتھی پال سنگھ تھے۔

میں نے سوچا۔ دوسرے لمحے میں بیک وقت آغا صادق اور عیسیٰ خان سے بغلگیر تھا۔

"ابے میں نے یہ کب کہا تھا کہ یہاں فوج کی بارش کرا دینا۔ بنا بنایا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔" میں نے آغا صادق کو دباتے ہوئے کہا۔

"تو میں کیا کر لیتا۔ تو نے جو ڈائریاں بھیجی تھیں انہوں نے نئی دلی سے لکھنؤ تک زلزلہ برپا کر دیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ اپنی ہڈی پسلی تڑوانے کے لئے ان لوگوں کے ساتھ آ جاؤں۔ اور تمہاری کارروائی شناخت میں حصہ لے کر تمہیں بچا لوں۔"

اور اس کے بعد کرنل مچلز سے تعارف ہوا۔ معلوم ہوا کہ چھاتہ برداروں کی پوری ایک بٹالین اتاری گئی ہے۔ لیکن افسوس وہاں سوائے ایک کھنڈر کے کچھ اور نہ تھا۔

کرنل مچلز سے اس علاقہ پر پیراشوٹ بٹالین اتارنے کی غیر دانشمندانہ کارروائی کے بارے میں کوئی سوال کرنا فضول تھا۔ انہیں جو حکم دیا گیا وہ پورا کیا گیا۔ مزید احکامات یہ تھے کہ اس علاقہ میں موجود ہر شخص کو گرفتار کر لیا جائے۔ اور مزاحمت کرنے والے کو گولی مار دی جائے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ میرے علاوہ کسی اور کو گرفتار نہ کر سکے ـــــ بہرحال میں نے کرنل سے درخواست کی کہ ابھی ایک موقع اور باقی ہے اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ میں جتنے عرصہ بھی ان کے ساتھ رہوں میرے ساتھ قیدیوں جیسا سلوک کیا جائے۔ اور یہ ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ میرا تعلق حکومت یا اس کے کسی محکمے سے ہے۔

کرنل نے اس سے اتفاق رائے کیا اور اس طرح میں عیسیٰ خان اور آغا صادق کی دستبرد سے محفوظ ہو گیا۔

آر آر آر کی اس خفیہ کمین گاہ کے علاقہ میں اس پیراشوٹ بٹالین کی جنگی سطح پر کارروائیاں ایک ہفتہ جاری رہیں۔

اگر میں چاہتا تو اپنے خصوصی اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے یہ کارروائیاں بند کرا دیتا۔ لیکن ایسا کرنا بالکل بیکار رہتا۔ کیونکہ آر آر آر کو پتہ چل چکا تھا کہ پوری حکومت برطانوی ہند اور برطانوی ہند کی افواج قاہرہ اس کی بو پر دوڑتی پھر رہی ہیں۔ اور آر آر آر جیسی منظم اور دماغی

الشجاع

درجے کی جماعت کے لئے یہ کچھ زیادہ مشکل بھی نہ تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے
اپنی سرگرمیاں بند کر دے۔

اور یہی ہوا بھی۔

ایک ہفتہ کی مسلسل کارروائیوں اور ہمالہ پہاڑ کو لغوی طور پر
چھلنی میں چھان لئے جانے کے بعد بھی جب کوئی کار آمد بات نہ معلوم ہو سکی
تو بٹالین واپس ہوئی اور سارجنٹ جیز جوان کے ہاتھ لگی وہ اسٹین گن تھی جو
میں نے اٹھائی تھی اور جس پر نمبر تھا نہ کوئی مارکہ۔

میرے ساتھ یہ چکر تھا کہ میں اپنی اصلی ہیئت میں دنیا کے سامنے
اس وقت تک واپس نہ جا سکتا تھا جب تک آر آر کا معمہ حل نہ ہو جاتا۔

بہرحال میں اس ناعاقبت اندیشانہ "فوجی کارروائی" سے
ناامید ہو چکا تھا اور واحد صورت یہ تھی کہ اپنے موجودہ حلئے کو برقرار
رکھتے ہوئے ایک کوشش اور کر دیکھوں۔

چنانچہ یہ طے پایا کہ کرنل مجلز مجھے بر سر عام بے قصور اور
ایک سیدھا سادھا سادھو سنت اللہ والا قرار دیتے ہوئے رہا کر دیں گے۔
اور نہ صرف رہا کر دیں گے بلکہ میری حسب خواہش مجھے کسی جگہ بھجوا دیں گے۔

اور اس طرح اس قلعہ نما کوٹھی کی تباہی اور فوجی پیمانہ پر کی جانے
والی جملہ احمقانہ کارروائیوں کے بعد ٹھیک گیارھویں دن مجھے ایک بار
پھر رہا کر دیا گیا۔ یہ رہائی بریلی کے پاس ایک غیر آباد اور ویران سے علاقہ
میں ملی۔

وہاں سے میں اور عیسیٰ خان تازہ بتازہ میک اپ اور پہلے
سے زیادہ مختصر مگر جدید قسم کے سامان سے آراستہ شہر کی طرف چلے۔

شہر مشکل تین چار میل دور ہو گا اور یہ فاصلہ ہم نے کوئی ایک
ڈیڑھ گھنٹہ میں طے کر لیا۔ پہاڑی علاقے کے دیہات کے برخلاف شہر
میں ہمارا داخلہ بڑا غیر رسمی سا رہا۔ کسی نے توجہ ہی نہ دی۔

ہم دونوں آگے پیچھے پیچ در پیچ گلیوں سے گزرتے ہوئے ریلوے
اسٹیشن پر پہنچ گئے اور پلیٹ فارم پر ڈیرہ جما دیا۔ اور تھوڑی ہی دیر
میں لوگوں کی حیرت آمیز توجہ کا مرکز بن گئے۔

یہ چھوٹی لائن کا اسٹیشن تھا۔ مسافروں کی زیادہ تعداد دیہاتیوں
پر مشتمل تھی اور ظاہر ہے کہ میرا اور عیسیٰ خان کا حلیہ ان کی توجہ ہی نہیں

اشتعال

عقیدت کا مرکز بننے کا بھی حقدار تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے ارد گرد ان عقیدت مندوں کا ایک
حلقہ قائم ہو گیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ان میں سے نہ کسی نے ہم سے
بات کی نہ کوئی سوال کیا۔ سیدھے سادھے بیچارے آتے، ہاتھ جوڑ کر
نمسکار کرتے اور مودب ہو کر بیٹھ جاتے۔

اچانک پلیٹ فارم پر ہمارے سامنے سے ایک نوجوان انگریز لڑکی ایک
ادھیڑ عمر کے انگریز کے ساتھ گزری۔ ہماری عجیب الخلقی اور سادہ لوح
عقیدت مندوں کا ہجوم دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹھک گئے۔

لڑکی خوبصورت، نوعمر اور بڑی شائستہ سی نظر آتی تھی۔ اس کا
ساتھی جو اس کا والد، چچا یا ماموں ہو سکتا تھا بڑا شریف خاندانی،
سنجیدہ، متین اور باوقار انسان معلوم ہوتا تھا۔

میرے عقیدت مندوں کی نظریں کچھ دیر ان دونوں پر مرکوز رہیں لیکن
یہ دیکھ کر کہ وہ انگریز لوگ بھی مجھے گہری دلچسپی کی نظروں سے دیکھ رہے
ہیں وہ اور بھی زیادہ عقیدت سے میری طرف دیکھنے لگے۔

میں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ دونوں پریشان اور متفکر نظر آتے
تھے۔ لڑکی کی خوبصورت نیلی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ اور
پیشانی پر شکنیں پڑی تھیں۔ دو چار لمحے ان کی طرف دیکھ کر میں نے سر
جھکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"میں نے ہندوستان کے ان مقدس لوگوں کے بارے میں بہت
کچھ پڑھا اور سنا ہے۔" اچانک میرے کان میں آواز آئی۔ وہ لڑکی دھیمی
آواز میں اپنے ساتھی سے کہہ رہی تھی ـــــ "اگر آپ اجازت دیں تو
میں ان کی باطنی بصیرت کی آزمائش کروں۔ موقع بھی ہے ـــــ اور
ضرورت بھی ہے ـــــ"

"شوق سے ـــــ آگے بڑھو ـــــ" اس کے باوقار ساتھی نے
جواب دیا ـــــ

"شکریہ ۔ پاپا!" اس لڑکی نے دھیمے سے کہا اور آگے بڑھ کر
میرے سامنے آئی ـــــ میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے
بڑے حسین انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرنے کی ناکام کوشش کی۔
میں نے مسکرا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

جیسے کہ وہ حقیقت حسن کے متعلق ایک لیکچر دے رہی ہو۔ سانس روک لی۔

لڑکی نے کچھ کہنا چاہا۔ کندھے اچکائے ــ بے بسی کا اظہار کیا۔ اس زبان میں مجھ سے بات کر سکتی تھی۔

بڑی کوشش اور خاصی ہچکچاہٹ کے بعد وہ یہ تین الفاظ اردو کے بول جو اس نے ہندوستان کے قیام کے زمانے میں سیکھے ہوں گے ــ "ہم بولا اُردو تھوڑا"

"بیٹی تم انگلش میں بات کر سکتی ہو" میں نے انتہائی نرم اور شیریں لہجے میں کہا۔ وہ اچھل پڑی ــ معصوم سے چہرے پر انتہائی حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔

"ہاں ہاں۔" میں نے اسے یقین دلایا اور ہمت افزائی کی۔ "ہم مردانِ خدا کو یہ قدرت حاصل ہے کہ تمہاری زبان بول اور سمجھ سکیں۔ اور اگر تمہیں انگلش نہیں آتی جو تمہاری مادری زبان ہے تو تم فرنچ جرمن، لاطینی یا ہسپینی زبان میں بات کر سکتی ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ لیکن ذرا میرے قریب آ جاؤ۔ اور جو بات کرنی ہو نرم آواز میں کرو۔"

"مقدس مریم۔" لڑکی نے تقریباً بہ آوازِ بلند کہا۔ "یہ بوڑھا تو آکسفورڈ کے لہجہ میں بول رہا ہے۔" پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ "اے مردِ بزرگ سچ بتاؤ کیا تم نے آکسفورڈ میں پڑھا ہے؟"

"بیٹی۔ آکسفورڈ کا تو میں نے نام بھی نہیں سنا۔ ہمارے پاس جو علم ہے وہ اس خزانہ علمی سے ملا ہے جو سوا لاکھ پہاڑ کے اس طرف برف پوش نشیب سے بہنے والے چشموں کے پانی میں گھلا ہوا ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔" وہ بڑبڑائی۔ پھر کندھے اچکائے۔ اچانک اس نے دوسرا سوال کیا۔

"آپ نے یہ کیسے جانا کہ میں انگریز ہوں ــ ایک انگریز اور جرمن میں کیا فرق ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم، میں نے کیسے جانا کہ تم انگریز ہو۔ بس یونہی تم پہ نظر پڑی پتہ چل گیا۔" میں نے جواب دیا ــ اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ تم بہت پریشان ہو۔ کیا یہ سچ ہے بیٹی؟"

"مقدس باپ ــ" اس کی معصوم آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ دوسرے لمحے وہ ذرا سی آگے کھسک آئی۔

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ اس برصغیر کے مقدس لوگ کسی طرح کی باطنی بصیرت رکھتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"تمہیں اس میں شک کیوں ہے بیٹی؟" میں نے کہا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب کے نقوش ابھرنے لگے۔ "تم جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو پوچھو اور اس الجھن میں نہ پڑو کہ روحانی بصیرت کیا ہوتی ہے اور اس کا سائنسی تجزیہ کیا جائے تو وہ کون سی نفسیاتی کیفیت کے مطابق ثابت ہوگی ــ بیٹی ــ سات سمندروں کے اس پار مشرق میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو تم مغرب کے رہنے والوں کی کبھی سمجھ میں نہ آئیں گی۔"

میں نے کہا۔ اس کی نظریں جھک گئیں اور وہ اپنے لمبے ہاتھ کے انگوٹھے سے اسی ہاتھ کی انگشت شہادت کے ناخن کو توڑنے کی کوشش کرنے لگی۔

"اچھا ــ تو اے مردِ مقدس مجھے یہ بتائیے کہ میں کس پریشانی میں مبتلا ہوں؟" اس نے سوال کیا

"آپ کو بہتر علم ہونا چاہیئے ــ" اس نے میرے چہرے پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا ــ "تم کسی کی تلاش میں ہو بیٹی۔" میں نے بہت جانچ تول کے اپنے ترکش کا پہلا اور آخری خدنگ چلایا ــ اور یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ تیر ہدف پر بیٹھا۔ لڑکی کی ناک ایک دم سرخ ہو گئی اور آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چھلک آئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ اس کے سیدھے ہاتھ کی تیسری انگلی میں منگنی کی انگوٹھی تھی۔ ایک قیمتی اور بڑا سا ہیرا اس میں جگمگا رہا تھا۔ ہیرے کے بیچ میں سونا بھر کر P کا حرف بنایا گیا تھا۔ میں جلدی جلدی سوچنے لگا کہ اس کے منگیتر کا کیا نام ہو سکتا ہے۔ پیٹ ــ فلپس ــ پیٹرک ــ فلپ ــ پارکر ــ پیٹرسن یا ــ یا ــ پرسیول ــ اور اس نام کی یاد پر میرے کلیجے پر ایک برچھا سا لگا ــ پرسیول یا پیری!

وہ جلد ہی سنبھل گئی۔ آنکھوں کے آنسو اس کی ہتھیلیوں پر منتقل ہو چکے تھے مگر پلکیں نم تھیں۔

"ہاں اے مردِ مقدس، میں کسی کی تلاش میں ہوں۔ مگر کس کی؟" اس نے پوچھا۔ سچ مچ میرا امتحان لینا چاہتی تھی۔

(باقی صفحہ ۷۹ پر)

"اس عنوان کے تحت اردو جرائد میں شائع ہونے والی بہترین تخلیقات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔"
(ادارہ)

واجدہ تبسم

دِل

جوتے کھٹ کھٹاتے ہوئے خلیفہ میاں گھر میں داخل ہوئے۔ آنگن میں تخت پر جانماز بچھائے مریم عصر کی نماز پڑھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو انہوں نے اسے ناگواری سے دیکھا اور بڑبڑانے لگے۔

"کمبخت جب دیکھو تب لگی ہے عبادت میں۔ ایسا ہی اس کا خدا دعائیں سننے والا تھا تو پھر بچہ کیوں نہ دے دیا؟"

چک اٹھا کر پھر سے مردانے میں چلے گئے۔ جوتے اتار کر زور سے کونے میں پھینکے، کوٹ اتار کر پلنگ پر اچھال دیا اور خود بھی پلنگ پر آڑے ترچھے لیٹ گئے۔ کلائی کی گھڑی یوں آنکھوں کے سامنے کرلی جیسے کسی پیارے کا آپریشن ہو۔ پل پل کی خبر رکھی جائے۔ سیکنڈ کی سوئی نے تین چکر لگائے، مطلب تین منٹ پورے ہو گئے۔ تین منٹ ہوتے ہی پھر اٹھے اور چک اٹھا کر زنانے میں آ گئے۔ دیکھا تو مریم تخت پر بیٹھی چھالیہ کترنے لگی تھی۔ نماز ختم ہو چکی تھی۔

"اگر اب بھی نماز ختم نہ ہوتی تو تخت ہی الٹ دیتا۔"

مریم نے سہم کر کہا۔ "ہیں ہیں! ایسی بات نہ کہیئے جی انسان خدا میں لوگ ... کفر نہیں نکالتے!"

"چل چل بڑی آئی وعظ کرنے والی۔"

الشہام

"مومنے کافروں کی صحبت میں بیٹھتے بیٹھتے آپ بھی کافر ہوتے جاتے ہیں۔"

"اچھا اچھا! میں کافر سہی۔ تو تو نمازن ہے مسلمان ہے؟"

مریم اب کی بار منہ سے کچھ نہ بولی۔ منہ پر ہولے ہولے تھپڑ مارنے لگی۔

"خدایا ان پہ رحم کیجیو ان کی تو آنکھیں بند ہیں۔ ان کا گناہ میرے سر پر ڈالیو۔"

"توبہ توبہ!" مریم نے دعا مانگ کر جلدی جلدی منہ پر ہاتھ پھیرے۔ گالوں پر ہاتھ مار کر ہولے ہولے توبہ توبہ کہا۔ سرتے کے گلے میں منہ ڈال کر زور سے پینے پر ہنسی پھوٹ گئی اور جھٹ اچھل کر ماں سے بولی۔

"اجی اماں! ہم ذرا خالہ جی کے جا رہے ہیں۔"

اماں چولہے کے پاس بیٹھیں سینک رہی تھیں۔ دھوئیں سے جلتی آنکھیں کھول میچ کر کے بیٹی کو دیکھا اور وہیں سے چلا کر بولیں۔

"ارے نامراد گیارہ برس کی تو ہو گئی، نہ کسی کام کی نہ دھام کی۔ سارے دن گلی کے پوٹوں کے ساتھ ہی ہی۔ ہا ہا۔ ارے گھر میں کوئی تیرا نہیں ہے چولہا۔ کبھی منحوس ماری شکل بھی دیکھی ہے آئینہ اٹھا کے۔ خالہ جی کے جا رہے ہیں۔ کیا کرے گی خالہ جی کے جاکر؟"

مریم نے زمین پر پیر پٹخنے شروع کر دیئے — "اللہ اللہ اللہ اللہ — جب دیکھو تب کہتی ہیں مجھے کام نہیں آتا ... [illegible]

بھابی! — آج پتہ چلا کہ تمہارے ہاتھ کے پکے کھانوں میں اتنا مزہ کیوں ہے؟ — کیوں نہ ہو۔ جس کے ہاتھ اتنے خوبصورت ہوں اس کے پکائے ہوئے کھانوں میں کیسے مزہ نہ آئے گا؟

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے کئی جھونکے جیسے ریگ زار میں در آئے۔ اور ——

اور مریم کا انگ انگ جیسے ٹھنڈی ہوا سے بھیگ گیا۔

دنیاں تو اتنی اچھی پکاتی ہوں، گول گول، ذرا بھی ٹیڑھی نہیں ہوتیں سالن ترکیب سے اچھا پکا لیتی ہوں، چاول ایسے پھریرے پکاتی ہوں، اوہ! یہ کرتا توبھئی موسیلا ہے، جب دیکھو تب اوں، اوں، اوں۔"

"توغضب خدا کا، دیکھو نگوڑی نہ ڈھنگ، اوپر سے زبان ایسی لمبی۔ اماں اٹھیں اور چولہے سے جلتی لکڑی اٹھا کر دھن، دھن دھنک ڈالا۔"

مریم کو کہا جاتا تو سب تھا، مگر بیٹی کی شادی کے وقت اس کی صورت بھی تو دیکھی جاتی ہے۔ ایسا تو کبھی کبھار ہوتا ہوگا کہ بعض گن دیکھ کر ہی سسرال والے بیاہ لے جائیں، گن ڈھنگ اپنی جگہ تک، صرف اپنی جگہ! ماں کو کیسی سولی تھی کہ بیٹی اٹھے تو کیسے اٹھے، یہ تو ہونے سے رہا کہ خود ہی منہ سے کہتی پھریں، اے بہن، میری بیٹی بڑے کام کاج کی ہے، صورت نہیں تو کیا ہے اس کے اوصاف تو دیکھو، جا صورت بیٹیوں کے نصیب جیسے ہوتے ہیں ویسے ہی مریم کے بھی ہوئے۔ پہلے تو کوئی پیام بھی نہ آیا۔ آیا تو حنیف میاں کا! جو پہلے سے دو دو بیویاں کھائے بیٹھے تھے۔ مریم کی عمر جس وقت بارہ تیرہ برس کی تھی، ان کی تیس سے اوپر۔ اگر لڑکی دیتے وقت جی کڑا یا تب بھی تو بی کا اللہ ہی حافظ تھا۔ آنکھیں بند کر کے بیٹی دے دی

حنیف میاں کو گھونگھٹ الٹتے ہی اپنی بیوی پسند نہیں آئی، پہلی بار جب شادی ہوئی تھی، بیوی ایسی تھی کہ میدا چھپاؤ اور اسے نکالو۔ دوسری بیوی بھی قسمت سے اچھی ملی۔ وہ بھی گوری چٹی تھی اتنی گوری تھی کہ لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ ایک بار رضیہ بیگم باورچی خانہ میں پاؤں پیارے بیٹھی تھیں کہ بلی نے آکر پنڈلی کا بوٹا نوچ لیا، وہ بھی شاید گندھا ہوا میدہ رکھا ہے۔ رضیہ بیگم کے سامنے پہلی بیوی کی یاد انہیں بھول کر بھی نہ آئی اور جب تک پہلی بیوی زندہ رہی وارے نیارے ہوتے رہے۔ مگر مرد کی فطرت تو بچہ کی فطرت ہوتی ہے نیا کھلونا مل جائے تو پرانے کو بھول کر بھی یاد نہیں کرتا دونوں بیویاں کیا تھیں جیسے چاند گھر میں اتر آئے ہوں۔ ان کی نگاہوں میں کوئی کیا بیٹھتا، اور خود حنیف میاں دفتر میں نوکری کرتے تھے، پر ناک ذرا اونچی ہی رکھتے، کوٹ پتلون بھی پہنتے، موج آتی تو شیروانی چوڑی چست پائجامہ بھی۔ آس پاس کے گھروں میں یہ پہناوا بھی کم ہی کم تھا۔ لمبی اونچی گردن اٹھائے چلتے

کسی کسی مرد کی قسمت ہی ایسی ترپٹ ہوتی ہے کہ راتوں شادیاں رچاتا جائے اور گریبان ہوتا جائے اور یوں بات مشہور ہو جائے، تو پھر بیچارہ

پٹیا ہی پڑ جاتا ہے! بیوی نبھتی نہیں، منحوس مارا ہے موا۔!

ایسے میں لاکھ کماؤ پوت ہو، لوگ بھی بیٹی دیتے ڈرتے ہیں، پڑھا لکھا ہو، چار پیسے کی روز جا لگتی ہو، تو بھی کیا ہے؟ زندگی تباہ کرنے سے تو رہے۔ ادھر ان کے بارے میں بھی مشہور ہو چلا تھا کہ میاں کی بیوی کبھی نہیں ایسے منحوس مارے ہیں، اور ادھر مریم کو کوئی بر ہی نہ ملتا تھا۔ ایسے میں ان دونوں کی قسمت کا میل تو ہونا ہی تھا۔ ادھر حنیف میاں کی نسبت آئی نہیں کہ ماں باپ نے ہاں کر دی اور ہاں ہی نہیں، لگے ہاتھوں شادی بھی رچا دی۔ بیچ میں لگائی بجھائی کرنے والے بھی تو کم نہیں ہوتے لاکھ حنیف میاں منحوس مارے تھے پھر بھی کوئی آکر لگا جاتا کہ لڑکی ایسی بدصورت ہے تو صاف پلٹ جاتے۔

مریم کے دل میں اپنی بدصورتی کا احساس اتنا شدید نہ تھا، ممکن تھا کہ حنیف میاں کو بھی اگر یہ پہلی عورت ملتی تو احساس نہ ہوتا مگر وہ پہلے ہی دو چاند اپنے آنگن میں چمکائے بیٹھے تھے صورت دیکھ کر بجھ گئے اور نفرت کی بنیاد اسی دن سے پڑ گئی۔ مگر ادھر مریم تھی کہ میاں کو دل و جان سے چاہنے لگی۔ بچپن ہی سے بدصورتی کا چرچا سنتی آئی تھی۔ شادی کی عمر ہوئی تو ایسی ایسی باتیں سننے میں آتی تھیں کہ بیچاری گھبرا گھبرا جاتی۔ "کبھی شادی بھی ہوگی میری۔!"

اپنے آپ میں سوچے جاتی۔ اتنی بڑی عمر کبھی نہ ہوئی تھی۔ مگر آس پاس والوں نے اس قدر بولا دیا تھا کہ اس کی ساری زندگی ایک مرد کے تصور سے وابستہ ہوگئی، جو کالا ہوتا، نکٹا ہوتا، جواری ہوتا، شرابی ہوتا رنڈی باز ہوتا مگر اس کا اپنا شوہر ہوتا کہ وہ بھی مرد والی کہلاتی، بچے والی کہلاتی اور جب سسرال سے اپنے کالے پیلے بچے گود لے کر لوٹتی تو بڑی تمکنت اور غرور سے اپنی ماں کی پٹی پر لٹا کر اس کے منہ میں اپنی چھاتی دے کے ماں سے میکے کی باتیں پوچھتی، آئے گئے کی خبر لیتی اور ماں بھی اپنی بیاہی بیٹی سے کسی اہم کام میں رائے لیتی۔ ورنہ اب تو جو تم بیزار کے سوا کچھ ملتا ہی نہ تھا۔ شادی ہوگی تو کم از کم یہ تو ہوگا کہ کسی بات میں گنی جاؤں گی۔

ادھر پھر یہ ہوا کہ کسی بدصورت کالے کلوٹے شرابی، کبابی مرد کے بجائے حنیف میاں اس کی زندگی میں داخل ہوگئے۔ جہاں ایک جن کا تصور تھا، اس کی جگہ ایک بانکے اور خوبصورت شہزادے نے لے لی، مریم کا دل کیسے لوٹ پوٹ نہ ہو جاتا، بن داموں غلام ہوگئی!

مرد کی فطرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ہر اس چیز کے پیچھے دوڑتا ہے جو اس سے دور بھاگے، جو آپ ہی آپ اس کے قریب آئے، وہ اس کے پیچھے کیا بھاگے گا۔؟ بلکہ خود ہی منہ موڑ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔ مریم کا حشر تو یہ ہوا کہ بھوکے کو فالودہ مل گیا، حنیف میاں ہیں تو سب کچھ ہے۔ وہ آنکھ سے اوجھل ہوئے کہ دنیا کا مزہ گیا۔ ہر کام وقت سے پہلے کر دیتی۔ دفتر جانے کو اٹھتے تو داڑھی مونڈنے کو کٹوری میں گرم پانی لا کر رکھ دیتی وہ داڑھی مونڈ کر اٹھتے تو جب تک حمام میں کپڑے لٹکا دیتی۔ نہا کر نکلتے تو دسترخوان لگا دیتی، کھا کر اٹھتے، دودھ کا پیالہ پکڑا دیتی۔ دودھ پی لیتے تو جوتے کے تسمے باندھنے بیٹھ جاتی تسمے باندھ چکتی تو آپ ہی لپک کر سائیکل باہر نکالتی اور مسکرا کر پوچھتی ۔" آج دوپہر کھانے کے لئے کیا بھجوا دوں ـــ ؟

" اپنا سر؟ " وہ چڑھ کر بول اٹھتے ۔ اس وقت انھیں مریم کی مسکراہٹ زہر لگتی۔ جانے کس نے ان کے پلے باندھ دیا اُسے سدا مسکرائے جاتی، سلام نبیڑے جاتی، کبھی تو ایسا نہ ہوتا کہ وہ بھی اٹوائی کھٹوائی لئے روٹھی رانی بنی پڑی ہو، اور منانے کی نوبت آئی ہو۔ میاں ساتھ بیٹھنے کو آئے تو یہ جھٹ باز و ہٹا کر جگہ خالی کر دیتی۔ کبھی تو ایسا نہ ہوا کہ ہاتھا پائی تک نوبت آگئی ہو۔ میاں کا سمجھ سے تو یہ بھی میاں کی خوشنودی ہی تھی، اسے کیا معلوم کہ مرد چکنا ہوتا ہے ۔ دیوانہ ۔ چاند کے پیچھے لپکنے والا ہاتھ آئی ہوئی چیز سے نفرت کرنے والا۔ حنیف میاں کا دل اس کی انہی باتوں سے جل جل جاتا اور مریم وہ تو پروانہ وار نثار تھی۔؟ میاں کے ماتھے پر شکن دیکھی اور اُس کی دنیا تیرہ و تار ہوئی۔ وہ یہ خوب سمجھتی تھی کہ میاں جو کھچے کھچے رہتے ہیں اس کی بدذوقی کے علاوہ اور کوئی وجہ ہی نہیں وہ چاہتی تھی کہ اپنی بدصورتی کی کمی اپنے کام کاج اپنی خدمت اپنی محنت سے پوری کر دے ۔

میاں بیوی کی باہمی چپقلش کو اولاد دور کر دیتی ہے، کیسا ہی جھگڑا ہو اور کیسے کٹے میاں بیوی ہوں، بچہ پیدا ہوتا ہے تو دونوں آپ ہی آپ مل جاتے ہیں۔ بچہ کی پیدائش بچھڑے دلوں کو ملا دیتی ہے اس کا وجود کسی معجزے سے کم نہیں ہوتا جو اندھیارے میں جیسے اجالا بکھیرتا ہے مگر مریم کے آنگن میں یہ سورج کبھی نہ چمکا۔ میاں کی یاد میں تو وہ ایسی کھوئی تھی کہ کبھی بچے کے پیار کی تمنا جاگی ہی نہیں۔ ہاں مدتوں بعد یہ احساس ہوا کہ کچھ ہو جاتا تو اچھا ہی ہوتا۔ وہ بھی دیکھ کر پاس پڑوس کی بڑی بوڑھیاں احساس دلانے لگیں اور شام کو ڈھلے تو وہ بھی دیکھتی کہ محلہ بھر کے باپ اپنی اپنی اولاد کو پیٹھ سر پر بٹھا کر گھوڑے گدھے بن رہے ہیں، کھیل کود رہے ہیں، ہنس رہے ہیں، اور ایسے میں حنیف میاں دفتر سے آکر پھر دفتر کے کام میں مشغول ہوتے یا فرصت ہوتی تو مریم کو بات بات پر گالیاں دیتے ۔ ہنستے پیار کے دو جملے بھی ان کی زبان سے کبھی نہ نکلتے مگر مریم کبھی محسوس نہ کرتی۔ مریم کا تصور اس کے پاس ایسا ہی تھا جیسا کہ خدا کا کہ سنے نہ سنے، سنائے جاؤ، پوجا قبول کرے نہ کرے پوجے جاؤ۔ بچپن سے بھر بھر دھنتی آئی تھی، سایہ سے دھوپ میں آتی تو ذرا تپش محسوس کرتی، یہاں تو سدا سے دھوپ ہی دھوپ تھی۔ اسے تو معلوم ہی نہ تھا کہ سایہ کیا ہوتا ہے پیار کیا ہوتا ہے، محبت کیا ہوتی ہے ؟ کوئی اس کا اپنا دل چیر کر دیکھتا تو سہی کہ حنیف میاں کے لئے کتنا پیار پھٹا پڑ رہا ہے! دنوں سے ہفتے ہفتے سے مہینوں سے سال بنے اور گزرتے گئے اور اب حنیف میاں کی شادی کو اتنے بھی نہیں پندرہ بیس برس گزر گئے تھے ۔

حنیف میاں کے اس عمر میں بھی کیا ٹھاٹ تھے، بڑھاپے کا تو دور دور تک پتہ نہ چلتا۔ اوپر سے روز روز داڑھی مونڈی جاتی۔ مریم کے ہاتھ کے مرغن اور طاقت بخش کھانے تھے یہ تو تین تین بیویاں بسنے کے بعد بھی گھٹے جوان بنے پھرتے تھے اور مریم تھی کہ تیس برس کی عمر میں ہی بالوں کی پٹیاں سفید ہونے چلی تھیں۔

حنیف میاں کوٹ پتلون پہنے جوتے کھٹکھٹاتے جب گھر میں داخل ہوتے تو مریم کو لمحہ بھر کو بھی احساس نہ ہوتا کہ شادی کو بیس برس سے اوپر گزر گئے ہیں۔ چال میں ابھی تک جوانوں کی سی دھمک اور دبدبہ تھا۔ دفتر سے ان کی واپسی کا وقت اور مریم کی عصر کی نماز کا وقت ساتھ ہی ساتھ پڑتا۔ ادھر یہ جھک اٹھا کر زنانے میں داخل ہوتے تو مریم کے لمحہ بھر کو یہ احساس ہوتا کہ میاں آگئے ہیں، مگر پھر وہ ٹھیکا لگن سے اپنے معبود کی عبادت میں لگ جاتی۔ ان کا کمرے میں داخل ہونا اس کا رکوع میں جھک جانا ساتھ ساتھ ہوتا۔ بس، تمام تو وہ مرضی کے خلاف کرتی۔ نماز کو میاں منع نہ کرتے مگر ایسے موقع پر کہ وہ تھکے آئیں اور یہ نماز میں جھکی رہے۔ ان کی جھلاہٹ بدلی ہو جاتی ہے

[illegible] میں بڑبڑاتے ہوئے آتے، پھر
پکانا شروع کرتے: "کیوں بی، کسی باپ کے یہاں سے آتا ہے جو ایسے تر
[illegible] پکائے جا رہی ہے" کھانوں کی تعریف تو عمر بھر بھولے سے بھی نہ کی
[illegible] جیسے لہجہ میں بڑے پیار سے بولتی۔
"کمانے والے آپ! اللہ آپ کی جان سلامت رکھے، آپ
کمائیں گے تو جئیں گے۔"
"چل چل، بڑی آئی کھلانے والی۔ اگر آپ کے اتنی جلدی گھی ختم ہو
گیا تو یاد رکھ ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا، سمجھی کہ نہیں۔۔؟"
وہ بڑے پیار سے جواب دیتی: "میں اپنے کنگن بیچ کر گھی منگوا
لوں گی، آپ کی جان سے بڑھ کر زیور تھوڑے ہی ہوا!"
حنیف میاں نے کبھی "تو، تیرے" سے ہٹ کر بات نہ کی۔
پہلی دو بیویوں سے بھی بات کا یہی انداز تھا مگر اس میں پیار جھلکتا تھا اور
اس میں غصہ۔ مریم بھی اسی انداز کی عادی ہو گئی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ سیدھے
سپاٹ لہجہ میں پکارتے
"مریم ادھر آنا ذرا!" تو وہ حیران سی کھڑی ہو جاتی
[illegible] کام بھول جاتا۔ پیار تو کبھی اس لہجہ سے نہ ٹپکتا۔ مگر وہ سن سی ہو جاتی
کہ خلافِ توقع آج کیا بات ہوئی جو پہلا سا انداز نہیں وہ جھلاہٹ نہیں۔"
عصر کی نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ زنانے میں کھلنے والے
دروازے کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتی کہ اب میاں اندر آئیں گے۔ آج بھی بیٹھی
تھی کہ میاں آئے، آج کھانے والے کی بجائے دوسری ہی بات چھیڑ دی۔
"باہر والا کمرہ خالی ہے۔ نہ۔؟"
"ہاں ہے تو!" وہ نرمی سے بولی
"اس کی صفائی کروا دینا۔ وہ چڑی مار آ رہا ہے۔"
"چڑی مار۔۔!" مریم حیرت سے بولی۔
حنیف میاں ہنسے۔ مریم کو ہنسی اتنی عجیب و غریب لگی شادی کے
بعد اس نے دو تین بار ہی انھیں ہنستے دیکھا ہوگا۔ مگر وہ بھی اس سے مخاطب
ہوتے وقت نہ ہنستے، کسی اور سے بات کرتے یا ہنستے۔ آج بھی یہ ہنسی مریم
کے لئے نہ تھی بلکہ اپنے دوست کے لئے تھی۔
"ہاں ہاں" وہ ہنس کر بولے: "میرا پرانا دوست ہے۔ میں
چار سال کا تھا تو وہ آٹھ سال کا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ پڑھتے تھے بچپن میں
ہم سب اسے چھیڑتے چڑی مار کہتے تھے بس وہی نام پڑ گیا۔"
"بڑے میاں، کس کام سے آ رہے ہیں۔؟" مریم نے سر ڈھانپتے
ہوئے پوچھا۔
حنیف میاں پھر بدل گئے: "کیوں، تیرے باپ کا کھائے گا؟
ایسے الٹے سیدھے سوال کیوں کر رہی ہے تو۔۔؟"
"توبہ، توبہ میں نے کبھی آپ کی بات ٹالی ہے؟ یونہی پوچھ لیا
تھا۔ معاف کر دیجئے!"
"معاف کر دیجئے کی بچی! یاد رکھ، بوڑھے کو اگر کھانے
پینے کی کچھ تکلیف ہوئی تو تیرا بھیجا کھول دوں گا۔"
"میں اس سے بھی خوش ہوں۔ اللہ آپ کو میرے لئے سلامت رکھے!"
وہ پیار سے بولی۔
چھ بجتے بجتے چڑی مار گھر آ گیا، نام تو برکت علی تھا مگر چہرے سے
تو سچ مچ چڑی مار لگتا تھا۔ اس بڑھاپے میں سرخ رنگ کی کامدار ٹوپی
اوڑھ رکھی تھی میلی پیلی سی قمیض، سفید شیروانی اور سفید پائجامہ چھوٹا
سا قد، دبلے پتلے ہاتھ پیر، سوکھا مارا چہرہ داڑھی ایسی تھی جیسے بچے ناریل
ناریلیاں نوچتے ہیں اور اکا دکا پھر بھی لگی ہی رہ جاتی ہیں۔ بس وہ بچہ
نچا ہوا ناریل معلوم ہو رہا تھا۔
تانگے میں بستر اور ایک چھوٹا سا بکس اس کے اترتے ہی حنیف
میاں نے زنانے میں جا کر کہہ دیا۔
"وہ آگیا ہے۔ شام کو دو سالن بڑھا لینا اور ہاں، روٹی نرم پکانا
اس کی دو داڑھیں گر گئی ہیں، سخت روٹی چبائی نہیں جائے گی۔"
"جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔" مریم سر جھکا کر بولی۔
صبح ہوتے ہی چڑی مار سب سے پہلے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ابھی مریم صبح
وظیفے سے فارغ بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے کمرے میں پڑے پڑے زور زور سے
ہاہاکر کے جمائیاں لینی شروع کر دیں اور پھر انگلیاں چٹخانے کی آوازیں آنے
لگیں جن کا صاف مطلب تھا۔ چائے چاہیئے۔
مریم کو غصہ تو بہت آیا مگر میاں کا دوست تھا۔ ابھی [illegible]
بھی نہ ختم ہوئی تھی کہ ادھر سے خود میاں نے بھی آواز لگائی۔

"مریم! دو کپ چائے تو بھجواؤ۔"

آج میاں بھی چڑی مار کے ساتھ سویرے اٹھ بیٹھے تھے ورنہ روز تو یہ ہوتا تھا کہ دھوپ چڑھ گئی ہے، گھر کے سارے کام کاج ختم ہو گئے ہیں ناشتہ تک تیار ہو گیا ہے۔ مگر میاں ہیں کہ اینٹھے پڑے ہیں۔ مریم نے میٹھی آواز سے کہا۔

"ابھی بھجواتی ہوں۔"

اگر صرف بوڑھے کی بات ہوتی تو کبھی وظیفہ چھوڑ کر نہ اٹھتی مگر میاں نے خود بھی چائے کی فرمائش کر دی، مریم کے لئے ناممکن تھا کہ میاں کی بات ٹال جاتے، چائے بنا کر طشت میں کپ سجائے اور ہاتھ بڑھا کر طشت دروازہ کی چوکھٹ پہ رکھ کر ذرا اندر کو ڈھکیل دیا۔ میاں نے پھر گالی دی۔

"طشت اندر کو ڈھکیل دیا اور اگر ابھی کپ گر کر ٹوٹ جاتے تو۔؟ تیرے باپ کا بھلا کیا جاتا تھا۔ مجھے کیوں نہ پکار لیا۔؟"

مریم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چائے سے فارغ ہو کر ناشتہ بنانے میں لگ گئی، ابھی پیالے میں انڈے توڑ ہی رہی تھی کہ میاں بھی وارد ہو گئے۔

"دیکھ خاگینہ میں ساری پیاز ہی پیاز نہ بھر دینا بلکہ سادے انڈے ہی تل دے تو اچھا ہے۔ اور سن، پراٹھے ابھی سے مت پکا لینا جب ہم ناشتے کو بیٹھیں تو توا چڑھانا، گرم گرم اچھے رہیں گے۔ ورنہ اس کے دانت...... !"

مریم کے چہرہ پہ ناگواری کے اثرات چھا گئے۔ مگر اس کا سر جھکا ہوا تھا اس لئے حنیف میاں دیکھ نہ پائے۔ چڑی مار کھڑاؤں پہنتا تھا۔ حنیف میاں گھر میں تو ربڑ کی چپلیں پہنتے تھے، باہر نکلتے تو بوٹ چڑھا لیتے، گھر میں چلتے تو ربڑ کی چپلوں سے ہلکی ہلکی دھپ دھپ سنائی دیتی اور وہ آواز اتنی ہلکی اور مریم کو اتنی میٹھی معلوم ہوتی کہ وہ غور سے سنتی رہتی۔ جدھر جدھر میاں کے قدم اٹھتے ادھر ادھر اس کے کان بھی جاتے۔ چڑی مار نے صبح اٹھتے ہی سارے گھر میں کھڑ کھڑ کھڑاؤں پہلے تو کھٹ کھٹ کرتا ہوا اٹھا اور غسل خانہ کو چل دیا۔ وہاں سے آیا تو بیٹھک میں بیٹھ گیا۔ مریم کے کان جیسے پک گئے۔

گلی میں سے اخبار والا گزرا تو چلا کر بولا۔ "لے نوزٹے اخبار لیتا جا۔"

نوزٹے اخبار پھینکا اور اس نے اخبار کے اوراق کھڑکھڑانے شروع کر دیئے، مریم کے کانوں میں آوازیں پڑ رہی تھیں، حالات حاضرہ پہ تبصرہ کیا، اپنی رائے سنائی، حنیف میاں کی رائے لی، پھر اوراق کھڑکھڑائے اور بولا "ارے میاں۔ یہ صفحہ پڑھتے ہو کبھی۔؟ بڑے لوگوں کی بڑی بڑی باتیں اس میں آتی ہیں۔؟"

"میں مطلب نہیں سمجھا؟ کیسے بڑے لوگ؟ کیسی بڑی بڑی باتیں؟"

"اچھا یہ سنو!" جیسے کسی بڑے آدمی نے کہا ہے "تحفہ تحائف دینے لینے سے محبت بڑھتی ہے۔"

"اچھا۔ اچھا!" حنیف میاں شرارت سے مسکرائے،

"سمجھ گیا مطلب کہ تمہیں تحفہ چاہیئے نہ کوئی؟ اچھا چلو ایک اچکن کا کپڑا دلائے دیتے ہیں۔"

"ہت تیری کی، یہ مطلب تھا میرا؟ ابے الو کی دم، میں بتا رہا تھا کہ اس صفحہ کو تو بس پڑھنا ہی چاہیئے۔ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ بڑی اچھی دل کو لگتی ہوئی اور سچی باتیں اس میں لکھی ہوئی ہیں۔ اس چھوٹی سی جگہ میں کوئی نہ کوئی بات روز آتی ہے اس کا عنوان ہے۔

"بڑے لوگ بڑی باتیں" بس روز ایک ہی بات آتی ہے۔"

مریم کو یہ سب باتیں سنائی دے رہی تھیں اور اس کو خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا۔ میاں کو کھانا تو اس کو آتا تھا اور کھلاتی بھی تھی۔ جو کھاتے وہی نہ کھلائے تو بھلا کیا کرے؟ اور میاں کو کھلا کر خوشی بھی ملتی تھی۔ مگر یہ چڑی مار جانے کہاں سے آ ٹپکا تھا اور انداز بتاتے تھے کہ ابھی مدتوں یہیں پڑا رہے گا۔

اور باتیں دیکھو۔ کیسی سنا رہا ہے۔ تحفہ تحائف دینے لینے سے محبت بڑھتی ہے۔ دے گا تو کیا۔ ہاں، خود ہتھیا ضرور لے گا۔ اس نے جل کر سوچا اور یہ میاں ایسے ہیں کہ کہا ہے، تو ضرور ہی اچکن بنا دیں گے۔ میاں کی حلال کی بہتے پسینے کی کمائی کوئی غیر کھائے، یہ اسے نہ بھایا۔

ناشتہ ختم ہوا۔ میاں نے ابھی کر پڑی مچا دی تھی کہ پراٹھے اٹھاتے ہیں اس کے ہاتھوں میں جلتے گھی سے چھالے پڑ گئے۔ ناشتہ ختم ہوتے ہی میاں تو دفتر چلے گئے اور چڑی مار اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے اونچے اونچے گانے لگا۔ "اجمیر والے خواجہ مجھ کو بھی میری بنا دے۔"

بار بار ایک چھوٹی سی ہی لائن دہرائے جا رہا تھا۔ مریم اوب گئی۔ دل چاہا جا کر کہہ دے، بس ختم بھی کرو۔ مگر ہمت نہ پڑی۔ شام کو میاں لوٹے تو وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ دو گھڑی چڑیا سے باتیں کرتے رہے پھر ہنستا کر اندر آئے

"کیوں ری۔ دوپہر کو کھانا بھجوایا تھا بیٹے کو۔ ؟"

"آپ نے کہا تھوڑے ہی تھا ۔"

"اری نکمی۔ تو نے نہ کھایا ہوگا جو اسے بھوکا مار رکھا !۔"

"آپ کہتے تو بھجواتی۔ اگر اپنے دل سے بھجوا دیتی تو بھی آپ چڑھتے ضرور!"

"خود بیٹھی ٹھونستی رہی۔ بوڑھا آدمی۔ اس کا دم کیا کہتا ہوگا۔ ؟"

مریم دھیرے سے بولی ۔" ناشتہ تو کیا تھا"

"ایسا کتنا کھایا تھا ؟" میاں ڈپٹ کر بولے

"چلئے پھر پیٹ بھرا ہو گئے اور کتنا کھاتا ؟" مریم کے ہونٹوں تک یہ جملہ آیا۔ مگر پی گئی ۔

"چل اٹھ ہلکا سا ناشتہ بنا دے۔ کوئی عمر بھر سا تھ ۔ جنے کو آیا ہے سونے کا چن دکھا رہی ہے۔"

مریم کا جی نہ چاہتا تھا کہ کوئی بات کہہ کر میاں سے بگاڑ کرے دھیرے سے اٹھ کر باورچی خانہ چلی گئی ۔

دوسرے دن ابھی اندھیرا چھٹا بھی نہ تھا۔ مرغ بانگ دے ہی رہے تھے کہ پہلے دن کی طرح چڑی مار اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مریم نے خفگی سے بچنے کے لئے آپ ہی چولھے کے پاس بیٹھ کر پھونکیں مارنی شروع کر دیں۔ پھونکوں کی آواز سن کر چڑی مار کی جمائیاں رک گئیں اور وہ پڑا پڑا گنگنانے لگا۔

"کالی کملی والے تجھ پہ لاکھوں سلام ۔"

میاں آتے آتے چڑیا کے لئے پچھلی شام اچکن کا کپڑا لیتے آئے تھے ۔ وہ تو مریم کو بھی پتہ نہ چلتا مگر چڑی مار نے کپڑا دیکھ کر طوفان مچا دیا۔

"میں نہ ہوں گا قسم کا موسلی کی میں نے اس لئے تھوڑے ہی پڑھ کر سنایا تھا۔ ہاتھ تو نہ لگاؤں گا ۔"

"ارے تو کون کہتا ہے کہ تیرا جی مانگنے کو چاہتا تھا۔ میرا دل ہے رکھ لے بھائی، اپنی یاری تھی۔ تو تیرا بھی ہوتا ہی تھا ۔"

مریم جان گئی۔ ضرور وہ بڑے لوگ، بڑی باتیں والی بات سچ ہوگی۔ بہت دانت کچکچا کر رہ گئی ۔

چائے ختم ہو گئی تو چڑی مار کھڑ کھڑاتے ہوئے لوٹے گھر میں پھرتا رہا اخبار والا گزرا تو پھر کل کی واردات دہرائی گئی ۔ اوراق کھڑکھڑا کر بولا "سنو میاں ! آج لکھا ہے۔ انسان پہاڑ کی بلندی سے گر کر کھڑا ہو سکتا ہے مگر نگاہوں سے گرے تو پھر کبھی کھڑا نہیں ہو سکتا ۔"

"بات تو واقعی دل کو لگتی ہوئی ہے ۔"

مریم کے دل کو بات اس لئے لگ گئی کہ اس میاں دینے دلانے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا ۔

کافی دن گزر گئے ۔ مگر چڑی مار نہ گیا۔ اب تو لگتا تھا کہ وہ حنیف میاں کے گھر عمر گزارنے ہی آ ٹپکا تھا۔ جانے کہاں سے آیا تھا کہ ایک دن اپنا بچا کھچا سامان بھی منگوا لیا۔ حنیف میاں تو دفتر میں رہتے۔ خود پڑا پڑا کمرہ میں گاتا رہتا ۔" اب پاس بلا لے مجھے مختار مدینہ ۔"

چڑی مار کو نہ پوری قوالی یاد تھی۔ نہ پوری نعت۔ کسی ایک ایک لائن سے آگے نہ پڑھتا۔ بار بار اسی کو دہراتے جاتا۔ گھنٹوں ایک ہی مصرعہ گنگناتے جانا۔ مریم کو اس کے دیدے سے اکتاہٹ تو ہوتی ہی تھی اس کے گانے سے بھی ہو گئی ۔ اگر پورے بول ہوتے تو بات بھی تھی۔ گلا بے سرا ہو گیا ہے اور وہ ہے کہ ایک ہی رٹ لگائے ہے۔

"اب پاس بلا لے مجھے ۔۔۔۔"

جا، اور ایسا جا کہ پھر آنا نصیب نہ ہو تجھے ! مریم نے کوسنا چاہا مگر وہ پھر رک گئی۔ اتنے دن گزر گئے تھے۔ مگر دونوں میاں بیوی میں آپس کے متعلق ایک بات نہ ہوئی تھی۔ آج اتنا ضرور سوچ لیا کہ شام کو میاں سے کچھ نہ کچھ ضرور کہے گی۔ شام کو آتے آتے حنیف میاں باریک کٹوایا ہوا لے آئے اور آتے ہی بولے

"اس کے دم کے کباب بنا دینا ۔"

کباب بنانے میں کیا کم دیر لگتی ہے ؟ کوٹنا پیسنا ہی میں گھنٹے دو گھنٹے لگ جاتے ہیں چولھے کے پاس جا کر بیٹھی تو بیٹھی ہی رہ گئی۔ میاں سے بات بھی نہ کر سکی۔ کبابوں کے ساتھ ورقی پراٹھے بھی پکنے ہی تھے گرم گرم پراٹھے کباب اور سالن، دسترخوان لگا اور دونوں جٹ گئے۔ کھاتے کھاتے چڑی مار بولا "ارے تیری ماما سالن تو خوب پکاتی ہے! کباب تو کیا ہے ہی نہیں ۔"

مریم کا دل چاہا کہ جا کر ایک چپاٹا لگا دے۔ بھلا ہوگی تیری ہونے والی، کھانے تو کھانے اوپر سے گالیاں بھی بکے۔

میاں کہہ رہے تھے "سالا! دماغ تو ٹھیک ہے تیرا۔۔؟

کھانا میری بیوی پکاتی ہے ۔۔"

"ہیں؟ اور تم یہ سدا چپڑ چپڑ بھڑ بھڑ کے سالا کہتا ہے۔ ؟"

اس کی آواز میں حیرت تھی۔

"اپنی بیوی کو، اور کس کو ؟"

چپڑ چپڑ منہ چلانے کی آواز رک گئی اور چپڑی مار زور سے بولا

"ابے کوئی اپنی بیوی سے ایسے تیز لہجہ میں بات کرتا ہے۔ ؟"

"تو نے شادی کی ہوتی تو پتہ چلتا! "چل چل، کھانا کھا" زیادہ باتیں نہ بنا! ۔۔"

تیز دھوپ کا اندازہ کسی سایہ دار درخت کی ٹھنڈک میں بیٹھ جانے سے ہوتا ہے، مریم نے میاں کی اتنی گھڑکیاں سنی تھیں کہ پیار کی کبھی زبانی نہ ہوئی۔ احساس بھی نہ ہوا کہ میٹھا بول بھی دنیا میں کوئی چیز ہے۔ چڑیا کے دو بول جا کر جی کو لگ گئے۔ مگر دھوپ کا مارا ابھی ایسی ہو گھڑی کی ٹھنڈک لے کر کیا خوش ہوتا کہ ابھی آگے تو وہی کڑی دھوپ پڑی ہوگی۔ الٹا جل کر رہ گیا۔ اور چڑی مار کو من ہی من میں دو چار گالیاں بھی دے ڈالیں موا ٹھگ لگا لیے گا، اور چل دے گا اور یہاں لڑائیاں لگا جائے گا۔

اگلے دن اخبار میں سے اس نے سنایا "جب تک دنیا میں ڈاکیے موجود ہیں خوشی محسوس ہوتی رہے گی ۔۔"

خود ہی بولنے لگا "سالا" اپنے نام تو کوئی خط نہیں آتا کیا خوشی محسوس ہوگی ؟"

مریم نے چلتے چلتے چڑھ کر سوچا۔ کس قدر باتونی ہے چپ تو رہا ہی نہیں جاتا اس سے۔

اس کے دوسرے دن بڑی دیر تک اخبار کھڑکھڑاتا رہا۔ پھر زور کی آواز میں بولا۔

"دنیا میں اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں کہ خط عورت نے لکھا ہو ۔۔"

مریم کا جی جل کر رہ گیا۔ رات کو میاں سے بولی "کیوں

جو آپ کا یہ دوست پڑوس کا بالا بنا پھرتا تھا ۔۔"

میاں پہلے سیدھا دیکھا تھے بولے "اپنے بھائی کے پاس رہتا تھا وہاں جھگڑا ہو گیا یہاں چلا آیا ۔۔"

"جھگڑا کس بات پر ؟"

"یہ کم بخت کھڑاؤں پہنتا ہے نا اور اس کے بھائی کی بیوی سر کے درد کی مستقل مریضہ ہے۔ وہ کھٹ کھٹ سے تنگ آ گئی۔ مگر اس نے کھٹ کھٹ نہ چھوڑی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ یہ سالا بڑا ضدی ہے، بھلا کیا ٹکتا ؟"

مریم بولی "تو شادی کیوں نہ کر لی ؟"

"اس اُلو کے پٹھے کو بھلا کون بیٹی دیتا ؟ مگر خود جناب کا یہ کہنا ہے کہ آج تک کوئی لڑکی ہی انھیں پسند نہ آئی۔" حنیف میاں ہنس کر بولے

"بچے ہوتے ناریل جیسی تو صورت ہے اور اس پر طرہ یہ کہ گھر بار ہے نہیں۔ بھاوج سے جھگڑا کر بیٹھا مطلب یہ کہ کٹھنا ساری عمر کے ساتھ ہے۔"

مریم نے دل ہی دل میں سوچا۔ مریم کی طبیعت اچانک گڑ گئی اور گھر کا سارا نظام چوپٹ ہو گیا۔ اب صبح ہی صبح پھکوں کی آواز کے ساتھ نہ کبھی چپاتے تھے نہ گرم گرم پراٹھے ملتے تھے۔ محلہ کی کوئی عورت صبح ہی پراٹھے تھوپ کر تھپکی لگا دیتی اور دسترخوان پر مینڈک جیسے موٹے موٹے پراٹھے پڑے رہتے مکھیاں ان پر بھنکتی رہتی ہیں کہ کھانا شام تک چل جاتا۔ دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے چڑی مار بولتا۔

"بھابی بیمار پڑیں تو کھانے کا مزہ چلا گیا ۔۔"

مریم کو دنیا تی کی موٹی سی تہ کے باوجود بھی سب کچھ سنائی دیتا میاں بولتا ۔۔

"ایسا کیا مزہ بھرا پڑا تھا ۔۔ ؟"

"ابے سالے تیرے کلیجہ پر تو سؤر کے بال ہیں کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا ۔۔"

"تیرے کلیجہ میں تو عورت کا دل ہے، لیس!" وہ چڑھ کر بولتے

"بھول گیا کل سنایا تھا تجھے، عورت کا دل پھول ہوتا ہے جو ذرا سی تپش سے کملا جاتا ہے۔ اور تو تو آگ لئے لئے پھرتا ہے ۔۔"

"ابے بہت دیکھے ایسے پھول ؟"

مریم کو رہ رہ کر غصہ آتا۔ چڑی مار کے بیچ میں منہ مارنے

میاں اسے کہتے رہتے ۔ اس دن تو مریم کو بڑا غصہ آیا ۔
" جہاں میاں بیوی کے جھگڑے نہ ہوں وہاں محبت نہیں ہوتی
" جانے کم بخت کون سا اخبار پڑھا کرتا ہے ۔ اُلو کی دم ۔!
بھلا گھر دیکھو ذرا اتنے جھگڑے ہیں اور محبت ؟ ۔"
مریم نے طے کر لیا چڑی مار کا قضیہ ہی پاک کرنا ہے ۔ مریم کو
یقین ہو گیا کہ اب چڑیا اس گھر سے جلد ہی منہ کالا کر جائے گا کیونکہ اب
حنیف میاں کی اور اس کی آئے دن چخ چخ ہوتی ہے اور موضوع خود مریم
ہوتی ۔ میاں تاؤ کھاتے اور چڑی مار اس نیک بیوی کو گھر کی برکت کہتا
مریم بے حد خوش تھی کہ اب منحوس چھوٹے گا ۔ مگر میاں نے ایک دن بتایا
" مہینہ بھر کا سامان اس چڑی مار کے ہاتھ سے منگوا لیے ۔ اور اب سے
وہی لایا کرے گا ۔ آدمی معقول ہے میں تو ایک کی جگہ دو پیسے پھینک
آتا ہوں ۔"
مریم نے بے دلی سے روپے تھام لئے ۔ وہی لایا کرے گا ۔
ظاہر ہے یہیں رہے گا ۔ تبھی تو سامان بھی لائے گا ۔ وہ زور سے تیز ہو
کر بولی ۔" کیوں جی ۔ یہ ......"
میاں نے پلٹ کر گھورا ۔ وہ بات بدل گئی آج دودھ کیوں
نہ پیا ۔۔۔ ؟"
" جی نہ چاہا میرا ۔" اور وہ پاؤں پٹکتے ہوئے چلے گئے ۔ مریم
کا دل چاہا کہ اپنی زبان ہی کاٹ پھینکے جو وقت پڑنے پر ایک بات بھی نہیں
کہہ سکتی ۔
حنیف میاں دو دن کی چھٹی پہ تھے بخار وخار تو کچھ نہ تھا
بس ایسے ہی سر میں ہلکا ہلکا درد اور اعضا شکنی ۔ مریم نے کھانا پکا کر
دسترخوان لگایا اور میاں کو آواز دی کہ ان کا جی کسمسا رہا تھا ۔ بولے
" میرا جی نہیں چاہ رہا ہے چڑی مار کو کھلا دے ۔
مریم نے بے دلی سے طشت میں کھانا لگایا اور بیٹھک کا پردہ
ذرا سا کھسکا کر طشت آگے کو بڑھا دیا ۔
چپڑ چپڑ کی آواز سے مریم کو پتہ لگتا رہا کہ چڑی مار کھانا کھا
رہا ہے ۔ کھا کھا کر اس نے طشت اندر زنانخانے میں رکھ دیا اور بولا
" قسم خدا کی بھابھی تمہارے ہاتھ کے کھانوں میں وہ مزہ ہے کہ جی چاہتا
ہے ان ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنا دوں ۔"
مریم نے اکیلے میں اپنے ہاتھوں کو دیکھا ۔ سونے کے کنگن ۔؟ وہ
طنزیہ انداز سے خود ہی مسکرائی ۔ سونے کے کنگن پہننے کے تو اس کے
نصیب کہاں ہیں ۔؟ ہاں مسالے پیستے پیستے اور روٹیاں تھوپتے تھوپتے
البتہ اس کے ہاتھ چمڑے جیسے سخت اور کھردرے ضرور ہو گئے ہیں ۔ تین چار
دن ایسے ہی گزرے ۔ حنیف میاں تو بس دودھ چائے کافی پر ہی گزارا
کرتے رہے اور چڑی مار ایک سے ایک بڑھیا کھانا کھاتا رہا ۔
ایک دن بڑا ہی عجیب اتفاق ہوا ۔ مریم کھانے کا طشت مردانے
میں کھسکا کر چق کے پیچھے سرک ہی رہی تھی کہ بیٹھک میں سے چڑی مار نکل آیا
ایک جھلک اس نے مریم کے ہاتھوں کی دیکھ لی بالکل سادگی اور پشیمانی سے
جس میں نہ کسی بدمعاشی کا شبہ تھا نہ بری نظر کا وہ وہیں سے بولا ۔
" بھابھی " آج پتہ چلا کہ تمہارے ہاتھ کے پکے کھانوں میں اتنا
مزہ کیوں ہے ۔ کیوں نہ ہو جس کے ہاتھ اتنے خوبصورت ہوں کھانوں میں
کیسے مزہ نہ آئے گا ۔"
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے سنسناتے کئی جھونکے جیسے ریگزار میں در آئے
اور مریم کا انگ انگ جیسے ٹھنڈی ہوا سے بھیگ گیا ۔ مگر وہ سنبھلی اور دروازہ
کو بری طرح بند کرتے ہوئے کہ ان کو ناگواری کا اظہار ہو جائے اور اندر آ
اپنے پلنگ پہ گر پڑی ۔
مریم خود سے یہ توقع کر رہی تھی کہ اب وہ شاید چڑی مار کیلئے
کوئی اہتمام کرے ۔ لیکن وہ خود ہی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ رات کو
جب اس نے کھانے کا طشت مردانے میں رکھنے کی خاطر اٹھایا تو وہ انواع
واقسام کے پکوانوں سے یوں بھرا ہوا تھا جیسے نئے نویلے دولہا کے لئے
سجایا ہو ۔ مریم خود سے ڈر گئی ۔
دوسرے دن حنیف میاں کی طبیعت چنگی تھی ۔ دفتر جانے کو اٹھے
تو مریم نے بے حد التجا آمیز لہجہ میں انھیں مخاطب کیا :
" ایک بات سنیئے گا میری ۔ ؟"
پتہ نہیں ۔ حنیف میاں کس موڈ میں تھے کہ بجائے گھڑکنے ڈانٹنے
کے پوچھ بیٹھے " کیا بات ہے ۔ ؟"
مریم رک رک کر، سہم سہم کر بولی ۔" دیکھیے آپ کو اندازہ نہیں

آپ کے دوست کی وجہ سے ہمارا بے حد خرچہ ہو رہا ہے۔ کسی بھی طرح سے آپ اسے یہاں سے روانہ نہیں کر سکتے۔؟"

حنیف میاں نے پہلے تو اسے ذرا گھورا ذرا رک کر بولے۔

"شام کو سوچوں گا۔"

شام کو حنیف میاں نیا نیا منصوبہ لے کر آئے، آتے ہی انہوں نے چڑی مار کو مخاطب کر کے اپنے پن سے یوں کہ اسے ذرا بھی شبہ نہ ہو پایا

"یار تو برا مت مان۔ میرے بڑے بھائی اور بھاوج شام کی گاڑی سے پہنچ رہے ہیں اور کوئی دو ہفتہ قیام رہے گا۔ تجھے تو معلوم ہے کہ گھر کتنا چھوٹا ہے! اور بھابی پردہ کرتی ہیں۔ اگر تو برا نہ ......"

چڑی مار سمجھ دار تھا۔ خود ہی بات کاٹ کر بول اٹھا: ارے یار کمال کرتے ہو۔ اس میں برا ماننے کا کیا سوال۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں زندگی باقی رہی تو ......" اور اس نے اپنا مٹھی بھر سامان لمحوں میں باندھ بوندھ کر تیار کر لیا۔ باہر تانگے کے گھنگرو چھن چھنائے اور ادھر مریم کی زندگی بھر کی بے زبانی کو زبان مل گئی۔ وہ جگر دہاڑ کر رو پڑی اور سسکیوں کے درمیان چیخ چیخ کر حنیف میاں سے کہنے لگی "اسے روک لو، خدا کے لئے روک لو۔ میں ...۔ میں اس کے بغیر زندہ نہ رہ پاؤں گی۔!"

حنیف میاں نے بے ہوش ہو جانے والی حیرت سے اسے دیکھا وہ بے باکی سے کہے گئی۔

"اس کے بغیر میری زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں، میں ...میں اس سے محبت کرتی ہوں ..... میں .... !"

صفحہ ۶۰ کا بقیہ —— آدم خور

میں نے سر اٹھایا، آنکھیں بند کیں، چند لمحے سوچا، کیا جواب دوں ——؟

"اپنے منگیتر کی ——" میں نے آہستہ سے جواب دیا —— اور آنکھیں کھول کر نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔ اس کا گلابی آمیز سفید رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔

"تم —— اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" اس نے لفظ "تم" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"وہی کچھ جو تم جاننا چاہتی ہو ——" میں نے جواب دیا۔

"کیا وہ زندہ ہے؟" اس نے سرگوشی کے انداز میں میری طرف سر جھکاتے ہوئے پوچھا ——

"کون؟" میں نے اچانک سوال کیا۔

"میرا منگیتر۔ اور کون؟" اس نے جواب دیا۔

"اوہ ——" میرے دل میں چاقو سا لگا۔ نام مجھے ہی لینا پڑے گا یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔

"اگر تم پرسیول کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہو تو ......"

اور میری بات پوری ہونے سے پہلے اس نے ہلکی سی چیخ ماری۔ آگے کو جھکی اور ....

(باقی آئندہ)

بلّور

[...]خموشی کے بلّور چھنکے
کسی مرمریں فرش پر چھن سے ٹوٹی
کلی چٹکی آواز کے پھول مہکے
رنگوں کی سُروں کی کوئی کہکشاں
کھلکھلاتی ہوئی گود میں آپڑی ہے
خموشی کے گہرے سمندر کی تہہ سے
کسی جل پری نے مجھے جیسے آواز دی ہو
اندھیرے کے پردے ہلے، ساز جھنکے
کئی نور کی انگلیاں جگمگائیں
شفق در شفق، رنگ در رنگ
عارض کا حیرت کدہ سامنے ہے
وہ ہنستا ہوا میکدہ سامنے ہے
دھنک سامنے ہے
کسی کو یہ قصہ سناؤں تو کیسے؟
قدم اور آگے بڑھاؤں تو کیسے؟

(پیکر حیدرآباد)

سردار جعفری

رات

انجم و ماہتاب کے سائے میں پھر آئے گی رات
نیلگوں زلفوں کے پیچ و خم میں بل کھائے گی رات
مسکرائے گی گریبانوں میں پھولوں کی طرح
آنچلوں کی ریشمی شکنوں میں لہرائے گی رات
مطرب رنگیں نوا کے ساتھ ہوگی نغمہ سنج
ساقیٔ کافر ادا کے ساتھ اٹھلائے گی رات
شعلہ پیکر قامتوں کے حلقۂ آغوش میں
کہکشاں کے پیرہن میں رقص فرمائے گی رات
عشق کے لب سے پئے گی جرعۂ آبِ حیات
حُسن کے پیمانۂ سیمیں کو چھلکائے گی رات
چشمِ ساقی ہی میں ٹھہرے گی نہ زلفِ بادہ میں
ساغر و مینا کے پینے سے ابل جائے گی رات
جرعہ جرعہ کرکے ذوقِ تشنگی پی جائے گا
قطرہ قطرہ کرکے پیمانوں میں ڈھل جائے گی رات
رنگِ خوں آرزو بن کر سحر ہوگی طلوع
دردِ دل بن کر مگر سینے میں رہ جائے گی رات
رنگ و بو کا کارواں غنچوں کی آوازِ جرس
دور بادِ صبح کی صورت نکل جائے گی رات

(نوجوان، کانپور)

الٹ پھیر

ازـ ——— شوکت تھانوی

ضخامت ——— ۱۸۴ صفحات

قیمتـ ——— تین روپے

ناشرـ ——— مشتاق بکڈپو کراچی

"الٹ پھیر" میں شوکت تھانوی مرحوم کے وہ دس منتخبہ خاکے شامل ہیں جو ریڈیو سے نشر ہو کر قبولیت عام حاصل کر چکے ہیں۔ یہ خاکے آج سے سولہ سترہ سال قبل کتابی صورت میں "مجھے خریدلو" کے عنوان سے انتہائی بھدّے اور مضحکہ خیز سرورق کے ساتھ شائع ہوئے تھے اور اسی سرورق کی بنا پر یہ کتاب ادبی حلقوں کی توجہ مبذول کرانے میں ناکام رہی۔ خوشی کی بات ہے کہ مشتاق بک ڈپو نے ان خوبصورت خاکوں کو نئے نام کے ساتھ خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ شوکت تھانوی اردو کے ان خوش نصیب آدمیوں میں ایسے تھے جن کی تخلیقات نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور ان کی کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ پھر بھی بازار میں ان کتابوں کی برابر مانگ رہی۔ زیرِ نظر کتاب کے خاکے بھی شوکت کی دوسری تخلیقات کی طرح سدا بہار ہیں۔ ان خاکوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے یہ صوتی حسن سے محروم ہو کر بھی ان کی دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے جب کہ عام طور پر بیشتر ریڈیائی تخلیقات کاغذ پر آ کر اپنی قدر و قیمت کھو دیتی ہیں۔ ان خاکوں میں شوکت تھانوی نے متوسط طبقہ کی زندگی کے مضحک پہلوؤں کو انتہائی خوبصورت انداز میں اجاگر کیا ہے۔ شوکت تھانوی کی زبان و بیان کے بارے میں رشید احمد صدیقی کے یہ الفاظ کافی ہیں۔ "شوکت تھانوی کی زبان و بیان میں وہی سلاست و بے تکلفی کی ... ہے۔ ان کے لطیفے ... ادب کا رزمیہ ... جانے ... ہیں"۔ شوکت روتوں کو ہنسانے کا گُر جانتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر کے آئینے میں معاشرے کے بیمار پہلوؤں اور ملمع کی ہوئی زندگیوں کا عکس اس خوبی سے دکھاتے ہیں کہ قاری کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے قہقہوں پر قدغن لگا سکے۔ لیکن شوکت کے فن کی عظمت یہ ہے کہ ان خاکوں کو پڑھنے کے بعد ہنسی کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی سوچتے ہیں کہ آج کا انسان اپنے دل میں نہ جانے کتنے غم چھپائے زندگی سے سمجھوتہ کیئے ہوئے ہے۔ اس سمجھوتہ نے اس کی شخصیت کو کتنا مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ اگر ہم اپنا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ ہم خود شوکت کے خاکوں کے کرداروں میں سے ایک ہیں۔ اور مصنوعی زندگی گزارنے کی وجہ سے خود ہماری شخصیت انتہائی مضحکہ خیز ہے۔

شوکت کے فن کی یہی وہ خوبی ہے جو انہیں دوسرے طنز نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ الٹ پھیر کے سب خاکوں میں یہ رنگ پوری طرح نمایاں ہے۔ کتابت و طباعت معیاری ہے۔ سرورق سادگی و پرکاری کا نمونہ ہے۔

سنگ و سمن

ازـ ——— خالد شفائی

ناشرـ ——— مقبول اکیڈمی

خالد شفائی حیدرآباد کے ایک نوجوان شاعر ہیں۔ ابھی نہ تو ادبی حلقے ان کے نام سے آشنا ہیں اور نہ ان کی شاعری کی عمر کچھ زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنگ و سمن کی نظمیں، غزلیں وہ فنی معیار نہیں رکھتیں جو قاری کو متاثر کر سکے۔ لیکن اس مجموعۂ کلام کو دیکھ کر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ شاعر صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اور فکری ندرت، زبان و بیان کی ... ان سے خوش آئند توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

گزشتہ شمارے میں جو سوالات شائع ہوئے تھے ان میں محترمہ صادقہ سعید کراچی کا سوال سب سے بہتر اور انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اعلان کے مطابق اس ماہ سے ان کے نام پرچہ جاری کر دیا گیا ہے۔ (ادارہ)

منصور جعفری بھوپال

س :- میرے ایک قابلِ احترام بزرگ جو میرے استاد بھی ہیں فرماتے ہیں کہ ریاض خیرآبادی امیر مینائی کے استاد بھائی تھے اس کے برخلاف بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ امیر مینائی ریاض خیرآبادی کے استاد تھے۔ براہِ کرم آپ میرے اس سوال کا تسلی بخش جواب دیں کیونکہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے کسی رائے سے اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ج :- منصور صاحب! اس مسئلہ میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ ریاض خیرآبادی نے شروع میں امیر مینائی کے استاد دلوا یے مظفر علی خاں اسیر سے اپنے کلام پر اصلاح لی اور ایک دیوان بھی مرتب کر ڈالا۔ مگر استاد کی تنبیہہ پر یہ دیوان ضائع کر دیا۔ بعد میں اسیر کی پیرانہ سالی کی وجہ سے انہوں نے اسیر کے بجائے امیر کے شاگرد امیر مینائی کو اپنا استاد بنایا۔ بعض نقادوں نے لکھا ہے کہ ریاض اپنی افتادِ طبع اور اسیر کے اندازِ فکر کے عدم ربط کے باعث تشکی پاتے تھے ان کی اصلاح سے مطمئن نہیں تھے۔ اور اسی لئے انہوں نے اسیر پر امیر مینائی کو ترجیح دی۔

ظفر حمید، کوئٹہ

س :- کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مرزا غالب کا فارسی دیوان کس سن میں شائع ہوا؟

ج :- ظفر صاحب! اس بارے میں ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ مگر بیشتر محققین اس پر متفق ہیں کہ مرزا غالب کا فارسی دیوان پہلی بار ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔

علی اصغر ڈھاکہ

س :- آجکل جدید شعراء کی جو نظمیں شائع ہو رہی ہیں وہ اس قدر مبہم ہوتی ہیں کہ ذہن ان کا کوئی تاثر قبول نہیں کرتا۔ پھر بھی نئی نسل کے شعراء کا ادعا یہ ہے کہ نئی نظم عصرِ حاضر کے تقاضوں کی آئینہ دار ہے۔ آپ کی اس بارے میں دیانت دارانہ رائے کیا ہے؟ کیا جدید شعراء کا یہ ادعا صحیح ہے؟ جواب ضرور دیں۔

ج :- ابہام، شعر کا حسن بھی ہو سکتا ہے اور نقص بھی۔ اچھے فنکار اکثر شعر یا نظم میں ایسے خلا چھوڑ دیتے ہیں جسے قاری اپنی ذہانت سے پُر کرتا ہے اشارات استعارہ میں کہی جاتی ہے اور نثر کی طرح براہِ راست نہیں کی جاتی۔ جس نظم میں براہِ راست ابلاغ کی کوشش کی جاتی ہے اسے ہم زیادہ سے زیادہ منظوم نثر پارہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ریاض اور محنت کی کمی سے مبتدی شاعر کے یہاں جو ابہام پیدا ہو جاتا ہے وہ شعر سازی ہے اور آج کل بیشتر نظموں میں جن پر جدید شاعری کا لیبل چسپاں رہتا ہے اسی قسم کے ابہام ملتے ہیں۔

اقتدار حیدر، پٹنہ

س :- اردو کے مشہور مزاحیہ شاعر راجہ مہدی علی خاں مرحوم سے مجھے انتہائی عقیدت ہے۔ اس لئے میں ان کا کلام زیادہ سے زیادہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ مطلع فرمائیں کہ راجہ صاحب کا کوئی شعری مجموعہ شائع ہوا ہے؟

ج :- اقتدار صاحب! راجہ مہدی علی خاں مرحوم کا ایک شعری مجموعہ "اندازِ بیاں اور" کے نام سے تقریباً دو تین سال قبل [illegible] شائع کیا تھا جسے انتہا مقبول ہوا۔ لاہور سے [illegible] آپ یہ مجموعہ منگا سکتے ہیں۔

جھلکیاں

کابل یونیورسٹی

افغان ایئرلائنز کی ایک ایئرہوسٹس

کابل کا ہوائی اڈا

چکما قبیلے کی ایک خاتون گھر پر کپڑا بن رہی ہے

اس عالم میں بھی زندگی ہے، [illegible]

[illegible]

پہلی بار آپ [illegible] کے توسط سے آپ کے رسالے سے [illegible] ہوں۔ یوں تو میرے پاس اردو کے کئی رسالے آتے ہیں مگر الشجاع [illegible] اپنے معیار کے اعتبار سے ان سب سے مختلف ہے۔ اس میں عام پڑھنے والوں کے [illegible] ہوتا ہے اور علمی ادبی شخصیتوں کی توجہ بھی اپنی طرف [illegible] ہے۔ ادارہ جس سلیقے سے پرچہ ترتیب دیتا ہے اس پر مبارکباد نہ دینا ادبی بددیانتی ہوگی۔ (کانپور)

[illegible]

الشجاع مجھے اس لئے بہت پسند ہے کہ اردو کے تمام رسالوں میں اس کا رنگ ڈھنگ اور ترتیب سب سے جدا اور منفرد ہے۔ دوسرے اس میں پڑھنے والے کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ (سارن بہار)

اشفاق مرزا

الشجاع نے غیر ملکی مہمانوں کی آمد پر ہمیشہ [illegible] پیش کئے ہیں۔ زیر نظر شمارے کے ذریعہ آپ نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ پاک افغان تعلقات سے متعلق حبیب اللہ بیگ کا مضمون اختصار کے باوجود جامع اور افادی نوعیت کا حامل ہے۔ "جھلکیاں" کے تحت آپ نے جو تصاویر پیش کی ہیں وہ خوب ہیں۔ البتہ سرورق کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔ (حیدر آباد)

قدسیہ جعفری

بنگالی کہانیوں کے تراجم کی اشاعت ایک قابل قدر اقدام ہے [illegible] حالات کا تقاضہ ہے کہ پاکستان کے دونوں صوبوں کو قریب [illegible] دونوں قومی زبانوں کے شہ پارے اردو اور بنگالی میں پیش [illegible]۔ آپ نے وقت کی آواز پر لبیک کہہ کر یہ ثابت کر دیا کہ الشجاع [illegible] ہے۔ افسانہ "گھاؤ" بہت پسند آیا۔ المجیب جوہر نے [illegible] سے اس کہانی کو اردو کا جامہ پہنایا اس سے ان کی فنکارانہ [illegible] کا اندازہ ہوتا ہے۔ توقع ہے کہ جوہر صاحب آئندہ بھی بنگالی ادب کے بہترین نمونے اردو میں پیش کرکے اپنی قومی [illegible]

اقدامات [illegible] ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں گے۔ (چاٹگام)

اخلاق عسکری

ڈراموں کی باقاعدہ اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ ڈرامہ اصناف ادب کی سب سے مظلوم صنف ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو میں اچھے ڈرامہ نگار نہیں ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کمی کی وجہ سے ڈرامہ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ مجھ مار کمیٹی ایک دلچسپ مزاحیہ ڈرامہ ہے جو نہ صرف اسٹیج ہو سکتا ہے اور نشر بھی ہو سکتا ہے بلکہ کاغذ پہ منتقل ہو کر ذہن پر بھی خوشگوار اثرات چھوڑتا ہے۔ (آگرہ)

جلیل الرحمٰن

شعری حصہ میں سحر انصاری اور شبی فاروقی کی نظمیں ان جدید شعراء کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں جو جدید شاعری کے نام پہ مبہم بلکہ مہمل نظمیں کہہ کر ادبی حلقوں کو مایوس کر رہے ہیں۔ حرمت الاکرام اور خورشید جامی کی غزلیں لاجواب ہیں۔ اس کے برخلاف کیف اسعدی اور سعادت نظیر کی غزلیں شائع کرکے آپ نے کاغذ ضائع کیا ہے۔ (کوئٹہ)

شہناز اشفاق

سچی کہانیوں کے تحت آپ نقی محمد خان خورجوی کی جو کہانیاں شائع کر رہے ہیں وہ انتہائی دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ نقی محمد خاں صاحب کا شمار اردو کے ان صاحب طرز ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی تحریریں عوام و خواص دونوں کے لئے باعث کشش ہیں۔ آپ آئندہ بھی موصوف کی کہانیاں پابندی سے شائع کریں۔ (کراچی)

نوید اختر

اس ماہ آپ نے آدم خور کی طویل قسط شائع کرکے ہم [illegible] گزشتہ ماہ کی غیر حاضری کی کسی حد تک تلافی کر دی۔ یہ [illegible] اور سنسنی خیز ہے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اس [illegible] صفحات میں اضافہ کر دیں [illegible] جاتے ہیں [illegible] (ڈھاکہ)

منظور شدہ محکمہ تعلیمات بموجب سرکلر نمبر ڈی ای/کیو ۹/۱۱۱۱۹-۹۴
مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۱ء

— ترتیب —

ایس ایم غیاث الدین — سلمان الارشد

— طابع و ناشر —

ایس ایم شجاع الدین

— زیر اہتمام —

سلطان کلیم

سالانہ: پانچ روپے ——— فی شمارہ: پچاس پیسے
فون نمبر ۵۲۳۳۳ (پریس) ——— ۵۵۲۱۲ شعبۂ ادارت

— شعبۂ نشر و اشاعت —

مینسفیلڈ اسٹریٹ۔ صدر۔ کراچی

ایس ایم شجاع الدین پرنٹر پبلشر نے ناز پریس مینسفیلڈ اسٹریٹ کراچی سے
چھپوا کر دفتر الشجاع صدر کراچی سے شائع کیا

اس شمارے کے چند فنکار

- قرۃ العین حیدر
- خلیل الرحمن اعظمی
- تابش دہلوی
- سرور جمال
- شہلا تزئین
- جمیل زبیری
- رضی عزیزی
- شبی فاروقی
- عبد الرؤف عروج
- رشیدہ رضویہ
- پال سارجنٹ
- حزیں لدھیانوی
- زبیر رضوی
- جم جونیئر

ان کے علاوہ
اور دوسرے

مشرقی پاکستان میں
ہوائی ڈاک سے ——— فی شمارہ ۱۸ پیسے

جلد ۱۵ — مارچ ۱۹۶۷ء — شمارہ ۳

ہمارے نام .. قارئین .. ۲

الناس .. ناشر .. ۵

تصویری فیچر

فیشن .. شہلا تزئین .. ۶

ناقابل فراموش

پلاسٹک بم .. پال سارجنٹ .. ۱۱

تحقیق و تنقید

ادب میں انسان دوستی .. غلام سمنانی .. ۱۶

شعری ادب

انسان .. حزیں لدھیانوی .. ۱۹

تخلیق .. شمی فاروقی .. ۲۰

بازگشت .. محمود خاور .. ۲۰

غزل .. تابش دہلوی .. ۲۱

غزل .. عبدالرؤف عروج .. ۲۲

غزل .. عادل منصوری .. ۲۲

غزل .. عنوان چشتی .. ۲۳

غزل .. بدر جعفری .. ۲۳

افسانے

بری لڑکی .. رضی عزیزی .. ۲۴

نشاط زندگی .. جمیل زبیری .. ۲۶

منزل .. ناصر بغدادی .. ۲۹

رفاقت .. قمر ساحری .. ۳۴

سچی کہانی

تائیس .. نصرت جمیل .. ۳۷

طنز و مزاح

طنز نگار کی بیوی .. سرور جمال .. ۴۱

سیر و سفر

بغداد کی چاندنی .. رشیدہ رضویہ .. ۴۵

فکر و خیال

ادب میں نسائیت آفرینی .. شبنم رومانی .. ۴۹

مسلسل ناول

آدم خور .. جم جونیئر .. ۵۲

حاصل مطالعہ

فوٹوگرافر .. قرۃ العین حیدر .. ۵۹

فیض کی شاعری .. میر احمد علی .. ۶۳

غزل .. خلیل الرحمٰن اعظمی .. ۶۶

غزل .. شہریار .. ۶۶

ہونہار شہری

ایک سوٹ .. محمود واجد .. ۶۷

کمرے میں موٹر .. خالد انصاری .. ۶۹

بازگشت .. ادارہ .. ۷۲

سرورق: فیشن — عکاس: سرازی — سرورق سے متعلق مضمون صفحہ ۶ پر ملاحظہ فرمائیے

اِلتماس

الشجاع کے جنوری کے شمارے میں ہم نے لکھا تھا کہ قارئین الشجاع اور قلمی معاونین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہر ماہ الشجاع میں شائع ہونے والی تخلیقات کا جائزہ لیں اور کھلے دل سے ان پر تنقید کریں تاکہ ان تنقیدی آرا کی روشنی میں ہم الشجاع کو اور زیادہ دلچسپ اور بہتر بنا سکیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ الشجاع کے پڑھنے اور لکھنے والوں نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے اپنے تاثرات سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ یہ تنقیدی جائزے اس اعتبار سے انتہائی اہم ہیں کہ ان میں ذاتی پسند یا ناپسندیدگی کے اظہار کے بجائے موضوع، اسلوب اور زبان و بیان پر بحث کی گئی ہے۔ زیرِ نظر شمارے کی ترتیب میں ان تنقیدی آرا سے ہمیں بڑی مدد ملی ہے۔ اور اسی لئے توقع ہے کہ یہ شمارہ بڑی حد تک پڑھنے والوں کے ذوق سے ہم آہنگ ہوگا۔ ترتیب کے سلسلہ میں موصول ہونے والی دوسری تجاویز ہمارے زیرِ غور ہیں۔ جیسے ہی حالات سازگار ہوئے ان پر عمل ہوگا۔ اس ذیل میں چند شکایتی خطوط بھی موصول ہوئے ہیں۔ لکھنے والوں کو شکایت ہے کہ بعض دوسرے جرائد کی طرح الشجاع بھی نئی نسل سے استغنا برت رہا ہے اور رسالہ میں جدید فنکاروں کی تخلیقات شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔

جہاں تک ان شکایات کا تعلق ہے وہ ہمارے خیال میں صحیح نہیں ہیں۔ ہم شاکی حضرات (جو خود شاعر و ادیب ہیں) کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے کبھی نئے پُرانوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ نئی نسل کے ممتاز فنکاروں کی تخلیقات الشجاع میں برابر شائع ہوتی ہیں۔ مَوجودہ دَور میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ جدید ادب کی اہمیت سے انکار کیا جائے۔ اس مرحلہ پر ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ہم ان فنکاروں کی تخلیقات سے واقعی استفادہ نہیں کرسکے جو جدید ادب کے نام لیوا تو ہیں۔ مگر جدید ادب کے تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خود نئی نسل اور جدید ادب کے صحیح علمبردار بھی ان فنکاروں سے عاجز ہیں۔ حال ہی میں نئی نسل کے ذہین نقاد محمود ہاشمی نے اپنے ایک مضمون میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

"جدید نسل کے یہ تخلیق کار جذبے اور مشاہدے سے عاری ہیں۔ زندگی یا جدید دَور کی زندگی اور انسانی انکار سے ان کا وہ تعلق بھی نہیں ہے جو آسمان کے چاند اور بالٹی کے پانی میں نظر آنے والے چاند میں ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنی بساط سے بے بہرہ، اپنے احساس سے ناواقف اور اپنی شخصیت کے تعلق سے احساس کمتری کا شکار ہیں۔ یہ لوگ صحیح معنی میں جدید ادب کی روایت سے متعلق نہیں ہیں۔ یہ فیشن پرستوں کی روایت سے وابستہ ہیں۔ جدیدیت ان کے لئے ایک مروّجہ فیشن ہے۔"

اِس 'اقتباس' کے پیش کرنے کے بعد ہمیں اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔
جنوری فروری کی طرح اس شمارے پر بھی آپ کے بے لاگ محاکمہ اور تنقیدی تجزیے کے ہم منتظر رہیں گے۔

آپ کا مخلص
شجاع الدین
ناشر

فیشن کے بازار میں پگڑی تو نہیں اچھلتی مگر خربوزے کو دیکھ کر دوسرا خربوزہ بڑے پیارے رنگ کا ہو جاتا ہے۔

سنتے ہیں کہ فیشن انسانی زندگی کی طرح متنوع اور اونٹ کی مانند بے کل ہوتا ہے۔ اور کسی کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ یہ شتر بے مہار کب اور کہاں ایسی عظیم الشان کروٹ بدلے کہ اپنے سارے کئے کرائے پر پانی سا پھر کر رہ جائے۔ مثلاً یہ کہ ہم اچھی بھلی قمیض پہنتے تھے۔ ڈھیلی ڈھالی گھٹنوں سے نیچے نیچے۔ سیدھا سادھا کھلا دوپٹہ۔ سر بھی ڈھانپیے اور جسم بھی۔ غرضیکہ اچھا خاصہ مہذب اور پُروقار سا ماحول تھا مگر خدا جانے اس فیشن کے اونٹ کو کیا سوجھی کہ ایک دم بلبلا کے اٹھا اور پھر ایسی چھلانگ لگائی کہ سر سے دوپٹہ گیا اور گھٹنوں سے قمیض — تو اب یہ فیشن ہے۔ اچھا بھائی جو مرضی اب ہماری تمام بہنیں فیشن کے سامنے خمیدہ اور مشین کے آگے دوزانو ہو بیٹھیں۔ ہاتھ میں قینچی اور ہر اپنی قمیضوں شلواروں اور دوپٹوں کا ڈھیر۔ کتر بیونت، چیر پھاڑ۔ ادھر اس فیشن کے بانی حضرات درزیوں کے چکر میں مصروف۔ سر۔ سر۔ سر۔ قینچی یہاں سے وہاں تک چل رہی ہے۔ تین انچ کے پائنچے بٹن والے۔ کھلے گلے کی ٹیڈی قمیض — خوب اونچی اونچی — اور رہ گیا دوپٹہ۔ یہ بیچارہ تو بس رہ ہی جاتا ہے۔ بہر حال جو خواتین زیادہ فیشن کے حق میں نہ تھیں انہوں نے بکمال ہوشیاری قمیض سے اتاری گئی پٹیوں کو جوڑ کر کاندھوں پر سجا لیا۔ یہ لیجئے ایک پنتھ اور دو کاج — دونوں پائنچوں کے — اب یہ تو مانا کہ فیشن معاشرے میں ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا بھی۔ قرونِ اولیٰ کی تاریخ پڑھیں یا الف لیلیٰ کی داستانیں
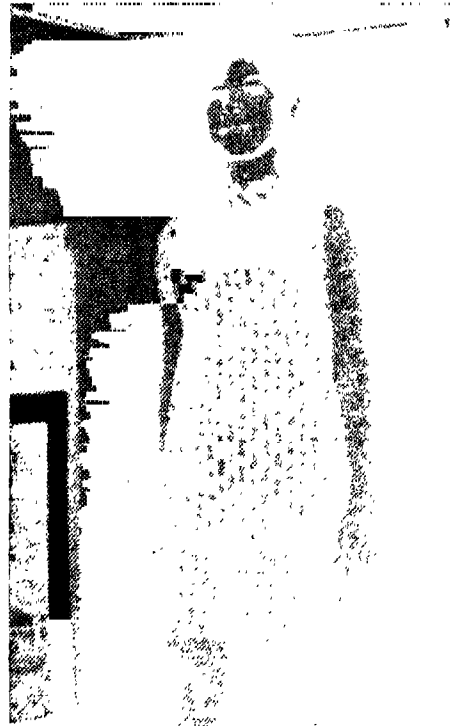
فیشن کے یہ نت نئے انداز ہر قصبہ اور ہر زمانہ میں موجود ہیں۔ قبلے
چست کی تاریخ بھی پرانی اور لکھنؤ کے بانکوں کا تذکرہ بھی فرسودہ۔
مگر کوئی اتنا تو بتلائے کہ لباس کی اس ہر لحظہ تراش خراش اور بالوں کی
آراستگی کے نشیب و فراز میں کونسا جذبہ مضمر ہے۔ اگر یہ فیشن ہے
تو بھیڑ چال اور جذبۂ خود نمائی کیا ہے؟ اگر تہذیب اور ثقافت
اسی کا نام ہے تو پھر احساسِ کمتری کسے کہتے ہیں؟ ان آئے دن کی
تبدیلیوں کا سبب جس سے پوچھا اس نے سارا الزام انسانی فطرت
کے سر باندھا کہ جو پارہ کی مانند رقصاں اور مضطرب ہے۔ اور
جس کے جبلی تقاضے اسے ہر آن ایک نئی منزل کی طرف لئے جاتے ہیں۔

اُفوہ۔ یہ نئی منزل — ہم چہار طرف کھنچے کھنچے بلکہ گھسٹے
گھسٹے پھرتے ہیں۔ اور یہ منزل — یہ نہ آج ملتی ہے نہ کل —
بیچاری — کہیں ہو تو ملے بھی۔

تو ذکر یہ تھا کہ فیشن تو ہمیشہ سے ہے اور پھر یہ زبردستی
کا معاملہ بھی نہیں ؎

بربادیٔ دل جبر نہیں فیض کسی کا۔

مگر فیض صاحب کو یہ بھی تو معلوم ہے کہ جو اس نے نہ
چڑھائی گھٹنوں سے اوپر قمیص اور نہ کٹے ایک بیتھ کے دو دو کاج
تو یہ ہماری ذات برادری ہے۔ یہ ہماری نام نہاد سوسائٹی اور یہ اہل
معاشرہ۔ اُف — ہمارے ڈھیلے ڈھالے لباس میں اٹھنے بیٹھنے اور چلتی
بس میں لپک کر چڑھ جانے کی سہولتوں پہ شک تو خیر کسی کو نہیں
آئے گا چہار سو ایک ہی صدا ہو گی۔ ہی ہی ہی — جسے دیکھئے
دانت نکالے خود ہنسے اور ہمیں رلانے کو کھڑا ہے۔ اچھا صاحب۔
جو پنچ کی رائے۔ مگر دم لیا تھا قیامت نے ہنوز۔ یہ تو اک [illegible]
کا وقفہ تھا۔ یعنی اب جو جناب فیشن دم لے کر آگے بڑھے تو چہار
سو وہی لمبی قمیص اور کھلے پائنچے۔ یہ لیجئے اڑا اڑا دھم —
اور جانئے سنبھل کی چال [illegible] لعل [illegible] — [illegible] کی
زمین نکل گئی [illegible] اوسط طبقہ کی
خواتین اور [illegible] پر [illegible] کی [illegible]
میں [illegible] معروف [illegible] — اب [illegible] کہ جو [illegible] نے

مستقبل کے چہرے پر بھی ایک نظر رکھی انہوں نے اپنی قمیضوں کی
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ابتدا میں تو یہ پٹیاں مجبوری کے تحت لگی تھیں۔ مگر دو چار ہفتوں میں "اخبار فلاں" ۔۔۔ اور "اخبار فلاں" کے توسط سے بالصراحت اطلاع ملی کہ یہ تو عین ماڈرن فیشن ہے کہ جس کے کرنے سے ہم سب کا بھلا ہوگا ۔۔۔

اب جس چھوٹے بڑے کو دیکھئے اچھی بھلی قمیصوں کو نیچے سے کاٹ کر سرخ، سبز، نیلی، پیلی پٹیاں جوڑے مگن گھومتا ہے کسی میں کیا مجال کہ اُف بھی کر سکے۔ ہاں تو لیجئے جس سے جلتی چلے ہے کروا لیجئے۔

یہ تو فیشن کا بازار ہے۔ یہاں پگڑی تو نہیں اچھلتی مگر خربوزے کو دیکھ کر دوسرا خربوزہ بڑے پیارے رنگ کا ہو جاتا ہے۔ رنگ پہ یاد آیا کہ ہم کسی تقریب میں اپنا نیا ساٹن کا سوٹ پہن گئے۔ اچھا خاصہ صوفیانہ رنگ۔ اپنی دانست میں خاصے دیدہ زیب بن کر پہنچے تھے۔ اپنے ہم عصروں سے تعریف کی امید تو کبھی رکھتی ہی نہیں۔ مگر ہاں۔ اس جھٹک کی توقع بھی نہ تھی کہ بس دیکھتے ہی ہنسی شروع ہو گئی۔ ایک صاحبہ کان میں بولیں۔ "یہ کیا امی جان کے جہیز کا ہے؟"

ایک نیم تبسم سے کہا۔ "جی نہیں۔ ہمارے ہی جہیز کا ہے۔"
ہنسی سے بے تاب ہو گئیں اور پھر یوں گوہر فشاں ہوئیں کہ "اچھا صاحب۔ تمہاری ہی ہمت ہے کہ ایسا آؤٹ آف ڈیٹ رنگ پہنے ہو۔ ہم ہوتے تو فوراً ڈائی کرا لیتے۔" تو یہ ڈائی کرانا بھی فیشن ہے۔ اچھا۔ اچھا۔ تو یہ "امریکانو" جو الہ دین کا چراغ مشہور ہے تو یوں ہے ۔۔۔ بہت خوب ۔۔۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ دیگر معاملوں کی طرح نقل کے میدان میں بھی ہم اہل مشرق خاصے لیٹ لطیف واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہمارے مردوں نے ترکی ٹوپی اس وقت اپنے سروں پر جمائی کہ جب خود ترک بھی اس سے بیزار ہو گئے۔ اور پھر اچانک دل میں ایسی مغربیت سمائی کہ ٹوپی بیچاری اتنی دور جا پڑی کہ اب ڈھونڈے نہیں ملتی۔ جیسے کسی زمانہ میں مردوں کے ننگے سر رہنے کا خیال محال تھا۔ ویسے ہی اب اگر کسی مجمع یا تقریب میں کوئی ٹوپی زدہ سر نظر آ جائے تو لوگ باگ اس کی شوخ اور شریر طبیعت کا اندازہ محض چند ثانیوں میں لگا لیتے ہیں۔

کوئی زمانہ ایسا بھی تھا کہ جب سادگی حسن اور فیشن کا معیار تھی تعلیم یافتہ خواتین تو اسے خاص طور پر ملحوظ رکھتیں۔ تیز تیز چیختے چلاتے رنگ، بھاری بھرکم زیورات، بال بنانے کے الٹے سیدھے انداز۔ پڑھا لکھا طبقہ ان باتوں سے کتنا بلند تھا۔ تبصرہ یوں ہوتا تھا۔ "اے واہ ۔۔۔ وہ کوئی جاہل ہیں کہ الٹے سیدھے رنگ پہنیں ۔۔۔" اور اب یہ حال ہے کہ جہاں کسی سادہ مزاج لڑکی پر نظر پڑی اور تجربہ کار نگاہوں نے فوراً بھانپ لیا۔ "بھولی پڑی

رکھی۔ یہ کیا جانیں بننا سنورنا۔ اب وہ بیچاری لاکھ ماسٹرکی ڈگری رکھتی ہو۔ مگر اس مشینی دور میں اس بدنصیب کا گزر کہاں ؟

ابھی کچھ عرصہ پہلے کا ذکر ہے کہ لڑکیوں کی ناک بچپن ہی میں چھیدی جاتی تھی تاکہ سندر رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے خلاف سیکڑوں بل پاس ہو گئے۔

"سراسر ظلم ہے"

"زندہ انسان کی ناک میں سوراخ !۔ توبہ توبہ ۔۔"

"تمہیں نے چھدوالی اپنی جان سے ڈر کر۔ میں تو یہ نکیل کبھی نہ ڈلواؤں" ۔۔ کوئی بات بھی ہو ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جمعدارنی چلی آرہی ہیں۔ ناک میں موٹی کیل اٹکائے" (ہائے کیسی خوش نصیب جمعدارنیاں ہیں کہ جو اپنی مرضی سے ناک میں کیل ڈالے مزے سے گھومتی ہیں اور کوئی انہیں سولی نہیں چڑھاتا.....) غرضیکہ دیکھتے ہی دیکھتے ننگے ہاتھ کان رہنے کی رسم چل پڑی فیشن بہت بہتر مگر کچھ دن نہ گزرے ہوں گے کہ ہماری ایک شناسا صدر میں شاپنگ کرتے ملیں۔ انتہائی موڈرن - پڑھی لکھی - سوچی ہوئی پکوڑا سی ناک اور اس میں موٹا سا کالا ڈورا ۔۔ اشارے سے سبب پوچھا تو وہ ہماری جہالت پر اشک بہا کر بولیں۔

"پنجارن میں نیلو کی ناک بھول گئیں کیا؟"

کیا کہتے کہ ہم تو یہاں خود اپنی ناک پھلائے بیٹھے ہیں کہ جسے عرصہ ہوا صدہا ارمانوں سے چھدوایا تھا کہ خوبصورت سی کیل پہنیں گے مگر یہ فیشن کی مہادیوی (جانے نہ مرحمت فرمائیں تب نا۔ ہم تو انہیں کے نگہ لطف و کرم کے امیدوار رہتے ہیں۔ غرضیکہ سیکڑوں دعائیں پائیں ان فلمساز صاحب نے کہ جن کے التفات سے سیکڑوں ناکیں قابلِ استعمال ہو گئیں۔

اور یہ بالوں کی زیبائش کا فن بھی خاصا مشکل ہے : تاریخ میں ملکہ نور جہاں کی مشاطہ کا ذکر ملتا ہے کہ جو بال سنوارتے ہوئے ایک بال نہ ٹوٹنے دیتی تھی۔ شکر ہے کہ وہ صاحبہ جلد ہی کوچ کر گئیں۔ ورنہ اس "فارغ البالی" کے زمانہ میں ان پر نہ جانے کیا گزرتی ۔۔ یا پھر زمانۂ قدیم کی وہ آرائشی کنگھیاں کہ جو اس زمانہ میں شادی کا ذریعہ تھیں۔ لڑکا ایک خوبصورت سی کنگھی خود بناتا اور پھر اپنی پسندیدہ لڑکی کے چرنوں میں رکھ دیتا۔ اور بس ۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ نفع و نقصان کی بحث سے قطع نظر محض فیشن کی رو سے کنگھیاں خاکسار کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر کسی صاحب نظر کو

اب ان کنگھیوں کا کوئی سراغ مل سکے تو ہمیں بتا کر عنداللہ ماجور ہوں۔

ہم پاکستانی خواتین و حضرات کی بات تو جانے دیجئے۔ ہمیشہ کے نقالچی۔ مگر جب صدیوں گوری گوری میموں پہ نظر پڑتی ہے کوئی سر کھجو رہا ہے۔ کسی کے دامن پر شیشوں کا کام جگمگا رہا ہے اور کسی کے

دستور اور مہندی سے سلجھ رہی تھیں۔ ایک لمحے تو جی کھل اٹھتا ہے مگر فوراً ہی حماقت پر ہنسی آجاتی ہے۔ بھلا ہم اس قابل کہاں کہ کوئی ہماری جھینپ دور کرے۔ پھر ہمدردی انسانی جبلت اور اس کے فطری تقاضے ہیں کہ جن بعض خواتین کو بھی منزل کی تلاش

جیسا چکرا سے دیتے ہیں۔ وہ تو ہمارا لباس یا کوئی انداز محض ذرا سی تبدیلی اور تفریح طبع کی خاطر اپنا لیتی ہیں۔ ورنہ جس تہذیب اور ثقافت کی یاد ہمارے دلوں میں نہیں وہ ان کے دلوں میں کہاں

الشہاب

سائے گی ---

اور اس مہندی جیسی دقیانوسی شے کو تو جیسے ہماری نسلیں نہیں چلنا ورنہ مٹکے رکھ دیں۔ ایک دلہن صاحبہ نے تو شادی سے ہفتوں پہلے نوٹس نکال دیا تھا کہ "اگر یہ ہاتھ گندے کرنے والی گندی سی چیز ہمارے قریب لائی گئی تو ہم سب کے منہ پر تھوپ دیں گے"۔ یہاں مجھے بے ساختہ عصمت چغتائی یاد آرہی ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون بعنوان نئے پرانے میں لکھتی ہیں۔

"بچوں نے ذرا اپنی پسند سے کوئی لباس پہنا اور قوم کی بڑی بوڑھیاں پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑیں۔" اگر سوال مرشد بچوں کا ہوتا تو بھی بات کچھ نہ تھی کہ چلو ان فتنہ انگیز بچوں کے سر پر کچھ بوڑھیاں پنجے تیز کیے پڑی ہیں۔ مگر رونا تو یہ ہے کہ یہاں سوپ کے ساتھ ساتھ چھلنی بھی بولتی ہے۔ اب قوم کی ان بڑی بوڑھیوں کو کوئی کیا کہے اور کس منہ سے کہے کہ یہ نیلوا ورنہ یہ کی نقالی اس عمر میں کچھ پریشان کن سی ہے اور یہ کہ تنگ قمیض شلوار یا کھلے گلے کا بلاؤز آپ کی ہستی مبارک پہ کچھ بھلے نہیں لگتے۔ بچے سر میں تیل نہیں ڈالتے۔ لیجئے قومی معیار تلپٹ ہوگیا۔ آپ کی بلا سے کوئی تیل ڈالے بال بڑھائے یا سر منڈائے (اے کاش) دھول جھونکئے آپ کیوں دبلے ہوئے جا رہے ہیں۔" تو عرض ہے کہ شہر کے قاضی کو ڈانٹنگ کا جو مستقل پروانہ منجانب اللہ عطا ہوا ہے اسے کون چھین سکتا ہے۔ ہاں اتنی درخواست فرور ہے کہ اگر دھول ہی جھونکنی ہے تو کیوں نہ اس ہم کو ذرا سا تیز کر لیا جائے۔ یوں نہ صرف یہ کہ بہتر خدمت کی بہترین مثال قائم کی جاسکتی ہے۔ بلکہ کے۔ ڈی۔ اے کے افسران کو ایک طویل عرصہ تک مشکور بنایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے اور آپ کے دھول جھونک لینے کے بعد کے ڈی اے کو کیا پڑی ہے کہ قریہ قریہ اور کوچہ کوچہ سڑکیں اور فٹ پاتھ کھودے اور اہل شہر سے دھول دھپہ کرتی پھرے۔ عصمت چغتائی مضمون کا آخری جملہ لکھتی ہیں۔

"ہم کیوں مغربی لباس اپنے بچوں کو پہنے دیکھ کر بدکنے لگتے ہیں۔ ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔" — ذرا نہیں بلکہ بے حد غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور پھر اپنی مسلم تہذیب ثقافت، زبان اور لباس کے بے قدر ہو جانے پر آنسو پی کر اور دل مسوس کر رہ جانے کی بھی ضرورت ہے۔

— مقدور ہو تو ساتھ رکھیں نوحہ گر کو ہم

"تمہارے بیگ میں پلاسٹک بم ہوگا جسے ہٹلر کے کانفرنس روم تک لے جانا اور اسے میز کے نیچے رکھنا تمہاری صلاحیت، ہمت، اور عزم پر موقوف ہوگا ...."

"میں تیار ہوں" کرنل اسٹفوفن برگ نے کہا۔ "میری رائے میں ایک بم میرے ایڈجوٹینٹ لیفٹیننٹ ہیفٹن کے پاس بھی ہونا چاہیئے۔ مبادا میرا بم کام نہ دے۔ تب ہم دوسرے بم سے کام لیں گے۔ ہمیں ہر صورت سے آج ہٹلر کا خاتمہ کردینا ہے۔"

"دوبارہ وہ موذی بچ بھی چکا ہے" لیفٹیننٹ ہیفٹن نے کرنل اسٹفوفن برگ کی تائید کی۔

"یہ بم!" جنرل اولبرچ نے کہا "بہترین اتحادی بموں میں سے ایک ہے۔ اور فیوز کے ٹھیک دس منٹ بعد چار پانچ گز کے اندر ہر چیز کو ستیاناس کر دے گا۔ ہٹلر بچ نہیں سکتا۔ ویسے مجھے اعتراض نہیں کہ دوسرا بم بھی احتیاطاً ساتھ جائے۔ اس لئے کہ ۲۰ جولائی ہٹلر کی موت کا یقینی دن ہونا چاہیئے۔ ہمارا عزم یہی ہے۔"

کرنل اسٹفوفن برگ کے نوجوان ایڈجوٹینٹ لیفٹیننٹ ہیفٹن کو بھی ایک بم مہیا کر دیا گیا۔ اور اس طرح پلاسٹک بم سے ان چار سازشیوں کی ہی امیدیں نہیں وابستہ ہو گئیں بلکہ ساری جرمن قوم کی قسمت منسلک ہو گئی۔

بم کا انتخاب اس لئے ہوا تھا کہ ہٹلر کی موت یقینی طور پر ہو جائے۔ ریوالور سے نشانہ چوک جانے کا بھی خطرہ تھا۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ گولی ہٹلر کا کام تمام نہ کرسکے۔ لہٰذا بھیانک قسم کے شدت سے پھٹ جانے والے بم کو ترجیح دی گئی۔ اس شدت کی وجہ یہ بھی تھی کہ

گیارہ جولائی کو ہٹلر اس لئے بچ گیا کیونکہ گوئرنگ اور ہملر ہٹلر کے ساتھ نہ تھے اور پندرہ جولائی کو اس لئے بچ گیا کہ عین وقت پر ہٹلر نے میٹنگ ملتوی کر دی تھی۔ لہٰذا ساری امیدیں ۲۰ جولائی پر مرکوز تھیں۔

خفیہ میٹنگ ختم ہوئی اور کرنل اسٹفوفن برگ کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ جونہی کرنل اسٹفوفن برگ جنرل فروم کے کمرے کے سامنے پہنچا کہ جنرل فروم کے کمرے کا دروازہ کھلا اور افواج داخلہ کے چیف کمانڈر جنرل فروم نے باہر نکلتے ہوئے کرنل اسٹفوفن برگ سے کہا۔

"ٹھہرو — وہ رپورٹ جسے تم فیوہرر کو پیش کرنے والے ہو دکھاؤ تاکہ ایک نظر اور ڈال لوں!"

جنرل فروم کے اچانک راستہ روک لینے سے لیفٹیننٹ ہیفٹن کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ جنرل فروم پورے طور پر سازش میں شریک نہیں تھا بلکہ اس نے اپنی حمایت کا مشروط وعدہ کیا تھا۔ ہٹلر اگر قتل ہو گیا تب وہ تعاون کرے گا ورنہ نہیں۔ کرنل اسٹفوفن برگ بھی ٹھٹکا، لیکن اس نے بیگ کھولا جس میں کپڑے میں لپٹا ہوا پلاسٹک بم رکھا تھا۔ رپورٹ نکالی اور جنرل فروم کو دیدی۔ رپورٹ دیکھتا ہوا جنرل فروم اپنے کمرے میں چلا گیا — وہ دونوں بھی پیچھے ہو لئے۔ جنرل فروم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کرنل ہوشیار رہنا تم بڑی رپورٹ لئے جارہے ہو"

"فکر نہ کریں آپ" کرنل اسٹفوفن نے کہا۔ "مشکل کام سے نمٹنا مجھے آتا ہے۔"

اور کرنل اسٹفوفن کمرے سے نکل کر تیزی سے پورٹیکو میں پہنچا جہاں بند موٹر اسے ہوائی اڈے لے جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

کرنل نے کہا

میری رائے میں ایک بم لیفٹیننٹ ہیفٹن کے پاس بھی ہونا چاہیئے — مبادا میرا بم کام نہ دے۔ تب ہم دوسرے بم سے کام لیں گے۔ ہمیں ہر صورت میں آج ہٹلر کا خاتمہ کردینا ہے۔

ہوائی اڈے پہنچنے کے چند منٹ بعد ایک طیارہ کرنل اسٹفن برگ اور لیفٹیننٹ ہیفٹن کو لے کر مشرقی ہیڈکوارٹر کی جانب جو راسٹن برگ کے جنگلات میں تھا اڑ گیا۔ ہیفٹن تو اونگھنے لگا لیکن کرنل اسٹفن برگ جاگ رہا تھا اور سازش قتل کا جائزہ لے رہا تھا جس میں قریب قریب چیف اسٹاف کے تمام لوگ شامل تھے اور ہٹلر کو اب تک علم نہ تھا۔ لیکن جون ۱۹۴۳ء سے اب تک پانچ بار ہٹلر کو قتل کرنے کا اقدام ہو چکا تھا۔ لیکن وہ ہر بار بچتا رہا تھا۔ لیکن کرنل کو یقین تھا کہ آج کے اقدام میں ہٹلر کا بچنا محال ہے۔ کرنل اسٹفن برگ کو خیال آ رہا تھا کہ ہٹلر کے قتل ہوتے ہی جنگ کی کمان ہٹلر کے ہاتھ سے نکل کر باغی جرنلوں کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ فوراً ہی نئی فوجی حکومت کی تشکیل ہو جائے گی اور سارے یورپ میں نازیوں اور ایس ایس لوگوں کی گرفتاری و نظر بندی ہو جائے گی۔ اور نئی حکومت اتحادیوں سے صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کر دے گی۔ اس طرح جرمنی ہٹلر کی مجنونانہ جنگ سے نجات حاصل کر لے گا۔ لیکن ان ساری امیدوں کا مرکز وہ پلاسٹک بم تھا جسے کرنل اسٹفن برگ لئے جا رہا تھا۔ اگر وہ کامیاب انداز سے پھٹتا تب نئے جرمنی کا جنم ہوگا ورنہ ؟

صبح دس بجے طیارہ راسٹن برگ کے ہوائی اڈے پہنچ گیا۔ ہیفٹن نے ہوا باز کو ایک لمحے کے نوٹس پر بعد دوپہر برلن پرواز کرنے کا حکم دیا اور پھر کرنل کے ساتھ اسٹاف کار میں بیٹھ گیا جو تیزی سے ہٹلر کے مستقر کی طرف روانہ ہو گئی۔

ہٹلر کا مشرقی مستقر تین مربع میل کے گھیرے میں تھا۔ اور چاروں طرف سے گھنے جنگلات سے چھپا تھا۔ ہٹلر کی رہائش گاہ تک کل ایک سڑک جاتی تھی جہاں تین چیکنگ چوکیاں تھیں۔ اور سارا راستہ بجلی کے کرنٹ والے خاردار تاروں، خطرناک سرنگوں اور طیارہ شکن توپوں وغیرہ سے محفوظ تھا۔ پہلی پوسٹ پر ایس ایس گارڈ نے چیکنگ کی اور دوسری چوکی کو فون کیا جو دو میل پر تھی۔ آخر تینوں چوکیاں گزر گئیں۔ آخری چوکی پر پہنچ کر کرنل اسٹفن برگ سارے جرمنی کے چیف سگنل کمانڈر جرنل فیلجیبس کے کمرے میں ملنے چلا گیا جو اندرونی طور پر سازش میں شریک تھا اور جسے اہم کردار ادا کرنا تھا۔ جرنل فیلجیبس نے قدرے گھبرا کر کرنل سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے؟"

کرنل نے بڑے اطمینان سے کہا: "سب ٹھیک ہے۔ ہم پہنچتے ہی جرنل اولبرچ آپ کے پیغام کے منتظر رہیں گے۔ اس کے بعد ہی رسل و رسائل منقطع ہو جانا چاہیئے۔"

"ہٹلر کے مرتے ہی سب کام بہ عجلت اور حسب اسکیم ہوگا۔"

اس کے بعد دونوں فیلڈ مارشل کیٹیل کی رہائش گاہ کی طرف ہو لئے جو ہٹلر کی مسلح کمان کا چیف آف اسٹاف تھا اور جو کرنل اسٹفن برگ کو لے کر ہٹلر کے کانفرنس روم لے جانے والا تھا۔

جب کرنل فیلڈ مارشل کے کمرے میں پہنچا تو اس نے نازی فوجی سلام کیا۔ فیلڈ مارشل نے پوچھا۔

"کرنل تمہاری رپورٹ کیا ہے؟"

"نئی محفوظ ڈویژنوں کی تشکیل ممکن نظر نہیں آتی۔"

"بیچارہ فیوہرر" فیلڈ مارشل نے کہا "کیا اسے تنہا جنگ لڑنی پڑے گی؟"

"لیکن یہ ساری مصیبت عارضی ہے جناب۔" کرنل نے ذومعنی انداز سے کہا۔ "جلد ہی مشکلات ختم ہو جائیں گی۔"

فیلڈ مارشل نے کرنل کو گھورا۔ اور پھر کہا۔

"رپورٹ مختصر انداز میں پیش کرنا۔ چونکہ آج رپورٹیں بھی فیوہرر کو سننی ہیں اور آج تین بجے مسولینی کی آمد ہے لہٰذا اختصار مناسب ہوگا۔"

"بہتر ہے جناب" کرنل نے کہا۔

جب اسے گولی ماری جا رہی تھی تب اس نے آخری بار کہا۔

اے مادرِ وطن

میں مر رہا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ

میرا وطن

زندہ رہے گا!

علیم صبا نویدی

ادب میں انسان دوستی

شفقت و محبت، مروت و حمیت، تلطف و مدارات اور مساوات و مواخات، حیات انسانی کی وہ اقدار عالیہ ہیں جن سے اخلاقی کردار کی تعمیر و تربیت وابستہ ہے اور انہیں میں سے ایک قدر انسان دوستی بھی ہے۔ انبیاء و رسل مصلحین اخلاق، صوفیا و مفکرین اور سادھو سنتوں نے ہر دور میں انسان دوستی کے تصور کی تبلیغ و اشاعت کی۔ اسی سرچشمہ سے رواداری، حق و صداقت اور عدل و انصاف کے دھارے پھوٹے ہیں۔ مذاہب اور اسی قسم کی تحریکات سے قطع نظر فنون لطیفہ میں بھی اس بنیادی تصور کا اظہار ہوا، کبھی رقص و موسیقی کے ذریعہ ہم نے اس کی ترجمانی کی۔ کبھی اصنام کی لطافت و نزاہت نے، کبھی تعمیرات کے سنگ و خشت نے، کبھی شعر و سخن کے بت کدوں نے اور کبھی انبیاء و رسل کے الہامات نے۔

شعر و ادب کو اگرچہ تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا لیکن اگر ان کی لطافت اور بنیادی شرائط کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو ان سے وہ کام تو لیا ہی جا سکتا ہے جو ہمارے مذہبی پیشوا کرتے آئے ہیں۔ شاعر و صوفی دونوں ہی تھوڑے فرق کے ساتھ عینیت پسند ہوتے ہیں۔ دونوں ہی ایک ایسی دنیا تعمیر کرتے ہیں جو مسرتوں کا گہوارہ ہو۔ اور دونوں ہی معاشرے میں کچھ بنیادی اصلاحات چاہتے ہیں۔ اور یہ خواب اسی وقت شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے جب انسان دوستی کا جذبہ لاشعور کے نگارخانے سے نکل کر عملی حیثیت اختیار کر لے۔

ادب و اخلاقیات اور ادب و معاشرہ کے باہمی رشتہ پر بہت کچھ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں نے مختلف نقطہ ہائے نظر سے اس کی تحلیل کی ہے لیکن مسئلہ ہنوز کسی فیصلہ کن مرحلہ پر نہیں پہنچ سکا۔ اس چیستاں میں الجھے بغیر یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ ادب پیغام بھی ہے اور پیغامبر بھی۔ ادب قصد بھی ہے اور قاصد بھی اور ادب خطاب بھی ہے اور مخاطب بھی۔ اس اعتبار سے ادب ان تمام اخلاقی قدروں پر محیط ہے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ البرٹ مالز نے نیویارک سے شائع ہونے والے ایک جریدے میں "ادیب — انسان کے ضمیر کی حیثیت سے" کے عنوان کے تحت گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا:

" ادب کی تاریخ پر زیادہ تر ایسے ادیبوں کا غلبہ ہے جو اپنی زندگی اور تحریروں میں عوام سے اپنی شفقت و محبت کی وجہ سے ممتاز ہیں نہ کہ اپنے طعن و تشنیع کی وجہ

> اگر ایک ادیب اپنے ساتھیوں کی زندگی کو مواد کی حیثیت سے استعمال نہ کرے تو پھر کس چیز کو موضوع بنائے؟ اگر اس کا دل اثر پذیر ہے اور اس کی نگاہیں حقیقت نگر ہیں تو وہ ایک نامکمل دنیا کی تصویر کشی سے کیسے باز رہ سکتا ہے۔ یا یہ کہ اپنے دل کے دروازوں کو ایک بہتر دنیا کی تمنا کے لئے کیسے مقفل کر سکتا ہے۔
> (رابرٹ مالز)

سے" وہ اس لئے بھی ممتاز ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کی ان معاشرتی
تحریکات کے حامی رہے ہیں۔ جو ترقی پسند اور اکثر بنیادی تھیں
یہ تمام ادب کی مکمل تاریخ نہیں بلکہ دستاویزی حیثیت
سے یہ ان کا غالب رجحان ہے۔ اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا
سکتا تھا؟ ادیب چونکہ انسانی فطرت رکھتے ہیں۔ اس لئے
دوسرے انسانوں کے مصائب سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر
ایک ادیب اپنے زمانہ کے لوگوں کی زندگی کو مواد کی حیثیت سے
نہ استعمال کرے تو پھر کس چیز کو موضوع بنائے؟ اگر اس کا دل
اثر پذیر ہے اس کا دماغ دقیقہ سنج ہے اور اس کی نگاہیں
حقیقت نگر ہیں تو وہ ایک نامکمل دنیا کی تصویر کشی سے
کیسے باز رہ سکتا ہے۔ یا یہ کہ اپنے دل کے دروازوں کو
ایک بہتر دنیا کی تمنا کے لئے کیسے مقفل کر سکتا ہے؟"

آغاز جنگ آزادی فرانس میں ہو چکا تھا۔ والٹیر اور روسو کی انقلاب
انگیز تحریروں نے وقت کے دھاروں کو موڑ دیا تھا۔ فرانس انقلاب
سے دو چار ہو چکا تھا۔ اور بندگی و خواجگی کے درمیان کشمکش شروع
ہو چکی تھی۔ اور پہلی بار یورپ کی تاریخ میں فرد کی مرکزیت اور اہمیت
کا احساس بیدار ہوا۔ اس تحریک کے پس منظر میں روتی بلکتی سسکتی
ہوئی انسانیت کے آنسوؤں کا وہ سیل رواں تھا جو بالآخر ملوکیت
و استعماریت کے قصر و ایوان کو بہالے گیا۔

> اقبال کے انسانی عظمت و برتری کے تصور کے پس منظر میں وہی
> انسان دوستی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جو افلاطونی تصور انسانیت
> کے خلاف ایک شدید احتجاج کے طور پر نمودار ہوا۔

ممکن ہے کہ ہم اس بیان کی صداقت سے پورے طور پر اتفاق
نہ کریں لیکن ہم جزوی طور پر متفق ہو سکتے ہیں۔ ادیب یا شاعر اتنا
نقش پذیر دل رکھتے ہوئے اپنے احساسات کی شدت کے ساتھ
کس طرح انسانوں کے مصائب و آلام سے صرف نظر کر سکتا ہے؟
انگریزی ادب کی تاریخ کا وہ دور جس کو رومانی احیا کا دور کہا جاتا
ہے۔ انسان دوستی کے جذبہ سے معمور نظر آتا ہے۔ ورڈزورتھ کی پوری
شاعری کی عمارت اسی انسان دوستی کی اساس پر قائم ہے۔ شیلی
کے شاعرانہ افکار کا سرچشمہ بھی انسان دوستی ہے۔ وہ تخت و تاج
اور طبقات سے بے نیاز ایک معاشرہ چاہتا ہے جس پر محبت اور
صرف محبت کی حکمرانی ہو۔ تعجب نہیں کہ انگلستان میں اس تحریک
کی عنان ولیم گاڈون جیسے مفکروں کے ہاتھوں میں آئی۔ اس کا

اردو ادب

اردو شعر و ادب نے دو سو سال کی مختصر سی مدت میں ان اخلاقی
اثرات کو قبول کیا جن میں سے کچھ تو خالص ہندوستانی تھے اور کچھ خارجی
اول الذکر سے میری مراد ہے مانند کبیر، نانک اور بھگتی۔ اور مسلمان
صوفیوں کی ان تحریکوں سے ہے جنہوں نے ہندوستانی تمدن پر اپنے
گہرے نقش چھوڑے ہیں۔ آخر الذکر سے میرا اشارہ فارسی اور عربی
ادبیات کی جانب ہے۔ فارسی ادب میں سعدی کی گلستاں اور بوستاں
کی اخلاقی اہمیت سے کون ناواقف ہے۔ یہ کتابیں اگر ایک طرف
صحیفۂ اخلاق ہیں تو دوسری طرف ادب کا بہترین شاہکار ہیں۔
گلستاں کی حکایات اور بوستاں کی منظومات کا مقصد تفریح طبع
نہ تھا بلکہ ان کی غرض و غایت انسانوں کی تربیت و اصلاح تھی۔
حافظ جیسا بظاہر رند مزاج اور عشق پیشہ شاعر حسن و عشق کے صنم کدے
کی نقاب کشائی کرتے کرتے انسان دوستی اور انسانی ہمدردی کا سبق دے جاتا ہے

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است
با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا

یہ اور اس قسم کے اثرات برج بھاشا، اودھی اور کھڑی بولی سے منتقل ہو کر اردو شعر و ادب میں گھل مل گئے۔ رحیم، رسکھان اور جائسی کی شاعری کا زیادہ حصہ انہیں پند و موعظت پر مشتمل ہے۔ اردو بھی انہیں اخلاقی قدروں کی ترجمان بن گئی عشق و محبت سے گریز اردو ادب کے لئے ممکن نہ تھا۔ اسی طرح اردو کے شاعر اور ادیب اخلاقی قدروں سے بھی چشم پوشی نہ کر سکے۔ وہ اس بات کا پورا شعور رکھتے تھے کہ شعر و ادب کا موضوع و مخاطب انسانیت اور انسان ہے۔ یہ بات اور ہے کہ سر سید ـــــ کی تحریک کے آغاز تک ہمیں اس قسم کا سرمایۂ ادب وافر مقدار میں نہیں ملتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میر و سودا اور ذوق و غالب کے دور میں اگرچہ اردو شعر و ادب کی گونج قلعۂ معلّٰی تک محدود نہ تھی بلکہ ہر گھر غزل سرائیوں کا مرکز تھا۔ لیکن ملک کچھ ایسے سیاسی بحران اور انتشار کی زد میں رہا کہ ہمارے شاعروں کو ان مسائل کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ پھر بھی ہمیں مرزا مظہر جانجاناں خواجہ میر درد اور مولانا نیاز بریلوی جیسے با خدا اور انسان دوست لوگ مل جاتے ہیں جن کی شاعری کا محور انسان دوستی ہے۔

سر سید کی تحریک اصلاح نے اردو شعر و ادب میں ایک انقلاب برپا کر کے اس کے مزاج کو یکسر بدل دیا۔ اور وہ ادب جو زندگی سے فرار کے مصداق تھا اب زندگی اور زندگی کے مسائل سے دلچسپی لینے لگا۔ مولانا محمد حسین آزاد۔ ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، وحید الدین سلیم، مولانا حالی، اور مولانا شبلی اسی تحریک کے پیرو رہ چکے تھے۔ خاص طور سے حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر شاعری اور ادب کے اعلیٰ مقصد کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ بے شک اردو شاعری کا سرمایہ بہت تھا اور میر و غالب کی عظمت مسلّم تھی لیکن مجموعی طور پر اردو شاعری یا دوسرے لفظوں میں اردو غزل میں داخلیت کا عنصر پورے طور پر غالب تھا۔ حالی نے تنگ نائے غزل کو وسعت بخشی اس کو نئے نئے موضوعات دیے۔ اخلاقی قدروں کا بوجھ اٹھانے کے قابل اسے بنایا۔ غزل کے علاوہ انہوں نے نظم کے کاکل و گیسو کو سنوار کر ایک نئے روپ میں نئی سج دھج کے ساتھ اسے پیش کیا۔ یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ حالی نہ ہوتے تو شاید اقبال نہ ہوتے۔ دھیرے دھیرے اردو شاعری کا دامن اتنا وسیع ہو گیا اور اشعار

اس نے پرانے بندھن اس طرح توڑے کہ اقبال نے شاعر کو "دیدۂ بینائے قوم" کہہ کر یہ پیغام دیا ؎

زمن با شاعر رنگیں بیاں گوئے
چہ سود از سوز اگر چوں لالہ سوزی
نہ خود را می گدازی نہ آتش خویش
نہ شامِ دردمندے بر فروزی

یہی نہیں بلکہ فرد و جماعت کے باہمی رشتہ کا تعین کیا۔ فرد کی اہمیت کو جتایا اور انسان اور انسانی زندگی کی عظمت و برتری کے اسرار کو بے نقاب کیا۔ اور وہ نادان انسان جسے گفتگو کرنے کا بھی سلیقہ نہ آتا تھا یزداں سے آنکھیں ملا کر کام کرنے کے لائق ہو گیا اور اپنی عظمت کے راگ یوں گانے لگا۔ ؎

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس سے بڑھ کر انسان کے لئے اور کون سی عظمت تھی جس پر وہ متمکن ہو سکتا تھا؟ اقبال کے انسانی عظمت و برتری کے اس تصور کے پس منظر میں وہی انسان دوستی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جو افلاطونی تصور انسانیت کے خلاف ایک شدید احتجاج کے طور پر رونما ہوا۔ اب قطرہ سمندر میں مل کر فنا نہیں ہوتا بلکہ اگر وہ ایک طرف سمندر کی طاقت میں اضافہ کرتا ہے تو دوسری طرف اپنی خودی کو بھی مستحکم و استوار کر لیتا ہے۔ اب اپنی ہستی "حباب کی سی" نہیں ہے۔ اب زندگی ایک جوئے رواں ہے جس کا منبع ازل کی گہرائیاں ہیں اور جو ابد کی پہنائیوں تک رواں رہے گی۔ اب مردم بیزاری کی جگہ انسان دوستی نے لے لی۔ اور اس کا منطقی نتیجہ اقبال کے تصور حیات و کائنات میں ظاہر ہوا جس نے اردو شعر و ادب کے پورے ڈھانچے کو بدل دیا۔

اقبال دراصل ایک تحریک تھے۔ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک نے

(باقی صفحہ ۹۵ پر)

حزیں لدھیانوی

اِنساں عظیم ہے

سرچشمۂ بہار ہے، انساں عظیم ہے　　خلّاقِ مرغزار ہے، انساں عظیم ہے
سوزِ دلِ چنار ہے، انساں عظیم ہے

روشن اسی کے سوز سے ہے شعلۂ حیات　　دلکش اِسی کے درد سے ہے نغمۂ حیات
نغموں کا آبشار ہے، انساں عظیم ہے

جور و ستم کی لاکھ چٹانیں ہوں راہ میں　　رکتا نہیں ہے منزلِ مقصد کی چاہ میں
بجلی کا اضطرار ہے انساں عظیم ہے

ہوتا ہے جب بھی چہرۂ تاریخ خوں میں تر　　لگتی ہیں جب بھی مہریں بشر کی زبان پر
آوازِ روزگار ہے انساں عظیم ہے

اپنے لہو کی لہر بہاتا ہے دشت دشت　　سو سو طرح کے پھول کھلاتا ہے دشت دشت
خود خار در کنار ہے، انساں عظیم ہے

شمیم طارق

تخلیق

سوچ کی راہوں میں گم ہیں کارواں الفاظ کے

بے صدا ہے قریۂ انفاس میں نغموں کی لے
بے زباں پھر مرے افسانوں کا ہر کردار ہے
ایک مدّت سے یونہی فکر و نظر کے درمیاں
دور تک خاموشیوں کا پردۂ دیوار ہے

آئینے کچھ اس طرح احساس کے دھندلا گئے
کوئی صورت اب نظر آتی نہیں اظہار کی
گردشِ افکار میں گم ہے گزرگاہِ خیال
روشنی سنولا گئی ہے دیدۂ بیدار کی

ذہن یخ بستہ پگھل جائے تو اپنے درد کی
پھر کوئی تحریر ابھرے سینۂ قرطاس سے
پھر کوئی تحریر کا پہلو نکل آئے — مگر
سوچ کی راہوں میں گم ہیں کارواں الفاظ کے

محمود خاور

بازگشت

آج کی رات ہے بہت بوجھل
آج کی رات ہوں بہت تنہا
فکر و احساس کے دریچوں سے
جھانکتا ہے مہیب سناٹا
اونگھتے چاند کی نگاہوں میں
ہجر کی بے کراں اداسی ہے
درد۔ آہٹ۔ فریب کچھ بھی نہیں
جسم پیاسے ہیں روح پیاسی ہے
بجھ گئے ہیں الاؤ یادوں کے
بام و در پر سکوت ہے طاری
سانس روکے ہوئے ہے ویرانی
زہر آلود ہے فضا ساری
کھٹکھٹایا ہر ایک دروازہ
ہر جگہ مجھ کو یہ جواب ملا
مدتوں سے تلاش ہے جس کی
جاؤ۔ اب وہ یہاں نہیں رہتا
پھر اندھیروں میں لوٹ آیا ہوں
روشنی جیسے کھو گئی ہے کہیں
وقت چپ ہے۔ حیات افسردہ
اب کسی کا بھی انتظار نہیں
آج کی رات ہے بہت بوجھل
آج کی رات ہوں بہت تنہا

تابش دہلوی

○

ہم کو معلوم یہ رازِ میخانہ ہے چشمِ ساقی ہی کا نام پیمانہ ہے

عشرتِ فصلِ گل دل سے پوچھیں مگر دل کا کیا پوچھنا دل تو دیوانہ ہے

جتنے سیراب ہیں اتنے تشنہ بھی ہیں زندگی اپنی مانندِ پیمانہ ہے

مٹ گیا فرقِ حسن و محبت مگر کتنی شمعوں کا نام اب بھی پروانہ ہے

میری بادہ گساری سلامت رہے در دیک جام ایک ایک میخانہ ہے

حالِ دل کہہ کے سب کچھ بیاں کر دیا خود یہ افسانہ عنوانِ افسانہ ہے

کتنے موسم بدلتے رہے ہیں مگر دل کہ دیوانہ تھا اب بھی دیوانہ ہے

فصلِ گل جب بھی آئی وہ دیوانہ تھا
کتنا تابش بھی ہشیار و فرزانہ ہے

عبدالرؤف عروج

○

امینِ چمنستان و گلزار ہیں ہم
اِسی اک خطا پر سر دار ہیں ہم
جہاں دام بردوش جہلِ ہوس ہو
محبت گنہ ہے، گنہگار ہیں ہم
ہمارا اجالا مکاں سے زماں تک
مہ و مہرِ ثابت ہیں سیار ہیں ہم
کہیں رشک دستی کہیں عذر و شکوہ
غرض یہ کہ غالب کے اشعار ہیں ہم
بد و نیک کو تاڑ لیتی ہیں آنکھیں
بہ ایں خواب و مستی بھی ہشیار ہیں ہم
مبادا کہ لوٹے طلسمِ شبستاں
بڑا خوف ہے اس کو بیدار ہیں ہم
ہمیں کوئی رہ سے ہٹائے تو جانیں
مسافر ہیں، پتھر نہ دیوار ہیں ہم
یہ مجبوریاں حاصلِ زندگی ہیں
نہ آزاد تم ہو نہ مختار ہیں ہم
کہاں کے اُجالے کہاں کے اندھیرے
کسی زلف و رُخ کے پرستار ہیں ہم
عروج ایک ہے فیض غالب کا یہ بھی
کہ ایسی زمیں پر گہربار ہیں ہم

عادل منصوری

○

وہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہے، سنو
خدا کے لئے کوئی تو روک لو

کھلے سر، پریشان، سڑکوں پہ وہ
کسے ڈھونڈتا ہے؟ ذرا پوچھ لو

کہیں کھو نہ جائے وہ اِس بھیڑ میں
لپک کر ذرا اُس کو آواز دو

یہ شعلے اگلتی ہوئی دوپہر
جلا دے گی اس کے ہر اک خواب کو

وہ لمحوں کی چلتی ہوئی برچھیاں
اسی سمت بڑھتا ہے وہ شخص تو

عنوان چشتی

○

یہ الگ بات کہ یہ راز کتابوں میں نہیں
تجربوں میں جو بشارت ہے وہ خوابوں میں نہیں

کیوں نہ پھر بیٹھ کے ہم لان میں باتیں کرلیں
میں حجابوں میں نہیں تو بھی نقابوں میں نہیں

حرف گیری سے ہو کیا لغزشِ پا کو نسبت
زندگی میں جو ہے رس جس وہ کتابوں میں نہیں

جس سے ہر سانس پہ تحریکِ وفا ملتی تھی
اب وہی بات محبت کے نصابوں میں نہیں

آپ اگر چاہیں تو میں آپ کو دل میں رکھ لوں
واقعی اب کوئی لڑکی مرے خوابوں میں نہیں

بدر جعفری جے پوری

○

اب آپ ستم جو کم کریں گے
یہ بھی تو نہ کم ستم کریں گے
ادراک کا سر قلم کریں گے
کیفیتِ دل رقم کریں گے
مہلت جو کبھی دی زندگی نے
تو قصد سوئے عدم کریں گے
دیوانوں کے سر قلم ہی کردو
سرکش ہیں نہ سر یہ خم کریں گے
ہو کر ہی رہیں گے ہم کسی کے
"تم سے نہ ہوا وہ ہم کریں گے"
کس کس کی کھنچیں گی اب زبانیں
کس کس کا وہ سر قلم کریں گے
ہم ڈالیں گے دل میں دل تمہارے
کچھ سنگ پہ مرتسم کریں گے
اک آپ سے کام آپڑا ہے
کردیں تو بڑا کرم کریں گے
جس دن بتوں نے نہ بات پوچھی
رخ بدر سوئے حرم کریں گے

بڑی لڑکی

رضی عزیزی

دفتر کا ہر فرد

للّی سے کھچا کھچا رہنے لگا۔ دفتر کا بوڑھا چپراسی اب چچا کے خطاب پر بُرا سا منہ بناتا۔ اِحسان نے کئی دِن کی رخصت لے لی تھی۔

اور پھر ایک دن بڑے بابو نے مجھ سے دبے لفظوں میں کہا۔

"جناب! مس للّی اچھی لڑکی نہیں ہے۔"

میرے اِصرار پر اُنہوں نے بتایا کہ۔

"للّی: نسوانیت کی اعلیٰ سطح سے گر چکی ہے۔"

للی کئی دن سے غیر حاضر تھی۔ اس کی دو سالہ ملازمت میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ بغیر کسی درخواست یا معقول عذر کے وہ یوں لاپرواہ ثابت ہوئی تھی۔ مجھے اپنی اس ٹائپسٹ کے کام پر بڑا ناز تھا۔ کیونکہ وہ ہر لحاظ سے اہل ثابت ہوئی تھی۔

انٹرویو میں یوں تو لڑکیوں کی بھرمار تھی مگر للی کی خوبصورت شخصیت اور اس کے رکھ رکھاؤ نے مجھے بڑا متاثر کیا تھا۔ اور خصوصیت سے اس کے لبوں پر جو اداس اداس سی مسکراہٹ تھی اس میں بڑی کشش تھی۔

چارج لینے کے بعد وہ بڑی ممنونیت سے میرا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ اور اس کے بعد سے وہ فاصلہ جو ایک افسر اور ماتحت کے درمیان ہوتا ہے اسی نے کبھی کم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہمیشہ بڑی مختصر بات کرتی۔ اور بلا ضرورت ایک لمحہ بھی میرے کمرے میں نہ آتی۔ شروع شروع تو دفتر کے عملہ میں اس کے متعلق دبی دبی سرگوشیاں ہوئیں اور اس کی طبیعت کو غرور کا نام دیا گیا۔ مگر پھر وہ رفتہ رفتہ اپنے سب ساتھیوں میں گھل مل گئی۔ اس کے انداز میں مادرانہ شفقت گھلی ہوتی۔ اسی لئے عملہ کے کسی رکن کو اس سے کبھی مذاق کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

لباس اور بناؤ سنگھار کے معاملہ میں للّی کافی بدذوق واقع ہوتی تھی۔ پُرانے دقیانوسی فیشن کا لباس اور سادے بال۔ مگر وہ صاف ستھری ہمیشہ رہتی۔ اس کے چہرے پہ اداسی تو کچھ یوں مسلط سی گئی تھی جو اس کے خدوخال کا جز معلوم ہوتی۔ میں نے کبھی اسے زور سے بولتے ہنستے یا قہقہہ لگاتے نہ دیکھا تھا۔ اس کی یہ اداسی میرے لئے سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ اور خواہ مخواہ دل میں ایک خلش سی رہنے لگی تھی۔ آخر وہ کونسا غم ہے جس نے اسے زندگی کی تمام تر رعنائیوں سے محروم کر دیا ہے۔ کئی بار سوچا کہ للی کے متعلق معلوم کروں۔ مگر جب بھی کوئی ایسا موقع آتا تو میں نروس ہو جاتا۔ کیونکہ اس کی خاموشی اور مختصر سی بات چیت جس میں حد درجہ ادب شامل ہوتا مجھے افسریت کے اس مقام پہ پہنچا تی جہاں سے میں کوئی اس سے ذاتی سوال نہ کر سکتا تھا۔ پھر یہ خیال بھی آتا کہ دفتر میں کوئی اسکینڈل ہی نہ ہو جائے۔

وہ کہاں رہتی تھی۔ اس کے ماں باپ کیا کرتے تھے۔ یہ ایک سربستہ راز تھا۔ اتنا گھل مل جانے کے باوجود اس نے اپنے متعلق کسی کو بھی کچھ نہ بتایا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ پُراسرار ہوتی گئی۔۔ دفتر کے ہر فرد کے ساتھ اس کی مناسبت سے مراسم تھے۔ بوڑھے چپراسی کو وہ ہمیشہ چاچا کہا کرتی۔ نئے نئے نوعمر کلرک احسان کو جب اس نے بھیّا کہہ کر خطاب کیا تھا تو اس نے بڑی شدت سے بُرا مانا تھا۔ اور جھنجھلا کر کہا تھا۔

"میرا نام احسان ہے۔ مس للی"

وہ ایک دم بجھ سی گئی تھی۔ میں نے اس کے تاثرات کا جائزہ لیا تھا۔ یوں لگا تھا جیسے اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہو۔ میں اسی وقت اپنے کمرے سے باہر نکلا تھا اس دن للی نے ٹائپ میں سب سے زیادہ غلطیاں کی تھیں اور وہ مجوبے سی رہی تھی مگر مجھے وجہ معلوم تھی۔ انسان کا دل بڑا نازک ہوتا ہے۔ اس کو ٹھیس لگ جائے تو انسان کا دل کسی بات میں نہیں لگتا۔

وہ کئی دن بجھی بجھی سی رہی۔ اداسی کی تہیں اور دبیز ہوتی گئیں۔ اور یہ بات سب ہی نے محسوس کی۔ انہیں دفتر کے ماحول میں خلا سا معلوم ہوا۔ اور پھر شاید سب نے احسان کو سمجھایا ہوگا جبھی تو ایک دن اچانک احسان نے اسے باجی کہہ کر پکارا تھا۔ اور وہ یوں چونک اٹھی تھی اور اس کے چہرے پر مسرت کی ایسی پھوار پڑنے لگی تھی جیسے کائنات کی خدائی مل گئی ہو۔ اس دن کے بعد سے وہ پھر نارمل ہو گئی تھی اور احسان اور للی باجی اور بھیا ہو گئے تھے۔

پھر کچھ عرصہ بعد نہ جانے کیا ہوا کہ دفتر کا ہر فرد اس سے کھچا کھچا رہنے لگا۔ دفتر کا بوڑھا چپراسی اب چچا کے خطاب پر بُرا سا منہ بناتا جیسے اسے تکلیف پہنچی ہو۔ احسان نے کئی دن کی رخصت لے لی تھی۔ اور یوں لگتا جیسے للی سے ہر شخص روٹھ گیا ہو۔ میرے لئے یہ دوسری خلش پیدا ہو گئی تھی۔ آخر یہ اس لڑکی نے دفتر کے ماحول کو اس درجہ پُراسرار کیوں بنا دیا ہے۔

یہ عقدہ آخر حل ہو کر رہا۔ ایک دن بڑے بابو نے دبے دبے لفظوں میں کہا۔

"جناب مس للی اچھی لڑکی نہیں ہے۔"

مجھے اس بات پر حیرت ہوئی اور افسوس بھی کہ اتنی مخلص سادہ مزاج سیدھی سادی لڑکی کے متعلق یہ بات کہی گئی۔ بڑے بابو مزید کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ مگر میرے اصرار پر رک رک کر انہوں نے بتایا کہ للی نسوانیت کی اعلیٰ سطح سے گر چکی ہے۔ یہ اطلاع میرے لئے تکلیف دہ تھی۔ پھر بھی میں نے اپنے تاثرات پر قابو پاکر بڑے بابو کو تنبیہ کی کہ آئندہ اس قسم کی غیر متعلق باتیں مجھ سے نہ کی جائیں۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ ہر شخص کو للی کی آوارگی کا یقین تھا اور ماضی کی وابستگی پر سب نالاں تھے۔

للی کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ البتہ اب اس کے سادگی سے بنے ہوئے بال اس امر کی غمازی کرتے تھے جیسے اب انہوں نے نئی زیبائش و آرائش کو اپنا لیا ہے۔ اس کا چہرہ نکھرا نکھرا سا لگتا۔ مگر ازلی اداکاری نے ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ ہاں آنکھیں ضرور بھاری بھاری خواب آلود سی لگنے لگی تھیں جنہوں نے اس کے حسن میں اضافہ کر دیا تھا۔

مجھے للی کے انداز سے آوارگی کی کوئی جھلک نظر نہ آتی تھی۔ وہ اسی طرح سنجیدہ اور باوقار تھی۔ اور شاید میں زندگی بھر اس بہتان پر یقین نہ کرتا۔ اگر جلیل مجھ سے ملنے دفتر نہ آیا ہوتا۔

اسے لاہور سے آئے ہوئے کوئی ایک ہفتہ ہوا تھا اور اس دن وہ جب میرے کمرے میں داخل ہوا تو بے اختیار کہہ اٹھا۔

"یہ ٹھاٹ ہیں استاد۔ ہمیں معلوم ہوتا تو کیوں دو سو روپے ضائع کرتے۔"

میں اس کے جملے کو بالکل نہ سمجھ سکا تھا اور جب جلیل نے تفصیلات بتائیں تو پھر مجھے للی کے متعلق مزید تصدیق کی ضرورت نہ رہی تھی۔ پہلی بار میرے دل میں اس لڑکی کے لئے نفرت کے جذبے نے سر ابھارا۔ اب جب بھی وہ میرے کمرے میں آتی تو میرا موڈ ایک دم خراب ہو جاتا۔ اف۔ انسان کے ظاہر اور باطن میں کتنا تضاد ہوتا ہے۔

احسان رخصت سے واپس آچکا تھا۔ مگر افسردگی اس جذباتی لڑکے کا بھی مقدر بن چکی تھی۔ اب للی بھی اس سے آنکھیں چراتی تھی۔ پورے دفتر کا ماحول عجیب گھٹا گھٹا سا ہو گیا تھا۔ کئی بار میں نے سوچا کہ کسی بہانے للی کو ملازمت سے الگ کر دوں۔ مگر نہ جانے کیوں اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

اور آج ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ للی کی کوئی خبر نہ تھی۔ باوجود کہ ہر ایک غیر متعلق تھا مگر پھر بھی اس کی خالی کرسی کو سب ہی چور نظروں سے دیکھ لیتے تھے۔ میں نے ہر ایک ہی سے للی کے گھر کا پتہ معلوم کیا مگر سب لاعلم تھے۔

(باقی صفحہ ۱۳۶ پر)

رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ نائٹ کلب کی رونق کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ کلب کی مدھم روشنیوں میں سائے سے لہرا رہے ہیں یکے بعد دیگرے رقاصائیں مختلف رقص پیش کر رہی ہیں۔ بوتلیں کھل رہی ہیں جام کھنک رہے ہیں۔ ہر رقص کے اختتام پر تالیوں کا شور ابھرتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد صرف لوگوں کے دبے دبے قہقہے یا باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ مختلف میزوں پر لوگ بے ترتیبی سے بیٹھے ہیں کچھ لوگ زیادہ پی جانے کی وجہ سے کسی دوسری فضا میں کھوئے ہوئے ہیں۔ کسی کسی پر اس زیادتی کا اثر الٹا پڑا ہے اور وہ بول رہا ہے یونہی فضول۔ کوئی کوئی زیادہ چڑھا کر بیرے سے ہاتھا پائی کے لئے تیار ہو گیا ہے۔ اور اس کے دوست یا اس کے برابر بیٹھے ہوئے لوگ اسے خاموش رہنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ اور زبردستی اسے پکڑ کر بٹھا رہے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی عورتیں بیٹھی ہیں۔ بنی سنوری، مگر اکیلی چپ چاپ۔ جیسے رقص دیکھنے میں اتنی محو ہوں کہ انہیں وقت اور جگہ کا احساس تک نہ رہا ہو۔ وہ کون ہیں اس کلب میں کیوں آئی ہیں۔ وہاں اس طرح بیٹھنے کا کیا مقصد ہے جیسے انہیں کچھ بھی پتہ نہیں۔ اسٹیج کے قریب کی میزیں ابھی تک خالی ہیں ان پر RESERVED لکھا ہوا ہے۔

یہ RESERVED ہیں شاید کچھ بڑے آدمیوں کے لئے جو بارہ بجے کے بعد کلب آتے ہیں۔ ان کی میزیں پہلے سے RESERVED ہو جاتی ہیں۔ مبادا دیر میں آنے کی وجہ سے انہیں اسٹیج کے قریب جگہ نہ ملے۔ اور وہ رقاصہ کی تھرکتی ہوئی پنڈلیوں لچکتے ہوئے بازو اور مٹکتی ہوئی کمر کو قریب سے نہ دیکھ سکیں۔

آدھا گھنٹہ اور گزر چکا ہے جو عورتیں ابھی تک تنہا بیٹھی تھیں اب ان کے پاس کوئی نہ کوئی بیٹھا ہے۔ سامنے بوتلیں کھل رہی ہیں۔ کاک ٹیل کے آرڈر دیئے جا رہے ہیں۔ بیرے بڑی پھرتی سے بوتلیں لاتے ہیں اور کھول کر میز پر رکھ دیتے ہیں۔

RESERVED سیٹیں بھی اب بھر چکی ہیں۔ چند بڑے لوگ وہاں آکر بیٹھ چکے ہیں۔ دور شروع ہو چکا ہے۔ انہوں نے دن بھر میں ہزار دو ہزار یا پانچ ہزار کمائے ہیں تو چار پانچ سو یہاں خرچ کر دینے سے کیا کمی ہو جائے گی۔ اور پھر انسان کماتا کس لئے ہے خوشی کی خاطر۔ فرصت کے لمحات کو رنگین بنانے کی خاطر۔ زندگی کی خاطر۔

میرے برابر والی میز پر دو شخص آکر بیٹھ گئے ہیں۔ مجھے ان کی گفتگو صاف سنائی دے رہی ہے۔

"آپ کیا پئیں گے؟"

"میں صرف بیئر پیوں گا۔"

● جی وہ عجیب لڑکی ہے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ وہ کوئی پیشہ ور رقاصہ نہیں ہے بلکہ ایک اسکول میں پڑھتی ہے۔ اور یہاں کی آمدنی سے اسکول کی فیس ادا کرتی ہے اور اپنا پیٹ پالتی ہے۔ اسے پڑھنے سے بڑی دلچسپی ہے۔ وہ اس ہال کے باہر سوائے کلب کے مالک کے کسی سے بات نہیں کرتی۔

*

"بیئر تو یہاں عورتیں پیتی ہیں۔"
"نہیں میرا مطلب ہے پہلے بیئر پیوں گا۔"
"اچھا میں منگواتا ہوں۔"
"تم نہیں پیو گے؟"
"جی نہیں۔ میں صرف چائے پیوں گا۔"
"کیوں۔"
"اس لئے کہ میں تو شراب پیتا ہی نہیں۔ میں نے آج تک کبھی نہیں چکھی۔"
"مذاق مت کرو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم یہاں ملازم ہو تمہیں تو ہر قسم کی آسانی ہے۔"
"ملازم ضرور ہوں لیکن ملازمت کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں شراب ضرور ہی پیئیں۔ میری ڈیوٹی یہاں صرف رات کو دس بجے سے ایک بجے تک ہوتی ہے۔ وقت پر آتا ہوں اور اپنا کام کر کے چلا جاتا ہوں"
"اور دن بھر کیا کرتے ہو؟"
"دن بھر ایک دفتر میں ملازمت کرتا ہوں۔"
"بھئی تعجب ہے۔ یہاں کلب میں تمہارے کسی سے تعلقات نہیں۔ میرا مطلب ہے کسی سے دوستی نہیں۔
"جان پہچان سب سے ہے مگر دوستی کسی سے نہیں۔ ہوٹل کا مالک مجھ سے بہت خوش ہے۔ اگر میں اپنے ساتھ کبھی کبھی آپ جیسے کرم فرما کو لے آتا ہوں تو وہ کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اچھا آپ جب تک ڈانس دیکھیں۔ میرا تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔ وہ ختم کر کے ابھی آتا ہوں۔ کہیں تو ایک بوتل اور بھجوا دوں۔"
"ہاں۔ یہ رقاصہ بڑی حسین ہے۔"
"یہ عجیب لڑکی ہے۔ بس کیا سے میں آپ کو آ کر بتاؤں گا۔"
اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا ہے۔ اس میز پر بیرے نے لا کر ایک بوتل اور رکھ دی ہے۔ اب JAZZ بجایا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے دو دو کے جوڑے سائے کی طرح میرے سامنے گزرتے ہیں اور اسٹیج کے قریب جا کر ناچنے لگے ہیں۔ میوزک اور تیز ہو گیا ہے۔ ناچنے والوں کے قدم اور زیادہ تیزی سے تھرکنے لگتے ہیں۔ وہ کبھی ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچتے ہیں کبھی علیحدہ ہو کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو کر عجیب انداز سے تھرکتے ہیں۔ پورے ہال میں سگریٹوں کا دھواں گھٹا ہوا ہے۔ سگریٹ اور شراب کی ملی جلی بدبو سے فضا مکدر ہو گئی ہے۔ لیکن اس کدورت کا احساس کسے ہے۔ میری میز سے کچھ فاصلے پر دو نوجوان ایک لڑکی کو لئے بیٹھے ہیں۔ جو کبھی ایک کے اور کبھی دوسرے کے کاندھے سے لگ کر ایک ایک گھونٹ پیتی ہے اور قہقہے لگاتی ہے۔ ہال میں روشنی اتنی کم ہے کہ کسی کی صورت صاف نظر نہیں آتی۔ کسی کو پتہ نہیں کہ دوسرا کیا کر رہا ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ میرے برابر والا شخص دوسری بوتل ختم کر چکا ہے اور JAZZ کی دھن پر سا رہاؤں ہلا رہا ہے۔
ہوٹل کا ملازم واپس آ گیا ہے اور ذرا دیر سے واپسی کی معذرت کر رہا ہے۔ وہ دونوں پھر گفتگو میں مصروف ہو جاتے ہیں۔
"کیوں بھئی وہ لڑکی جو ان نوجوانوں کے ساتھ بیٹھی ہے وہ کون ہے۔ کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟"
"جی ہاں۔ یہ سب لڑکیاں یہاں ملازم ہیں۔"
"ملازم ہیں؟ کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ جو لوگ یہاں تنہا آتے ہیں یہ ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر پیتی ہیں اور انہیں پلاتی ہیں۔"
"اچھا تو اسے یہاں بلا لو۔"
"مجھے افسوس ہے۔ یہ کام آپ کو خود ہی کرنا ہو گا۔"
"یعنی میں خود اس کے پاس جاؤں۔"
"یا تو خود جائیے یا بیرے کو ٹپ دیجئے۔ وہ آپ کا کام کر دے گا۔"
"ہاں وہ جو تم مجھے اس رقاصہ کے متعلق بتانے والے تھے۔"
"جی وہ ... عجیب لڑکی ہے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ وہ کوئی پیشہ ور رقاصہ نہیں بلکہ ایک اسکول میں پڑھتی ہے اور یہاں کی آمدنی سے اسکول کی فیس ادا کرتی ہے ——— اور اپنا پیٹ پالتی ہے۔"
"تو کیا اس کا اور کوئی نہیں ہے؟"

"جی ہاں - اس کی ماں ہے۔ وہ اپنے وقت میں بہترین رقاصہ تھی لیکن اب اس کی آنکھیں جاتی رہی ہیں۔ اس نے بہت کوشش کی کہ جہاں سے اس کی رقص و سرود کی زندگی ختم ہوتی ہے وہاں سے اسی طرح اپنی بیٹی کی زندگی شروع کروا دے۔ لیکن وہ اپنی ماں سے بہت مختلف ہے۔ اسے پڑھنے سے بڑی دلچسپی ہے۔ وہ اس ہال کے باہر سوائے کلب کے مالک کے کسی سے بات نہیں کرتی۔"

"آج تم مجھے عجیب عجیب باتیں سُنا رہے ہو۔ یقین نہیں آتا"

"آپ یقین کیجئے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل حقیقت ہے اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ اچھا ڈیڑھ بجنے والا ہے۔ مجھے اجازت دیدیں تو بڑا مشکور رہوں گا۔ میرا گھر کافی دور ہے۔ پہنچتے پہنچتے دو بج جاتے ہیں۔"

"کلب کس وقت تک کھلا رہتا ہے؟"

"رقص تو دو بجے تک ختم ہو جاتا ہے کچھ لوگ ایک آدھ گھنٹے بعد تک بیٹھے رہتے ہیں۔"

"اچھا جانے سے پہلے مجھے ایک بات بتاتے جاؤ۔ مگر بالکل سچ سچ بتانا۔"

"جی پوچھیئے۔"

"کیا تم اپنی زندگی سے خوش ہو؟"

"کیوں نہیں۔ میں خوش ہوں۔ میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ ایک نیک سی بیوی ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بس یہی ہماری چھوٹی سی دنیا ہے۔ جس میں ہم سب مگن رہتے ہیں۔"

"کیا تمہاری بیوی کو معلوم ہے کہ تم اس نائٹ کلب میں ملازمت کرتے ہو؟"

"جی ہاں معلوم ہے۔ ہماری خوشی اور مطمئن زندگی کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ میں اس سے چھپا کر کوئی کام نہیں کرتا۔ رات گئے تک گھر سے باہر رہنے کے لئے مجھے کوئی بہانہ ڈھونڈنا نہیں پڑتا۔ میں اس سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اچھا آخری رقص شروع ہونے والا ہے۔ آپ اس سے لطف اندوز ہوں اور مجھے اجازت دیں۔"

"اچھا جاؤ۔"

اس کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہال سے باہر چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس شخص نے ایک لمبا سانس بھرا اور گلاس اٹھا کر ایک ہی گھونٹ میں اسے خالی کر دیا۔

آخری رقص کا اعلان ہو گیا ہے۔ لوگ اس رقص کو دیکھنے کے لئے کچھ زیادہ بے چین معلوم ہوتے ہیں۔ ننھے ننھے سے بوتلیں میزوں پر لگ گئی ہیں سگریٹ کے دھوئیں کی تہہ کچھ اور دبیز ہو گئی ہے ——

ایک جھناکے کے ساتھ رقاصہ اسٹیج پر آ گئی ہے۔ اس کے جسم کا زیادہ تر حصّہ کھلا ہوا ہے۔ وہ تھرک رہی ہے اور عجیب وحشیانہ انداز سے جسم کے مختلف حصّوں کو حرکت دے رہی ہے۔ میوزک تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا ہے وہ ناچتے ناچتے کچھ مدہوش سی ہو گئی ہے۔ اور اب اس نے اپنے جسم کے وہ چند کپڑے بھی اتار دیئے ہیں۔ لوگ خوشی سے تالیاں بجا رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں بھوکے بھیڑیوں کی طرح چمک رہی ہیں۔ ان کے منہ کھلے ہوئے ہیں۔ ٹانگیں رقص کی موسیقی کے ساتھ ساتھ تھرک رہی ہیں۔ ہاتھوں میں جام ہیں اور ہر شخص کی زندگی سمٹ کر اس جام میں آ گئی ہے۔

رقص ختم ہو گیا ہے۔ سب لوگ آہستہ آہستہ اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ دور ایک میز پر ایک شخص سر پکڑے بیٹھا ہے۔ شاید وہ سو گیا ہے۔ یا زیادہ لُٹ ہو گیا ہے۔ بیرا آکر اُسے چھوتا ہے اور باہر جانے کے لئے اشارہ کرتا ہے۔ وہ کرسی سے اٹھتا ہے پھر گر جاتا ہے۔ پھر کوشش کر کے اٹھتا ہے اور لڑکھڑاتا ہوا چلا جاتا ہے۔

میرے دل میں ایک کسک ہے۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر رہا ہوں۔ میرے سامنے زندگی کا وسیع و عریض کینوس پھیلا ہوا ہے۔ اور اس شخص کے جملے میرے ذہن میں گونج رہے ہیں ——
—— میں خوش ہوں۔ میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے ایک نیک سی بیوی ہے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بس۔ یہی ہماری چھوٹی سی دنیا ہے جس میں ہم مگن رہتے ہیں۔

ناصر بغدادی

منزل

اس کی بھی تمنا تھی
کہ اس کا اپنا گھر ہو۔ ایک چھوٹی سی
چہار دیواری جس میں خوشی کا راج
ہو۔ اور جب وہ باہر سے آئے
تو اس کا سارا وجود مسکراہٹوں
کی نورانی چاندنی میں نہا جائے۔
دل کی دھڑکنوں پر خوشی کی شبنم
کی خنک پھواریں برس پڑیں کہ تھکن
کا احساس دور ہو جائے۔
لیکن اس کے باوجود وہ اتنی
جلدی شادی کے لئے تیار
نہ تھا۔

پڑھتے پڑھتے اقبال بری طرح چونکا۔ گھڑی پہ نظر پڑتے ہی اس کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ روح فنا ہو گئی۔ زبان پر اس طرح کانٹے پڑ گئے جیسے وہ مدتوں کا پیاسا تھا۔ رات کے دس بجنے والے تھے اور اس کی شامت آنے والی تھی۔ اس نے ایک طویل سانس لی ہاتھ سے کتاب میز پر گر پڑی اس نے گھڑی پر سے نظریں ہٹالیں اور ہلکے نیلے رنگ کے شیڈ کے اندر چھپے ہوئے چالیس وولٹ کے بلب کو دیکھا۔ آنکھوں میں اندھیرے بادل تیرنے کی وجہ سے روشنی اس کو مدھم دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس کے چاروں طرف تاریکیاں ہالہ بناکر کھڑی ہو گئی ہوں۔ کچھ دیر پہلے اس نے جو کچھ پڑھا تھا وہ بھول گیا تھا وہ خود کو بالکل خالی الذہن محسوس کرنے لگا۔ فوج اپنے سے طاقتور حریف کی آمد کی خبر سنکر چپکے چھوڑ کر رفوچکر ہو جاتی ہے۔ اس نے آیت الکرسی پڑھ کر سینے پر دم کیا اور اس بلا سے پناہ مانگی جس کا آنا موت کی طرح اٹل تھا۔ اس نے پھر گھڑی دیکھی۔ دس بج کر کچھ منٹ ہو چکے تھے اس کے چہرے پر حیرت کے سائے رینگنے لگے۔ تعجب کی بات تھی اس بلا کی آمد کا وقت مقرر تھا وہ ٹھیک دس بجے اس کے سر پر مسلط ہو جاتی تھی اس کے بعد آنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا خوشی کا احساس سرخی بن کر اس کی آنکھوں میں ابھرا۔ مختلف النوع خیالات ذہن میں پیدا ہو گئے۔ کیا اس بلا کی آنکھ لگ گئی۔ کیا اس کو جھپٹنا نصیب ہو گیا۔ اوہ! تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ آج کی رات ایک دن کے سلطان کی طرح اپنی مرضی میں آئے کر سکتا ہے، ساری رات جاگ سکتا ہے۔ کتاب کا کیڑا بن سکتا ہے۔ برآمدے میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے کھا کر تھکن کو معدوم کر سکتا ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کی یہ خوشی سانس کی ڈوری کی طرح ٹوٹ گئی اور وہ ایک تلخ احساس سے ہمکنار ہو گیا۔

"اقبال!" اس کے والد کی آواز برابر کے کمرے سے آئی۔ آواز زیادہ بھاری نہ تھی۔ مگر اس کے باوجود اس کا جی چھوٹ گیا اور اس کے دل میں اپنے والد کے خلاف باغیانہ خیالات پیدا ہو گئے۔ اس کو معلوم تھا کہ اگلے چند لمحوں کے بعد ہی شائستہ آواز کسی دشمن کے لہجے کی طرح سخت اور کرخت ہو جائے گی۔ وہ اپنے باپ کے نادر طرز عمل کے متعلق سوچنے لگا۔ وہ یہی جو اس سے پہلے دو بار بار سوچ چکا تھا۔ اس کو شک تھا کہ شاید وہ اس کا سوتیلا باپ ہے کیونکہ اس نے کسی باپ کو اپنی اولاد سے ایسا برتاؤ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ کبھی کبھی تو اس کو اپنا باپ ہندوستان کے ریاستی رئیسوں کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس عمر میں اگر اس نے یہ رویہ اختیار کیا ہوتا تو وہ اس کو بڑھاپے کے دماغ کی خرابی پر محمول کرتا مگر اس نے تو اس وقت سے اس کو اپنے باپ میں جابر و ظالم محسوس کیا تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا جینے اور جینے میں تمیز کرنا سیکھا تھا۔

"اقبال! سو جاؤ۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔" اس بار آواز میں تلخی تھی

...ضرورت بھی پوری نہ ہو سکی تھی۔ اور اقبال ماخت پیس کر رہ گیا۔ اگر آج اس کو معلوم ہو جاتا کہ وہ اس کا باپ نہیں ہے تو وہ چن چن کر یوں بدلے لیتا کہ وہ ہستی بھول جاتا۔ اس نے اس کی زندگی کو زہر کا ساغر بنا دیا تھا اس نے اس کی ہر خوشی جبراً چھین لی تھی اس کے دل کے منبع کو آنسوؤں سے بھر دیا تھا۔ آخر اس کو اقبال سے اس درجہ عداوت کیوں تھی۔ ؟ اس کے متعلق اس نے بارہا سوچا تھا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا دماغ اپنے باپ کے متعلق سوچتے سوچتے ژولیدہ ہو جاتا۔ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ایک سلیٹ کے دستے لگتیں تو وہ بری طرح جھلا جاتا اس کا دل چاہتا کہ بڑھ کر دیوار کو ایک ایسی ٹکر مارے کہ سر کے کئی ٹکڑے ہو جائیں تاکہ زندگی بھر کی بے قراری کو قرار مل جائے۔

جب سے اس نے آنکھ کھولی تھی اس وقت سے وہ سکون کو ترس رہا تھا اس کا دل ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح برس رہا تھا۔ وہ ایک ایسا لمحہ حاصل نہ کر سکا تھا جس کو وہ حقیقتاً میں کیف افزا کہہ سکتا وہ لمحہ۔ وہ تو شاید اس کے مقدر میں ہی نہ تھا وہ تو دور کھڑا اس کو منہ چڑا رہا تھا۔ اس وقت وہ ایم اے فائنل کا طالب علم تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے اسے مدت ہو چکی تھی۔ نفسیات کا طالب علم ہونے کی وجہ سے اس کو فہم و فراست اور نطاقت میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ دوسروں کے اذہان میں چھپے ہوئے خیالات کو پڑھنے میں وہ اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ دلوں میں پوشیدہ رازوں کو اس کی دور رس نگاہیں طشت از بام کر دیتی تھیں مگر۔ مگر وہ ہنوز اپنے باپ کی الجھی ہوئی فطرت کے تار و پود کو یکجا نہ کر سکا تھا۔ نفسیات کا کوئی اصول اس کی مدد نہ کر سکا تھا ڈارون فرائڈ اور ہیوم جیسے ماہر نفسیات کے زرّیں اور بیش بہا اقوال اور تھیوریوں کی روشنی میں بھی وہ اپنے باپ کا نفسیاتی تجزیہ نہ کر سکا تھا وہ تو ایک ایسی الجھی ہوئی گتھی تھا جس کو سلجھانے کا کوئی قاعدہ، کوئی طریقہ کلیہ نہیں تھا اس نے بچپنے سے لیکر آج تک اقبال کی معصوم خوشیوں کا خون بہایا تھا اس کے لبوں کی مسکراہٹ اس کے جنونی غصہ کو مہمیز لگا دیتی تھی بشارت تو بعد کی بات۔ ہلکی سی شوخی بھی اس کے لئے جھلاہٹ کا سبب بن جاتی تھی اس کو کوئی ایسا واقعہ یاد نہ تھا جب اس کو ہنستے ہوئے دیکھ کر اس کا باپ بھی مسکرایا ہو۔ بس وہ تو یوں گریز اختیار کرتا کہ آنسو کے لئے مسکراہٹ کا استحصال

تصور بھی اس کے لئے ایک خوفناک شے بن جاتا۔

اگر کبھی اس کو ضروریات کی تکمیل کے لئے کچھ روپے کی ضرورت ہوتی اور وہ جیب خرچ سے زیادہ طلب کرتا تو اس کا باپ اس کو غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر کہتا۔

" آج تم ایک روپیہ زیادہ طلب کر رہے ہو۔ کل دس روپے زیادہ مانگو گے! جاؤ میں فضول خرچی کو اچھا نہیں سمجھتا۔ "

اگر کبھی اس کو کالج سے واپسی میں دیر ہو جاتی، دو چار یار دوست مل جاتے، خوش گپیوں کا سلسلہ چل پڑتا اور گھڑی کی سوئی اس مقررہ وقت سے آگے نکل جاتی جب اس کو روز گھر پہنچنا ہوتا تو بس اس دن قیامت ہی آ جاتی۔ گزارے ہوئے دلنواز لمحات کی یاد انگارہ بن کر اس کے ذہن میں دہکنے لگتی، وہ راستے بھر اپنے دوستوں کو دل ہی دل میں برا بھلا کہتا اور دھڑکتے دل کے ساتھ جوں ہی گھر میں داخل ہوتا اس کا باپ موسلا دھار بارش کی طرح برس پڑتا، طنزیہ فقرے زہریلے خنجر بن کر اس کے سینے میں اترنے لگتے ایسے وقت اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی کھری کھری سنائے۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالے مگر جب سانپ اس کو اپنی زبان پر خاموشی کے تالے لگانا پڑتے، وہ بخوبی جانتا تھا کہ زبان کھولنے کا کیا انجام ہوگا۔ ؟

" اعلیٰ حضرت اب آ رہے ہیں " وہ زہر خند کے ساتھ کہتا " گھڑی دیکھی ہے۔ ؟ کالج ختم ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا اور حضور اب آ رہے ہیں وہی غنڈے مل گئے ہوں گے جن کو تم جگری دوست سمجھتے ہو۔ اونھ۔ اگر تمہارے یہی چلن رہے تو خدا ہی حافظ ہے "

اور ایک دن تو سارے دوستوں میں اس کی کرکری ہو گئی تھی جس کے سبب ایک عرصہ تک اس کا سر زمین پر پست رہا اس دن اس کی رگوں میں غصے کے انگارے دہک اٹھے تھے نفرت کی آگ دل میں یوں بھڑکی تھی کہ اس نے دیوانہ وار سنجیدگی سے سوچا تھا کہ کیوں نہ بڑھ کر اپنے باپ کے گنجے سر پر ایک ایسا لٹھ رسید کر دے کہ اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں کچھ تو شرمندگی کا احساس کم ہو! کچھ تو تلافی مافات ہو! یہ تو باپ نہیں پاپ ہے! مگر اس دن بھی وہ خون کے گھونٹ پی کر چپ رہا تھا اب یہ خاموشی ہی اس کا مقدر بن چکی تھی ۔۔۔ اس دن کالج کے چند بے تکلف دوست اس کے گھر آ گئے تھے بس وہ کے دن تھے

اس لئے وہ سب برآمدے میں کرسیوں پر خوش گپیوں میں مصروف
تھے۔ اس دن خلافِ توقع دھوپ ذرا تیز تھی مگر چونکہ سردی کا موسم تھا
اس لئے سب کو دھوپ کی فرحت بخش سنہری کرنوں کے غسل میں مزا آرہا
تھا۔ عین اسی لمحے کمرے کے اندر سے اس کے باپ کی آواز آئی۔

"اقبال! کمرے میں آجاؤ۔۔ دھوپ تیز ہے" اس کی یہ بات
سنکر اقبال کے سب دوست کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

"یار! کیا تیرے والد تجھے موم سمجھتے ہیں جو تو دھوپ میں پگھل
کر رہ جائے گا۔" ایک دوست نے ازراہِ مذاق کہا۔ سب پھر ہنس پڑے
اور اقبال بیچارہ خفیف ہو کر رہ گیا۔

"نہیں یار یہ بات نہیں" اقبال نے بات بنائی۔ "دراصل
میرے والد بڑے بااصول ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ میں صحت پہ منفی اثر
ڈالنے والی حرکت کروں" ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کا باپ
زخمی شیر کی طرح دھاڑا۔

"سب کو بھگاؤ اور کمرہ میں آکر پڑھو۔ جب دیکھو غلط
آدمیوں کے ساتھ وقت ضائع کرتے ہو۔" بات تلخ تھی بلکہ زہر سے
بھی زیادہ کڑوی! یہ سراسر اس کے دوستوں کی توہین تھی، سب کے منہ
لٹک گئے، وہ چپ چاپ چلے گئے اور اقبال شرم و انفعال کے
سبب اس موسم میں بھی پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اور پھر دوسرے ہی دن
کالج میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ اس کا باپ تہذیب
کے نام سے کلی طور پر نا آشنا ہے، اس نے اقبال کے پیروں میں زنجیر
پہنا دی ہے جو اقبال سے ملنے آتا ہے اس کا باپ اس کی گالیوں سے
خاطر تواضع کرتا ہے۔ اقبال نے یہ باتیں سنی اور اپنا دل تھام کر رہ
گیا باپ کے خلاف ابھری ہوئی نفرت کہ جیسے جنون بن گئی ہو، اس کا جی
چاہا کہ اپنے باپ کو قتل کر دے۔ مگر اس کے باوجود وہ اس کا کچھ نہ
بگاڑ سکا۔ جب قسمت ہی اس پہ مہربان تھی وہ کیا کر سکتا تھا اس نے یوں
ماں کے جیسا بیٹے کی زندگی جیسے اس کے لئے نفرت انگیز پیغام بن گئی
بستر سے نہ صرف اس کی بے عزتی کی بلکہ انھوں نے اس کو اپنے قریب
پھٹکنے بھی نہ دیا اور ان کے قریب آتا تو نشتر جیسے اس کی رگ حمیت پہ
لگتے۔

"جاؤ یار! ہمارے قریب نہ آؤ۔ تمہارے والد ناراض
ہوں گے۔۔!"

"غنڈوں کے پاس آؤ گے تو بگڑ جاؤ گے۔"

اور ایسے موقعوں پر اس کا چہرہ چقندر بن جاتا، دل چاہتا کہ ابھی
زمین شق ہو جاتے اور وہ اس میں سما جائے، وہ اکیلا کالج میں کٹی
ہوئی پتنگ کی طرح اِدھر اُدھر ڈولتا پھرتا، کسی کو اس کے زخم خوردہ
احساسات سے ہمدردی نہ تھی، ہر ایک اس کے دکھ سے نا آشنا تھا

اچانک اس کے خیالات پہ بجلی گری۔ رات کے دبیز اندھیرے
میں اس کے باپ کی دھاڑ بھٹکتی ہوئی روح کی لرزہ براندام کر دینے
والی چیخ بن کر ابھری تھی۔

"ابے او اقبال کے بچے! لائٹ بند کر کے سو۔ گیارہ بج گئے"

اور اقبال اچھل پڑا اور دوسرے ہی لمحے اس نے لائٹ آف
کر دی اور اتنی گرمی میں بھی لحاف کو سر سے پاؤں تک لپیٹ کر اپنی آنکھیں
بند کر لیں اس وقت اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور ہر
دھڑکن نفرت کے بوجھ تلے دبی دبی سی ہو گئی تھی! اس کا جی چاہا کہ وہ اس
گھر سے ہی بھاگ جائے کم از کم اس صورت میں اس کو اپنے شقی القلب
باپ سے تو نجات مل جائے گی! مگر وہ کہاں جائے؟ یہ ایک ایسا
مشکل سوال تھا جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا نہ اس کا کوئی واقف
کار تھا اور نہ کوئی دستگیر یا یار تھا۔ جس کو وہ اپنا سہارا سمجھ سکتا اور پھر
اس کی آمدنی بھی کیا تھی؟ وہ تو اسقدر اپنے باپ کے ٹکڑوں پہ پل رہا
تھا۔ اس میں اتنی استطاعت بھی نہ تھی کہ ایک کشکول ہی خرید سکتا ابھی
کو اپنی زندگی سے بھی نفرت ہونے لگی۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر، لعنت
ہے ایسے جینے پر!! ۔

وہ اپنے باپ کی ہر بات زہر مار کر سکتا تھا مگر پڑھائی کے
معاملے میں اس کی بے جا دخل اندازی اسے پسند نہ تھی۔ یہ بھی ہو گیا
تھا کہ ایم اے فائنل کے اسٹوڈنٹ کے چہرے پہ قدغن لگایا
جائے۔ یہی وہ چار چھٹی تو پڑھائی کے ہوتے ہیں جن میں طالب علم
دنیا کی فکر ہی سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ پھر جب تم پڑھ رہا
تھا اور وہ! اقبال کو کچھ جھڑکی نے لگا اس کا جی چاہا کہ چیخ

چیخ کر رونا شروع کر دے۔ دنیا والوں کو جمع کر کے ان کے سامنے
فریاد کرے کہ یہ کیا انصاف ہے؟ یہ کیسا زمانہ آگیا ہے کہ ایک باپ
بیٹے سے جلتا ہے، اس کے مستقبل کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے!!

اس سال اقبال ایم۔اے میں سیکنڈ ڈویژن کامیاب ہو گیا
ہزاروں رکاوٹوں کے باوجود اتنی بڑی جماعت میں امتیازی نمبروں سے
پاس ہونا معجزہ ہی تو تھا۔ بے شک اس کا باپ جلاد اور فرعون صفت
تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی پہنچ بڑے بڑے آدمیوں تک تھی گزٹیڈ
آفیسر بھی اس کو جھک کر سلام کرتے تھے بڑے بڑے لوگ اس کے
سامنے اپنی آواز کو اونچا کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ اس کا اثر و
رسوخ کام آیا اور اقبال کو ایک مقامی کالج میں لیکچرر کی جگہ مل گئی
اور اس طرح اس کے باپ کے اعمال نامہ میں پہلی نیکی درج ہو گئی۔ اب
اقبال اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ اب اس کو احساس ہونے لگا تھا کہ وہ
بھی کچھ ہے۔ سوسائٹی میں اس کا بھی کوئی مقام ہے، جب طلبا و طالبات
اس کو سلام کرتے تو اس کا دل کھل اٹھتا تھا۔ اس کو محسوس ہوتا تھا
کہ فخر و رعونت اور تمکنت سے اس کا سینہ پھول رہا ہے کبھی کبھی
تو اسے ایسا لگتا جیسے وہ خود بدل گیا ہے یا پھر دنیا ہی بدل گئی ہے زندگی
کا یہ کیف افزا رخ اس کے احساسات کو چار چاند لگا رہا تھا۔ مگر
اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی، اس پر ایک اور غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا
جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کا باپ اس کی شادی کی بات پکی کر رہا ہے
تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کو شادی سے نفرت نہ تھی،
اس کی بھی تمنا تھی کہ اس کا بھی اپنا گھر ہو۔ ایک چھوٹی سی چہار دیواری جس
میں خوشی کا راج ہو، کوئی اس کا بے چینی سے انتظار کرتا ہو اور جب
وہ باہر سے آئے تو اس کا سارا وجود مسکراہٹوں کی نورانی چاندنی
میں نہا جائے، دل کی دھڑکنوں پر خوشی شبنم کی خنک پھواریں کریں
ٹپکے کہ تھکن کا احساس دور ہو جائے، لیکن اس کے باوجود وہ اتنی
جلدی شادی کے لئے تیار نہ تھا، وہ چاہتا تھا کہ کچھ دن اور کنوارے
پن کی آزاد زندگی سے لطف اندوز ہو جائے، اس نے اس سلسلے میں
اپنے رشتے سے اپنے باپ کو آگاہ کر دیا، اس کا خیال تھا کہ حسبِ عادت
اس کی بات سن کر اس کا باپ آگ بگولا ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہیں

ہوا، اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں ہو گئے، اس کے باپ کا
یہ رخ اس کے لئے بالکل ہی نیا تھا۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

"اقبال!" اس نے زندگی سے خالی لہجے میں کہا۔ "میں زندگی
کی راہوں میں چلتے چلتے تھک گیا ہوں۔ اگر تمہاری ماں زندہ ہوتیں
تو شاید میں تمہاری شادی میں اتنی عجلت نہ کرتا۔ مگر اب میں چاہتا
ہوں کہ جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں، تاکہ یہ بوجھ
میرے سر سے اتر جائے، تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہئے کیونکہ
اب تمہاری عمر بھی شادی کے قابل ہو چکی ہے اور بفضلِ خدا تم اپنے
پیروں پر بھی کھڑے ہو چکے ہو۔"

باپ کا لہجہ اتنا پُر اسرار و پراثر تھا کہ اقبال خود قائل ہو
گیا، اب انکار کی گنجائش ہی نہ تھی اور پھر ایک نہ ایک دن تو اس کی
شادی کرنی ہی تھی، اس کے چند ماہ بعد وہ ایک قبول صورت، نیک
سیرت دوشیزہ کا شوہر بن گیا۔

شادی کے بعد وہ بھی بدل گیا تھا اور اس کا باپ بھی۔ اب
اس کی فطرت کی کرختگی دور ہو چکی تھی غصیلی طبیعت یک لخت موم
کی طرح نرم و ملائم ہو گئی تھی مگر وہ اب بھی ناصح تھا۔ پند و نصائح کا باب
کھولنے سے باز نہ آتا تھا، کبھی اس کی نصیحتیں اقبال کو ہنسنے پر مجبور
کر دیتی تھیں اور کبھی وہ دل ہی دل میں کھولنے لگتا تھا، وہ شادی
شدہ تھا، جوان تھا، صاحبِ عقل و فراست تھا مگر اب بھی اس کا باپ
اس کو ایسی باتیں سمجھاتا تھا جیسے وہ طفلِ مکتب ہو، جیسے ابھی اس
کے منہ سے دودھ کی بو آتی ہو، کبھی وہ دھوپ میں کھڑے ہو کر کسی
سے بات کرتا تو وہ اس کو ناصحانہ انداز میں سمجھاتا کہ کڑی دھوپ
میں سانولے بھی جھلس جاتے ہیں، یوں کھڑا ہونا اپنی صحت کو برباد
کرنے کے مترادف، اب وہ اس کو کیا جواب دیتا، چپ چاپ سعادت
مندی سے وعدہ کر لیتا کہ وہ آئندہ اپنی اس حرکت کا اعادہ نہیں
کرے گا، اس کی بیوی اپنے خسر کی دلچسپ باتیں سن کر بے اختیار ہنسنے
لگتی اور وہ خفیف ہو جاتا ایسے موقعوں پر اس کو اپنے باپ پر شدید
سے غصہ آجاتا، رات کو اگر سردی بڑھ جاتی اور اقبال بے فکری سے
بغیر چادر یا لحاف کے سو جاتا تو اس کا باپ رات کو اٹھ کر اس کو اچھی طرح

مسرت ساحری

● — وہ بغیر ہاتھوں کے زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ لیکن جمیلہ کی محبت اور شہلا کے پیار نے اُسے زندہ رہنے پر مجبور کر دیا۔

● — سراج کے ہاتھوں کی وہ لکیریں کٹ چکی تھیں جن میں نجومیوں کو دھان کی فصلیں لہلہاتی نظر آتی تھیں۔ وہ ہتھیلیاں چھین لی گئی تھیں جن میں پسینے کی بوندیں ڈھل کر — روپے — بن جایا کرتی تھیں۔

سراج کی نظریں راستے ہی پر جمی ہوئی تھیں۔ گلی سنسان تھی لیکن وقفہ وقفہ سے کبھی نہ کسی آہٹ پر اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں اور وہ بے اختیار پکار اٹھتا۔

"جمیلہ —!! جب کوئی جواب نہ ملتا تو وہ گلی سے گزرنے والے کو مخاطب کر کے وقت ہی دریافت کر لیتا اور چپ ہو رہتا۔

رات کے دو بج رہے تھے اور جمیلہ ابھی تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ سراج کے دل میں وسوسے جاگ رہے تھے۔ وہ اپنے آپ ہی بڑبڑانے لگتا۔

"نہیں۔ !! میری جمیلہ آتی ہی ہو گی۔"

سراج کا دل مطمئن ہو جاتا۔ لیکن اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے خوف اور شک جھانکنے لگتا۔ وہ اپنے شک کو جھٹلانے کے لئے اپنی لڑکی شہلا کو جگاتے ہوئے پوچھتا —

"تبا شہلا — جمیلہ نے دیر سے آنے کی بات کہی تھی؟"

شہلا کچھ نہ کہتی۔ نیند میں بڑبڑاتی ہوئی کروٹ بدل لیتی۔ سراج سوچنے لگتا۔ جمیلہ کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ بے وفائی کبھی نہیں کر سکتی۔ بے وفا عورتوں کی آنکھوں میں کانچ کی جھلملاہٹ ہوتی ہے۔ اور جمیلہ کی آنکھوں میں سچے ہیروں کی چمک ہے۔ اس کے پیار میں وہی خوشبو ہے جو آج سے پانچ سال پہلے تھی جب اس کے فولادی ہاتھ لوہا پگھلانے والے کارخانے میں لوہے کی مشینوں کو موم کی طرح گھماتے تھے۔ اس کی طاقت اور کس بل کی تعریف کارخانے کا بوڑھا منیجر تک کرتا تھا۔ جب کبھی کسی بھاری مشین کو کہیں منتقل کرنا ہوتا تو منیجر کو اس کے مشوروں اور ہاتھوں کی طاقت ہی کا سہارا لینا پڑتا جس وزنی مشین کو دو تین مزدور مل کر ہٹانے میں دقت محسوس کرتے وہ اپنے ذہن کی ہوشیاری اور ہاتھوں کی طاقت سے منٹوں میں ہٹا دیتا۔ ایسے موقعوں پر بوڑھا منیجر خوش ہو کر اس کی تعریف کرتا تو اس تعریف سے اسے اتنی خوشی ہوتی تھی جیسے ایک ساتھ دو بونس مل گئے ہوں۔ وہ پہلوانوں کی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے گھر لوٹتا اور جمیلہ کو اپنے فولادی ہاتھوں کی طاقت کے کارنامے سناتا۔ جمیلہ مسکراتے ہوئے اس کے بھرے بھرے بازوؤں کو ہلکے ہلکے دبانے لگتی۔ اور وہ محبت سے جمیلہ کے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے کہتا۔

"ارے کہیں فولاد کے ہاتھ بھی دُکھتے ہیں۔ اتنی بڑی مشینیں اٹھانے کے بعد بھی میرے فولادی ہاتھوں میں وہی دم خم ہے — یہ دیکھو — یہ کہہ کر وہ جمیلہ کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیتا اور کہتا۔

"تجھے جب کبھی اٹھا لیتا ہوں میرے ہاتھوں کی طاقت اور بڑھ جاتی ہے"

جمیلہ ہنستی ہوئی اس کی باہوں میں پھول بن جاتی۔ اور وہ جمیلہ کو [illegible]

پلنگ پہ بیٹھے سے چپک دیتا۔

شہلا کے پیدا ہونے کے بعد اس کی بے تکلف محبت پہ پہرے لگ گئے۔ لیکن جب کبھی کارخانے میں کسی بھاری مشین کو ہٹانے کے بعد بوڑھا منیجر اس کی تعریف کرتے ہوئے اٹھنی انعام میں دیتا تو اس کا سینہ اور بازو خوشی سے پھول جاتے۔ وہ کارخانہ سے چھوٹتے ہی جمیلہ کے لئے پھول خریدنے پھولوں والی گلی کی طرف جاتا جہاں اپنے کو فروخت کرنے والی عورتیں اس کے چوڑے چکلے سینے اور بھرے بھرے بازوؤں کو دیکھ کر للچاتیں اور اسے چھیڑتیں۔ لیکن وہ ان کی طرف پلٹ کر کبھی نہیں دیکھتا۔ انعام میں حاصل کی ہوئی اٹھنی کے گجرے لئے سیدھا اپنے گھر لوٹتا اور مہکتے ہوئے گجرے جمیلہ کے جوڑے میں باندھ دیتا۔ اس وقت اسے اس بات کا بھی خیال نہیں ہوتا کہ ننھی شہلا اس کی گود میں ہے۔ وہ شہلا سمیت جمیلہ کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا۔ جمیلہ کی آنکھیں مسکراتیں۔ وہ شہلا کو اپنے سینے سے چپٹائے شرم سے دوہری ہو جاتی۔

سوچتے سوچتے اس کی کنپٹیاں گرم ہو چکی تھیں۔ ہونٹوں پہ زبان پھیری تو محسوس ہوا کہ سوکھ رہے ہیں۔ اس نے شہلا کو بیدار کر کے پانی مانگا اور بڑے پیار سے پوچھا۔

"کیا شہلا جمیلہ نے دیر سے آنے کی بات کہی تھی؟"

چار برس کی شہلا جواب ہی کیا دیتی وہ الٹا اس سے پوچھ بیٹھی۔

"ماں کہاں ہے؟"

شہلا کے سوال نے اسے چکرا دیا۔ اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ شہلا کو کیا جواب دے۔

"ماں کہاں ہے" شہلا نے رٹ لگائی۔ سراج نے فوراً شہلا کو قریب آنے کے لئے کہا۔ وہ قریب آئی اور اس کے چوڑے سینے پہ گر پڑی سراج کی آنکھیں بھر آئیں۔ اسے اپنے آپ پر رحم آ رہا تھا۔ شہلا سینے پہ سر رکھے اونگھ رہی تھی۔ وہ بڑی حقارت اور غصہ سے اپنے ننھے جاوید کی ادنیٰ نیلی کو دیکھ رہا تھا جو اپنی پیدائش کے چھ مہینہ بعد ہی مر گیا۔ لیکن مرتے مرتے اس پر قیامت ڈھا گیا۔ جاوید کی پیدائش سے جو قرض ہو گیا تھا اس کی ادائیگی کے لئے اسے دن کے علاوہ رات میں بھی کسی دوسرے کارخانے میں کام کرنا پڑا۔ جہاں لوہے کی بھاری سلاخوں کی منتقلی کا کام اس کے سپرد تھا۔ وہ لوہے کی نگرانی کے ساتھ ساتھ سلاخیں منتقل کرنے والے مزدوروں کا ہاتھ بٹاتا۔ جن وزنی سلاخوں کو وہ بانس کے ہلکے ٹکڑوں کی طرح آسانی سے منتقل کر لیا کرتا تھا وہی لوہے کی سلاخیں اس کے فولادی ہاتھوں سے اپنی ہتک کا بدلہ لینے کے لئے موقع کی منتظر تھیں۔

ایک رات جب کہ سلاخوں کی منتقلی کا کام زوروں پہ تھا اس کے ساتھ والے مزدور نے اپنا توازن کھو دیا جس کے نتیجہ میں بھاری سلاخوں کے نیچے اس کے دونوں ہاتھ آ گئے۔ جب سراج کو دواخانہ میں ہوش آیا تو اس کے دونوں ہاتھ مر چکے تھے۔ جن فولادی ہاتھوں پر اس کو ناز تھا ایک چھوٹے سے نشتر نے ان کو کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ اس کی نظر میں اس حادثے کی ذمہ داری ننھے جاوید پر تھی۔ اس کی منحوس پیدائش نے اسے رات میں کام کرنے پر مجبور کیا اور آخر کار اس کے ہاتھوں کی موت کا باعث بنی۔ وہ بغیر ہاتھوں کے زندہ ہی رہنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جمیلہ کی محبت اور شہلا کے پیار نے زندہ رہنے پر مجبور کر دیا۔ سراج کے ہاتھوں کی وہ لکیریں کٹ چکی تھیں جن میں نجومیوں کو دھان کی لہلہاتی فصلیں نظر آتیں۔ وہ ہتھیلیاں چھین لی گئی تھیں جن میں پسینے کی بوندیں ڈھل کر روپیہ بن جایا کرتی تھیں۔ وہ بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ اب جمیلہ ہی کی محنت اور مزدوری پہ اس کی اور شہلا کی زندگی کا دارومدار تھا۔

جمیلہ صبح ہی اٹھتی۔ کام کاج سے فارغ ہو کر سراج کا منہ دھلاتی کپڑے ٹھیک کرتی۔ بال جاتی۔ پھر شہلا کی باری آتی اس کا منہ ہاتھ دھلاتی، بال ٹھیک کرتی، دونوں کو ایک ساتھ اپنے ہاتھ سے مسکراتے ہوئے کھانا کھلاتی۔ ان دونوں کی خدمت سے فرصت پاکر خود زہر مار کرتی۔ اور مزدوری کے لئے نکل جاتی۔ پھر شام گھر لوٹتی تو ایک ساتھ دونوں کی خدمت میں جٹ جاتی۔ چھ مہینے سے اس کے یہی دن رات تھے۔ لیکن پچھلے ایک مہینے سے جمیلہ کی مزدوری کے اوقات بدل گئے تھے۔ اب وہ گھر سے پانچ بجے نکلتی۔ اور رات کے بارہ بجے لوٹتی۔ یہ پابندی ایک مہینے سے ہو رہی تھی۔ وقت کی تبدیلی سے جمیلہ کی مزدوری میں اضافہ بھی ہو گیا تھا لیکن وہ اداس اداس سی رہتی۔ سراج اداسی کا سبب پوچھتا تو جمیلہ مسکراتے ہوئے اس کے چوڑے سینے پر سر رکھ دیتی۔ اور بڑے پیار سے کہتی۔

"مجھے تیرے ہاتھ یاد آتے ہیں۔"

گلی سے گزرنے والے قدموں کی آہٹ نے سراج کو چونکا دیا۔ لمحے

گھٹنے والے تھا۔ دانت پیستی [illegible] آواز گونجنے والے کو متوجہ نہ کر سکی شہلا
اس کے قریب [illegible] بستر پر سو رہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔
اس نے اپنے آپ کو دلاسا دیتے ہوئے خیال کیا "ہو سکتا ہے اچانک اوور ٹائم
کی وجہ سے جمیلہ کے آنے میں دیر ہو گئی ہو" وہ اپنے دلاسوں سے مطمئن ہو
رہا تھا۔ لیکن اس کے شکوک نے مطمئن ہونے نہیں دیا۔ وہ سوچنے لگا جمیلہ
اوور ٹائم بھی نہیں کر سکتی اور اوور ٹائم سے زیادہ میرا خیال رکھتی ہے۔ ضرور کوئی
ان ہونی بات ہوئی ہو گی۔ سراج کا دل دھڑکنے لگا۔ شہلا سو رہی تھی۔ اس نے
جمیلہ کے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ اسے یاد آگیا کہ جمیلہ سبز ساڑی پہنے ہوئے تھی۔
سراج چپکے سے گھر سے باہر نکل پڑا تاکہ قریب کے پولیس اسٹیشن پر جا کر کچھ معلومات
حاصل کر سکے۔ پولیس اسٹیشن پر سوائے ایک کانسٹبل کے کوئی دوسرا نہ تھا۔
کانسٹبل نے جمیلہ کے بارے میں لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے دوسرے پولیس اسٹیشن
پہ جانے کا مشورہ دیا۔ سراج سوچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ راستے میں پھولوں
والی گلی سے گزرتے ہوئے وہ اپنے کٹے ہوئے بازوؤں کو دیکھ کر مسکرانے
لگا۔ سامنے والی گلی کے نکڑ پر پیٹرومکس کی روشنی میں چند پولیس والوں کو دیکھ
کر اس کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ وہ ان کے قریب پہنچ رہا تھا۔ پولیس والوں
کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ سراج نے اندازہ لگا لیا کہ ٹکر سے
کسی کی موت واقع ہوئی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سفید چادر سے
ڈھکی ہوئی لاش پڑی تھی۔ اس نے کانسٹبل سے دریافت کیا۔ کون ہے؟

"کوئی آوارہ عورت ہے۔ لاری سے ٹکرا کر مر گئی۔" کانسٹبل نے
لاپرواہی سے سراج کو جواب دیا۔

"ارے اسے بھی دکھا دو شاید وارثوں کا پتہ چلے۔" دوسرے
کانسٹبل نے مشورہ دیا۔ لاش سے چادر ہٹائی گئی۔

"جمیلہ ——!" سراج چیخ پڑا۔

"تم جانتے ہو اسے" انسپکٹر پولیس کی آواز گونجی۔

"ہاں ——"

"کون ہے یہ؟"

"یہ میری سب کچھ تھی انسپکٹر صاحب۔" سراج پھوٹ پڑا۔
—— سبز ساڑی میں ملبوس جمیلہ کے مطمئن چہرے پر تھکی تھکی سی مسکراہٹ
کھلی ہوئی تھی ——

اشتیاق

جھوک —— صفحہ ۲۸ کا بقیہ

ٹک آتے ہوئے [illegible] ٹھوکر [illegible] ایک چیخ کی آواز نے
مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ میں ہڑبڑا کر باہر نکلا تو احسان زمین پر
بے ہوش پڑا تھا اور اس کی میز پر ایک کھلا ہوا لفافہ اور ایک چیک
تھا۔ بڑے بابو سے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرنے کے لئے کہہ کر میں نے لفافہ
اور چیک اٹھا لیا۔ یہ تو بد اخلاقی تھی مگر احسان کی اچانک بے ہوشی
کا سبب معلوم کیا جانا بھی نہایت ضروری تھا۔ خط ختم کرتے کرتے میری
آنکھیں نم ہو گئیں۔ خط للّی کا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"بھیا! —— میں جانتی ہوں تم مجھ سے کیوں ناراض ہو۔ چچا
مجھ سے کیوں خفا ہیں۔ سب مجھ سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔ جس بات
کو میں راز رکھنا چاہتی تھی آج تمہیں بتاتی ہوں تاکہ تم لوگ مجھے اتنے
بُرے الفاظ سے یاد نہ کرو جتنا اب کرتے ہو۔ ولیم میرا محبوب تھا جس
کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ ایک منحوس شام کو وہ فالج کا شکار ہو گیا۔
ایک نیم مردہ ہستی —— میں نے اس کی خاطر ماں باپ کو چھوڑا۔ نوکری
کی۔ پھر ماں باپ بھی مجھ سے ہمیشہ کے لئے روٹھ گئے۔ چند ماہ پیشتر
ایک مشہور ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ جرمنی میں فالج کا علاج ممکن ہے۔
ولیم کے علاج کے لئے پانچ ہزار روپے جمع کر رہی تھی۔ احسان بھیا تم
خفا ہو۔ مگر بتاؤ میں کیا کرتی۔ روپے کہاں سے لاتی —— آج پانچ ہزار
روپے پورے ہو گئے —— لیکن آج ہی میرا محبوب مجھ سے ہمیشہ کے لئے
رخصت ہو گیا ہے۔ اور میری زندگی کا مقصد ختم ہو گیا۔

یہ پانچ ہزار روپے کا چیک تمہیں بھیج رہی ہوں۔ تم ملازمت
چھوڑ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرو۔ اور اس رقم میں سے ایک ہزار روپے
چچا کو دے دینا۔ انہیں اپنی لڑکی کی شادی کرنی ہے۔ مجھے معاف کر دو
بھیا —— کل کا سورج مجھے نہ دیکھ سکے گا۔ سب سے فرداً فرداً میری طرف سے
معافی مانگ لینا۔ اچھا خدا حافظ۔ تمہاری للّی

اور پھر یہ خط ختم کرتے ہی سب [illegible] کی آنکھیں
نمناک ہو گئیں [illegible] معلوم ہو گیا تھا کہ ہم سب لوگ
مجرم ہیں گنہگار ہیں [illegible]

[illegible]

ساری دنیا کو فتح کرنے کا جذبہ بیدار ہوا تھا۔ عیش و عشرت کی زندگی سے باہر آ کر اس نے نہایت سنجیدگی سے اپنے اس جذبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر غور کیا۔ اور چند ہی لمحوں بعد وہ تائیس کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ تائیس آئینہ کے سامنے بیٹھی بن سنور رہی تھی۔ آئینے ہی میں اس نے سکندر کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ سکندر کا چہرہ شاداب تھا۔ آنکھوں میں عزم کی جھلک نمایاں تھی۔ قریب پہنچتے ہی سکندر نے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس سے مخاطب ہوا۔

"تائیس میں نے ساری دنیا پر فتح حاصل کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ سب سے پہلے میں ایران کے بادشاہ دارا پر فتح حاصل کروں گا۔ میں تمہیں کسی بھی حالت میں خود سے الگ نہیں کر سکتا۔ میری خواہش ہے کہ تم بھی میرے ساتھ رہو۔"

تائیس یک بیک اٹھ کھڑی ہوئی اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، جیسے انگارے دہک رہے ہوں۔ اور پھر اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کی سرخی بڑھ رہی تھی اور اعصاب کا تناؤ شدت اختیار کر چکا تھا۔ اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ کر تائیس صرف اتنا کہہ سکی ۔۔۔ "اگر آپ ایران پر فتح حاصل کرنے جا رہے ہیں تو یقیناً میں آپ کا ساتھ دوں گی۔"

سکندر چلا گیا تو تائیس اپنے پلنگ پر لیٹ گئی مخملی بستر میں کروٹیں بدلتی رہی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی تصویریں رقص کر رہی تھیں۔ جتنی شدت کے ساتھ اس کے جذبات انڈ رہے تھے وہ محسوس کر رہی تھی کہ چبھن بڑھ رہی ہے۔

تائیس نے اپنے ذہن میں ایران کے دریائے پلوار کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی کی جھلک دیکھی۔ اس نے دیکھا کہ اس بستی کے مشرق میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے۔ جہاں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ اس نے بچپن گزارا ہے۔ ماں باپ بہن بھائی اور قبیلے کے دوسرے لوگ ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے اور وہ بے اختیار رو پڑی۔ سسک سسک کر روتی رہی۔ کئی سال گزر جانے کے بعد آج پہلی بار اس نے اپنی غمناک زندگی کی پُرنم داستان پر آنسو بہائے تھے، سسکیاں بھری تھیں۔

دریائے پلوار کے کنارے واقع اس بستی میں زیادہ تر ماہی گیر رہتے آباد تھے۔ ان کے علاوہ ایک یونانی قبیلہ بھی آباد تھا۔ جو اپنے ملک سے جلاوطن ہونے کے بعد یہاں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ اس قبیلے کے مرد جنگجو اور جفاکش تھے اور عورتیں نہایت نازک اور حسن و جمال میں لاثانی تھیں۔ ایران کے کئی قبیلوں کے سرداروں نے بارہا یہ کوشش کی تھی کہ وہ اس قبیلے کی خوبصورت عورتوں کو اپنے حرم میں داخل کر لیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ نزدیک کی شاہپ نامی ایک ایرانی بستی کے سردار گرزدار نے بھی ایسی ہی کوشش کی تھی اور جب اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس یونانی قبیلے کا دشمن ہو گیا۔ ہر وقت وہ کسی ایسے موقع کی تاک میں رہتا جب اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکے۔ ہر لمحہ انتقام کی آگ اس کے سینے میں تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

اور ایک روز گرزدار اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

آسمان شفق کی تجلیوں سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ پہاڑ کے دامن میں شفاف پانی کا چشمہ رواں تھا۔ سرسبز و شاداب پیڑ پودوں اور درختوں نے جیسے چشمے کو اپنے آنچل میں سمیٹ رکھا تھا۔ ماحول میں ایک ایسا سکوت طاری تھا جو روح کو تسکین بخشتا ہے۔ اس سکوت کو یا تو پرندوں کے چہچہانے کی سریلی آوازیں توڑ رہی تھیں یا چشمے کا پانی چھوٹے بڑے پتھروں کے سینے سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہا تھا۔ نہایت دلکش و مسرور کن منظر تھا۔ یونانی قبیلے کی دو نوجوان دوشیزائیں ۔۔۔ تائیس اور بخترا اس چشمے سے پانی بھرنے کے لئے آئی تھیں۔ لیکن ایک بڑے سے پتھر پر ساتھ ساتھ بیٹھی وہ جانے حسین خیالوں کی کس دنیا میں پہنچ گئی تھیں۔

اور جبھی ایک اجنبی نوجوان کو وہاں موجود پا کر وہ دونوں چونک گئیں۔ یہ نوجوان ایرانی قبیلے کا سردار گرزدار ہی تھا۔ جو تائیس اور بخترا کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک ایک درخت کی آڑ لے کر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ انہیں عالم محویت میں دیکھ کر گرزدار جب درخت کی اوٹ سے باہر آیا تو اچانک ہی دونوں کی نظریں اس پر پڑیں۔ تائیس چیخ مار کر ایک طرف بھاگی لیکن گرزدار نے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو دیکھ کر بخترا جہاں تھی وہیں پتھر سی ہو کر رہ گئی۔ گرزدار کا قہقہہ ماحول کے سکوت کو توڑتا ہوا اس ویران وادی کے اطراف میں پھیل گیا۔ تائیس اب گرزدار کی مضبوط گرفت میں تھی اور بخترا کھڑی کانپ رہی تھی۔ گرزدار نے بخترا کی طرف قہر سے نگاہیں پھینکیں اور اس سے مخاطب ہوا۔ ایک مدت سے میرے سینے میں انتقام کی آگ جل رہی ہے

آج تم دونوں کو پاکر اسے ٹھنڈک سی پہنچ رہی ہوگی۔ آج اس بے عزتی کا بدلہ لے لیا جب تمہارے قبیلے کے سردار نے میری درخواست کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔

گزدار کا ایک اور قہقہہ بلند ہوا۔ تائیس اور بجز کے جسم لرز گئے۔ گزدار نے تائیس کو اپنے کندھے پر ڈال لیا اور گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھتا ہوا بجز سے مخاطب ہوا: "لڑکی اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو کچھ ہی فاصلہ پر کھڑے میرے آدمی تمہاری بوٹی بوٹی نوچ ڈالیں گے۔" اور وہ آگے بڑھ گیا۔ بجز کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور خوف سے اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ گزدار جب وہاں سے رخصت ہوا تو تائیس اور بجز سے اس نے کہا "میں نے تم دونوں سے ایرانی سردار کی توہین کا بدلہ لیا ہے۔"

رات کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ سکوت اور بھی گہرا اور خوفناک ہو گیا تھا۔ تائیس اور بجز کے چہرے زرد تھے۔ جیسے خون کی ایک بوند بھی جسم میں نہ ہو۔ دونوں سسک سسک کر رو رہی تھیں۔

تائیس اور بجز نے جب تمام داستان اپنے قبیلے کے سردار کو سنائی تو قبیلے کے تمام لوگوں کا خون ابل اٹھا۔ انہوں نے اسے اپنے قبیلے کی عورتوں کی بے حرمتی ہی نہیں بلکہ اسے یونان کی غیرت پر حملہ تصور کیا۔ اور اسی روز انہوں نے گزدار کی بستی شاہسپ پر حملہ کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے خون کی ندیاں بہا دیں۔ لیکن جیسے ہی یہ خبر علاقہ میں پھیلی فوراً ہی دوسرے ایرانی قبیلوں کی طرف سے گزدار کو کمک پہنچ گئی۔ اور اس ایک یونانی قبیلے پر کئی ایرانی قبیلوں نے حملہ کر دیا۔ یونانی قبیلے کے خیمے جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ ایک ایک کر کے سب مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ عورتوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ گزدار اور دوسرے ایرانی قبیلوں نے بہت سی خوبصورت عورتوں کو اپنے پاس رکھ لیا اور باقی تمام ایک بڑے سوداگر کو فروخت کر دی گئیں۔

تائیس اور بجز کسی طرح ایرانی قبیلوں کے سرداروں کی نظر سے بچ کر ان عورتوں کے ساتھ جا ملی تھیں جنہیں فروخت کر دیا گیا تھا۔ سوداگر کئی ممالک سے ہوتا ہوا یونان کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ یونان پہنچا تو اس کے پاس تائیس اور بجز ہی رہ گئی تھیں کیونکہ یہ دونوں دوشیزائیں نہایت خوبصورت تھیں۔ اس لئے سوداگر ان کی بڑی سے بڑی قیمت وصول کرنا چاہتا تھا۔

ایک دن ایتھنز کے بارونق بازار میں یونانی سوداگر نے تائیس اور بجز کو فروخت کر دیا۔ اسے منہ مانگی قیمت مل گئی تھی۔ بجز کو ایک امیر رئیس نے خریدا تھا اور تائیس کو ازکوبیا نامی ایک یونانی طوائف نے حاصل کر لیا تھا۔

ازکوبی یونان کی ایک مشہور طوائف تھی اور مقدونیہ کے دربار تک اس کی رسائی تھی۔ تائیس کے عوض بہت بڑی رقم دینے کا اسے کوئی افسوس نہ تھا کیونکہ اس کی حسن شناس نگاہوں نے ایک ہی نظر میں تائیس کے بے مثال حسن کی قیمت و اہمیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ تائیس کی بدولت وہ بے پناہ شہرت و دولت حاصل کر سکے گی۔

اور ہوا بھی یہی۔ ازکوبی نے تائیس پر دل و جان سے محنت کی اور اپنے فن کے سارے گر اسے سکھلائے۔ تائیس انتہائی خوبصورت تھی۔ بناؤ سنگھار نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ اب حسن کی جلوہ گری اور ناز نخرے میں تائیس کا جواب نہ تھا۔ ازکوبی کو اسی دن کا انتظار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے یونان میں تائیس کی شہرت پھیل گئی۔ اس کے یہاں یونان کے مشہور فوجی جرنیل، مدبر، رؤسا اور امراء آنے لگے۔ اور تائیس اس نئی زندگی میں اپنے آپ کو مطمئن سی محسوس کرنے لگی۔ ایک طرح سے سارا یونان اس کا گرویدہ ہو چکا تھا۔

اور جب مقدونیہ کے دربار میں تائیس کے حسن کی شہرت گونجی تو سکندر بے اختیار ہو اٹھا۔۔۔ اور اب تائیس صرف سکندر ہی کی ہو کر رہ گئی۔ وہ جب بھی تائیس کا قرب حاصل کرتا اس کی نشیلی آنکھوں میں جھانک کر کہتا۔ "تائیس نہ جانے تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے کہ دل مضطرب کو تمہارے بغیر ایک لمحہ کے لئے بھی قرار حاصل نہیں۔" اور تائیس کا فرادا کے ساتھ مسکرا دیتی۔۔۔ دلآویز مسکراہٹ ہی سکندر کے سوال کا جواب ہوتی۔ اس طرح تائیس اپنی زندگی میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی اس مقام تک پہنچ چکی تھی جس کا اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ وہ سکندر کی صرف منظور نظر کنیز ہی نہ تھی اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر وہ خاص مقام حاصل کر چکی تھی جو صرف ایک محبوبہ ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

نرم و گداز مخملی پلنگ پر کروٹیں بدلتی ہوئی تائیس اپنے ماضی کے جھروکوں میں جھانک رہی تھی۔ جب سے اس نے سکندر کی زبان سے یہ سنا تھا کہ وہ ایران پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو رہا ہے اور اسے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے تب وہ بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر رقصاں تھا جب ایرانی سردار گزدار نے اسے اور بجز کو اپنی ہوس کا شکار بنایا تھا۔ وہ اپنے تصور کے آئینہ میں وہ منظر دیکھ رہی تھی جب گزدار اور دوسرے ایرانی قبیلوں نے اس کے قبیلے کے لوگوں کا قتل عام کیا تھا۔ معصوم بچوں کے جسموں کو

بیٹوں کی لاش سے محروم کر دیا تھا، جہاں عورتوں کی بے حرمتی کی تھی اور قبیلے کی
عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کر دیا تھا۔ نہ جانے ان کا کیا حشر ہوا
ہوگا؟ بہزاد اور بجز کی یاد آتے ہی تائیس فرط بیقراری سے تڑپ تڑپ اٹھی۔ وہ
کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟ ایسے ہی سوالات اس کے ذہن پر کاری ضرب
لگانے لگے اور ......

اور تائیس یکایک بھڑک اٹھی۔ اس کا سارا جسم کانپ اٹھا، لرز اٹھا
اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔ چہرہ تمتمانے لگا اور دل کی دھڑکنیں
تیز تر ہو گئیں۔ اس کے ذہن کا تناؤ شدت اختیار کرتا گیا۔ اس وقت وہ
ایک بپھری ہوئی شیرنی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کانوں میں صرف یہی ایک آواز
گونجتی محسوس کر رہی تھی۔

"ظالموں سے انتقام لینے کا یہی وقت ہے ــــ انتقام ــــ
انتقام ــــ انتقام؟"

اور دوسری صبح کو سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی سکندر اپنی
فوج کے ساتھ ایران کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تائیس اس کے ہمراہ تھی۔

سکندر کی فوجوں نے جدھر کا بھی رخ کیا فتح و نصرت نے اس کے قدم
چومے۔ ایران کی فوجوں کو پے بہ پے شکستیں دیتی ہوئی سکندر کی فوجیں ایران
کی جانب پیش قدمی کرتی گئیں۔ سکندر نے اربیل اور شام پر قبضہ کر لیا۔ اس
کے بعد شوستر پر بھی سکندر اعظم کا قبضہ ہو گیا اور پارس میں جو فیصلہ کن جنگ
ہوئی اس میں یونانیوں نے ہمیشہ کے لئے ایران کی سلطنت کو کمزور بنا دیا۔

تائیس جنگ کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور تلف ہونے والی
ہر ایرانی زندگی اس کی روح کو تسکین عطا کرتی۔ اس کا جذبۂ انتقام تسکین محسوس
کرتا اور پُر وقار انداز میں ایرانی لاشوں کے انباروں پر یوں نظر پھینکتی ہوئی
آگے بڑھ جاتی جیسے یہ زندگیاں موسم خزاں میں اڑتے ہوئے خشک پتے ہوں
سلطنت ایران پر اپنی قوت و عظمت کا سکہ جمانے کے بعد سکندر نے
بربریت و بہیمیت کا مظاہرہ کیا۔ یونانی فوج بھی سکندر سے پیچھے نہیں رہی۔
یہ سب تائیس کی نظروں کے سامنے ہو رہا تھا۔ ایک عورت کی موجودگی میں
ہزاروں عورتوں کی بے حرمتی ہو رہی تھی۔ بے شمار زندگیاں موت کا شکار
ہو رہی تھیں۔ اور تائیس اس سے اپنے جذبۂ انتقام کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔
اس رات قصر صد ستون میں سکندر اعظم نے جشن طرب منعقد کرنے
کا حکم صادر فرمایا۔ جشن میں مغنیوں اور رقاصاؤں کا زمزمہ و رقص [illegible] کیا گیا
قصر میں چاروں طرف عیش و طرب کا دور دورہ تھا۔ تائیس بھی سکندر اعظم کے قریب
ہی جلوہ افروز تھی۔ امراء و عمائد شراب ارغوانی کے جام نوش کر رہے تھے۔
اس وقت سکندر بھی نشے میں تھا۔ تائیس یہ سب دیکھ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں
میں شراب کی سی مستی نہیں تھی۔ اب بھی انتقام کی آگ کے شعلے لپکتے محسوس ہو رہے
تھے۔ سکندر کی نشیلی نگاہوں نے جب تائیس کا جائزہ لیا تو اس نے محسوس کیا
کہ تائیس کا حسن اور بھی نکھر گیا ہے۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا اور بے قابو ہو کر
اس نے تائیس کو اپنی گرفت میں لے لینا چاہا۔ تائیس یک بیک جھٹکے سے الگ ہو گئی اور
سکندر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا "ہوش میں آؤ"
لیکن سکندر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس وقت وہ سکندر اعظم نہیں ایک عام انسان
بن کر رہ گیا تھا۔ شراب میں اس کی عقلیت تحلیل ہو چکی تھی۔ سب سے بے بس ہو کر تائیس نے
تخلیہ کا حکم دیا۔

اور دوسرے ہی لمحہ قصر خالی ہو چکا تھا۔ وہاں صرف سکندر اور تائیس
ہی رہ گئے تھے۔ تائیس نے دیکھا کہ سکندر کے جذبات اس وقت شدت اختیار کر
چکے ہیں اور پورے طور پر وہ اس کے زیر اثر ہے۔ اپنے جذبۂ انتقام کو ٹھنڈا کرنے
کا یہ سنہری موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ سکندر کی گردن کے گرد
اپنے دونوں بازو حائل کرتے ہوئے اس نے بڑی ادا سے کہا۔

"میری ایک خواہش ہے۔ کیا تم اسے پورا نہیں کرو گے؟"

"کیوں نہیں، صرف تمہارے حکم کی دیر ہے۔" سکندر نے لڑکھڑاتی سی
آواز میں جواب دیا۔

"تو میں اخشیارش کے بنائے ہوئے اس عظیم الشان [illegible] یونانیوں
کو آگ کے سرخ شعلوں میں نہاتے دیکھنا چاہتی ہوں؟"

"بس؟" سکندر نے کہا۔

"نہیں!" تائیس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میری خواہش
ہے کہ تمام قیدیوں کو میری نظروں کے سامنے تہ تیغ کر دیا جائے۔"

"اور کوئی خواہش؟" سکندر نے پوچھا۔

"ہاں ایک خواہش اور ہے۔ اس شہر کو تباہ کر دیا جائے۔ اخشیارش
کے جلتے ہوئے محل میں ہی انہیں پھینک دیا جائے۔ [illegible] ان
کا نام و نشان باقی نہ رہے۔" (باقی صفحہ [illegible] پر)

سرور جمال

طنز و مزاح

مصیبت ہے طنز نگار کی بیوی ہونا

• سُنا تھا ـــــ سہاگ رات بہت رومان پرور اور رنگین ہوتی ہے۔ حسن و عشق اور پیار محبت کی باتیں دہرائی جاتی ہیں یا اُن کا آغاز ہوتا ہے ـــ لیکن مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ میں ایک بہت بڑی ادیبہ ہوں اور میرا انٹرویو لیا جا رہا ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک عالمانہ اور فاضلانہ سوال۔ ادھر اپنی یہ حالت کہ زندگی میں امتحان پاس کرنے کے مواقع تو بہت آئے۔ لیکن قابلیت کا علم تو ممتحن کو یا اس عالم الغیب ہی کو ہوگا۔

یاد نہیں آ رہا ہے کہیں پڑھ رکھا تھا یا سُن لیا تھا کہ ڈاکٹر، شاعر اور فلاسفر سے کبھی شادی نہ کرنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ گھر اور خاندان میں اس قسم کے شوہروں کی بیویوں کے حشر دیکھ دیکھ کر خود بخود یہ بات دماغ میں بیٹھ گئی ہو۔

آپ جانئے کہ اپنا ملک اس تیزی کے ساتھ شاعر، ڈاکٹر اور انجینئر پیدا کر رہا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ اور نہ جانے کیوں والدین کو ڈاکٹر اور انجینئر اس قدر پسند ہیں کہ شہر کے کھاتے پیتے گھرانوں کی ہر تیسری لڑکی کی شادی کسی ڈاکٹر یا انجینئر سے ہوتی ہے مگر شوہروں میں پھر بھی بڑی تعداد شاعروں کی ہوتی ہے۔ لیکن شاعروں کے ساتھ ٹریجڈی یہ ہے کہ شاعری کا شمار کسی "کوالی فکیشن" میں نہیں۔ اس لئے ان بے چاروں کا شاعر ہونا ان کی شادی کے کارڈ سے ظاہر نہیں ہوتا۔ حالانکہ کچھ عقلمند تو آپ کے شاعر اپنے تخلص کو جلی حروف میں چھپوا کر اس کی اطلاع ہر خاص و عام کو دے دیتے ہیں۔

میرے والدین بھی عام والدین کی طرح کم از کم ڈاکٹر کو ضرور پسند کرتے تھے لیکن میں نے جب بھی سُنا کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ میرے بار بار کے انکار سے گھر والے کافی پریشان ہو چکے تھے۔ لہٰذا بات جب ادیب تک پہنچی تو مجھے اقرار کرنا پڑا۔ اس زمانے میں ادیبوں کے چہرے، حلیئے اور صورت کے علاوہ مجھے کسی طرح کا خطرہ یا اندیشہ نہ تھا۔ مگر جب معلوم ہوا کہ ادیب کے ساتھ ساتھ مزاح نگار ہیں اور خوش شکل بھی ہیں تو سوچا ٹھیک ہے آئندہ زندگی ہنستے کھیلتے گزر جائے گی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں ـــ تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ ـــ یا شاید میرے بار بار انکار کرنے کی وجہ سے گھر والوں سے زیادہ قدرت کو تاؤ آگیا تھا۔ چنانچہ اس نے کافی غور و فکر کے بعد ایک ایسا منصوبہ تیار کیا کہ ساری اگلی پچھلی کسر نکال لی۔ اور مجھے ایک ایسی ہستی کے ساتھ وابستہ کر دیا کہ جن میں ہر تینوں کے اوصاف کوٹ کوٹ کے بھرے ہوئے ہیں۔ یعنی بے پناہ مصروفیت کے اعتبار سے اگر وہ ڈاکٹر ہیں تو تخیلات کی دنیا میں گم رہنے کی وجہ سے شاعر اور بُھلکڑ پن میں بڑے سے بڑے فلاسفر کو بھی مات دیئے ہوئے ہیں۔

سنا تھا سہاگ رات بہت رومان پرور اور رنگین ہوتی ہے۔ حسن و عشق اور پیار و محبت کی باتیں دہرائی جاتی ہیں یا ان کا آغاز ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ یادگار رات کبھی نہ بھولنے والی رات ہوتی ہے ـــ تو خیر یہ رات یادگار تو ضرور تھی اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے ناقابلِ فراموش ایک لڑکی کے لئے بڑا CRITICAL MOMENT ہوتا ہے۔ اور میرے لئے بھی تھا لیکن اس لئے نہیں کہ ایک انجان شخص سے میری پہلی ملاقات تھی بلکہ اس لئے کہ ایک بہت ہی جید نقاد سے سابقہ پڑا تھا

مجھے تو بس ایسا لگ رہا تھا کہ میں ایک بہت بڑی ادیبہ ہوں اور میرا
انٹرویو لیا جا رہا ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک عالمانہ اور فاضلانہ سوال
ادھر اپنی حالت یہ کہ زندگی میں امتحان پاس کرنے کے مواقع تو بہت آئے
لیکن قابلیت کا علم تو ممتحن کو یا اس عالم الغیب ہی کو ہوگا۔ ہم تو بس اتنا
جانتے ہیں کہ گیس پیپرز، "شیور سکسیس"، "ریڈ میڈ اینڈ ڈائجسٹ"،
شارٹس نوٹس، اور گولڈن کی ٹاٹ پٹ کے نوٹس، اور "کی" رٹ رٹ کر
اپنی قابلیت اور ہمہ دانی کا سکہ غریب ممتحن اور گھر والوں پر جماتی رہی
اور وہ بے چارے مرعوب ہو کر ہمیں پاس کرتے اور ہم ڈانٹ رہے —
لیکن امتحان میں رٹ رٹ کر کامیاب ہونا اور بات ہے۔ اور شاعری ادب
سیاست اور فنون لطیفہ کے تمام پہلوؤں پر اپنی پسندیدگی اور رائے
کا اظہار کرنا دیگر بات ہے۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ کی اور نوٹس ہی سے ہی
میں سوئفٹ، مارک ٹوین، شا، ہارڈی، کیٹس، پوپ، شیلے، شیکسپیر
وغیرہ وغیرہ کے نام سے آشنا تھی۔ اور فردوسی، سعدی، اقبال وغالب کے
ساتھ ساتھ موجودہ دور کے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں بھی تھوڑی
بہت واقفیت ضرور ہے۔ لیکن بات صرف مغربی و مشرقی ادیبوں اور
ادب تک ہی رہتی تو غنیمت تھا۔ لیکن وہاں تو مارکس اور لینن سے لیکر
رسل اور شوپنہار تک پر سوالات پوچھے جا رہے تھے۔ سوشلزم،
کمیونزم، مارکسزم اور نہ جانے کس "ازم" پر باتیں۔ موجودہ سیاست
آزاد شاعری اور تجریدی آرٹ تک پر تبادلہ خیال کے متمنی۔ لیکن خدا بھلا
کرے ہمارے رسم و رواج کا کہ دلہن کو گونگی اور بہری بنا کر سسرال بھیجا
جاتا ہے۔ بس دلہن کی شان بھی اسی میں ہوتی ہے کہ وہ بہری بنی، چھوئی
موئی اور مٹی کی مورت بنی رہے۔ اس کے لئے ہنسنا بولنا تو دور کی بات ہے
نظر اٹھا کر دیکھنا بھی جگ ہنسائی کا باعث ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس روایتی
شرم و حیا نے اپنی لاج بھی رکھ لی۔ اور اس کٹھن اور پُرپیچ امتحان سے
میں بخیر و خوبی گزر گئی۔

مزاح نگار ہونے کا اتنا فائدہ تو ضرور ہے کہ گھر ہمیشہ زعفران
زار بنا رہتا ہے۔ لیکن کوئی انصاف سے کہے کہ جب کسی کے سر میں درد
ہو، پیٹ کے درد میں مبتلا ہو یا بخار نے انجر پنجر ڈھیلے کر رکھے ہوں اور
اسے چٹکلوں اور لطیفوں کی "ڈوز" پر "ڈوز" دی جائے تو اس تکلیف

اور درد میں کہاں تک افاقہ ہو سکتا ہے۔ دوا اور دوا بھی حکیموں کے قول
کے مطابق کڑوی دوا ہی مرض کو جلد دور کرتی ہے۔ (اور اسی لئے میں
بھول کر بھی کبھی طبیبوں کی دوا استعمال نہیں کرتی) تو پھر یہ شکر اور
قہقہوں میں گھلے لطیفے کیا کام کریں گے۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ دو
چار لطیفے سنانے کے بعد پوچھا جائے گا کہ اب تو درد کم ہو گیا یا بالکل ہی دور
ہو گیا ہوگا۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ لطیفے یا مزاحیہ باتیں کوئی جادو
کے منتر ہیں کہ جنہیں سنتے ہی درد اڑن چھو ہو جائے۔
کہتے ہیں ایک تو کریلا کڑوا دوسرے نیم چڑھا۔ (حالانکہ مجھے ایسا
کریلا کھانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا) ایک تو موصوف ادیب دوسرے
صحافی۔ یعنی ایک نہ شد دو شد۔ ان کی ہر بات ہمیشہ ایک اہم خبر ہوتی ہے
اور اس میں ایڈیٹرانہ مبالغہ آرائی ضرور ہوگی۔ کیونکہ خبر کو چٹ پٹا بنانے
کے لئے نمک مرچ ضرور لگانا پڑتا ہے۔
ایک دن آپ باہر سے آئے اور آتے ہی خبر سنائی کہنے لگے۔
"بڑی بُری خبر ہے"۔ اور میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ خدا خیر کرے بس
پر کیا حادثہ گزر گیا۔ آج ہی گھر سے خط آیا ہے۔ یہاں شام تک سب اچھے
بھلے تھے۔ دل بلیوں اچھل رہا ہے...... ہمت کر کے ایک ایک کی خیریت
پوچھ ڈالی۔ اور جہاں تک کسی کے ساتھ کسی بُری خبر کو وابستہ کرنے کا
امکان ہو سکتا تھا وہ بھی پوچھ ڈالا۔ ادھر سے ٹھنڈی سانس بھر کر
جواب ملتا ہے۔
"کیا کہوں۔ میں نے اپنی نئی کتاب تمہارے نام معنون کی تھی۔
مگر کم بخت پبلشر نے وہ صفحہ ہی صفحات کی کمی کی وجہ سے نکال دیا۔"
میں لا حول پڑھ کر رہ گئی۔ ادھر جان نکل گئی اور ان کے نزدیک
کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور "بدذوقی" کا جو طعنہ ملا وہ الگ۔
یہی نہیں ایک بار نائٹ ڈیوٹی سے لوٹے۔ رات کے دو بجے
مجھے سوتے سے جگایا۔ اور میرے جاگتے ہی ایٹم بم چھوڑ دیا۔ "آج میرے
ساتھ بہت بڑی ٹریجڈی ہو گئی۔" اور میں اچھل کر بستر سے زمین پر آ
پڑی۔ "ہائے اللہ کیا ہوا؟ کوئی ایکسیڈنٹ تو نہیں ہو گیا؟ نصیب
دشمناں کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آ گئی۔" لیکن ادھر سے جو جواب ملا
یہ میری جان ہی تو جل گئی۔ بڑے اداس لہجے میں ارشاد ہوتا ہے

"کیا بتاؤں ..... مزاح نگاروں پر جو مضمون لکھا ہے اس میں میرا نام ہی نہیں دیا" — اب بتائیے سر پیٹ لینے والی بات ہے یا نہیں۔ روز تو کوئی نہ کوئی آپ کا نام لیتا ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی نام لینا بھول گیا تو کونسی قیامت آگئی۔ آئے دن کی ان کی یہ ٹریجڈیاں اور بری خبریں سنتے سنتے میں بھی اس کی عادی ہو چکی ہوں۔ لیکن کبھی کبھی میرے ساتھ بھی یہ ٹریجڈی ہو جاتی ہے کہ ان کی زبان سے کوئی بری سے بری خبر سنکر بھی اس کی اہمیت پر دھیان نہ دینے کی وجہ سے رشتہ داروں کی لعنت ملامت کا شکار بن جاتی ہوں۔

بات اگر صرف ان کے مزاحیے، نکاہیے، انشائیہ اور مضامین پڑھنے تک رہتی تو ایک حد تک گوارا بھی تھا۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ ان کے دوستوں یا پھر دوستوں کے دوستوں تک کی تخلیقات کا پڑھنا ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی ہے۔ اور پڑھ لینے کے بعد اس پر باقاعدہ تبصرہ اور تنقید کرنے کی تیاری بھی کرنی پڑتی ہے۔ ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ اگر کسی مشہور ادیب سے ملنا ہے تو کم از کم اس کی دو ایک کتابیں، چار پانچ مضامین، افسانے یا منتخب نظمیں اور غزلیں پڑھ لینا ان کے نزدیک ضروری ہوتا ہے۔ ایک بار موصوف نے صبح صبح الٹی میٹم دیدیا کہ شام کو ..... صاحب کے یہاں چلنا ہے۔

"بھلا یہ کون صاحب ہیں؟" میرا یہ پوچھنا گویا اپنی شامت کو خود بلانا تھا۔ نہایت متفکر ہو کر بولے۔

"حد ہو گئی۔ یعنی کہ تم انہیں تک نہیں جانتیں۔ بھئی بہت بڑے ادیب ہیں۔ درجنوں کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ میرے بک شیلف میں ان کے نئے افسانوں کا مجموعہ رکھا ہے۔ اسے شام تک ضرور پڑھ لینا"

شام کو جب ان جیسا فسانہ نگار صاحب کے یہاں پہنچے تو بدقسمتی سے کتاب کا نام ذہن سے اتر گیا۔ رجی لگا کر پڑھا ہوتا تو یاد بھی رہتا) غالباً "جاگتے سپنے" یا "سوتے ارمان" ٹائپ کا کچھ نام تھا۔ لہٰذا دوران گفتگو جب ان کے ادبی کارناموں پر بات چلی تو میں نے بھی ان کے پرتکلف ناشتے کا حق ادا کرنے کے خیال سے کہا۔

"جناب مجھے آپ کی کتاب "سوتے جاگتے" کا۔ بس قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔"

"جی!"

ادھر ان کے منہ سے ایک لمبی سی "جی" نکلی ادھر انہوں نے گھور کر دیکھا۔ میں بالکل گڑبڑا گئی اور دل ہی دل میں کتابوں کے ان شاعرانہ بلکہ فلمی ناموں پر لاحول پڑھتے ہوئے بولی۔

"اوہ! وہ کیا نام تھا بھلا سا۔ غالباً "سوتے ارمان"؟"

لیکن انہوں نے جلدی سے صحیح نام لے کر معاملہ کو سنگین ہونے سے بچا لیا۔ اور اس کے بعد ان کے کسی افسانے کی تعریف یا تضحیک کرنے کی ہمت کس میں تھی۔ لہٰذا میں افسوس ہوا کہ ان کے ناشتے کا حق ادا نہ کرسکی۔

پھر دلچسپ بات تو یہ ہے کہ فلاسفر ہیں تو نہیں لیکن بھلکڑ ہونے کی حد تک ضرور فلاسفر ہیں۔ یعنی ان کو کبھی یہ خبر نہیں ہوتی کہ کس کی چیز میرے یہاں آگئی اور کس کے یہاں میری چیز مل گئی۔ انہیں کبھی یہ یاد نہیں رہتا کہ کب کس کے یہاں جانا ہے اور کس کو کس وقت اپنے یہاں بلانا ہے —

شامت اعمال سے باہر جاتے ہوئے اگر ان سے کوئی چیز منگالی جائے تو بس سمجھ لیجئے کہ قیامت شاید جلد آجائے لیکن وہ چیز قیامت تک نہ آئے گی۔ کتنی شامیں اور کتنی صبحیں اس کا وعدہ کرتے گزر جائیں گی۔ اور پھر رفتہ رفتہ نہ تو وہ چیز یاد رہے گی اور نہ اپنا وعدہ۔ اتفاق سے اگر سڑک پر راستے میں یا کسی کافی ہاؤس یا ریسٹورنٹ میں دو چار دوست مل گئے تو بس سمجھ لیجئے کہ انہیں یہ بھی یاد نہ رہے گا کہ اس شہر میں اپنا کوئی گھر بھی ہے۔ سفر پر جانا ہے تو کبھی ٹوتھ پیسٹ بھول جائیں گے کبھی شیو کا سامان یا ضرورت کی کوئی اور چیز۔ ظاہر ہے کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ مجھے تو بس یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کسی دن مجھے بھی نہ بھول جائیں۔

ایک مزاح نگار کے لئے بگڑنا، خفا ہونا یا تکلیف و مصیبت میں گھبرانا اس کی شان میں بٹہ لگنے کے مترادف ہے۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ اگر خود خفا نہیں ہوتے تو دوسروں کو بھی خفا ہونے نہیں دیتے۔ نہ خود کسی پر خفا ہوں گے نہ کسی دوسرے کو غصہ کرنے دیں گے۔ یعنی کہ آپ لاکھ کسی بات پر ان سے بگڑیے خفا ہوئیے

رہتے لیکن وہ تو بس مسکرا کر ہی دم لیں گے۔ اس لئے ان کی عادتوں پر
تھما سبھلا کہنا۔ بگڑنا یا غصہ کرنا بالکل بے کار ہے۔

گھر میں اگر ایک ادیب اور وہ بھی مزاح نگار موجود ہو تو
ظاہر ہے کتنا پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہوگا۔ کیونکہ اب تک
کے تجربات نے تو یہی ثابت کیا ہے کہ کسی سے کوئی غلطی ہوئی ہو یا
اس کی سیدھی سادی باتوں میں یا حرکتوں میں کہیں سے بھی مزاح
کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ اگلے ماہ وہ چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا۔ مجھے
تو نہیں یاد پڑتا کہ اپنے اور دوستوں کو تو چھوڑئیے شناسائوں
میں سے بھی شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب ہوگا جو اُن کی مزاح نگاری
کی زد میں نہ آیا ہو۔ پھر اس مزاح نگاری میں کتنی حقیقت ہوتی
ہے اور کتنا مبالغہ یا تو" وہ "خود جانتے ہیں یا ان کا" شاہکار"

لیکن اتنا تو میں بھی ضرور جانتی ہوں کہ ان کے سامنے کی بات کا انجام
ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی سے کم نہیں ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب
تک ان کی نگاہ کرم مجھ پر نہیں پڑی ہے۔ لہٰذا اپنی جان بھی ہر وقت
سولی پر رہتی ہے کہ خدا جانے اس غریب کی کب کوئی ادا یا بات پسند
آ جائے اور میں بھی ان کا تختہ مشق بن کر ان ستم زدوں کے زمرہ میں
آ جاؤں۔ پھر کیوں نہ ڈروں اس سے جس شخص نے" اندیشۂ شہر"
میں موٹے ہونے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اور جس کا کام ہی نت نئے" ستم"
ایجاد کرنا ہے۔ اس سے کہاں تک نہ ڈرا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے
کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

تائیس ـــ صفحہ ـــ ۴۰ کا بقیہ

اور دوسرے ہی لمحہ سکندر اعظم نے تائیس کی خواہش کے مطابق حکم دیا
تائیس کی موجودگی میں تمام قیدیوں کا سر قلم کر دیا جائے۔ خشیارش کے تمام
ایوانوں کو نذر آتش کر دیا جائے اور قیدیوں کی لاشوں کو لپکتے شعلوں کی نذر
کر دیا جائے۔

تائیس کے روبرو ہزاروں انسانی زندگیاں تہ تیغ کر دی گئیں۔ صدہا
سال کی شاہان عجم کی بے بہا دولت، خشیارش کے عظیم الشان و خوبصورت
ایوان جل رہے تھے۔ ان میں سے سُرخ شعلے لپک رہے تھے اور ایک عورت کے
جذبہ انتقام کی گرمی ان شعلوں سے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ ان جلتے ہوئے ایوانوں
میں انسانی جسم بے رحمی سے پھینکے جا رہے تھے۔ اور انتقام کی آگ میں جلتی
ہوئی ایک عورت کا دل ایک لمحہ کے لئے بھی نہ تڑپا۔ اور دنیا کو ہلا دینے والا، تمام
عالم پر اپنی قوت و شجاعت کا سکہ جمانے والا سکندر اعظم ایک حقیر انسان کی طرح
اپنی محبوبہ کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ (ہندی سے ترجمہ)

مشہور مغربی مفکر ہنری ڈبلیو لینگ کا قول ہے کہ۔

خوشی، احتیاط اور سکون انسان کو ڈاکٹروں سے بے نیاز
کر دیتے ہیں۔ کتنا ناسمجھ ہے وہ انسان جو اتنے آسان
اور سستے نسخہ سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔

بہت سے نالائق لڑکوں سے ایک لائق لڑکا کہیں اچھا ہے بالکل اس چاند کی طرح جو تنہا اندھیرے کو دور کر دیتا ہے
جب کہ سارے ستارے مل کر بھی اندھیرا دور نہیں کر سکتے۔

بغداد کی چاندنی یروشلم کی دھوپ

> آخر مجھے خود بندرگاہ کی کسٹم پر پہنچنا پڑا۔ جہاں اور سوالات کے بعد اس سوال سے واسطہ پڑا۔
>
> **بچہ کہاں ہے**
>
> صرف بچہ والی ماں ہی لا سکتی ہے۔ میں اسے لانے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔ اگر آج میں ماں نہیں ہوں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کل کو بھی نہیں ہوں گی۔
>
> میرے اس جواب پر چکرا کر افسر نے فوراً گاڑی میرے سپرد کر دی۔

"ضربِ کلیم ملی کہاں جا کر" دورانِ سفر اتنے واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ اتنے لوگ ملتے ہیں اور زندگی اس قدر متنوع ہو جاتی ہے کہ اگر ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر لکھا جائے تو ایک طویل الف لیلیٰ تیار ہو جائے۔ لوگ عموماً ذاتی تجربوں اور احساسات کے بجائے تاریخی حوالے زیادہ پسند کرتے ہیں اس لئے الف لیلیٰ تیار کرنے سے پیشتر کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ تاریخی حوالوں کے لئے بھی ہوشمندی کی ضرورت ہے۔ ذرا خیال بھٹکا اور ذہن سے سب کچھ نکل گیا۔ سو میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ کئی شہر مشرقِ اوسط کے ایسے ہیں کہ جن کا ایک ایک گلی کوچہ ذہن میں ہے۔ حالت یہ ہے کہ میں لاہور اور پشاور میں راستے بھول کر بھٹک سکتی ہوں لیکن بغداد اور دمشق میں نہیں۔ ان شہروں کے شمال جنوب، مشرق مغرب کچھ بھی اجنبی نہیں۔ لیکن فلسطین میں عجیب معاملہ ہوا۔ معلوم نہیں مزارات کا ردِعمل تھا یا غلیلیہ کے مجاوروں کی بد دعاؤں کا اثر کہ یروشلم میں سب کچھ گڈمڈ ہو گیا۔ اب فلسطین کا بھی کوئی گوشہ نہ چھوٹا۔ لیکن ان کو یاد کرنے پر بھی بعض

سڑکوں اور گلیوں کے نام یاد نہ رہ سکے۔ ہوٹل داؤد کے لئے یاد رہا کہ اسرائیلی یروشلم میں ہے۔ کسی نے بطورِ خاص اشارہ کر کے کہا تھا۔ "وہ جو عمارت دیوارِ یروشلم سے جھانکتی نظر آتی ہے دراصل وہاں کا مشہور ہوٹل ہے۔ اس ہوٹل میں بال روم ناچ بھی ہوتا ہے۔ اسرائیلیوں کے دل میں اپنے شہر کا بالکل احترام نہیں۔ توبہ توبہ۔" لیکن دیوارِ یروشلم سے کئی عمارات نظر آتی ہیں۔ جن میں کوئی مزار بھی شامل ہے۔ جس کا نام میں یاد نہ رکھ سکی۔ ان عمارات اور مسجد اقصیٰ پر آخری نظر ڈال کر میں نے تمام مقامات ذہن میں سمیٹنے کی کوشش کی۔ کیونکہ بدقسمتی سے میری سیاہی کی بوتل بالکل خشک ہو چکی تھی۔ اور پنسل کھو چکی تھی اور میں فلسطین کے متعلق کوئی بات بذریعہ تحریر محفوظ نہ کر سکی تھی۔ یوں بھی بغداد سے نکلے ڈیڑھ ماہ ہو چکا تھا۔ اور صحرائے عرب، چٹانوں، پہاڑوں اور سمندروں نے ذہن اور جسم دونوں کو ہی بہت طرح تھکا دیا تھا۔ یروشلم کی دھوپ رنگ [illegible]

[illegible] میں ہونے لگی تھی۔ اب تو جی یہی چاہتا تھا بس فوراً بغداد پہنچ کر وہاں کی چاندنی میں اطمینان کا سانس لیں۔ یروشلم میں مزید قیام ناممکن ہو گیا تھا۔ خلیلیہ سے واپسی کے دوسرے ہی روز صبح ۱۰ بجے منزل کے لئے نکل پڑے۔ یروشلم پیچھے ہٹتا جاتا تھا لیکن دھوپ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس دھوپ میں وہی گرمی اور تیزی تھی جو لندن کی سرد فضاؤں میں ٹیرسا کی دوستی میں تھی۔ ٹیرسا یروشلم سے دُور تل ابیب کے ایک خوشنما اور حویلی نما گھر میں رہتی تھی۔ باپ کی بیماری نے اس حویلی کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ٹیرسا کا آخری خط جو مجھے ملا آنسوؤں سے بھرا تھا اور اس میں باپ کی لاعلاج بیماری' کاروبار کی بربادی اور تلاش ملازمت کا ذکر تھا۔ اور یہ خط مجھے اس زمانہ میں ملا تھا جب کہ میری اماں موت کو شکست دے کر از سرِ نو زندگی میں آئی تھیں۔

یہ عجیب معاملہ ہے کہ ٹیرسا کا باپ عین اسی روز بیمار پڑا تھا جس روز میری اماں۔ وقت بھی مختلف مقامات کے مختلف انسانوں پہ ایک ہی انداز میں کیسے بیت جاتا ہے۔

میری لندن کی تعلیم اور تعلیم پہ باپ کا خرچ کردہ سرمایہ سب غارت گیا۔ کاروبار ختم ہونے کے بعد مجھے ملازمت کرنا پڑی لیکن تنخواہ ضروریاتِ زندگی کے لئے ناکافی ہے۔ میں دوسری ملازمت کی تلاش میں ہوں۔ اسرائیل میں تنخواہیں زیادہ نہیں ملتیں۔ ٹیرسا نے لکھا تھا۔ پھر اس کا کوئی خط نہیں آیا۔ اللہ جانے اس لڑکی کا کیا حشر ہوا۔

جب ہم یروشلم سے کافی دور نکل آئے تو اچانک یاد آیا کہ حضرت موسیٰ کا مزار بھی تو یہیں کہیں یروشلم سے باہر ہی ہے۔ وہاں بھی جانا چاہیے لیکن ڈرائیور ہمارے اس ارادہ پہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ پریشان تھا کہ ہمیں حضرت موسیٰ کے مزار کا پتہ کس نے دیدیا۔ وہ تو اسرائیل میں واقع ہے۔ اور بچہ زائرین تو بی بی مریم کے مزار سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ ہم نے ایک ایک گلی کوچہ چھان مارا تھا۔

"اے۔ اے' ڈرائیور صاحب۔ بی بی مریم تو خود ہمارے گھر میں موجود ہے۔ ہماری اماں کا نام مریم ہے۔ اور وہ بی بی مریم کی مانند نیک اور صابر ہیں۔ بی بی مریم کا ذکر تم چھوڑو۔ اور یہاں اسرائیلیوں کا کہنا ہے کہ برطانیہ نے جان بوجھ کر حضرت موسیٰ کا مزار مسلمانوں کو دکھ اشتعال [illegible] ناپید کر دیا ہے۔

اللہ غارت کرے برطانیہ اور اسرائیل کو۔ دونوں کذب و افترا سے کام لیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کا مزار تو اپنے مقام پہ بخیر و عافیت ہے۔ لیکن میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ علاقہ ممنوعہ ہے"۔ اقرار کے ساتھ ڈرائیور انکار بھی کر گیا۔ لیکن ہمارا کہنا تھا کہ یہودیوں اور جاسوسوں کے لئے ممنوعہ علاقہ ہے۔ ہمارے لئے نہیں۔ ڈرائیور گھبرا رہا تھا لیکن مجبور ہو کے لے گیا اور موٹر کافی فاصلہ پہ روک دی۔ اور ہم کپڑوں سے گرد جھاڑتے خاردار جھاڑیوں سے الجھتے مزار تک پہنچ ہی گئے۔ میں یہ بتانے سے یقیناً گریز کروں گی کہ یہاں کس مملکت کے لوگ تھے۔ اور ان کی شخصیت کیا تھی۔ بہرحال یہاں جو بھی تھے بے حد خلیق اور جاذبِ نظر تھے۔ اپنی بدحالی کے باوجود بے حد مہمان نواز تھے۔ انہوں نے فوراً قہوہ تیار کر کے ہمیں پیش کیا۔ اور فلسطین کے اس صحرا میں بغداد کے ڈرائنگ روم کا لطف آ گیا۔ اس پہ بھی ان حضرات کو افسوس تھا کہ خاطر خواہ خاطر نہ کر سکے۔

سیاہ قہوہ اور دلچسپ باتوں کا دَور ختم ہوا تو کچھ لوگوں نے مزارِ موسیٰ پہ آزادیِ فلسطین کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ لیکن جب مغربی اقوام مسئلہ فلسطین کو کوئی مسئلہ ہی تسلیم نہیں کرتیں تو یہ ہنگامے اور جھڑپیں' دعائیں اور گھروں سے دُور موہوم امیدوں کے سہارے وقت گزارنا کیا؟ حضرت موسیٰ کے عصا نے تو ہتھیار کی صورت اختیار کر لی تھی جو اسرائیلی حدود کے جوانوں کے پاس بھی تھے۔ اور مزارِ موسیٰ پہ بیٹھنے والوں کے پاس بھی۔ لیکن ایک مدت تک یہ لوگ محض اللہ کے بھروسے پہ بغیر ہتھیار ہی مقابلہ کرتے رہے تھے۔ ضربِ کلیمی کا تصور ہی ان کے ارادہ کی مضبوطی کا باعث تھا۔

مزار کلیم اللہ پہ ہمارا قیام مناسب نہ تھا۔ لہٰذا سب کو خدا حافظ کہہ کر پھر سفر شروع کیا۔ وہی صحرا اور تیز دھوپ تھی اور بغداد تک چوبیس گھنٹوں کا سفر تھا۔

"نفرت کا سفر"

ڈرائیور کو بھی بغداد پہنچنے کی اس قدر خوشی تھی کہ زور زور سے گا رہا تھا۔ اور بلا وجہ ہارن بجا رہا تھا۔ [illegible] کے عالم میں اس نے موٹر ایک بستی میں روک دی۔ اگر ہم اسے موٹر روکنے کے لئے کہتے تو یقیناً بڑبڑا کر سر پکڑ لیتا۔ دیہات کی اس بستی میں دیہاتی خواتین تالیاں

بجا رہی تھیں اور مرد رزمیہ ناچ ناچ رہے تھے۔ غالباً کسی لڑکے کی ختنہ ہوئی تھی۔ عرب کے اس مخصوص رزمیہ ناچ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سربراہ مملکت بھی بلا امتیاز شریک ہو سکتا ہے۔ اس ناچ میں کچھ افراد ایک دوسرے کے بائیں ہاتھ تھام کر داہنے ہاتھوں میں تلواریں پکڑتے ہیں اور پھر ایک ساتھ قدم اٹھا کر تلواریں ٹکراتے ہیں۔ قدموں کی تھاپ اور تلواروں کی جھنکار ایسا تاثر دیتی ہے جس کی وضاحت آسان نہیں۔

ہماری موٹر رکی تو عورتوں اور بچوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں اپنے ہجوم میں شرکت کی دعوت دی۔ لیکن اس ہجوم میں شمولیت کا مطلب تین چار گھنٹے ضائع کرنا تھا۔ لہٰذا موٹر سے ہی ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گئے اور عمان پہنچ گئے۔ لیکن قیام کے بجائے تمام شہر کا چکر کاٹ کر دمشق کا راستہ اختیار کیا۔ موٹر اب ستر کی رفتار سے چل رہی تھی۔ لہٰذا جب دمشق پہنچے تو یروشلم کی دھوپ بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اور شام کے سائے زمین پر اتر رہے تھے۔ وہی آشنا و مانوس دمشق اپنی بھرپور رعنائیوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے پھیلا تھا۔ خلاف معمول یہاں کی فضا میں انتشار کے بجائے امن و امان ہی تھا۔ ورنہ یہیں جہاں کبھی کئی حکومتوں کے تختے الٹتے اور خون خرابے ہی دیکھے۔ استنبول اس قدر ٹھنڈا اور پُرامن شہر ہے۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو قبرص کے ہنگاموں نے تمام ترکیہ کو ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اور ترکی عوام کو ننگے پاؤں انگاروں پہ چلا دیا تھا۔

یہ بات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی کہ استنبول میں قدم قدم پہ نفرت کا سامنا کرنا پڑا۔ نفرت کا پہلا حادثہ تو اس وقت پیش آیا جب کہ میں نے استنبول کی زمین پہ قدم دھرا۔ اور سرکیجی کے سٹیشن پہ اتری تو اپنی ساتھیوں سمیت عرب ہونے کے الزام میں سٹیشن سے باہر کر دی گئی۔ اور جب ہم سٹیشن کے کسی ویٹنگ روم کے بجائے باہر ایک فٹ پاتھ پہ سامان سمیت کھڑے اپنے دوسرے ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے جو ہوٹل کی تلاش میں سرگرداں تھے تو ٹریفک پولیس نے یہ کہہ کر فٹ پاتھ سے اٹھانا چاہا کہ ہماری وجہ سے نقضِ امن کا خدشہ ہے۔ تین نا تجربہ کار لڑکیوں کی وجہ سے نقضِ امن کا خدشہ؟

دمشق کے ماحول میں تناؤ اور ہیجان نہ تھا۔ البتہ ہماری موٹر میں انقلاب ضرور آ رہا تھا۔ وہ بچہ جو لبنان سے نکلتے بار آٹھ ماہ کا تھا اور اب ساڑھے نو ماہ کا ہو رہا تھا اپنی ماں سمیت زور و شور سے رونے لگا تھا۔ انکشاف ہوا کہ بچے کے پر نکل آئے ہیں۔ اور پر دیکھنے کے لئے ہم سب موٹر میں بھونچال لے آئے۔ بچہ کی کلائی پر بی بی مریم کے مزار کا سبز دھاگا بندھا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ دھاگے کی تاثیر سے پر نکل آئے ہیں اور یہ بچہ بھی بڑا ہو کر عرب کا کوئی مشہور ولی یا امام ثابت ہوگا۔ اس زمین پہ تو آئے دن لوگ پیغمبری اور امامت کا دعویٰ کرتے پھرتے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں کرکوک کے ایک شخص کاظمہ ثور نے پیغمبری کا دعویٰ کیا اور کہا کہ قبیلے کے تمام لوگ اپنی عورتیں اور مویشی کاظمہ ثور کے حوالے کر دیں۔ ورنہ ان پہ اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔ قبیلہ تو کسی قہر کا نشانہ نہ بنا البتہ کاظمہ ثور پہ عدالت شرعیہ کا عتاب نازل ہوا اور وہ جیل میں پہنچ گیا۔ اور باہر نکلنے کے لئے اپنے پر نکلنے کا انتظار کرتا رہا۔

"اماموں اور ولیوں کے پر نہیں ہوتے۔ پر تو محض فرشتوں کے ہوتے ہیں۔" کسی نے اظہار خیال کیا۔ اور بچہ کی ماں جھنجھلا اٹھی۔ اس بچہ کے پر نہیں بلکہ دانت نکل رہے تھے۔ دانتوں اور پروں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لہٰذا مایوس ہو کر بچے کے دانت ہی گننے کی کوشش کی۔ تو بچہ پہلے سے زیادہ چلانے لگا۔ اور ماں ہمیں کوسنے لگی۔ بچہ کے دانت نہیں نکل رہے تھے بلکہ چوٹ لگنے کی وجہ سے گنے چنے چار دانتوں میں ایک ہل رہا تھا۔ اور شاید گرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس صورت حال نے ہوٹل سے سامان لے کر سفر جاری رکھنے کے بجائے شب وہیں گزارنے اور بچوں کی ماں کو دانتوں کا ڈاکٹر تلاش کرنے پہ مجبور کر دیا۔ وہ تو ڈاکٹر کے پاس چلی گئی اور ہم نے دمشق کے اسی قدیم و یادگار بازار یعنی سوق الحمیدیہ میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس بازار کی ایک دکان پر بڑے خوبصورت و نفیس جھاڑ فانوس لٹک رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ ان کو خرید لیا جائے۔ لیکن اس قدر نازک شیشے اٹھا کر کون اٹھائے پھرے۔ اور اگر کراچی لاتے تو کسٹم ڈیوٹی سے زیادہ افسران کے سوالات مار ڈالتے۔ لندن سے پہلی مرتبہ اپنی بہن کے نوآمدہ بچہ کے لئے ایک پرمبولیٹر بک کروا آئی تھی۔ کراچی کسٹم بچہ گاڑی چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ آخر مجھے خود بندرگاہ کی کسٹم پہ پہنچنا پڑا۔ جہاں پہلے تو اس سوال سے واسطہ پڑا کہ "زرمبادلہ" کہاں سے آیا؟ جواب میں فراق

بلکہ کے ماحقات پیش کر دیئے تو سوچ سوچ کر افسر متعلقہ نے یہ نکتہ نکالا کہ یہ گاؤن تو صرف بچّہ والی ماں ہی لا سکتی ہے۔ میں تو اسے لانے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔

"اگر آج میں بچہ والی ماں نہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ کل کو بھی نہیں ہوں گی!" میرے اس جواب پہ چکرا کر کسٹم افسر نے گاؤن فوراً میرے سپرد کر دی۔ اور خود عورتوں کی بے باکی پر تقریر فرمانے لگے۔

دمشق کے جھاڑ فانوس ہمارے بس کا روگ نہ تھے۔ لہٰذا دل پہ جبر کر کے دوسری دکان کی طرف بڑھ گئے۔ جہاں سبز آنکھوں والی ایک حسینہ نظر آئی۔ لڑکی سے دوستی کرنے ہم بھی دکان میں داخل ہو گئے۔ چند خواتین ایک جگہ جمع ہو جائیں تو نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ لڑکی کا منگیتر یا منکوحہ وہاں آ گیا ورنہ خلیلیہ کے مجاور کی مانند دمشق کا یہ تاجر بھی ہمیں بد دعاؤں سے نوازنے لگتا اور لذت کے سفر کی استنبول تا خلیلیہ اور خلیلیہ تا دمشق کوئی انتہا نہ رہتی۔

(باقی آئندہ)

پلاسٹک بم —— صفحہ ۱۵ کا بقیہ

کی فوج نیک آئی اور ہٹلر کو جتنی امداد ملنے لگی۔ اور ہملر و گوئرنگ وغیرہ ہٹلر کے پاس پہنچ گئے۔ ہٹلر کو جب علم ہوا کہ سب رسائل منقطع ہیں تب یہ ہم ہوا اور فوراً بحالی کا حکم دیا۔ اس وقت گوئبلز کا فون آیا اس نے بتایا کہ میجر ریمر اسے گرفتار کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اسے یقین ہے کہ ہٹلر مر چکا ہے! ہٹلر نے فوراً میجر ریمر کو حکم دیا کہ وزارت جنگ جو باغیوں کا گھونسلہ ہے اسے گھیر لو۔ میجر ریمر نے جب ہٹلر کو بولتے سنا تو باغیوں سے الگ ہو گیا اور ہٹلر کے حکم کی تعمیل میں چل کھڑا ہوا۔

جبکہ اس دوران میں چھوٹے آفیسروں نے حالات بگڑتے دیکھے تو بغاوت کر دی اور بڑے باغی جرنیلوں کو دیوار سے لگا کر بے دست و پا کر دیا اور قید کر دیا اس اندرونی انقلاب کے نتیجے میں جنرل فردم کو آزادی مل گئی جس نے آزاد ہوتے ہی باغی جرنیلوں کا کورٹ مارشل کیا اور انہیں شوٹ کرا دیا محض اس لئے کہ ان جرنیلوں سے خود اس کی نیم شرکت کا راز نہ کھل جائے اس طرح اس نے اپنی جان بچائی۔ جب کرنل اسٹفو فن برگ کو گولی ماری جا رہی تھی تب اس نے آخری بار کہا "او وطن مادر وطن! میں مر رہا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا وطن زندہ رہے گا...!"

رات ہٹلر نے ریڈیو پہ غضبناک تقریر کی اور باغیوں کے لئے بھیانک انتقام کا اعلان کیا۔ ہٹلر کا اعلان محض اعلان نہ تھا بلکہ اس نے جو دھمکی دی اس پہ عمل بھی کیا اور سب سے پہلے نزلہ جنرل فردم پہ گرا جس نے بہ عجلت باغی جرنیلوں کا کورٹ مارشل کیا تھا۔ جنرل رومل کو زہر پینے پہ مجبور کیا گیا انکار کی صورت میں اس کے خاندان کو بھی ختم کر دینے کی دھمکی دی گئی لہٰذا اپنے خاندان کو بچانے کے لئے جنرل رومل نے زہر پی لیا۔ امیر البحر کیناریس کو جیل کی کوٹھڑی میں اذیتیں دے کر مار دیا گیا جنرل ہونپر اور اس کے تمام ساتھیوں کو سر عام پھانسیاں دے دی گئیں روسی محاذ پر ہٹلر کے انتقام سے بچنے کے لئے ٹریکاڈا اور دوسرے جرنیلوں نے خودکشی کر لی۔ پچاس چوٹی کے جرنیلوں کو فنا کر دیا گیا۔ اور ہزاروں نچلے درجہ کے آفیسروں کو ایذا دے دے کر ختم کر دیا گیا۔ ان کی بیگمات نے خوفزدہ ہو کر خودکشی کر لی اور ان تمام بہیمانہ مظالم کی فلمیں لی گئیں جنہیں ہٹلر کے مستقر اس کی تفریح طبع کی خاطر بھیج دیا گیا۔!

بیس جولائی کے پلاسٹک بم کے حادثے اور بعد کے خوفناک انتقام نے جرمنی کی بنیادیں ہلا دیں۔ خود ہٹلر بھی خوفزدہ رہنے لگا۔ زخمی ہاتھ کے رعشے روکنے کے لئے وہ دونوں ہاتھ زیادہ تر لپیٹے رہنے لگا اور اس کے طرز عمل میں تبدیلی آ گئی اس کی چیخیں کم ہو گئیں اور غصہ مدھم پڑ گیا۔ یہی نہیں اس کا اعتماد ہر ایک پر سے اٹھ گیا اس کو ذرا سی مخالفت یا بری رپورٹ میں گہرے معنی اور چھپے راز نظر آنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کی حقیقی تصویر الٹ گئی اور رفتار جنگ کا اندازہ بالکل غلط ہو گیا۔

سچ تو یہ ہے کہ پلاسٹک بم سے اگرچہ ہٹلر فوری طور پہ مر نہ سکا لیکن زندہ رہنے کے باوجود معنوی طور پہ وہ مر چکا تھا اس طرح پلاسٹک بم نے جو کام ادھورا چھوڑ دیا تھا وہ بعد میں مکمل ہو گیا اور جس نے صرف جرمنی ہی سے وفا نہیں کی بلکہ ساری دنیا پر بھی احسان کیا تھا۔!!

اردو غزل میں متانت آفرینی

ذیل میں ہم جناب شبنم رومانی کا ایک طویل مکتوب مضمون کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ ہم اس مضمون سے متفق نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارا یہ ادعا ہے کہ متانت اور عدم متانت ہر شخصیت کا جزو ہے لیکن اسے آج تک ادب میں اس طرح کبھی تقسیم نہیں کیا گیا ہے کہ کچھ لوگ متانت آفرینی کے علمبردار بن جائیں اور باقی غیر متین شاعروں کی صف میں جمع کر دیے جائیں۔ ہمیں توقع ہے کہ دوسرے ممتاز انشا پرداز بھی اس موضوع پر اظہار خیال فرمائیں گے۔ (ادارہ)

دسمبر کے "الشجاع" میں مجلہ جناح کالج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:۔ "کالج کے ایک استاد اور مجلہ کے مدیر اعلیٰ کا مضمون "اردو غزل میں متانت آفرینی کی روایت" ایک الجھا ہوا مضمون ہے۔ متانت اور عدم متانت ہر شخصیت کا جز ہے لیکن اسے آج تک ادب میں اس طرح کبھی تقسیم نہیں کیا گیا ہے کہ کچھ لوگ متانت آفرینی کے علمبردار بن جائیں اور باقی غیر متین شاعروں کی صف میں جمع کر دیے جائیں — وہ شاعر جو روایت شکنی کرتا ہے یا تجربے کرتا ہے بلند و پست مراحل سے گزرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے میر و غالب متانت کی کمی کے باوجود درد اور حالی سے بڑی شخصیتیں تھیں۔ درد۔ حالی۔ دل شاہجہاں پوری (معلوم نہیں آخر الذکر کو اردو شاعری میں یہ مقام کب ملا ہے) جیسی مختلف النوع شخصیتوں کو متانت کے خود ساختہ رشتے میں پرو کر فاضل مضمون نگار نے اتحاد بندی کی جو کوشش فرمائی ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔"

اس تبصرے میں جو کچھ متانت شعری کے متعلق کہا گیا ہے مجھے اس سے اختلاف ہے۔ ہر بڑے شاعر کی پہچان ہوتی ہے۔ جیسے فانی کا فلسفۂ غم، درد اور اصغر کا تصوف، جگر کی سرمستی، غالب کا تصوف، حالی کی قوم پرستی —— ان سب کا کلام اپنی اپنی دنیا لئے ہوئے ہے۔ سو یہ کہنا کہ ان میں سے ہر ایک کے ہاں کسی نہ کسی انداز میں تصوف، سرمستی، تفکر اور قوم پرستی موجود ہے۔ اس لئے کوئی ایک طرۂ امتیاز کسی کے ساتھ مخصوص نہ کیا جائے۔ تاریخ شعر و ادب سے ناواقفیت اور اصول تنقید سے انحراف ہے۔ درد، اصغر اور دل کی شاعری کا مجموعی طور پر تصوف کی شاعری ہے۔ تصوف علو خیال اور پاکیٔ نفس سے مشروط ہے اسی لئے ان تینوں شاعروں کے ہاں ایک پاکیزہ ماحول اور سنجیدہ فضا ملتی ہے یہ محبت کرتے ہیں مگر شرافت کے دائرے میں رہ کر، شکوۂ محبوب کرتے ہیں مگر احترام حسن کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ قرب دوست کی تمنا کرتے ہیں مگر جھجک

غالب کی عظمت

دھول دھپے میں یا میر کی بلندی اس کی امرد پرستی میں نہیں ہے۔ یہ تو ان کی شخصیت کے بہت کمزور پہلو ہیں۔ اصل میں فن آئینہ ہوتا ہے فنکار کا۔ جیسا فنکار ہوگا ویسا اس کا فن بھی ہوگا اور اگر ان دونوں میں ضد ہو تو وہ فن تصنع پر مبنی ہوگا۔

[illegible] تک نہیں پہنچے — یہ گوشت پوست کے انسان ہیں جیتے جاگتے ہوئے ہیں مگر ان کی رومانیت میں غیرتِ انسانی اور شرافت نسبی کے عناصر پوری طرح موجود ہیں۔ وہ لوگ جو چھچھورپن کو روایت شکنی سے ملتبس کرتے ہیں ممکن ہے ان کے نزدیک یہ لوگ خالص روایتی شاعر رہے ہوں مگر اہل نظر اور اہل الرائے جانتے ہیں کہ روایت ہزار پہلو رکھتی ہے اور روایت شکنی کے بھی ہزار پہلو ہو سکتے ہیں۔

دل شاہجہان پوری نے بھی روایت شکنی کی ہے۔ ان کا دور داغ و امیر کا دور تھا۔ داغ تو داغ ہی تھے مگر امیر جو طبعاً اور مزاجاً ثقہ تھے وہ بھی داغ کے تتبع سے نہ بچ سکے۔ "صنم خانۂ عشق" ان کے دامنِ عظمت پر داغ ہے۔ دل شاہجہان پوری مدرسہ امیر سے تعلق رکھتے تھے امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ مگر ان کی روش اپنے عہد سے تو الگ تھی ہی اپنے استاد سے بھی علیحدہ تھی۔

پوری اردو شاعری میں حالی، درد، اصغر، فانی اور دل اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ ان کا کلام ابتذال سے پاک ہے۔ حالی کی قوم پرستی اور فانی کی غم دوستی ان کی سنجیدہ کلامی کا سبب ہے۔ درد اور اصغر خالصتاً روحانی دنیا کے آدمی ہیں۔ مگر دل کی شاعری متصوفانہ فضا کے باوجود تغزل کی شاعری ہے۔ ان کے اشعار گرمیٔ جذبات سے دہکتے اور خوشبوئے بدن سے مہکتے ہیں۔ پھر بھی وہ "جوبن دیکھنے" کے مشتاق یا "پاؤں دبانے" کے متمنی نظر نہیں آتے — وہ "دھول دھپے" کے مرتکب ہوئے نہ انہوں نے کبھی "عطار کے لونڈے سے دوا لی"

وہ یقیناً رگوں میں خونِ گرم اور پہلو میں دھڑکتا ہوا دل رکھتے تھے — مگر "دھول دھپے" سے "وصال کے بعد محبوب کو آئینہ دکھانے" تک کے تمام درمیانی مراحل خالصتاً انفرادی افعال و تجربات ہیں۔ جن کا اظہار بے ادبی کے مترادف ہے۔ کیونکہ ادب زندگی کا نقال نہیں نقاد ہوتا ہے۔ بلکہ معیار ہوتا ہے۔ اور تغزل کی اساس اس جذبہ لطیف پر ہے جو حسن کو ننگا جسم بنا کر پیش کرنے کے بجائے اسے خیالوں کے رنگا رنگ لباس پہنا کر نئے نئے زاویوں سے ہمارے سامنے لاتا ہے۔ غالب کی عظمت دھول دھپے میں یا میر کی بلندی اس کی امرد پرستی میں نہیں ہے — یہ تو ان کی شخصیت کے بہت کمزور پہلو ہیں۔

اصل میں فن آئینہ ہوتا ہے فنکار کا — جیسا فنکار ہوگا ویسا ہی اس کا فن بھی ہوگا۔ اور اگر ان دونوں میں تضاد ہو تو وہ فن تصنع پر مبنی ہوگا — دل صاحب طبعاً متین و مہذب نیک طینت اور پاکباز تھے۔ اور ان کی شاعری ان سے الگ کوئی شے نہیں تھی — چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

حضرت دل کی متانت فطرت کے سبب ان کے کلام پر بھی متانت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ مقالہ نگار نے غزل میں متانت آفرینی کی روایت قائم کرنے والوں میں انہیں بھی شامل کیا تو بجا کیا — ظاہر ہے جو ادب کو ایک نقاد کی نظر سے دیکھے گا وہ اس میں ایک رشتہ ایک قدر مشترک تلاش کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ اسی تلاش کا نام تنقید ہے۔ چنانچہ اگر مقالہ نگار نے متانت آفرینی کا رشتہ تلاش کیا اور درد، حالی اور دل کو اس باب میں یکساں پایا تو یہ امر مستحسن ہے مضحک ہرگز نہیں۔ پھر دل شاہجہان پوری کے بارے میں یہ کہنا کہ "معلوم نہیں آخر الذکر کو اردو شاعری میں یہ مقام کب ملا ہے" اردو کے اکابر شعراء سے غفلت کے مترادف ہے۔ برمحل ہوگا اگر میں یہاں حضرت دل کی ادبی شخصیت اور شعری متانت کے بارے میں بعض برگزیدہ ہستیوں کی آراء کے اقتباسات پیش کروں:-

ڈاکٹر اقبال:- یوپی میں اصغر گونڈوی اور دل شاہجہان پوری کا کلام غنیمت ہے۔

صفی لکھنوی:- آپ کا کلام سلیم المذاقی کا بہترین نمونہ ہے۔ شعراء صفِ اوّل میں آپ کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔

آرزو لکھنوی:- ہندوستان کے بہترین غزل گو شعراء کی صف اول میں آپ کی ہستی مسلم ہے۔

فانی بدایونی:- آپ ایک لفظ سے شعر کو معراجِ کمال پر پہنچا دیتے ہیں۔

احسن مارہروی:- انہوں نے اپنے کلام میں عریاں گوئی سے یکسر چشم پوشی کی۔ اکثر جذباتی مضامین کو حقیقت کا لباس پہنایا۔ اسی صرف نے ان کی شاعری کو عام سطح سے بلند کر دیا ہے اور اسی حکمت بیان نے ان کی شاعری کو [illegible]

مرزا یگانہ :- حضرت دل کے سنجیدہ کلام اور حسن اخلاق کا میں پہلے بھی معترف تھا اور اب بھی ہوں۔ اور ان کو ایک معتبر سخنور سمجھتا ہوں ۔ وہ نہایت نیک اور پاکیزہ انسان ہیں اور شاعر کی حیثیت سے نہایت سنجیدہ اور متین صاحب فکر اہل فن ہیں۔

عبدالسلام ندوی :- کلام دل میں سب سے پہلے جو خصوصیت ذوق سلیم کے سامنے آتی ہے وہ متانت اور سنجیدگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب دل کا کلام ایک بڑے تاریخی دور کا نچوڑ ہے۔

مجنوں گورکھپوری :- دل صاحب کے یہاں دبستان امیر کی بعض عام خصوصیات کے علاوہ ایک دردمندی اور دل گداختگی بھی ہے جو متانت اور وقار لئے ہوئے ہے اور خلوص ان کی اپنی چیز معلوم ہوتی ہے۔

نیاز فتحپوری :- جناب دل کی متانت شعری کا تعلق ان کی متانت نظر سے ہے

علامہ الدین احمد :- ان کے یہاں معانی اور بندشوں میں اعتدال سے بہتر ہے۔ دونوں میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں

اختر علی تلہری :- دل صاحب سلجھے ہوئے صوفی ہیں۔ فطری طور پر متین واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری کے دامن پر ابتذال اور سوقیت کا دھبہ دکھائی نہیں دیتا۔ اردو غزل کی ترقی اور اردو غزل کا عروج انہیں جیسے بزرگوں کی سالہا سال کی عرق ریزیوں کا نتیجہ ہے۔

تاجور نجیب آبادی :- حضرت دل عہد حاضر کے ان مخصوص غزل گو اساتذہ سے ہیں جنہوں نے غزل کو نئی تقریب عطا کی ہیں۔

ان تمام بزرگوں کی واضح آراء کے بعد دل صاحب کی بلند ادبی شخصیت اور متانت شعری کے بارے میں کسی شک و شبہ اور مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ادب میں انسان دوستی —— صفحہ ۱۶ کا بقیہ

اقبال سے بہت کچھ لیا اور اس تصور کو اور آگے بڑھایا۔ ہمارے ادیب اور شاعر اپنے مرتبہ و منصب سے بخوبی واقف ہو گئے۔ ملک راج آنند سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم اور ڈاکٹر اشرف نے انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کر کے اس سمت میں ایک شعوری کوشش شروع کی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے موقعہ پر ۱۹۳۶ء میں خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے منشی پریم چند نے مندرجہ ذیل الفاظ کہے تھے :-

"جب ہماری نگاہ حسن عالمگیر ہو جائے گی جب ساری خلقت اس کے دائرہ میں سمٹ آئے گی ...... ہم صرف صفحۂ کاغذ پر تخلیق کر کے خاموش نہ ہو جائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اخلاق، خودداری اور انسانیت کا منافی نہ ہو۔"

پریم چند کے الفاظ گویا ایک طرح خود ان کے تصورات کے آئینہ دار ہیں تو دوسری طرف انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کی غرض و غایت کے بھی ترجمان ہیں۔ اس تحریک نے اردو کو اچھے ادیب، اچھے شاعر، اچھے افسانہ نگار، اچھے طنز نگار دیئے۔ ان شاعروں اور ادیبوں کے تصریحات و کائنات سے ممکن ہے کہ ہم کلی طور پر اتفاق نہ کریں۔ لیکن کم از کم ہمیں ان کے ادبی کارناموں کے اس حصّہ سے کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا جو انسان دوستی کے خالص جذبہ پر مبنی ہے۔

ہمارے شاعر و ادیب آج بھی وہی کام کر سکتے ہیں۔ آج بھی دنیا کو صلح و سلامتی اور امن و آشتی کی ضرورت ہے۔ اور آج بھی انسانیت اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ انسان دوستی، نیک خواہی، انسانی ہمدردی اور صلح کل کے عظیم اور سچے پیغام کو تازہ کیا جائے اور ہم محبت و شفقت کا مینہ برسا کر دلوں کی ان کھیتیوں کو سرسبز و شاداب کر دیں جو سوکھ چکی ہیں۔

گلریا کا آدم خور

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ تقسیم برصغیر سے دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ جم اپنے دوست ٹھاکر نبیر سنگھ کے علاقے میں شکار کھیلنے گئے۔ وہاں ایک آدم خور شیر کی اطلاع ملی۔ جس نے ایک بنجارے اور ٹھاکر صاحب کے گاؤں گلریا مہاراج پور کے ایک نوجوان گوالے کو مار دیا تھا۔ جم نے جب اس شیر کو تلاش کر کے مارنے کی کوشش کی تو ایک پراسرار مسلح گروہ کی سرگرمیاں علم میں آئیں۔ جس کا گڑھ اکبر آباد کے گھنے جنگلوں میں معلوم ہوتا تھا۔ اس انکشاف پر پولیس کے دستے جنگل میں پہنچ گئے اور چھان بین کرنے لگے۔ جم آدم خور شیر کو شکار کر کے واپس ہوئے تو سفر میں ایک پراسرار اینگلو انڈین کا ساتھ ہوا جس سے ناقابل فہم حالات میں لڑائی ہو گئی۔ اور وہ جم کو بری طرح زخمی کر کے ٹرین سے فرار ہو گیا۔ اس کے سامان سے ۷۵ بور کی ایک ایسی رائفل برآمد ہوئی جس پر نہ تو کوئی نمبر تھا اور بنانے والی فرم کا نام۔ جم نے اس پراسرار ہتھیار کا تعلق بھی اسی خفیہ گروہ سے سمجھا اور اس پورے معاملے میں انہیں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اینگلو انڈین سے اس معرکے میں وہ سخت زخمی ہو گئے۔ اور بہت دن ہسپتال میں رہ کر تبدیلی آب و ہوا کے لئے بھوالی چلے گئے جہاں ایک دن یہ انکشاف ہوا کہ اس پراسرار گروہ نے ان کے دوست ٹھاکر صاحب کو اغوا کر لیا ہے اور یہ شرط لگا دی ہے کہ جب تک اکبر آباد کے جنگل سے پولیس نہ ہٹائی جائے گی انہیں رہا نہیں کیا جائے گا۔ یہ خبر لے کر ٹھاکر صاحب کی بیگم خود نینی تال آئی تھیں۔ اور اس گروہ کی طرف سے اس سلسلے میں جو خط ملا تھا وہ بھی ساتھ لائی تھیں۔ یہ خط آر آر نامی خفیہ تنظیم کی طرف سے تھا۔ اپنے دوست کے اغوا ہو جانے کی خبر پا کر جم نے نینی تال میں ہی اپنے ایک اور دوست آغا صادق کی مدد حاصل کی جن کا حکومت اور سرکاری حلقوں میں بڑا رسوخ تھا۔ آغا صادق نے فوری طور پر گورنر سے احکامات جاری کرا دیئے کہ اکبر آباد سے پولیس واپس بلا لی جائے۔ اس حکم پر فوری عمل ہوا۔ جم کو آر آر کی طرف سے شکریے کا خط بھی ملا۔ لیکن ٹھاکر صاحب کو رہا نہیں کیا گیا۔ مجبور ہو کر جم نے گورنر سے استدعا کی کہ آر آر کا پتہ چلانے اور متعلقہ افراد کو قانون کی گرفت میں لانے کی خدمت ان کے سپرد کر دی جائے۔ گورنر نے آر آر کے بظاہر پراسرار اور پیچیدہ معمے کو حل کرنے کے لئے جم کی پیشکش منظور کر لی۔ اور انہیں پولیس کی ایک خاص برانچ کا کمشنر مقرر کر کے خاصے اختیارات تفویض کر دیئے۔ آر آر کی نظروں سے پوشیدہ رہنے کے لئے جم نے اپنی حادثاتی موت کا ڈھونگ رچایا اور خود آغا صادق کے پٹھان دوست عیسیٰ خان کے ساتھ سادھوؤں کا بھیس رچا کر جنگل اور پہاڑوں کے راستے اکبر آباد کے جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں انہوں نے سادہ لوح پہاڑی دیہاتیوں کا دل موہ لیا۔ ان کو بے دریغ روپیہ دیا ان کے قرضے ادا کر دیئے۔ اور ان کو اپنی مصنوعی بزرگی سے گرویدہ کرتے ہوئے یہ دونوں جب ایک پہاڑی جنگل سے گزر رہے تھے تو ایک آدم خور شیر سے مڈبھیڑ ہو گئی جو ایک انگریز نوجوان کی لاش کھا رہا تھا۔ جم نے شیر کو مار دیا اور اس انگریز کی لاش سے بعض خفیہ تحریریں برآمد ہوئیں۔ جم نے وائرلیس پر آغا صادق سے رابطہ قائم کر کے لاش اٹھائے جانے اور خفیہ تحریریں حکام کے سپرد کرانے کا انتظام کیا۔ اور خود آگے بڑھے۔ اور بالآخر بلند و بالا اور دشوار گزار پہاڑوں کے درمیان انہیں ایک پرانی طرز کی قلعہ نما عمارت نظر آئی جس میں مسلح افراد موجود تھے۔ ان دونوں نے ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر دیکھا کہ ایک اور مسلح انگریز گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا۔ اور پہاڑیوں کی طرف روانہ ہوا۔ جم کو بڑی تشویش ہوئی کہ یہ لوگ کون ہیں؟ ان کا اس انگریز

اشتہار

نوجوان کا کیا رابطہ ہو سکتا ہے جس کو آدم خور شیر نے ہلاک کیا تھا۔ ان سوالوں کا جواب صرف اسی صورت میں مل سکتا تھا کہ وہ انگریز جو گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑیوں کی طرف گیا تھا ان کی طرف آنکلے اور یہ جان پر کھیل کر اسے پکڑ لیں۔ اور اس طرح ایک ایک لمحہ گزرنے کے ساتھ ان دونوں کا اضطراب بڑھتا گیا اور یہ دونوں بے چینی سے آنے والے واقعات کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ گھوڑا سوار برآمد ہوا تو عیسیٰ خاں نے اسے گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے اپنا نام لیفٹیننٹ پرسیول بتایا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑے افسر نے اسے گرفتار کیا ہے تو اس نے اپنے بارے میں کچھ تفصیل سے نہیں بتایا۔ البتہ یہ ظاہر ہو گیا تھا اس کا تعلق آر آر آر کے گروہ سے ہے۔ اور اسی راز کے افشا ہو جانے کی وجہ سے اس نے اپنی انگوٹھی میں لگی ہوئی زہریلی سوئی سے خودکشی کر لی۔ پرسیول کی خودکشی سے معاملہ اور الجھ گیا۔ غور و فکر کے بعد آخر یہ طے پایا کہ عیسیٰ خاں ان گاؤں تک واپس جائے جہاں جم نے دادو دہش کا مظاہرہ کیا تھا اور وہاں کسی صورت سے آغا صادق سے رابطہ قائم کر کے ان کے توسط سے مزید ہدایات حاصل کر کے واپس آئیں۔ چنانچہ عیسیٰ خاں چلے گئے اور جم جونیئر اس کوٹھی کی نگرانی کرتے رہے۔ اس رات جم نے دیکھا کہ کوٹھی کی چھت سے سرچ لائٹ آسمان کی طرف پھینکی جا رہی ہے۔ اور ایک ڈکوٹا نیچی پرواز کر رہا ہے۔ اور آسمان و زمین کے درمیان چھاتے ہی چھاتے بھرے پڑے ہیں۔ جم نے جب غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ان چھاتوں کے ذریعہ سامان اتارا جا رہا ہے۔ ایک چھاتہ پہاڑی کے ڈھال پر گرا۔ زور کا دھماکہ ہوا۔ اور ایک بکس لڑھکتا ہوا ڈھال پر اُگی ہوئی ایک جھاڑی میں الجھ چکا تھا۔ جم نے جلدی سے نیچے اتر کر ٹوٹے ہوئے بکس کے سامان کو دیکھا اس میں اسٹین گنیں تھیں۔ جم نے جلدی سے ایک بنڈل اٹھایا اور اسے لے کر ایک جھاڑی میں چھپ گئے۔ چند منٹ بعد کچھ آدمی اس جگہ آئے اور بکھرا ہوا سامان چھاتہ میں رکھ کر روانہ ہو گئے۔ اچانک کچھ دور چل کر یہ آدمی رک گئے۔ ایک آدمی نے جھک کر سگرٹ کا وہ بچا ہوا ٹکڑا اٹھایا جو جم نے پی کر پھینک دیا تھا۔ اس کے بعد وہ جلدی جلدی ٹارچیں گھماتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ جم کئی گھنٹہ بعد آہستہ آہستہ پوشیدہ انداز میں سڑک تک واپس پہنچ گئے اور طے کیا کہ رات کو جنگل میں گھس کر کوٹھی تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت ساڑھے چھ بجے تھے۔ مکمل تاریکی میں ایک گھنٹہ کی دیر تھی اس لئے جم گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بانہوں میں سر چھپا کر بیٹھ گئے تاکہ اس طرح کچھ دیر آرام کر لیں۔ ٹھیک اس وقت پانچ ڈکوٹا طیارے فضا میں نمودار ہوئے اور ان میں سے چھاتہ بردار کودنے لگے۔ اسی لمحہ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور جنگل میں واقع قلعہ نما کوٹھی کھنڈر میں تبدیل ہو گئی۔ جم کو چھاتہ برداروں نے گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد جم کی ملاقات آغا صادق اور عیسیٰ خاں سے ہوئی تب پتہ چلا کہ سرکاری طور پر اس کوٹھی کا محاصرہ کیا گیا تھا۔ اس اقدام سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ پروگرام کے مطابق جم اور عیسیٰ خاں بریلی اسٹیشن آئے اور پلیٹ فارم پر بیٹھ گئے۔ جہاں ان کی ملاقات ایک انگریز لڑکی سے ہوئی۔

پھر کیا ہوا یہ اب پڑھیے

دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر سسکیاں لینے لگی۔

میں نے نظریں اٹھا کر اس کے ساتھی کی طرف دیکھا۔ سو وہ خاموش کھڑا تھا۔ متانت اور سنجیدگی کا پیکر۔ جیسے خاموش تھا۔ حیرت زدہ سا۔ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی مجھے اور کبھی اس سسکیاں بھرتی نوجوان انگریز لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔

"بیٹی، تمہارا اضطراب، تمہاری پریشانی برحق لیکن اس طرح بسرِ عام رونا دھونا اور اپنے دلی رنج و غم کا اظہار متانت اور سنجیدگی کی ان تمام روایتوں کے خلاف ہے جو تمہاری قوم کا تہذیبی شیوہ ہیں۔" میں نے بڑی نرمی سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

اس نے ایک گہری لمبی سی سانس لی۔ بلاؤز سے چھوٹا سا معطر دستی رومال نکالا اور آنکھیں خشک کیں۔ سنبھل کر بیٹھی۔ مجھ پر ایک نم آلود آنکھوں سے ایک بھرپور نظر ڈالی۔

"تو آپ پرسی کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ کہاں ہے وہ؟" اس نے سوال کیا۔

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم مجھ سے یہ سوال آج سے پہلے لکھنؤ کے امبیسڈر ہوٹل میں آکر پوچھو؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اورینٹ ہوٹل لکھنؤ پانچ دن بعد" وہ زیر لب بڑبڑائی۔
"کمرہ نمبر؟" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔
"ہوٹل کے منیجر سے پوچھنا کہ بابا جی کس کمرے میں ٹھہرے ہیں۔"
میں نے جواب دیا۔
"بس بیٹی اب تم جاؤ۔ تمہارے والد تمہاری ان کیفیات سے پریشان ہو رہے ہیں۔"

وہ اٹھتے اٹھتے ایک لمحے کو جھجکی۔ جیسے وہ کوئی فیصلہ کرنے والی ہو۔ پھر وہ میری طرف جھکی۔ اور دونوں ہاتھوں سے میرے گھٹنوں کو تعظیمی انداز میں چھوا، اٹھی۔ دو قدم الٹے پاؤں چلی۔ اس کا باپ آگے بڑھا اور اسے سہارا دے کر ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

مجمع نے ایک گہری سانس لی۔ عقیدت مند آنکھیں اس لڑکی کا پیچھا کرکے پلٹیں اور پھر مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر مجمع کو "آشیرواد" دی۔ اچانک مجمع سے گیروے کپڑے پہنے ایک نوجوان اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں اکتارہ تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ لمبی سی چوٹی تھی جو بائیں کان کی لو تک لٹکی ہوئی تھی۔ اس کان میں چاندی کا ایک لمبا سا بالا پڑا تھا۔ اس نے اکتارہ والا ہاتھ اٹھا کر ویٹنگ روم کی طرف اشارہ کیا اور اسی ہاتھ کی انگلی سے تار کو چھیڑتے ہوئے دوسرا ہاتھ اپنے کان پر رکھ کر ایک دم گانا شروع کر دیا۔

ہو او او او او وو و
جو یہ میں جانتی رے پیارے
کہ پریت کرے دکھ ہوئے
نگر نگر ڈھنڈورہ پیٹتی کہ پریت کرے نہ کوئے

اور پھر اس نے اپنی آواز بلند کی۔

لکڑی جلی کوئلہ بھئو رے پیارے
اور کوئلہ بھئو راکھ
میں پاپن ایسی جلی رے پیارے
کہ کوئلہ بھئو نہ راکھ
کہ کوئلہ بھئو نہ راکھ
کہ کوئلہ بھئو نہ راکھ

بولت کیوں ہم بولت ناہیں ہم، بولت ناہیں ہم۔ بم بولا آآآ۔
اور سارا مجمع بم بولا بولنے لگا۔۔۔۔۔

اور میں اس نوجوان سادھو کی روحانی عظمتوں اور باطنی بصیرت کا قائل ہو گیا۔ مجمع بڑھتا گیا۔ نوجوان سادھو جوش میں آ کر رقص کرنے لگا۔ کبیر اور تلسی داس کے دوہے پر دوہے پڑھے جانے لگے۔ بم بولا کی صداؤں سے اسٹیشن گونج اٹھا۔ اسٹیشن سے باہر کھڑے تانگے والے تک پلیٹ فارم پر آ گئے۔ بچے شور مچانے لگے۔ نوجوان سادھو کے ساتھ کئی اور بوڑھے اور جوان ان معرفتی گیتوں کے تال سُر اور گت نرت میں شامل ہو گئے۔ نہیں معلوم یہ مقدس محفل سماع کتنی دیر جاری رہتی کہ اچانک ریل کی کرخت سیٹی اور گڑگڑاہٹ کی آواز گونجی۔ لوگ جلدی جلدی میرے پاؤں چھو چھو کر سامان اٹھانے اور سوار ہونے کے لئے دوڑے۔ میں اور علیمی خاں وہیں بیٹھے رہے جلد ہی مجمع چھٹ گیا۔ چند لمحے بعد وہ انگریز لڑکی اپنے باپ کے ساتھ نکلی۔ میرے پاس ہوتی ہوئی گزری اور تقریباً بلند آواز میں کہتی ہوئی گئی۔ "پانچ دن بعد لکھنؤ کے اورینٹ ہوٹل میں۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بھی ان روحانی فیوض سے برکت پہنچانے کا اشارہ کیا جن سے میں خود محروم تھا۔ وہ دونوں ایک فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھے اور مسافر بھی ریل کے ڈبوں میں بھر چکے تھے۔ اور آدھے سے زیادہ لوگ کھڑکیوں سے سر نکالے میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ اچانک گارڈ نے سیٹی بجائی۔ انجن نے وسل دی۔ دھواں نکلا۔ گاڑی کے پہیے گھومے۔ مسافروں نے نعرہ مارا۔ پیلو مہاراج کی ۔۔۔ جے ۔۔۔ اور جیکاروں کی گونج میں وہ ریل گاڑی جہاں سادھو اور ان کے چیلے کو پلیٹ فارم پر چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

ریل کے جانے کے بعد بڑی دیر تک اس نوجوان سادھو کے گائے ہوئے دوہوں کی صدا کانوں میں گونجتی رہی۔۔۔۔۔ "جو میں جانتی کہ پریت کرے دکھ ہوئے۔ نگر نگر ڈھنڈورہ پیٹتی پریت کرے نہ کوئے۔"

میں اس دوہے کے معرفتی کو دل ہی دل میں دہرا رہا تھا۔ لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر اپنے عملے کے دو تین افراد

سامنے آیا اور بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔

"بابا کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟" اس نے بڑی لجاجت سے دریافت کیا۔

"پیلی بھیت۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ گاڑی پیلی بھیت جا رہی تھی۔ آپ اس سے کیوں نہ چلے گئے؟" اس نے پوچھا۔

"لوگوں کا ہجوم ہو گیا، ہم ٹکٹ نہ لے سکے۔" میں نے جواب دیا۔

"حضور کو ٹکٹ کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے کہا۔

مجھے ہنسی آگئی۔ روکنے کے باوجود مسکرانا پڑ ہی گیا۔

"ہم بلا ٹکٹ سفر نہیں کرتے۔ ٹھاکر بچہ۔ صاحب کے ساتھ جاؤ اور پیلی بھیت کے ٹکٹ لے آؤ۔"

عیسیٰ خان کشکول لے کر اٹھا اور اسٹیشن ماسٹر مرعوب ہو کر یا کچھ کچھ اس کے ساتھ بکنگ آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان کے ساتھی میرے سامنے بیٹھ گئے۔ اکڑوں بیٹھے میلی پتلونیں اور پرانی قمیصیں پہنے یہ بابو لوگ زمین پر پالتی مار کر بیٹھنے سے مجبور تھے۔ تعلیم یافتہ لوگ تھے یا نیم تعلیم یافتہ۔ کچھ بھی ہو ان کی مکمل یا غیر مکمل تعلیم نے ان کے اور میرے درمیان ہچکچاہٹ کی ایک دیوار کھڑی کر دی تھی۔ وہ کچھ کہنا اور سننا چاہتے تھے۔ مگر ان کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ وہ چپ چاپ بیٹھے مجھے دیکھتے رہے۔ اور میں دل ہی دل میں ان کے تذبذب پر ترس کھاتا رہا۔ شاید ان میں سے کسی نے مجھے اس انگریز لڑکی سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ اور شاید یہی وجہ ان کو کھینچ کر مجھ تک لے آئی تھی ورنہ ریلوے اسٹیشنوں پر مجھ سے مصنوعی اور اصلی فقرا سیدہ بزرگوں سادھوؤں اور جوگیوں کی ریل پیل رہتی تھی۔

"بابا آخر وہ لڑکی آپ سے کیا بات کر رہی تھی؟" آخر کار ان میں سے ایک شخص نے ہمت کر ہی لی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

وہ سہم کر چپ ہو گیا۔ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ پڑی۔ اتنے میں عیسیٰ خان اور اسٹیشن ماسٹر واپس آ گئے۔

"حضور پیلی بھیت کی اگلی گاڑی رات کے ساڑھے دس بجے جائے گی۔ آپ کے مریدنے ٹکٹ خرید لئے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ویٹنگ روم میں تشریف رکھیں۔" اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔

"نہیں۔ ہم یہیں بیٹھیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور کوئی خدمت میرے لائق۔ کچھ چائے پانی؟" اسٹیشن ماسٹر نے پوچھا۔

"شکریہ۔ خدا آپ کو اپنے فضل و کرم سے نوازے ہم فقیروں کو کچھ اور نہیں چاہیئے۔" میں نے جواب دیا۔

اسٹیشن ماسٹر کچھ دیر کھڑا رہا۔ اور پھر ادب سے سلام کر کے واپس ہو گیا۔ اس کے عملے کے افراد بھی اس کے ساتھ ہی چلے گئے بالکل ایسے جیسے بکری کے پیچھے اس کے بچے چلتے ہیں۔

ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔

میں نے عیسیٰ خان کو مودب بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود گھٹنے کھڑے کر کے ان پر سر رکھ کر سونے کی ناکام کوشش کے دوران گزرے ہوئے اور آنے والے واقعات پر غور کرتا رہا۔

پیلی بھیت جانے والی ٹرین دس بجے پلیٹ فارم پر پہنچی۔ اسٹیشن ماسٹر اور اُن کا عملہ ہمیں سوار کرانے آیا۔ عیسیٰ خان نے تھرڈ کلاس کے ٹکٹ لئے تھے۔ مگر اسٹیشن ماسٹر نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ ہمیں تھرڈ کلاس کا ایک خالی ڈبہ مل گیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے غالباً گارڈ کو بھی ہدایت کی کہ کسی دوسرے مسافر کو ہمارے ڈبے میں نہ بیٹھنے دیا جائے تاکہ بابا صاحب آرام کر سکیں۔

ریل کے روانہ ہوتے ہی عیسیٰ خان نے چولہا نکال کر کافی بنائی اور کچھ بسکٹوں اور چاکلیٹ کے پیکٹ کے ساتھ پیش کی۔ ہم دونوں نے خاموشی سے کافی اور بسکٹ کا لطف اٹھایا۔ دوسرا سگریٹ سلگا کر میں نے سلسلہ کلام کا آغاز کیا۔

"تو ٹھاکر صاحب کی کوئی خبر نہیں ملی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ آغا کہتا تھا کہ آپ کی ہدایت کے مطابق اس نے بیگم ٹھاکر کو ان کے کاٹیج پہنچانے کے بعد ان سے کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھا۔ البتہ ہاری خان اور گرو کھا ان کے ساتھ گئے تھے۔ شاید

اب بھی وہیں ہیں۔"

اس موضوع پر چھانہ بردار نوح کی قید کے دوران بھی گفتگو ہو چکی تھی۔ پھر بسیلی کے پاس رہا ہونے کے بعد راستے میں بھی اس بارے میں کھسر پسر ہوتی رہی تھی۔ مگر میرے دل میں یہ کانٹا سا چبھا ہوا تھا کہ اس کی خلش چین ہی نہ لینے دیتی تھی۔ آر آر والوں نے وعدہ کرنے کے باوجود میرے دوست کو کیوں رہا نہیں کیا؟۔ آر آر والوں کے بارے میں اس وقت تک میں جو قیاس آرائیاں کر چکا تھا یہ بات ان کے بالکل عکس تھی۔

اس مختصر سے سوال اور اس کے جواب کے بعد ہم دونوں پھر بڑی دیر تک خاموشی سے سگریٹ پیتے رہے۔

"ہم پیلی بھیت کیوں جا رہے ہیں؟" عیسیٰ خان نے اچانک سوال کیا۔

"معلوم نہیں، ویسے ہی وقت گزاری کے لئے۔ ویسے ہمیں لکھنؤ پہنچ کر اس انگریز لڑکی سے ملاقات کرنی ہے۔ مجھے امید ہے کہ پرسیول کے بارے میں جو معلومات ہوں گی ان سے آر آر کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"پیلی بھیت میں کیا کیجئے گا؟"

"لوگوں کو مرید کریں گے۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"اگر آپ میری مانیں تو اکبر آباد کے جنگل تک جانے کے لئے جو سفر پہلے شروع کیا تھا اسی کا ایک بار پھر آغاز کیجئے۔ کیا پیلی بھیت کے جنگل سے اکبر آباد پہنچا جا سکتا ہے؟"

"یقیناً۔ مگر لکھنؤ جانا ضروری ہے۔ بعد میں فیصلہ کیا جائے گا۔"

ایسی ہی باتوں میں تین ساڑھے تین گھنٹے کا سفر گزر گیا۔

پیلی بھیت کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو پلیٹ فارم سنسان پڑا تھا۔ گاڑی سے دو ایک مسافر اترے۔ جنہوں نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ گارڈ ہمیں اتارنے آیا تھا۔ اسٹیشن کے باہر تک چھوڑ گیا۔ جہاں دو چار تانگے کھڑے تھے۔ تانگے والے اونگھ رہے تھے۔ ریل کی آواز سے ایک آدھ جاگ چکا تھا۔ ایک تانگے والا تانگہ بڑھا کر ہمارے پاس آیا اور بجلی کی دھندلی روشنی میں ہمیں دیکھ کر کچھ مبہوت سا رہ گیا۔

"کہاں جائیں گے بابا؟" اس نے تانگہ سے اتر کر ہماری طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"تم جہاں چاہو پہنچا دو۔" میں نے مہمل سا جواب دیا۔

"بابا آپ اللہ والے لوگ ہیں جہاں فرمائیں پہنچا دوں۔"

"ہم اللہ والے لوگ ہیں تو پھر ہمیں اللہ کے گھر پہنچا دو۔" میں نے پھر ایک مہمل سی بات کہی۔ اور میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب تانگے والے نے تعظیم سے سر جھکا کر ہمیں تانگے میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ہم دونوں چپ چاپ تانگے میں بیٹھ گئے۔ تانگے والے نے گھوڑے کو ٹٹکاری دی۔ باگیں اچھالیں اور گھوڑا اس قدیم تاریخی شہر کی پختہ و نیم پختہ تنگ اور تاریک گلیوں میں چل پڑا۔

ہم دونوں خاموش رہے۔ تانگہ والا بھی خاموش رہا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد اس نے ایک جگہ تانگہ روک دیا۔

"بابا اللہ کا گھر آ گیا۔" تانگے والے نے ادب سے کہا۔

ہم دونوں تانگے سے اتر گئے۔ میں نے کشکول سے مٹھی بھر کے دس دس کے نوٹ نکالے اور تانگے والے کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے خاموشی سے روپے لے کر ان کو ایک نظر دیکھا۔ پھر بڑے ادب سے جھک کر درباری انداز میں تین سلام کیئے۔

"حضور میری قسمت کھل گئی۔ آپ نے مجھے اتنی دولت عنایت فرما دی ہے کہ میں اپنے لئے دو تانگے اور گھوڑے اور لے سکتا ہوں۔" اس نے پھر جھک کر سلام کیئے۔

"جاؤ۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ اچھی جگہ پہنچا گئے ہو۔" میں نے کہا اور اسے ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ دو منٹ بعد ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ تانگے والے نے ہمیں برگد کے ایک پرانے درخت کے نیچے اتارا تھا۔ ہم نے اندھیرے میں ادھر ادھر گھور کر دیکھا۔ سامنے ایک عظیم الشان پرانی سی عمارت تھی۔ عیسیٰ خان کی تیز نظروں نے اسے بھانپ لیا۔

"جامع مسجد ہے۔ میں نے سنا تھا کہ پیلی بھیت میں پٹھانوں کی بنائی ہوئی بالکل ایسی جامع مسجد ہے جیسے دلی میں ہے۔" اس نے کہا۔

مجھے بھی معلوم تھا۔ پیلی بھیت کی جامع مسجد کی شہرت سے واقف تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جامع مسجد کس نے بنوائی ہے

میں نے سوچا شاید عیسیٰ خان کو اس مسجد کے بنوانے والے کے بارے میں علم ہو۔

"اگر پٹھانوں نے بنوائی ہے تو بتاؤ کس نے بنوائی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اوں ۔" اس نے اپنی مصنوعی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ "یہ تو نہیں معلوم۔ بس اتنا معلوم ہے کہ پٹھانوں کی بنوائی ہوئی ہے۔"

"حافظ الملک حافظ رحمت خان کی بنوائی ہوئی ہے۔" میں نے اس عظیم پرانی عمارت کو گھورتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"حافظ رحمت خان۔ ارے ہاں خوب یاد آیا۔ وہ تو ہمارے ہی قبیلے کے تھے۔" عیسیٰ خان نے جلدی سے کشکول زمین پر رکھ دیا اور بڑی عقیدت مندی سے بولا۔ "الحمد للہ اس جگہ کی آج زیارت نصیب ہوئی ہے۔"

"یہ خیال رہے کہ یہاں تم ایک ہندو کی حیثیت سے آئے ہو۔" میں نے اسے فہمائش کی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ۔" اس نے کہا اور کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس پر ایک عجیب بے چینی کا سا عالم طاری تھا۔

"مگر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ویسے تو میں نماز وغیرہ پابندی سے نہیں پڑھتا مگر اس وقت بڑا اچھا موقع ہے۔ میرا دل دو رکعت پڑھنے کو چاہ رہا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو...."

"میں تمہیں نیک کام سے کیسے روک سکتا ہوں۔ جاؤ۔ مگر کسی نے دیکھ لیا تو؟" میں نے کہا۔

"تو کیا ہوگا۔ کسی نے دیکھ لیا تو یہی دیکھے گا کہ ایک ننگ دھڑنگ ہندو جوگی مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے۔" اور وہ ایک عجیب بے خودی کے سے عالم میں مسجد کی طرف بڑھ گیا۔

میں وہیں پیڑ کے نیچے شیر کی کھال بچھا کر بیٹھ گیا اور مسجد کے تاریک در و دیوار کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ عیسیٰ خان کو مسجد میں اس کا خون کھینچ کر لے گیا ہے یا مذہبی عقیدت مندی۔

بہرحال میں دل ہی دل میں مطمئن تھا۔ یہ خون کے نسلی اثرات ہوں یا مذہبی عقیدت مندی۔ انسان کے کردار کو قابل اعتبار بنانے میں دونوں باتوں کا ہی دخل ہوتا ہے۔

میں سوچتا رہا اور مسجد کی طرف گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ اچانک مسجد سے صدائے تکبیر بلند ہوئی۔ عقیدت اور بھرپور خلوص کے جذبے میں ڈوبی ہوئی۔ کھنکتی ہوئی۔ گونجتی ہوئی آواز ۔۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر ۔۔ عیسیٰ خان اذان دے رہا تھا ۔۔ "اللہ رے پٹھان۔" میں نے دل میں سوچا۔ نہ صرف نماز پڑھے گا بلکہ اذان بھی دے گا۔

عیسیٰ خان کی آواز بتدریج بلند ہوتی گئی اور میں سوچنے لگا کہ اگر آس پاس کے رہنے والوں کی آنکھ کھل گئی تو وہ کیا سوچیں گے کہ رات کے دو بجے کون اذان دے رہا ہے۔

اذان ختم ہونے کے بعد ایک بار پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ آس پاس سے کچھ دبی دبی آہٹیں ہوئیں۔ ادھر ادھر سے کچھ سائے مسجد کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ شاید وہ سمجھے ہوں کہ فجر کا وقت ہو گیا۔ یا پھر وہ اسی تحقیق کے لیے آئے ہوں کہ اس وقت کون اللہ کا بندہ اذان دے رہا ہے؟

میں خاموشی سے بیٹھا مسجد کی طرف دیکھتا رہا۔ اچانک مسجد کے گرد نور کا ہالہ سا چھا گیا۔ چاروں طرف نورانی مشعلیں سی روشن ہو گئیں۔ میری آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ میرے کانوں میں دور سے طلوع سحر کے وقت بجنے والے نقاروں کی دھمک گونجنے لگی۔ مسجد کا دروازہ بھی روشن ہو گیا۔ میں نے دیکھا کچھ لوگ دروازے پر کھڑے ہیں۔ سفید انگرکھے پہنے، سفید عمامے باندھے، داڑھیاں چڑھی ہوئی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ فراخ پیشانیاں۔ اور ۔۔ اور.... اچانک وہ نور کا ہالہ ختم ہو گیا۔ تاریکی چھا گئی۔ میں نے آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ وہ سب میرے تصور کی کرشمہ کاری تھی۔ میں حیرت زدہ سا مسجد کے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ دروازے سے عیسیٰ خان کا بلند و بالا پیکر نمودار ہوا۔ وہ جھکے جھکے قدموں سے میری طرف آ رہا تھا۔ وہ تنہا نہ تھا اس کے پیچھے تین چار سائے اور بھی تھے ۔ عیسیٰ خان کے ساتھ دوسروں کو آتا دیکھ کر میں دم بخود ہو گیا۔ سر جھکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں ۔۔ عیسیٰ خان کی آہٹ قریب آئی۔ وہ گہری گہری سانسیں لیتا ہوا میرے سامنے دو زانو بیٹھ گیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ تین چار سائے مجھ سے کچھ دور ٹھہر گئے۔ آپس میں کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ اس کے بعد

وہ بزرگ الٹے پاؤں ادھر ادھر چلے گئے ـــ ہم دونوں پھر اکیلے رہ گئے۔

ہم دونوں جس روحانی تجربے سے دوچار ہوئے تھے اس کی کیفیت اتنی طمانیت بخش تھی کہ کسی بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے ـــ کچھ دیر بعد ایک طرف سے ایک لالٹین کی روشنی چمکی۔ کوئی لالٹین لئے ہماری طرف آرہا تھا۔ چند لمحوں میں وہ ہمارے سامنے تھا۔ لالٹین اٹھا کر اس کی روشنی میں ہمارا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سفید داڑھی والا ایک معمر شخص تھا۔ سفید قمیص، سفید پاجامہ پہنے، ننگے سر۔ اس آدمی کے چہرے سے بزرگی، متانت اور بردباری کے آثار ہویدا تھے ـــ ہمارے حلیوں کا جائزہ لے کر وہ بھی تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ سوچ رہا ہوگا کہ ہم کون ہو سکتے ہیں۔

"السلام علیکم" آخرکار اس نے ہمیں مخاطب کیا۔ میں نے جواب دیا۔

"آپ نے اذان دی تھی؟" اس نے سوال کیا۔

میں نے جواب کے طور پر انگلی سے عیسیٰ خاں کی طرف اشارہ کر دیا۔

"اللہ اکبر" وہ بڑبڑایا۔ "میرے لائق کوئی خدمت؟" اس نے پوچھا ـــ میں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی۔

"آپ کا قیام رہے گا؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا ـــ وہ الٹے پاؤں لالٹین لئے واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کو دیر نہ گزری تھی کہ ایک اور لالٹین مسجد کے دروازے سے برآمد ہوئی میں نے سوچا کہ یہ دوسرا شخص مسجد کا امام یا خادم ہو سکتا ہے۔ وہ تیزی سے ہماری طرف آیا۔ لالٹین اٹھا کر ہمارا جائزہ لیا۔ میں نے بھی اسے دیکھا۔ وہ پہلے شخص سے بھی زیادہ بوڑھا تھا کمر جھکی ہوئی تھی۔ سفید داڑھی سفید بھنویں۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ وہ چند لمحے ہمیں دیکھتا رہا۔ پھر معنی خیز انداز میں مسکرایا اور لالٹین کی بتی کم کر کے ہمارے سامنے بیٹھ گیا۔ میں گھبرایا کہ اب یہ گفتگو کا سلسلہ چھیڑے گا۔ مگر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد میں ہی بولا۔

"آپ زحمت نہ فرمائیں۔ آرام فرمائیے۔ ہم لوگ بالکل آرام اور اطمینان سے ہیں۔"

"یہ اذان کس نے دی تھی۔ میں حجرے میں سو رہا تھا۔ کانوں میں آواز آئی۔ میں سمجھا خواب دیکھ رہا ہوں۔ سوتا رہا۔ آواز کانوں میں گونجتی رہی۔ آخر کو آنکھ کھل گئی۔ باہر نکل کر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ ایک سایہ سا دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔ تب میں نے لالٹین جلائی اور یہاں آپ کو پایا۔ اذان کس نے دی تھی۔" ساری بات کہہ کر اس نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔

"اس فرزند نے اذان دی تھی جو سر جھکائے بیٹھا ہے۔" میں نے جواب دیا ـــ "سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ یا اللہ، کیسی تڑپ تھی اس آواز میں۔ کیا سوز تھا۔ اللہ اللہ۔ میں نے سنا ہے اپنے بزرگوں سے کہ میرے دادا کے وقتوں میں ایک نوجوان رات کو تہجد کی نماز پڑھنے مسجد میں آتا تھا اور کبھی کبھی جوش میں آکر اذان بھی دے دیتا تھا۔ بس مجھ کو یہی بات یاد آگئی۔ اب سے ۷۰، ۷۵ سال پہلے کی بات ہے اب کہاں۔ اب ایسی آوازیں اور ایسی لگن کہاں۔ اللہ اللہ۔" وہ بزرگ بے ربط انداز میں اور اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کی گہری اور کھردری سانس کی آواز آتی رہی۔ وہ خود ۷۵۔ ۸۵ سال سے کم کا نہ ہوگا۔

"پھر اس نوجوان کا کیا ہوا؟" میں نے دالیسے ہی سوال کر لیا۔

"وہ دن ـــ" اس نے سانس سنبھال کر کہنا شروع کیا ـــ

"وہ دن بڑے برے تھے۔ وہ ایک اچھا خاندانی لڑکا تھا۔ کہتا تھا میں اس مسجد کی شان و شوکت کو بحال کروں گا۔ وہ حافظ جی کی اولاد میں تھا۔ آپ تو جانتے ہوں گے حافظ جی کو۔"

"جی ہاں۔ حافظ الملک رحمتہ اللہ علیہ" میں نے جواب دیا۔

"اللہ اللہ اللہ۔ اللہ ان پر رحمتوں کی بارش کرے۔ آہ" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "نہیں معلوم کہ وہ زمانہ کبھی لوٹ کر آئے گا یا نہیں۔ اللہ اللہ اللہ" اور وہ پھر خاموش ہو گیا۔

اتنے میں دور سے کچھ اور لالٹینوں کی روشنی نمودار ہوئی۔ اس بزرگ نے بھی ان کی طرف مڑ کر دیکھا۔

(باقی آئندہ)

حاصلِ مطالعہ

اِس عنوان کے تحت ہر ماہ
اُردو جرائد میں شائع ہونے
والی بہترین تخلیقات کا
انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔
(ادارہ)

قرۃ العین حیدر

فوٹو گرافر

موسم بہار کے پھولوں سے گھرا ہوا یہ دلفریب گیسٹ ہاؤس ہرے بھرے ٹیلے کی چوٹی پر دور سے نظر آجاتا ہے ٹیلے کے عین نیچے پہاڑی جھیل ہے۔ ایک بل کھاتی سڑک جھیل کے کنارے کنارے گذرتی گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک تک پہنچتی ہے۔ پھاٹک کے نزدیک والرس کی ایسی مونچھوں والا ایک فوٹوگرافر اپنا ساز وسامان پھیلائے ایک ٹین کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ یہ گم نام پہاڑی قصبہ ٹورسٹ علاقے میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے بہت کم سیاح اس طرف آتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی ماہ عسل منانے والا جوڑا یا کوئی مسافر گیسٹ ہاؤس میں آپہنچتا ہے تو فوٹوگرافر بڑی امید اور صبر کے ساتھ اپنا کیمرہ سنبھالے باغ کی سڑک پر ٹہلنے لگتا ہے۔ باغ کے مالی سے اس کا سمجھوتہ ہے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری کسی نوجوان خاتون کے لئے صبح سویرے گلدستہ لے جاتے وقت مالی فوٹوگرافر کو اشارہ کر دیتا ہے۔ اور جب ماہ عسل منانے والا جوڑا ناشتہ کے بعد نیچے باغ میں آتا ہے تو مالی اور فوٹوگرافر دونوں ان کے انتظار میں چوکس ملتے ہیں۔ فوٹوگرافر مدتوں سے یہاں موجود ہے۔ نہ جانے کہیں اور جا کر اپنی دکان کیوں نہیں سجاتا۔ لیکن وہ اسی قصبہ کا باشندہ ہے۔ اپنی جھیل اور اپنی پہاڑی چھوڑ کر کہاں جائے۔ اس پھاٹک کی پلیا پر بیٹھے بیٹھے اس نے بدلتی دنیا کے رنگا رنگ تماشے دیکھے ہیں۔ پہلے یہاں صاحب لوگ آتے تھے۔ برطانوی پلانٹرز سفید سولا ہیٹ پہنے کولونیل سروس کے جغادری عہدے دار ان کی میم لوگ اور بابا لوگ۔

رات رات بھر شرابیں اڑائی جاتی تھیں اور گراموفون ریکارڈ چیختے تھے۔ اور گیسٹ ہاؤس کے نچلے ڈرائنگ روم کے چوبی فرش پر ڈانس ہوتا تھا۔ دوسری بڑی لڑائی کے زمانے میں امریکن آنے لگے۔ پھر ملک کو آزادی ملی اور اکا دکا سیاح آنے شروع ہوئے۔ یا سرکاری افسر یا نئے بیاہے جوڑے یا مصور یا ادیب۔ ایسے لوگ جو تنہائی چاہتے ہیں ایسے لوگ جو برستی شاموں کو جھیل پر جھکی دھند کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ جو سکون اور محبت کے متلاشی تھے جس کا زندگی میں وجود نہیں۔ کیونکہ ہم جہاں جاتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے جہاں ٹھہرتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے۔ فنا مسلسل ہماری ہم سفر ہے۔

گیسٹ ہاؤس میں مسافروں کی ادک جادک جاری ہے۔ فوٹوگرافر کے کیمرے کی آنکھ یہ سب دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔

ایک روز شام پڑے ایک نوجوان اور ایک لڑکی گیسٹ ہاؤس میں آنکر اترے۔ یہ دونوں انداز سے ماہ عسل منانے والے معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن بے حد مسرور اور سنجیدہ سے۔ وہ اپنا مختصر سامان اٹھائے اوپر چلے گئے۔ اوپر کی منزل

بالکل خالی پڑی تھی۔ زینے کے برابر میں ڈائننگ ہال تھا اور اس کے بعد تین بیڈ روم۔

"یہ کمرہ میں لوں گا۔" نوجوان نے پہلے بیڈ روم میں داخل ہو کر کہا جس کا رخ جھیل کی طرف تھا۔ لڑکی نے اپنی سُرخ چھتری اور اوور کوٹ اس کمرے کے ایک پلنگ پر پھینک دیا۔

"اٹھاؤ اپنا بوریا بستر۔" نوجوان نے اس سے کہا۔

"اچھا۔" لڑکی نے دونوں چیزیں اٹھا کر برابر کے سٹنگ روم سے ملحق دوسرے کمرے میں چلی گئی جس کے پیچھے ایک پختہ گلیارہ سا تھا۔ کمرے کے بڑے بڑے دریچوں میں سے وہ مزدور نظر آ رہے تھے جو ایک سیڑھی اٹھائے پچھلی دیوار کی مرمت میں مصروف تھے۔

ایک بیرہ لڑکی کا سامان لے کر اندر آیا۔ اور دریچوں کے پردے برابر کر کے باہر چلا گیا۔ لڑکی سفر کے کپڑے تبدیل کر کے سٹنگ روم میں آ گئی۔ نوجوان آتش دان کے پاس ایک آرام کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ باہر جھیل پر دفعتاً اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ دریچے میں کھڑی ہو کر باغ کے دھندلکے کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ نہ جانے وہ دونوں کیا باتیں کرتے رہے۔ فوٹو گرافر جو اب بھی نیچے پھاٹک پر بیٹھا تھا اس کا کیمرہ آنکھ رکھتا تھا لیکن سماعت سے عاری تھا۔

پھر کچھ دیر بعد وہ دونوں کھانے کے کمرے میں گئے۔ اور دریچے سے لگی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر قصبے کی روشنیاں جھلملا اٹھی تھیں۔

اس وقت تک ایکسلا بہین سیلاح بھی گیسٹ ہاؤس میں آ چکا تھا۔ وہ خاموش ڈائننگ ہال کے دوسرے کونے میں چپ چاپ بیٹھا خط لکھ رہا تھا۔ چند پکچر پوسٹ کارڈ اس کے سامنے میز پر رکھے تھے۔

"یہ اپنے گھر خط لکھ رہا ہے کہ میں اس وقت پراسرار مشرق کے ایک پراسرار ڈاک بنگلے میں موجود ہوں۔ سُرخ ساری میں ملبوس ایک پُراسرار ہندوستانی لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے۔ بڑا ہی رومانٹک ماحول ہے۔" لڑکی نے چپکے سے کہا۔ اس کا ساتھی ہنس پڑا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں پھر سٹنگ روم میں آ گئے۔ نوجوان

الشعاع

اب اسے کچھ پڑھ کر سنا رہا تھا۔ رات گہری ہوتی گئی۔ دفعتاً لڑکی کو زور کی چھینک آئی اور اس نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا۔

"اب سونا چاہیئے۔"

"ہاں۔ شب بخیر۔" لڑکی نے جواب دیا۔ اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پچھلے گلیارے میں گھپ اندھیرا تھا۔ کمرہ بے حد پرسکون، خنک اور آرام دہ تھا۔ زندگی بے حد پُرسکون اور آرام دہ تھی۔ لڑکی نے کپڑے تبدیل کر کے سنگھار میز کی دراز کھول کے دوا کی شیشی نکالی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اپنا سیاہ کیمونو پہن کر دروازہ کھولا۔ نوجوان ذرا گھبرایا ہوا سا سامنے کھڑا تھا۔ "مجھے بھی بڑی سخت کھانسی اٹھ رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا۔!" لڑکی نے دوا کی شیشی اور چمچہ اسے دیا۔ چمچہ نوجوان کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ اس نے جھک کر چمچہ اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ لڑکی روشنی بجھا کر سو گئی۔

صبح کو وہ ناشتے کے لئے ڈرائنگ روم میں گئی۔ زینے کے برابر والے ہال میں پھول مہک رہے تھے۔ تانبے کے بڑے بڑے گلدان براسو سے چمکائے جانے کے بعد ہال کے جھلملاتے چوبی فرش پر ایک قطار میں رکھ دیئے گئے تھے اور تازہ پھولوں کے انبار ان کے نزدیک رکھے ہوئے تھے۔ باہر سورج نے جھیل کو روشن کر دیا تھا اور زرد و سفید تتلیاں سبزے پہ اُڑتی پھر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد نوجوان ہنستا ہوا زینے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا ایک گچھا تھا۔

"مالی نیچے کھڑا ہے۔ اس نے یہ گلدستہ تمہیں بھجوایا ہے"

اس نے کمرے میں داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا اور گلدستہ میز پر رکھ دیا۔ لڑکی نے ایک شگوفہ اٹھا کر بے خیالی سے اپنے بالوں میں لگا لیا اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

"ایک فوٹو گرافر بھی نیچے منڈلا رہا ہے اس نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے تمہارے متعلق دریافت کیا کہ کیا تم فلاں فلم اسٹار تو نہیں؟" نوجوان نے کرسی پر بیٹھ کر چائے بناتے ہوئے کہا۔

لڑکی ہنس پڑی۔ وہ ایک نامور رقاصہ تھی۔ مگر اس جگہ پر کسی نے اس کا نام بھی نہ سنا۔ نوجوان لڑکی سے بھی زیادہ مشہور موسیقار تھا مگر اسے بھی یہاں کوئی نہ پہچان سکا تھا۔ ان دونوں کا یہ اس عارضی گمنامی

اور مکمل سکون کے یہ مختصر لمحات بہت بھلے معلوم ہوتے۔

کمرے کے دوسرے کونے میں ناشتہ کرتے ہوئے اکیلے یورپین نے آنکھیں اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا اور ذرا سا مسکرایا۔ وہ بھی ان دونوں کی خاموش مسرت میں شریک ہو چکا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں نیچے گئے اور باغ کے کنارے گل مہر کے نیچے کھڑے ہو کر جھیل کو دیکھنے لگے۔ فوٹو گرافر نے اچانک چھلاوے کی طرح نمودار ہو کر بڑے ڈرامائی انداز میں ٹوپی اتاری اور خود اجھک کر کہا۔

"فوٹو گراف لیڈی؟"

لڑکی نے گھڑی دیکھی۔ ہم لوگوں کو ابھی باہر جانا ہے۔ دیر ہو جائے گی۔"

"لیڈی —" فوٹو گرافر نے پاؤں منڈیر پر رکھا اور ایک ہاتھ پھیلا کر باہر کی دنیا کی سمت اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "باہر کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے مجھے معلوم ہے۔ اس گھمسان سے نکل کر آپ دونوں خوشی کے چند لمحے چرانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ دیکھئے اس جھیل کے اوپر دھنک پل کی پل میں غائب ہو جاتی ہے لیکن میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ ادھر آئیے۔"

"بڑا اسان فوٹو گرافر ہے۔" لڑکی نے چپکے سے اپنے ساتھی سے کہا —

مالی جو گویا اب تک اپنے کیو کا منتظر تھا دوسرے درخت کے پیچھے سے نکلا اور لپک کر ایک ایک گلدستہ لڑکی کو پیش کیا۔ لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ اور اس کا ساتھی ارسنٹک یا روتی کے پیچھے کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ لڑکی کی آنکھوں میں دھوپ آ رہی تھی اس لئے اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں ذرا سی چندھیا دی تھیں۔

کلک۔ کلک۔ تصویر اتر گئی۔

"تصویر آپ کو شام کو مل جائے گی۔ تھینک یو لیڈی۔ تھینک یو سر" فوٹو گرافر نے ذرا سا جھک کر دوبارہ ٹوپی چھوئی۔

لڑکی اور اس کا ساتھی کار کی طرف چلے گئے۔

سہ پہر کے وہ دونوں شام پڑے لوٹے اور سندھیا کی نارنجی روشنی میں دیر تک باہر گھاس پر پڑی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔

جب کہرہ گرنے لگا تو اندر نچلی منزل کے وسیع اور خاموش ڈرائنگ روم میں نارنجی قمقموں کی روشنی میں آ بیٹھے۔ نہ جانے وہ کیا باتیں کر رہے تھے جو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ کھانے کے وقت وہ اوپر چلے گئے۔ صبح سویرے وہ واپس جا رہے تھے اور اپنی باتوں کی محویت میں ان کو فوٹو گرافر اور اس کی کھینچی ہوئی تصویر یاد بھی نہ رہی تھی۔

صبح کو لڑکی اپنے کمرے ہی میں تھی جب بیرے نے اندر آ کر ایک لفافہ پیش کیا۔ "فوٹو گرافر صاحب یہ رات کو دے گئے تھے۔" اس نے کہا۔

"اچھا۔ اس سامنے والی دراز میں رکھ دو۔" لڑکی نے بے خیالی سے کہا اور بال بنانے میں جٹی رہی۔

ناشتے کے بعد سامان باندھتے ہوئے اسے وہ دراز کھولنا یاد نہ رہی اور جاتے وقت خالی کمرے پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر وہ تیز تیز چلتی نیچے جا کر کار میں بیٹھ گئی۔ نوجوان نے کار اسٹارٹ کر دی۔ کار پھاٹک سے باہر نکلی فوٹو گرافر نے پلیا پر سے اٹھ کر ٹوپی اتاری۔ مسافروں نے مسکرا کر ہاتھ ہلائے۔ کار ڈھلوان سے نیچے اتر گئی۔

وہ دالرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹو گرافر — اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اور اسی طرح اس گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک پر ٹین کی کرسی بچھائے بیٹھا ہے۔ اور سیاحوں کی تصویریں اتارتا رہتا ہے۔ جہاں نئی فضائی سروس شروع ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس طرف آنے لگے ہیں۔

لیکن اس وقت ایئر پورٹ سے جو ٹورسٹ کوچ آ کر پھاٹک میں داخل ہوئی۔ اس میں سے صرف ایک خاتون اپنا اٹیچی کیس اٹھائے برآمد ہوئیں۔ اور مشفک کر انھوں نے فوٹو گرافر کو دیکھا جو کوچ کو دیکھتے ہی فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر کسی مہمان اور حسین لڑکی کے بجائے ایک ادھیڑ عمر کی [illegible] کر مایوسی سے دوبارہ جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

خاتون نے دفتر میں جا کر رجسٹر میں اپنا نام درج کیا اور [illegible]

[illegible]

چلی گئیں۔ گیسٹ ہاؤس سنسان پڑا تھا۔ سیاحوں کی ایک ٹولی ابھی ابھی آگے روانہ ہوئی تھی۔ ادھیڑ عمر کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر چکے تھے سامنے کے گلدان تازہ پھولوں کے انتظار میں ہال کے فرش پر رکھے جھل جھل کر رہے تھے۔ اور ڈائننگ ہال میں دریچے کے نیچے سفید براق میز پر چھری کانٹے چمک رہے تھے۔ نو وارد خاتون درمیانی بیڈ روم میں سے گزر کر پچھلے کمرے میں چلی گئیں۔ اور اپنا سامان رکھنے کے بعد پھر باہر آ کر جھیل کو دیکھنے لگیں۔ چائے کے بعد وہ خالی سٹنگ روم میں جا بیٹھیں اور رات ہوئی تو جا کر اپنے کمرے میں سو گئیں۔ گلیارے میں سے کچھ پرچھائیوں نے اندر جھانکا تو وہ اٹھ کر دریچے میں گئیں۔ جہاں مزدور دن بھر کام کرنے کے بعد سیڑھی دیوار سے لگی چھوڑ گئے تھے۔ گلیارہ بھی سنسان پڑا تھا۔ وہ پھر پلنگ پر آ کر لیٹیں تو چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ باہر کوئی نہ تھا۔ سٹنگ روم بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ پھر آ کر لیٹ رہیں۔ کمرہ بہت سرد تھا۔

صبح کو اٹھ کر انہوں نے اپنا سامان باندھتے ہوئے سنگھار میز کی دراز کھولی تو اس کے اندر بچھے پیلے کاغذ کے نیچے سے ایک لفافے کا کونہ نظر آیا جس پر ان کا نام لکھا تھا۔ خاتون نے ذرا تعجب سے لفافہ باہر نکالا۔ ایک کاکروچ کاغذ کی تہہ سے نکل کر خاتون کی انگلی پر آ گیا۔ انہوں نے ڈر کر انگلی جھٹکی اور لفافہ میں سے ایک تصویر سرک کر نیچے گر گئی جس میں ایک نوجوان اور ایک لڑکی امرسندری پاروتی کے مجسمے کے قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ تصویر کا کاغذ پیلا پڑ چکا تھا۔ خاتون چند لمحوں تک گم سم اس تصویر کو دیکھتی رہیں اور پھر اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

بیرے نے باہر سے آواز دی کہ ائیر پورٹ جانے والی کوچ تیار ہے۔ خاتون نیچے گئیں۔ فوٹو گرافر نئے مسافروں کی تاک میں باغ کی سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ اس کے قریب جا کر خاتون نے بے تکلفی سے کہا۔

"کمال ہے پچھلے برسوں میں کتنی بار اس سنگھار میز کی صفائی کی گئی ہوگی۔ مگر یہ تصویر کاغذ کے نیچے اسی طرح پڑی رہی۔" پھر ان کی آواز میں جھلاہٹ آ گئی۔ "اور یہاں کا انتظام اتنا خراب ہو گیا ہے۔ کمرے میں کاکروچ ہی کاکروچ ہیں۔"

فوٹو گرافر نے چونک کر ان کو دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر خاتون کے جھریوں والے چہرے پر نظر ڈال کر الٹے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ خاتون کہتی رہیں — ان کی تو آواز بھی بدل چکی تھی۔ چہرے پہ درشتی اور سختی تھی۔ اور انداز میں چڑچڑاپن اور بے نیازی۔ سادہ سپاٹ آواز میں کہے جا رہی تھیں۔

"میں اسٹیج سے ریٹائر ہو چکی ہوں۔ اب میری تصویریں کون کھینچے گا بھلا۔ میں اپنے وطن واپس جاتے ہوئے رات کی رات یہاں ٹھہر گئی تھی۔ نئی ہوائی سروس شروع ہو گئی ہے نا۔ یہ جگہ راستہ میں پڑتی ہے۔"

"اور — اور — آپ کے ساتھی — ؟" فوٹو گرافر نے آہستہ سے پوچھا۔

"کوچ نے ہارن بجایا۔"

"آپ نے کہا تھا ناکہ کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ اس گھمسان میں وہ کہیں کھو گئے۔"

کوچ نے دوبارہ ہارن بجایا۔

"اور ان کو کھوئے ہوئے بھی مدت گزر گئی۔ اچھا خدا حافظ۔"

خاتون نے بات ختم کی اور تیز تیز قدم رکھتی کوچ کی طرف چلی گئیں۔

والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹو گرافر پھاٹک کے نزدیک جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

زندگی انسانوں کو کھا گئی

صرف کاکروچ باقی رہیں گے۔

(بشکریہ شب خون الہ آباد)

اشتہار

میر احمد علی قادری

فیض کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

مشہور شاعر فیض احمد فیض کے قدیم و جدید چار مجموعے "نقش فریادی"، دستِ صبا، زنداں نامہ، دستِ تہِ سنگ میرے پیش نظر ہیں۔ فیض اس دور کے جو ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتا ہے مقبول ترین شاعر ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ناقدوں نے فیض کا نام دورِ حاضر کے ان غزل گو شعرا کے ساتھ بھی لیا ہے جو غزل کے معمار ہیں۔ اور جنہوں نے غزل کو توانائی اور زندگی بخشی ہے۔ لیکن ناقدین کی رائے سے متاثر ہوئے بغیر جب ان کے کلام کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے والا اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ فن، زبان، بیان اور خیال کی شاید ہی کوئی ایسی غلطی ہوگی جو فیض احمد فیض کے کلام میں موجود نہیں۔ غلطیوں کے باوصف فیض کو صفِ اول کے شعرا میں شمار کرنا یا تو ہمارے ناقدین کے ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت ہے یا پھر یہ کوئی ایسی سازش ہے جس کو "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کا نام دیا جا سکتا۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ فیض کو ادبی انعام دیا گیا ہے۔ اگر یہ انعام کسی اور حیثیت سے دیا جاتا تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی۔ لیکن ادب کے عنوان سے انعام کا دیا جانا اردو ادب پر ظلم ہے۔ فیض کا تمام کلام پڑھ جائیے۔ ایک نظم بھی ایسی نہ ملے گی جس کو شاہکار نظم کہا جا سکے یا جو کم از کم زبان و بیان کی غلطیوں سے پاک ہو۔ ایک شعر بھی ایسا نہ ملے گا جس میں گہرائی و گیرائی ہو۔

اب کوئی طبل نہ بجے گا نہ کوئی شاہسوار
صبح دم موت کی وادی کو روانہ ہوگا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

نہ رہا جنونِ رخِ وفا یہ رسن یہ دار کیا کروگے
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہگار چلے گئے

اے صبا شاید ترے ہمراہ یہ خوفناک شام
سر جھکائے جا رہی ہے شہر یاراں کی طرف

ہستی کی متاعِ بے پایاں جاگیر تیری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعلِ دل بسمل ہے تو کیا رخشاں ہے تو کیا

دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں بانہیں بدن بلاتے رہے

دستِ تہِ سنگ کا پہلا قطعہ ہے

یہ خوں کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

اِس قطعہ کے دوسرے مصرعہ میں لفظ "جانب" زائد ہے۔ کس راہ سے صبا آتی ہے کہنا کافی ہے۔ چوتھے مصرعہ میں (کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو) صبا دیکھی نہیں جاتی سنی جاتی ہے۔

غزل کا یہ مطلع ہے

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

پہلے مصرعہ میں (ہو) اور (ہے) فعل ناقص زائد ہے۔ (نہ تم آئے نہ شبِ انتظار گزری) کہنا کافی ہے۔

"نوشتِ ضمانتِ غم" نظم کا آخری شعر

اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں نثاروں کو
جلالِ فرقِ سرِ دار کو نظر نہ لگے

دوسرے مصرعہ میں فرق بمعنی سر اور سر بمعنی فرق یعنی مانگ کی [illegible]۔

اسی نظم کے یہ شعر ہے

ہر ایک خانۂ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر خانماں خراب کی خیر

ہر ایک کشتۂ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدۂ پُرنم کی آب وتاب کی خیر

"ہر" کے ساتھ "ایک" نہیں آتا۔

نظم "سنکیانگ" کا پہلا شعر ؎

اب کوئی طبل بجے گا نہ کوئی شاہسوار
صبح دم موت کی وادی کو روانہ ہو گا

(اب کوئی طبل بجے گا نہ کوئی شاہسوار) اس مصرعہ میں عطف کے موقع پر "نہ" لایا گیا ہے۔ یہ زبان کی بہت ہی نازک غلطی ہے۔ "نہ" کے استعمال سے پہلے مصرعہ کے یہ معنی نکلتے ہیں کہ اب نہ کوئی طبل بجے گا اور نہ شاہسوار بجے گا۔

غزل کا یہ مطلع ؎

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہ تمام

"صد شرق و غرب" صد زائد محض ہے جو وزن پیدا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔

نظم "شام" کے یہ شعر ؎

آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ ملے ماتھے پہ سیندور ملے
سرنگوں بیٹھا ہے چپ چاپ نہ جانے کب سے

"آسماں" بام کے تلے نہیں ہوتا بلکہ اوپر ہوتا ہے۔ یہ محاوراتی غلطی ہے۔ (جسم پر راکھ ملے ماتھے پر سیندور ملے) ماتھا جسم سے خارج نہیں۔ جسم (کل) کہنے کے بعد پھر ماتھا (جز) کی تخصیص اصول بلاغت کے خلاف ہے۔

نظم "شورشِ زنجیر بسم اللہ" ؎

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرام دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ

یہاں بسم اللہ کا محل نہیں۔ کسی کام کے شروع کرتے وقت بسم اللہ کہا جاتا ہے نہ کہ کام شروع کر چکنے کے بعد۔ (ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ) بجائے ہوئی کے "کرو پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ" کہا جاتا تو درست تھا۔

اشعار

اسی نظم کا یہ شعر ؎

گنوسب داغ کی حسرتیں شوقیں نگاہ کی
سرِ دستار پرستش ہو رہی ہے پگڑ نگاہ کی

"شوقیں" نہیں معلوم کس زبان کا لفظ ہے؟

"دستِ تہِ سنگ" (صفحہ ۵۲) کا یہ شعر ؎

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہگزر میں گزراں
نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم

شوقیں کی طرح "گزراں" بھی نیا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ گزراں ایک لفظ ضرور ہے جیسے جہانِ گزراں ؎

وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

گزراں (ز) متحرک کے ساتھ ہے گزراں (ز) ساکن کوئی لفظ نہیں

صفحہ (۵۵) کے قطعہ کا یہ مصرعہ ؎

دامن میں مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے

"مشتِ خاکِ جگر" نہیں معلوم یہ کیا چیز ہے۔

صفحہ (۵۷) کا یہ شعر ؎

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مراد
دیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

پہلے مصرعہ میں "خوش نشیں" مہمل اور بے معنی ترکیب ہے۔ چیلنج غالب کا مال ہے ؎

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
جب تو ہی خنجر آزما نہ ہوا

چوتھا مصرعہ (ہر صنم اپنی بارگاہ میں) جب ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے تو پھر آپ دیر سے بے نیاز کیوں ہیں۔ لیکن خانقاہ سے بے نیازی کا سیاقِ شعر سے ظاہر نہیں۔ اگر صنم حاصل ہے تو پھر صنم کدہ کی ضرورت ہے۔

صفحہ (۶۰) کا یہ شعر ؎

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

ترتیب دے رہا ہوں دیوانِ عاشقی کو
لکھ لکھ کے کاٹتا ہوں عنوانِ زندگی کو

تو ساتھ چل سکے گی اے گردشِ زمانہ؟
اب اک نئے سفر پر جانا ہے آدمی کو

گمراہ ہو کے میں نے ڈھونڈی ہیں اپنی راہیں
ایماں دعائیں دیتا ہے میری کافری کو

گھر سے نکل پڑے ہیں اب کس کی جستجو میں
پہچانتے نہیں ہیں ہم آج سے کسی کو

کیا دیکھ کر کروگے یہ دامن دریدہ
ہے دیکھنا تو دیکھو دل کی شکستگی کو

برسوں پھرے ہیں ہم بھی مثلِ غزالِ وحشی
پہلو میں لے کے تیری خوشبوئے دلبری کو

کرتے ہیں یاد اب تک بیتی ہوئی بہاریں
آنکھوں سے چومتے ہیں اک ایک پنکھڑی کو

کل بٹ رہا تھا ان کی محفل میں آبِ حیواں
ہم لوٹ آئے لے کر ناموسِ تشنگی کو

ہے آج کونسا دن آنکھوں کو کیا ہوا ہے
آواز دے رہی ہیں ہر سمت روشنی کو

(نظارہ جھانسی)

شہریار

○

کس کس کا یہ دامن دل کھینچے کس کس کو یہ شے نایاب لگے
بازارِ جہاں میں اب کے برس کیا دیکھئے قیمتِ خواب لگے

کیا خوب تھی راہِ تمنا بھی، تھے ایسے نشیب و فراز اس میں
کبھی دوست جو تھے دشمن سے لگے، کبھی غیر جو تھے احباب لگے

دنیا میں کہیں ہے بھی کہ نہیں وہ شکل کہ جس کی ہو یہ صفت
دن ہو تو دکھائی دے سورج رات آئے تو مہتاب لگے

کچھ تشنہ لبوں کا کہنا ہے سچ اس میں جلنے کتنا ہے
ساغر ہو اگر ان ہاتھوں میں تو زہر بھی بادۂ ناب لگے

رہتی ہے تعاقب میں اس کے ہر ساعت رسوائی کی بلا
جس شخص کو بھی اعزاز ملے جس نام میں بھی القاب لگے

(حصہ گیا)

پیارے ساتھیو ——— فروری کے شمارے میں بعض مجبوریوں کی بنا پر تمہارے صفحات شامل نہیں ہوسکے۔ اس سلسلہ میں بے شمار شکایتی خطوط ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ بعض ساتھیوں نے یہ سمجھا کہ ہم نے ہونہار شہری کے صفحات حذف کر دیے ہیں۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ آئندہ تمہارے صفحات بدستور شامل رہیں گے۔ تم بدستور اپنے صفحات کے لئے دلچسپ مضامین اور کہانیاں بھیجتے رہو۔"

(نگراں ہونہار شہری)

محمود واحد

ایک سوٹ

چھوٹے لوگوں کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی کتنی اہمیت ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو واقعی چھوٹے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی صفائی میں خود صاف ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا بوجھ جھیلتا کر کے ڈالا اور اپنی اولاد کے کاندھوں پر ڈالا۔ ان کی اولاد نے اپنی اولاد پر۔ ایسے سلسلہ اس وقت تک قائم ہے جب تک کہ مخلوق قسم کے لوگ غائب نہ ہو جائیں۔

چنانچہ شوکت میاں کے ساتھ بھی کچھ یہی تھا۔ ان کے باپ کلرک تھے۔ ان کے باپ کے باپ بھی کلرک۔ اپنے کلرک بھی ہوتے تو بات

بنتی) لیکن عجیب الطرفین قسم کی نحوست نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ اب جو زمانہ شوکت میاں کا آیا تو لگے ہاتھ پاؤں مارنے۔ صاحب کو یہ خبط کہ علم و ادب کی خدمت کریں گے۔ گھر کے لوگ مارتے رہ گئے کہ اب لڑکپن چھوڑ و اور دھندے سے لگو۔ گو کہ چھوٹے سے کلرکی سہی۔ عزت سے کھاتے کماتے۔ کبھی کچھ ہوتا تو دے دلا کر ڈھنگ کی جگہ مل ہی جاتی۔ چنانچہ اماں جان کی مرادیں، بہن کی حسرتیں اور بھائی کا استفسار۔ یہ چہرہ ان کے ارادوں کو کمزور نہیں کر سکا۔ آپ نے پسند فرمائی تو اخبار کی نوکری۔ دن کے دو بجے سے رات کے دو بجے تک۔ مختلف اخبارات کے کالموں کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ کہیں اداریے لکھے جا رہے ہیں۔ کہیں بے حد پڑھا جا رہا ہے مضامین سے مگر

نرائن گنج گھاٹ ڈھاکہ کا ایک منظر

چھپتے ہیں جو مدیروں کے لئے فرمائشوں کی تسکین کرتے ہیں اور ماحول جو سستی تہذیب کی کسی لعنت سے علاوہ کچھ نہیں — کہے دیں اور کسے نہ دیں۔ سر ڈھانپیں تو پیر باہر آجائے۔ پیر چھپائیں تو سر کھل جائے۔ خاندانی رئیس تھے نہیں کہ پس انداختہ کام آتا۔ کالج میں تھے تو کیسے کیسے خواب نظر آتے۔ عمدہ ملازمت، بڑے گھرانے میں شادی۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب قسم کی بیوی اور جانے کیا کیا خیالات تھے گے۔ اب جو آنکھ کھلی تو نقشہ ہی عجیب تھا۔ ملا سب کچھ لیکن ان میں نہ کوئی عمدہ تھا، نہ شاندار، نہ بڑا۔ تعلیم تھی یا بیکار، شناسیوں میں اضافہ۔ ملازمت تھی یا تضیع اوقات۔ دور کے رشتہ داروں کی ایک لڑکی سے ان کی شادی ہوگئی۔ لیکن شادی کے بعد تو جیسے مصیبت آگئی۔ مہایہ کہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں زندگی کا حاصل بن گئیں۔ اچھا کھانا، اچھا کپڑا، اچھا مکان، ہر چیز کے لئے ترس گئے۔ اب نہ زندگی میں رس ہے، نہ حلاوت، نہ لوچ۔ اب زندگی ہے یا تمسخر، دیر سے سونا، دن چڑھے جاگنا۔ پہروں سوچ میں گم رہنا۔ بچوں کو جھڑک دینا، بیوی سے منہ پھلا لینا۔ ماں پہ برسنا اور دوسری طرف ادب اور صحافت کی بے نام خدمت۔ ایک آدھ چیز کہیں آگئی، ایڈیٹر خوش ہوئے تو پرچہ جاری ہوگیا ورنہ وہ بھی ندارد۔ پڑھنے والوں کے خطوط کے ڈھیر لگ جاتے اور شوکت میاں سمجھتے جیسے زندگی بھر کی کمائی انہیں مل گئی ہو۔ آخر کب تک۔ ادیب نام کی شے ذرا احساس بھی تو ہوتی ہے۔ آخر بچتا کراسی ڈگر پہ ہولئے جو اُن کی اپنی تھی۔ عمر اشتہاع

منافع چھوٹنے کے خیال سے کانپ کانپ گئے۔ دوسرکاری ملازمت کی طرف جھکے تو خواستین اور انٹرویو کے کتنے ہی مراحل سے گزرے اور ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ رہے۔ ایسے میں ایک سوٹ کی آرزو — کتنی بڑی آرزو ہو سکتی ہے یہ وہی جانے جو تشنۂ آرزو رہا ہو۔ ویسے تکمیل آرزو آرزو کی موت ہے۔ لیکن یہ بات ذرا دل والوں کو ہی بھائے گی جہاں دل سے زیادہ آگے دال کا وزن معلوم ہو وہاں یہ آرزو زندگی بن سکتی ہے۔ نامکمل، ویران اور سپاٹ۔

لیکن آج شوکت میاں ایک خوش تھے۔ ایک ایڈیٹر نے خوش ہوکر ایک طویل کہانی کے تیس روپے کیا بخش دیئے خوشی کی دیوی ان کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔ اور اسی لئے آج دوسری خوشی بھی۔ ماہ کے تنخواہ کے کچھ باقی روپے ملے تو ان میں سے پچاس روپے بیوی کے ہاتھوں میں ڈال دیئے۔ زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی رقم دیکھ کر انھوں نے سمجھا کہ زندگی کا حق ادا کردیا۔ ماں کے لئے کپڑا آگیا۔ بیوی کی شلوار بن گئی اور بچوں کے نیکر اور پڑھائی کی کتابیں۔ وہ تیس روپے جو ادب کی خالص خدمت کے سلسلہ میں ملے تھے لیکر وہ بیٹ آرزو کی تکمیل کے لئے نکل پڑے۔

دس دس کے تین نوٹ ان کی جیب میں پھڑک رہے تھے۔ بس آ، حاتم بھائی کی دکان کے ان کا پیر شم [illegible] دل کی کلیاں کھل گئیں۔ مسرت اور حسرت کے ملے جلے جذبات کا عکس [illegible] عیاں تھا۔ وہ کپڑا جو [illegible] جسم پر دیکھ کر حسرت سے دل مسوس کر رہ جاتے تھے [illegible]

اسکاٹ لینڈ کے دارالحکومت ایڈنبرگ کا ایک منظر

روزنِ کشائی کی تصویر

ہونہار شہری کی ممبر رخسانہ محسن۔ حیدرآباد

کپڑوں کے تھانوں کے سامنے پڑے تھے انہوں نے ایک رنگ پسند کر کے ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے کپڑے کی قیمت پوچھی۔ صرف آٹھ روپے گز۔ ان کا ہاتھ غیر ارادی طور پر ہٹ گیا۔ جیسے جلتے شعلے پر ہاتھ پڑ گیا ہو۔ سیلزمین کپڑے دکھاتا رہا۔ سفید، سیاہ، رنگ برنگے۔ اور وہ طویل سوچ کی دنیا میں غرق رہے اور یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب ان کے دوست انور نے کاندھے پر ہاتھ مارا۔

"کیا لے رہے ہو بھئی" اور وہ اس طرح جھینپ گئے جیسے عین چوری کرتے پکڑے گئے ہوں۔ ابھی کچھ دنوں شوکت میاں نے انور سے کچھ روپے لئے تھے۔ سیلزمین موقع کی نزاکت سمجھ چکا تھا۔ جناب یہ ڈبل عرض کا کپڑا ہے کم ہی رہے گا۔ گھر لوٹے تو بیوی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے جیسے سوٹ اسی کا ہو۔

خوشی [illegible] مصیبت کی طرح تنہا [illegible] نہیں [illegible] ایک نئی خوشخبری شوکت میاں کے گھر وہاں پہنچا گئی۔ بے شمار [illegible] سرکاری ملازمت [illegible] گویا ایسے [illegible] دولت مل گئی لیکن مسرت [illegible] کی بھی [illegible] خوشی آئی بھی تو [illegible] دشواری [illegible]

طاؤس اپنے رقص پر خود بھی نازاں ہوتا ہے۔ لیکن ناچتے ناچتے جب اپنے پاؤں پر نظر پڑتی ہے تو رقص تھم جاتا ہے۔ حسن کا جادو بکھر جاتا ہے موسیقی کی دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ یہی کچھ شوکت میاں کے ساتھ ہوا۔ غیر متوقع طور پر ملازمت پانے کی جتنی خوشی تھی اتنا ہی ملازمت تک پہنچنے کے محدود ذرائع دیکھ کر غم۔ ترقی کے بڑے امکانات تھے۔ خوشحالی دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ دوست اور رشتہ دار آئے مبارکبادیاں پیش کیں۔ کچھ ایسے بھی تھے جو جل سے گئے۔ لیکن شوکت میاں ان سب سے بے نیاز سوچ میں گم تھے۔ سوال اس خرچ کا تھا جو کم از کم اپنے کام تک پہنچنے کے لئے انہیں چاہیئے تھا۔ بیوی کو جو روپے دیئے تھے وہ قرض کی ادائیگی میں اٹھ چکے تھے۔ زیورات پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔ اب مزید رقم حاصل کرنے کی کیا شکل تھی۔ تیس روپے شوکت میاں کی راہ میں پہاڑ بن کر کھڑے ہو گئے۔ تیس روپے جو طالب علمانہ زندگی میں سگریٹ چائے کا ماہانہ خرچ تھا۔ تیس روپے جو ایک کہانی کا معاوضہ تھا۔

شام آئی تھکے ہارے بستر پر گرے۔ گھنٹوں خیال کی آغوش میں پڑے رہے۔ پھر یک بیک ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اپنا بکس کھولا۔ کپڑے کے نئے پیکٹ کو گھور کر دیکھتے رہے۔ دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ڈھلتے گالوں پر لڑھک آئے۔ پیکٹ کو سینے سے لگایا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ کبھی کبھی پیدا ہونے والی بجلی کی چمک سے انور کے مکان کا راستہ صاف دکھائی دینے لگتا۔

ترجمہ۔ خالد انصاری

کمرے میں بیٹھ کر موٹر چلانے کی تربیت

شہروں کی آبادی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ تیز رفتار ذرائع آمد و رفت کا رواج اور استعمال آئے دن بڑھتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی سڑکوں پر ہونے والے حادثوں کے امکانات بھی بڑھ رہے ہیں۔ حادثات کے امکانات کو گھٹانے اور لوگوں کو چھوٹی سے چھوٹی کار سے لے کر بڑے سے بڑے ٹرک کو احتیاط [illegible] سے چلانے کی تربیت دینے کی کوششوں میں ایک نیا [illegible]

...ڈھونڈ نکالا جا رہا تھا۔ اس مسئلے کے حل میں ہالینڈ نے بڑا کام کیا ہے۔ وہاں کے ایک نوجوان انجینئر نے ایک مقامی فرم کے اشتراک سے ایک ایسا طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے جس سے نوآموز ڈرائیور کار، ٹرک وغیرہ چلانا بہت آسانی سے سیکھ جاتے ہیں۔ اور اس میں کمال مہارت پیدا کر لیتے ہیں۔

آپ شاید یہ سوچنے لگیں کہ مہارت کے لئے مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈرائیونگ کی مشق ظاہر ہے سڑکوں پر ہی ہو سکتی ہے۔ اور جب کوئی نوآموز ڈرائیور سڑکوں پر کار، ٹرک چلانے کی مشق کرے گا تو حادثات کے امکانات بڑھیں گے یا کم ہوں گے؟ جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں اگر صورت حالات اس کے مطابق ہو تو یہ بات بالکل صاف ہے کہ سڑکوں پر حادثات کے امکانات بڑھ جائیں گے لیکن یہ طریقہ ایسا نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ سوچ رہے ہیں۔

یہ طریقہ بہت عجیب و غریب ہے۔ اس اعتبار سے کہ نوجوان ڈرائیور کو کار یا ٹرک لے کر سڑک پر نکلنا ہی نہیں پڑتا۔ اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں۔ لیجئے اس کی تفصیل ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں۔ یہ طریقہ مشتمل ہے ٹیلی ویژن، شہر کے چھوٹے سے ماڈل اور حرکت نہ کرنے والے ایک عام ٹرک پر۔ یہ سب چیزیں دو متصل کمروں میں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک میں شہر کا ماڈل ہے۔ اس ماڈل شہر میں چوڑی و تنگ سڑکیں ہیں۔ چوراہے ہیں۔ پیچیدہ گلیاں ہیں۔ اونچے اونچے مکان ہیں۔ سڑکوں کے نشان اور سگنل ہیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک چھوٹا سا، بڑے کھلونے جتنا، ایک ٹرک ہے۔ ایک برقی بازو اس ٹرک کے ساتھ متعلق ہے۔ یہ چھوٹا سا ٹرک ہدایت دینے والی کار کا کام کرتا ہے۔ اس ٹرک کا انتظام ایسا ہے کہ یہ عام ٹرکوں کی طرح شہر کی سڑکوں پر چلتا، مڑتا اور گھومتا ہے۔

دوسرے کمرے میں ایک ٹرک کا ڈھانچہ ہے۔ اس میں انجن اور آگے کے پہیے نہیں ہیں۔ پچھلے پہیے ایک رولر پہ لگے ہوئے ہیں۔ انجن کی جگہ ایک برقی موٹر ہے اور ایک آئل پمپ۔ اس ڈھانچے میں اسٹیئرنگ، ڈرائیونگ کی نشست کے آگے کل پرزے عام ٹرکوں جیسے ہوتے ہیں۔ ان کی مدد سے وہ گاڑی کو کنٹرول کرنا سیکھتا ہے۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ نوآموز ڈرائیور گاڑی اسٹارٹ کر سکتا ہے۔ گیئر بدل سکتا ہے۔ ہینڈل گھما سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ڈھانچہ بالکل ایک ٹرک کی طرح سے کام کرتا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے۔ یہ کمرے کے اندر ہی کھڑا رہتا ہے۔ نہ چلتا ہے اور نہ کہیں جاتا ہی ہے۔ ایک بات اور بھی ہے۔ اگر نوآموز ڈرائیور کلچ اور گیئر کو ڈھنگ سے نہیں استعمال میں لاتا تو یہ گھر گھر کرنے لگتا ہے۔

ٹیلی ویژن کے پردے کی بدولت نوآموز ڈرائیور خود کو ماڈل شہر میں پاتا ہے۔ اور اس کے ٹرک کا تعلق ماڈل شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں چلنے والے ماڈل ٹرک سے ہے۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ وہ ٹرک کے ڈھانچے میں بیٹھے ہوئے یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ ماڈل شہر میں چلنے والے ماڈل ٹرک میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس ٹرک اور ماڈل ٹرک کی رفتار اور سمت ایک ہوتی ہے۔ اس تربیت کے سات مرحلے ہیں۔ یعنی سات گھنٹے۔ جب ایک شخص سات دن میں یہ سات مرحلے طے کر لیتا ہے تو وہ کار اور

روزہ کشائی کی تصویر

ہونہار شہری کی ممبر شہانہ محسن - حیدر آباد

ٹرک کے ڈھانچے سے اترتا ہے تو بڑے اعتماد کے ساتھ چھوٹی سے
چھوٹی کار اور بڑے سے بڑے ٹرک کو چلا سکتا ہے۔
اس ضمن میں جو تجربات ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ اس طریقہ
سے کمروں کے اندر دی گئی سات گھنٹوں کی تربیت باہر کھلی فضا میں
دی گئی ہفتوں کی تربیت کے برابر ہے۔ پہلی صورت میں کوئی خطرہ
جان یا مال کو نہیں ہوتا۔ اور کسی قسم کی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا
پڑتا۔ شروع میں فوجی ڈرائیوروں کو تربیت اس طریقے سے دی
جاتی تھی۔ لیکن اب عوام بھی یہ تربیت حاصل کر سکتے ہیں۔

فیض کی شاعری کا جائزہ ——— صفحہ ۶۵ کا بقیہ

غیر ہیں اہل دیر جیسے ہیں
آپ اہل حرم کی بات کرو

"آپ" کے ساتھ "کرو" شتر گربہ ہے۔ یہاں "کریں" کا محل ہے۔
دستِ صبا صفحہ ۴۷ کا یہ شعر

وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دستِ عدو کے گزند کیا کرتے

اردو میں گزند کے معنی ہیں نظر بد، چشم زخم۔ خسارا۔ ایذا، تکلیف
فیض نے (وہیں لگی ہے) لکھا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فیض
کے ذہن میں "گزند" کے معنی (ضرب) کے ہیں۔ کیونکہ ضرب لگتی ہے اور
گزند پہنچتا ہے۔ اس لفظی غلطی کے قطع نظر یہ شعر معنوی حیثیت
سے بھی مہمل ہے۔

"دو آوازیں" کا یہ شعر

جینے کے فسانے رہنے دو اب ان میں الجھ کر کیا لیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے جب چاہیں گے نبٹا لیں گے

"دھندا" نبٹایا نہیں جاتا۔ جھگڑا نبٹایا جاتا ہے۔
نظم "دوسری آواز" کا یہ شعر

ہستی کی متاعِ بے پایاں جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعل دل بسمل ہے تو کیا رخشاں ہے تو کیا

پہلا مصرعہ نا موزوں ہے۔ دوسرے مصرعہ میں فیض نے مشعل دل کو
"بسمل" کہا ہے۔ پھر اس کی ضد "رخشاں" بیان کی ہے۔ اس سے یہ
واضح ہوتا ہے کہ فیض کے ذہن میں لفظ بسمل کے حقیقی یا مجازی معنی
بجھی ہوئی یا تاریک کے ہیں۔ جب ہی تو رخشاں سے تقابل کیا ہے۔
بسمل عربی لفظ ہے۔ بعض لغت نویسوں نے اس لفظ کی اصل
بسملہ (بسم اللہ) کہنا بتائی ہے اور بعض نے بسم اللہ کا مخفف لکھا
ہے۔ اس لفظ کے حقیقی معنی نیم جان۔ زخمی اور گھائل کے ہیں۔ مجازی
مذبوح اور عاشق۔ فارسی گو شعرا نے ذبح کے معنوں میں بھی استعمال
کیا ہے جیسے صائب

زخون خود رقم بسمل نوشتہ ام بر خاک
وصیتی کہ نخواہند خون بہا از تو

فیض کے شعر میں "بسمل مشعل دل" کے حقیقی یا مجازی کوئی مفید مطلب
معنے نہیں نکلتے۔
دستِ صبا نظم "میرے ہمدم مرے دوست" کے یہ شعر

کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں

"حسیناؤں" کوئی لفظ نہیں۔ یہ جمع نہ تو قیاسی ہے نہ سماعی۔
نظم "صبح آزادی" کا یہ شعر

دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے

مجرد لفظ "بدن" کو کسی ترکیب توصیفی کے بغیر استعمال کرنا معیوب ہے۔

(طالب حیدر آبادی)

۱۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا ہے۔
سب سے بڑا صدق امانت داری ہے۔
سب سے بڑا کذب خیانت ہے۔
سب سے بڑی عقلمندی تقویٰ ہے۔
اور سب سے بڑی حماقت فسق و فجور میں مبتلا ہونا

بازگشت

گزشتہ شمارے میں جو سوالات شائع ہوئے تھے، ان میں جناب منصور علی سبھپال کا سوال سب سے بہتر اور انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اعلان کے مطابق اس ماہ سے ان کے نام ایک سال کے لئے الشجاع جاری کر دیا گیا ہے۔ (ادارہ)

واجد صدیقی چاٹگام

س:۔ حال ہی میں انگریزی کے مشہور شاعر رابرٹ فراسٹ پر ایک مضمون جو ایک اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا ہے میری نظر سے گزرا۔ مضمون نگار نے اس عظیم شاعر کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مشرقی شعراء میں حافظ اور انگریزی شعراء میں ازرا پونڈ سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ انگریزی ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے مضمون نگار کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ اس اختلاف رائے کی بنا پر یہ سوال بازگشت کی نذر ہے۔

ج:۔ واجد صاحب! جہاں تک ہمیں یاد ہے کسی نقاد نے فراسٹ کے بارے میں اس رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ البتہ بعض نقادوں نے یہ ضرور لکھا ہے کہ مشرقی شعراء میں عمر خیام کا فراسٹ پر کسی حد تک اثر ہے اور انگریزی شعراء میں اس نے صرف ورڈسورتھ کا اثر قبول کیا ہے۔ ازرا پونڈ کا فراسٹ سے صرف اس حد تک تعلق ہے کہ اس نے فراسٹ کے پہلے شعری مجموعہ "A Boy's Will" پر تبصرہ کیا تھا۔

اقبال احمد کراچی

س:۔ جب ترقی پسند تحریک عروج پر تھی تو ترقی پسند افسانہ نگاروں نے لذتیت کی خاطر بے شمار عریاں اور فحش افسانے لکھے تھے اس تحریک کے مردہ ہونے پر اردو افسانہ عریانی سے پاک ہو گیا تھا۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ دو تین سال سے ہمارے نئے افسانہ نگار اس روایت کو پھر دہرا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر اردو افسانہ پر جنس کا غلبہ کب تک رہے گا۔

ج:۔ محترم! ہم آپ کی اس رائے سے متفق نہیں ہیں کہ

ترقی پسند افسانہ نگاروں نے لذتیت کی خاطر افسانے لکھے تھے۔ اپنے ادعا کی تائید میں ہم اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر احتشام حسین کے ایک مضمون کی چند سطور پیش کر رہے ہیں۔ ان کے مطالعے سے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔

" ترقی پسندوں کے پیش نظر جو زندگی کی تصویر تھی اس میں جنسی موضوعات محض جنس کی حیثیت سے نہیں بلکہ سماج کی ایک حقیقت کی حیثیت سے آتے ہیں۔ جو پورے سماجی نظام کو درہم برہم کرتی ہے اور توازن بگاڑتی ہے اور اس طرح وہ ایک اہم مسئلہ بن جاتی ہے۔ اس وقت بھی یہ بحث تھی اور آج بھی ہے اور کل بھی ہوگی کہ انسانی زندگی میں جنس کی کیا جگہ ہے اور ادب میں اس کا اظہار کس طرح ہونا چاہیئے۔ یہ سوچنا کہ ہم کسی وقت جنس سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے یا اسے افسانے یا نظم کا موضوع نہیں بنائیں گے یہ محض ایک خیال خام ہے۔ تاہم عہد بہ عہد جنسی تصور کا بدلتے رہنا بھی ایک حقیقت ہے اور جدید افسانہ نگاروں کے لئے قابل غور ہے۔ انہیں سوچنا ہے کہ جب وہ کوئی جنسی موضوع لیں تو اسے سماجی حقیقت کے طور پر پیش کریں یا محض ایک انفرادی رجحان کی حیثیت سے۔ ایک بیماری کی حیثیت سے یا ایک انفرادی کج روی کی حیثیت سے اسے افسانے کا موضوع بنائیں۔ موضوع کے انتخاب میں افسانہ نگار بہت حد تک آزاد ہے۔ لیکن جب وہ پوری طرح اس کو سانچے میں نہ ڈھال سکے تو وہاں افسانہ نگار ناکام ہو جاتا ہے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے وہ لامحالہ زندگی کے مواد اور بکھرے ہوئے حالات سے لئے جائیں گے۔ [illegible]"

اقبال صاحب! ادب اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے [illegible] ممکن ہے کہ اردو میں جنس کے موضوع کو نظر انداز کیا جائے۔

ASH-SHUJA

A TIMES PRESS PUBLICATION

Mansfield Street Sadar Karachi-3

کراچی

ایک رسالہ — گھر کے ہر فرد کیلئے

اجنبی آنکھیں

پیاسا

(عفت سوہانی)

پراسرار روشنی

شاعر کی بیوی

(صفیہ اریب)

مجاز کی انفرادیت

(اشفاق طالب)

ملیریا کا آدم خور

پاکستان
کے نوجوان ذہین مصور
مبین العظیم کی تصاویر کی
نمائش ۱۰ اپریل سے پاکستانی
امریکن کلچرل سینٹر میں ہو
رہی ہے - اس صفحہ پر اس
نمائش کی دو بہترین تصاویر
پیش کی جارہی ہیں

زرد اونٹ

یادیں اور زرد اونٹ یہ دونوں تصاویر
تجریدی اظہاریت کی عمدہ مثال ہیں

یادیں
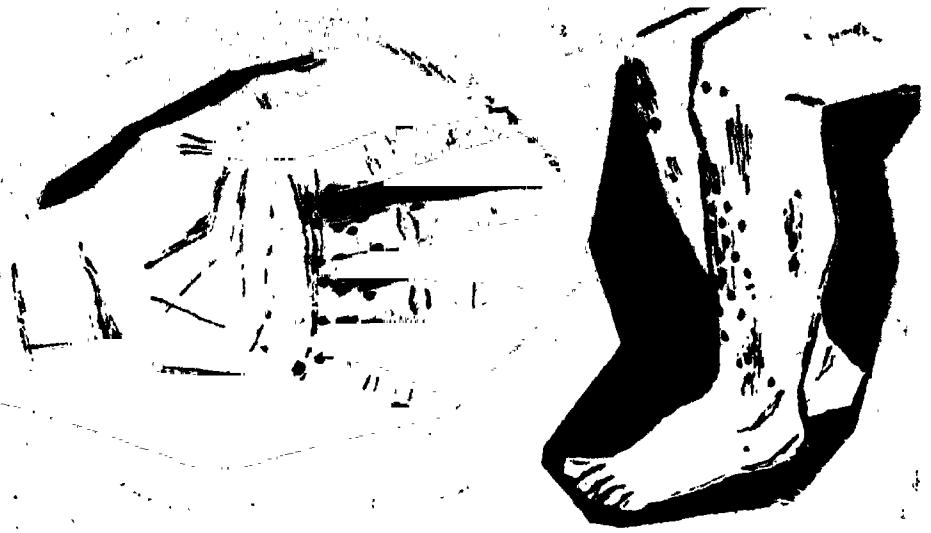
ہمارے نام

تاج سعید

ہر ماہ الشجاع کے ورق ورق پر آپ کی ذہانت کے موتی بکھرے ہوئے دیکھتا ہوں۔ پرچے میں دلچسپی کا سامان بھی ہوتا ہے اور علم و ادب کی چاشنی بھی۔ رشیدہ رضویہ کا رپورتاژ عمدہ ہے۔ انہوں نے اپنی تحریر کے حسن کو نکھارنے کے لئے جو نیا ڈھنگ ڈھونڈا ہے وہ خوب ہے۔ واقعات اور جزئیات کو بیان کرنے کا ڈھنگ انہیں بہت اچھا آتا ہے۔ نظم و غزل میں قدیم و جدید کا امتزاج بھی بھلا لگتا ہے۔ آپ کے ہاں بعض اوقات بڑے عمدہ اشعار پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ (پشاور)

نیرنگ بخاری

آپ قابل مبارکباد ہیں کہ الشجاع میں پابندی سے تحقیقی مضامین شائع کر کے عام پڑھنے والوں میں تنقیدی شعور پیدا کر رہے ہیں۔ مارچ کے شمارے میں غلام ثمانی صاحب کا مقالہ بڑا جاندار ہے۔ انہوں نے ایک اہم موضوع پر پورے غور و فکر کے بعد قلم اٹھا کر اس کے تمام گوشوں کو اجاگر کیا ہے لیکن مجھے مقالہ نگار سے ایک شکایت ہے کہ انہوں نے نئی نسل کے فنکاروں کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ اس دور کے فنکار زیادہ بہتر طریقہ پر انسان دوستی اور امن پسندی کے جذبات کو فروغ دے رہے ہیں۔ اگر غلام سمنانی صاحب نئی نسل کی تخلیقات کا جائزہ لیں تو وہ بھی اس بات کو فراخ دلی سے تسلیم کرنے پر مجبور رہیں گے کہ ان تخلیقات میں انسان دوستی کا بھرپور جذبہ ہے۔ نئے ذہن نے اردو ادب کے دامن کو نئے نئے موضوعات دیے ہیں۔

(حیدر آباد)

صہبا ظہیر

تازہ شمارہ ملا۔ خوب سے خوب تر پایا۔ غزلیں ساری پسند آئیں۔ افسانوی حصہ بھی معیاری ہے۔ ڈرامہ "مجھر" مارکیٹ نے بہت محظوظ کیا۔ بنگالی کہانی "گھاؤ" دراصل ہمارے معاشرے کا وہ گھاؤ ہے جس کا درد ہم سب محسوس کر رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر سوشلزم کی روح جاگ اٹھے اور عدم مساوات ختم ہو جائے۔

(مردان)

شبیر احمد

کئی مہینے بعد سرور جمال کا انشائیہ شائع کر کے آپ نے طنز و مزاح کے عنوان سے انصاف کیا ہے۔ سرور جمال نے گو حال ہی میں لکھنا شروع کیا ہے پھر بھی مختصر مدت میں انہوں نے اپنے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ قائم کر لیا ہے۔ اگر وہ پابندی سے لکھتی رہیں تو مجھے یقین ہے کہ بہت جلد ان کا شمار اردو کے ممتاز مزاح نگاروں میں ہونے لگے گا۔ ان کے مضامین میں جو ندرت اور بے ساختگی ہے وہ اس دور کے مزاح نگاروں کی تخلیقات میں بہت کم ہے۔ (ملتان)

قمر ندیم

تازہ شمارے میں پال سارجنٹ کا مضمون "پلاسٹک بم" بہت پسند آیا۔ اس قسم کے مضامین کی خوبی یہ ہے کہ یہ دلچسپ بھی ہوتے ہیں اور معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ میری رائے ہے کہ آپ اس قسم کے مضامین پابندی سے شائع کریں۔ اختر ملیح آبادی نے ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ اس پر طبعزاد کا گمان ہوتا ہے۔ (چاٹگام)

نعیمہ عثمانی

فکر و خیال کے تحت جناب شبنم رومانی کا مضمون "اردو غزل میں متانت آمیزی" نظر سے گزرا۔ مجھے توقع تھی کہ فاضل مضمون نگار اس موضوع پر تفصیل سے بحث کریں گے لیکن انہوں نے موضوع کو نظر انداز کر کے صرف حضرت دل شاہجہاں پوری کی ادبی عظمت تسلیم کرانے کی سعی کی ہے۔ اس طرح وہ مقصد حاصل نہ ہوا جس کے تحت یہ مضمون شائع ہوا ہے۔ البتہ ایک بات اس مضمون میں چونکا دینے والی ضرور ہے کہ فاضل مضمون نگار میر و غالب کا شمار بھی متین شعراء میں نہیں کرتے ہیں۔ (لائل پور)

شفیق احمد

میں پابندی سے الشجاع کا مطالعہ کرتا ہوں اس کی تمام تخلیقات بہت معیاری اور بلند پایہ ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ہر ماہ نگار ادب کے چاہنے والوں کی خدمت میں ادب عالیہ کا حسین اور دلربا گلدستہ پیش کرتا ہے۔ پرچے کی ترتیب پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

(ڈھاکہ)

منظور شدہ محکمہ تعلیمات بموجب سرکلر نمبر ڈی ای/ آر ٹی سی ۶۶۲۲۹ - ۸۹/۶۴
مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۶ء

: ترتیب :

ایس ایم غیاث الدین سلمان ارشد

: طابع و ناشر :

ایس ایم شجاع الدین

: زیر اہتمام :

سلطان کلیم

زر سالانہ : پانچ روپے —— فی شمارہ : پچاس پیسے
فون نمبر : ۵۲۳۳۳ (پریس) —— ۵۵۲۱۲ (شعبہ ادارت)

شعبہ نشر و اشاعت

ٹائمز پریس

مینسفیلڈ اسٹریٹ - صدر - کراچی

ایس ایم شجاع الدین پرنٹر پبلشر نے ٹائمز پریس صدر کراچی سے چھپوا کر
ماہنامہ الشجاع صدر کراچی سے شائع کیا۔

اس شمارے کے چند فنکار

- ارشد تھانوی
- کرشن چندر
- عفت موہانی
- شرون کمار ورما
- تاج سعید
- مخمور سعیدی
- ڈاکٹر عزیز تمنائی
- ڈاکٹر حیدر شاہین
- پروفیسر منظر ایوبی
- پروفیسر عنوان چشتی
- رشیدہ رضویہ
- خورشید جامی
- ندا فاضلی
- اشتیاق طالب
- عوض سعید
- جم جونیئر
- بشر نواز

ان کے علاوہ
اور دوسرے

التماس . . . . ناشر . . . ۵

تصویری فیچر

بہاسمان رشی . . . عبدالجلیل قریشی . . . ۶

تحقیق و تنقید

مجاز کی انفرادیت . . . اشتیاق طالب . . . ۱۲

شعری ادب

مات کا نوحہ . . . محمود سعیدی . . . ۱۶

سود و زیاں . . . منظر امام . . . ۱۷

ترغیب . . . حیدر شاہین . . . ۱۷

جستجو . . . ڈاکٹر عزیز تمنائی . . . ۱۸

قطعات . . . عنوان چشتی . . . ۱۸

غزل . . . ارشد تھانوی . . . ۱۹

غزل . . . تاج سعید . . . ۲۰

غزل . . . خورشید جامی . . . ۲۰

غزل . . . منظر ایوبی . . . ۲۱

غزل . . . روشن نگینوی . . . ۲۱

غزل . . . حزیں لدھیانوی . . . ۲۲

غزل . . . عنبر چغتائی . . . ۲۲

افسانے

تعلان . . . شمعون کمار وردھا . . . ۲۳

پیاسا . . . عفت موہانی . . . ۲۶

گمراہ . . . رضیہ رضوی . . . ۳۲

طنز و مزاح

شاعر کی بیوی . . . صفیہ ادیب . . . ۳۶

سچی کہانی

تبسرگی . . . انجم اختر . . . ۴۰

فکر و خیال

نئی نظم . . . ندا فاضلی . . . ۴۵

شکاریات

شکاریوں کے ہتھیار . . . طغرل ترکمان . . . ۴۹

سیر و سفر

بغداد کی چاندنی . . . رشیدہ رضویہ . . . ۵۲

مسلسل ناول

آدم خور . . . جم جونیئر . . . ۵۵

حاصل مطالعہ

اجنبی آنکھیں . . . کرشن چندر . . . ۶۳

نقش قدم . . . عوض سعید . . . ۶۸

تضاد (نظم) . . . زبیر رضوی . . . ۷۱

سچ (نظم) . . . بشر نواز . . . ۷۱

مستقل عنوانات

ہمارے نام . . . قارئین . . . ۲

بازگشت . . . ادارہ . . . ۷۲

سرورق :- ایرانی فنکارہ شہپارہ

الشجاع کی پندرہ سالہ علمی ادبی روایات کے مطابق زیر نظر شمارہ برصغیر ہند و پاک کے ممتاز فنکاروں کی متنوع تخلیقات پر مشتمل ہے۔ اِس بار تحقیق و تنقید کے تحت "مجاز کی انفرادیت" کے عنوان سے اِشتیاق طالب کا ایک مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔

یہ اردو ادب کا المیہ ہے کہ ہم اپنے ممتاز فنکاروں کی موت کے بعد انہیں بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ لیکن مجاز کی یہ خوش قسمتی یا بے مہریٔ عالم کا صلہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی زمانہ ابھی تک اسے یاد کر رہا ہے۔ زیر نظر مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مضمون نگار نے مجاز کی شاعری کا بہ نظر غائر مطالعہ کرکے اور ذاتی پسند و ناپسند سے بلند ہوکر "مطرب بزم دلبراں" کی شاعری کی قدر و قیمت کا تعین اور تجزیہ کیا ہے۔

اِس مضمون کے علاوہ نئی نظم سے متعلق ندا فاضلی کے ایک ہندی مضمون کا ترجمہ پیش ہے۔ گزشتہ دو تین سال سے جدید شاعری اور نئی و پرانی نسل کے ذہنی تضاد پر جو بحث چھڑی ہوئی ہے یہ مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس سلسلہ میں دوسرے لکھنے والوں کے لئے بھی الشجاع کے صفحات حاضر ہیں۔ اِس ذیل میں اس کا اِظہار ضروری ہے کہ الشجاع نہ تو گروہ بندی کا قائل ہے اور نہ کسی خاص حلقۂ فکر کے لئے مخصوص ہے۔ الشجاع کے صفحات ہر مکتبۂ خیال کے فنکاروں کی معیاری نگارشات کے لئے وقف ہیں۔ طنز و مزاح کے تحت مارچ کے شمارے سے مضامین کا ایک نیا سلسلہ "مصیبت ہے ـــــ کی بیوی ہونا" شروع کیا گیا تھا۔ گزشتہ شمارے میں سرور جمال کا طنزیہ شائع ہوا تھا۔ اِس بار صفیہ آپا کا طنزیہ "مصیبت ہے شاعر کی بیوی ہونا" نذر قارئین ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ قارئین الشجاع مضامین کے اس سلسلہ کو پسند کریں گے۔

"اردو غزل میں متانت آمیزی" کے عنوان سے گزشتہ شمارے میں جو مضمون شائع ہوا تھا ہماری توقعات کے مطابق علمی ادبی حلقوں نے اس موضوع کی اہمیت کو محسوس کرکے مکاتیب کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ اِس سلسلہ میں چند مضامین بھی موصول ہوئے ہیں جن میں مضمون نگار یا تبصرہ نگار کی حمایت یا مخالفت میں جذباتی انداز میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اصل موضوع پر تعمیری نقطۂ نظر سے بہت کم مواد ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مضامین "بحث برائے بحث" کا مفہوم تو ادا کر سکتے ہیں لیکن افادی نوعیت کے حامل نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے یہ مضامین ہمارے انتخاب میں نہیں آ سکے۔ ہمیں امید ہے کہ مضمون نگار اس کا کوئی ناخوشگوار اثر قبول نہیں کریں گے۔

افسانوی اور شعری حصّہ اس بار انفرادی نوعیت کا حامل ہے۔ امید ہے کہ یہ منفرد تخلیقات آپ کے ذوق سے ہم آہنگ ہوں گی۔

آپ کا مخلص
شجاع الدین
ناشر

مترجمہ: عبدالجلیل قریشی

پُراسرار روشنی

بے گور و کفن جسموں سے جُدا ہونے والی روحیں انتہائی مضطرب اور بے چین تھیں!!

ہم کو سفر کرتے ہوئے چھ ہفتے ہو چکے تھے لیکن ابھی تک کہیں نہیں پہنچ سکے تھے۔

دورانِ سفر کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے ملے جہاں لنگر انداز ہونے کے بعد مسافر اور عملے کے لوگ جزیروں میں جاتے اور مقامی باشندوں سے کپڑے، لوہے کے معمولی اوزار، بسکٹوں اور کپڑوں کے عوض شہد، پھل اور دوسری تازہ چیزیں خریدتے تھے۔

سفر طویل ہوتا جا رہا تھا۔ ہمارا خیال تھا کسی بڑے جزیرے میں لنگر انداز ہوں تاکہ کسل بھی دور ہو اور کاروبار بھی بہتر طریقے پر ہو سکے۔

ہمارے اس دو مستول کے جہاز کی کمان جان اسٹون نامی ایک انگریز کے ہاتھ میں تھی۔ جہاز کافی بڑا تھا اس میں مسافروں کے لئے کافی تعداد میں کمرے تھے۔ اس کے علاوہ پینے کا پانی اور سامان خوردنی ذخیرہ کرنے کا بہت اچھا انتظام تھا۔

جان اسٹون اور اس کا اسسٹنٹ اپنے فن میں کافی ماہر تھے۔ ان کے علاوہ مارکونس کے بارہ ملازم تھے جن کو جہاز رانی کا وسیع تجربہ تھا۔ میں اس جہاز پر ایک مسافر کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔ کافی طویل علالت سے صحت یاب ہونے کے بعد ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی مجھے کچھ دنوں کے لئے سمندر میں سفر کرنا چاہیے۔

یہ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ راتیں بڑی دلکش تھیں۔ میں تو اکثر آدھی رات تک ڈیک پر فضا سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ اس وقت ہم جزائر "پاساوا" میں سفر کر رہے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جزیروں کا ایک سلسلہ ہے جس میں جہاز چلانا انتہائی مشکل ہے۔ ذرا سی غلطی کی بنا پر جہاز کسی بھی لمحہ چٹانوں سے ٹکرا سکتا تھا جو اس سمندر میں کثرت سے تھیں۔ جس رات کا میں ذکر کر رہا ہوں اس رات چاند پوری طرح نکلا ہوا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور ابر کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ چاندنی میں فاصلے پر افق کی سیاہی دکھائی دے رہی تھی۔ آج چاند اتنی آب و تاب کے ساتھ نکلا ہوا تھا کہ اگر کوئی شخص چاہے تو ڈیک پر بیٹھ کر بڑی آسانی کے ساتھ کتاب پڑھ سکتا تھا۔ جہاز آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ لہریں ٹکراتیں اور واپس ہو جاتیں۔ کبھی کبھی کوئی بڑی مچھلی اچھال بھرتی اور پھر گر کر پانی میں غائب ہو جاتی۔

میں ڈیک پر کھڑا ہوا تھا کہ جان اسٹون بھی میرے پاس پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ "کتنی خوبصورت رات ہے اس وقت ہم سمندر کے ایسے سفر کر رہے ہیں کہ موسم کسی وقت بھی بدل سکتا ہے۔" جان اسٹون نے مغرب کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں کہیں

کچھ دکھائی دے رہا ہے؟"

جیمز نے اسٹون کے اشارے کی جانب دیکھا۔ بہت دور افق کے قریب سیاہ ابر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "ہاں یہ ابر ہے۔ اور معمولی ابر نہیں ہے بلکہ اس میں بارش، آندھی، طوفان سب کچھ بھرا ہوا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد جہاز میں آدھے گھنٹے کا گھنٹہ بجا۔ اس وقت یہ ابر جہاز کے اوپر آ چکا تھا۔ اور جب آدھے گھنٹے کے بعد دوبارہ ایک بجے کا گھنٹہ بجا تو ابر حد نظر تک پھیل چکا تھا۔ ہوا بھاری ہو چکی تھی اور تیز جھکڑ چلنا شروع ہو گئے تھے۔ بجلی کی چمک ہر لمحہ آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ دلوں کو ہلا دینے کے لئے کافی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ آج آسمان اپنا تمام پانی برسا دے گا۔ موجیں یوں دکھائی دے رہی تھیں کہ ایک پہاڑ آ رہا ہے۔ وہ جہاز سے ٹکراتا، جہاز ایک جانب جھک جاتا اور پھر سنبھلنے بھی نہ پاتا کہ دوسری جانب سے موجوں کا پہاڑ ٹکراتا اور جہاز چرچرا کر ڈولنے لگتا۔

طوفان کی ہولناکی اپنی جگہ پر تھی، لیکن جہاز پر موجود جانوروں نے الگ طوفان اٹھا رکھا تھا۔ اس جہاز پر منجملہ اور چیزوں کے کچھ بیل بھی تھے۔ یہ بیل بڑے طاقتور اور اچھی نسل کے تھے۔ ان کا مالک ایک مسافر تھا جس کے پاس بیلوں کے علاوہ ایک کریٹ میں سانپ اور دوسرے کریٹوں میں مختلف قسم کے حشرات الارض تھے۔ جہاز والے اس لاؤ لشکر کو لے جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ لیکن جب اس نے معاوضے میں کافی رقم ادا کی تو جہاز والے آمادہ ہو گئے۔ بس کا مالک یہ تمام چیزیں کسی اچھی منڈی میں فروخت کرنے کا منتظر تھا تاکہ کافی رقم حاصل کر سکے۔

طوفان میں سانپوں کا کریٹ ٹوٹ چکا تھا اور چھ سانپ جہاز میں غائب ہو چکے تھے۔ کپتان جان اسٹون نے فوراً حکم دیدیا کہ جہاں کہیں بھی یہ سانپ نظر آئیں ان کو ختم کر دیا جائے۔ مالک اسٹریچر لئے ہوئے ان کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ بمشکل وہ چار سانپ پکڑنے میں کامیاب ہوا۔ دوسرے دو سانپوں کو بڑی جستجو کے بعد تلاش کر کے مسافروں نے مار ڈالا۔

ویران جزیرے میں پھل دار درخت کثرت سے تھے

بیلوں نے الگ اودھم مچا رکھا تھا۔ انھوں نے اپنی رسیاں تڑالی تھیں اور ردمن اکھاڑوں کی طرح چاروں طرف دوڑیں لگا رہے تھے۔ جہاز کا عملہ انتہائی پریشانی کے عالم میں تیزی کے ساتھ جہاز کو سنبھالنے میں لگا ہوا تھا۔ دوسرے لوگوں کو پیر ٹکا کر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ دوسری طرف ان سرکش بیلوں کو باندھنا بھی ضروری تھا۔ لوگوں نے پھندے بنا بنا کر پھینکنا شروع کئے۔ آخر بڑی مشکل کے بعد ان پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکے۔

جان اسٹون نے فوراً بادبان گرانے کا حکم دیا لیکن ایسے وقت میں بادبانوں کا گرانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ ہیڈ بولتے بل ہی تھا جو تنہا مستولوں پر چڑھا اور پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بادبان گرانے لگا۔

طوفان اس وقت شباب پر تھا۔ عملہ جان کی پرواہ کئے بغیر ہر صورت سے جہاز کو سنبھالنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ یہ لوگ اس وقت بجلی کی طرح کام کر رہے تھے۔

سب مسافر طوفان کی لپیٹ سے بچنے کے لئے نچلے درجوں میں دبکے بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دعاؤں میں مصروف تھے۔ کچھ آنے والے وقت کے منتظر تھے۔ بعض کمزور دل مسافروں کی حالت غیر تھی۔ [illegible]

ملاح بے ہوش و حواس میں نہیں تھے۔ ان پر دہشت طاری تھی اور وہ خوف کی کیفیت میں مبتلا ہو کر بری طرح رو رہے تھے۔

کافی دیر کے بعد طوفان کا زور کم ہوتا شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ بارش ختم ہو گئی۔ ہوا تھمنے کے بعد ماحول پہلے کی طرح پرسکون ہو گیا ایک جانب دور سیاہی میں کبھی کبھی بجلی کی چمک دکھائی دے رہی تھی لیکن دوسری جانب آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ لیکن ہمارا جہاز اس طوفان میں گھرنے کے بعد اصل راستے سے ہٹ کر نہ معلوم کہاں پہنچ چکا تھا۔

اس وقت جہاز میں چھ بار گھنٹہ بجا۔ جس کا مطلب رات کے تین بجے کا تھا۔ لیکن ابھی جہاز کا گھنٹہ بجکر خاموش ہی ہوا تھا کہ یکایک دور سے ہمارے گھنٹے کے جواب میں کسی دوسرے جہاز کا گھنٹہ بجنے کی آواز سنائی دی۔

"یہ کیا ہے۔؟" جان اسٹون نے حیرت کے ساتھ پاس کھڑے ہوئے کوارٹر ماسٹر سے پوچھا۔

"گھنٹے کی آواز" کوارٹر ماسٹر نے بھی اسی حیرت کے ساتھ جواب دیا۔

"مسٹر تم نے بھی آواز سنی ؟"

"جی ہاں سنی ہے" میں نے جواب دیا

"کسی اور نے بھی سنی ہے ؟" جان اسٹون نے پوچھا۔

"ہم نے سنی ہے" ہیڈ بولتے بولتے کہا۔ اس کے بعد جتنے ملاح وہاں موجود تھے سب نے تصدیق کی۔

اسٹون نے ایک آدمی کو مستول پر چڑھنے کا حکم دیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے چلاتے ہوئے کہا "روشنی"

"روشنی ؟" اسٹون نے چلاتے ہوئے پوچھا

"ہاں روشنی۔ ذرا ٹھہرو۔۔۔۔ ایک منٹ صبر کرو۔۔۔ ہاں ہاں روشنی ہی ہے۔ بالکل روشنی ہی ہے اور اگر یہ روشنی نہیں ہے تو پھر کیا ہے ؟"

چند لمحوں کے بعد روشنی ڈیک پر سے بھی صاف دکھائی دینے لگی۔

میں نے بھی اسے دیکھا۔ مگر یہ جہاز کی روشنی کی طرح بہت تیز نہیں تھی اس کا رنگ زرد تھا۔ جب میں نے تعجب سے اس کی جانب غور سے دیکھا تو وہ غائب ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد دوبارہ نظر آئی۔ لیکن اس بار وہ پنڈولم کی طرح دائیں بائیں متحرک تھی۔ اور کچھ دیر کے بعد غائب ہو گئی۔ روشنی کے غائب ہونے کے بعد

ویران جزیرے میں خلیج کے کنارے پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر

گھنٹے کی آواز پھر سنائی دی لیکن اس بار اس کے بجنے میں جہازی گھنٹے کی طرح ترتیب اور تسلسل نہیں تھا۔

یکایک کسی نے چیخ کر کہا کہ روشنی پھر نظر آ رہی ہے۔ ایک بار روشنی بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ہر شخص اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس بار روشنی زرد اور آسمانی رنگ کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص لالٹین لئے ہوئے جہاز کے ڈیک پر چل رہا ہے۔ ہمارے جہاز کا ہر ایک شخص آنکھیں گاڑے ہوئے اس پراسرار روشنی کو دیکھ رہا

تھا۔ ایسا ایکی روشنی سمٹتی ہوئی شعلہ کی صورت میں دکھائی دینے لگی۔ پھر یہ شعلہ آسمان کی جانب بلند ہوتا دکھائی دیا اور چند ثانیوں میں فضا میں غائب ہو گیا۔

شعلہ غائب ہونے کے بعد کوئی نئی بات ظہور میں نہیں آئی۔ اب دن نکلنے والا تھا۔ ہر طرف روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ چھ بج چکے تھے۔ بل مستول پر چڑھا تاکہ ماحول کا جائزہ لے سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد زور سے اس کی آواز سنائی دی۔ "زمین ۔۔۔ اوہو زمین"۔

ایسا معلوم ہو رہا تھا بل کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔

"زمین ؟"

اسسٹنٹ فلپ نے چلاتے ہوئے کہا "کہاں ہے بل ؟"

"مشرق کی جانب دیکھو۔" بل نے خوشی کے لہجہ میں جواب دیا۔ "وہ جہاں سفید بادل کمان کی طرح ہے"

اس وقت سورج نکل رہا تھا۔ زرد دھوپ چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ روشنی ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگوں نے بھی غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سب کی متفقہ رائے تھی کہ یہ زمین ہی ہے۔ اب سورج اچھی طرح چمک رہا تھا۔ جان اسٹون نے دوربین سے دیکھنا شروع کیا۔ اس نے بتایا کہ ریتیلا ساحل، درخت اور پہاڑیاں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔

کپتان نے کوارٹر ماسٹر سے سمت معلوم کی جس نے قطب نما دیکھنے کے بعد بتایا کہ زمین مشرق اور شمالی سمت میں واقع ہے۔ دونوں نیچے گئے اور میز پر نقشہ پھیلا کر اس میں زمین کو تلاش کرنا شروع کیا۔ لیکن نقشہ میں اس نامعلوم جزیرے کا کہیں وجود نہیں تھا۔

"میرا خیال ہے کہ روشنی اور گھنٹے کی آواز بھی اسی گمنام جزیرے سے آ رہی تھی" جان اسٹون نے نقشہ لپیٹتے ہوئے کہا۔

میری رائے ہے کہ ہمیں جزیرے میں چلنا چاہئے۔ وہاں لوگوں سے ملنے کے بعد شاید ان پراسرار حالات سے واقف ہو سکیں" کوارٹر ماسٹر نے کہا۔

ایک گھنٹے کے بعد ہمارا جہاز ساحل کے قریب لنگر انداز ہو چکا تھا۔ ہم لوگ کشتیوں پر بیٹھ کر ساحل پر پہنچے۔ سامنے تقریباً ایک میل تک ریتیلا ساحل تھا۔ پھر سرسبز درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ سامنے پہاڑی تھی جس پر کثرت سے درخت تھے۔ پھلدار درختوں کے علاوہ ناریل کے درخت بھی کثیر تعداد میں تھے۔ سانپ اور دوسرے حشرات الارض کے علاوہ پرندے بھی کثرت سے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب انسانی وجود سے قطعی ناواقف ہیں۔ ہم سے کوئی بھی خائف نہیں تھا۔ یہ جزیرہ انسانی آبادی سے خالی تھا۔ یہ بات تعجب خیز تھی حالانکہ جزیرہ شاداب تھا اور پانی کی جھیلیں بھی تھیں۔

پہاڑی پر چڑھنے کے بعد ہماری نظروں کے سامنے پھیلا ہوا سمندر تھا۔ یہاں سے ہر شخص دوسرا جہاز دیکھنے کی کوشش میں تھا۔ لیکن دور دور تک کسی جہاز کا نام و نشان نہیں تھا۔

یعنی گھنٹے کی آواز اور روشنی دونوں ہی پس پردہ تھے۔

ہم لوگ اس سلسلے میں ابھی تبادلہ خیالات ہی کر رہے تھے کہ یکایک پھر گھنٹے کی آواز سنائی دی۔ سب گھنٹے کی آواز کو غور سے سن رہے تھے۔ اندازہ یہ ہوا کہ آواز خلیج سے آرہی ہے۔ یہ خلیج یہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلہ پر تھی۔

ہم لوگ تیزی سے چل کر خلیج پر پہنچے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد گھنٹہ ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ خلیج کے کنارے بڑے بڑے شہتیروں سے بنائی ہوئی ایک پرانی کشتی پڑی تھی اسی میں ایک کھڑے شہتیر میں گھنٹہ بندھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک موٹا تار کنارے پر کھڑے ہوئے بلند ناریل کے درخت سے اس طرح بندھا ہوا تھا کہ تار کا سرا درخت سے بھی اوپر دو تین فٹ نکل گیا تھا۔ اس تار کا دوسرا سرا کشتی کے نیچے تک گیا تھا۔ غالباً کسی شہتیر سے بندھا ہوگا۔ یہ تار کافی موٹا تھا۔ جس وقت ہوا چلتی تو یہ گھنٹے سے رگڑ کھاتا۔ اور گھنٹہ بجنے لگتا۔

ملاح گھنٹہ کھول کر کنارے پر لائے۔ لیکن اس سے کچھ پتہ نہیں چلا۔ کیونکہ گھنٹے پر لکھی ہوئی عبارت کو زنگ نے اس طرح کھا لیا تھا کہ حروف بالکل سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ اس تار کے ذریعہ روشنی ظاہر ہوتی ہو؟" جان اسٹون نے بڑی دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ لیکن اس بارے میں کوئی شخص بھی فیصلہ کن رائے نہیں دے سکتا تھا۔ یہ چیز ہر شخص کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر بھی میں نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا "میرے خیال میں یہی تار ہی روشنی کا سبب ہو سکتا ہے۔"

جب ہم گھنٹے کو لیکر واپس ہوئے تو تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ جھونپڑی بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک خطہ زمین ایسا تھا جس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں شجر کاری کی گئی تھی۔ غالباً یہ باغ ہوگا۔ لیکن اب تو اس زمین پر گھاس پھوس اگا ہوا تھا۔

جھونپڑی کافی بڑی تھی۔ اس کی چھت غائب تھی۔ دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا تھا کہ یہ موسمی تغیرات کی وجہ سے تباہ نہیں ہوئی ہے بلکہ انسانی ہاتھوں نے اسے تباہ کیا ہے۔ اس کی حالت دیکھنے کے بعد سب یہ سوچنے لگے کہ اس کو بنانے والا کون ہو سکتا ہے اور تباہ کرنے والے کون ہو سکتے ہیں؟"

یکایک دور سے ہمیں ہیڈ بولنے بل کی آواز سنائی دی۔ وہ ایک ٹیلہ پر کھڑا ہوا چلا رہا تھا "ہڈیاں — یہاں ہڈیاں پڑی ہیں۔"

"ہڈیاں؟" جان اسٹون نے زور سے پوچھا "ہڈیاں کہاں ہیں؟"

"ہاں ہاں — اس طرف سے آیئے"

ہم لوگ تیزی سے ٹیلے پر پہنچے جس کے نیچے ایک ڈھلان تھا۔ یہ جگہ جھونپڑی سے تقریباً دو گز دور تھی اور چاروں طرف سے چٹانوں میں گھری ہوئی تھی۔ اسی جگہ انسانی ڈھانچے پڑے ہوئے تھے۔ جو بالکل سفید ہو چکے تھے ٹیلے کے قریب ساحل پر ایک کشتی الٹی پڑی تھی ہم لوگوں نے اسے سیدھا کیا جس کے نیچے سے ایک زنگ آلود چاقو اور دو فیتے ملے۔ یہ فیتے اسی طرح کے تھے جیسے فجی کے قبائل استعمال کرتے ہیں۔

ہماری نظروں کے سامنے اب ان بدنصیب انسانوں کا نقشہ تھا جنہوں نے جھونپڑی بنائی۔ باغ لگایا اور یہاں رہائش اختیار کر لی تھی۔ لیکن قبائلیوں کو ان کی سکونت شاید پسند نہیں تھی اور انھوں نے موقع پاکر ان کو قتل کر ڈالا۔ یہ انسانی ڈھانچے پانچ تھے جن میں سے دو عورتوں کے ڈھانچے تھے۔

مجھے جھونپڑی میں سے ایک بکس بھی ملا۔ اس کی لکڑی اسقدر بوسیدہ ہو چکی تھی کہ کھولنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ اس میں سے کوئی خزانہ نہیں نکلا بلکہ ایک ملاح کی جیکٹ اور ایک جوڑ زنانہ جوتے تھے۔

اب ہمارے لئے یہاں مزید ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس لئے جہاز پر واپس جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہم نے جھونپڑی پر آخری نظر ڈالی یہ یورپین طرز کی بنی ہوئی تھی۔ لیکن یہ کون لوگ تھے اور جزیرے میں کیسے پہنچے؟ — یہ سوال ناقابل حل تھا۔

ہم نے قبریں کھود کر ہڈیوں کو دفن کیا اور بڑے گھنٹے کو لے کر بمشکل جہاز پر پہنچے۔

دوسرے دن ہمارا جہاز ایک آباد جزیرے میں پہنچا۔ مقامی باشندے دستور کے مطابق ہمیں خوش آمدید کہنے کے لئے چھوٹی کشتیوں اور ڈونگوں میں بیٹھ کر جہاز پر آنا شروع ہو گئے۔ جان اسٹون نے ازراہ مذاق ڈیک پر ٹنگے ہوئے پرانے گھنٹے کو دو تین بار بجایا لیکن ہمیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ گھنٹے کی آواز سن کر راستہ میں ہی ہر کشتی اور ڈونگا ٹھہر گیا اور پھر چشم زدن میں وہ سب کنارے کی جانب تیزی سے واپس ہو رہے تھے۔

پرانے گھنٹے کی آواز کو سن کر قبائلیوں کے واپس ہونے پر ہمارا شبہ اصلیت اختیار کر گیا اور اب یہ بات صاف ظاہر تھی کہ ان کے ہی دادا پردادا نے اس ویران جزیرے میں بسنے والے ان افراد کو قتل کیا تھا جنھوں شاید جہاز تباہ ہونے کی وجہ سے اس جزیرے میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

گھنٹے کی آواز سن کر جزیرے میں رہنے والے قبائلیوں کی واپسی نے ایک راز کو تو بے نقاب کر دیا تھا مگر روشنی کہاں سے آتی ہے کیسے آتی ہے؟ اس راز پر ابھی پردہ پڑا ہوا تھا۔ غور و فکر کے باوجود بھی جہاز کے سارے لوگ اس پراسرار روشنی کا معمہ حل نہیں کر سکے۔ بیشتر ملاحوں اور مسافروں کی یہ رائے تھی کہ یہ روشنی دراصل گزرنے والے جہازوں کے لئے ایک سگنل تھا ان کی روحوں کی جانب سے جن کے جسم بے گور و کفن اس ویران جزیرے میں پڑے ہوئے تھے۔ اس روشنی اور شعلہ کا مطلب یہ تھا کہ کوئی جہاز اس جزیرے میں آئے اور اس کے عملے کے لوگ ان لاشوں کو دفن کر دیں جن کی بے کسی سے ان جسموں سے جدا ہونے والی روحیں مضطرب اور بے چین تھیں۔ بظاہر یہ قیاس آرائی مضحکہ خیز تھی۔ لیکن اس قیاس کو تقویت اس بات سے پہنچی کہ ہم نے اس کے بعد اس روشنی اور شعلہ کو دیکھنے کے لئے دو راتیں اس جزیرے کے قریب گزاریں لیکن پھر یہ روشنی اور شعلہ نظر نہیں آیا۔ کیونکہ لاشوں کی تدفین کے بعد شاید روحوں کا اضطراب ختم ہو گیا تھا۔

(آزاد ترجمہ)

زندہ ادب

کی راہ اردو میں جہاں اس حد تک صاف ہوتی ہے کہ اس کی ماہیت کا شعور اور اس کی ضرورت کا احساس عام ہو گیا ہے وہاں اس کی راہ میں ایک اور سنگ گراں حائل ہے، جسے دور کرنے کے لئے ہمیں ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑے گا۔ ہمارے ادیب زیادہ تر اور شاعر کمتر صحت مند اور جاندار ادب کے خالق سمجھے جانے کے شوق میں یہ غضب کر رہے ہیں کہ ترقی یافتہ ملکوں کے ادب کے منتخب نمونے کے گران کا چربہ اردو میں اتار لیتے ہیں۔ اور اسے اپنی اپج کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محض اخلاقی بددیانتی ہی نہیں بلکہ اصلیت کا منہ چڑانا ہے۔ جو فن کی شرح میں اس سے بھی بدتر گناہ ہے۔ اس لئے کہ یہ نقلیں کتنی ہی کامیاب کیوں نہ ہوں ان کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہوتی جیسے کسی ماہر فن نقاش کے شاہکار کا عکسی فوٹو لیا جائے جس میں اصل کے موٹے موٹے خد و خال تو آ جاتے ہیں لیکن وہ باریکیاں اور نزاکتیں نہیں آتیں جن سے تصویر میں جان پڑتی ہے۔ اگر ہم زندہ ادب پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ——————

ہمارے نقادوں

کو اپنی نظر اجتہاد کو تیز اور احساس مروت کو کند کر کے ان ادبی چوریوں کو پکڑنا اور بے تکلف ظاہر کرنا چاہیے۔ ورنہ جب تک یہ چوری کا مال ادبی بازار میں [illegible] کسی ادیب یا شاعر کو کیا پڑی ہے کہ اچھوتے خیالات کا زر خالص کھود کر نکالے اور اسے اصل کی ٹکسال میں ڈھالنے کی زحمت اٹھائے۔

(ڈاکٹر سید عابد حسین)

مجاز کی انفرادیت

مجاز کے ہاں جو کچھ ہے تجربہ کی آنچ سے کندن ہو کر نکلا ہے۔ کھلنڈرا پن، معصومیت، مستی و سرمستی، رندی و سرشاری۔ ہنستے ہنستے زندگی کے غم جھیل جانا۔ بزم نگاراں میں اپنے آپ کو غرق مئے ناب کر لینا، اور مجاہد کی طرح قدم اٹھا کر پیچھے نہ لوٹنا۔ مجاز کی شخصیت کے بنیادی عناصر ہیں۔

مطرب بزم دلبراں مجاز ایک ایسے روشن خیال اور کھاتے پیتے خاندان کا چشم و چراغ تھا جو ایک طرف پرانی تہذیب اور قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے تھا تو دوسری طرف نئی تہذیب اور رجحانات کو بھی خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ یہی دونوں خصوصیات ہمیں مجاز میں بھی ملتی ہیں۔ بڑوں کی عزت و احترام اپنے ہم عصروں اور چھوٹوں کے ساتھ محبت و شفقت کا جذبہ بھی ملتا ہے ایک طرف اس کے یہاں حسن پرستی اور جذباتیت ملتی ہے تو دوسری طرف سادگی، معصومیت، خلوص و پیار اور بانکپن۔ مجاز کے یہاں نام نہاد تقسیم کا دکھاؤ۔ وضعداری، غرور و تکبر، امیر و غریب کی تفریق نہیں ملتی۔ جو ایک دولت کے پرستار لوگوں کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ وہ صحیح معنی میں انسان تھا انسانی قدروں کا حامل، انسان دوست اور انسانی عظمت کا علمبردار!

مجاز بچپن ہی سے متین و سنجیدہ تھا لیکن بچوں کی سی شوخی و شرارت بھی تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں وہ ہر ایک کا دوست تھا۔ علی گڑھ کے ماحول میں اس کی ذہنی جلا ہوئی۔ اس کی شاعری میں رنگینی پیدا ہوئی۔ اپنی معصومیت، بھولپن اور محبت سے ہر ایک کے دل میں گھر کرتا چلا گیا۔ ہر ایک نے اس سے دوستی کی اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اسی دور میں نہ صرف اس کی شاعری میں نکھار پیدا ہوا بلکہ سیاسی اور سماجی شعور بھی پیدا ہوا۔ دراصل علی گڑھ کا دور مجاز کی زندگی کا ایک حسین دور بھی ہے اور نیا موڑ بھی۔

[illegible]

مجاز ایک غنائی شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں جام و مینا، شمشیر و سناں اور حسن و عشق کی آمیزش ہے۔ اس میں شیفتگی و سرمستی، سرشاری و ہشیاری اور وارفتگی کے ساتھ ایک قسم کی سپردگی بھی ملتی ہے۔ وہ ہر حسین شے کا پرستار ہے۔ وہ حسن کا پجاری ہے اس کے نغمے الاپتا ہے۔ اس کے قدموں پہ کہکشاں کے موتی اور اس کی راہوں میں پھول برساتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن اس نغمگی، سرشاری و سرمستی کے ساتھ ساتھ انقلاب کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دیتی ہے۔ مجاز نے جب انقلابی نظمیں کہیں تو اسے باغی اور انقلابی کہا گیا لیکن اس کے یہاں انقلاب، توڑ پھوڑ یا تخریب کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ اس کے دل میں نفرت کے شعلے نہیں بھڑکے اس نے تو انقلاب کی کرختگی، دہشت، ہولناکیوں اور کربناکیوں کو اپنی نغمگی میں سمو کر قابل قبول اور گوارہ بنا دیا۔ یہی اس کی سب سے بڑی خوبی اور کامیابی ہے۔ اس کے یہاں حسن و محبت کے نغمے بھی ہیں اور دولت کی چیرہ دستیوں سے اکتایا ہوا انسان کا عزم اور بیزاری بھی ہے۔ ایک جگہ وہ حسن کی دلآویزی سے متاثر ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض سے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

پابندیوں سے اکتا کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ؎

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ جذباتیت سستی اور سطحی نہیں اس میں صرف الفاظ کا شکوہ نہیں بلکہ بڑا گہرا اور شدید احساس ہے جذبے کی شدت ہے سماج کے خلاف بھرپور احتجاج ہے اس میں فنکاری بھی ہے ساحری و دلبری کا حسین امتزاج بھی۔

مجاز کی شاعرانہ عظمت کو سمجھنے کے لئے میں یہاں ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اختر شیرانی، فیض اور مجاز تینوں نے حسن و عشق کا والہانہ انداز اختیار کیا ہے

اختر شیرانی کا مطمحِ نظر اور انداز یہ ہے۔ ؎

ع وہ مے کہ جس کا قدح ماہ تاب ہے ساقی

فیض نے اپنے لئے جو رنگ اختیار کیا وہ ان کے اس مصرعے سے ظاہر ہے۔

ع گل ہوتی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام

اور مجاز یوں نغمہ سرا ہوتا ہے۔

ع بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو

فیض کا مصرع مغرب کے اثرات کا حامل ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہی مصرع اختر شیرانی کی شاعری کی توسیع بھی کرتا ہے، لیکن اس کا خالص مشرقی مزاج ہمیں مجاز کے یہاں ملتا ہے۔ جسے نہ صرف اردو بلکہ انگریزی میں بھی رومانی شاعری کہتے ہیں۔ بقول کیٹس۔

"A thing of beauty is a joy for ever"

اس میں اس انداز کی لذت ہے جیسی اختر شیرانی، فیض اور مجاز کے مصرعوں میں ملتی ہے۔ البتہ کیٹس کے کلاسک میں رومانی شاعری کا جو معیار ملتا ہے وہ دنیا کی اعلیٰ ترین شاعری کا معیار ہے جہاں اشتہار

دلکشی و دلنشینی تھی۔ اس تجزیہ میں مجاز اور فیض دونوں کے یہاں ایک رومانوی مزاج ملتا ہے جو اختر شیرانی کی روایت کا اگلا قدم ہے۔ اپنے اس قول کی صداقت کے لئے مجاز کی نظم "ان کا جشنِ سالگرہ" کے۔ یہ دو بند پیش کرتا ہوں۔

فطرت نئے جذبات کے در کھول رہی ہے
میزانِ جوانی میں اُسے تول رہی ہے
لب ساکت و صامت ہیں نظر بول رہی ہے
سرشار نگاہوں میں حیا جھوم رہی ہے
ہیں رقص میں افلاک زمیں گھوم رہی ہے
شاعر کی وفا بڑھ کے قدم چوم رہی ہے

جس زمانے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک شباب پر تھی اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا جو اشتراکی نظریات کی حامل تھی اسی زمانے میں فرائڈ کا نظریۂ جنس پڑھے لکھے نوجوانوں میں بے مقبول ہوا۔ ان سب باتوں کا تھوڑا بہت اثر ہمارے نوجوان شاعروں اور ادیبوں پر بھی پڑا۔ کچھ شاعروں نے فرائڈ کے نظریات کو اپنایا جن میں ن۔م۔ راشد اور میراجی پیش پیش تھے۔ مجاز، فیض، مخدوم، سردار جعفری، جانثار اختر، ساحر اور دوسرے شعراء اشتراکی نظریات کے قائل تھے۔ ان لوگوں کے یہاں بھی جنس کا پہلو ابھرا ہے۔ لیکن بیماری کی بجائے ایک صحت مند پہلو کی طرح

دوسرے شعراء کی طرح مجاز کے یہاں انقلاب نے نعرہ کی شکل اختیار نہیں کی اُس کے یہاں انقلاب کی لے کچھ اس طرح ابھری۔

آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
بڑھ چلے ہیں دیکھ وہ مزدور دندناتے ہوئے
اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے
بھوک کے مارے ہوئے انسان کی فریاد کے ساتھ
فاقہ مستوں کے جلو میں خانہ برباد کے ساتھ

[illegible] داری کا نظام

[illegible] جوشِ انتقام

[illegible] کچھ اس طرح ۔ ــ

کلیجہ پھک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمہیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے
یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے
یہ انسانی بلا خود خونِ انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھ کے مہلک، موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

ان اشعار میں مجاز کا انقلابی مزاج، شاعرانہ انداز، سرمایہ داری کی بھیانک اور ہولناک تصویر، طبقاتی کش مکش اور وہ سارے حالات اور مسائل جو اس دور میں سر ابھار رہے تھے مل جاتے ہیں۔ آزادی کی تحریک میں کل برصغیر شامل تھا۔ آزادی کے حصول کی خاطر مزدور، کسان، امیر و غریب سب ہی متحد ہو کر علمِ بغاوت بلند کر کے میدان میں آگئے تھے۔ مجاز بھی انہی میں شامل تھا لیکن ان کی شاعری پر انقلاب کا وہ اثر حاوی نہیں ہوا جو دوسرے ترقی پسندوں کے یہاں نظر آتا ہے۔ مجاز کے یہاں انقلابی بصیرت ملتی ہے نعرہ نہیں۔ مجاز اور فیض اس موڑ پر آکر اختر شیرانی سے مختلف نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے سے منفرد بھی۔ کیونکہ ان دونوں کا اپنا اپنا شعری مزاج ہے۔ فیض کے یہاں فضا کی تعمیر اور اداسی کے ساتھ ایک سوچ ملتی ہے۔ مجاز کے یہاں ایک عاشق اور انقلابی کردار کی جرأت، اس کا حوصلہ اور بانکپن ملتا ہے۔ "اندھیری رات کا مسافر" اور "خوابِ سحر" اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ "آوارہ" میں بھی یہ تمام باتیں ملتی ہیں اور انہی کے ساتھ اس دور کے نوجوانوں کا مزاج اور اس دور کے سماجی شعور کا پتہ بھی چل جاتا ہے

فیض اور مجاز دونوں رومانی ہیں لیکن مجاز کی رومانیت بھرپور ہے۔ ــ

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تیری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے
اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

یا اعتراف کا یہ عہد

چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو

مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی سزا پائی ہے

لیکن فیض کی دوسرے میں ان کی رومانیت اکثر جگہوں پہ دم توڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

مجاز کے یہاں جو کچھ ہے تجربہ کی آنچ سے کندن ہو کر نکلا ہے، معصومیت، کھلنڈراپن، مستی و سرمستی، رندی و سرشاری، ہنستے ہنستے زندگی کے غم جھیل جانا، بزمِ نگاراں میں اپنے آپ کو غرقِ مے ناب کر لینا اور مجاہد کی طرح قدم اٹھا کر پیچھے نہ لوٹنا مجاز کی شخصیت کے بنیادی عناصر ہیں۔ "آوارہ" مجاز کی سب سے اچھی نظم ہے۔ اگر آوارگی سے پیار کرنے کی کسی میں جرأت ہے تو اسے اس نظم میں مجاز کی پوری زندگی سموئی ملے گی۔ نہ صرف مجاز کی زندگی بلکہ اس عہد کے نوجوانوں کی تصویر بھی۔ جن کے حصے میں زندگی کے بجائے امیدیں خواب اور حوصلے جو اپنی تعبیر کے لئے زندگی ہی کا ایثار چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور میں پھیلے ہوئے خلفشار و انتشار بیزاری، غم و غصہ، بے چینی اور محرومیوں کی ترجمانی بھی اسی نظم "آوارہ" سے ہو جاتی ہے۔ ــ

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مجاز ایک انقلابی ہے، ایک اشتراکی ہے لیکن اس کی ایک حیثیت

مستقل ہے اور وہ ما حبِ دل کی۔ جسے عرفِ عام میں عاشق کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے اسے قریب سے دیکھا ہے، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ عاشقی ہی اس کا اپنا تجربہ ہے اس کا سرمایۂ حیات ہے جس کے لئے اس نے اپنی زندگی گنوا ئی۔ عشق ہمارے معاشرے میں چونکہ ایک کارِ فضول ہے اسی لئے عشق کی آگ آدمی کو جلاتی ہے اور جلانے سے پہلے گھلانے کا سودا کرنے کی طاقت بھی عطا کرتی ہے۔

وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

میرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرأت کی قسم اب مری جرأت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو میری محبت سے ڈرو

یہاں مجاز کو صرف عاشق کہنا اختر شیرانی کا مقلد سمجھنے کے مترادف ہوگا۔ مجاز ایک روایتی عاشق کے بجائے عشق کے تجربے سے گذر کر ایک انقلابی کردار کا حامل بنا۔ البتہ اس نے فیض کی طرح یہ نہیں کہا کہ

"مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ"

عشق انسان کی بہت بڑی روحانی ضرورت ہے۔ جنسی تشنگی اور ہوس کاری کے اس دور میں عشق کے نام پر جو لوگ شرما جاتے ہیں وہ اسے بھی اپنی ہوس کاری سمجھتے ہیں۔ میں ان لوگوں کے بارے میں صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ وہ مجاز سے نا واقف ہیں ورنہ انہیں عشق کا مفہوم اس عہد کے پس منظر میں آسانی سے مل جاتا۔ اس کے لئے زندگی کو مختصر کرنا پڑتا ہے۔ اپنے آنسوؤں سے ان گلابوں کو ترو تازہ رکھنا پڑتا ہے جن کی خوشبو آدمی کو در بدر پھراتی ہے اس کا دوسرا نام جگر کاوی اور دردمندی ہے۔

فیض نے انقلابی شاعری کی طرف توجہ دلانے کے لئے گویا ایک پہلو یہ کہہ کر نکالا تھا کہ "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" ورنہ وہ عشق کے مفہوم سے بخوبی واقف تھے البتہ فانی طور پر اس کیف میں انہوں نے مجاز کی طرح آبرو کھونا پسند نہیں کیا گھلنے کا سودا نہیں کیا۔ اسی لئے [illegible] ملیح آباد

ہو جاتے ہیں۔ مجاز عشق کا شاعر ہے اور فیض عشق کی کسک یا درمان کے۔ مجاز نے آبرو کھو کر آبرو حاصل کی فیض نے اپنے احساسِ جمال کی محاکات اور آشفتوں کی دردمندی سے اعتبار حاصل کیا۔

مجاز کی زندگی سراپا شعر تھی اور مرتے مرتے بھی وہ ولولۂ ادب کو میر کے المناک اشعار کا مفہوم سمجھا گیا۔ مجاز مطربِ بزم دلبراں بھی تھا اور مردِ انقلابی بھی۔ اس کی زندگی اور شاعری میں انہی دونوں عناصر کی کارفرمائی ملتی ہے نغمگی اور بغاوت کا یہ امتزاج مجاز کے ہم عصروں میں اتنا گہرا اور رچا ہوا نہیں ہے۔ یہی مجاز کی انفرادیت اور اس کی عظمت ہے۔

سعیدی

رات کا نوحہ

نغمہ و نور کی فضا برہم
میزباں بام و در اداس اداس

نزہت و ناز کا سماں رخصت
محفلِ شب کے میہماں رخصت

شام کے سرمئی دھندلکے میں
حسرتیں منتظر نگاہوں کی

روز کچھ آہٹیں ابھرتی ہیں
آنے والوں کا روپ بھرتی ہیں

تنگ زینے کی خامشی ہر شام
سونے کمرے ہیں دفعتاً ہر شے

خیر مقدم کے گیت گاتی ہے
ناچ اٹھنے کو کسمساتی ہے

آنے والے سب اجنبی لیکن
ہر ادا جذبۂ تپاک کا رقص

سب سے رسم و رہِ شناسائی
ہر نظر نغمہ پذیرائی

مستیوں سے چھلکنے لگتا ہے
مصلحت بڑھ کے پیش کرتی ہے

گنگناتی فضا کا پیمانہ
خود فراموشیوں کا نذرانہ

نغمہ و رقص و روشنی بن کر
دن کی ویرانیوں کو رات کا حسن

وقت پرواز کرتا جاتا ہے
نظر انداز کرتا جاتا ہے

بے حسی سوچنے نہیں دیتی
عمر بھر کی تھکن کے بوجھ تلے

جب یہ رنگین طلسم ٹوٹے گا
روح تڑپے گی جسم ٹوٹے گا

چاند تارے حسین لمحوں کے
الوداعی سلام کو ان کے

ایک اک کر کے ڈوب جائیں گے
غم کے لمحات لوٹ آئیں گے

آخرِ شب کی ہم نفس ہوگی
دل کی بڑھتی ہوئی کسک تنہا
حسرتِ خواب خالی آنکھوں میں
کروٹیں لے گی صبح تک تنہا

مظہر امام

سود و زیاں

یاس و امید کے دوراہے پہ چلتے چلتے
مجھ کو اکثر تری بانہوں کا خیال آیا ہے
کبھی اس راہ سے گزرا تو وہ باہیں شل تھیں
کبھی اِس راہ پہ آیا تو سہارا نہ ملا

بُجھ چکے وَقت کے فانوس بھی جلتے جلتے
پاسکا ایک بھی لمحہ نہ حیاتِ اَبدی
رنگِ رخ سے ہے عیاں عہدِ گزشتہ کی تھکن
ہائے یہ حال جسے تیرا اشارہ نہ ملا

غم کدے میں سحر و شام کے پلتے پلتے
کھو چکا طفلکِ دل سود و زیاں کا احساس
اَب میں خاکسترِ جذبات کہاں لے جاؤں
ڈھونڈنے سے بھی جہاں کوئی شرارا نہ ملا

ڈاکٹر حیدر شاہین

ترغیب

ترکِ تعلقات پہ عرض کیا ہے برملا
ملنی ہی چاہیئے مجھے جرمِ تضاد کی سزا

سطوت و جاہ کا وجود میرے نصیب میں نہیں
اور تمہاری آرزو جاہ و حشم کی انتہا

درسِ خلوصِ باہمی تم نے کبھی لیا نہیں
کبر و غرور و تمکنت میرے جنوں کی گرد پا

میرا مذاقِ زندگی، میرا مزاجِ بندگی
لعل و گہر سے منحرف، مہر و وفا میں مبتلا

کتنی عجیب بات ہے مجھ کو اسی پہ ناز ہے
مری طلب برہنہ سر، میرا جنون برہنہ پا
میرے تمہارے درمیاں ایک خلیج بیکراں
ایک طرف غرورِ زر، ایک طرف مئے وفا

تم کو تلاشِ سیم و زر، شوقِ نمود و کروفر
میرے خلوصِ قلب پر کیسے ہو تم کو اکتفا

عہدِ وفا کو توڑ دو میرا خیال چھوڑ دو
میں تمہیں بے وفا کہوں تم مجھے نارسا کہو

ڈاکٹر عزیز تمنائی

جستجو

زمانے کے کوہِ گراں کی سرنگوں میں
جلتی ہوئی مشعلیں لے کے
شام و سحر ڈھونڈتا ہوں
کہ کوئی کرن کوئی روغن کوئی موجۂ بادِ تازہ
جو مل جائے میں ماورائے نظر کی جھلک پا سکوں
اس بھیانک اندھیرے میں گھٹتے ہوئے جی کو بہلا سکوں

میں جب پہلی بار ان سرنگوں میں داخل ہوا تھا
مجھے کیا خبر تھی یہاں سے مفر کی کوئی راہ ممکن نہیں
ہر دقیقہ مجھے اور الجھائے گا
سینۂ کوہ کی پیچ در پیچ راہوں میں
ہر پل کی پرچھائیں تاریکیوں میں اضافہ کرے گی
مجھے کیا خبر تھی کہ ہر آرزو مجھ کو مقصود سے دور تر کر سکے گی

مگر میرے دل میں یہ کیسی خلش ہے
کہ ہر ضربِ پسپائی نو بہ نو
مجھ کو سعیِ مسلسل پہ اکسا رہی ہے
سرنگوں کی وحشت نظر کے شراروں کو بھڑکا رہی ہے
مجھے جستجو آگے لے جا رہی ہے

عنوان چشتی

قطعات

ہو کے محصور خول میں اپنے
بند کمرے میں یوں ہوں غلطیدہ
ہار کر جیسے زندگی کا جوا
جاگتے میں ہو کوئی خوابیدہ

فکر و ادراک و آگہی و شعور
ایک نقطے پہ جم گئے ایسے
مہر و ماہ و نجوم اے ہمدم
ایک مرکز پہ تھم گئے جیسے

فکر و احساس کے دریچوں سے
یوں نہ یادوں کے قافلو در آؤ
خود مکینوں کے ہاتھ سے پیہم
شیش محلوں پہ جیسے ہو پتھراؤ

عالمِ بیکسی میں گھر سے دور
دامنِ ضبطِ غم نہ یوں چھوٹے
جیسے مانگا ہوا پڑوسی کا
فرش پر گر کے آئینہ ٹوٹے

ارشد تھانوی

گداز دل سے جو آنسو بہائے جاتے ہیں
وہی تو عرش کے تارے بنائے جاتے ہیں

بہار آنے کو ہے عشق کے گلستاں میں
جنوں کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں

بہ فرطِ ذوقِ تماشا بعرضِ حسنِ نظر
ہم اُن کے جلووں کی رونق بڑھائے جاتے ہیں

حضورِ قلب سے روتی ہے رات بھر شبنم
سحر کو جب کہیں غنچے کھلائے جاتے ہیں

دَر ایک اور بھی ہے ماورائے دیر و حرم
بڑے بڑوں کے جہاں سر جھکائے جاتے ہیں

مگر ہے جانِ تمنا، مگر ہے روحِ امید
یہ انتظار کہ اب ہم بلائے جاتے ہیں

یہ ابتدائے محبت میں یورشِ آلام
چراغ شام ہیں لیکن بجھائے جاتے ہیں

سُنیں گے آ کے وہ اک دن فسانۂ دل بھی
ابھی تو شعر مرے گنگنائے جاتے ہیں

بایں تہیۂ دانائی آپ میں ارشد
جنونِ عشق کے انداز پائے جاتے ہیں

تاج سعید

○

اس نے جہاں بھی پاؤں دھرا تھا
پھول وہیں پر کھل اٹھا تھا

پلکوں کی جھالر کو اٹھا کر
اس نے میری جانب دیکھا تھا

صندل کی خوشبو تھی واری
اس نے ایسا عطر ملا تھا

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں
اس کو آخر چوم لیا تھا!

وہ جب جھوم کے مسکاتی تھی
دل واری اس پر ہوتا تھا

گھور گھٹا کا مان تھیں زلفیں
مکھڑا چندا کا ٹکڑا تھا

جوڑا، افشاں، مسّی، کاجل
ان کا دل پر رعب جما تھا

اُس نے تاج پیا کے دل کو
چلتی گاڑی میں لوٹا تھا

خورشید احمد جامی

○

دل کے بجھتے ہوئے شعلوں کو ذرا بھڑکاؤ
یاد آؤ تو مجھے آج بہت یاد آؤ

غم کے زینے پہ کوئی شمعِ تمنا رکھ دو
دل کی راہوں میں کوئی نقشِ وفا چمکاؤ

کھٹکھٹاؤ شبِ تاریک کے دروازہ کو
اور گھبرا کے میں نکلوں تو کہیں کھو جاؤ

آنچ دیتے ہوئے زخموں کی حسیں وادی ہیں
لالہ و گل کی امیدوں کو ابھی ٹھہراؤ

ذہنِ شاعر میں رہو پیار کی خوشبو بن کر
وقت کی دھوپ میں آنچل کی طرح لہراؤ

تیز رفتار خیالوں کی ندی سے آگے
پھر کوئی گیت محبت کی فضا میں گاؤ

شامِ ہجراں سے ملو مثلِ نسیمِ سحری
دشت کو سایۂ گیسو کی طرح مہکاؤ

محفلِ ذکرِ نگاراں کو سجا کر جامی
رات بھر شمع کی مانند پگھلتے جاؤ

منظر ایوبی

○

پردۂ رنگ و بو رہے ہیں ہم
پھول کی آبرو رہے ہیں ہم

ہم سے گردش ملی زمانے کو
مثلِ جام و سبو رہے ہیں ہم

منزلِ عشق تھی کہ راہِ ستم
آپ کے روبرو رہے ہیں ہم

رخ ترا دیکھ کر ہیں چپ ورنہ
کس قدر تند خو رہے ہیں ہم

دم بتوں کا بھرا مگر ناصح
عمر بھر باوضو رہے ہیں ہم

کوچۂ یار ہو کہ تختۂ دار
ہر جگہ سرخ رو رہے ہیں ہم

شہر ہو، دشت ہو کہ زنداں ہو
مرکزِ گفتگو رہے ہیں ہم

دیدہ و دل گواہ ہیں منظر
صورتِ آبِ جو رہے ہیں ہم

روشن نگینوی

○

چشمِ پُر آب کہاں تک دیکھوں
ایک ہی خواب کہاں تک دیکھوں

میں بھی انسان ہوں پتھر تو نہیں!
دل کا خونناب کہاں تک دیکھوں

چاندنی لاکھ دلآویز سہی!!
ایک مہتاب کہاں تک دیکھوں

آ گئے اشکِ سپاس آنکھوں میں
لطفِ احباب کہاں تک دیکھوں

ضبط کی بھی کوئی حد ہے آخر!
رسمِ آداب کہاں تک دیکھوں

زخم شاخوں پہ کھلے ہیں روشن
اب نہیں تاب کہاں تک دیکھوں

حزیں لدھیانوی

○

پھر ذکر صبح کے افسانے بہت رات گئے
رو کش شب ہوئے دیوانے بہت رات گئے

چشم میگوں کی کچھ اس رنگ سے شب یاد آئی
ہر طرف کھل گئے میخانے بہت رات گئے

میں تو سرمست تھا زلفوں کے گھنے سائے میں
مجھ کو چونکا دیا دنیا نے بہت رات گئے

شام ہی سے نہ دیا ہے نہ کوئی پھول نہ چاند
آج کیا ہوگا خدا جانے بہت رات گئے

وقت کے کو مکنو چشمہ تاباں لاؤ
چیخ کر کہتے ہیں ویرانے بہت رات گئے

اے حزیں روشنی فکر و نظر سے آخر
جگمگائے ہیں سیہ خانے بہت رات گئے

عنبر چغتائی

○

ایک گرتی ہوئی دیوار کے سائے سائے
کس جگرداری سے اے دوست یہاں تک آئے

اپنی ہستی کا احساس گراں ہے اے دوست
چاہتا ہوں کہ نہ یہ سانس کبھی آئے جائے

یوں گزر جاتی ہیں اب ذہن سے تیری یادیں
ابر جیسے کہ سمندر پہ برستا جائے

چاند سے کوئی اشارے سے کیا کرتا ہے
سوچ میں سب ہیں مگر کون سندیسا لائے

یوں تو انسان نے بہر حال خدائی کی ہے
اس کی تکمیل یہی تھی کہ قیامت ڈھائے

آگ برسے گی کہ دنیا میں اجالا ہوگا
دیکھنے میں تو سیہ رنگ کے بادل چھائے

شرون کمار ورما

آج اچانک اسے بمل کا خیال آگیا تھا۔

بمل بھی کیسا آدمی ہے۔ سال سوا سال سے وہ مل رہے ہیں۔ اکٹھی فلمیں دیکھیں، کافی پی، سیر و شاپنگ کی لیکن وہ شادی کی بات نہیں کرتا۔ یہ بات نہیں کہ وہ بدھو ہے۔ بس اور سینکڑوں باتیں کریگا۔ دنیا بھر کے مسائل پر بحث کرے گا ہر مسئلہ پر اس کا ذہن بہت صاف ہے۔ لیکن شادی ـــ

نہیں وہ اس موضوع پر کبھی بات نہیں کرے گا۔

گیتا کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ اس نے انگلیاں 'ٹائپ رائٹر' سے ہٹا لیں۔ کئی لمحوں تک اس کی انگلیاں سیدھی نہ ہو سکیں۔ اس نے میز پر پڑی فائلوں کی طرف دیکھا۔ ابھی بہت کام باقی تھا ایک دم اسے اپنا وجود بے معنی و غیر ضروری معلوم ہوا۔ اس نے اداسی اور لاچاری سے ادھر ادھر دیکھا۔ سب اپنے کام میں مشینوں کی طرح جٹے تھے۔

چائے والے کا لڑکا پیالیاں وغیرہ اکٹھی کرنے آیا تھا اسے دیکھ کر گیتا کو چائے پینے کا خیال آیا۔ اس نے لڑکے سے چائے لانے کے لئے کہا اور شرما کی طرف دیکھا جو جھکا جھکا سا بالکونی کی طرف جا رہا تھا۔ بالکونی میں پہنچ کر اس نے انگڑائی لی اور سگریٹ سلگا کر کھڑا ہو گیا۔

لڑکا چائے کا گلاس لے آیا۔ گیتا نے پرس سے اسپرو کی ٹکیہ نکالی۔

"گیتا پلیز ایک ٹکیہ مجھے دینا۔" مسز بیدی نے کہا۔

"یہ ہمیشہ مانگتی ہے، پکی ڈھیٹ ہے۔ گیتا نے سوچا اور نرمی سے کہا، "بس ایک ہی تھی۔" حالانکہ اس کے پرس میں ابھی دو اور تھیں۔

چائے نے اسے تھوڑی دیر کے لئے گرما دیا اور اس کی انگلیاں پھر سے 'ٹائپ بورڈ' پر حرکت کرنے لگیں۔

آفس ٹائم کے بعد جب وہ بس سٹاپ پر پہنچی تو لمبا کیو لگ چکا تھا۔ اس نے اداسی سے قطار کو دیکھا اور آخر میں جا کھڑی ہوئی۔ جلدی ہی اس کے پیچھے بہت سے لوگ آ گئے۔ اب اسے کچھ حوصلہ ہو گیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ گھنٹہ بھر سے پہلے اسے بس نہیں مل سکے گی۔ اور اگر کوئی بس بیچ میں فیل ہو گئی تو۔ اس خیال نے اسے ایک دم اور تھکا دیا۔ آج بھی اندھیرا پڑے گھر پہنچے گی۔ اس نے سڑک پر دوڑتی کاروں اور ٹیکسیوں کو دیکھا۔ ان میں بیٹھے خوش پوش لوگوں کا تصور کیا اور اداس ہو گئی۔

"بھئی آگے بڑھیئے یا یہیں جگہ دیجئے۔" اس کے پیچھے کھڑا ادھیڑ عمر کا ایک شخص کہہ رہا تھا۔

"لوگوں کے لیے کتنے کٹھور ہو گئے ہیں۔ بات نہیں کرتے کوڑا مارتے ہیں، گیتا نے سوچا اور آگے کھسکتی ہوئی قطار کے ساتھ چند قدم آگے بڑھ گئی یہ چند قدم قطار میں کھڑے لوگوں کے لئے کتنے اہم ہیں۔

تب ہی ایک لمبی خوبصورت کار قطار کے سامنے آ رکی۔ اسٹیئرنگ پر بیٹھے ایک نوجوان نے قطار میں کھڑی ایک لڑکی کو اشارہ کیا۔ وہ اس کے ساتھ

ویٹنگ روم میں تھی۔ گیتا نے اسے پہچان لیا تھا وہ ان کے دفتر کی مس چودھری تھی۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔ ہر ایک کے ساتھ چل رہی ہے۔

وہ مس چودھری کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اس کی سہیلی اندو نا آ گئی۔ وہ ایک سکول میں پڑھاتی تھی وہ لفتنا سے باتیں کرنے لگی۔ اندو نا پرائیویٹ سکولوں کی دھاندلی کا رونا رو رہی تھی۔ وہ سرکاری نوکری کی تلاش میں تھی لیکن سفارش کا بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔ پھر وہ اپنی ماں کا ذکر لے بیٹھی۔ جن کی آنکھیں اب بالکل جواب دے گئی تھیں اور وہ اس کا علاج بھی نہیں کرا سکتی تھی۔

۔ آخر اس زندگی کے معنی کیا ہیں۔؟ اندو نا کہہ رہی تھی۔ تب ہی بس آ گئی اور گیتا سب کچھ بھول کر ادھر متوجہ ہو گئی۔ اسے کھڑے ہونے کی جگہ مل گئی۔ چالیس منٹ کا سفر تھا اور وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔ اس کا سر اب اور بھی زیادہ دکھنے لگا تھا۔ اعصاب توگرمی سے بھی برا حال ہو رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف گرم سانسوں اور پسینے کی بو پھیل رہی تھی وہ ایک ہاتھ میں اپنی چیزیں سنبھالے اور دوسرے سے راڈ تھامے تقریباً لٹک رہی تھی۔ اس نے قریب بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا۔ شاید کوئی کرٹسی کے طور پر اسے جگہ دیدے اور وہ کھڑکی کے قریب بیٹھ سکے لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس کے پیچھے کھڑا شخص اب اور بھی اس سے آ لگا تھا۔

وہ گردوارہ روڈ پر اتر گئی۔ وہاں سے اسے پیدل جانا تھا۔ راستے سے کچھ چیزیں بھی خریدنا تھیں۔ وہ تھکی تھکی سی فٹ پاتھ پر چلنے لگی اسے تبل کا خیال آیا۔ کتنے دن بعد اچانک اسے تبل کا خیال آ گیا تھا۔ اور اتنے دن کیوں اسے تبل کا خیال نہیں آیا۔ کیا وہ اسے بھول چکی ہے۔؟ تین ہفتے ہوئے تبل اسے راستے میں مل گیا تھا۔ انہوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کافی پی۔ تبل اس کے دفتر اور کام کے بارے میں باتیں کرتا رہا اس روز اسے اس کی ذات کی دلچسپی تھی۔

۔ رات کو شینوں کے بیچ چلنا بھی خوب ہوتا ہے اس نے کہا تھا۔

پھر وہ جدا ہو گئے تھے۔ اور آج اچانک اسے تبل کا خیال آ گیا تھا۔ یہ محبت ہے۔ اس نے کبھی محبت کے خواب نہیں دیکھے۔ رات کو تھک کر تکیے پر سر رکھتی ہے تو صبح ٹائم پیس جگاتا ہے۔ تبل بھی کیسا آدمی ہے۔ سال سوا سال سے وہ مل رہے ہیں۔ اکٹھے فلمیں دیکھیں، کافی پی، سیر و شاپنگ کی، لیکن وہ شادی کی بات ہی نہیں کرتا۔ یہ بات نہیں کہ وہ بد تمیز ہے۔ بس اور سینکڑوں باتیں کرے گا۔ دنیا بھر کے مسائل پر بحث کرے گا۔ انتخابات کے نتائج سے لے کر ویٹ نام تک ہر مسئلے پر اس کا ذہن بہت صاف ہے لیکن شادی۔ نہیں، وہ اس موضوع پر کبھی بات نہیں کرے گا۔ لیکن وہ برا آدمی بھی نہیں۔ اس کی نیت خراب ہو۔ ایسا بھی نہیں عجیب آدمی ہے۔؟

"گیتا ۔؟"

کسی نے اسے پکارا۔ وہ چونکی۔ ایک نازک خوبصورت سی عورت تھی ایک لمحہ تو گیتا اسے پہچان نہیں سکی۔ ذہن پر زور دیا تو سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ موہنی تھی کالج میں اس کی کلاس فیلو تھی۔ پانچ سال ہو گئے۔ موہنی لڑکی سے بھرپور عورت ہو گئی تھی۔ موہنی کار سے اتر کر اس کے قریب آ گئی

۔ ارے گیتا، تم تو ذرا نہیں بدلیں۔ دلی میں ہو آج کل کیا کر رہی ہو، سناؤ شادی وادی ہو گئی، تمہارے ہزبینڈ کیا کرتے ہیں

موہنی نے ایک دم ڈھیر سارے سوال کر ڈالے۔

۔ سروس کر رہی ہوں" موہنی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

موہنی کا سارا جوش جیسے ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے اس طرح گیتا کی طرف دیکھا جیسے دوبارہ پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو پھر وہ مسکرا کر بولی۔

۔ آؤ تمہیں اپنے ہزبینڈ سے ملواؤں۔ بڑے اچھے ہیں

وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر کار کی طرف لے گئی۔ موہنی کا خاوند

الشجاع

— پھر ڈوبتی آئی۔

میرے آس پاس روشنیوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ نگاہیں خیرہ ہوگئیں اور حیات کی وہ کشتی جو بغیر بادبان کے حالات کے بحر تند پہ بہی جا رہی تھی۔ اچانک ساحل مراد سے آ لگی۔

اصل محبت جو میری روح کا نچوڑ تھی دور تھی ہی تھی۔ لیکن میں نے اندازہ لگایا جوں جوں میری بیتابی میں شدت آ چلی ہے ویسے ویسے وہ کسی اضطراب میں گم ہوتی جا رہی ہے۔

ایک ہمہ گیر اداسی اس کی روح میں رچ بس گئی تھی۔

بڑی مشکل سے میں نے اسے پہچانا۔ پھر بھی مجھے شبہ تھا۔ یہ پرویز تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کھردری بالوں سے ڈھکا ہوا سر، اور پرشکن چہرہ پرویز ہی کا تھا۔! وہ شوخی اور اچپلاہٹ کہاں تھی۔ جس سے اس کا خمیر تشکیل کیا گیا تھا۔ بات بات پہ بے دھڑک قہقہے لگانے والا۔ جس نے کبھی زندگی کو سنجیدگی سے نہیں دیکھا تھا۔ جس کے نزدیک کبھی غم والم نہیں پھٹکے تھے۔ زمانہ کتنا اپھداء ہے۔!

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اس مجبور تبسم میں کیا کچھ نہ تھا۔ میرے دل پہ دھکا سا لگا۔ ناکامی، نامرادی اور تباہی و بربادی کی ایک طویل داستان اس کی گہری آنکھوں میں پوشیدہ تھی۔ مجھے محسوس ہوا۔ شاید اس نے اپنی عمر کے کسی حصے میں زندگی کی سنجیدگی کو سمجھا ہے۔ یہ مسکراہٹ تو اپنی ہزیمت کے بعد ہی ہونٹوں پہ آتی ہے۔!

یہ بھی اچھا ہوا کہ تم مل گئے! " اس نے کہا۔ اور دور افق پہ نظریں گاڑ دیں۔ جہاں بیکراں نیلے آسمان میں آزاد چڑیاں محو پرواز تھیں۔!

پارک میں نسبتاً سناٹا تھا۔ میں یہاں روز ہی گھومنے آتا تھا۔ حسن اتفاق سے مجھے پرویز مل گیا۔ میں شاید کشمکش میں رہ جاتا۔ مگر جب اس نے مجھے مسکرا کر دیکھا تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔

میں اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ جانے کیا کچھ لاوا ایک رہا تھا۔ جب آتش فشاں پھٹتا ہے تو کتنی بھری پری بستیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ مگر پہلے پہاڑ کی چھاتی پھٹتی ہے! اور مجھے پہاڑ کی یہ بے بسی پسند نہ تھی۔! میں کچھ اسی قسم کا ہوں۔ دوستوں کا دکھ سکھ میرے اپنے دل پہ سے گزرتا ہے!

انگلینڈ سے کب آئے؟۔ اب تو کچھ دن رہو گے یہاں " میں نے پوچھا

یہاں آئے ہوئے ہفتوں بیت گئے!.... اس نے کہا اور پتھر کی سرد بنچ سے پیٹھ ٹیک کر سبزے پہ پاؤں پھیلا دیئے۔!

شاہد!"۔ اس نے یوں کہا۔ جیسے مجھ سے نہیں۔ اپنے آپ سے مخاطب ہو۔ داستان پارینہ کو دہرانا بھی ایک عذاب ہے۔ پچھلی یادیں اگر انسان کو سزا نہ دیں تو شاید روح کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ ورنہ حافظے سے بڑھ کر کوئی دل آزار چیز آدمی کے لئے نہیں ہے۔"

زندگی نے مجھے سزا دی ہے" وہ آگے جھکا۔ " تم سلمیٰ کو جانتے ہو۔ ہفتہ بھر پہلے اس نے سینی ٹوریم میں دم توڑ دیا۔"

سلمیٰ.... حسن و شباب کا جیتا جاگتا پیکر۔ حنا چھپے اور بتا نتوں کا مجسمہ

[illegible] ایک گہری کھائی [illegible] ۔
[illegible] تھا۔ اسباب زندگی کے
[illegible] کر اپنا آپ اپنے نام اور ماضی کو
[illegible] رہا تھا۔!

سو ساتھی تھا ایک چلبلی سی جانے کب کس کی گود میں جا پڑے۔ میرا اپنا کوئی مقام نہیں۔ کوئی حیثیت نہیں۔ خدا خدا کر کے اس حادثے نے مجھ سے میرا مستقبل چھین لیا۔ میں جیکی ڈان میرا معاون تھا! بلیک اسکینڈل سے [illegible] میں سے وطن کو خیرباد کہا اور انگلینڈ چلا گیا۔

ہمارا ذہنی سطح ایک آئینہ ہے! بظاہر! جس پر گزرتے ہوئے حالات کا عکس الٹی چھپکلی کے پیروں کی طرح پڑتا ہے۔ مگر منجمد نہیں ہوتا۔ انگلینڈ میں ذہنی تسکین اور جسمانی رفاقت کے سامان کم نہ تھے۔ لیکن پہلے ناکام تجربے نے مجھے عورتوں سے متنفر کر دیا۔ یہ وہ مخلوق ہے۔ جس نے کبھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کی

پرشاندار اور حسین مستقبل نے میرے قدم چومے میں ایک سول سرجن تھا۔ اپنے فن کا ماہر۔ مجھے دولت شہرت اور عزت ملی! لیکن کسی کی رفاقت نہ ملی۔ ایک عجیب سا اضطراب مجھے اپنے گھر میں بیٹھنے نہ دیتا۔ جیسے میں کچھ کھو بیٹھا ہوں۔ بیکراں اداسی، لا وحشت سناٹا، میرا مقدر بن گیا تھا! وہ اداسی جو دل کی تھی۔ وہ کسی کو چاہتی ہے انسان بغیر کسی ساتھی کے نہیں رہ سکتا۔ تنہائی پسندی کے دعوے غلط ہیں۔ میری تنہائیاں شوخ و شنگ پیکر محسوس کو اپنے وجود میں سمونے کے لئے بے چین تھیں۔

پھر ڈوروتھی آئی... میرے آس پاس روشنیوں کا سیلاب امڈ آیا۔ نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ اور حیات کی وہ کشتی جو بغیر بادبان کے حالات کے بحر تند پر بہی جا رہی تھی اچانک ساحل مراد سے آ لگی۔

اصلی محبت جو میری روح کا نچوڑ تھی۔ ڈوروتھی ہی تھی۔! وہ پہلے پہل ایک مریضہ کی حیثیت سے میرے مطب میں آئی۔! اور جس نے مجھے بیمار کر دیا۔ محبت تجربہ کار ہوتی ہے پھیلنے پھولنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی اب وہ تنہا رہیں۔! لیکن وہ میرے قریب آتی گئی میں نے اس کا توجہ [illegible]

[illegible] تھا کہ [illegible] تھا اور اب تو میں بھی اس منزل میں تھی۔ جہاں آ کر کسی سہارے اور دلی دولت کی دولت کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔!

میں نے اندازہ لگایا کہ جب جیلا میری بیتابی میں شدت آ چکی ہے۔ وہ لیے دیے کسی اضطراب میں گم ہوتی جا رہی ہے، ہنستے ہنستے یکبارگی خاموش ہو جاتی۔ میرے ہاتھ میں اس کا ہاتھ ہوتا لیکن ذہنی طور پر کہیں اور ہو جیسا کہ وہ سیر کر رہی ہوتی۔ ایک ہمہ گیر اداسی اس کی روح میں رچ بس گئی تھی۔

پھر ایک دن وہ وقت بھی آیا جب میں ملک کے ہاتھوں سے مجبور اپنا سامان اٹھا کر اس کے گھر پہنچا۔ اتفاقات اور حادثات انسانی تقدیر کے لئے ریل کی اس پٹری کا کام انجام دیتے ہیں جہاں یکلخت گاڑی اپنی راہیں بدل دیتی ہے! وہ دھچکا مجھے آج بھی اپنے دل پر محسوس ہوتا ہے۔ اُف فوہ۔ انسان کا دل مٹھی بھر گوشت جو نحیف سا نزار سا ہے۔ مگر کتنا طاقتور اور قوی ہے کہ ہر صدمہ عظیم پہ چند غیر معمولی دھڑکنوں کا تحفہ پیش کر کے پھر اپنی یکساں رفتار سے دھک دھک کرنے لگتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا!

ڈوروتھی اپنے کمرے میں ایک لڑکے کے ساتھ موجود تھی! سوجی ہوئی پلکوں اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ۔

ڈوروتھی! — میرے منہ سے نکلا۔

"پیر ڈیئر! میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔" وہ میرے سینے سے آ لگی۔ "تمہارے چاہنے میرے لبوں پر خاموشی کے تالے ڈال دیئے۔" یہ کہتے کہتے رک گئی۔ "کہ مجھے ڈکیم سے بہت محبت ہے وہ میرے بچپن کا ساتھی ہے۔ تمہاری اس کی غربت نے مجھ سے دور کر دیا ہے پیویز! اپنی دولت سے تم کئی مجبوریاں تو خرید" اور وہ سسک کر رو پڑی۔ جیسے بے حد نادم ہو۔

تبھی ایک بار پھر جیکی [illegible] ہاتھ سے نکل گئی۔ یہ دھوکا تقدیر نے دیا تھا۔! مجھے حالات کی ستم ظریفی پر ہنسی آ گئی۔ قسمت کے پیچھے بھاگنا دانشمندی نہیں ہے!

میں نے ڈوروتھی کو معاف کر دیا [illegible]

تاہم تمہاری محبوبہ غالب ہوئی۔ بے چین کسک پنہاں تھی مگر غیر متوازن تھا۔ اور وہاں آس و امید کا کوئی چراغ روشن نہ تھا۔ اپنا سارا اثاثہ میں نے ولیم کے نام کر دیا۔ اور اسی ہفتہ اپنے ہاتھوں سے ڈورتھی کو دلہن بنایا۔ پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا ہاتھ ولیم کے ہاتھوں میں دے دیا ——!

چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ سرِ شام چڑیوں کا شور بے پناہ ہو چلا تھا۔ اور پارک ویران ہونے لگا تھا۔ وہ ہوٹل کی تیز روشنیوں کا عکس حوض کی سطح پر کانپ رہا تھا! ۔ پوپ ٹکسڈ پر بھنوروں کی بھنبھناہٹ ارغنوں کی طرح گونج اٹھی تھی!

اچھا کل ملیں گے!" یکایک اس نے کہا۔

یہ بات پہاڑ بن کر سر پر آ کھڑی ہوگی! ۔ میں نے کہا۔"

پر تو بتاؤ۔ تم یہاں کب آئے! سلمیٰ کا تذکرہ تو رہ گیا۔

پھر وہی تلخ اور طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

اچھا تو سن ہی لو۔ کون جانے۔ میرے لئے اس رات کی سحر ہو کہ نہ ہو۔ پیر ویز نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا اور شفق سے جا ملتے تاروں پر نظریں جما دیں۔

" اپنا نشیمن تو میں نے اپنی ہی آہوں سے پھونک ڈالا سوچتا ہوں۔ انسان قدرت و قسمت کا گلہ کر سکتا ہے۔ مگر اپنا گلہ اپنی ذات سے کیسے کرے۔ ! اگر میں اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں تو کیا میری روح مجھ سے فریاد کرنے آئے گی۔

ہرگز نہیں —— !

میں ہندوستان آیا نہیں۔ لایا گیا۔ ارادہ تھا کہ مستقل وہیں سے جا ملوں۔ لیکن امی کی ہنگامی علالت اور ضعیف والد کی بے بسی نے مجھے ہندوستان واپس بلا لیا۔ دس سال کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی۔ ماں باپ بھائی بہنوں نے کتنی محبت اور شفقت سے مجھے اپنے سینے سے بھینچا تھا! ۔ زندگی میں پہلی بار اور آخری بار میں ان کے [illegible] پھوٹ پھوٹ کر رویا اور دس سال کی آگ پانی کی [illegible] سے ٹھنڈی ہوئی۔ [illegible] چھپے [illegible] ——

آہ! اپنا گھر۔ اپنا پیارا وطن۔ میں کیسے [illegible] سب سے جدا رہا تھا!؟ اور میں سب کے درمیان اپنے وجود کو مدغم کرتا رہا۔ مدغم کر دیا۔ بہت کچھ۔!

اور یہیں پہلی بار میں نے سلمیٰ کو دیکھا۔

سلمیٰ ....؟ اس نے یکبارگی اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام لیا جیسے یہ نام ایک گہری ٹیس بن کر دل سے ابھرا ہو۔

سلمیٰ میری بنتِ عم تھی۔ کالی کالی آنکھوں اور گلابی رنگت والی۔ معصوم اور بھولی لڑکی۔ مگر عورت وہ بھی تھی۔

بے وفا ——

خود غرض۔

چالاک اور مفاد پرست۔

میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی کشش جیسا سحر محسوس کیا۔ مگر اس کی طرف سے چہرہ پھیر لیا۔ میری تباہیوں کی واحد ذمہ دار یہی مخلوق تھی۔ جس سے اب مجھے بے انتہا نفرت ہو چکی تھی۔ امی نے بہت چاہا کہ کہیں میری نسبت کی بات چیت کریں! والد صاحب نے زور دیا۔ بہنوں نے خوشامدیں کیں۔ مگر میں نے سب کو خاموش کر دیا۔ میں سوچتا تھا کہ اس طرح کے سلوک میں، میں حق بجانب ہوں۔ آخر کچھ تو انتقام لینا ہی تھا۔! وہ لڑکیاں جو صدقِ دل سے میرے قرب کی خواہش مند تھیں۔ ان سے بدلہ لینے کا اس سے بہتر اور کون سا طریقہ تھا کہ ہفتوں انہیں ایک مایوس کشمکش میں مبتلا رکھتا اور پھر بڑے مزے میں دھتکار دیتا! اپنی اس فتح پر میں نے دل کھول کر قہقہے لگائے ہیں۔ تھا نا پاگل پن ——؟

سلمیٰ میرے چشم و ابرو کے اشارے کی منتظر رہتی۔ ہر [illegible] میں اسے اپنی خدمتوں کا موقع دیتا۔ وہ میرا چہرہ تکتی رہتی۔ شاید میری مسکراہٹ کو کوئی حکم سنا دے۔ لیکن میں [illegible] تھا۔ اس کے آنسو اس کا اضطراب اس کی تپش۔ چٹان پر بارش کے قطرے تھے جو [illegible]

لیکن اس نے اپنی حرکتوں سے [illegible] پامردی سے [illegible] سمجھ [illegible] اپنے [illegible] چاہت لیا تھا۔ [illegible] میں وہ اپنی [illegible]

[illegible] کا سبب نہیں تھی۔!

[illegible] پچیس سال کے مرد میں ایک نوعمر لڑکی کی دلچسپی۔ میں
[illegible] گیا۔ اب کیا سلمیٰ بے وقوف بنائے گی۔؟

میں سب کچھ سمجھ گیا! اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر موم ہوتی تو
پگھلا دیا جاتا۔ میرے دوست۔ پتھر میں بھی کبھی جونک لگی ہے
وہ سنگ تھا جو پہلے ہی محبت کے ہاتھوں ٹوٹا تیشے سے
پاش پاش ہو چکا تھا۔ بکھرے پتھر کب چٹان کا روپ دھارتے ہیں
دوبارہ بھی اپنی کو بیکار۔ جس پر موسم کی تبدیلیوں اور حالات کی دھوپ
چھاؤں کا یکساں اثر ہوتا ہے۔

اور سلمیٰ تپتے سر پھوڑتی رہ گئی۔!

میرے التفات و گرمجوشی کی منتظر۔ میری محبت کی آس میں تپتے
تپتے وہ پگھلنے لگی تھی۔ جوں جوں اس کی نیازمندی بڑھتی گئی میرے
پندار میں سنگدلی آتی گئی! اس کے ہر سلوک پر میں نے بے رحمانہ قہقہے
لگائے۔ نفرت کا اظہار کیا۔ جس دن امی نے مجھے سلمیٰ سے وابستہ کرنے
کا ارادہ کیا۔ میں بھڑک اٹھا۔ نجانے امی کے دل پر کیا گزری ہوگی
سلمیٰ زندہ درگور ہوگئی

وہ رات میرے احساس میں زندہ ہے! جب سارا گھر
خواب کی وادیوں میں کھو چکا تھا اور میں تنہا ہمیشہ کی طرح بے خواب
سا اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ یکایک کوئی سہمیدہ و ناہمیدہ
بدن میرے قدموں سے لپٹ گیا۔ کارنس کے پیچھے سے پھوٹتے
نیلی مدھم سی نیلگوں روشنی میں، میں نے جلتی جلتی آنکھیں پھاڑ کر
دیکھا! اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اپنی نسائیت، اپنا وقار۔! اپنی محبت
وہ ایک سنگدل اور نفرت کوش مرد کی بھینٹ چڑھانے آئی تھی۔ جس
کا تقدس جس کا جسم ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک اور بے داغ تھا
وہ رو رو کر مجھ سے بھیک مانگتی رہی۔ تشنگی ہاری پیاسی روح جو
میرا ظلم برداشت نہ کر سکی تھی۔!

میں درندہ تھا! درندوں سے بڑھ کر وحشی اور جنگلی
آہ! میری قسمت۔ وہ روتی رہی! اور میں ہنس ہنس کر اس کا مذاق اڑاتا
رہا۔ میرے ذہن میں دیرینہ اسعد تھی ابھری اور بے پناہ غصے سے
[illegible]

میں نے اسے جھڑک دیا۔ بازو پکڑا! اسے کمرے کے باہر
لا کر چھوڑ دیا۔ نہ پوچھو شاہد۔! اس نے کن نگاہوں سے مجھے
دیکھا۔ حسرت اور التجا۔ وہ دنیا جو ایک معصوم و یتیم کی آنکھوں میں
اجڑی تھی۔ وہ دنیا۔ جو آج سلمیٰ کی آنکھوں میں اجڑ چکی تھی۔!

انتقام۔ میں نے بڑے مسرور انداز میں سوچا۔ اور
کھوکھلا قہقہہ لگایا۔ جس کی ضرب آج تک دل پر محسوس ہوتی ہے
آہ۔ نادان۔ میں نے سوچا تھا۔ ہر عورت کی طرح بے وفا سلمیٰ بھی ہو
گی۔ عشق و محبت کا ڈھونگ رچائے گی، تڑپائے گی۔ اور آگ میں جلا
چھوڑ کر دامن کشاں ہو جائے گی۔

مگر غم کا گھن میرے وجود کو کھاتا رہا۔ اور جسم وہ کھوکھلا
شہتیر بن گیا۔ جسے دیمک اندر اندر چاٹتی رہے اور یہ شہتیر اس دن بے
آواز گر پڑا۔ جب سلمیٰ کی گہری علالت کی خبر ملی۔ میں نے اسے دیکھا
اپنے بستر پر وہ صورت شکن بنی پڑی تھی۔ زرد زرد رخساروں پر
بہے ہوئے آنسوؤں کے نشان واضح تھے جیسے خوبصورت آبگینے پر حباب
جم جاتے۔ میں نے اس کی نبض پر اپنی تین انگلیاں رکھ دیں۔ اس
کے احساس سے اس نے آنکھیں کھولیں اور میری شکل دیکھتے ہی ہاتھ
چھڑا لیا۔!

یہ مرض لا علاج ہے۔ امی!" میں نے ہنس کر کہا۔
اور کمرے سے چلا آیا۔ اور بیماروں کی آہوں کراہوں میں، میں اپنے
درد کا درماں تلاش کرتا رہا! سفر نجانے راستوں کا ہو چلا ہے
زندگی کا۔ اختتام کی منزلوں کو ضرور پہنچتا ہے۔ میں نے مڑ کر کبھی نہیں
پوچھا کہ سلمیٰ کیسی تھی۔! بہت دنوں بعد اچانک امی رات حواس باختہ
میرے پاس آئیں! سلمیٰ جانے کب سینی ٹوریم پہنچا دی گئی تھی
اور اب خبر ملی تھی کہ وہ جاں بلب ہے

بیٹے! اتنے سنگدل نہ ہو۔" انہوں نے رونا شروع
کر دیا۔" ساری دنیا کا علاج کرتے ہو۔ سلمیٰ کے روگ کا علاج تمہارے
پاس نہیں ہے۔؟" ہم ہسپتال پہنچے۔

رضیہ میری بہن چھ پارٹی کی [illegible] تھی۔ [illegible] رہی تھی۔
اور میں۔ شہر کا مشہور و معروف ماہر [illegible]

سرِ محبت کی اس لاعلاج بیماری کے سامنے سرنگوں نادم و منفعل سا کھڑا تھا۔ سلمٰی کی زندگی ۔ صرف آنکھوں تک محدود تھی ۔ ہونٹوں پر چھا چکی تھی ۔ ! اب کیا تھا وہاں ... کچھ بھی نہیں ـ ؟

پھر کسی طاقت نے مجھے آگے دھکیل دیا ۔ سلمٰی ... وہ ویران بگولے ۔ ہولناک سناٹے جو آہستہ آہستہ میرے اردگرد بکھر رہے تھے ۔ یکبارگی چلا اٹھے ۔ میں اس کے پہلو میں گر پڑا ۔

پلکوں سے پلکیں جدا ہوئیں ۔ دو سرد ننھے منے ہاتھوں میں میرا ہاتھ کانپ رہا تھا ۔ موت کے نشے میں گھلی ملی ہنسی

" آپ آگئے ـ آہ ..... "

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پہ اب !

تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے ؟

سلمٰی ۔ سلمٰی ۔ ہوش میں آؤ ۔ مجھے دیکھو ... سلمٰی میں ہوں تمہارا پرویز ـ

میرا پرویز ـ اللہ ـ اللہ ـ" اس کی آنکھیں کھلتے ہی کھولتے مندگئیں نہ آنکا ... میں ناشاد و ناکام نہیں جا رہی ہوں

آپ آگئے ... دنیا آگئی ـ "

اور پھر اس کی آواز پہ موت کا پہرہ لگ گیا ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ۔ سلمٰی واپس آجاؤ ۔ جہاں پہنچ چکی ہو ... سلمٰی ۔ سلمٰی ...

میں نے اس کا سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں سے لگا لیا ۔ ناشاد ۔ دیکھ لیا ۔ اپنی نفرت کا انجام ... امی نے کہا ۔ اور آنچل سے چہرہ چھپا لیا بتاؤ ۔ شاہد ۔ میرے کونسے جذبے کی تسکین ہوئی تھی ۔ میری خام خیالی اور غلط فہمی نے سلمٰی کی جان لی ۔ میں بھول گیا تھا ۔ دنیا کے چمن میں بہت سے پھول ہیں ۔ جن کے رنگ جدا ۔ جن کی خوشبو جدا ۔ میں سمجھ نہ سکا ۔ وہ لالہ جس کی چھاتی پہ داغ تھا ۔ میری محبت کا تھا

آہ ! سلمٰی کہاں ہے ـ ؟

ایسی زندگی کس کام کی جس میں سلمٰی نہ ہو ۔ سلمٰی کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے منوں مٹی کے نیچے چھپا دیا ہے ! "

اور دفعتاً وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر لڑکی ایسے بچے کی طرح بلکنے لگا ۔ جس کا کھلونا ٹوٹ چکا ہو ـ !!

صفحہ ۲۵ کا بقیہ

لیے بیٹھی رہی ۔ پھر اٹھ کر بتی جلا دی ۔

" بتی بجھا دو ماں ـ "

" سرلا کی چٹھی آئی ہے وہ نوکری کے لئے گاؤں سے یہاں آرہی ہے منگل کی صبح کو پہنچ رہی ہے ۔" ماں نے بتایا ۔

" اس سے کہو مت آئے یہاں " گیتا ایک دم چیخی

"ماں ' اسے منع کر دو ـ "

۔ گیتا ۔ ماں خوفزدہ سی ہو گئی

" ماں ' میرے پاس آؤ مجھے ڈر لگ رہا ہے ۔ ماں میرے پاس آؤ ـ "

دور سڑک پر بس تیزی سے گزر گئی

■ امی کی چڑچڑاہٹ غلط نہیں تھی
•• لڑکوں کی نہیں لڑکیوں کی ماں تھیں
اندر سے دیکھ رہی تھیں کہ لڑکوں کے نخرے
بڑھتے جا رہے ہیں سب لمبے چوڑے جہیز کی
فرمائش گویا کوئی بات ہی نہیں —
کار نہیں تو نقد روپیہ اعلیٰ تعلیم کے لئے
چاہیئے گویا لڑکی دینا ہے تو اس کی زندگی کا
سارا خرچ پہلے جمع کرا دو۔ لڑکیوں کی یہ
ناقدری دیکھ کر کبھی کبھی وہ سوچتی لڑکیوں نہ
خودکشی کر لے۔ پھر ایسے میں ایک چیز اس کے
کام آتی — وہ تھی — شہلا کی محبت؟
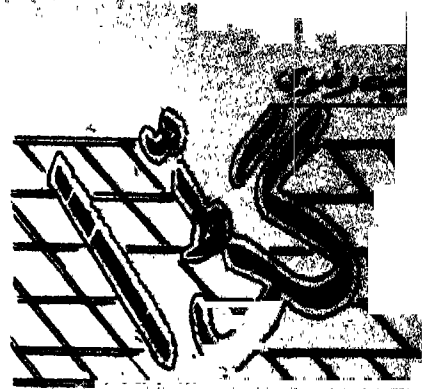
باہر شاہد مضطرب تھا — اندر ناہید موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا — مگر یہ تو
تکلیف ہے میری ناہید کو — شاہد سوچ رہا تھا۔ اور ناہید اس درد میں بھی ایک سرور محسوس
کر رہی تھی۔ وہ اس وقت کی منتظر تھی جب یہ تکلیف ایک عجیب سی راحت اور ایک عجیب سی
خوشی میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس وقت جب اس کے چہرے پر نور ہوگا۔ ممتا کا نور —
اس تکلیف میں بھی اس کو ایک خیال تھا — اس کے تصور میں دو ننھے ننھے نرم نرم ننھے
ننھے ہاتھ تھے جو کبھی اس کے بالوں کو پکڑ لیتے تھے۔ اس کی گردن میں حمائل ہو جاتے تھے۔
اس کے سامنے دو پیاری پیاری آنکھیں تھیں جو اس کو ایسے تک رہی تھیں گویا کہہ رہی ہوں
ہمیں پالو۔ ہمیں پالو — بس یہی خیال تھا جو اس کو اس تکلیف میں بھی راحت پہنچا رہا تھا
ایک ننھے کا۔ ایک پیارے سے ننھے کا جس کے خواب وہ بچپن سے دیکھا کرتی تھی۔ پھر اسے
کچھ یاد نہیں رہا کہ وہ کہاں ہے — کیا ہو رہا ہے — بس جب اس نے آنکھیں کھولیں
تو پہلو میں کوئی نرم سی چیز محسوس ہوئی۔ ایک پیاری ننھی سی آواز اسے سنائی دی۔ حالانکہ
یہ آواز رونے کی تھی۔ مگر اسے سن کر اس پر سرور کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آنکھیں کھولتے
ہی اس نے پوچھا "کیا ہے؟"

نرس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "بڑی ہی پیاری گڑیا۔ بالکل آپ جیسی گڑیا۔"
"گڑیا" اس نے یوں دہرایا گویا اس کو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ وہ تو ہمیشہ گڈے پسند
کرتی آئی تھی۔ اس نے اس گڑیا کی طرف دیکھا بھی نہیں — نرس دروازہ کھول کر باہر جا
چکی تھی۔

"مسٹر شاہد مبارک ہو، بے بی ہوئی ہے۔ بالکل اپنی ممی پر ہے۔" شاہد خوشی سے
بیتاب ہو اٹھا۔ "بیگم صاحبہ تو ٹھیک ہیں؟"
"بالکل نارمل — آپ اندر جا سکتے ہیں۔" نرس نے مسکرا کر جواب دیا۔
شاہد کمرے میں داخل ہوا۔ ناہید اس کو اتنی پیاری معلوم ہو رہی تھی کہ وہ حیران رہ گیا۔
گلابی گلابی سی پیاری بچی ناہید کے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ وہ مسکرانے لگا۔ ناہید اس کو
اتنا خوش دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شاہد یہ سمجھے کہ اسے بچی کی پیدائش
سے کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے۔
"ناہید بیگم تم ہار گئیں نا — میں نے کیا کہا تھا۔" شاہد نے کہا۔
"ہاں بھئی ہار گئے۔" ناہید نے اپنا ہاتھ بڑھا کر شاہد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔
بچپن میں اگر اسے کوئی کھیل پسند تھا تو یہی گڈے گڑیا کا۔ لیکن اسے گڑیوں سے
کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے پاس تو سارے گڈے تھے۔ جب کوئی پوچھتا تو وہ کہتی
اور کہتی۔ "بس ہمیں گڑیاں اچھی نہیں لگتیں۔"

اس بات پر شاہد اس کو خوب چھیڑتا۔ گڑیا خرید کر اس کے
کھلونوں میں چھپا دیتا۔ وہ شاہد سے تین چار سال چھوٹی تھی۔ شاہد
سے کبھی اس کی نہ بنی۔ ہمیشہ اسی بات پر جھگڑا ہو جاتا۔ شاہد اس کا خالہ زاد
بھائی تھا۔ جب چھٹیاں آتیں اس کے گھر مانو قیامت آجاتی۔ بڑی خالہ آپ
کہاں آتیں، بس ہر وقت وہ ہوتی اور شاہد کی شرارتیں۔ شاہد کو جب
بھی موقع ملتا اس کے گڈے غائب کر دیتا اور گڑیوں کو خوب بنا سنوار
کر اس کے کھلونوں میں سجا دیتا۔ ان کی خوبصورتی دیکھ کر اس کا دل ایک
لمحے کو دھڑکنا بھول جاتا۔ مگر پھر وہ روتی چیختی دوسرے ہی لمحے
خالہ کے پاس جا پہنچتی۔

"دیکھئے خالہ بی یہ شاہد کا بچہ نہیں مانتا۔ پھر یہ منحوس ماری
گڑیا میرے کھلونوں میں رکھ آیا۔" اس نے اکثر اپنی امی سے یہی لفظ
اپنے لئے سُنا تھا اور خالہ اس ننھی منی سی گڑیا کو پیار کرتیں اور شاہد کو
دو چپت لگ جاتے۔ دن یونہی گزرتے رہے۔ اس کے دل میں گڑیوں
کے خلاف نفرت بڑھتی گئی۔ بچپن سے اس نے اپنے گھر میں لڑکیاں
ہی دیکھیں۔ دو بہنیں اس سے بڑی تھیں دو چھوٹی۔ اس بیچ کی کانی
سی لڑکی کو کون پوچھتا۔ جب بھی اس کے گھر میں کسی فرد کا اضافہ ہوتا تو
اس کی امی کی مایوسی میں اور اضافہ ہو جاتا۔ ان کی آنکھوں کا انتظار اور
بڑھ جاتا۔ ادھر ان بڑی بچیوں کی گویا شامت آ جاتی۔ دن رات اٹھتے
بیٹھتے امی کی نفرت انگیز باتیں سُننا پڑتیں۔

"ان کمبختوں کا کیا ہے؟ لکھائی پڑھائی میں پیسے برباد کرو۔ اس
پر بھی لاد پھاند کر رخصت کرو۔ پھر اس زمانے میں کونسے لڑکے مل جاتے
ہیں۔ اور یہ لڑکیاں کیا ہیں بس ککڑی کی بیل۔"

یہ تو ان لڑکیوں کی قسمت تھی کہ بڑی خالہ کے تین لڑکے تھے اور
ان ہی بہنوں کی طرف سے کچھ مطمئن تھیں۔ یہ چھوٹے لڑکے نے انہیں خاندان
بھر میں کوئی نظر آتا تھا۔ اسی لئے وہ عورت اس غم میں گھلی جا رہی تھی
ان کے اس غم نے اس کے ننھے سے ذہن کو [illegible] سے زیادہ متاثر کیا تھا۔
گڑیوں سے نفرت کا یہ اس احساس [illegible]

[illegible]
[illegible]

امی پڑھائی کی جتنی شوقین تھیں کچھ وہی جانتی تھی۔ [illegible]
امی تھیں ابا تو نہ تھے۔ اور ابا لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کے قائل ہی نہ تھے
وہ تو قناعت پسند تھے جو مل گیا بس اس میں اضافہ کفر تھا۔ لڑکیوں
کی پیدائش پر بھی انہیں کوئی دکھ نہ تھا۔ وہ تو ایک قسم کا کارِ خیر سمجھتے
تھے ان کی پرورش کو۔ لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی بھی لڑکی میٹرک
سے آگے تعلیم پائے۔ ویسے تو ان پیاری پیاری سی کومل لڑکیوں کو کسی چیز
کی کمی بھی نہ تھی۔ تین لڑکیوں کی شادی تو بس چٹکی بجاتے ہی ہو گئی۔ پھر بھی
امی مطمئن نہیں تھیں کیونکہ ابھی دو بھاری پتھر باقی تھے۔ ابا سختی سے رسم
و رواج کے پابند تھے۔ غیر سید لڑکا تو اب کوئی بھی ان کی نظر میں نہیں
رہا تھا۔ اور بھلا سید لڑکی سید گھرانوں کے علاوہ اور کہاں جا سکتی
تھی۔ یوں امی کی پریشانی ان لڑکیوں کے متعلق بے جا نہ تھی۔ ہر طرف
نظریں دوڑاتیں مگر خاندان بھر میں کوئی لڑکا انہیں ایسا نظر نہ آتا جو
ان کے در پر جھک جاتا۔

ذرا بڑی ہوئی تو معلوم ہوا کہ واقعی جو کچھ ہے بس مرد کی ذات
ہے۔ خالہ بی اپنے تین لڑکوں پر اس طرح اتراتیں جیسے انہیں دو جہاں
کی دولت مل گئی ہے۔ دوسری طرف اس کی امی ان لڑکوں کی اتنی
خاطریں کرتیں کہ وہ جل کر کوئلہ ہو جاتی۔ لڑکے بھی اس طرح امی اور اس
کی بہنوں سے باتیں کرتے جیسے وہ سچ مچ کے شہزادے ہوں۔

حامد اور خالد تو اس سے بہت بڑے تھے۔ بس وہ اپنا سارا غصہ
شاہد پر اتارتی۔ اکثر تنہائی میں وہ سوچتی کہ اللہ میاں نے آخر اسے
کیوں نہ لڑکا بنایا۔ کیا کیا مزے ہوتے۔ خوب خوب پڑھتی جو جی
میں آتا کرتی۔ سب اس کی خاطر خوشامد میں لگے رہتے۔ شاید اس
احساس محرومی کی تلافی کے لئے اس نے ڈھیر سارے گڈے جمع کر لئے
تھے۔ امی ابا سب اس کے اس شوق کا مذاق اڑاتے۔ مگر تھی وہ دھن
کی پکی کبھی گڑیوں سے نہ کھیلی۔

جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی لڑکیوں کے ایسے بہت سے مسائل
اسے واضح ہوتے گئے۔ اور تب اسے اندازہ ہوا کہ اس دور میں [illegible]
لڑکیاں ماں باپ کے لئے مصیبت ہوتی ہیں۔ امی ابا اس [illegible]
سے ہمدردی کے مستحق ہیں۔

[illegible] شادی نے ابا کی کمر جھکا دی۔ امی کو
[illegible] سوچتی غریب ہیں ہمارے یہ بزرگ۔ یہ
[illegible] مذہب کا نام لیتے ہیں۔ مگر اسلام کے سادگی کا جو نمونہ
[illegible] سے کیوں نہیں اپناتے۔ مذہب نے یہ کب
کہا ہے کہ قرض لے کر جھکڑے بھر کر جہیز ضرور دو۔ ورنہ کافر کہلاؤ گے۔

دونوں بہنوں کی شادی کیا ہوئی گھر میں اداسیوں کا تسلط
ہو گیا۔ امی ابا ہر وقت اداس اور کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔
اور ان دونوں کو غمگین دیکھ کر اس کی سوچوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ اب
تو اسے لڑکیوں سے ایک طرح کی نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ کتنا
سوچتی تھی جب ابا امی کی مشکلات پر غور کرتی ۔ وہ چھوٹی بہنوں
کو دیکھتی تو یہ سوال اس کے ذہن میں گونجتا۔ ان کا حشر کیا ہوگا؟ امی
چڑچڑی ہو گئی تھیں۔ ان کی چڑچڑاہٹ غلط نہیں تھی۔ وہ لڑکوں
کی نہیں لڑکیوں کی ماں تھیں اور یہ دیکھ رہی تھیں کہ لڑکے والوں کے
نخرے اور نسخے بڑی تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ لمبے چوڑے جہیز
کی فرمائش گویا کوئی بات ہی نہیں جب کہ یہاں گیارہ جوڑے جوڑنا
بھی مشکل ہیں۔ کار نہیں تو نقد رقم یہ اعلیٰ تعلیم کے لئے چاہیئے ۔ گویا
لڑکی دینا ہے تو اس کی زندگی کا سارا خرچ پہلے سے جمع کرا دو۔

لڑکیوں کی یہ ناقدری دیکھ کر کبھی کبھی وہ سوچتی کہ کیوں نہ
خودکشی کر لے۔ پر ایسے میں ایک چہرہ اس کے آڑے آ جاتا۔ وہ تھی شاہد
کی محبت۔ بچپن سے اس کا نام شاہد کے ساتھ منسوب ہو چکا تھا۔ اس کی
ہر سانس شاہد کے لئے تھی۔ اور خود شاہد بھی اس کا دیوانہ تھا۔ اپنی
خوشحال پھوپی کے طعنوں کے باوجود وہ ناہید کا پرستار رہا۔ پھوپی
کی ماڈرن صاحبزادی نزہت ایک آنکھ نہ بھاتی۔ خود اس کی امی کا
بس چلتا تو وہ ناہید کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتیں۔ کیونکہ اس کی
دونوں بہنوں کا جہیز ان کی نگاہوں میں نہ جچا تھا۔ ان کی منی سی لڑکیاں
ہیں اگر کوئی برائی تھی تو یہی کہ غالباً ان کا جہیز فخر سے اپنے ملنے والیوں
کو نہیں دکھا سکتی تھیں۔ حالانکہ خاندان کے پڑھے لکھے افراد کا خیال
تھا کہ لڑکی والوں نے اپنی حیثیت سے زیادہ ہی جہیز دیا تھا لیکن
[illegible] یہ سمجھتی تھیں کہ انہوں نے اپنی بہن پر احسان کیا ہے کہ معمولی جہیز
[illegible]
کے ہوتے ہوئے ان کی تینوں لڑکیوں کو سمیٹ لیا۔ ورنہ اس دور میں
ان کے پڑھے لکھے لڑکوں کو ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی مل سکتی تھی۔
جو صورت شکل کے ساتھ اگر لاکھوں کا نہیں تو بلا مبالغہ ہزاروں کا جہیز
لاتی۔۔۔

شاہد کی پھوپی نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی خالہ نے بھی
تقریباً ہاں کر دی۔ مگر وہ تو خدا بھلا کرے کہ وہ اڑ گیا اور اس طرح ناہید
امی ابا اور دونوں چھوٹی بہنوں کو چھوڑ کر اس گھر کی تمام فکریں لئے شاہد
کے ہاں آ گئی۔ شادی ہوئی تو اس کی سوچوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ خالہ
کے طنز میں بجھے ہوئے جملے اور طعنے شاہد کے لامحدود پیار کے باوجود اس
کو تیر کی طرح لگتے۔ آہ بچاری عورت، وہ لڑکی ہو تو پہلے ہی دن ماں
باپ کے چہرے اتر جاتے ہیں۔ کسی خوشی کا اظہار نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے بڑھتی
جاتی ہے ماں باپ کی فکروں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اچھے لڑکے کی
تلاش۔ ڈھیر سارے جہیز کا انتظام۔ پھر شادی کے بعد بھی لڑکی کو سکون
میسر نہیں۔ ساس اور نندوں کے طعنے ۔۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے
دل میں لڑکیوں کے خلاف نفرت بڑھتی ہی گئی۔ وہ سوچتی۔ بھلا
اس کے امی ابا اب شاہد کو ایسی باتیں سناتے ہیں جو اس کو سننی پڑتی ہیں۔
اس کے برخلاف اس کے ہاں تو شاہد کی وہ وہ خاطریں ہوتی ہیں کہ وہ
تنگ آ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان خاطرداریوں میں ان لوگوں کو
کتنی مشکلات اٹھانی پڑتی ہیں۔ یوں شادی بھی اس کے خیالات میں
کوئی تبدیلی نہ لا سکی۔ جب وہ اداس ہو جاتی تو شاہد فوراً سمجھ جاتا کہ
وہ کیوں اداس ہے۔ وہ ہنس کر کہتا۔

"وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"

وہ ہر ممکن طریقے سے اس کو قائل کرتا۔ شاہد کی خوشی کے لئے
وہ اپنے آنسوؤں کو پی کر اس کے ساتھ خوب ہنستی۔ مگر کہیں ان باتوں
سے بھی سکون کی دولت ملتی ہے۔ اس کے دل نے صحیح معنوں میں
مسکرانا اس وقت شروع کیا جب اس کو اپنے وجود میں ایک ننھی
منی سی دھڑکن کا احساس ہوا۔ وہ تصور میں اچھے اچھے خواب دیکھنے
لگی۔ پیارے پیارے۔ مانو بالکل اپنے گڈے جیسے بچوں کے خواب
۔۔۔ وہ ستاروں سے کھیلتا ہے۔ [illegible]

اس لئے اسے یقین تھا کہ اللہ میاں اسے ضرور ایک بیٹا بال لگا دیں گے۔ کبھی کبھی جب چپکے چپکے اکیلے میں مسکراتے ہوئے وہ چھوٹے چھوٹے کپڑے سیتی۔ پیارے پیارے اونی سوٹ تیار کرتی تو بےپایاں خوشی محسوس کرکے اپنی نرگسی آنکھیں یوں موند لیتی گویا وہ ناچتے مسکراتے بچے ان آنکھوں سے نکل بھاگیں گے۔

تب اسی لمحے ایک خیال اس کو دہلا کر رکھ دیتا۔ یہ شاہد بڑا ظالم ہے۔ ہمیشہ یہ دعا مانگتا ہے کہ اللہ میاں اس کے لئے ایک گڑیا بھیج دے۔ دونوں بڑی بہنوں کے بھی لڑکے ہی ہوئے تھے۔ یوں اس گھرانے نے کسی ننھی منی بچی کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی، اور شاہد تو سدا کا دیوانہ تھا لڑکی کا۔ یوں اس کے ان مسکراتے خوابوں میں اگر کوئی خیال تکلیف دہ تھا تو یہی کہ کہیں لڑکی نہ ہو۔

اور اب ماں بنی تو کس کی۔ ایک بچی کی۔ اسے انسانیت کی معراج حاصل ہوئی تھی مگر اس میں اس کو کوئی راحت نہ ملی۔ وہ جو سدا گڈے پسند کرتی آئی تھی اب ایک جیتی جاگتی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ شاہد خوش تھا اس کو خوش دیکھ کر وہ اپنی تمنا سے بےنیاز ہو جاتی۔ بچی کی بھولی بھالی شکل پر اسے لامحدود پیار آتا۔ پر ایک ننھے منے گڈے کو وہ اب بھی خواب میں دیکھتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ ممتا کا جذبہ ہر چیز سے ہر غرض سے مبرا ہوتا ہے۔ لیکن وہ اب بھی چپکے چپکے اللہ میاں سے ایک ننھا منا گڈا مانگا کرتی۔ اس کی دعاؤں میں اضافہ اس وقت ہوا جب اس کو اپنے وجود میں پھر ایک نئی دھڑکن محسوس ہوئی۔ ایک بار پھر امید کی شمع روشن ہوئی ـــ ننھے منے شریر سے گول مٹول بچے اس کے تصور میں ناچتے رہتے۔ "ہاہا" ہاہا۔ امی ہمیں بلالو ـــ امی ہمیں بلالو۔ تب اسے آنکھیں موندتے ہوئے بھی خوف آتا۔ کہیں اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی یہ غائب نہ ہو جائیں۔ وہ منی بچی کی طرف دیکھتے ہوئے گھبراتی۔ اف! یہ کیسا خوف تھا جو اس کے رگ و پے میں سا چکا تھا۔

دن یوں ہی گزرتے گئے۔ ہر لمحہ جو بیت جاتا اس کے لئے قیامت تھا۔ ہر آنے والا لمحہ اس کے لئے زندگی کا پیام ہوتا۔ کون جانے آنے والا وقت کیا لائے گا۔ کیا دکھائے گا ـــ اور کس میں اتنی تاب ہوتی ہے جو پہلے سے سب دیکھ لے۔ کچھ اور دن بیت گئے۔ اور آخر وہ دن آ ہی گیا جب [illegible] شاہد باہر مضطرب تھا۔ اسے [illegible] کی [illegible] میں [illegible] اس کے [illegible] پیارے پیارے بچے تھے۔ یوں سامنے آ کر چھپ رہے تھے گویا کہہ رہے ہوں "ہمیں تلاش کرو، ہمیں ڈھونڈو۔ دیکھو امی ہمیں دیکھو۔" اس کے ہونٹوں پر اس تکلیف میں بھی مسکراہٹ تھی جیسے وہ جانتی تھی کہ وہ انہیں پالے گی۔ ڈھونڈ لے گی۔ اس نے مسرور ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں کھولتے ہی اس نے پوچھا "کیا ہے؟"

نرس نے مسکراتے ہوئے کہا: "لڑکا" اور پھر اس کے گڈوں سے کہیں زیادہ ایک خوبصورت گڈے کو لا کر اس کے پہلو میں لٹا دیا۔

"لڑکا ہے"

"لڑکا! ـــ سچ" اس نے خوش ہو کر اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے گڈے کو دیکھا اور پھر یوں آنکھیں موند لیں جیسے وہ خوشی سے بوجھل ہو گئی ہوں۔ جب شاہد مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا تو وہ آنکھیں بند کئے مسکرا رہی تھی۔

"ناہید بیگم تم جیت گئیں۔ دیکھو تو تمہارا گڈا تمہارے پاس آ گیا"۔ خوشی سے شاہد کی آواز کانپ رہی تھی ـــ پر کسی نے بھی آگے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ پر نہیں رکھا۔ کسی نے نہیں کہا کہ "ہاں بھئی ہم جیت گئے"۔ حیا کے بوجھ سے جھکی ہوئی آنکھیں کھولی گئیں کسی نے شاہد کو نہیں دیکھا۔ ـــ خوبصورت گڈا پہلو میں روتا رہا۔ شاہد سرہانے کھڑا اس کو تکتا رہا۔ پر وہ آنکھیں اپنے اندر خوشی کا لامحدود خزانہ سمیٹ کر بند ہو گئیں ہمیشہ کے لئے ـــ"

نئے لکھنے والوں سے

درخواست ہے کہ وہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر صاف اور خوشخط لکھیں۔ جو مضامین اشاعت کے لئے منتخب کر لئے جاتے ہیں وہ ترتیب وار شائع ہوتے ہیں۔ ناقابل اشاعت مضامین نظم و نثر اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جب کہ ان کے ہمراہ ٹکٹ لگا ہوا لفافہ ہو۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ لگا لفافہ ارسال فرمائیے تاکہ آپ کے مکتوب کا بروقت جواب دیا جا سکے۔

مدیر

مصیبت ہے شاعر کی بیوی ہونا

■ شاعر سے شادی کا معاملہ بڑا ہی ٹیڑھا ہوتا ہے۔

■ شاعر سے کسی لڑکی کی شادی جانتے بوجھتے لڑکی کو کنوئیں میں جھونکنے کے برابر سمجھی جاتی ہے۔

یہ شاعر

عشق بھی ایسی لڑکیوں سے کرتے ہیں کہ بیس برس بھی اس لئے ٹنگے رہیں تو اپنی محبوبہ سے اُن کی شادی نہ ہو پائے ـــ توجہاں

اپنی قسمت میں بھی ایک شاعر کی بیوی بننا لکھا تھا۔

گاگن، دنیا کا ایک عظیم مصور، چالیس سال کی عمر میں اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر پیرس چلا جاتا ہے تاکہ وہ مصوری کر سکے۔ وہاں اس کے ایک دوست کی بیوی اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنے شوہر کو چھوڑ دیتی ہے اور آخرکار خودکشی کر لیتی ہے۔ اس کی موت کا اسے قطعی افسوس نہیں ہوتا اور وہ کہتا ہے میں ایسی عورتوں سے نفرت کرتا ہوں جو شدید عشق میں مبتلا ہوتی ہیں اور مرد سے اس کی تمام تر محبّت اور توجہ مانگتی ہیں۔ میں ایک فنکار ہوں اور میں اپنے آپ کو صرف کسی عورت کی محبّت کے لئے وقف نہیں کر سکتا۔" بعد میں وہ ایک معمولی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ اسے گاگن کے آرٹ سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اس سے کوئی مطالبہ نہیں کرتی اور گاگن اپنی موت تک اسی کے ساتھ مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ فن اور فنکار ـــ عورت ان دو انتہاؤں کے درمیان آج تک اپنا صحیح مقام نہ پا سکی۔ فنکار عورت کو نہ پاکر اپنی زندگی کھو دیتا ہے اور عورت کو پاکر اپنا فن۔ اسی لئے بڑے ادیبوں، شاعروں اور مصوروں کی ازدواجی زندگی بیشتر تلخ رہی ہے۔

فنکار ایک نارمل اور متوازن شخصیت نہیں رکھتا۔ سماج کی مروجہ اخلاقی اقدار پر ہم اس کی شخصیت کو پرکھ نہیں سکتے۔ وہ اپنی شخصیت کو ماحول، افراد اور اخلاقی و سماجی قوانین کے مطابق نہیں ڈھال سکتا۔ اس کی شخصیت اور اس کے ماحول کے تضاد کا اظہار ہی اس کا فن ہے۔ لوگ اس کی شخصیت اور اس کے فن کو چاہے سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر فنکار کے قریبی افراد کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس سے بے تعلق نہ رہیں۔ اور ایسا نہ ہونے کی صورت میں وہ افراد سے اپنے قریبی تعلقات بھی باقی نہیں رکھ پاتا۔ پھر یہ ضروری بھی نہیں کہ ایک اچھا فنکار، اچھا بیٹا، اچھا شوہر اور اچھا باپ بھی ثابت ہو بلکہ عام طور پر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ کہ ایک اچھا فنکار ان سماجی اور دنیاوی رشتوں کو کبھی کامیابی سے برقرار نہیں رکھ سکتا جن کا برقرار رکھا جانا ہم عام انسانوں کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔

فن دراصل بنیادی جبلتوں کے بالواسطہ اظہار کا نام ہے۔ ایک طرف جبلتیں اپنی راست تشفی چاہتی ہیں تو دوسری طرف فنکار ذہن ان تشنہ خواہشات کو اس بلند شکل میں پیش کرنا چاہتا ہے جو موسیقی بھی ہے اور شاعری بھی اور مصوری بھی۔ [illegible] ہے جسم اور اس کے تمام تر جذبات کو اپنے اوپر [illegible]

دوسری طرف عورت کا پیار اسے اس کے فن سے ہٹنے نہیں دیتا ہے اور وہ عورت سے بیزاری محسوس کرنے لگتا ہے اور اپنے جذبات کے اس راستے پر رکاوٹ پا جانے سے بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کی توانائیاں اور اس کی اندرونی قوتیں اسے اکساتی ہیں کہ وہ اپنا اظہار فن کی شکل میں کرے۔ پھر بھی عورت جب تک وہ محبوبہ بنی رہے اس متضاد صورت کو کسی نہ کسی طرح نبھائے جاتی ہے۔ مگر بیوی بن کر خوبی سے نبھائے جانا بہت مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ لڑکیاں شاعر کی محبوبہ بننے میں تو بڑی دلکشی پاتی ہیں مگر شاعر کی بیوی بننا ان کے لئے سوہان روح ہو جاتا ہے۔ ہم سہیلیاں جب آپس میں ایک دوسرے کو چھیڑتیں یا بددعا دیتیں تو کہتیں کہ خدا کرے تمہاری شادی کسی شاعر سے ہو۔ کچھ عرصہ بعد سہیلیوں کا دیا ہوا یہ کوسنا میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا بن گیا تھا۔

شاعروں سے شادی کا معاملہ بھی بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے شاعر سے کسی لڑکی کی شادی جانتے بوجھتے لڑکی کو کنویں میں جھونکنے کے برابر سمجھی جاتی ہے اور یہ شاعر عشق بھی ایسی ایسی لڑکیوں یا عورتوں سے کرتے ہیں کہ بیس برس بھی الٹے لٹکے رہیں تو اپنی محبوبہ سے ان کی شادی نہ ہو پائے۔ شاعر ہیں، کچھ کماتے نہیں لاابالی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بھلا کون سمجھدار ماں باپ اپنی لڑکیوں کو ایسوں کے حوالے کریں گے۔ نتیجہ یہ کہ شاعر لوگ عشق تو اونچی نیچی جگہوں پر کرتے ہی رہتے ہیں۔ مگر شادیاں ان کے ماں باپ جہاں کوئی بدنصیب لڑکی مل جاتی ہے کر دیتے ہیں۔ کچھ دنوں لڑکیاں بے چاری پریشان رہتی ہیں کہ کس مخلوق سے پالا پڑا ہے کہ پہلے تو ہیئت ہی عجیب پھر مزاج سونے پہ سہاگہ، ہر وقت شاعری سر پہ سوار، دوست احباب سے الٹی سیدھی بحثیں تو کبھی، آدھی رات کو گھر واپس آنا ادھر شاعر صاحب کا یہ حال کہ گھر میں بیوی موجود ہے [illegible] شاعری بھی چل رہی ہے، تفریح بھی ہے [illegible] کی کچھ فکر نہ بیوی کی کوئی پرواہ، اگر قسمت سے [illegible] آجاتا ہے کہ صاحب بیوی تو ایسی [illegible] شاعر [illegible] کچھ [illegible] کر سکتے ہیں

تو جی ہاں! اپنی قسمت میں بھی ایک نوجوان شاعر کی بیوی بننا لکھا تھا۔ یہ شادی والدین کی زبردستی سے نہیں بلکہ ہماری پسند اور خوشی سے ہوئی۔ پہلے میں محبوبہ تھی۔ اور اب بیوی ہوں۔ محبوبہ سے بیوی بننے تک بڑا طویل راستہ طے کرنا پڑا۔ شادی سے قبل اپنے شاعر شوہر کے متعلق بڑی خوفناک باتیں سننے میں آتی تھیں کسی بھی مرد کے متعلق جو بدترین اور خوفناک باتیں کی جا سکتی ہیں وہ سب میں سن چکی تھی اور اس طرح میں انہیں ان کی تمام ترکیبوں کے ساتھ قبول کر چکی تھی۔ بہرحال جب شادی ہوئی تو سچ جانیئے بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ تو کسی بھی پہلو سے خوفناک نہ تھے بس شاعر تھے نرے شاعر۔

میں اس بات کو بلا جھجک ظاہر کرنا چاہتی ہوں کہ میں انہیں عورتوں میں سے ہوں جن سے گوگن جیسا فنکار نفرت کرتا ہے۔ جو مرد سے شدید عشق کرتی ہیں اور ان کی تمام تر محبت اور توجہ چاہتی ہیں میں نے بھی اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز اسی تمنا سے کیا تھا۔ شاعر کو اس کی تمام شاعرانہ کمزوریوں کے ساتھ جانتے ہوئے اسے مطمئن رکھنا اور اپنی اس تمنا کو پورا کرنا شاعر کی بیوی کے سامنے یہی وہ مسئلہ ہوتا ہے جس کا صحیح حل تلاش کرنے پر ہی اس کی زندگی کی کامیابی و ناکامی کا دارومدار ہوتا ہے۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں شوہر کی شاعرانہ شخصیت میری نظروں سے اوجھل رہی، میں ان سے پوری محبت اور توجہ چاہتی رہی میں سمجھتی تھی کہ ان کا جی باہر کسی بات میں نہیں لگے گا بس کچھ ضروری کام کر کے فوراً بھاگے بھاگے چلے آیا کریں گے۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ان کی طبیعت کبھی نہ تھکے گی۔ مجھ پر نظمیں اور غزلیں کہیں گے اور پتہ نہیں اس قسم کی کتنی ڈھیر ساری غلط سلط باتیں میرے دل میں تھیں مگر یقین جانیئے کہ شادی کے تیسرے ہی دن جو صبح سے نکلے ہیں تو پھر رات کے [illegible] بجے گھر واپس آئے اور پھر دوسرے دن [illegible] بجے سے پہلے بستر سے نہیں اٹھے۔ معلوم ہوا کہ شادی کی خوشی میں دوستوں نے بہت شاندار ضیافت کی اور پھر جب [illegible] آیا تو [illegible] رات کے [illegible] بجے گھر [illegible] کے [illegible]

[illegible]

زندگی میں تھوڑی سی بے راہ روی مجھے بھی بھلی لگتی ہے
پہلے پہل تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ زندگی ہی بے راہ روی کا نام ہے
وقت پہ کھانا، وقت پہ سونا اور نہ ہی کوئی اور وقت کام پہ۔ آپ
بھی اپنے شاعر کی زندگی کو معمول پہ لانے کے لئے بے چاری بیوی کو
کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شاعر کی زندگی تو
جیسے گزرتی تھی ویسے ہی گزرتی رہتی ہے اور بیوی غریب رفتہ رفتہ
اپنے اصولوں کو ترک کر کے اس بے راہ روی میں خود شریک ہو جاتی
ہے۔ میں چاہتی تھی کہ وہ وقت پہ کھانا کھا لیا کریں اور اس کے لئے
میں نے بڑی کوشش کی مگر ہوا یہ کہ میں خود وقت پہ کھانا کھانے کی
عادی نہ رہی اگر کبھی بھوک سے بے چین ہو کر ان کے آنے سے پہلے کھا
لیتی تو نازک مزاج شاعر کے احساسات کو اتنی ٹھیس پہنچتی کہ بس کچھ نہ
پوچھئے۔ کچھ یہی حال رات میں وقت پہ سونے کا ہوا۔ پہلے تو مجھے گھر
پہ چھوڑ کر تنہا شام میں گھومنے کے لئے چلے جاتے تھے اور رات میں
بہت دیر سے واپس آتے۔ جاگتے جاگتے میری حالت تباہ ہو جاتی
اس کے بعد میں خود شام میں ان کے ساتھ باہر نکلنے لگی تاکہ انھیں
جلد گھر واپس لے آؤں پہلے تو ہر جگہ ساتھ لے جانے پر محسوس کیا کہ بیوی کو
ہر وقت ساتھ رکھنا کچھ ٹھیک نہیں ہے تو کرتے یہ کہ مجھے کسی سہیلی
کے گھر چھوڑ دیتے اور رات میں لینے کے لئے آ جاتے کچھ دنوں تک
یہی سعادت مندی دکھائی پھر اسی پرانی ڈگر پہ لوٹ آئے۔ میرے
لئے پریشانی [illegible]
انسان کو جاگنا پڑتا تھا۔ اب میں نے آخری کوشش یہ کی کہ ٹھیک نو بجے
سہیلی کے گھر سے نکل کر باہر سڑک پہ آ کر ٹھہر جاتی اور وہیں انتظار کرتی
میں نے سوچا کہ اب تو وہ ضرور جلد آ جایا کریں گے لیکن اس تجربے
کا بھی وہی حشر ہوا جو اور تجربوں کا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے ان
کو جلد گھر لانے کی کوشش ہی چھوڑ دی۔ ان مسائل پر شاعر سے
الجھنا بیکار ہے وہ اپنے آپ کو درست تو خیر کیا کرے گا البتہ بیوی سے
ضرور وہ تنگ آ جائے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں کو اپنی شاعری
کا اتنا خیال نہیں ہوتا جتنا کہ اپنے شاعرانہ مزاج کو برقرار
[illegible]

رکھنے کی ہوتی ہے۔ میں نے بھی اپنی عافیت اسی میں جانی کہ شاعر
کے شاعرانہ مزاج اور کمزوریوں سے صلح کر لوں۔

اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو یہ بھی کہہ دوں کہ محبوبہ بنی
رہنے کے باوجود میں نے کبھی شاعر کو INSPIRE نہیں
کیا۔ ان کی بیاض میں مجھ پہ لکھی ہوئی نہ کوئی نظم ہے نہ کوئی غزل
نہ ہی کوئی رباعی۔ شاعر کی پچھلی محبوبائیں اس معاملے میں بڑی خوش قسمت
رہیں کہ ان کی پوری شاعری ان ہی کے تذکروں سے بھری پڑی ہے
اب میں یہ محسوس کرنے لگی ہوں کہ میں نے اپنے شوہر کو بہت خوش اور مسرور
رکھا ہے مگر ان کے اندر چھپے ہوئے شاعر کو میں نے کچھ بھی نہیں دیا
میرے شوہر مزاجاً رومانی شاعر ہیں اور رومانی شاعر غالباً زندگی کی
محرومیوں، حالات کی ستم ظریفی اور محبوبہ کی بے وفائی سے متاثر ہو کر
تو شعر کہہ سکتا ہے لیکن شاید وصل، مسرت اور حاصل کردہ محبت
سے متاثر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور ذرا میری بدقسمتی ملاحظہ
کیجئے کہ میں نے نہ ہجر اور فراق کی گھڑیوں کو طویل ہونے دیا اور نہ
ہی شاعر کے دل میں محرومیوں کا غم پیدا ہونے دیا اور نہ ہی بے وفائی کی
ظاہر ہے کہ شاعر کا دل اب ایسی لڑکی سے کیا متاثر ہوتا۔ خود وہ یہ
کہتے ہیں کہ حاصل ہونے والی چیز اپنا CHARM کھو دیتی ہے
لیجئے یہ تو وہی بات ہوئی کہ مرغی جان سے گئی اور کھانے والے کو لطف
نہ آیا بہرحال مشاعروں میں جب وہ پچھلی محبوباؤں پہ کہی ہوئی غزلیں
اور نظمیں لہک لہک کر سناتے ہیں تو سچ جانئے سینے پہ سانپ
لوٹ جاتا ہے۔

شاعر دراصل تضادات کا ایک مجموعہ ہوتا ہے ان کی فطرت
میں بھی کئی تضادات جمع ہیں۔ جہاں وہ چند چیزوں کے معاملے میں
بہت محتاط ہیں، سلیقہ و نفاست برتتے ہیں وہیں بعض معاملات
میں انتہائی لاابالی ہیں۔ ان کے اکثر ملنے والے اور خصوصاً عورتیں بڑی
مداح ہیں کہ وہ بہت نفاست اور سلیقے سے کھاتے ہیں ایک دانہ ادھر
ادھر نہیں گرتے۔ پلیٹ بہت صاف رکھتے ہیں اور کھانے کا
انداز بہت اچھا ہے اور میں آپ سے کیا بتاؤں کہ گھر میں وہ کس
طرح کھاتے ہیں۔ چونکہ ان کے [illegible]

دسترخوان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جیسے کسی بچے نے تمام کھانا پھیلا دیا ہو۔ سالن کٹورے سے لے کر تو کبھی سیدھے چپیٹے میں ڈال ہی نہیں سکتے۔ کسی نہ کسی طرح وہ دسترخوان پر گر ہی جاتا ہے اور جب نوالہ اٹھاتے ہیں تو اس طرح کہ وہ آدھا منہ میں جاتا ہے اور آدھا پلیٹ میں کبھی کبھار ہاتھ کبھی نہیں دسترخوان پر پلیٹ ہی میں دھو لیتے ہیں

پہننے کے معاملے میں البتہ شاعر صاحب بہت زیادہ سلیقہ مند ہیں کپڑا کبھی گندہ یا میلا نہیں پہنیں گے۔ دھوبی اگر کپڑے لانے میں دیر کر دے تو اپنے ہاتھوں سے کپڑے اس طرح دھوتے ہیں کہ ڈرائی کلیننگ کمپنی سے دھلے معلوم ہوتے ہیں۔ گرمی میں کم سے کم لباس پہننے کے قائل ہیں۔ تہمد باندھ لیا اور بنیان پہن لی، کبھی کبھار تو بنیان کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔

میرے شوہر نے غالباً ترقی پسندی کے اظہار میں بال بڑھا رکھے ہیں، پہلے مجھے ان کے اسٹیج ایکٹروں کے سے بال دیکھ کر بڑی شرمندگی اور کوفت ہوتی تھی اس لئے بھی کہ میرے بال عورت ہونے کے لحاظ سے بہت چھوٹے ہیں اور ان کے بہت گھنے اور بڑے پھر دوسری مصیبت یہ کہ ان کے بال کچھے نہیں رہتے۔ لکھنے پڑھنے میں منہمک ہوں تو چہرے پر اس طرح آ جاتے کہ چہرہ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اور جب ایسی حالت میں مجھ سے کچھ بات کرتے ہیں تو میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ جی چاہتا ہے کہ قینچی لے کر تمام بال سامنے سے کاٹ دوں۔ چونکہ خود شاعر صاحب کے بال اچھے ہیں اور شاید پچھلی محبوباؤں کی زلفیں بھی غنیمت تھیں اس لئے زلفوں پر کافی اشعار لکھے ہیں اور جب میں انہیں پڑھتی یا سنتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مجھے جلانے کے لئے لکھے گئے تھے۔

اپنے شاعر شوہر کی سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ان کی کاہلی اور سستی ہے۔ پتہ نہیں خدا نے شاعروں کو وقت کا احساس کیوں نہیں دیا۔ ہر کام دیر سے کرتے ہیں۔ وقت پر کام کرنا جانتے ہی نہیں چاہے اس سے کتنا عظیم نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے۔ شاعر ہو کر آپ نے پیشہ ایڈیٹری کا اختیار کیا ہے اور پرچہ شاعرانہ بلکہ شاہانہ انداز سے نکالتے ہیں کبھی مہینے میں ایک بار اور کبھی تین ماہ میں ایک بار نتیجہ یہ کہ پرسال سے پہلے [illegible] حالانکہ آتی [illegible]

مدت میں ہوتی اور ہوتا تو اپنی [illegible] پرچہ چھپ کر تیار ہو جاتا ہے مگر بازار میں [illegible] دو ہفتے دیر سے آتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب نے اداریہ ہی وقت پر نہیں لکھا۔ پہلے تو اداریہ لکھنے کی تیاری ہی میں ایک ہفتہ لگ جاتا ہے۔ پھر جب شروع ہوتا ہے تو اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ ایک گھنٹے میں مکمل ہوگا یا ایک دن میں یا ایک ہفتہ میں۔

صبح اٹھتے جلدی ہیں لیکن ضروریات سے فارغ ہونے میں ایک گھنٹہ صرف کر دیتے ہیں۔ اگر شیو کرنا ہو تو پھر سمجھئے پون گھنٹہ مزید برباد۔ اور عام طور پر جتنی دیر میں لوگ نہا لیتے ہیں اتنی دیر میں منہ دھلتا ہے اور اس طرح دھلتا ہے کہ جیسے نہا کر آ رہے ہیں۔ پھر بال بنانے اور ناشتہ کرنے میں دس منٹ۔ لہٰذا زندگی میں آج تک دس بجے سے پہلے آفس نہ پہنچ سکے۔ کسی سے آٹھ بجے ملنے کا وعدہ ہو تو نو بجے پہنچیں گے اور اب تو سبھی جانتے ہیں کہ وہ ملنے کا جو وقت دیتے ہیں اس کے ایک گھنٹہ کے بعد ان سے ملنے کے لئے جانا چاہیئے۔

لاپرواہی کا یہ عالم ہے کہ اپنے خونِ جگر سے تخلیق کی ہوئی نظموں اور غزلوں کو کاغذ کے بیکار پرزوں پر لکھ کر ایسی بیدردی سے پھینک دیتے ہیں کہ کچھ پوچھیئے مت۔ بیاض کی حالت یہ ہے کہ ایک پرانی کاپی کی جلد میں مختلف قسم کے اور مختلف سائز کے کاغذ ٹھنسے ہوتے ہیں۔ کتنی چیزیں کھو گئی ہیں کتنی ایسی ہیں جو چھپ چکی ہیں مگر جن کی نقل موجود نہیں۔ لکھی ہوئی چیز مکمل ہو جانے کے بعد ان کے لئے ردی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

شعر کہنے کی طرف رات میں مائل ہوتے ہیں۔ اس سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ ہر رات وہ کچھ نہ کچھ ضرور کہتے ہیں۔ جی نہیں بلکہ ایسے وقت جبکہ وہ پی رہے ہوں میری کوئی بات ان کو ناگوار گزری ہو تو فوراً شعر کہنے کا موڈ آ جاتا ہے اور اگر کوئی اچھی بات کہوں تو شاعری کا موڈ ہوا ہو جاتا ہے اور چونکہ مجھے اپنے شوہر کو خفا یا ناراض کرنا گوارا نہیں ہے اس لئے ان کی شاعری ہوتی جا رہی ہے۔

میرے شوہر کلام ترنم سے پڑھتے ہیں [illegible]
[illegible]

— عاصم: بچپن میں ہم نے جو خواب دیکھے تھے وہ آج حقیقت بن کر میرے سامنے ہیں۔ تم زینب کو چاہتے ہو چاہے جاؤ۔ میں تم سے کچھ زیادہ تو نہیں مانگتی بس یہ چاہتی ہوں کہ کچھ دن اور ٹھہر جاؤ تاکہ میں جی بھر کے اس ختم ہو جانے والے خواب کی نزاکت اور رنگینی سے لطف اندوز ہو لوں۔

شاید تم نہیں جانتے کہ میں بیکار ٹانگوں کی طرح بیکار دل و دماغ بھی رکھتی ہوں۔

پاگل ہو گئی ہو تم۔ عاصم نے چونک کر پوچھا۔ تو کیا تمہاری ٹانگیں بیکار ہیں؟

کئی دن سے شاہین کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر ایک بھرپور انگڑائی لے۔ اور کسلمندی کا وہ بوجھ جو مہینوں سے وہ اپنے کاندھوں پر محسوس کر رہی ہے اتار پھینکے۔ اور اس وقت تو اٹھتی ہوئی گہری گھٹاؤں کو دیکھ کر اس کا دل مچل گیا اور اس نے اپنی ہتھیلیوں پر بوجھل پپوٹوں کا پردہ ڈال لیا۔ اور تصور میں وہ اپنی آرام کرسی چھوڑ کر دریچے کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ سینے تک آتے اور کاندھوں سے بلند ہو گئے۔ اس نے اپنے مرمریں اعضاء اور لوچدار بدن کو تنبک بنا تے ہوئے پنجوں پر اپنا بوجھ سا دھنا چاہا — اور "اف! — آہ!" کہہ کر اس نے آنکھیں کھول دیں، اس کی ٹانگوں کے سوکھے پٹھے اور مرجھائی رگیں چٹ چٹا اٹھیں۔ جست اور لوہے کے تاروں کی طرح! اس نے اپنی سوکھی سوکھی لکڑی جیسی بیکار ٹانگوں کو ہلانا چاہا اور وہ صرف ارادہ کر کے رہ گئی اس کے اس ارادے کی تکمیل ہی تو مدت ہوئی مر چکی تھی۔

جب وہ جوانی اور ادراک کی سرحدوں سے کچھ دور تھی۔ بس ایک آغوش۔ ایک چھلانگ اور ایک زقند کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ وہ چھت پر سے پتھریلے صحن میں آ پڑی تھی اور پھر مہینوں اسے وحشتناک کڑوی کسیلی خوشبوؤں سے واسطہ پڑتا رہا۔ مختلف چمکیلے سفید اور ستھرے اوزار، گٹھے ہوئے اور دبلے پتلے بازوؤں والے، ڈاکٹروں کے ہاتھوں کے ذریعہ اس کی ٹانگوں پر عمل جراحی کرتے رہے۔ وہ خاموش پڑی ہوئی اسپتال کے مخصوص کمروں کے دریچوں سے باہر جھانکتی رہتی۔ برساتیں آئیں اور گذر گئیں۔ سردیاں محسوس ہوئیں اور گرم گرم لو کے تھپیڑوں سے بدل گئیں۔ مگر وہ اسپتال کے لوہے کے لچکیلے پلنگوں اور نرم گدیلوں پر پڑی۔ بیٹیوں میں جکڑی جکڑائی دواؤں کی کسیلی اور میٹھی خوشبوؤں میں بسی دریچے سے باہر دیکھتی رہتی۔

ماں کی شفقت کے متعلق کتابوں کے اوراق نے اس کے ذہن میں متعدد خاکے تراشے مگر وہ باپ کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں، چوڑے چکلے سینے اور گداز بازوؤں کے درمیان ایک گرم گرم سی کپکپی کے احساس کو سب کچھ سمجھتی رہی۔

جب اس کا باپ کبھی اس کی طبیعت پوچھتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا اور اپنی نوکیلی مونچھوں کے دائرے میں سمٹے ہوئے ہونٹ اس کی پیشانی سے مس کر دیتا۔ تو اس کو عاصم یاد آ جاتا۔ اس کا ننھا سا ساتھی۔ جو اس کو چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ وہ اکثر اس کے متعلق سوچتی کہ وہ ابھی تک ننھا ہی سا ہوگا کیسی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا۔ کس طرح وہ اس کے بالوں سے کھیلا کرتا تھا وہ کہتا "تیرا ماتھا چاند سا ہے۔ اور تیرے بال چھوٹے چھوٹے ہوتے کیسے لگتے ہیں" وہ اس کے بالوں کو بگاڑ کر اس کی پیشانی پر بکھیر دیتا۔

[illegible]۔ اس نے ٹانگوں پہ پھیلا ہوا کمبل درست کیا۔ اور آہستہ سے پاس رکھا ہوا رسالہ اٹھالیا۔ اس کی [illegible]

"اوہ تم ہو شاہین؟" ——"ہیں!" وہ گھبرا گئی —"اوہ! عاصم بھائی تشریف رکھئے" اس نے تکلف برتنا چاہا —"چچا جان کہاں ہیں؟"۔ عاصم نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

عاصم کی لاپرواہی اسے کچھ ناگوار گذری —"آپ تشریف تو رکھئے — وہ بھی آ ہی جائیں گے" اور ابھی اس کی آواز کا ارتعاش فضا میں تحلیل بھی نہیں ہوا تھا کہ ابا آگئے — عاصم اور ابا کچھ سیاسی گفتگو میں محو ہو گئے اور اس کو اپنی ہستی بالکل ایسی محسوس ہوئی جیسے میز پہ ایک ڈش میں سجے ہوئے سیب — اچانک اس کے ابا بولے۔ "ہم لوگوں کے لئے چار بناؤ۔ اور انھوں نے میز کو ہلکا سا دھکا دیا اور میز اپنے پایوں میں لگے ہوئے ننھے ننھے پہیوں پر اس کی طرف گھوم گئی۔

"ہاں عاصم بیٹا" ابا نے گفتگو کا رخ بدلا "میں بوڑھا ہو چکا اور اب ان تمام گزشتہ واقعات پر سوچتے ہوئے بھی تکلیف محسوس کرتا ہوں جو میرے اور تمہارے درمیان گذرے۔ بہر حال تم پھر میرے ہو۔ میرا اپنا خون —" ابا اپنے پائپ سے کھیل رہے تھے۔ شاید وہ اپنے ضمیر کی اس آواز کو جو ندامت کے بوجھ سے کپکپا رہی تھی۔ اخروٹ کی لکڑی سے بنے ہوئے پائپ کی تلاش خراش اور ساخت کی پرکھ سے بالکل ہی دبا دینا چاہتے تھے ــ"آج مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اب تم اور شاہین۔ دونوں میرے اپنے بچے ہو۔ تم دونوں ایک سے ہو — تم دونوں ایک ہو۔"

عاصم نے — سیبوں کی ڈش کے پاس پڑی ہوئی چھری اٹھالی تھی وہ شاید کوئی سنجیدہ جواب سوچ رہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اس کی دھار پر اپنی انگلی پھیری۔ جیسے وہ اس کی تیزی کو پرکھ رہا ہو۔ "میں چاہتا ہوں"۔ وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"دیکھو بیٹی میں ذرا گہری چار پیوں گا" انھوں نے سہارا لیا۔ وہ شاید کہتے ہوئے جھجھکتے تھے — شاہین نے چار داہنی ہاتھ میں تھامے ہوئے نظر اٹھائی — ابا کی آنکھوں میں چشمے کی آڑ سے ایک فیصلہ جھانک رہا تھا — اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

میں چاہتا ہوں — تم دونوں۔ تم دونوں ہمیشہ کے لئے ایک ہو جاؤ" ابا نے جلدی سے جملہ اگل کر پائپ منہ میں ٹھونس لیا۔ اور ایک سیب اٹھالیا۔ شاید وہ جواب کے انتظار سے زیادہ سیب کے چھلکے کی چکناہٹ پر غور کرنا چاہتے تھے۔

"چچا جان —" عاصم نے کہنا شروع کیا۔ اور شاہین کے ہاتھ سے پیچ میں اٹھائی ہوئی تمام شکر نیچے گر پڑی۔

"بات یہ ہے۔ یہ تو درست کہ جو کچھ ہوا اس کو اب ہم فراموش کر دیں۔ میں خود ان باتوں کو یاد کر کے دکھ محسوس کرتا ہوں۔ مگر میں ایسا کرنے سے اپنے آپ کو معذور پاتا ہوں"

عاصم نے آہستہ سے ہاتھ میں تھمی ہوئی چھری سے ایک سیب کو چھید دیا۔ شاہین کو ایسا محسوس ہوا جیسے عاصم نے یہ چھری سیب کے بجائے اس کے سینے میں اتار دی ہے۔

"عاصم!" اسے دور، بہت دور سے ابا کی بھاری آواز سنائی دی "مگر یہ کیوں؟"

"چچا جان — میں ایک فرض کے درمیان گھرا ہوا ہوں۔ میں یہ آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر مجبوری ہے۔ آپ کو شاید دکھ ہو۔ جب میں نے گھر چھوڑا۔ تو مجھے کوئی سہارا مدت تک نہ مل سکا اور پھر جو سہارا ملا تو ایک بڑھیا بیوہ کا جس نے مجھے اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا۔ اور آج اسی کی بدولت میں ایک کامیاب ڈاکٹر ہوں۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس بیوہ کی محنت ایک ڈاکٹر کے روپ میں آپ کے سامنے ہے۔ اور اس بیوہ کے بھی ایک لڑکی ہے" زینب"

شاہین کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا کسی نے اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

اور پھر دوسری صبح اس نے جاتے ہوئے عاصم کو رخصت کرتے ہوئے اس نے کہا :۔

"عاصم تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ بچپن میں ہم نے جو خواب دیکھے تھے وہ آج حقیقت بن کر میرے سامنے ہیں۔ تم زینب کو چاہتے چاہے جاؤ میں تم سے کچھ زیادہ نہیں مانگتی [illegible]

اور ٹھہر جاؤ۔ میں دوبارہ بھر کے اس ختم ہو جانے والے خواب کی لذت
اور رنگینی سے لطف اندوز ہو لوں۔ تم شاید یہ نہیں جانتے کہ میں
بے کار ٹانگوں کی طرح بے کار دل و دماغ بھی رکھتی ہوں"
کیا کہہ رہی ہو تم۔ عاصم نے چونک کر پوچھا" تو تمہاری ٹانگیں
بے کار ہیں ؟"

" ہاں۔! اور اسی لئے تو باوجود اس قبول صورتی اور دولت
کے کوئی اس بے کار جسم کو قبول نہیں کرتا" اور اس نے عاصم کو ہلکی ہلکی
سسکیوں کے درمیان سب کچھ سنا ڈالا۔

اور پھر عاصم رک گیا" تمہارا علاج ہو سکتا ہے" عاصم نے
شاہین سے کہا۔ اور شاہین ایک مرتبہ پھر خطرناک آپریشن کے تصور سے
لرز گئی۔ "نہیں آپریشن کی ضرورت نہیں۔ تم صرف میرے ساتھ دہلی چلو۔
تم وہاں زینب سے بھی مل کر خوش ہو گی" اور شاہین اس خیال سے اس
کے ہمراہ دہلی آ گئی کہ شاید وہ عاصم کو جیت سکے۔

شاہین کی ٹانگوں کا علاج دہلی آتے ہی بس ہو چکا تھا مگر اس کے
ذہن اور احساس ابھی تک مریض تھے۔ عاصم نے اس سے کہا۔" شاہین
تم اگر کوشش کرو تو تم اچھی ہو سکتی ہو" وہ اسے طاقت کی دوائیں کھلاتا
رہا اور اس کے ذہن اور احساس سے اس دھند کو مٹاتا رہا کہ اس کی
ٹانگیں بے کار ہیں وہ چل پھر نہیں سکتی۔ زینب کی رفاقت نے جلد ہی اسے
موہ لیا۔ اب عاصم کی مسکراہٹ اور زینب کی رفاقت اس کی زندگی
کی مسرت تھی اور چھ ماہ بعد شاہین چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی۔!

وہ رات اس کی زندگی کی کس قدر تابناک اور رنگین رات
تھی۔ جب اس نے اپنی صحت کی خوشی میں ہونے والے ڈنر میں اپنا ڈانس
دکھایا۔ اس کے ابا کس قدر خوش تھے، اور خود وہ بھی اپنے سینے میں ایک
بے پایاں مسرت محسوس کر رہی تھی۔ مگر ایک ہلکی ہلکی احساس ٹیس اس
کے دل میں کبھی تیز ہو جاتی۔" عاصم زینب کا ہے"

زینب نے اسے صحت یابی کی مبارک باد دیتے ہوئے
[illegible] تم [illegible] خوش رہو۔ [illegible]" زینب بولی۔
"کیا! میں اپنا کچھ دے دوں" یہ سوچ کے دل کی اتھاہ
گہرائیوں میں ٹیس اٹھی جس نے الفاظ کا روپ دھار لیا۔

[illegible]

"مجھے خود تمہاری ضرورت ہے۔ اور میں کیا دے سکتی ہوں؟" "خدا
رکھے تمہیں کس بات کی کمی ہے۔ تم خود چاہو تو دوسروں کو دے سکتی ہو۔
زندگی کی تمام راحتیں تمہارے پاس ہیں"

" زینب بہن۔ میں عاصم کو چاہتی ہوں تم عاصم کو مجھے دے دو"

" شاہین۔!"

" ہاں زینب انہیں میری ضرورت ہے"

" مگر۔؟"

زینب بہن انہیں دنیا میں کیا کچھ کرنا ہے۔ انہیں سب کچھ
کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے۔ اور۔ اور"

" شاہین۔ تم۔ تم" زینب سسکیاں لینے لگی۔" مجھے سوچنے دو
مجھے سوچنے دو"

زینب کے جانے کے بعد اس نے سوچا یہ اس نے کیا کیا۔ یہ اس
نے کس طرح کہہ دیا۔ اور یہ سب کچھ اس نے سوچا کب تھا۔ اسے ایسا محسوس
ہوا جیسے اس نے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ نہ اس کا ایسا ارادہ تھا یہ کوئی اور
تھا جس نے کہا۔ کوئی غیبی طاقت۔ کوئی انجان قوت۔ مگر اب ؟۔ اور
جو زینب انکار کر دے۔ سب کچھ عاصم سے کہہ دے تو۔ تو کیا ہو گا ؟۔
عاصم اسے کس قدر ذلیل خیال کرے گا۔

دوسری صبح زینب نے اس سے کہا" میں عاصم کی خاطر سب کچھ
برداشت کر سکتی ہوں۔ میں ان کی بھلائی کے لئے اپنی جان تک قربان کر
سکتی ہوں۔ میں ان کی کامیاب زندگی کو اور کامیاب بنانے کے لئے
ان سے دست بردار ہوتی ہوں۔ اب عاصم تمہارا ہے" شاہین اس
مسرت میں ایسی کھو گئی کہ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ زینب کی تمام شب
روتی آنکھوں کی سرخی کے پس پردہ ایک بیچارگی، نامرادی اور محروم
زندگی کی کربناکی سسک رہی ہے۔

وہ اپنی اس اچانک کامیابی کی اطلاع دینے کو ابا کے پاس
دوڑ گئی۔ مگر اسے راہ میں عاصم نے روک لیا" سنو شاہین" عاصم
کے چہرے پر ایک کرخت سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔

" اوہ عاصم تم۔!" وہ اس کے بازوؤں میں جھول جانا چاہتی تھی

" شاہین تم جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے چلی جاؤ"

تمہارے ہاتھ بڑھا کر دھڑکتے ... میں چنگاریاں سی دہک رہی تھیں

تمہارے باپ نے میرے بچپن کی مسرت چھین لی۔ مجھے نکال کرکے نکال دیا اور تم بھی خود غرض باپ کی بیٹی ہو اور مجھ سے میرا سب کچھ چھیننے آئی ہو۔ تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ اپنی دولت کی تمام رنگینیاں اور جھنکاریں لے کر تم یہاں سے چلی جاؤ۔ تم کسی غریب کے دل کی قدر کیا جانو؟"

"عاصم!" وہ چیخی۔

"تم محبت کرنا کیا جانو۔ محبت کی قدر بھی وہی کر سکتے ہیں جو قربانی اور ایثار جیسے بلند جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ تم چلی جاؤ فوراً۔ مجھے زینب کی محبت اور زینب کی رفاقت کی ضرورت ہے۔ عاصم نے فیصلہ سنا دیا۔

شاہین کی سانس تھم گئی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تھم گئی تھی۔ اس کی پتلیوں کی گردش تھم گئی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا دنیا اپنے مرکز پہ تھم گئی ہے۔"

مدقوق شاہین نے ہولے سے ایک کروٹ لی۔ کھڑکی سے ہلکی ہلکی ہوا آ رہی تھی۔ سینی ٹوریم پر موت کا سا سکوت چھایا رہا تھا۔

... کی تمام آنکھوں کے آگے ایک۔ وہ سرے سے تیر رہی تھیں۔ اس کے ماضی کے تمام چہرے اس کی آنکھوں میں ناچ رہے تھے۔ تمام ملاقاتوں کی طرح آج کی رات شاہین کو بے چینی نہیں تھی۔ آج تمام رات وہ ایک مرتبہ بھی نہیں کھانسی تھی۔ آج اس نے خون کی قے نہیں کی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے وہی آنا کے ہسپتال کی وہ کھڑکی یاد آ گئی جس سے سمندر میں کھڑے ہوئے جہازوں کے بادبان نظر آتے تھے۔ انھیں بادبانوں میں وہ عاصم کا چہرہ دیکھتی رہی۔

یکایک اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مشرق سے سپیدی ابل رہی تھی۔ اس نے اپنی ٹانگیں سمیٹیں۔ اور بستر پہ اوندھی ہو کر تکیہ کے نیچے سے ایک لفافہ نکال لیا۔ اس نے اس میں سے عاصم کی تصویر کھینچ لی۔ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اسے نگاہوں کے سامنے کر لیا۔ یکایک اس کے سینے میں ایک طوفان اٹھا۔ سینے سے حلق تک ایک گولا سا سرک آیا۔ اور کھانسی کے ساتھ حلق سے خون کا لوتھڑا عاصم کی تصویر پہ آ گرا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

پاس ہی لفافے میں اس کی وصیت پڑی تھی۔ زینب کی محبت کے ساتھ عاصم کو جس چیز کی ضرورت تھی وہ اسے اس نے دے دی تھی۔

صفحہ ۳۹ کا بقیہ ——— شاعر کی بیوی

گھر میں اب پڑھتے بھی ہیں۔ میں بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ مصروف اور مطمئن بیٹھتی ہوں کہ آج تو بہت عمدہ سنائیں گے لیکن جب ان کا نام پکارا جاتا ہے تو مسکرا کر مائک کے قریب آتے ہیں۔ چند کچھ دیر تو اپنے آپ میں گنگناتے ہیں اور پھر بالکل نئی طرز میں غزل شروع کر دیتے ہیں۔ میں شرم سے پسینہ پسینہ ہو جاتی ہوں جب مصرعہ اٹھانے والے سننے والوں کو اتنا رحم آتا ہے کہ وہ بھی مصرعہ اٹھانے میں حصہ لے کر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اچھا خاصہ کلام غارت ہو جاتا ہے۔ بہرحال اس مختصر سے مضمون میں یہ بتانا ممکن نہیں کہ شاعر کی بیوی بے چاری کن مسائل سے دوچار رہتی ہے۔ اس لئے کہ وہ خود ہے اور یہ سارا حسن بے چارہ بیوی کے سر رہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ فنکار کی بیوی ہے۔ شاعر کو تو خوب خوب داد ملتی ہے۔ زندگی میں نہ سہی موت کے بعد ہی سہی۔ اس کے کلام پر تحقیق کی جاتی ہے۔ اس کا یوم منایا جاتا ہے اور اس کی بد نصیب بیوی کو کوئی بھی نہیں پوچھتا جو زندگی بھر شاعر کا ساتھ دیتی ہے اور جی جان سے گذر جاتی ہے۔

[illegible] مستقبل جنم لیتا ہے۔ کڑی سے [illegible] ہے۔ [illegible] کرتی ہوائیں کو موجودہ دور سے [illegible] انسان کا [illegible] میں صدیوں کی دوری طے کرنا پڑی [illegible] حیات کے سفر کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

[illegible] پہلے کا فاصلہ جتنا آج کم ہو گیا ہے، اتنا شاید کبھی نہیں رہا [illegible] تحریک اور میر سے غالب تک اور غالب سے اقبال [illegible] کے فاصلے درمیان میں ہیں۔ پچھلے پچیس تیس سال میں اردو [illegible] بدل چکا ہے۔ اس کی مثال شاید ہی کہیں تاریخ میں ملے۔

ترقی پسند تحریک اردو ادب میں۔

آزادی ایک مقصد کی طرح ہندوستان میں بسنے والوں کے سامنے تھی جب آزادی صرف ایک سیاسی تحریک نہ ہو کر ایک عبادت، ایک عقیدت کا روپ دھار چکی تھی۔ ہم اپنی تمام قوتوں۔ جسمانی۔ ذہنی۔ اور روحانی سطحوں پر اس تحریک میں کھوئے ہوئے تھے۔ آدمی کی نظر زندگی میں رومان اور خواب ٹٹولنے کے بجائے برٹش راج کی جڑ کھودنے میں مصروف تھی۔ نظم اب راج درباروں کی رقاصہ، خلاقوں کی پتنگ اور فرصت کے لمحوں کی ذہنی عیاشی نہیں رہی تھی۔ وہ کھیتوں کی مٹی۔ چٹختی ہڈیوں، بند مٹھیوں اور وطن پرستی کے رس کی کہانی بنتی جا رہی تھی۔ اب نظم کے قارئین گاؤ تکیے سے ٹکے پان کے بیڑے چبانے والے نہیں تھے۔ ان کا تعلق عوام سے تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں سے۔ کارخانوں میں اوزار چلانے والے مزدوروں سے، اور دفتروں میں قلم سے روزی کمانے والے کلرکوں سے۔ اس دور کی نظم سماجک اور زمینی تھی۔ لیکن یہ بھی جذباتیت سے اپنا رشتہ نہیں توڑ پائی۔ رنگین نقابیں اب بھی چہروں پہ ڈالی جاتی تھیں۔ یہ رومانیت دوسری سطح سے ابھرتی ہے۔ بچھڑے ہوئے طبقوں کی بڑائی کا راگ، گاؤں کی تنگ پگڈنڈیوں میں حسن کی کھوج، محنت کشوں کی طاقت کا راگ۔ بجھے ہوئے چہروں میں ہر کلس کی آب و تاب اور ایک خاص نظریہ حیات پہ اٹوٹ اعتماد، زندگی کا رومانی پہلو ہی سامنے لاتی ہے۔ مگر وقت سماج اور ملک کے حالات کے مطابق یہ پہلے دور کی رومانیت اور جذباتیت کی طرح افیم کی گولی نہیں تھی۔ اس میں جینے اور حوصلوں میں کس بل پیدا کرنے کی صلاحیت ضرور تھی۔

ان نظموں میں گھن گرج، چیخ پکار، غصہ اور صداقت تھی۔ یہ سیدھی آسان، بیانیہ اور براہ راست ہوتی تھیں۔ ان میں فلسفۂ حیات کی جھلکیاں، فرد کی انفرادی الجھنیں، گہری سوچ، چھوٹی چھوٹی زندگی کی پرچھائیاں، نفسیاتی سوجھ بوجھ، اور مختلف آوازوں کا ایک فرق نہیں دکھائی دیتے۔ یہ ٹھہرے ہوئے بند پانی کی طرح [illegible]

نئے شاعر کی آنکھیں اس کے چہرے پر کم اور دماغ میں زیادہ دھنسی ہوئی ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ رنگین نقابوں کے پیچھے چھپی تاریکی کا سراغ لگانے میں نہیں جھجکتا۔

[illegible] معصومیت کو دیکھیں ہی کہ سامنے آئی تھی۔ اس وقت کی نظم پر انیسویں صدی کے انگریزی رومانی شاعروں، جن میں ورڈس ورتھ، شیلے، کولرج اور جان کیٹس خاص ہیں، کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ کچی جذباتیت، حقیقتوں سے فرار اور ایک طلسماتی دنیا کی کھوج ذہنوں پر بری طرح چھائی رہی۔ اس رومانی رجحان کے نمایندے شاعر اختر شیرانی کی نظموں میں زبان، تکنیک، مواد اور روپ کے کئی تجربے نظر آتے ہیں۔ مگر ان کی نظر ستاروں کے خوابناک جال میں الجھی رہی اور ہاتھ چاند کو چھونے کی ناکام کوشش میں اٹھے رہے۔ وہ اس ست رنگی زمین کو گناہ کی زمین مان کر عشق (جو ذہنی نہیں) سے کہیں اور لے چلنے کی درخواست کرتے ہیں۔ ان کی محبوبائیں بھی زمین پر چلتی پھرتی عورتوں کے بجائے ورڈس ورتھ کی لوسی یا الف لیلوی پریوں کی مانند خیالی پرچھائیاں ہی بنی رہیں۔ [illegible] ماحول، اٹھتا ہوا اور حقیقتوں سے فراریت، [illegible] رنگوں اور خوشبو سے بھی بنی دنیا کا خواب [illegible] نظموں کی خصوصیات ہیں۔

[illegible] سن ۳۵ - ۳۶ کی دین ہے۔ یہ اس کچی جذباتیت [illegible] کے خلاف ایک بغاوت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

ذہنی ونفسیاتی رشتہ پہچان کی نظر کم ہی پڑتی ہے۔ سردار، مجروح، کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کی تخلیقات اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

ن م راشد کا مجموعۂ کلام "ماورا" اس سطحیت اور بحر و قافیہ کے جو التزام، کے خلاف پہلی آواز تھی، جس نے اپنے اور اپنے پہلے دور کی بہت ساری آوازوں کو پاک کر ختم لیا تھا۔ راشد، میراجی۔ اپنے ڈھنگ، لہجہ اور لب ولہجے کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں سب سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ نعرے بازی کے شور میں بھی دھیمے دھیمے رنگوں میں بدلتے دور میں سانس لیتے، متوسط طبقے کی کش مکش، الجھنوں، اور اقتصادی حالات کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں فرد کا تعلق سماج سے زندہ اور نفسیاتی ہے۔ سردار جعفری، نیاز حیدر، کیفی اور مجروح کی نظر انسان کے اوپری ڈھانچے سے الجھتی رہی۔ مگر راشد، میراجی اور فیض نے آدمی کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ مگر پہلی دو آوازیں نئی، جاندار اور خوبصورت ہوتے ہوئے بھی نقادوں کے تیروں کا نشانہ بنی رہیں

اردو کی نظم جس کا جنم ہر حالت میں آزادی کے بعد ہی مانا جائے گا انھیں لکیروں کا نکھرا ہوا صحت مند اور سنجیدہ روپ ہے۔ راشد اور میراجی کی نظمیں نئی سمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی زندگی کے ایک ہی پہلو کو کئی کئی پہلوؤں سے دکھاتی رہی ہیں۔ وہ زندگی کے مسائل، سماجی الجھنیں، اقتصادی افراتفری، اور ذہنی احساس کمتری سب میں جنس کا رنگ ہی بھرتے رہے، جہاں سردار جعفری، کیفی، مجروح وغیرہ پر مارکس کی گہری چھاپ ہے۔ تو ان پر فرائڈ کا بھوت بری طرح حاوی نظر آتا ہے راشد زندگی کی الجھنوں کا حل اپنی عمیق نگہی سے بھی جاناں بانہوں کے لمحاتی وقتی حصار کے علاوہ کہیں نہیں ڈھونڈ پائے۔

زندگی سے..
بھاگ کر آیا ہوں میں
اے مری ہم رقص
مجھ کو تھام لے

[illegible] مشینی پرچھائیں ملک کی غلامی کا بدلا ایک جوان بدن سے لیتے ہیں [illegible] ہاتھ میں پونچھ ہوئے آنسوؤں کی نمی دیکھ [illegible] کوشش [illegible] کے بعد ذہن صاف، کھلا اور منطقیانہ

[illegible] ہے، [illegible] کے بعد کسی سپاہی کی طرح یہ آزاد ملک، [illegible] سوجھ بوجھ سے اپنے آپ کو اور اپنے واسطے سے سماج کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے، یہ نظر رومانی شاعرانہ یا جذباتی نہیں، یہ سائنسی نگاہ ہے یہ کسی چیز کو حوالوں اور اسناد کے دلائل پر نہیں، اپنی معلومات و تجربات کی کسوٹی پر پرکھ ہی لیتی ہے، نئے سماج میں نئے انسان کی تلاش اور سماج میں اس کے رشتے کی نوعیت کا تعین اس کا مقصد ہے۔ زندگی پر اس کی گرفت جذباتی، جنس زدہ، رومانی یا نظریاتی ردعمل کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس مشینی دور میں اس کے ذہنی ڈھلاؤ کا ثبوت ہے۔ نیا ذہن جنس اور بھوک کی لمبی چوڑی خلیج کے درمیان ایک زندہ پل کی طرح بدلتے ہوئے وقت کی آہٹوں کو سننے کا حوصلہ رکھتا ہے اور انھیں اپنی انفرادی اور سماجی منطق کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ یہ آج کا نیا آدمی ہے۔ کسی بات کو اندھا ہو کر مان لینا اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہ ہر اصول، ہر روایت کے سامنے سوالیہ نشان کی طرح کھڑا ہوا ہے۔ اس کا رشتہ ملک کی چہار دیواری میں رہ کر بھی تمام انسانی برادری سے ہے۔ نیا شاعر ایک اکائی میں کئی اکائیوں کی زندگی بنا ہوا ہے۔

اردو نظم بدلتے ہوئے حالات میں متوسط ذہن کا تجزیہ ہی نہیں۔ اس بکھرے ہوئے سماج میں اس کے نئے روپ کی تلاش کی کوشش بھی ہے۔ یہ ستے آدمی کی نظم ہے جس کی آنکھوں میں خواب ہیں اور نہ ہاتھوں میں کوئی جھنڈا۔ اس کا سر بڑا بہت بڑا۔ اور ہاتھ پیر روز بروز چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے لہجے میں کڑواہٹ اور گہرا طنز ہے، جو ننگی سچائیوں سے ٹکرانے کا ردعمل ہے، یہ ہر چیز پر طنزیاتی نظر ڈال کر ایک تماشائی کی طرح خود بھی اس میں شامل ہو کر اس کا تجزیہ کرنے سے نہیں چوکتا۔

نئی نظم گھر کی دہلیزوں، خستہ کرتے آنگنوں، اونچے اونچے مکانوں، پکی سڑکوں، جھکے ماتھوں، اترے چہروں اور شور کرتی مشینوں میں پلی بڑھی ہے، اس میں زمین کی خوشبو، گھریلو فضا اور ایک نیا لہجہ ہے جو نئے زاویوں میں نئے اور نئی زندگی کو ڈھونڈتی ہے۔ نئی نظم کے موضوعات کسی دھرتی کی زندگی کا چونکتی احساس کے جیتے ہیں۔

[illegible] ہر بڑی سگریٹ کی قیمت [illegible] چاہئے [illegible] [illegible]

شکاریوں کے ہتھیار

شکاریوں کے متعلق امور میں ایک اہم موضوع ان کے اسلحہ
انسان کا استعمال ہے۔ گزشتہ ایک صدی کے اندر اندر شکاری اسلحہ
نے جو ترقی حاصل کی ہے اس نے شکار کے فن پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اور
اس طرح قدیم و جدید اسلحہ استعمال کرنے والے پرانے اور نئے شکاریوں میں
جو فرق ہونا چاہیے وہ محتاج تعارف نہیں ہے۔ گزرتے بدلتے اور ترقی
کرتے وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف شکار کی اقسام گھٹ بڑھ رہی ہیں
ان میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں بلکہ خود شکاریوں میں ان کے طور
طریقوں، ہتھیاروں، شکار کے اصولوں اور نظریات میں بھی خاصی تبدیلی
ہو چکی ہے۔

۱۸۵۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کی ایک صدی میں برصغیر کے شکاریوں
کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا وہ جو شکار کے
لئے توڑے دار (MATCH LOCK) بندوقیں استعمال
کرتے تھے جو برصغیر میں مغلوں کی آمد کے بعد عام ہو چکی تھیں۔ دوسرے
گروپ میں وہ شکاری آتے ہیں جو توڑے دار بندوقوں کی جگہ ایسٹ
انڈیا کمپنی کے توسط سے رائج ہونے والی ٹوپی دار (FLINT-LOCK)
بندوقیں اور رائفلیں استعمال کرتے تھے۔ پہلی جنگ آزادی کے قریب
تک ایک خاص قسم کی کارتوسی بندوقیں اور رائفلیں رائج ہو چکی تھیں
جن کا استعمال انگریزی فوجوں تک محدود تھا۔ لیکن انگریزی تسلط کے
فوراً بعد شکاریوں اور فوج دونوں کے استعمال میں کارتوسی BREECH
LOADER بندوقیں اور رائفلیں عام ہو گئیں۔ لہٰذا شکاریوں کے
اس دوسرے گروپ میں وہ لوگ شامل ہیں جو ٹوپی دار ہتھیاروں سے
لے کر کارتوسی اسلحہ تک ہر چیز استعمال کرتے تھے۔ موجودہ صدی کے
اوائل میں کارتوسی اسلحہ میں مزید ترقی اور ترمیم ہوئی۔ اور شکار کے
لئے خصوصی (کیمبرے) رائفلیں رائج ہوئیں۔ توشہ دان [illegible]

افریقہ کے پیشہ ور کھلاڑی

آج کل ہاتھی مارنے کے لئے جدید رائفلیں استعمال کرتے ہیں جن میں سب سے بھاری رائفل
چھ سو بور ہے۔ اس رائفل کی گولی کا وزن نو سو گرین ہوتا ہے۔

اگرچہ چھ سو بور کی

نو سو گرین وزنی گولی ہاتھی کے بدن میں کسی بھی ہڈی پر پڑ جائے تو اس کا جھٹکا اتنا شدید
ہوتا ہے کہ ہاتھی کم از کم آدھے گھنٹے کے لئے بے ہوش ہو جاتا ہے۔

[illegible] کالی بارود استعمال ہوتی تھی۔ توڑے دار اور [illegible] والے اسلحہ میں جو فرق تھا اس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ توڑے دار اسلحہ کا تعارف مغلوں کے ذریعہ ہوا۔ توڑے دار بندوقوں اور [illegible] میں لبلبی نہیں ہوتی تھی بلکہ نال اور دستے کے [illegible] دائیں یا بائیں جانب ایک پلیتہ یا سن کی رسی سے بنا ہوا ایک [illegible] (HAMMER) لگا ہوتا تھا جس میں فلیتہ سلگتا رہتا تھا۔ توڑے دار ہتھیار کے استعمال کا طریقہ یہ تھا کہ نال کے منہ سے بارود ڈال کر درست ہوتی کر ڈاٹ لگائی۔ پھر چھرہ گراب یا گولی جو بھی مقصود ہوا بھرا۔ نال کے جس حصہ میں بارود رہتی ہے (CHAMBER) اس کے ساتھ نال کے باہر ایک چھوٹی سی پیالی بنی ہوتی تھی۔ یہ پیالی اور بندوق میں بھری ہوئی بارود کے درمیان ایک باریک سا سوراخ ہوتا تھا۔ فائر کرنے سے پہلے اس پیالی میں ذرا سی بارود ڈال دی جاتی جسے انجک کہا جاتا تھا۔ اس طویل کارروائی کے بعد بندوق سے نشانہ لیا جاتا اور انگوٹھے سے جلتے ہوئے فلیتے کو جھکا کر پیالی میں بھری ہوئی انجک کو لگایا جاتا جس کی چنگاری اس سوراخ کے ذریعہ بندوق میں بھری ہوئی بارود کو اڑا دیتی اور فائر ہو جاتا۔ یورپین اقوام نے اس توڑے دار میں اتنی ترمیم کی کہ فلیتے کی جگہ گھوڑا لگایا جس میں فلیتہ لگا رہتا تھا۔ فائر کے وقت انگوٹھے سے اس گھوڑے کو انجک کی پیالی میں گرا دیا جاتا۔ اور جب اس ہتھیار کو اور ترقی دی گئی تو گھوڑے کو انگوٹھے سے گرانے کے بجائے کمانی دار لبلبی ایجاد کی گئی جسے انگلی سے دبا کر فلیتہ آہستہ آپ انجک میں جا گرتا۔ اسی لبلبی اور فلیتہ نے آگے بڑھ کر ٹوپی دار ہتھیاروں کو جنم دیا۔ ٹوپی دار ہتھیار آج بھی استعمال ہوتے ہیں مگر ان کے اصول کا ذکر بے کار نہ ہوگا۔ توڑے دار اور ٹوپی دار دونوں ہی ہتھیار منہ سے بھرے جاتے تھے۔ یعنی دونوں مزل لوڈر کہلاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ٹوپی دار ہتھیاروں میں انجک کی پیالی کی جگہ نال کے بارود خانے پر لگے ہوئے نپل (NIPPLE) نے لے لی اور فلیتہ کی جگہ آتشیں ٹوپی (PERCUSSION CAP) نے لے لی۔ اس ٹوپی کو نپل پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ لبلبی دبانے پر گھوڑا نپل پر گرتا ہے جس کی چوٹ سے نپل میں لگا ہوا آتش گیر مادہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اور بندوق کی بارود [illegible]

آگ پکڑ لیتی ہے اور فائر ہو جاتا ہے۔ نپل اور ٹوپی کی ایجاد نے دونالہ ہتھیار بنانے کا موقع فراہم کر دیا۔ اور اس طرح شکار کی دنیا میں ایک نیا انقلاب آ گیا جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ توڑے دار اور ٹوپی دار دونوں طرح کے ہتھیاروں میں کالی بارود استعمال ہوتی تھی۔ بارود سازی میں مغلوں نے کمال حاصل کیا تھا۔ یہ آتش گیر مادہ صرف فوجی اور شکاری ہتھیاروں میں ہی استعمال نہ ہوتا تھا۔ بلکہ آتش بازی اور سرنگیں بچھانے کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ لیکن برطانوی تسلط کے بعد جب برصغیر کے رہنے والوں کے لئے ہتھیاروں کا ہی استعمال جرم قرار پا گیا تو بارود سازی کا فن بھی آپ سے آپ ختم ہو گیا۔ اس کے باوجود مقامی لوگ آج تک بارود بناتے ہیں جسے دیسی بارود کہا جاتا ہے۔ انگریزوں نے جب برصغیر کی عظیم منڈی میں اپنے ملک کی مصنوعات کو کھپانا شروع کیا تو کپڑے اور برتن سے لے کر ہتھیار اور بارود تک ہر چیز اپنی ہی رائج کی۔ برطانوی ساخت کی بارود کو عام طور پر ولایتی بارود کہا جاتا تھا۔ اور اسی کو ہتھیاروں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ بارود کی کتنی ہی اقسام ہیں جن کا ذکر طوالت کا سبب ہوگا۔ اس زمانے کے لحاظ سے تو ایسی کالی بارود والے ہتھیار کچھ کم مہلک اور مؤثر نہ تھے۔ لیکن رائج الوقت کارڈائٹ بارودوں کے مقابلے میں اس کالی بارود کی مار (RANGE) اور توڑ (PENETRATION) بہت کم تھی۔ یعنی یہ کالی بارود والے ہتھیار نہ تو زیادہ فاصلہ پر مار کر سکتے تھے اور نہ ہی دور کھڑے ہوئے جانور کو مہلک زخم پہنچا سکتے تھے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اس دور کے شکاری شکار پر گولی چلانے سے قبل اس کے قریب تر پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ جس نے خاموشی، پھرتی اور معمولی سے معمولی آڑ کا فائدہ اٹھانے کی خوبیاں پیدا کر دی تھیں۔ اس پر بھی فائر اس وقت کیا جاتا تھا کہ جب سو فیصد کامیابی کا یقین ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک پرانے انگریز شکاری کی وہ نصیحت یاد آتی ہے جو اس نے اپنے بیٹے کو ہاتھی کے شکار کے بارے میں کی تھی۔ یہ نصیحت اور ہدایت نہ صرف بے حد کارآمد اور مفید ہے بلکہ اس سے اس قدرتی خوف کی بھی نشاندہی ہوتی ہے جو شکاریوں کے دل میں جانوروں کی طرف سے جاگزیں رہتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہاتھی سے تیس قدم دور تک

پہنچ جاؤ۔ پھر جتنا اور نزدیک جا سکتے ہو جاؤ۔ پھر دس قدم اور آگے بڑھ جاؤ تب فائر کرو۔"

اس لطیفہ نما ہدایت کے کئی حصے ہیں (۱) ہاتھی پر بیس قدم سے زیادہ فاصلے سے گولی نہ چلاؤ۔ (۲) جب ہاتھی سے بیس قدم کے فاصلے تک پہنچ جاؤ تو (۳) اس کے جتنا قریب اور جا سکتے ہو جاؤ۔ اور پھر (۴) دس قدم اور آگے بڑھ جاؤ۔

یعنی مطلب یہ ہے کہ ہاتھی کے بالکل سر پر پہنچ جاؤ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پرانے شکاری اپنے دور کے ہتھیاروں کے سبب اپنے شکار کے بیحد قریب تک جانے پر مجبور تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب افریقہ میں ہاتھی کے شکار کے لئے پرانے طرز کی چار بور، آٹھ بور اور دس بور کی ٹوپی دار بندوقیں استعمال ہوتی تھیں۔ چار بور میں رائج الوقت اوزان کے حساب سے لگ بھگ دو چھٹانک وزنی گولی چلائی جاتی تھی۔ ہاتھی کے شکار کی ان پرانی بندوقوں (ELEPHANT GUNS.) کے بور کا حساب یہ تھا کہ ایک پونڈ سیسے میں چار بور کے لئے چار گولیاں، آٹھ بور کے لئے آٹھ گولیاں اور دس بور کے لئے دس گولیاں بنتی تھیں۔ اب چار بور کا استعمال بالکل متروک ہو چکا ہے اس کے چلانے کے لئے بڑے تن و توش کی ضرورت تھی۔ نحیف الجثہ شکاری اس کو کسی دوسرے کے کندھے یا تپائی (TRIPOD) پر رکھ کر چلاتے تھے۔ آدھ پاؤ کی گولی چلانے والی یہ بندوق توپ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ بہرحال کارتوسی آٹھ بور اب بھی دیکھنے میں آتی ہے لیکن ان کا بننا بند ہو چکا ہے اور جن لوگوں کے پاس یہ آثار قدیمہ موجود ہیں ان کے لئے بطور خاص کارتوس بنوانا پڑتے ہیں۔ مشہور عالم اسلحہ ساز فرم ہالینڈ اینڈ ہالینڈ آٹھ بور کا ایمونیشن خصوصی آرڈر دینے پر تیار کر دیتی ہے۔ آٹھ بور میں بارہ بور کی طرح چھرّہ گراب گولی ہر قسم کے کارتوس چل سکتے ہیں مگر خیال ہے کہ اب آٹھ بور سے شاید ہی کوئی شکار کھیلتا ہو۔ افریقہ کے پیشہ ور شکاری آجکل ہاتھی مارنے کے لئے جدید رائفلیں استعمال کرتے ہیں۔ جن میں سب سے بھاری رائفل ۔۶۰۰ بور ہے۔ اس رائفل کی گولی کا وزن نو سو گرین ہوتا ہے۔ اس رائفل ... کا دھکا اتنا سخت ہوتا ہے کہ اس کے دھکے ... [illegible] جاتے ہیں جب گولی ہاتھی کے بدن ... [illegible] اشجاع

میں ہاتھی مر جاتا ہے ... (LB SHOCK ABSORBER) ... جاتا ہے۔ اگر چہ سو بیک لو سو گرین وزنی گولی ہاتھی کے بدن میں کسی بھی ہڈی پر پڑ جائے تو اس کا جھٹکا اتنا شدید ہوتا ہے کہ ہاتھی کم از کم آدھے گھنٹے کے لئے بیہوش ہو جاتا ہے۔ جدید خیال کے شکاری ہاتھی اور دوسری اقسام کے شکار کے لئے بھاری رائفلوں کے استعمال کو غیر ضروری اور غیر شکاریانہ (UN - SPORTING) کارروائی تصور کرتے ہیں لیکن شکاریوں کے مختلف مکاتیب خیال ہیں جن میں ہتھیاروں کی اقسام اور بور کے موضوع پر بڑا اختلاف ہے۔ بھاری بور کے مخالفین کا کہنا ہے کہ چھ سو بور لے جانے والے شکاری اگر فیل شکن توپ استعمال کریں تو ہاتھی اور زیادہ آسانی سے مر سکتا ہے۔ جب کہ موافقین کا یہ کہنا ہے کہ جن شکاریوں کا ذریعہ معاش ہی شکار ہے انہیں اسپورٹ کی نزاکتوں سے زیادہ اپنی مختصر سی زندگی کی پرواہ ہونی چاہیئے۔ ان شکاریوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ شکاری اور بالخصوص ہاتھی کے شکاری طبعی عمر کا آدھا حصہ بھی بمشکل پاتے ہیں۔ اس لئے انہیں کوئی خطرہ مول نہ لینا چاہیئے۔ شکاریوں کی ایک تیسری قسم وہ ہے جو درمیانے درجہ کی رائفلوں کے حق میں ہے۔ ان کی نظر میں ۳۷۵۔ میگزین یا ۴۰۰/۴۵۰۔ دونالہ رائفل ہر قسم کے شکار کے لئے موزوں ہے۔ ہلکے بور کے ہتھیاروں سے درندوں اور ہاتھیوں کا شکار کرنے والوں کے ہلاکت آفریں حادثات سے دوچار ہونے کے واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ بھاری بور کے استعمال میں ہی عافیت معلوم ہوتی ہے۔ مگر جدید شکاریوں میں ایک اور اختلاف میگزین اور دونالہ ہتھیاروں کے سوال پر ہے۔ کچھ لوگ میگزین رائفلوں کے قائل ہیں جن میں تین سے سات تک کارتوس آسکتے ہیں۔ اور بولٹ ایکشن کے ذریعہ تیزی سے فائر کئے جا سکتے ہیں۔ دوسرا طبقہ دونالہ رائفلوں کے حق میں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خطرناک شکار کے موقعوں پر اگر میگزین کا باریک اور پیچیدہ میکنزم خراب ہو جائے تو مصیبت ہو جائے جب کہ دونالہ رائفل میں ایک نال ... کے بعد دوسری نال پر ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے ... دونالہ رائفلوں کے حق میں ایک ... [illegible] مثلاً ۴۷۰/۵۰۰ اور ... [illegible]

بغداد کی چاندنی
یروشلم کی دھوپ

"چناں قحط اندر دمشق است"

دمشق کے دوکاندار دنیا کے کسی دوکاندار سے مختلف نہیں۔ لیکن کیا دمشق، کیا بغداد اور کیا عربیہ کے کسی دوسرے شہر کا دوکاندار یہاں سب کی کچھ اپنی مخصوص خصوصیات ہیں۔ پاکستانی دوکاندار گاہک کو دس چیزیں بھی پیشانی پہ تیوری ڈالے بغیر دکھائے گا۔ گاہک نے کچھ خرید لیا تو ٹھیک ہے ورنہ وہ خاموشی سے چیزیں سمیٹنے لگے گا۔ لیکن عرب دوکاندار پہلے تو علیک سلیک کرکے آپ کے تمام خاندان کی خیریت طلب کرے گا۔ اور غالباً خاندان سے اپنی واقفیت کا اظہار کرے گا اور پھر چیزیں دکھانے کے بعد ہی مشتعل ہو جائے گا کہ میرا مال ناقص نہیں ہے۔ پسند کیوں نہیں آیا۔ اگر خریدنا نہ تھا تو دیکھا کیوں؟ دیکھا ہے تو اب خرید۔ اپنے مال کو ناپسندیدگی کی توہین سے بچانے کے لئے عرب دوکاندار قیمت بھی کم کر دیتا ہے۔ لیکن ان دوکانداروں میں بعض باتیں اچھی بھی ہیں۔ جس طرح عرب کے ہر گھر کی یہ رسم ہے کہ جب گھر کا کوئی فرد نہا دھو کر غسل خانہ سے باہر نکلتا ہے تو دیگر تمام افراد اسے "نعیماً" (خدا تمہیں اپنی پناہ میں رکھے) ضرور کہتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے دوکاندار گاہک کو چیز دیتے بار "اللہ بارک" (اللہ مبارک کرے) ضرور کہتے ہیں۔ دوسری رسم یہاں کے دوکانداروں کی یہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی اپنے جہیز کے لئے کچھ خریدتی ہے تو دوکاندار اسے ہدیہ (تحفہ) ضرور دیتا ہے۔ وہ لڑکی دوکاندار کے لئے کس قدر اجنبی کیوں نہ ہو۔ اور اگر کبھی دوکاندار بھول جائے تو لڑکی خود ہی لجاتی شرماتی ہدیہ مانگ لیتی ہے۔ اس رسم کے پس منظر سے میں کما حقہٗ واقف نہ ہو سکی۔ لیکن اسے لڑکی کی آئندہ زندگی کے لئے مبارک شگون تصور کیا جاتا ہے۔

> دمشق لاکھ خوبصورت و پُرفضا سہی لیکن ہم تو بغداد کی چاندنی کے مارے تھے۔ بغداد اپنی تمام تر خونریزی کے باوجود عزیز تھا۔ دجلہ کے وہ پل بری طرح یاد آتے تھے جن پہ جلوس نکلتے اور گولیاں چلتی تھیں اور ہم لوگ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ٹہلتے تھے۔

عرب لڑکی کا جہیز پاکستانی لڑکی کے جہیز سے قطعی مختلف ہے۔ پاکستان میں ہندوؤں سے مستعار لئے جو رسم و رواج قائم ہیں ان میں تبدیلی سے یقیناً ہمارا اسلام خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن اسلامی ممالک میں شادی بیاہ کا رنگ ہی دیگر ہے۔ ہر اسلامی مملکت میں عوامی عدالت کے علاوہ ایک شرعی عدالت بھی قائم ہے جو زوجین کے حقوق کا تحفظ کرتی ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ بنت عم اور ابن عم سے قطع نظر اگر غیر قبیلوں اور غیر خاندانوں کے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو اس پسندیدگی کی اطلاع والدین کو دیدی جاتی ہے۔ اور پھر لڑکے کے والدین نکاح کا کوئی دن مقرر کرکے خاندان کے بزرگوں اور اپنے اپنے محلوں کے حیثیت والوں سمیت دولہا کے ہمراہ عدالت شرعیہ کی راہ لیتے ہیں۔ جہاں قاضی لڑکے اور لڑکی کے برتھ سرٹیفکیٹ اور دیگر کاغذات تسلی بخش پاکر نکاح پڑھا دیتا ہے۔ حق مہر کا فیصلہ

[illegible] اندھیرے راستے کے مسافروں کو [illegible] کے سامنے کی روشنی اور موٹروں کی گھرر گھرر کے سوا کوئی آواز [illegible] کی آواز اچانک عجلت و تیز رفتاری کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ [illegible] دمشق سے دو موٹریں ہم سے دو گھنٹے پیشتر نکلی تھیں۔ ہمارا [illegible] پہنچنا چاہتا تھا۔ جب وہ موٹریں راستے میں نظر آگئیں تو [illegible] کرکے اور کچھ کہتے ہوئے ہمارا ڈرائیور آگے نکل آیا۔ تقریباً [illegible] منٹ بعد پچھلی موٹروں میں سے ایک موٹر ہم سے آگے ہوگئی۔ اور اگلی پچھلی دونوں موٹریں ہماری موٹر کو گھیرے میں لے کر چلنے لگیں۔ نہ ہم آگے ہو سکتے تھے نہ پیچھے۔ ہر دو موٹر میں ہٹے کٹے لمبی لمبی مونچھوں اور سونے کے دانتوں والے مرد بیٹھے تھے۔ ہماری موٹر میں اللہ کی قدرت ہی قدرت تھی۔ ہمارا گھبرانا لازمی تھا۔ بہتیرا چیخے چلائے۔ ڈرائیور کو پچھلی سیٹ پر بیٹھی خواتین نے جوتے بھی بہت لگائے لیکن وہ تو اندھا گونگا اور بہرا ہو چکا تھا۔ اور ہم صدائے صحرا کی جیتی جاگتی تصویر۔ لق و دق صحرا میں ہم اللہ کے بھروسے سفر کرتے رہے اور جب سورج کی آخری مدد آئی اور اگر میں مسلم پر تینوں موٹریں رکیں تو ہم نے موت غنیمت جان کر سرحدی پولیس اسٹیشن میں گھس کر اپنی حالتِ ناپیاں کردی۔ پولیس نے کچھ بھانپ کر تینوں موٹروں کی تلاشی لی تو ہماری موٹر کی سیٹوں کے نیچے سے بھی شراب کی بوتلیں دستیاب ہوئیں۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ پہلی اور پچھلی موٹر کے مسافروں نے کسٹم افسران سے کہا تھا کہ تیسری موٹر میں ان کی پردہ نشین خواتین بیٹھی ہیں۔

پولیس نے دونوں موٹریں دو گھنٹے کے لئے روک لیں اور ہمیں آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ لیکن ہم آگے کیا بڑھتے کہ اوندھے منہ ریت پر لڑھک گئے۔ دو بجے ہم کرک سے چلے تھے اور صبح کے ٹھیک چار بجے ڈرائیور نے موٹر صحرائی ریت پر الٹا دی۔ روشن اور نیلے آسمان پر ستارہ سحری دم توڑ رہا تھا۔ اور سپیدۂ سحر نمودار ہونے کے لئے مچل رہی تھی صحراؤں کی صبحیں بار بار دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ لیکن ہم نظارۂ فطرت کے بجائے کسی غیبی امداد کے منتظر تھے۔ پاکستان میں ہم نے جب بھی بذریعہ موٹر سفر کیا؟ کبھی گرد کے ٹرک اور کبھی پجارو [illegible] کر منزل تک پہنچے۔ اس صحرا میں بھی کچھ یہی معاملہ نظر آتا تھا۔ لیکن کسی [illegible] کے بجائے ہمیں دو موٹریں سڑک پر نظر آئیں [illegible] دکھائیں۔ انہی [illegible] کم بختوں نے کسی قسم کی

مدد کے بجائے بڑے اطمینان سے کہا۔

"دیکھا ہماری شکایت کرنے کی اللہ نے کیسی سزا دی۔ سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔" "بغداد کی گرک گرک میں بھی تمہاری شکایت کریں گے۔" ہم بھی جواباً کہہ لے۔ اور اپنی مدد آپ کے تحت سب مل کر موٹر کو سیدھا کرنے لگے۔ ہم لوگوں نے موٹر اور ڈرائیور دونوں کو سیدھا تو کر دیا لیکن بغداد آٹھ بجے پہنچنے کے بجائے دن کے ساڑھے بارہ بجے پہنچے۔ اور یوں بغداد کی چاندنی سے یروشلم کی دھوپ تک کا معرکہ خیز اور پُر از مہم سفر تمام ہوا۔ اور میں سندباد جہازی کی جانشین بن کر اپنے تمام تر سفروں کے واقعات شمار کرنے لگی۔ ان سفروں میں بری، ہوائی اور سب ہی شامل تھے۔ بحری سفر پہلی مرتبہ ۱۹۵۹ء میں کیا۔ ورنہ اس سے پیشتر ہر سفر ہوائی ہی رہا۔ اس بحری سفر کی بھی اپنی ایک الگ داستان ہے۔

صفحہ ۵۱ کا بقیہ ـــــــ شکاریوں کے ہتھیار

دونالہ ساخت میں ملتی ہیں۔ میگزین ساخت میں شاذ ہی بنتی ہیں۔ بہرحال یہ مسئلے تو افریقہ کے پیشہ ور (PROFESSIONAL HUNTER) اور شوقین (SPORTSMAN) شکاریوں کے تھے۔ مگر برصغیر کے شکاریوں کے اختلافی مسائل بھی کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ یہاں بھی بھاری اور ہلکی رائفلوں کی بحث تھی۔ ہاتھی پر مچان باندھ کر اور پیدل گھوم پھر کر شیر مارنے والے شکاریوں کی جتھہ بندی تھی اور اب بھی ہے۔

برصغیر میں توڑے دار اسلحہ کے دور کے شکاری ہمارے تذکرے کی حد سے باہر ہیں۔ اب توڑے دار ہتھیار یا تو عجائب گھروں میں دیکھے جا سکتے ہیں یا ان علاقوں کے رہنے والوں کے پاس جو جدید تمدن و تہذیب کے اثرات سے آزاد اب تک جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ وسطی اور جنوبی ہند کے علاقوں میں رہنے والے بھیل اور دراوڑ اور دوسرے جنگلی قبائل کے شکاری اب بھی توڑے دار بندوقیں استعمال کرتے ہیں۔ بعض جدید شکاریوں نے بھی ماضی کی ان یادگاروں کو محفوظ رکھ چھوڑا ہے جو انہیں اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہیں۔

جم جونیئر

گلریا کا آدم خور

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ تقسیم برصغیر سے دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ جم اپنے دوست ٹھاکر رنبیر سنگھ کے علاقے میں شکار کھیلنے گئے۔ وہاں ایک آدم خور شیر کی اطلاع ملی جس نے ایک بیچارے اور ٹھاکر صاحب کے گاؤں گلریا بہار ۵ پور کے ایک نوجوان گوالے کو مار دیا تھا۔ جم نے جب اس شیر کو تلاش کر کے مارنے کی کوشش کی تو ایک پراسرار مسلح گروہ کی سرگرمیاں علم میں آئیں جس کا گڑھ اکبر آباد کے گھنے جنگلوں میں معلوم ہوتا تھا۔ اس انکشاف پر پولیس کے دستے جنگل میں پہنچ گئے اور چھان بین کرنے لگے۔ جم آدم خور شیر کو شکار کر کے واپس ہوتے تو سفر میں ایک پُراسرار اینگلو انڈین کا ساتھ ہوا جس سے ناقابل فہم حالات میں لڑائی ہو گئی۔ اور وہ جم کو بری طرح زخمی کر کے ٹرین سے فرار ہو گیا۔ اس کے سامان سے ۷۵ بور کی ایک ایسی رائفل برآمد ہوئی جس پر نہ تو کوئی نمبر تھا اور نہ بنانے والی فرم کا نام۔ جم نے اس پراسرار ہتھیار کا تعلق کسی اسی خفیہ گروہ سے سمجھا اور اس پورے معاملے میں انہیں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اینگلو انڈین سے اس معرکے میں وہ سخت زخمی ہو گئے۔ اور بہت دن ہسپتال میں رہ کر تبدیلی آب و ہوا کے لئے بھوالی چلے گئے جہاں ایک دن یہ انکشاف ہوا کہ اس پراسرار گروہ نے ان کے دوست ٹھاکر صاحب کو اغوا کر لیا ہے اور یہ شرط لگا دی ہے کہ جب تک اکبر آباد کے جنگل سے پولیس نہ ہٹائی جائے گی انہیں رہا نہیں کیا جائے گا۔ یہ خبر لے کر ٹھاکر صاحب کی بیگم خود نینی تال آئی تھیں۔ اور اس گروہ کی طرف سے اس سلسلے میں جو خط ملا تھا وہ بھی ساتھ لائی تھیں۔ یہ خط آر آر آر نامی خفیہ تنظیم کی طرف سے تھا۔ اپنے دوست کے اغوا ہو جانے کی خبر پا کر جم نے نینی تال میں ہی اپنے ایک اور دوست آغا صادق کی مدد حاصل کی جن کا حکومت اور سرکاری حلقوں میں بڑا رسوخ تھا۔ آغا صادق نے فوری طور پر گورنر سے احکامات جاری کرا دیئے کہ اکبر آباد سے پولیس واپس بلالی جائے۔ اس حکم پر فوری عمل ہوا۔ جم کو آر آر آر کی طرف سے شکریئے کا خط بھی ملا۔ لیکن ٹھاکر صاحب کو رہا نہیں کیا گیا۔ مجبوراً جم نے گورنر سے استدعا کی کہ آر آر آر کا پتہ چلانے اور متعلقہ افراد کو قانون کی گرفت میں لانے کی خدمت ان کے سپرد کر دی جائے۔ گورنر نے آر آر آر کے بظاہر پراسرار اور پیچیدہ معمے کو حل کرنے کے لئے جم کی پیشکش منظور کر لی۔ اور انہیں پولیس کی ایک خاص برانچ کا کمشنر مقرر کر کے خاص اختیارات تفویض کر دیئے۔ آر آر آر کی نظروں سے پوشیدہ رہنے کے لئے جم نے اپنی حادثاتی موت کا ڈھونگ رچایا اور خود آغا صادق کے پٹھان دوست عیسیٰ خان کے ساتھ سادھوؤں کا بھیس بدل کر جنگل اور پہاڑوں کے راستے اکبر آباد کے جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں انہوں نے سادہ لوح پہاڑی دیہاتیوں کا دل موہ لیا۔ ان کو بے دریغ روپیہ دیا۔ ان کے قرضے ادا کر دیئے اور ان کو اپنی مصنوعی بزرگی سے گرویدہ کرتے ہوئے یہ دونوں جب ایک پہاڑی جنگل سے گزر رہے تھے تو ایک آدم خور شیر سے مڈبھیڑ ہو گئی جو ایک انگریز نوجوان کی لاش کھا رہا تھا جم نے شیر کو مار دیا اور اس انگریز کی لاش سے بعض خفیہ تحریریں برآمد ہوئیں۔ جم نے دارجلنگ پر آغا صادق سے رابطہ قائم کر کے لاش اٹھائے جانے اور خفیہ تحریریں حکام کے سپرد کرانے کا انتظام کیا۔ اور خود آگے بڑھے۔ اور بالآخر بلند و بالا اور دشوار گزار پہاڑوں کے درمیان انہیں ایک پراسرار قلعہ نما عمارت نظر آئی جس میں مسلح افراد موجود تھے۔ ان دونوں نے ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر دیکھا کہ ایک اور جوان انگریز گھوڑے پر سوار [illegible] نکلا اور پہاڑوں کی طرف روانہ ہوا۔ جم گہری تشویش میں [illegible] کون ہے؟ [illegible] انگریز نوجوان کا کیا رابطہ ہو سکتا ہے [illegible]

... اس طرح ایک ایک کرکے گھوڑے کے ساتھ ان دونوں کا اضطراب بڑھتا گیا ... دونوں بے چینی سے آنے والے
کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ گھوڑا سوار برآمد ہوا تو عیسیٰ خاں نے اسے گرفتار کرلیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے اپنا نام لیفٹیننٹ بسیل
بتایا جس سے یہ معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑے افسر نے اسے گرفتار کیا ہے تو اس نے اپنے بارے میں کچھ تفصیل سے نہیں بتایا۔ البتہ یہ ظاہر ہو گیا تھا
کہ اس کا تعلق آزادی کے گروہ سے ہے۔ اور اسی راز کے افشا ہو جانے کی وجہ سے اس نے اپنی انگوٹھی میں لگی ہوئی زہریلی سوئی سے خودکشی کرلی۔ بسیل
کی خودکشی سے معاملہ اور الجھ گیا۔ غور و فکر کے بعد طے پایا کہ عیسیٰ خاں ان گاؤں تک واپس جائے جہاں جم نے داد و دہش کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور
وہاں کسی صورت سے آغا صادق سے رابطہ قائم کرکے ان کے توسط سے مزید ہدایات حاصل کرکے واپس آئیں۔ چنانچہ عیسیٰ خاں چلے گئے اور جم جونیئر
اس کوٹھی کی نگرانی کرتے رہے۔ اس رات جم نے دیکھا کہ کوٹھی کی چھت سے سرچ لائٹ آسمان کی طرف پھینکی جا رہی ہے۔ اور ایک ڈکوٹا بھی پرواز کر رہا ہے
اور آسمان و زمین کے درمیان چھاتے ہی چھاتے بکھرے پڑے ہیں۔ جم نے جب غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ان چھاتوں کے ذریعہ سامان اتارا جا رہا
ہے۔ ایک چھاتہ پہاڑی کے ڈھلان پر گرا۔ زوردار دھماکہ ہوا۔ اور ایک بکس لڑھکتا ہوا ڈھلان پر آگیا ہوئی ایک جھاڑی میں الجھ چکا تھا۔ جم نے جلدی سے
نیچے اتر کر ٹوٹے ہوئے بکس کے سامان کو دیکھا اس میں اسٹین گنیں تھیں۔ جم نے جلدی سے ایک بنڈل اٹھایا اور اسے لے کر ایک جھاڑی میں چھپ
گئے۔ چند منٹ بعد کچھ آدمی اس جگہ آئے اور بکھرا ہوا سامان چھاتہ میں رکھ کر روانہ ہو گئے۔ اچانک کچھ دور چل کر یہ آدمی رک گئے۔ ایک آدمی
نے جھک کر سگریٹ کا وہ بچا ہوا ٹکڑا اٹھایا جو جم نے پی کر پھینک دیا تھا۔ اس کے بعد وہ جلدی جلدی ٹارچیں گھماتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ جم کئی
گھنٹے بعد آہستہ آہستہ پوشیدہ انداز میں سڑک تک واپس پہنچ گئے اور طے کیا کہ رات کو جنگل میں گھس کر کوٹھی تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اس
وقت ساڑھے چھ بجے تھے۔ مکمل تاریکی میں ایک گھنٹے کی دیر تھی اس لئے جم گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بانہوں میں سر چھپا کر بیٹھ گئے تاکہ اس طرح
کچھ دیر آرام کرلیں۔ ٹھیک اس وقت پانچ ڈکوٹا طیارے فضا میں نمودار ہوئے اور ان میں سے چھاتہ بردار کودنے لگے۔ اسی لمحہ اچانک ایک
دھماکہ ہوا اور جنگل میں واقع قلعہ نما کوٹھی کھنڈر میں تبدیل ہو گئی۔ جم کو چھاتہ برداروں نے گرفتار کرلیا اس کے بعد جم کی ملاقات آغا صادق
اور عیسیٰ خاں سے ہوئی تب پتہ چلا کہ سرکاری طور پر اس کوٹھی کا محاصرہ کیا گیا تھا۔ اس اقدام سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ پروگرام کے
مطابق جم اور عیسیٰ خاں بریلی اسٹیشن آئے اور پلیٹ فارم پر بیٹھ گئے۔ جہاں ان کی ملاقات ایک انگریز لڑکی سے ہوئی۔ انگریز لڑکی کا
امتحان لینے کے لئے ان کے پاس آئی۔ جم نے بطور شبہ ویسے ہی کہہ دیا کہ وہ اپنے محبوب کو تلاش کر رہی ہے۔ یہ جواب سنتے ہی لڑکی ان کی معتقد ہو گئی اور ان
سے اپنے محبوب کا پتہ پوچھا۔ جم نے اس سے کہا کہ یہ سوال پانچ دن بعد لکھنؤ کے اورینٹ ہوٹل میں آکر پوچھو۔ لڑکی کے جانے کے بعد جم عیسیٰ خاں کے ساتھ
ریل میں سوار ہو کر پیلی بھیت پہنچ گئے جہاں ایک تانگہ والے نے انہیں جامع مسجد کے قریب اتار دیا۔ عیسیٰ خاں جم سے اجازت لے کر جامع مسجد میں نماز
پڑھنے گئے اور وہاں اذان بھی دی۔ اذان کی آواز سن کر بہت سے معمر لوگ بیدار ہو کر آگئے اور جم کے پاس پہنچ گئے ——— اور تاریخی گفتگو چھڑ گئی۔

پھر کیا ہوا یہ اب پڑھئے

"اللہ اللہ اللہ" اس مرد بزرگ نے کہا "دیکھا آپ نے۔
اس اذان کی کشش — لوگوں کو آرام کرنے سے کھینچ لائی"

عیسیٰ خاں خاموشی سے سر جھکائے مؤدب بیٹھا رہا۔ میں اور وہ
پیر مرد بالشتیوں کے اس ہجوم کو اپنی طرف بڑھتے دیکھتے رہے۔ چند لمحوں
میں ہمارے چاروں طرف چراغاں سا ہو گیا۔ لالٹینیں اٹھیں۔ ان کی روشن
[illegible] دھواں آلود، بھڑکتی اور ٹمٹماتی روشنیاں ہم پر پڑیں۔

کئی درجن متجسسانہ آنکھیں ہم پر جم گئیں۔ میں نے بھی نظر اٹھا کر مجمع
کو دیکھا۔ ان میں زیادہ تر بوڑھے لوگ تھے، قمیص پاکستے پاجامے
پہنے، ننگے سر، بیشتر کی سفید داڑھیاں تھیں۔ کچھ ادھیڑ عمر کے لوگوں کی
بل کھائی باوقار مونچھیں — میں نے خاموشی سے ایک ایک چہرے کا جائزہ
لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تاریخ کے صفحوں سے گزشتہ نسلوں کے لوگ
زندہ ہو کر اٹھ آئے ہیں۔ میرا اور عیسیٰ خاں کا علیحدہ [illegible]

الشہادتہ

بنا ہوا تھا۔ ان سب کے چہروں پہ سوالیہ نشان نمایاں تھے۔

آخر کار ان میں سے ایک نے اس پیر مرد کو پہچان لیا جو ہمارے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

" سید میاں۔ یہ بابا کون ہیں ؟" اس نے پوچھا۔

" اللہ اللہ اللہ" اس مرد بزرگ نے کہا "بچن خاں یہ اللہ والے لوگ ہیں۔ ظاہر ہے"

" اذان انھوں نے ہی دی تھی ؟" دوسرا سوال ہوا

" اللہ اللہ اللہ، کیا اذان تھی۔ کیا درد تھا ؟ کیا سوز تھا ؟" بزرگ نے کہنا شروع کیا۔ "بچن میاں اذان ان بزرگ نے نہیں بلکہ ان کے اس مرید نے دی ہے۔ اللہ اللہ اللہ۔ مجھے حسین خاں کی یاد آگئی۔ سدن خاں چچا آپ کو تو یاد ہوگا حسین خاں۔ میں نے اپنے والد بزرگوار سے سنا تھا وہ بھی بڑی دل سوزی سے اذان دیتا تھا۔ اللہ اللہ"

انھوں نے مجمع میں سے ایک اور صاحب کو مخاطب کیا۔ میری نظریں ان کی طرف اٹھیں۔ شاید وہ شہر کے سب سے معمر بزرگ تھے ان کی کمر دوہری ہو رہی تھی۔ سفید داڑھی تھی جو حیرت انگیز طریقے سے ٹھوڑی کے نیچے مڑ کر گلے پر چپکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ موٹی موٹی سفید مونچھیں تھیں جو بل کھا کر اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی خمیدہ ناک، غلافی آنکھیں، فراخ پیشانی اور سر کے بال اڑے ہوئے تھے۔ سید میاں کو خود سے مخاطب پاکر سدن خاں ایک قدم آگے بڑھے۔ اور سید میاں کی طرف جھکے۔ میں سمجھا کہ ضعیف العمری کے سبب آواز نہ نکلتی ہوگی اس لئے وہ قریب سے جواب دینا چاہتے ہیں۔ مگر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ بڑی کڑکتی ہوئی آواز سے بولے۔

" ہاں سید میاں مجھے یاد ہے۔ میں دس بارہ سال کا تھا جب اسے ٹھاکر دوار سنگھ کے سپاہیوں نے شہید کیا تھا۔ میں نے اس کی شہید کی لاش بھی دیکھی تھی۔ قسم خدا کی سید میاں پورے شہر میں تہلکہ مچ گیا تھا اور علی پور، شیر پور اور گھٹیا شیر گڑھ کے پٹھانوں نے لاٹھیوں اور بلموں پر سوار ہو کر ٹھاکر دوار سنگھ کی گڑھی پر چڑھائی کر دی تھی بڑی لڑائی ہوئی۔ پولیس آئی تھا سے مار بھگایا پھر ٹکر نہ کھیچ پچاس آدمی شہید ہوئے۔ باقی کو گرفتار کر لیا گیا

پانچ سال تک مقدمہ چلا تھا۔ اللہ اکبر !" اور وہ خاموش ہو کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔

" بزرگوار یہ ٹھاکر دوار سنگھ کون تھا ؟"۔ میں نے سدن خاں سے بڑی نرمی سے پوچھا۔

انھوں نے اپنی فراخ پیشانی پہ ہاتھ پھیرا۔ جیسے کچھ یاد کرتے ہوں۔

" پورن پور کا زمیندار تھا۔ خاندانی آدمی تھا۔ اس میں شک نہیں" انھوں نے جواب دیا۔

"پورن پور" کا نام میرے دماغ پہ بھاری ہتھوڑے کی چوٹ کی طرح پڑا۔ پورن پور۔ پورن پور۔ میرے ذہن پہ اس نام کی بازگشت ہوئی جیسے کچھ یاد آ رہا ہو۔ جیسے میں بھول گیا ہوں۔ اس ذہنی خلفشار کو چھپانے کے لئے میں نے سب لوگوں کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ لوگ فرمانبردار اور سعادتمند بچوں کی طرح مودب بیٹھ گئے اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔

" کس خاندان کا آدمی تھا۔ ؟" میں نے ان بزرگ سے دوسرا سوال کیا۔

سدن خاں نے پھر پیشانی پہ ہاتھ پھیرا، جیسے کچھ سوچتے ہوں۔ پھر انھوں نے سر ہلایا جیسے کہ یاد آگیا ہو۔

" ہوں۔ دوار سنگھ پورن پور کے موجودہ زمیندار راجہ حکم سنگھ کا دادا تھا۔"

میرے دماغ پہ ایک اور ہتھوڑا پڑا۔ حکم سنگھ۔ ٹھاکر حکم سنگھ۔ ہاں یاد آگیا۔ اور میری آنکھوں کے آگے مہارانا پرتاپ سنگھ کا باوقار چہرہ گھوم گیا۔

ٹھاکر دوار سنگھ مہارانا پرتاپ سنگھ کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ جب اکبر بادشاہ کی پرتاپ سنگھ سے لڑائیاں ہو رہی تھیں تو پرتاپ سنگھ کا ایک بھائی اکبر بادشاہ سے مل گیا تھا اکبر بادشاہ نے اس کو دربار میں بڑا رتبہ دیا تھا مگر جب پرتاپ سنگھ ہار گیا۔ اور پہاڑوں میں چھپا چھپا پھرنے لگا تو اس کے بھائی کو بڑا افسوس ہوا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اس نے جو کچھ کیا۔ مگر اکبر بادشاہ [illegible]

[illegible] کہ یہاں قائم کر دیا۔ دلاور [illegible] کی اولاد میں تھا "

[illegible] واقعہ حسین کی صحت میں کچھ زیادہ شبہ کی گنجائش نہ تھی [illegible] کی گرہیں کھولتا گیا۔ دوسرے لوگ بھی بڑی توجہ سے یہ گذرے [illegible] سن رہے تھے

" حسین خاں کو اس نے کیوں مروا دیا ؟ " میں نے سوال کیا

" کوئی خاص بات نہ تھی۔ حسین خاں، حافظ جی کی اولاد میں تھا۔ [illegible] جیسے بھولا بھالا سیدھا اور پکا مسلمان، لوگ کہتے ہیں وہ پاگل ہو گیا تھا، ہر وقت تلوار لگائے، گھوڑے پر سوار پھرتا تھا، لوگ پوچھتے تھے حسین خاں کو جہاد کا ارادہ ہے۔ یہ تلوار کیوں باندھ رکھی ہے تو وہ کہتا نہ معلوم کب جہاد کا حکم ہو جائے، اسلئے تیار رہتا ہوں۔ اس زمانے میں انگریز حاکم بھی پرانے اور شریف خاندان کے لوگوں کی عزت اور توقیر کرتے تھے۔ ان دنوں جو کلکٹر تھا اس نے حکم دے رکھا تھا کہ حسین خاں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے

حسین خاں بڑا گرانڈیل اور خوبصورت جوان تھا، کہتے ہیں کہ حافظ جی (حافظ رحمت خاں) کی جوانی کی تصویر تھا۔ چوڑی چکلی چھاتی، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، سیاہ چڑھی ہوئی مونچھیں، سرخ سفید رنگ گھرا ہوا بدن، غرض مردانہ حسن کا مکمل نمونہ تھا۔ پنجوقتہ نماز کا پابند تھا۔ مگر ہر وقت بے قرار اور بے چین سا معلوم ہوتا تھا۔ جامع مسجد سے کہ اس کے مورث اعلیٰ کی بنوائی ہوئی ہے، بڑی محبت تھی، روزانہ بڑی عقیدت سے جھاڑو دیتا تھا۔ وقت بے وقت اذان دیتا تھا۔ اللہ اکبر — بالکل ایسی اذان جیسی آج رات سنی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے، جیسے کچھ یاد آ گیا ہو — جیسے حسین خاں کی اذان ان کے کانوں میں گونج گئی ہو —

" مگر دلاور سنگھ نے حسین خاں کو کیوں شہید کرا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

میں نے اپنا سوال پھر دہرایا

" ہاں، وہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ ایک دن اتفاق سے حسین خاں [illegible] پور کے علاقہ میں جا نکلا۔ حسب معمول گھوڑے پر سوار تھا۔ تلوار کمر سے بندھی تھی۔ ادھر سے ٹھاکر دلاور سنگھ اپنے کچھ ہمراہیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار آ رہا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب دلاور سنگھ کی سواری نکلتی تو راہگیر راستے کے ایک طرف ہو جاتے اور اسے ادب سے سلام کرتے۔ مگر یہاں تو حسین خاں تھا۔ وہ دلاور سنگھ کو پہچانتا تو تھا مگر اسے راستہ نہ دیا۔ دندناتا ہوا گھوڑے کو بیچ سڑک پر چلاتا رہا۔ دلاور سنگھ کے سپاہیوں میں سے ایک نے آواز دی " راستہ چھوڑ دے " حسین خاں کو یہ طرزِ تخاطب پسند نہ آیا۔ اس نے گھوڑا روک لیا اور کڑک کر کہا " تمیز سے بات کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

دلاور سنگھ حسین خاں سے ناواقف تھا۔ اسے بڑا تعجب ہوا۔ گھوڑا بڑھا کر آگے آیا اور پوچھا۔ نوجوان تم کون ہو ؟ حسین خاں نے جواب دیا۔ میں حسین خاں ہوں۔ اس نے پوچھا کہاں رہتے ہو ؟ جواب دیا بیلی بھیت میں۔ ٹھاکر نے پوچھا مجھے نہیں پہچانتے۔ حسین خاں نے کہا پہچانتا ہوں۔ تم ٹھاکر دلاور سنگھ ہو۔ پورن پور کے زمیندار۔ ٹھاکر نے کہا تم اس طریقے سے ناواقف ہو کہ لوگ میری عزت میں راستہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حسین خاں نے کہا میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں کہ تمہیں میرے لئے راستہ چھوڑ دینا چاہئے۔ ٹھاکر نے کہا سبحان اللہ تم ایسے کہاں کے نواب ہو ؟ حسین خاں نے کہا تمہارے دادا پردادا میرے جدِ اعلیٰ کے حضور ہاتھ باندھ کر آتے تھے۔ یہ سن کر ٹھاکر کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ڈانٹ کر کہا گستاخ تو میرے باپ دادا کا ذکر اس طرح کر رہا ہے ؟ حسین خاں نے کہا تو مجھ سے راستہ چھوڑنے کو کہہ رہا ہے جانتا نہیں میں کون ہوں ؟ حسین خاں کا اتنا کہنا تھا کہ ٹھاکر کے سپاہیوں میں سے ایک سپاہی نے کندھے سے بندوق اتار کر توڑے چڑھائی اور گھوڑا بڑھا کر حسین خاں پر تان لی اور ڈپٹ کر کہا کہ مہاراج کا راستہ چھوڑ دے۔ حسین خاں نے حقارت سے کہا تو کیا ہستی رکھتا ہے مجھ سے راستہ چھڑوانے کی۔ تیرا مہاراج بھی میرا راستہ نہیں چھڑوا سکتا۔ ابھی حافظ رحمت خاں کی اولاد اتنی گئی گزری نہیں ہوئی ہے کہ تجھ سے نفر اور تیرے گنوار مہاراج کے لئے راستہ چھوڑ دے۔ گنوار کا لفظ سننا تھا کہ دلاور سنگھ کے آگ لگ گئی۔ اس نے کمر سے طمنچہ نکال لیا اور پاگلوں کی طرح چیخ کر کہا گستاخ تو سسودیہ راجپوتوں کو گنوار کہتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے حسین خاں کا نشانہ لے لیا۔ حسین خاں نے [illegible] کر جواب دیا سسودیہ راجپوت ہے تو میرا راستہ روک کر دکھا۔ یہ کہہ کر اس نے تلوار کھینچی، یا علی کا نعرہ لگایا اور گھوڑے کو ایڑ دی۔ گھوڑا بجلی کی طرح تڑپ کر [illegible] دلاور سنگھ کے

سپاہیوں کے غول میں جا گھسا۔ ٹھاکر ہنستے۔ تلواریں چمکیں اور جب عیسیٰ خاں کا گھوڑا اس غول سے دوسری طرف باہر نکلا تو حسین خاں پشت زین پر تھا۔ اسے ٹھاکر کے سپاہیوں نے گرا لیا تھا اور وہ اس کی تکا بوٹی کر رہے تھے۔ یہ سارا واقعہ کچھ دیہاتیوں کے سامنے ہوا جو ادھر سے گزر رہے تھے اور حسب قاعدہ راستہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔ ان میں دو دیہاتی مسلمان تھے۔ ان میں سے ایک لپک کر دوڑا اور حسین خاں کے گھوڑے کو پکڑا اور اس پر سوار ہو کر سرپٹ پیلی بھیت کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں جو مسلمان ملا، اور جتنی مسلمانوں کی آبادیاں آئیں ان کو سناتا چلا گیا کہ حسین خاں کو شہید کر دیا۔ حسین خاں کو ٹکڑے کر ڈالا۔ ور سنگھ نے مار دیا۔ بس۔ پھر کیا تھا۔" اتنا کہہ کر ستن خاں خاموش ہو گئے، ایک لمبی سانس لی ــــ

مجمع خاموش تھا۔ لوگوں کی آنکھیں ستن خاں کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ جس پر ستر بہتر سال پہلے کے اس واقعے کی پرچھائیاں کھیل رہی تھیں۔ اچانک عیسیٰ خاں نے، جو دو زانو بیٹھا ہوا تھا، اپنے گھٹنے کھڑے کئے اور ان میں منہ چھپا کر چیخ چیخ کر رونے لگا !!!

یہ کہنے یا بتلانے کی ضرورت نہ تھی کہ عیسیٰ خاں کیوں رو یا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجمع جو ہمہ تن گوش تھا، مجلس عزا میں بدل گیا۔ لوگ آبدیدہ ہو گئے، سسکیاں لینے لگے۔

عیسیٰ خاں کو سنبھالنا بیکار تھا۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو چکا تھا ابھی چند لمحے پہلے اس پر مذہبی عقیدت کا غلبہ ہوا تھا اور اب پٹھان اور راجپوت کے ٹکراؤ کے اس ذکر نے اس کی نسلی غیرت کو جگا دیا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا ہو کہ کاش اُس وقت وہ بھی ہوتا اور حسین خاں کے ساتھ راجپوتوں پر حملہ کرتا شاید وہ اس لئے رو رہا تھا کہ اب وقت گزر چکا ہے اور اس واقعے کا بدلہ چکانا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ دوسرے لوگ اس بہادری، شجاعت اور تہور پر آنسو بہا رہے تھے جس کا دور گزر چکا تھا۔ ایک اکیلے سوار کا اپنے سے زیادہ تعداد میں لوگوں پر یکا و تنہا دلیرانہ یلغار کرنا اور حملہ کرنا ایک ایسا تصور تھا جو کسی بھی پٹھان یا مذہبی مزاج رکھنے والی نسل کے آدمی کو ضرورت سے زیادہ مشتعل کر سکتا ہے اور اس اشتعال کا آنسوؤں میں تبدیل ہو جانا کوئی انہونی بات نہیں ہوتا۔

اشجاع

سکی اس مجمع تمام ہی عیسیٰ خاں چیخ کر رونے لگا۔ اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حسین خاں کی طرح اولاد بھی اسی نے دی تھی میرے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔ اور وہ یہ کہ اس تمام تر جذباتی ردعمل نے ہم دونوں کے مہذب ہونے کے دعوے کو پیش ہونے سے غلط ثابت کر دیا تھا میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا کہ جب سورج نکلے گا اور دوسرے لوگ آئیں گے تو ہمارا عمل کیا ہوگا۔ یہاں معاملہ گڑبڑ ہو چکا تھا۔ میری بیوی جس کہہ رہی تھی کہ تاریخی کردار جن کے ہم شبیہ بوڑھوں کے اس شہر کو جلد از جلد چھوڑ دو۔

آخر کار میں نے عیسیٰ خاں کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"صبر کرو بیٹا۔ اگر تمہاری کیفیت ابھی سے اتنی بگڑ گئی تو آگے کیا ہوگا۔ ہمیں تو بڑی دور جانا ہے۔"

لوگوں کی سسکیاں بند ہو گئیں اور وہ ایک بار پھر میری طرف متوجہ ہو گئے۔

"حضور اقدس کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟" بل کھائی ہوئی مونچھوں اور ایک باوقار چہرے بشرے والے ادھیڑ عمر شخص نے بڑے ادب سے سوال کیا۔

"پورن پور" میرے منہ سے اچانک اور قطعاً غیر ارادی طور پر نکلا۔

"پورن پور ــــ پورن پور ــــ پورن پور" لوگوں نے سرگوشی کے انداز میں دہرایا۔ عیسیٰ خاں کی ہچکیاں رک گئیں۔ اور اس نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں ــ" میں نے کہنا شروع کیا: "ہم پورن پور جائیں گے۔ اور وہاں ٹھاکر حکم سنگھ سے مل کر حسین خاں کے واقعہ کی تصدیق چاہیں گے۔ اگر یہ واقعہ یونہی پیش آیا تھا جیسا کہ میر ستن خاں نے بیان فرمایا تو پھر ہم دیکھیں گے کہ یہ پرانا حساب کس طرح بیباق کیا جا سکتا ہے۔"

"اللہ اکبر" ستن خاں نے جھوم کر کہا۔ "حضرت کس لئے زحمت فرمائیں، ہمیں اشارہ فرمائیں ہم اب بھی حاضر ہیں۔ ابھی اسی وقت بدلہ چکایا جا سکتا ہے ..... اور وہ تن کر اٹھ گئے۔ ایسے تن کر کہ کسی بھی دھیری کر بلے یو نے کے لئے مشکل ہوگا۔ بدلہ لینے پر آمادگی کے اس اظہار سے مجھے کچھ زیادہ تعجب نہ ہوا مگر میرے ارادے کچھ اور ہی تھے

"حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ ایسا بدلہ چکانے کا ارادہ نہیں
ہے جب جنگ، وقت بدل چکا ہے۔ اب سے ستر بہتر سال پہلے
جب ہمیں ظالم نے آواز دی تھی اور مردانِ حق بندوقیں سنبھال کر گھوڑوں
پر سوار ہو گئے تھے۔ اب ایسا کرنا مناسب نہیں ـــــ اب تو کچھ اور ہی
زمانہ ہے۔"

"پھر کیا ارادہ ہے آپ کا؟"

"مگر حسین خاں کا تو بدلہ لے لیا گیا تھا۔" ایک طرف سے آواز آئی
میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ شاید پورے مجمع میں وہ واحد نوجوان تھا۔
کلین شیوڈ۔ چہرے سے ایک خاص قسم کی بیزاری اور آنکھوں سے شک
و شبہ کے آثار نمایاں ...... مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ کھسک کر آگے
آیا ـــــ اور بولا۔

"بزرگوار ـــــ حسین خاں کے واقعہ کو تہتر سال گزر چکے ہیں۔
ان کی شہادت پر پٹھانوں نے ٹھاکر دلاور سنگھ کی گڑھی پر حملہ کر کے بچاس
آدمیوں کو مار دیا تھا۔ اور خود اپنا بھی کافی جانی نقصان ہوا تھا۔ اب
اتنی پرانی بات کا اور کیا بدلہ لینا ـــــ

"عقیل خاں تم چپ رہو۔" ایک اور بزرگ نے اس نوجوان
کو ڈانٹا۔ "تم نئے زمانے کے ان باتوں کو کیا جانو؟"

میں نے غور سے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف
دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی آنکھوں سے جھلکنے والی بیزاری تقریباً نفرت
کے رنگ میں بدل چکی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اس نوجوان کو داد دی۔ اس
کا نام بھی عقیل تھا اور جذبات اس نے کبھی زمانہ کے لحاظ سے وہ بھی عقل ہی
سے قریب تھی۔ میں نے دل میں کہا۔ نوجوان تم سے اتنی ہی غلطی ہو گئی کہ تم
مجھے پہچان نہ سکے۔

"بیٹے تم نے ٹھیک کہا۔ اتنے عرصہ پہلے کا واقعہ اور وہ بھی ایسا جس
کا بدلہ لیا جا چکا ہے۔ لیکن تم ایک بات نہیں جانتے اور وہ یہ کہ ہم اور تم
بلکہ ہم سب بہت طاقتور دھاروں پر بہنے والے حقیر تنکے ہیں۔ یہ دھارے
جدھر لے جائیں ہمیں جانا پڑے گا۔ ان دھاروں کو کوئی نہیں روک سکتا۔
تم تمہاری جدید تعلیم، میں اور میری امن پسندی اور دنیا سے بے تعلقی ساری
دنیا کی صلح اور آشتی چاہنے والی سرکاریں۔ بدلتے ہوئے نظریات اور
تمام حالات یہ سب مل کر ان دھاروں کا رخ نہیں بدل سکتے۔ اب دیکھو نا،
دنیا میں اتنی بھاری جنگ ہو رہی ہے۔ یہ ہماری جنگ نہیں ہے۔ مگر ہم
پھر بھی لڑنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح اگر آئندہ بھی کوئی ٹکراؤ ہونے والا ہے
تو ہم اس کو بھی نہیں روک سکتے۔ عقیل خاں یاد رکھو ہمارے اس بڑے ملک
میں بھی تاریخ کے دو دھارے ہیں جو ساتھ ساتھ کچھ فاصلے پر بہہ رہے ہیں۔
لیکن آگے ایک جگہ ایسی آنے والی ہے جب ان دھاروں کا بھرپور ٹکراؤ
ہو گا۔ تم اس ٹکراؤ کو کتنا ہی ناپسند کیوں نہ کرو اس ٹکراؤ میں تمہیں بھی
ٹکر لینی پڑے گی، جیسے کہ ہر شریف اور خوددار آدمی ذاتی دفاع میں اٹھ
کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے ہی تمہیں بھی اٹھنا پڑے گا۔ اس کے لئے تیار رہو۔"

میری اس بظاہر بے تعلق اور بے معنی سی تقریر سن کر عقیل خاں کی
پیشانی پر سوچ کے گہرے بل پڑ گئے۔ دوسرے لوگ حیرت زدہ سے چپ
بیٹھے رہے۔ شاید وہ نہ سمجھ پائے ہوں کہ وہ دو دھارے کون سے ہیں۔
مگر عقیل خاں سمجھ گیا۔

"مگر اس وقت جو آپ پورنا پور جا رہے ہیں اس کا کیا مقصد
ہے۔" اس نے سوال کیا۔

"یہ ہم تمہیں کیا بتائیں، بہرحال تم اطمینان رکھو۔ ہم اپنے ساتھ کسی
کو لینے جائیں گے۔ نہ تلواریں نکلیں گی۔ نہ بندوقیں چلیں گی۔ ہمارا مقصد
کچھ اور ہی ہے۔ تمہیں بلا سبب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم فساد کرانے
نہیں جا رہے ہیں۔"

لوگوں نے گھور گھور کر عقیل خاں کو دیکھا۔ اس نے عافیت اسی
میں جانی کہ کھسک کر پیچھے جا بیٹھے۔

"کوئی مرد خدا ہمارے لئے سواری کا انتظام کر سکتا ہے؟" میں نے
باآواز بلند سوال کیا۔

"تو کیا آپ اسی وقت وہاں جا رہے ہیں؟" ایک صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

مجمع میں سرگوشیاں ہوئیں۔ تھوڑی دیر کی کھسر پھسر کے بعد ایک
طویل القامت ادھیڑ عمر کے صاحب کھڑے ہوئے۔ خشخشی داڑھی مونی
مونچھیں، بند گلے کا اچکن اور گہری شہری کا پاجامہ پہنے یہ صاحب
بڑی باوقار شخصیت کے مالک تھے۔

"اگر آنجناب تشریف فرمائیں تو بندہ سواری کا انتظام کرے؟"

"آپ کی نوازش"

"کیا سواری پسند فرماتے ہیں گے۔ ٹمٹم، فٹن، شکرم یا زین سواری؟"

"اگر آپ دو برق رفتار گھوڑے مہیا فرما سکیں تو عنایت ہوگی"

میں نے جواب دیا۔

"نواب صاحب کے اصطبل میں گھوڑوں کی کیا کمی ہے" لوگوں نے کہا۔

"نواب صاحب!" اس خطاب پر میں نے چونک کر ان کی طرف غور سے دیکھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ نواب صاحب بھی اتنی رات گئے نہ معلوم کہاں سے بستر استراحت چھوڑ کر آ گئے۔

"ابھی حاضر ہوں گے ۔۔ لٹن خاں" انہوں نے بارعب لہجے میں کسی کو آواز دی۔

"جی حضور" ایک شخص مجمع سے کھڑا ہوا۔

"شاہیانہ اور شاہین کو کس کر حاضر کیا جائے۔"

"بہت بہتر حضور" لٹن خاں نے جھک کر کہا۔ اور تیز قدموں سے ایک طرف روانہ ہوا۔ دو آدمی اور اس کے ساتھ گئے۔

"میں نے خاص اپنی سواری کے گھوڑے منگائے ہیں۔"

"آپ کی انتہائی نوازش ہے۔ ہم لپسن پور پہنچ کر کسی ذریعہ سے واپس بھجوا دیں گے۔"

"جناب والا کا اسم گرامی؟"

"حقیر کو نصرت حسین خاں کہتے ہیں۔ نواب نصرت حسین خاں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"ٹھاکر حکم سنگھ آپ کے دوست ہیں؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے کچھ گھبرا کر لوگوں کی طرف دیکھا پھر سنبھل کر جواب دیا۔

"جی ہاں، بڑے پرانے دوست ہیں۔ مگر دوستی اپنی جگہ ہے اور دھارے اپنی جگہ جس کا آنجناب نے ابھی ذکر فرمایا تھا۔"

میں دل ہی دل میں خود کو ملامت کرنے لگا۔

"حسین خاں شہید جن کا قصہ آپ نے شاید [illegible] تھے، میرے حقیقی بھائی کے صاحبزادے تھے۔"

"سبحان اللہ!" میں نے کہا۔ ٹھاکر کے خاندان سے آپ کے خاندان

نے حسین خاں کا معاملہ کیسے نمٹایا۔؟"

"قومی طور پر جو توجداری ہوئی تھی اس کے بعد دنوں بعد تک چرچے جاری ہیں، تلخی اب تک باقی ہے مگر اتفاق سے ٹھاکر حکم سنگھ اور میں نے ایک ساتھ تعلیم حاصل کی، دوستی ہو گئی۔ حکم سنگھ بڑا اچھا آدمی ہے، فراخ دل روشن خیال اور سپاہیانہ مشاغل کا دلدادہ ہم دونوں نے اپنی سطح پر ہمیشہ یہی مناسب جانا کہ دلاور سنگھ اور حسین خاں کے مقابلے کا تذکرہ درمیان میں نہ لائیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر کسی مرحلے پر حسین خاں شہید اور دلاور سنگھ والا معاملہ ایک بار پھر پیش آیا تو میں اپنا فرض پورا کر دوں گا۔"

میں نے دل میں کہا حضور نواب صاحب اگر آپ یہ نہ فرمائیں گے تو یہ سادہ لوح پٹھان آپ کو نواب کیوں کہیں گے۔؟

اتنے میں وہ بزرگ جو مسجد سے آ کر ہمارے پاس بیٹھے تھے اس انداز میں کھنکھارے جیسے کہ کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"یہ تو سب ٹھیک ہے۔ خوب باتیں ہوئیں۔ اللہ اللہ! پرانی یادیں تازہ ہو گئیں، مگر، ان بزرگ سے یہ نہ پوچھا کہ کہاں سے تشریف آوری ہے۔ کیا یہاں قیام کا ارادہ ہے یا۔ اللہ اللہ" انہوں نے فرمایا۔

"اس توجہ اور عنایت کا شکریہ۔ سچ پوچھئے تو مجھے بڑی شرمندگی ہے کہ ہماری وجہ سے آپ بزرگوں کے آرام میں خلل پڑا اور شب کے اس حصے میں آپ حضرات نے پرسش احوال کی زحمت فرمائی۔ ہمارا قیام کا ارادہ نہ تھا۔ یونہی گزر رہے تھے، سوچا کہ یہ رنگ بھی دیکھ لیں۔" "خوب۔ واللہ دل خوش ہو گیا۔"

"حضور میرا ایک سوال ہے اگر جواب عنایت ہو" ایک طرف سے آواز آئی۔

"ارشاد؟" میں نے ادھر دیکھا وہ ایک ادھیڑ [illegible] سست [illegible] انسان تھے جنہوں نے [illegible] کی چادر [illegible]

"حضور کا تعلق [illegible] کے کس [illegible]

... نے پوچھا۔

"جی!" میں نے سوالیہ انداز میں آپ کی طرف دیکھا وہ جاننا چاہتے تھے کہ میں راہِ طریقت میں کس مسلک کا پیرو تھا۔

انہوں نے میرے سوالیہ نشان کا مفہوم سمجھ لیا۔

"سرکار کے لباس کا رنگ کچھ اور بتا رہا ہے مگر آپ کا مُرید حیثیت قلندر معلوم ہوتا ہے۔"

"ہمارے حلیے پر نہ جائیے بزرگوار، دل کی آنکھوں سے ہمیں پہچاننے کی کوشش فرمائیے۔ ویسے ظاہراً تو میرے مُرید کا حلیہ ایسا ہے کہ اسے کچھ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔"

اتنے میں گھوڑوں کے سرپٹ دوڑتے آنے کی آوازیں آئیں میں ادھر دیکھنے لگا۔

لڈن خان اور اس کے ساتھی نے پاس آکر لگامیں کھینچیں گھوڑے الف ہو گئے۔ ہنہنائے۔ دونوں نے ان کی گردن پر تھپکیاں دیں اور زین سے نیچے اتر آئے۔

"حضور سواریاں حاضر ہیں۔ بسم اللہ۔" نواب صاحب نے گھوڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے عیسیٰ خان کو اشارہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا، میرے ساتھ ہی سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ عیسیٰ خان نے ایک گھوڑے پر شیر کی کھال اور دوسرا مختصر سامان باندھا۔ اتنے میں لوگوں نے میری دست بوسی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے مجھ سے اتنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا کہ میں خود کو سچ مچ کوئی بزرگ سمجھنے لگا۔ سب سے معانقہ کر کے میں اور عیسیٰ خان گھوڑوں پر سوار ہو گئے

"اے بزرگو، ہمیں اتنا بتا دو کہ لیدن پور کس سمت واقع ہے؟"

لوگوں نے جامع مسجد کی طرف اشارہ کیا۔ مراد یہ تھی کہ اُس سمت ہے

"خدا حافظ۔" میں نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں الوداع کہا۔ اور گھوڑے کو ایڑ دی۔ اور آناً فاناً میں گھوڑے ہم کو لے کر ایک تنگ سی گلی میں گھس پڑے۔ ہمارے پیچھے مبہوت، حیران اور پریشان شریف لوگوں کا مجمع خدا حافظ خدا حافظ کہتا رہ گیا۔

شاید گھوڑوں کو شہر سے باہر جانے کا راستہ معلوم تھا کیونکہ وہ بے تحاشا دوڑتے ہوئے، گلیوں، چوراہوں اور سڑکوں کو پار کرتے ہوئے تقریباً پانچ سات منٹ ہی میں شہر کے باہر پہنچ گئے اور ایک پکی سڑک پر دوڑنے لگے۔ جھلملاتے ستاروں کی روشنی نے سڑک کے کنارے کھڑے خاموش درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر ان کے نیچے ایک عجیب سا روشن اور تاریک جال سا بُن دیا تھا۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں ہوا کے گھوڑے پر سوار کسی عجیب طلسماتی دُنیا کا سفر کر رہا ہوں، اچانک سامنے سڑک کے کنارے سے تیز روشنی کی دھار میرے چہرے پر پڑی کسی نے ٹارچ سے روشنی ڈالی تھی ساتھ کسی نے ڈپٹ کر کہا "ہالٹ" میرا گھوڑا جھجکا، ٹارچ ڈالنے والے نے جب میرا حلیہ دیکھا تو اُس کے حلق سے گھٹی ہوئی چیخ نکلی اور ٹارچ ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ ہم دونوں سرپٹ اُس حیران پریشان مسلح کانسٹبل کے پاس سے گزرتے چلے گئے۔ وہ پولیس کے کسی گشتی دستے کا سپاہی تھا اور ظاہر ہے کہ ہم جیسے "بزرگوں" کا اتنی رات گئے گھوڑوں پر سوار سرپٹ اُڑے چلے جانا ایک ایسی انوکھی بات تھی جو شاید کبھی اُس کے فرشتوں کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی۔

ہم دونوں کچھ ہی آگے نکلے ہوں گے سڑک کے کنارے سے روشنی کی ایک تیز دھار آئی۔ جس نے اطراف و اکناف میں ایک دم سے دن جیسی روشنی پھیلا دی۔ اس بار کوئی سرچ لائٹ ڈال رہا تھا۔ اس صاف اور تیز روشنی نے ہمارے خدوخال اور زیادہ واضح کر دیئے ان لوگوں پر بھی وہی اثر ہوا، اس بار پولیس کے یہ سپاہی ایک جیپ پر بیٹھے تھے اور انہوں نے گھوڑوں کی سرپٹ سن کر جیپ سڑک کے کنارے کر لی تھی۔ ہمارے گھوڑے ذرا جھجکے، مگر پھر پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے آگے چلے گئے۔ جیپ کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے ان سراسیمہ سپاہیوں اور ان کے استعجاب کی گھٹی ہوئی آواز کو سُنا۔ دوسرے لمحے وہ ہم سے بہت پیچھے رہ گئے۔ اچانک خنک ہوا کے تھپیڑے آئے۔ ہم ندی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ گھوڑے سڑک سے اتر کر کچے میں آئے اور اُسی تیزی سے دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر پہنچے اور ایک ایسے کچے راستے پر دوڑنے لگے۔ جس کے دونوں طرف کھیت تھے۔ (باقی آئندہ)

...تا تھا۔ یہ ہوٹل ایک سستے قسم کا ہوٹل تھا۔ ایک روز ... کے قریب میں ایک نائٹ کلب سے کیبرے دیکھ کر لوٹا ... معلوم ہوا کہ پچھلے ہوٹل کے آٹھ دس کمروں میں ایک ساتھ چوری ہو ... ہے۔ بدقسمتی سے ان میں میرا کمرہ بھی شامل تھا۔ میرے دو تین ... کیس چوری ہو گئے تھے اور ایک ٹائپ رائٹر بھی۔ پولیس تحقیقات ... کرتی اور کرتی رہے گی، مگر مجھے دو دن بعد واپس لوٹنا تھا ... کے ایڈیٹر نے فوراً واپس آنے کے لئے کیبل کیا تھا۔ کیونکہ ہانگ ... کانگ میں میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ اب مجھے بمبئی پہنچ کر وہاں سے پھر فوراً ہی نیروبی جانا تھا۔

• مجھے کچھ رقم چاہیئے۔" میں نے بی ڈی اسرانی سے کہا۔ مگر میں اب اس کے عوض صرف اپنا چیک پیش کر سکتا ہوں، وہ بھی ہندستان کے بینک کا۔

• کتنی رقم چاہیئے ؟" اس نے پوچھا۔

" پانچ سو روپے !"

• ضرور۔" بی۔ ڈی اسرانی نے اطمینان کا سانس لیا، "میرے ساتھ چلیے۔ میں ابھی بینک سے اپنی گارنٹی پر آپ کا چیک کیش کرائے دیتا ہوں یا خود رقم دے دوں گا۔ یہاں ہم سندھیوں کا اپنا ایک بینک ہے۔"

وہ سندھی مرکنٹائل بینک ایک پانچ منزلہ عمارت میں واقع تھا۔ بی ڈی اسرانی نے مجھے بتایا کہ بینک کی عمارت کا مالک خود بی ڈی اسرانی ہے گیارہ ہزار روپیہ کرایہ ہر مہینے آتا ہے۔ اور وہ بینک کا ڈائرکٹر بھی ہے

پانچ سو روپیہ دلوا کے اس نے مجھ سے کہا: شام کے ۷ بجے میری دکان پہ آ جانا۔ گھر چلنے سے پہلے تھوڑا سا گھوم پھر لیں گے۔" میں شام کے ٹھیک چھ بجے اس کی دکان پہ پہنچ گیا۔ وہ پہلے ہی سے میری راہ دیکھ رہا تھا۔ دکان کے ملازموں کو ہدایت دے کر وہ میرے ساتھ باہر نکلا۔ دکان کے باہر بادامی رنگ کی ایک مرسڈیز کھڑی تھی۔ وہ موٹر بہت تیز چلا رہا تھا مگر گاڑی کے بریک بہت عمدہ تھے گو اس کا چہرہ چپٹا تھا مگر جسم بہت مضبوط تھا، خاص طور پر اس کے ہاتھ بہت مضبوط اور بالوں سے چھپے ہوئے کسی گوریلے سے بہتر تھے۔ اس خوبصورت سوٹ کے اندر کا جسم ... بہت ... ہوگا۔

وہ راہ چلتے چلتے سیٹی بجاتا۔ کسی خوبصورت چینی لڑکی کے قریب جا کر اپنی تیز موٹر ایک دم دھیمی کر کے اس سے چینی زبان میں کچھ کہتا اور پھر ہنس کر آگے چل دیتا۔ اس کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت گندے فقرے کس رہا ہے۔

• کسی چینی لڑکی سے پٹے نہیں اب تک ؟"

" یہاں کس میں ہمت ہے جو اسرانی کو پیٹے۔ یہ گلی میری ہے۔"

• تمہاری کیسے ہے ؟"

• اس گلی کے سب غنڈوں کو میں جانتا ہوں۔ یہاں میرے دو جوئے خانے چلتے ہیں۔ دیکھو گے۔ ؟"

• دیکھ لیں گے۔"

سامنے کراکری کی دوکان، پچھواڑے جوئے خانہ۔ دونوں کے درمیان ٹائلٹ کا ایک لمبا کمرہ جس کے اندر دو ادھیڑ عمر کے چینی چھوٹے چھوٹے تولئے لئے کھڑے رہتے تھے۔ وہ اسرانی کو تو پہچانتے تھے اس لئے مجھے ٹائلٹ کے اُدھر جوئے خانے میں جانے کے لئے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مگر دوسرے گاہکوں کے لئے کوڈ ورڈ تھا۔ اس جوئے خانے میں صرف وہی جا سکتا تھا جسے وہ خفیہ لفظ معلوم تھا ——— !

• میں ہر کام بڑے اسٹائل سے کرتا ہوں۔" بی ڈی اسرانی نے مجھے اپنا جوئے خانہ دکھاتے ہوئے کہا۔ عمدہ سجے ہوئے دس کمرے۔ دبیز بے آواز غالیچے۔ خاموش مؤدب بیرے۔ نازک اندام چینی لڑکیاں جام پیش کرتی ہوئی۔ اور امیر گاہک۔"

• یہاں ہائی کلاس جوا چلتا ہے۔ صرف گنے چنے گاہک یہاں آتے ہیں۔ روز رات کو ڈھائی تین ہزار کا کٹ مجھے یہاں سے ملتا ہے باہر کراکری کی دکان بھی اچھی چلتی ہے۔"

• ویری فائن پیلس۔" میں نے اس سے کہا۔ "یہاں تو خلیفہ ہارون رشید کی طرح تالی بجانے کو جی چاہتا ہے۔"

• کون خلیفہ ؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھ کر پوچھا اس کی آنکھیں مجھے اس وقت بڑی معصوم اور بھولی سی معلوم ہو رہی تھیں۔

"کچھ نہیں۔" میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے، میرا ایک دوست ہے۔ وہ مجھے اس وقت یاد آ گیا۔ جب وہ کوئی اچھی چیز دیکھتا ہے تو تالی پیٹنے لگتا ہے۔"

"کیا پیتے ہو؟" اس نے مجھ سے کہا اور ایک لمبا سگار اپنے منہ میں لے کر اس کا خوشگوار دھواں میرے منہ پر پھینکنے لگا۔

"جوا کھیلو گے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔ وہ مجھے جوئے خانے سے لے کر باہر آ گیا۔ دوسرا جوئے خانہ دکھا کے وہ مجھے ٹی ہاک اسٹریٹ میں لے گیا۔ یہاں بھی سب لوگ اسے جانتے تھے اور ان کے چہروں سے لگتا تھا جیسے اس سے ڈرتے ہوں۔ "یہاں میرا ایک چنڈو خانہ ہے۔" اسرانی نے مجھ سے کہا۔

"کیا ابھی تک ادھر چنڈو خانے موجود ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہانگ کانگ میں تو ہیں۔ اُدھر سنا ہے نہیں رہے۔" اسرانی نے منہ سے اپنا لمبا سگار نکال کے اُدھر دوسرے چین کی طرف اشارہ کیا۔

چنڈو خانے کی فضا مجھے بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ اچھا انتظام تھا۔ ہشت پہلو چینی شمع دان، ہر پہلو پر رنگ دار ریشمی جھالریں لٹکتی ہوئی چھوٹے چھوٹے پیالوں میں انواع و اقسام کی خشتیات اور دھواں اور ترچھے ہونٹوں والی حسینائیں جو نشہ نہیں کر سکتی تھیں نشہ لا سکتی تھیں، پیش کر سکتی تھیں۔ یہ چنڈو خانہ بھی ہشت پہلو تھا۔ ہر کمرہ ایک مرکزی ہال میں کھلتا تھا۔ جس میں چند چینی سازندے بیٹھے تھے اور ایک چینی رقاصہ گھوم گھوم کر ناچ رہی تھی۔ دو بڑے بڑے چینی پنکھے اس کے ہاتھ میں تھے جن سے وہ کبھی کبھی ستر پوشی کا کام لیتی تھی۔ ورنہ بالکل ننگی تھی۔

"یہ کاؤنٹ مینا ہے۔" اسرانی نے مجھے بتایا۔ "دو سو ڈالر دو۔ پر کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔"

"چلو گے؟"

"نہیں!"

"تمہاری مرضی۔"

باہر آ کے ہم اس کی موٹر میں بیٹھ گئے۔ اس نے مجھے بتایا: "پیسے کولون میں ٹی ہاک کا چنڈو خانہ سب سے بڑا ہے۔ رات کو پانچ سات ہزار ڈالر کی بکری ہوتی ہے۔ سنڈے کو بھی دو ڈھائی ہزار کی بکری ہو جاتی ہے۔ وانڈرفل بزنس۔"

"اور کپڑے کی دکان؟" میں نے پوچھا۔

"ارے وہ تو ایک سائڈ بزنس ہے۔ وہاں سے کیا ملتا ہے۔ آج کل سیدھا دھندا کر کے کون جی سکتا ہے۔ یو آر اے ڈیم فول۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"اس میں کیا شبہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

پھر وہ مجھے ایک قحبہ خانہ میں لے گیا۔ اب میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ دراصل مجھے اپنی سلطنت دکھا رہا تھا۔ ایک غریب سندھی آج سے پینتیس برس پہلے دو سو ڈالر لے کے ہانگ کانگ میں آیا تھا۔ آج اسی بی۔ ڈی اسرانی کا شمار ہانگ کانگ کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔

"ایسے ایسے میرے چھ براتھل ہیں۔" اس نے مجھے اپنا پہلا قحبہ خانہ دکھاتے ہوئے کہا: "کوئی لڑکی پسند آئی؟"

"نہیں۔"

"کیا تم کو لڑکیاں پسند نہیں ہیں؟"

"ہیں تو سہی مگر اپنے گھروں میں۔"

"کیا مطلب؟" اس نے پھر حیرت زدہ معصوم نگاہوں سے میری طرف دیکھا جو اس کی پتلی پتلی روغنی پلکوں سے جھانک رہی تھیں۔ اس لیے میں وہ نگاہیں بہت پاکیزہ تھیں۔ اور وہ سردیوں کی پہلی برف کی طرح میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ میں نے تشریح کرنا مناسب نہیں سمجھا، اس سے صرف اتنا کہا کہ میرے لیے ہانگ کانگ اور کلکتہ یا بمبئی کے قحبہ خانوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور اگر کوئی فرق ہے تو محض ظاہری سجاوٹ میں یا ہم چہرے کی ظاہری ساخت میں، ورنہ لڑکیاں ہندوستانی ہوں یا چینی [illegible]

"... میں کچھ گیا ہم کر ڈالر مال لینے ہے۔" ایمپیسی روڈ پر چوپاٹی کا علاقہ ہے اس میں کافی مال بھی ملتا ہے اور بہت کر کے بہت اچھا ... میں ابھی تم کو ادھر لے چلتا ہوں۔ ادھر ایک نئی چھوکری آئی ہے اس کو ذرا دیکھ لینا۔"

اسرانی نے قحبہ خانہ کے مہتمم سے چینی میں کچھ بات کی۔ وہ ہمیں ایک نیم تاریک کمرے میں لے گئے۔ جہاں ایک چینی لڑکی ہاتھ پاؤں سے بندھی ہوئی صوفے پر رکھی تھی۔ اسرانی کے کہنے پر اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے گئے۔ اس کی عمر مشکل سے پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ اسرانی چند منٹ تک اسے چینی زبان میں کچھ سمجھاتا رہا مگر وہ لڑکی برابر سر ہلا کر انکار کرتی رہی اور آخر میں چیخنے لگی اور کمرے سے بھاگ جانے کی کوشش کرنے لگی اس پر اسرانی نے گھونسہ مار کر اس لڑکی کو نیچے گرا دیا۔ لڑکی کے منہ سے خون جاری ہوگیا۔ اور وہ فرش پر پڑی پڑی سسکنے لگی اور وحشت زدہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگی۔ اسرانی مجھے لیکر باہر آگیا۔ اس نے دروازہ باہر سے بند کر کے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا، "کل ہی تائی وان سے چند لڑکیوں کا ایک ریچ منگوایا ہے۔ قحبہ خانہ میں ہر دوسرے تیسرے مہینے نئی لڑکیاں منگانی پڑتی ہیں ورنہ بزنس ڈل پڑ جاتا ہے۔ بالکل نئی چھوکریاں ہیں۔ اغوا کر کے لائی گئی ہیں۔ ایک دم اناڑی ہیں۔

"اے چھنتے!" اس نے ایک لمبے تڑنگے ہندوستانی کو آواز دی جو لباس اور وضع قطع سے اس قحبہ خانہ کا کوئی اہم ملازم معلوم ہوتا تھا۔

چھنتے نے قریب آکے مؤدب سلام کیا۔ "دس آدمی" اسرانی نے اندر کمرے میں بند چینی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

چھنتے نے ادھر ادھر آوازیں دیں۔ تھوڑی دیر میں کمرے کے باہر آٹھ آدمی جمع ہوگئے۔ اسرانی انہیں ضروری ہدایات دے کر وہاں سے مجھے ساتھ لے کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں پیچھے کمرے سے لڑکی کی چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"تم ایسا کیوں کرتے ہو؟" یکایک میں برداشت نہ کر سکا۔

"تکلف برطرف اسے؟" اس نے مجھے بڑے ٹھنڈے لہجہ میں

جواب دیا۔"

اس کا گھر بہت عمدہ تھا۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی ڈھلوان پر واقع تھا۔ وہاں سے ہانگ کانگ کا سارا منظر نظر آتا تھا۔ اس کی بیوی بہت ہی گھریلو اور سیدھی سادی عورت تھی۔ دو بچیاں تھیں۔ بڑی پیاری اور معصوم۔ ایک دس سال کی ہوگی، دوسری کوئی بارہ تیرہ برس کی۔ اس نے مجھے بتایا۔ "سب سے بڑی لڑکی کی شادی ہوچکی ہے۔ اس کا خاوند جنوبی امریکہ میں بزنس مین ہے، سندھی ہے، مگر جنوبی امریکہ میں بہت بڑا دھندہ ہے اس کا۔ میری لڑکی کے دو بچے بھی ہیں۔ وہ بہت خوش ہے اپنے گھر میں۔"

"لڑکا کوئی نہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"لڑکا نہ ہووے تو مکتی کیسے ہووے۔" وہ زور سے ہنسا "دو لڑکے ہیں، مگر دونوں سیانے ہیں۔ عمر کے بڑے ہیں۔ ایک کو فلپائن میں بزنس کر کے دیا ہے۔ دوسرا جاپان میں ہے۔"

وہسکی پی کے وہ چہکنے لگا۔ "بھگوان نے سب کچھ دے دیا ہے مجھ کو۔"

اس کی بیوی اس کے قریب بیٹھی ہوئی ہماری باتیں سن رہی تھی اور پیلے رنگ کی اون سے ایک کارڈی گن بن رہی تھی۔

"ہنس مکھ پیاری بیوی" (شاردا موٹی انگلی گوشتی بچوں کی طرح مسکرانے والی اس کی بیوی کارڈی گن بنتے بنتے مسکرائی اور اس نے جڑاؤ کنگن والا ہاتھ اپنے شوہر کے ہاتھ پر رکھ دیا) میری منو اور گنگا (یہ شاید اس کی دونوں لڑکیوں کے نام تھے) اور سوتری (یہ اس کی بڑی لڑکی کا نام تھا۔ جس کی تصویر شاردا نے مجھے لا کر دکھائی۔ ایک خوبصورت بے عقل لڑکی ایک موٹے تاجر کے ساتھ کھڑی تھی۔ دونوں کے چہروں پر وہ حماقت بھری خوشی بھی تھی جو صرف شادی کے دنوں میں نظر آتی ہے۔ اور میرا بڑا لڑکا شنکر داس جو فلپائن میں ہے اور ہری داس جو جاپان میں ہے۔ شاردا نے مجھے ان کی تصویریں بھی دکھائیں۔ دونوں اپنے باپ کے پاکٹ ایڈیشن تھے۔ پینتیس سال ہوتے ہیں ہانگ کانگ میں آیا تھا دو سو ڈالر لے کر۔ آج ملک در شصت پندرہ کی جائیداد میرے پاس ہے۔"

"تم ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر بیٹھے ہو۔ ہانگ کانگ دو گھنٹے میں جا سکتا ہے۔"

"میں بے وقوف نہیں ہوں۔" اسرانی بولا۔ "اسی لئے تو میں نے اپنی فرم کا بیڈ آفس فلپائن، منیلا میں کھول دیا ہے۔ بمبئی والی کو اس کا انچارج بنا دیا ہے اور باقی سب بندوبست ایسا کر رکھا ہے کہ میں بھی ہانگ کانگ سے دو گھنٹے میں جا سکتا ہوں۔" ایک عجیب مسرت آمیز مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنے پیٹ پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا! میں بہت خوش ہوں۔ میں بہت خوش ہوں

کھانا کھا کے ہم کافی پی رہے تھے کہ کلاک نے دس بجائے۔ اسرانی کے منہ سے نکلا "ارے" اور کافی کی پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری اور اس نے جلدی سے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا شاردا جلدی سے دوڑی دوڑی دوسرے کمرہ میں گئی اور دوڑی دوڑی واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں تہہ در تہہ بہت سے رومال پکڑے رکھے تھے۔ شاردا نے جلدی سے وہ رومال اسرانی کے گھٹنے پر رکھ دیئے میں نے دیکھا اتنے عرصہ میں اسرانی کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ نہ صرف چہرہ بلکہ اس کی ہتھیلیاں بھی بھیگ گئی تھیں جلدی سے وہ رومال لے کر اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔ مگر آنسو تھے کہ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے اُبلتے ہی چلے آ رہے تھے۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ رومال سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا، "تم سے باتیں کرتے ہوئے مجھے خیال نہیں رہا۔"

"کیا خیال نہیں رہا؟"

"کہ وقت آگیا ہے۔"

"کون سا وقت؟"

وہ کچھ دیر چپ رہا، پھر اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا "میں نے تمہیں بتایا نہیں۔ مجھے اس دنیا میں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بس اگر کوئی تکلیف ہے تو یہی۔ ہر روز رات کے دس بجتے ہیں میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ کبھی گھنٹہ بھر، کبھی دو گھنٹے، کبھی تین گھنٹے میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے ہیں۔"

"مگر کیوں؟"

"کیا معلوم! امریکہ تک ہو آیا ہوں ان آنکھوں کے علاج کے لئے مگر کسی ڈاکٹر سے ٹھیک نہیں ہوا۔ کسی ڈاکٹر کو میری بیماری کا پتہ نہیں چل سکا۔"

"کیا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس آنسو بہتے ہیں؟"

"بس آنسو بہتے ہیں۔"

"اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی؟"

"نہیں اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔"

اس کی آنکھیں رو رہی تھیں اور آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ اور وہ بار بار رومال لگا کر اپنی آنکھوں کو خشک کرتا تھا اور آنسو ان سے بہہ کر نکلتے چلے آ رہے تھے۔ یکایک اس کا بھیگا بھیگا آنسوؤں میں تر بتر چہرہ مجھے ایک ایسی لاش کا چہرہ دکھائی دیا جو پانی میں ڈوبی ہوئی ہو۔ پھر وہ کسی گہرے کنوئیں سے مجھے ایک لڑکی کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔

"شاید یہ آنکھیں احتجاج کرتی ہیں۔"

"کیا؟" وہ آنکھیں پونچھتے پونچھتے میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا، "کیا کہہ رہے ہو تم؟ میں سمجھا نہیں۔"

"کچھ نہیں۔ یہ وہ بیماری ہے جسے تم نہیں سمجھ پاؤ گے۔"

میں نے سر پہ ٹوپی رکھ کر اسے سلام کیا اور اسرانی اور اس کی بیوی کو حیران اور ششدر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

وہ قحبہ خانہ کی لڑکی اب ہنس رہی تھی۔

(شمع دہلی)

نقشِ قدم

جب بیوی شوہر کے پیار سے محروم ہو جاتی ہے تو وہ باغی ہو جاتی ہے یا خودکشی کر لیتی ہے یا اپنی محبت سے ایک بار پھر اپنے شوہر کی محبت کو جیت لیتی ہے۔ لیکن بیگم ہار جیت کی منزل کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح کئی برسوں سے لٹک رہی تھیں۔

پھر بھی سلامت نواب جیسی شخصیت کا دل موہ لینا آسان نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

الشعاع

کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے [illegible] کے گھر کی خادمہ نے کلثوم سے آنکھیں لڑانا شروع کر دیں۔ خادمہ بھی تھی بڑی شوخ طرار پہلے چند دن تو مجو میاں کے جذبات سے چوری چھپے کھیلتی رہی اور جب بات مقطع تک آ پہنچی تو یوں منہ پھیر لیا جیسے کبھی مجو میاں سے واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ سلامت نواب کی ڈیوڑھی میں اب ایک تنہا کلثوم ہی باقی رہ گئی تھی۔ سب خادمائیں ایک ایک کر کے رخصت ہو چکی تھیں۔ کچھ تو اس لئے کہ سلامت نواب کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ ساہوکاروں نے پے در پے گھر پر ڈگریاں تعمیل کروا کر سارا اثاثہ ضبط کروا لیا تھا۔ ایک کھنڈر نما ڈیوڑھی تھی جس کا مشکل سے ڈھائی سو روپے ماہوار کرایہ آ سہا تھا۔

سلامت نواب کی ساری زندگی قرض چکانے میں گزر گئی۔ پھر بھی ان پر ایک اور قرض باقی تھا۔ وہ قرض تھا مجو میاں کی شادی۔

وہ جو کہتے ہیں ہاتھی مر کر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے، کچھ یہی حال سلامت نواب کا تھا۔ گو وہ مالی پریشانیوں میں بے طرح گھرے ہوئے تھے لیکن خیالات میں ابھی تک خلیل خاں بنے ہوئے تھے جن کے ہاتھوں سے مدت ہوئی فاختہ اڑ چکی تھی۔ نہ خود کبھی زندگی میں تعلیم حاصل کی اور نہ اولاد ہی کو پڑھایا۔ صرف دولت ہی کے بل بوتے پر زندگی کی گاڑی کہاں تک بھاگ سکتی تھی دولت کی باگ اگر دماغ کے ساتھ ہوتی تو وہ شام ہوتے ہی شراب سے اپنا غم غلط نہ کرتے۔ وہسکی تو خیر ان کے لئے اب خواب بن چکی تھی۔ لے دے کے ایک "ابن جی" ہی تھی جسے وہ وہسکی سمجھ کر حلق سے اتار لیتے۔

اگلے وقتوں کی فورڈ آج بھی گیرج میں پڑی سسک رہی تھی۔ ایک وقت یہ بھی تھا کہ سلامت نواب کے ہاں دو دو ڈرائیور تھے لیکن اب ڈرائیور تو کجا کلینر بھی ڈھونڈنے پر دکھائی نہ دیتا تھا۔ یوں تو وہ بہت کم کار کو استعمال میں لاتے لیکن جب طبیعت ترنگ میں ہوتی تو وہ گیرج میں پہنچ کر کپڑے سے موٹر کی گرد جھاڑتے اور کار میں بیٹھ کر آبادی سے کوسوں دور نکل جاتے اور بیگم گھر میں بیٹھی کڑھتی رہتیں۔ یوں بھی بیگم کی جوانی مدت ہوئی ڈھل چکی تھی۔ چہرے پر عمر کی زیادتی کے باعث گہری لکیریں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ گال جو کبھی کشمیری سیب کی طرح سرخ تھے آج ان میں اسنو اور پاؤڈر کی سفیدی چڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ابھر کر نمایاں ہو گئے تھے۔ گھنی اور دراز پلکوں کے نیچے ان کی جھیل ایسی نڈھال آنکھیں یوں لگتی تھیں جیسے پلکوں سے ان آنکھوں کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ ایسے وقت جب اچانک ان کی نگاہیں کلثوم کے تمتماتے ہوئے سرخ گالوں پر پڑتیں تو انہیں اپنی جوانی یاد آ جاتی۔

کلثوم کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں جن میں شراب کا سا نشہ تھا انہیں زہر معلوم

ہیں۔ انہیں احساس ہو گیا کہ ان کی عمر کے گھوڑے بہت آگے نکل چکے ہیں۔
گال پچک گئے ہیں۔ عزتی اخراجات اور کلثوم کو دیکھ کر نفرت سی ہونے لگی ہے۔
نہ کیا جائے یا ملیح ہے جب ہی تو وہ رات رات بھر اس سے پاؤں دبواتے ہیں۔
کیا پتہ کسی وقت "ایسی ویسی" بات ہو جائے! اور ایک دن ایسی بات ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ہوا یوں کہ بیگم اپنے ایک عزیز کے ہاں کسی کام سے گئی ہوئی تھیں اور لوٹتے لوٹتے کافی رات ہو گئی۔ سردیوں کا زمانہ تھا رات آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ ڈیوڑھی کا زنگ خوردہ دروازہ بند تھا۔ انھوں نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں سلامت نواب کے کمرے کی طرف گئیں۔ کمرے میں سے سلامت نواب کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے وہ دور کسی گھاٹی سے بول رہے ہوں۔

"کلثوم! تو نے کیا غضب کا چہرہ پایا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس چہرے کو گلے سے لگا کر ساری عمر گزار دوں!"

"ہائے نواب صاحب! موئے میرے چہرے میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ آپ یوں باؤلے ہو جائیں۔ مجو میاں نے بھی پرسوں یہی بات کہی تھی۔"

"کیا کہا — ؟ مجو نے بھی تجھ سے یہی بات کہی۔ تو گویا وہ بھی ان کاموں میں پڑ گیا ہے! کمینی تو نے مجو کو اپنے قریب آنے کیوں دیا؟" سلامت نواب نے غصہ میں بپھر کر کہا۔

"میں تو کمینی ہوں ہی۔ لیکن آپ کون سے شریف زادے ہیں!" کلثوم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

سلامت نواب چاہتے تو کلثوم کو جوتی کی نوک پر مارتے۔ لیکن کلثوم تو ان کی کمزوری بن کر رہ گئی تھی۔ شاید وہ اسی لئے غصے کو پی کر رہ گئے۔

بیگم باہر کھڑی سب کچھ سنتی رہیں۔ انھیں سلامت نواب سے نفرت ہو گئی۔ وہ غصے سے بڑے بڑے ڈگ بھرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

دوسرے دن صبح جب سلامت نواب نے بیگم کو دیکھا تو انھیں حیرت ہوئی۔

"کب آئیں تم — ؟"

"اس سے آپ کو کیا غرض؟"

"یہ کیسا کورا جواب ہے!"

"اس سے اچھا جواب اور کیا ہو سکتا ہے؟"

سلامت نواب نے آگے کچھ نہ کہا اور اپنے منہ پر تالا لگا لیا۔ انھیں اچانک احساس ہوا کہ شاید رات والے واقعہ سے بیگم باخبر ہو گئی ہوں۔ پھر وہ آپ ہی آپ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ اگر بیگم نے گفتگو سن بھی لی ہو گی تو کیا ہو گا۔ رفاقت کی بھی حد ہوتی ہے۔ ازدواجی زندگی کے تیس برس کیا ایک آدمی کو زیر کرنے کے لئے کافی نہیں؟

لیکن شام کو جب بیگم نے چائے کی کشتی لاتے ہوئے سلامت نواب کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا تو وہ دل ہی دل میں مسرور ہو کر چپ ہو گئے۔ بیگم نے سلامت نواب کی طرف چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے محبت میں سرشار ہو کر کہا "دیکھئے! آپ رات میں زیادہ جاگا نہ کیجئے۔ کہیں آپ کے دشمنوں کا مزاج خراب نہ ہو جائے۔ یوں بھی آج کل آپ کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیشہ اعضاء شکنی رہتی ہے۔ میں آپ کے پاؤں دبا دیا کروں گی۔"

"نہیں بیگم، میرا خیال ہے تمہاری صحت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تم تکلیف نہ کرنا۔ کلثوم اس کام کے لئے موزوں ہے۔"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ لیکن کلثوم تو چلی گئی۔"

"کلثوم چلی گئی! کیا کہہ رہی ہو — ؟"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ مگر گھبرایئے نہیں وہ بازار گئی ہوئی ہے تھوڑی دیر میں آ جائے گی۔" یہ کہہ کر بیگم نے سلامت نواب کے چہرے کو کچھ اس انداز سے دیکھا کہ سلامت نواب ایک لمحہ کے لئے بوکھلا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیگم آخر ان سے کیا چاہتی ہے۔ لیکن بات تو بالکل صاف تھی۔

جب بیوی شوہر کے پیار سے محروم ہو جاتی ہے تو وہ باغی ہو جاتی ہے یا خودکشی کر لیتی ہے یا اپنی محبت سے پھر ایک بار شوہر کی محبت کو جیت لیتی ہے۔ لیکن بیگم ہار جیت کی منزل کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح کئی برسوں سے لٹک رہی تھیں۔ پھر یوں بھی سلامت نواب جیسی گھاگ شخصیت کا ان حالات میں دل موہ لینا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ ادھر بیگم نے اپنا راستہ صاف کرنے کے لئے کلثوم کو گھر سے یوں نکال پھینکا تھا جیسے وہ کوئی ٹوٹی ہوئی گرگٹ ہو۔

جب شام ہو گئی اور کلثوم گھر واپس نہ آئی تو سلامت نواب کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ رات دیر گئے تک بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہلتے رہے۔ بیگم سامنے والے کمرے میں بیٹھی یہ سب تماشہ دیکھتی رہیں۔ سلامت نواب کو کوئی [illegible]

سعت ۔۔۔ بے قراری سے جھڑے رہتا۔ بیگم جیسے سو ہان
روح تھا۔ بیگم ہی چاہتا تھا کہ سلامت نواب کے منہ پر
۔۔۔ وہ ایسا نہ کر سکیں اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی رہیں۔
دوسرے دن صبح سلامت نواب ہی نے بیگم سے بات کی اور نہ
بیگم ہی نے ناشتہ پر سلامت نواب کو بلوایا۔ وہ اچانک بگولے کی طرح
کمرے میں داخل ہوئے اپنی سائز نکالی پھر تیزی سے باہر نکل گئے۔ عین اسی
وقت مجو میاں گھر میں داخل ہوا۔ مجو کو دیکھتے ہی بیگم یوں دہاڑیں مار
مار کر رونے لگیں جیسے گھر میں میت پڑی ہو۔

" امی جان آپ اس طرح رو کیوں رہی ہیں ؟ کچھ بتایئے بھی تو ۔
کس نے آپ کو دکھ دیا ہے۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔" مجو نے غصہ
کی آگ میں جلتے ہوئے کہا۔

تیرے باپ نے میری ناک کٹوا دی ہے ۔ وہ گزشتہ کئی دنوں سے
کلثوم سے محبت کی پینگیں بڑھا رہے تھے۔ آخر میں کب تک یہ صدمہ برداشت
کرتی۔ میں نے آج ہی کلثوم کو گھر سے نکال باہر کیا ہے وہ کمینی بدذات یہاں
اب پھر نہ آ سکے گی۔"

مجو چپ تھا۔ ماں کی باتیں اس کے سر کے اوپر سے یوں گزر
رہی تھیں جیسے بندوق کی باڑھ چل رہی ہو۔ وہ اطمینان سے کمرے میں
داخل ہوا۔ کوٹ اتار کر سلک کی سفید شیروانی پہنی شیشے کے سامنے بڑی
دیر تک بال سنوارنے کے بعد وہ گھر سے یوں نکلا جیسے وہ اپنی محبوبہ کی
سالگرہ میں جا رہا ہو۔

" مجو کہاں جا رہے ہو ؟ " کمرے کی کھڑکی کو چیرتی ہوئی ایک
آواز گونجی ۔
یہ بیگم تھیں۔ مجو کی ماں ۔ لیکن مجو نے ان سنی کر دی ۔
جب وہ ڈیوڑھی کا پھاٹک پار کر چکا تو بیگم نے چیختے ہوئے کہا۔
" اگر تو نے میرا دودھ پیا ہے تو کلثوم کی جان لے کر ہی لوٹے گا۔"
لیکن ماں کی آواز مجو کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ شاید مجو نے
ماں کا دودھ ہی نہ پیا ہو۔

ایک ہفتہ گزر گیا نہ سلامت نواب ہی گھر لوٹے اور نہ مجو ہی
کا پتہ چلا۔ بیگم کا دل گھبرا رہا تھا کہ کہیں ایسی ویسی بات نہ ہو جائے جیسے

ہر آہٹ پر مجو کا گمان گزرتا تھا۔
ایک دن اچانک سویرے ہی سویرے کسی نے ڈیوڑھی کے
پھاٹک پر دستک دی ۔ دستک کی آواز بڑی مانوس تھی۔ بیگم کو یقین
تھا کہ یہ سلامت نواب ہی ہوں گے اور یہ سلامت نواب ہی تھے جو سر
جھکائے پھاٹک کے قریب یوں کھڑے تھے جیسے وہ اس ڈیوڑھی کے مالک
نہیں نوکر ہوں ۔

بیگم نے کھڑکی میں سے جب یہ منظر دیکھا تو وہ دوڑی دوڑی آئیں ۔
جوں ہی پھاٹک کھلا ۔ سلامت نواب ہوا کے بگولے کی طرح اندر داخل
ہوئے ان کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھوں نے کئی راتیں جاگتے ہوئے گزاری ہوں۔
ان کی چال میں بھی لڑکھڑاہٹ سی آ گئی تھی۔ انھوں نے کچھ دیر چپ چاپ
رہنے کے بعد دھیرے سے کہا
" بیگم ! صبح کا بھولا سمجھ کر مجھے معاف کر دینا۔ مجو نے چوری چھپے
کلثوم سے شادی کر لی ہے اور اب وہ دونوں بمبئی میں گلچھرے اڑا رہے ہیں۔"
اس خبر نے بیگم پر ذرا بھی اثر نہیں کیا۔ وہ زیر لب مسکرائیں ۔ جیسے
کہہ رہی ہوں۔ یہ تو خوش ہونے کی بات ہے کہ مجو اتنا سعادت مند لڑکا
نکلا ۔ جبھی تو آپ کے نقش قدم پر چلا ہے ۔

زبیر رضوی

تضاد

پرستش، عبادت، عقیدت، محبت کے
شہرِ طلسمات کی سمت جب بھی
بڑھے قافلے زندگی کے
لئے ساتھ اپنے ہجومِ تمنا،
جنوں، شوق، وارفتگی، آرزوئیں

ہر اک گام پر، راستوں کے ہر اک موڑ پر
تجربہ، آگہی، عقل اور محرومیوں نے
کہا تھا کہ شہرِ طلسمات کی سمت اے جانے والو
ذرا اپنے سجدوں کی
اپنی وفاؤں کی توقیر سمجھو
متاعِ دل و جاں کے نذرانے دے کے
ہمیں کیا ملا ہے جو تم پا سکو گے !!

جنوں، شوق، وارفتگی، آرزوئیں
متاعِ دل و جاں کے نذرانے لے کر
دیارِ طلسمات کی اونچی اونچی فصیلوں کے نیچے
بہت دیر سے منتظر ہیں کوئی آئے آکر مرادوں کا دامن
تمناؤں کے موتیوں سے سجا دے !!!

(شاعر بمبئی)

بشر نواز

سچ کی قیمت

ہمالیہ کی بلند چوٹی پہ میں کھڑا ہوں
اگر میں تم سے کہوں یہاں میں نے سات رنگوں کے راز پائے
ہوا کی مبہم زبان سمجھی
دہکتے سورج کی تیز کرنوں کو گن چکا ہوں
دمکتے مہتاب کی شعاعوں کی ریشمی ڈوریوں کو چھو کر
— میں روح میں نور بھر چکا ہوں
تو تم کہو گے
بجا ہے سچ ہے
بلندیوں پر پہنچ کے تم اک نئی بصیرت سے آشنا ہو چکے ہو
سچ ہے
مگر میں تم سے یہ کہہ رہا ہوں
یہاں سوائے ہوا کی موجوں کہر کے پردوں کے کچھ نہیں ہے
میں اس بلندی پہ تم سے کٹ کر خود اپنی ہستی کے تنگ زنداں میں گھر گیا ہوں
میں ایسے محسوس کر رہا ہوں
کہ جیسے اندھے کنویں میں گر کر خود اپنے کو ڈھونڈتا ہوں
مگر تمہیں کیوں یقین آئے
کہ جھوٹ کا جلوہ فروزاں صداقتوں سے کہیں زیادہ حسین و دلکش رہا ہے
مگر میں سچ کہہ رہا ہوں تم سے سچ کی قیمت چکا رہا ہوں

بازگشت

گزشتہ شمارے میں جو سوالات شائع ہوئے تھے اُن میں جناب اقبال احمد کراچی کا سوال سب سے بہتر اور انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اعلان کے مطابق اس ماہ سے ان کے نام ایک سال کے لئے الشجاع جاری کر دیا گیا ہے۔ (ادارہ)

عظیم حیدر شہداد پور

س :- اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کا یہ شعر

سکھی تو ہر گھڑی مجھ پہ نہ کر غیظ
محبّت پر نظر رکھ کر بسر غیظ

بطور حوالہ ایک ادبی نشست میں سُنایا تھا۔ اس پر میرے ایک فاضل دوست نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ محمد قلی قطب شاہ کا شعر نہیں ہے جہاں تک مجھے یاد ہے کئی سال ہوئے میں نے یہ شعر "قلی قطب شاہ" پہ لکھے ہوئے کسی مضمون سے نوٹ کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری تائید فرمائیں گے اور اس طرح میں معترض کو مطمئن کر سکوں گا۔

ج :- عظیم صاحب! آپ کے دوست کا اعتراض صحیح ہے۔ یہ شعر محمد قلی قطب شاہ کا نہیں ہے بلکہ قلی قطب شاہ کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کا ہے جو اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں ظل اللہ اور اردو میں قطب شاہ ان کا تخلص ہے۔ دراصل ناموں کی یکسانیت کی وجہ سے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس ذیل میں اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ قلی قطب شاہ نے اردو میں جو شاعری کی ہے وہ معانی کے نام سے کی ہے۔ ان کا ایک مقطع سند کے طور پر پیش ہے۔

کہتے ہیں دعویٰ شعر کا سب اپنی طبع سوں
بخش فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

ڈاکٹر اشفاق صدیقی ایم بی بی ایس کراچی

س :- ہمارے بعض بڑے نقادوں کی رائے میں داغ اور امیر کے بعد ان کے شاگردوں نے غزل میں اجتہاد کے بجائے اپنے اساتذہ کی روایات کو دہرا کر فرسودہ شاعری میں اضافہ کیا ہے۔ اسی لئے یہ شاعری جذبہ اور احساس سے خالی ہے۔ اگر ان نقادوں کی یہ رائے مان لی جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن لکھنوی شعراء نے میر و غالب کی پیروی کی تو پھر یہ نقاد ان کی شاعری پر رسمی اور روایتی شاعری کا لیبل کیوں لگاتے ہیں۔ اور یہ اعتراف کیوں نہیں کرتے کہ انہوں نے غزل کے حُسن کو نکھارا ہے۔ کیا یہ ادبی عصبیت نہیں ہے؟

ج :- ڈاکٹر صاحب! آپ نے ممتاز نقادوں پر عصبیت کا جو الزام عائد کیا ہے اس سے ہم متفق نہیں ہیں۔ آپ اس مسئلہ پر صرف جذباتی انداز سے نہ سوچیں بلکہ اس دور کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی آپ کوئی صحیح رائے قائم کر سکیں گے۔ جہاں تک لکھنوی شعراء کا سوال ہے کہ انہوں نے جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے پھر بھی ان کی شاعری پر اعلیٰ شاعری کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ کیا ہے اس بارے میں اگر ہم کچھ کہیں گے تو ممکن ہے آپ یہ رائے قائم کریں کہ ہم ممتاز نقادوں سے مرعوب ہیں اس لئے ہم اپنی رائے کے بجائے نئی نسل کے ذہین نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی کے ایک مضمون کی چند سطور پیش کر رہے ہیں جن کے مطالعہ سے آپ کو اپنے سوال کا جواب مِل جائے گا ــــــ "دوسری طرف لکھنؤ کے کچھ غزل گو تھے جنہوں نے لکھنؤ کی بے جان شاعری سے بغاوت تو کی تھی لیکن اس کے بعد جو راستا اختیار کیا وہ غیر فطری تھا۔ انہوں نے سوچا کہ ناسخ اور امانت کی تقلید کرنے سے غیر حقیقی شاعری پیدا ہوتی ہے اس لئے میر و غالب کو اپنا امام بنانا چاہیئے اور غزل میں سوز و گداز یا فلسفیانہ عنصر داخل کرنے سے غزل کو صحیح بنایا جا سکتا ہے۔ یہ شعراء اپنی شاعری میں بناوٹی غم لانے کی کوشش کرنے لگے جو میر کا طرہ امتیاز ہے یا وہی فکری عنصر پیدا کرنے کے لئے زور لگانے لگے جو غالب کی خصوصیت بتائی جاتی ہے۔ چونکہ ان شعراء نے شاعری کا مواد اپنی شخصیت، افتاد طبع یا زمانے کے ماحول سے نہیں لیا تھا اس لئے ان کی شاعری بھی رسمی اور میکانکی بن کر رہ گئی اور ایک پُر تصنع فضا نے ہماری غزل میں در آئی دوسری طرف غالبیت نے مغلق ترکیبوں، دور از کار استعارات اور غیر ضروری فلسفیانہ مباحث کا انبار لگا دیا اور اس طرح یہ شعراء بھی روایتی غزل گو بن کر رہ گئے"

—— اپنے وطن میں ——

سوات کا ایک دلکش منظر

کاغان کا ایک حسین نظارہ

سیاحوں کی جنت
سوات

مضمون صفحہ ٦ پر ملاحظہ فرمائیے

سوات کی ایک شاہراہ
جس کے دونوں طرف سرسبز درخت ہیں

سوات کا ایک کسان
اپنے کھیت میں

اقتباس . . . ناشر . . . ۵

سیاحت کی جنت . . . یٰسین معصوم . . . ۶

نجات . . . جان سنکلائر . . . ۱۲

ملاقات . . . مشتی فاروقی . . . ۲۰
حمد . . . محمود خاور . . . ۲۰
پناہ گیر . . . کفیل آذر . . . ۲۱
پہلا . . . مقبول قریشی . . . ۲۱
غزل . . . حرمت الاکرام . . . ۲۲
غزل . . . شاہد منصور . . . ۲۲
غزل . . . خاور انصاری . . . ۲۳
غزل . . . صلاح الدین نیر . . . ۲۳
غزل . . . حزیں لدھیانوی . . . ۲۴
غزل . . . ظفر ابن متین . . . ۲۴
[illegible] . . . عنبر چغتائی . . . ۲۵
غزل . . . ڈاکٹر شہید . . . ۲۵
قطعات . . . شفیق احمد . . . ۲۵

کہانی . . . انیسہ جلال . . . ۲۶
عزت . . . عادل رشید . . . ۲۹
[illegible] . . . ادیب جوہر . . . ۳۳
[illegible] . . . نسیم اقبال . . . ۳۷

پُراسرار کہانی

خونی درخت . . . ایس عزیز . . . ۴۱

فکر و خیال

نئے شعر کا لہجہ . . . بشر نواز . . . ۴۶

اسلامی تاریخ

اصفہان . . . خواجہ جمیل احمد . . . ۵۲

سیر و سفر

کراچی کا پانی . . . رشیدہ رضویہ . . . ۵۵

مسلسل ناول

آدم خور . . . جم جونیئر . . . ۵۸

حاصل مطالعہ

ست رنگا کبوتر . . . بلونت سنگھ . . . ۶۴
پگڈنڈی (نظم) . . . منیب الرحمٰن . . . ۶۷
غزل . . . رکش صدیقی . . . ۶۷
موت (نظم) . . . شہریار . . . ۶۷

ہونہار شہری

فرق . . . عابد نوگانوی . . . ۶۸
چھٹی . . . عظیم کمال . . . ۷۱

مستقل عنوانات

بازگشت . . . ادارہ . . . ۷۳

التماس

الشجاع کا زیر نظر شمارہ ملک کے ممتاز فنکاروں کی منتخب تخلیقات پر مشتمل ہے۔ گزشتہ تین ماہ سے "ناقابل فراموش" کے تحت سچی جنگی کہانیوں کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے اس سلسلہ کی تیسری کہانی "نجات" اس شمارے کی زینت ہے۔ "ہٹلر کا وصیت نامہ" اور "چاسنگ بم" کی طرح اس کہانی میں بھی تاریخی حقائق کو غیر جانبدارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کہانیوں کے مطالعہ سے صرف جنگ کی ہولناکیوں کا ہی اندازہ نہیں ہوتا بلکہ امن کی قدر و قیمت کا بھی پوری شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اس عہد کا انسان جنگ کے بجائے امن کا متمنی ہے۔ وہ انسانیت کے دامن پر ہیروشیما کا سا سیاہ داغ نہیں دیکھنا چاہتا۔ ان کہانیوں کی اشاعت کا مقصد بھی یہی ہے کہ امن سے بے پناہ چاہت اور عالمگیر انسانی محبت کا صحت مند جذبہ بیدار ہو۔ ہمیں خوشی ہے کہ الشجاع کے قارئین نے اس سلسلہ کو پسند فرمایا۔ اس ذیل میں ہم جناب اختر ملیح آبادی کے ممنون ہیں جو خلوص جانفشانی سے ان کہانیوں کو انگریزی سے اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔

نئی شاعری سے متعلق گزشتہ شمارے میں ندا فاضلی کا جو مضمون شائع ہوا تھا علمی ادبی حلقوں میں اسے پسند کیا گیا۔ اس مضمون سے متعلق ہمیں کافی خطوط موصول ہوئے ہیں۔ یہ مکاتیب پورے خلوص سے لکھے گئے ہیں۔ اور بحث برائے بحث کا فریضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ مگر جدید نسل کے عقائد اور نظریات کا تجزیہ نہیں کرتے۔ موضوع کی مخالفت اور موافقت میں لکھا تو بہت کچھ گیا ہے۔ دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں میر سے لیکر آج کے شاعر کے ذہنی سفر کی روداد بھی ہے۔ البتہ مخالف اور موافق حضرات نئی شاعری کی حد متعین کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ آج کے شاعر کے روحانی کرب اور ذہنی الجھنوں کی نشاندہی بھی نہیں کر سکے ہیں اور نہ ہی وہ اس ابہام اور اشاریت کی وجہ بیان کر سکے ہیں جس نے نئی شاعری کو ضرورت سے زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان مکاتیب کی اشاعت سے خوشگوار نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ اس لئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ خطوط کے بجائے الشجاع میں نئی شاعری سے متعلق ایسے مضامین شائع کئے جائیں جن کو پڑھ کر قاری صحیح رائے قائم کر سکے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق ہم اس شمارے میں جناب بشر نواز کا ایک قیمتی مضمون معاصر [illegible] کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ موجودہ دور میں جب کہ ادب میں جمود کے باوجود ممتاز نقادوں کے بقول اچھی چیزیں نہیں لکھی جا رہی ہیں ہم اپنے وسائل کے مطابق ایسی تخلیقات پیش کرتے رہے ہیں جو بہترین کے مفہوم سے قریب تر ہوں۔ اس شمارے کے مضامین نظم و نثر سے ہمارے اس دعوٰی کی تصدیق ہوگی۔ زیر نظر شمارے کا سرورق [illegible] سے متعلق ہے۔ توقع ہے کہ رنگ آمیزی اور خطوط کے اعتبار سے یہ سرورق آپ کے ذوق سے ہم آہنگ ہوگا۔

آپ کا مخلص

شجاع الدین

مدیر

تصویری فیچر

سیاحوں کی جنت

جہاں زندگی، محبت اور حسن ہے

اس زمین کے سینے پر ایسے خطوں کی کوئی کمی نہیں جو اپنی خوبصورتی قدرتی مناظر، فطری حسن اور انسانی ہاتھوں کی ہنرمندی کی منہ بولتی تصویریں ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک دلفریب اور جاذب نظر۔ اور ابھی تک نہ ہی ایسے سیر بیروں کی کوئی کمی ہے جو اپنے روزمرہ کے مشاغل چھوڑ چھاڑ کر اوقات اپنا بہت کچھ خرچ کر کے دور دراز علاقوں کی سیر کرتے ہیں اور جسم و جان کے علاوہ اپنی روح کو تسکین اور سچی خوشی بخشتے ہیں۔

جب ایک سیاح سمندر کی لامحدود وسعتوں سے نکل کر زمین کے سینے پر قدم دھرتا ہے، یا جب ریگستان کے گرم اور تپتے ہوئے صحرا کے ریگزاروں سے نکل کر ہرے بھرے درختوں کی گھنی چھاؤں میں قدم رکھتا ہے تو اس کی روح کو جو خوشی، مسرت اور تازگی کا احساس عطا ہوتا ہے بالکل وہی حالت ایک سیاح کی سرزمین سوات پر داخل ہو کر ہوتی ہے۔ ایک نیا احساس، ایک نیا ولولہ ایک نئی امنگ اور جوش سا رگ رگ میں پھیل جاتا ہے۔ یہ ہماری شاید ناواقفیت ہے یا پھر احساس کمتری کہ ہمیں مغربی دنیا کے ایسے خطوں کے نام تو یاد ہیں اور وہاں جانے کی شدید تمنا بھی دل میں [illegible]

ہے۔ لیکن [illegible] سوئٹزرلینڈ [illegible] ہے اس سے ناواقف ہیں۔

سوات پاکستان کا سوئٹزرلینڈ ہے۔ اور اس کا تصور کرتے ہی دل کو کچھ ایسا سکون محسوس ہوتا ہے کہ فیض کا یہ قطعہ ذہن میں گھوم جاتا ہے۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

ایک سیاح گھومتا گھامتا ہوا جب پاکستان کی اس دور دراز ریاست میں قدم رکھتا ہے تو لمحہ بھر کے لئے مبہوت ہو جاتا ہے۔ میلوں تک ہرے بھرے درختوں کا جنگل، نغمہ ریز آبشار، گنگناتے ہوئے ٹھنڈے اور شیریں پانی کے نغمے، غضبناک دریا اور سبک خرام ندیاں، لہلہاتے ہوئے کھیت اور مسکراتے ہوئے خوش رنگ پھول۔ نیلا چمکتا آسمان اور جھومتی ہوئی گھٹا، بلند و بالا برف پوش چوٹیاں اور گہری وادیاں۔ غرض شفق کی رنگینی اور چمکتے تاروں کا تمام حسن اس دھرتی پر اس طرح سمٹ آیا ہے کہ زندگی ایک خوبصورت [illegible] میں جکڑ جاتی ہے۔ اور جہاں روح حسن و محبت کے لافانی گیت گا کر ابدی سکون محسوس کرتی ہے، وہ سرزمین جہاں [illegible] آنسو تاج محل اور آسمان سے [illegible]

[illegible] بادش کا پہلا قطرہ گر جاتا ہے یہ اسی سرزمین کی رنگین اور دلچسپ داستان ہے جو صرف جنت نگاہ ہی نہیں بلکہ [illegible] گوش بھی ہے۔

پاکستان کی شمال مغربی سرحد پر واقع یہ ایک چھوٹی سی ریاست ہے جو کہ مری، نتھیا گلی، چھانگا گلی، ایبٹ آباد، کاغان اور زیارت وغیرہ سے حسن میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ یہاں میدانی علاقہ کم اور پہاڑی علاقہ زیادہ ہے۔ ریاست سوات جسے ریاست یوسفزئی بھی کہتے ہیں اب سے چالیس پینتالیس سال پہلے تک یہ ایک [illegible] گم گشتہ کی حیثیت رکھتی تھی حالانکہ سرحد کی دوسری ریاستوں میں یہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ یوسفزئی قبیلے کے جیالے پٹھانوں کی اس سرزمین کے ذرے ذرے میں اس غیور قوم کی بہادری، وفاداری اور جانثاری کی داستانیں پوشیدہ ہیں جہاں اسلامی تہذیب، افغانی روایات، سادہ تمدن اور پشتو زبان اپنی تمام تر تابناکیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ یہ پاکستان کا ایک ایسا حصہ ہے جو فرقہ بندی اور مغربی سیاست کے تباہکن اثرات سے بھی [illegible]

چالیس سال پہلے کی اس گم گشتہ جنت کی تاریخی داستان بڑی طویل ہے لیکن سوات کے موجودہ حالات اس کی سماجی اور [illegible] حیثیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس کے تاریخی پس منظر [illegible] ہے۔ [illegible]

کے شمال میں ریاست چترال مغرب میں ریاست دلبر، جنوب میں ضلع مردان اور مشرق میں ریاست امت اور دریائے سندھ بہتا ہے۔ یہاں صرف ایک بڑا دریا ہے جو دریائے سوات کے نام سے موسوم ہے۔ یہ دریا ۱۴۰ میل تک ریاست کے وسط میں سے گزرتا ہے۔

قدیم دستاویزات سے سوات کا پتہ ۳۲۶ ق۔م تک چلتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سکندر اعظم ایک طوفان کی مانند یونان سے اٹھا تھا اور تمام عالم پر چھا جانے کا عزم کیے ہوئے تھا۔ اس وقت سوات میں بدھ مت کے پیروکار آباد تھے۔ سکندر ایران کو تہہ و بالا کر کے ہندوستان فتح کرنے کی نیت سے کابل کے علاقہ کونٹر سے ہوتا ہوا وادی سوات میں داخل ہوا۔ اور "چانڈی" گاؤں کے قریب دریائے سوات کو پار کر کے اس کے جنوبی کنارے پر پہاڑ کے دامن میں قصبہ منگلور کے قریب مقیم ہوا۔ ایک روایت کے مطابق سوات کے بدھ حکمران راجہ آرنس نے تیس ہزار فوج کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی پھر سکندر یہاں سے پنجاب کی طرف چلا گیا۔ اس زمانے کی یادگاریں اکثر یہاں کے دورِ حکومت میں سوات سے ملے گئے۔

سکندر کے بعد اس کے مشہور جرنیل سیلوکس نے ۳۰۵ ق۔م میں ہند پر حملہ کیا اور سوات، بونیر اور سرحد کے دیگر علاقے راجہ چندر گپت موریا

کو بخش دیئے۔ ۴۵ء میں راجہ کنشک کی قلمرو میں یہ علاقے شامل تھے۔

راجہ کنشک کی وفات کے بعد دام راجہ اس کا جانشین ہوا۔ اور پھر سنہ ۲۰۰ء میں یہ علاقہ راجہ ورانٹھ کی حکومت میں تھا۔ اگرچہ راجہ ورانٹھ کا پایہ تخت "تخت بھائی" تھا مگر وہ سکون و آرام کے لئے یہاں اکثر قیام کرتا۔

سوات کے مختلف علاقوں میں بدھ راجاؤں کے عہد حکومت کے اکثر آثار ملتے ہیں۔ یہ آثار محلات اور قلعوں کی صورت میں اب بھی کہیں کہیں موجود ہیں۔ ان آثار سے پتہ چلتا ہے کہ سنگتراشی کا فن اس زمانے میں عروج پر تھا۔ منگورہ کے قریب کانبلی گاؤں میں ایک قدیم قبرستان برآمد ہوا ہے۔ جس میں قبروں میں مٹی کے گھڑے رکھے ہوئے پائے گئے ہیں۔ مُردوں کے ساتھ گھڑے رکھنے کا رواج بدھ زمانے کی یادگار ہے۔ راجہ گیرا آخری بدھ حکمران تھا جو گیارھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔

گیارھویں صدی کے آغاز میں راجہ گیرا پر سلطان محمود غزنوی نے باجوڑ کے راستے ریاست سوات پر حملہ کیا۔ راجہ گیرا شکست کھا کر قتل ہوا۔ بدھ باشندے جنہوں نے اسلام قبول نہ کیا وہ بھاگ کر کوہستانوں میں چلے گئے۔ محمود غزنوی کے ساتھ پٹھانوں کے دلازاک قبیلے کے لوگ اور سواتی پٹھان بھی تھے۔ لہٰذا محمود غزنوی نے انہیں یہاں آباد کر دیا اور یہ علاقہ ان کی تحویل میں دیدیا۔ اس طرح یہاں پہلی بار مذہب اسلام کی شمع روشن ہوئی۔

سوات میں آباد پٹھان قبیلے کو یوسف زئی کہتے ہیں۔ یہ لوگ یہاں چار سو سال سے آباد ہیں۔ یہ علاقہ انہوں نے بزور شمشیر حاصل کیا تھا۔ جب ہندوستان میں مغل دور کا آغاز ہوا تو یوسف زئی اور مغلوں میں آپس میں چلنے لگی۔ آخر ۱۵۸۵ء میں اکبر نے راجہ ٹوڈرمل کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی۔ راجہ ٹوڈرمل نے بغیر لڑے اپنی حکمت عملی سے یوسف زئی سے صلح کر لی۔ اکبر کے بعد جہانگیر اور پھر شاہجہاں اور اورنگ زیب بھی اس حکمت عملی پر عمل پیرا رہے۔

اورنگ زیب کے بعد جب مغل حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو یہ سرحدی علاقے بھی خود مختار ہو گئے۔ لیکن بجائے خود ان قبیلوں کی کوئی تنظیم قائم نہ ہو سکی۔ ۱۷۴۹ء احمد شاہ ابدالی نے ایک مرتبہ پھر تمام افغان قبیلوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ لیکن یہ اتحاد عارضی ثابت ہوا۔ غرض سوات اور دیگر سرحدی علاقے مختلف تاریخی مراحل سے گزرتے رہے یہاں تک کہ سید احمد بریلوی کی شہادت کے بعد یوسف زئی قبیلے کی حالت ابتر ہو گئی۔ نہ ان کی کوئی تنظیم تھی نہ کوئی قانون تھا اور نہ نظام۔ ان حالات میں ایک برگزیدہ شخصیت سامنے آئی۔ عبدالغفور صاحب جو ممتاز شخصیت کے مالک تھے اور عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ انہوں نے ریاست سوات کو ایک مثالی ریاست بنا دیا۔ آج انہی کی اولاد موجودہ سوات پر قابض ہے اور ریاست کو ترقی دینے میں شب و روز کوشاں ہے۔

انگریزی عملداری میں سوات کی سرحد لنڈاکی محدود ہو گئی۔ یہ ریاست کی آخری سرحد ہے آج بھی اس مقام پر ریاستی حکومت کا کیمپ چوکی ہے۔ اور یہاں سے کالام تک کا خوشگوار علاقہ وادئ سوات کہلاتا ہے۔

ریاست سوات کا شاندار دور دراصل ۱۹۱۷ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ میاں گل شہزادہ، عبدالودود خاں عرف بادشاہ صاحب نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھالی جنہوں نے ریاست کو ہر حیثیت سے ترقی دینے میں شب و روز اپنا خون پسینہ ایک کر دیا۔ تعلیم، تجارت، ثقافت اور زبان کی ترقی کے لئے مختلف سکیمیں بنائیں اور ان پر عمل پیرا ہوئے۔ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ شاہراہیں بنیں۔ آمد و رفت کے ذرائع کو وسیع کیا گیا۔ غرض زندگی کا کوئی گوشہ اور شعبہ ایسا نہ چھوڑا جس پر توجہ نہ دی گئی ہو۔ اور مزید یہ کہ سیاحوں کی توجہ کے لئے نئے نئے انتظامات کئے گئے۔

موجودہ سوات میں زندگی کا ہر شعبہ انتہائی تیزی سے ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اور خاص کر پاکستان بننے کے بعد تو ترقی کی رفتار انتہائی تیز ہو گئی ہے۔ سوات پہلی ریاست تھی جس نے پاکستان سے الحاق کیا تھا

گئے ہیں۔ دریائے سوات جو شہر سے تین میل کے فاصلے پر بہتا ہے پہاڑوں کا دلفریب منظر شہر کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ عوام اگرچہ نادار اور غریب ہیں مگر سادہ مزاج، متواضع اور ملنسار ہیں۔ اور سیاحوں کے ساتھ بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ مغربی تہذیب کی کچھ چیزیں اگرچہ یہاں پہنچ چکی ہیں مگر پھر بھی اکثر چیزیں یہاں مفقود ہیں۔ جیسے سینما وغیرہ۔ تصنع اور بناوٹ ابھی تک یہاں کی زندگی سے بہت دور ہے۔ دوسرے جدید اور ترقی یافتہ شہروں کے برخلاف یہاں کے بازاروں میں عورت شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ یہاں مرد کا لباس قمیض، شلوار، واسکٹ، پشاوری چپل اور سواتی ٹوپی ہے۔ جب کہ خواتین اپنے جسم پر ایک لمبی سی چادر اوڑھتی ہیں۔ یہ خواتین بازاروں میں عید بقر عید یا خاص خاص تہواروں کے موقعوں پر نظر آتی ہیں۔ پٹھانوں کے ہاں بعض تہوار بھی بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر عید کا تہوار۔ پرانے زمانے میں دستور یہ تھا کہ عید کی نماز سے فارغ ہو کر اجلے اور نئے کپڑوں میں ملبوس ایک گاؤں کے لوگ دوسرے گاؤں والوں سے خونریزی کرنے چل دیتے تھے۔ اور پتھروں اور مختلف ہتھیاروں سے شام تک یہ لڑائی جاری رہتی تھی۔ یہاں تک کہ شام کو ان کے سفید کپڑے لال لال خون سے تر بتر ہو جاتے تھے۔ لیکن بانیٔ سوات بادشاہ صاحب نے اس رسم کو جبراً بند کر دیا۔ اب منگورہ میں عید کے موقع پر ایک ہفتہ تک دریائے سوات کے کنارے ایک میدان میں

جدوجہد آزادی میں بڑی حد تک یہاں کے لوگوں کا بھی ہاتھ ہے۔

۱۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کا دن ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس روز بانیٔ سوات عبدالودود خان صاحب عرف بادشاہ صاحب نے اپنے بیٹے صاحبزادے میاں عبدالحق جہاں زیب (موجودہ والی سوات) کے حق میں تخت سے دستبرداری کا اعلان کیا۔ تاجپوشی کی رسم مرحوم وزیر اعظم خان لیاقت علی خان نے ۱۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ریاست کے دارالحکومت سیدو شریف میں انجام دی۔ اور اس طرح ریاست کی تاریخ میں ایک نئے اور شاندار دور کا آغاز ہوا۔

مالاکنڈ ایجنسی کے اونچے نیچے پہاڑوں اور خطرناک دروں سے گزرنے کے بعد ایجنسی کا آخری اسٹیشن ہے جو ایک پہاڑی بستی ہے۔ یہ بستی "تانہ" کہلاتی ہے۔ یہاں سے چند میل چلنے کے بعد ریاست کی کسٹم چوکی آجاتی ہے۔ اس پُرفضا وادی میں داخل ہونے کے بعد سیاح کو ایک نیا احساس ہوتا ہے۔ خوشگوار اور مسرت بخش اور دلفریب مناظر سے گزرتا ہوا ریاست کے پہلے بڑے شہر منگورہ پہنچتا ہے۔ منگورہ سوات کا سب سے بڑا شہر ہے۔ چوڑی چوڑی سڑکوں، بلند اور پختہ عمارتوں اور سکولوں، ہسپتال، محلے، مساجد، باغ، پارک غرض نئے دور کی تمام چیزوں کو اپنے دامن میں لیے ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتا ہے۔ شاہراہوں کی جانب شاہ بلوطوں اور خوبانیوں کے درخت قطار در قطار چلے

ایک میلہ لگتا ہے جس میں کھیل تماشے اور دیگر کرتب ہوتے ہیں۔ اس میں طوائفوں کا رقص بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ طوائفیں مردان نوشہرہ چارسدہ اور دیگر علاقوں سے آتی ہیں۔ لیکن ان کے قیام کی مدت عارضی ہوتی ہے۔ اور ان کے رہن سہن کا انتظام علیحدہ ہوتا ہے اور انہیں عام لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہوتی ہے۔ یہ میلہ شاید واحد رنگین تفریح ہے جو باضابطہ حکومت کی منظوری سے یہاں کے عوام کو سال میں ایک بار میسر آتی ہے۔

سوات میں سب سے قابل دید شہر سیدو شریف ہے جو دارالحکومت بھی ہے۔ یہاں سوات کی اکثر قابل دید عمارتیں ہیں۔ ان میں جہاں زیب کالج، کالج کا ہوسٹل۔ ہوٹل سوات، اسٹیٹ ہسپتال، جامع مسجد، شفاخانہ حیوانات، شاہی مہمان خانہ، والی سوات کا محل اور بادشاہ صاحب کی آخری آرام گاہ ہے جو خود انہوں نے اپنی نگرانی میں تعمیر کرائی ہے قابل دید ہیں۔ سیدو شریف سے دس میل آگے "مرغزار" ہے۔ یہ مقام نہایت دلفریب اور دلکش ہے۔ ہرے بھرے پہاڑ کی چوٹی پر یہ مقام ناشپاتی، آلوچہ، خوبانی، شہتوت اور اخروٹ کے درختوں سے پٹا پڑا ہے۔ "مرغزار" کی اہمیت اس سے بھی دوچند ہو گئی ہے کہ یہاں سنگ مرمر سے تعمیر کردہ سفید محل ہے جو اپنی ثقافت اور کاریگری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ سفید محل بادشاہ صاحب کا گرمائی محل ہے اور اکثر معزز مہمانوں کو اسی سفید محل میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ مغربی طرز سے سجی ہوئی یہ عمارت قابل دید ہے۔

اندرون ریاست میں مختلف چھوٹی چھوٹی بستیاں اور شہر ہیں جن میں مدین اور بحرین زیادہ مشہور ہیں۔ بحرین میں سبز پوش پہاڑ اور ان کی برفانی چوٹیاں جو دلفریب مناظر پیش کرتی ہیں وہ سیاحوں کے لئے بڑی کشش کا باعث ہیں۔ مزید برآں یہاں دو دریاؤں کا اتصال ہوتا ہے ایک دریائے اوشو اور دوسرا دریائے کالام۔ یہاں کا موسم ریاست کے دوسرے مقامات کے مقابلے میں زیادہ سرد ہوتا ہے۔ اور جون جولائی میں بھی گرم کپڑوں کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ بحرین ایک طرح سے کوہستانی علاقہ کا دروازہ ہے۔ یہاں سے بلند و بالا پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ وادی کالام ریاست کا آخری حصہ ہے جو انتہائی پرسکون اور دلکش ہے۔ قدرتی مناظر اور پہاڑوں کے دلفریب منظر کی وجہ سے یہ جگہ انتہائی ... ہے۔ دوسرے مقامات میں شانگلہ، چکیسر، پل ڈھیری، الپوری، خوربند اور وادی کالام قابل دید مقامات ہیں۔ کچھ عرصہ سے ریاست کے بعض مقامات پر محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے کھدائی کا سلسلہ جاری ہے جس میں بدھ اور اس سے پہلے کے عہد کی اشیاء برآمد ہوئی ہیں۔ اور اس طرح پاکستان کے ثقافتی ورثہ میں ایک بیش بہا خزانہ کا اضافہ ہو رہا ہے۔

غرض سوات میں فطرت اپنی تمام تر رعنائیوں، دلفریبیوں اور دلکشی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہاں سیاح آکر غم دوراں اور غم جاناں سب کچھ بھول کر صرف فطرت کے حسن میں محو ہو جاتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اس خوابناک ماحول کا ایک جزو ہے۔ بس لامحدود تنہائی کا ایک حصہ، اس شان و شکوہ کا ایک شریک۔ اور اکیلا ہوتے ہوئے بھی وہ تنہائی محسوس نہیں کرتا۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا ہمراز، ہمنوا اور ساتھی ہے۔ اور وہ کائنات کا ہے اور کائنات اس کی ہے۔ دراصل یہی احساس زندگی ہے۔ محبت ہے اور حسن ہے۔

نئے اثرات

کے تحت لکھی جانے والی شاعری مواد اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے پچھلی شاعری سے اس قدر مختلف ہے کہ پرانی ادبی اصطلاحوں اور ترکیبوں کی مدد سے اسے نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ سمجھایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ۔ یہ روایت سے انحراف کی شاعری ہے، یا یہ باغیانہ شاعری ہے۔ یا اس میں ایک ماتمی لے ملتی ہے۔ تو یہ اس شاعری سے انصاف نہ ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ پرانے تنقیدی لیبل اس پر ٹھیک نہیں بیٹھتے کیونکہ یہ نہ مقصدیت کی شاعری ہے نہ نئی ادبیت کی، نہ یہ داخلیت کی آواز ہے نہ خارجیت کی۔ غم دوراں اور غم جاناں کی تقسیم بھی یہاں بیکار نظر آتی ہے۔ یا ڈرامیا اثر کی شاعری بھی نہیں۔ یہ تو محض انسان کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کی جستجو ہے۔ یا غم اور مسرت کو محض غم اور مسرت کے روپ میں دیکھنا ہے!!

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ہٹلر کے پہلے ایٹم بم کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا

دوسری عالمگیر جنگ اپنی بھیانک تباہ کاریوں کے ساتھ ہر طرف "امن" آگ اور موت کو بُری طرح پھیلاتی چلی جا رہی تھی اور ہر جانب اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ وہائٹ ہال کے ایک مختصر خفیہ کمرے میں برطانوی عسکری ہائی کمان کے گیارہ بڑے آفیسر خاموش اور فکرمند بیٹھے وزیراعظم برطانیہ سر ونسٹن چرچل کی آمد کے منتظر تھے۔ ان کو رات گئے اچانک میٹنگ میں طلب کیا گیا تھا۔ اس اچانک طلبی نے سب کو متوحش کر دیا تھا۔ اچانک خفیہ دروازہ کھلا اور چرچل ایک اجنبی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ تمام بڑے افسروں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ ساتھ ہی ایک ہی نظر میں بھانپ بھی لیا کہ برطانیہ کا رہنما مضمحل و فکرمند بھی ہے۔ چرچل نے بہ عجلت ایسی نشستوں کے رسوم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھاری لیکن باعزم آواز میں کہا۔

"حضرات! بلا تمہید کے بتا دوں کہ جرمنی ایٹم بم تیار کر رہا ہے۔ [illegible] اس کم مدت میں ہٹلر ہمیں اپنی مرضی کے خلاف اپنی [illegible] پیش کردہ شرائط تسلیم کرنے پر یقیناً مجبور کر دے گا۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ایٹم بم سے نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ لندن ویران ہو جائے گا۔ اور جگمگاتے ہوئے امریکی شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو جائیں گے۔ یہ شاعری نہیں حقیقت ہے کہ جرمن سائنس داں چھ ماہ میں تباہ کن ایٹم بم تیار کر لیں گے۔ اس وقت جنگ کی باگ ہمارے ہاتھوں سے

آگے بڑھو۔ پلانٹ کو تباہ کر دو — اگر ایسا نہ ہو سکا تب ہماری ہی موت یقینی نہیں بلکہ — ساری دنیا تباہ ہو جائے گی!

نکل چکی ہوگی۔ لہٰذا ہمیں عزم کرنا ہے کہ کسی طرح بھی ہو ہم ایٹم بم تیار نہ ہونے دیں۔"

یہ کہہ کر وزیراعظم چرچل نے ایک ہی نظر میں سب چہروں کو پڑھ لیا اور پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ناروے سے جاسوسوں نے بذریعہ رپورٹ مطلع کیا ہے اور خود ڈاکٹر ہالسٹڈ یہاں موجود ہیں" یہ کہتے ہوئے وزیراعظم نے اجنبی کی طرف جو بائیں جانب بیٹھا تھا اشارہ کیا۔ "ڈاکٹر [illegible] دنیا کے چند مانے ہوئے ایٹمی سائنس دانوں میں سے ایک [illegible] ہماری خوش نصیبی ہے کہ وہ ہمارے قریب [illegible]

[illegible] کیا ہے ؟

ڈاکٹر لیف ٹرانسٹڈ میز کا سہارا لے کر اٹھے [illegible] اور آہستہ

کہا: "حضرات! بغیر تمہید اور انتہائی اختصار سے صرف دو لفظوں میں اس بھیانک خطرے کو بتا دوں جو اس وقت عالم پر ابھر آتا ہے اور وہ دو لفظ ہیں "ڈیٹیریم آکسائڈ"! ڈیٹیریم آکسائڈ کے حصول کے لئے جرمنی نے نارسک ہائیڈرو کو ہدایت کی ہے کہ تین ماہ میں ڈیٹیریم آکسائڈ کی مقدار تین ہزار پاؤنڈ کے بجائے دس ہزار پاؤنڈ مہیا کرے۔ یہ ڈیٹیریم آکسائڈ ہے کیا بلا؟ بغور سنئے کہ یورینیم جو ایٹم بم کی ماں ہے اسی سے تیار ہوتی ہے اور ایک قسم کا سائینٹفک پانی ہے جس کی تیاری میں سولہ ماہ درکار ہوتے ہیں لیکن خطرناک وحشیانہ رخ یہ ہے کہ "کیسر ولہلیم انسٹی ٹیوٹ" نے سائنٹفک پانی کی تیاری کے لئے نیا نسخہ معلوم کر لیا ہے، کس طرح؟ یہ میں نہیں بتا سکتا لیکن اسقدر اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اب سولہ ماہ کے بجائے صرف چھ ماہ کی مدت رہ گئی ہے۔ اس طرح ڈیٹیریم آکسائڈ کا واضح مطلب ہے "تباہی" یعنی "تباہی بذریعہ ایٹم بم!"

ڈاکٹر لیف ٹرانسٹڈ نے لمبی سانس لی اور سب پر متفکرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا: "بچت کا صرف ایک ہی راستہ ہے — کہ ڈیٹیریم آکسائڈ کے پلانٹ کو فوری طور پر تباہ کر دیا جائے — اگر نارسک کا یہ پلانٹ فوراً برباد نہ کیا گیا تب دنیا کی تباہی لازمی ہے!! حضرات! نارسک ڈیٹیریم آکسائڈ پلانٹ کی تباہی آسان نہیں بلکہ قریب قریب ناممکن ہے — اس لئے کہ ہوائی حملے سے وہاں کام نہیں چلے گا کیونکہ پلانٹ کو گنجان پہاڑیوں کے بیچ میں ایک پہاڑی کی آڑ میں فولاد اور کنکریٹ سے اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ ہوائی حملے کا سوال ہی نہیں۔ ساتھ ہی پلانٹ تک جانے کا کل ایک راستہ ہے جس کی حفاظت نازی فوج کرتی رہتی ہے۔ غرضکہ پلانٹ تک کسی آدمی کا گزر ممکن نہیں — لیکن اس کے باوجود بھی صرف اپنی بقا ہی کے لئے نہیں دنیا کی خاطر انسانیت کے واسطے اس ناممکن عمل کو ممکن العمل بنانا ہے۔ لہٰذا ہوائی حملوں کے بجائے ہمیں زمین پر چل کر پلانٹ تک کسی نہ کسی طرح پہنچنا ہے اور پلانٹ کو [illegible] پلانٹ کی حفاظت اور [illegible]

[illegible]

ڈاکٹر لیف ٹرانسٹڈ نے پھر سب کی طرف دیکھا اور کہا [illegible] آپ کو تین وطن پرست نارویجین باشندے مل جائیں جو وطن پر سے قربان ہونے کا جذبہ اور خدمت انسانیت کی تڑپ رکھتے ہوں تب انہیں میرے پاس لے آئیے۔ میں انہیں جملہ تفصیلات سمجھا دوں گا لیکن یاد رکھئے کہ ہٹلر کو شبہ تک نہ ہونے پائے کہ نارسک پلانٹ کو تباہ کرنے کا قصد رکھا جا سکتا ہے۔ اگر جرمنی کو کامیابی مل گئی تب یقین کیجئے کہ ساری دنیا کی تباہی لازمی ہے اور انگلینڈ کو ہتک آمیز صلحنامہ پر دستخط کرنے پڑیں گے۔"

دوسرے دن برطانوی وزیراعظم چرچل ان تینوں خفیہ رپورٹوں پر غور کر رہے تھے جو ڈاکٹر لیف ٹرانسٹڈ کی میٹنگ کے بعد انہیں موصول ہوئی تھیں۔ ایک خفیہ رپورٹ میں ڈاکٹر لیف ٹرانسٹڈ کی تائید کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ "کیسر ولہلیم انسٹی ٹیوٹ" میں ایٹم بم کا تجربہ کیا جا رہا ہے اور یہ کام قریب دو سال سے جاری ہے اور انتہائی خطرناک سطح پر پہنچ چکا ہے۔ دوسری رپورٹ فضائی حملوں کے صدر دفتر سے ملی تھی یہ رپورٹ بھی ڈاکٹر لیف ٹرانسٹڈ کی تائید میں تھی۔ رپورٹ میں واضح طور پر اعتراف کیا گیا تھا کہ پلانٹ کی سات منزلہ مضبوط ترین عمارت کو فضائی حملے سے تباہ کرنا ناممکن ہے کیونکہ پلانٹ پہاڑیوں کے سائبان میں ہے اور اسے گزند پہنچایا نہیں جا سکتا اس لئے زمین سے کوشش کی جانی چاہئے۔ تیسری خفیہ رپورٹ میں ناروے کے جاسوسوں کے حوالہ سے بتایا گیا تھا کہ پلانٹ کی حفاظت کا انتظام جرمنی نے کس پیمانے پر کر رکھا ہے اور کہ کسی جانب سے بھی پلانٹ میں داخل ہونا یا اس پر حملہ کرنا غیر ممکن ہے۔

چرچل ان رپورٹوں پر غور ہی کر رہے تھے کہ [illegible] ایک [illegible] رپورٹ انہیں ملی جس میں صرف یہ ایک جملہ تھا۔

"تو پکی سیدی" باشندہ ناروے برطانوی دفتر میں ملاقات کا متمنی ہے"

چرچل نے سیدی کو اپنے دفتر ہی میں طلب کر لیا۔ جیسے ہی وہ اندر [illegible] تو چرچل نے [illegible] کے سید [illegible] نارسک پلانٹ تباہ کر سکتے ہو؟"

"یقیناً!" [illegible]

آیا ہوں۔"

"[illegible]"

[illegible] جلب !"

"[illegible] تم ایسا کر سکو گے ؟ " چرچل نے پوچھا۔

"[illegible] ہو ؟ "

"[illegible] کو بھول کر یہاں آیا ہوں !" ترپچھے نے کہا۔ "رہا یہ سوال کہ میرا جذبہ کیا ہے تو عرض کروں کہ حب الوطنی سے میں خالی نہیں ہوں اور میرا اقدام دنیا کی خدمت کے لئے بھی ہے !"

چرچل کے حکم پر اسے ڈاکٹر لیف ٹرانسٹڈ کے پاس پہنچا دیا گیا جہاں "سویری" کے علاوہ چار اور ناروے کے انجینئر جو نازی حملے کے بعد لندن میں پناہ گزین ہو گئے تھے موجود تھے۔ ان سب کو ڈاکٹر لیف نے پلانٹ کے محل وقوع اور تعمیر سے متعلق سبق دینا شروع کر دیا۔ "سویری" جو اس مہم کا لیڈر تھا اسے رائل ایئر فورس کی گاڑی میں خصوصی افواج کے ٹریننگ ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا جہاں صرف دس دن کی ٹریننگ نے اسے ایک مشاق کمانڈو بنا دیا۔ "سویری" پیراشوٹ کے استعمال سے ناواقف تھا لیکن محض چار دن میں اس نے پندرہ بار چھلانگیں لگائیں۔ اس نے کبھی بے تار برقی ریڈیو کا استعمال نہیں کیا تھا لیکن محض تین دن میں وہ ریڈیو استعمال کرنے لگا اور "کوڈ ورڈ" کے پانچ سبق یاد کر لئے۔ اور اس طرح جب وہ قابل اطمینان طور پر تربیت پا چکا اور ناروے کے لئے پرواز کرنے والا تھا اس کو چرچل نے خود اپنے قلم سے حکم دیا۔

" تمہیں اپنے تئیں کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہئے جو اس مہم کی کامیابی کے امکانات کم کر دے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم پلانٹ سے متعلق جملہ اطلاعات فراہم کرو اور بے تار برقی سے ہمیں مطلع کرو تاکہ ہم مکمل پروگرام بنا سکیں۔ بعد میں تمہیں ٹرینڈ آدمی ملیں گے اس وقت تم انکی رہنمائی کرنا اور انہیں لے کر پلانٹ کی طرف بڑھ جانا۔"

دوسری شب ایک برطانوی جنگی طیارہ "سویری" کو لے کر ناروے کی طرف پرواز کر گیا۔ "سویری" [illegible] اپنے گھر کے قریب اترا اور جب گھر پہنچا تو اس کی ماں اسے دیکھ کر شادی مرگ ہو گئی۔ اسی رات "سویری" کو معلوم ہوا کہ پلانٹ کے قریب ہی نازیوں کا ایک پروجیکٹ شروع [illegible] گیا ہے کہ اب اس پروجیکٹ پر کام کرنے کے لئے بھرتی جاری ہے۔

اس خبر نے "سویری" کو نہال کر دیا اور خوشی کے مارے وہ رات بھر سو نہ سکا !

جلد ہی "سویری" نے نئے پروجیکٹ میں کام حاصل کر لیا اور جرمنوں نے اسے پروجیکٹ منتقل کر دیا۔ جہاں پہنچ کر اسے بہت سے جانے پہچانے دوست مل گئے جو اسی مقصد کے تحت کام کر رہے تھے جو "سویری" کا تھا۔ یعنی پلانٹ کے متعلق زیادہ سے زیادہ اطلاعات اکٹھا کرنا اور موقع ملتے ہی کام دکھا جانا۔ لہٰذا "سویری" کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی اور اس نے اپنا ریڈیو پہاڑیوں میں چھپا دیا جہاں سے وہ روزانہ بات کو جملہ اطلاعات لندن بھیجنے لگا۔ اس کی دوسری رپورٹ نے لندن کو مایوس کر دیا — !

دوسری رپورٹ یہ تھی کہ جرمنوں نے پلانٹ میں کافی توسیع کر لی ہے اور یہ کام ناروے کے انجینئروں کے ہاتھوں انجام پا چکا ہے۔ بادل ناخواستہ ہی سہی۔ لیکن ناروے کے انجینئر جرمن مظالم سے مجبور ہو کر اس کام کا تکملہ کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں اس لئے کہ جرمنوں نے موت کی کھلی دھمکی دے رکھی ہے لہٰذا جان بچانے کے لئے انجینئروں کو جرمنوں کی خواہشوں پر عمل کرنا پڑ رہا ہے۔ اسی کے ساتھ پلانٹ میں کام کی نوعیت سے متعلق لندن کو خفیہ رپورٹ ملی کہ ڈیٹیریم آکسائڈ تیزی سے بن رہا ہے اور جرمنی نکاسی جاری ہے۔ ان اطلاعات نے لندن کو لرزہ براندام کر دیا۔ چرچل نے فوراً حکم دیا کہ برطانوی افواج سے بیس منتخب شدہ آدمی فوراً "سویری" کو بھیج دیئے جائیں تاکہ وہ بیس کا جتھا فوراً پلانٹ کو تباہ کرنے کا اقدام کرے۔ پوری جنگ میں یہ اقدام انتہائی دشوار اور خطرناک تھا۔ اس لئے کہ یہ جتھا جس سمت روانہ ہونے والا تھا وہ انتہائی سنگلاخ علاقہ ہونے کے علاوہ ان معنوں میں خطرناک تھا کہ پہاڑوں پر اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا چلا کرتی تھی اور جہاں پیراشوٹ سے اترنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ پھر بھی کوشش کا آغاز ہوا اور دو بار جتھے روانہ کیا گیا لیکن دونوں بار ناکامی ہوئی [illegible] حالات نے قطعی موقع نہیں دیا کہ پیراشوٹ استعمال کیا جا سکے [illegible] اور دہشت طاری کر دی لیکن ایٹم کی وحشت [illegible] لہٰذا [illegible] بہرحال کسی نہ کسی طرح [illegible] ایک اندھیری اور [illegible]

[illegible] حالت میں اترے ۔ [illegible] تھا کہ واپس [illegible]
[illegible] سامان اکٹھا کرنے میں مناسب [illegible] جا رہا تھا پھر بھی اور یہ
قافلہ جو پلانٹ سے تین سو میل کے فاصلے پر تھا بہ احتیاط پہاڑوں کے اوپر
اوپر رستے لے کر پلانٹ کی طرف بڑھنے لگا جو ان سپاہیوں کو نگاہوں سے محفوظ
رکھ کر پہاڑوں کا سفر قافلے کے ارکان کا سخت ترین امتحان تھا۔ ہر سپاہی کے
ساتھ ایک سو بائیس پاؤنڈ کا سامان تھا جسے لے کر سیدھے پہاڑوں پر چڑھنا
اور وہ بھی انتہائی ٹھنڈک میں کارے دارد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وزنی
سامان کو ایک ساتھ لے جانے کے بجائے اقساط میں پہنچانا پڑتا تھا تھوڑا
سامان پہاڑ کی بلندی تک لے جایا جاتا پھر واپسی ہوتی اور تب دوسری
قسط جاتی اس طرح متعدد پھیرے ہوتے۔ محنت کے علاوہ جان کا خطرہ
الگ لگا رہتا تھا اس پر طرہ یہ کہ قیمتی سامان رہ نہ جائے۔ برباد ہو یا
چھوٹ نہ جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشن کا ہر فرد گھبرا گیا جبکہ ان آدمیوں
سے توقع تھی کہ اگر پورا پہاڑ بھی پھٹ پڑے تب بھی ان میں کا ہر فرد پورا
بوجھ پیٹھ پر اٹھالے گا لیکن عملی طور پر جب کام کرنے کا موقع ملا تو ان
کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔! دوسری بات یہ تھی کہ خوراک کی کمی نے حالت
ابتر کر رکھی تھی دن بھر میں چند بسکٹ چوتھائی پاؤنڈ پنیر اور دو اونس
دلیا اگر کسی کھانے کو ملا تو رہی سہی طاقت بھی تیزی سے روبہ زوال
ہونے لگی۔ متعدد لوگ زخمی ہو چکے تھے۔ کئی ہاتھوں یا پیروں کی انگلیاں
ٹوٹ چکی تھیں۔ بیشتر کے پیر سوج چکے تھے۔ غرضیکہ مشن عملاً فیل ہو چکا تھا
جبکہ منزل ابھی تک بہت دور تھی۔!

جب یہ جان لیوا سفر منزل کے قریب پہنچا تو بہ نظر احتیاط دن
کا سفر ترک کیا اور رات میں سفر شروع ہوا۔ دن میں سب کے سب
پہاڑوں کے غاروں میں چھپے رہتے اور رات میں سردی کی شدت میں
ٹھٹھرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ آخر ایک ماہ کے دشوار گزار اور انتہائی
تکلیف دہ سفر کے بعد انہوں نے لندن کے ہیڈ کوارٹر کو یہ اطلاع دی۔
"ہم ایک ایسی جگہ پہنچ چکے ہیں جہاں سے پلانٹ بہیں صاف نظر آرہا ہے
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] ۔ جرمنوں کے خواب میں بھی یہ تصور نہ تھا کہ [illegible]
کرنے کی سازش دشمن کر رہا ہے۔ لیکن اس حادثے نے جرمنوں کے کان کھڑے
کر دیئے۔ طیاروں کے ملبے میں جب جرمنوں کو طیرین پلانٹ کے قریب تعمیر
کا نقشہ ملا تو گھبرا گئے۔

"سویری" کو جب اس حادثے کا علم ہوا تب وہ بہت مایوس ہوا اسے
یقین ہو گیا کہ جس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ جرمنوں کو خفیف سا شبہ
تک نہ ہونے پائے، وہ خیال درہم برہم ہو گیا۔ نقشہ پر [illegible] جنگ [illegible]
تھا اور ناروے کے جرمن سپہ سالار کو وزارت جنگ نے حکم دیا کہ پلانٹ
کی حفاظت کے لئے پہریدار دوگنے کر دیئے جائیں۔

ادھر لندن میں حادثے کے بعد ڈاکٹر لیف ٹرانسٹڈ نے دوسرا دستہ تیار
کرنا شروع کر دیا۔ جس کی اطلاع اگرچہ "سویری" کو مل چکی تھی لیکن وہ خود اور
اس کے چاروں ساتھیوں کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ غذا کی
کمی نے "سویری" کو متوحش بنا دیا تھا۔ ساڑھے چار ہزار بلند پہاڑ کے غار میں
وہ پانچوں کے پانچوں موت سے لڑ رہے تھے کیونکہ بھوک اور سردی نے انہیں اس
قابل نہیں رکھا تھا کہ وہ مزید انتظار کر سکیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ریڈیو سیٹ بھی
جواب دے چکی تھی مگر "سویری" کسی نہ کسی طرح آخری اطلاع لندن دینے میں کامیاب
ہو سکا تھا کہ "بھوک اور سردی نے اس کی اور اس کے آدمیوں کی حالت [illegible]
حد تک ابتر بنا دی ہے اور وہ سب ایک غار میں پناہ گزین ہیں جرمنوں نے
پلانٹ کے محافظوں میں ایک سو آٹھ محافظوں کا مزید اضافہ کر دیا ہے۔"

شاید قدرت "سویری" کی مدد پر آمادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جرمنوں نے
چند محافظوں کو پلانٹ سے ہٹا کر نئے پروجیکٹ کی طرف روانہ کر دیا تھا
اور پلانٹ کی حفاظت اب چند بارہ محافظوں کے سپرد تھی جو پلانٹ کے گرد
حفاظت کر رہے تھے۔ انتہائی جدوجہد کے بعد "سویری" نے اس بات سے لندن کو
باخبر کر دیا تھا کہ جرمنوں کو کامل یقین ہے کہ اتحادی پلانٹ کو نشانہ بنا کر
پروجیکٹ کو تباہ کرنا چاہتے ہیں لہٰذا پلانٹ کی طرف سے وہ مطمئن ہیں۔ یہ
اطلاع لندن کو پہنچ چکی [illegible]
[illegible]
[illegible]

انداز میں خبردار کرتے ہوئے کہ اک انتہائی خفیف سی غلطی، ہو یا پھسلن بھیانک
نتائج کی حامل ہی نہ ہو گی بلکہ مستقبل میں ہر کوشش کے لئے خطرناک ثابت ہو گی
لہٰذا انتہائی احتیاط، فرض شناسی اور عزم کے ساتھ نیچے اتر کر اس عظیم مقصد کا
تکملہ کر لینا ہے جس کی خاطر وہ سب جان ہتھیلی پہ لے کر نکلے ہیں۔ اس کے بعد
"سویری" نے سب سے پہلے پہاڑ کی ڈھال سے نیچے اترنا شروع کیا۔ اس کے آٹھ
ساتھی بھی اس کی پیروی کرنے لگے۔ اور یہ منزل بڑی چابکدستی سے طے کر لی گئی۔
پہاڑ کے قدموں پر پہنچ کر انھوں نے اطمینان کا سانس لیا اور "سویری" نے
پنسل نما ٹارچ نکالی اور اس کی مدد سے اندھیری برفیلی شب میں آگے بڑھنے
کے لئے راستہ کی تلاش شروع کر دی۔ اسے آگے ایک کھائی نظر آئی جس کو پار
کرنا ممکن نہ تھا لیکن پنسل نما ٹارچ نے ایک تنگ پل کا نشان دیا جیسے ایک
لکڑی کے تختے سے عارضی طور پہ بنایا گیا تھا۔ یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ لکڑی
کا تختہ ایک آدمی کا بوجھ سنبھال سکتا ہے "سویری" آگے بڑھا اور دیکھتے
دیکھتے کھائی کے اس پار جا پہنچا۔ یکے بعد دیگرے اس کے آٹھ حملہ آور ساتھی
بھی کھائی پار کر چکے تھے یہ دوسری منزل تھی جو بحسن و خوبی طے ہو چکی تھی۔

اب صرف ایک پہاڑی درمیان میں اور حائل تھی جس کو پار کر لینے
کے بعد منزل مقصود ان کے سامنے ہونے والی تھی۔ لیکن وقت کم تھا اگرچہ
پہاڑی کل نو سو فٹ ہی بلند تھی لیکن "سویری" ایک لمحے کے لئے متفکر ہوا پھر
بے ساختہ آگے بڑھا کہ ایک لمحہ کی بربادی تاریخی تباہ کن نتائج کی حامل ہو سکتی
ہے اس نے پہاڑی پر عزم و استقلال کے ساتھ چڑھنا شروع کیا اور ہمت
مرداں مدد خدا کے تحت یہ منزل بھی آسان ہو گئی۔ پہاڑی کے ادھر پہنچتے ہی
"سویری" کی نظر اس ریل کی پٹڑی پہ جا پڑی جو صدر پھاٹک سے چار سو فٹ
کے فاصلے پر تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے پہلے سے زیادہ خاموشی اور احتیاط اختیار
کی گئی اور آخر یہ حملہ آور پارٹی اس نازک مقام تک جا پہنچی جہاں درمیان
میں تار صرف راستہ روکے کھڑے تھے "سویری" اور اس کے ہر ساتھی پر نفسیاتی
کیفیت کا اثر ہونے لگا۔ خوشی، اور بے چینی اعصابی تناؤ پیدا کر رہا تھا۔
آخر "سویری" نے وہ آپریشن نکالا جس کی مدد سے اس نے معلوم کر لیا کہ کون
کون تار کرنٹ زدہ ہیں۔ اس راز سے باخبر ہوتے ہی اس نے بجلی والے تین
اور چار کے تاروں کو قریب کیا اور کلپ سے ایک ہی جوڑ دیا اور گرہ
لگا دی اب جو خلا پیدا ہو چکا تھا اس میں سے جھک کر وہ خود اور اس کے
الشہاب

ساتھی گزر کر اندر داخل ہو سکتے تھے۔ "سویری" سب سے پہلے کرنٹ زدہ
تاروں کو چھوڑتا ہوا ان کا رانہ طور پہ بیرک کراس پار گیا اور پھر اس کے
ساتھی باری باری پلانٹ کے کمپاؤنڈ میں آنے لگے۔ لیکن ایک لمحہ وہ بھی آیا
جبکہ پوری احتیاط کے باوجود رات کے سناٹے نے جھرجھری لی اور تار کی زرٹ سے
ایک گھٹی ہوئی آواز پیدا ہوئی جو گہرے سناٹے میں قیامت خیز شور سے کم نہ
تھی۔ آواز کے ہوتے ہی "سویری" نے بہ عجلت اپنا ریوالور نکال لیا مبادا
پہرے دار چوکنا ہوں تو وہ ان کا استقبال ریوالور کی گولیوں سے کر سکے لیکن
دوسرے لمحے رات کے سناٹے نے "سویری" کے شک کو زائل کر دیا اور وہ آواز
کسی سان کو کھٹکا نہ کر سکی۔ بائیں جانب پلانٹ کا پھاٹک نظر آ رہا تھا لیکن
وہاں کوئی پہرے دار نہ تھا۔ !

حملہ آور پارٹی کے ہر فرد کو اپنی ڈیوٹی کا ماقبل علم تھا لہٰذا پانچ
ہاتھوں میں فوجی ریوالور لئے خاموشی کے ساتھ پہریداروں کی بیرک کی طرف
ہو لئے جہاں انھوں نے اندھیرے کی آڑ میں اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی تاکہ
بوقت خطرہ۔ اگر جرمن پہریدار باہر نکلیں تب کسی پہریدار کو یہ لوگ آگے نہ
بڑھنے دیں اور بلا تکلف موت کے گھاٹ اتار دیں۔ ان کے جاتے ہی "سویری"
بقیہ حملہ آوروں کے ساتھ بہ احتیاط پھاٹک کی طرف ہو لیا۔ !

پھاٹک پر پہنچتے ہی "سویری" نے پنسل نما ٹارچ سے سگنل کیا۔ یہ سگنل
ان لوگوں کے لئے تھا جو بیرک کے سامنے خطرناک ہم زیبل لئے تھے سگنل
ملتے ہی وہ سمجھ گئے کہ "سویری" پھاٹک کے قفل کو چھیڑنے والا ہے لہٰذا انھوں
نے چوکنا ہو کر ریوالور مضبوطی سے پکڑ لئے اور ریوالوروں کے گھوڑوں پہ
انگلیاں جما لیں۔۔۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ "سویری" کو شبہ تھا کہ صدر
پھاٹک کا قفل الارم اسٹیشنوں سے منسلک ہو گا اور یہ کہ قفل کے کھلتے
ہی الارم بج اٹھیں گے جرمن پہریدار سر پہ پیر رکھ کر گھبراہٹ میں باہر نکلیں گے
اس وقت انھیں ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ سامنے کی اس منزل پہ
پہنچ کر پلانٹ کو تباہ کئے بغیر پسپا ہونے کے لئے حملہ آور پارٹی قطعی تیار
نہ تھی۔ "سویری" کی دھڑکنوں کو اس وقت سکون مل گیا جب قفل
تین سکنڈ میں نہ صرف کھل گیا بلکہ خلاف توقع الارم نہیں بجے۔ اس وقت
قفل کا کھلنا گویا تھا کہ "سویری" اور اس کے تباہ کن دستے کے سامنے [illegible]
دروازے کھل گئے۔ وہ سب کے سب پھاٹک قدرے کھول کر [illegible] اندر داخل

[illegible] گرتے گرتے بچے تھے۔ انھیں ڈاکٹر لیف ٹرانسٹڈ نے ایٹم کا وہ کرہ [illegible] روشناس کرا دیا تھا۔ اس وقت ان کے کام آئی اور ایک [illegible] وہ سب بھول گئے۔ لمبا راستہ طے کیا۔ اس وقت اچانک "سویری" [illegible] اس نے کہ ایک جرمن محافظ سنگین لئے کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ [illegible] جرمن پہریدار کھڑے کھڑے سو رہا تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کا [illegible] اس بات کا ثبوت تھا۔ ! دوسرے لمحے "سویری" نے لپک کر ریوالور جرمن پہریدار کی پیٹھ سے لگایا اور برجستہ کہا۔ "خاموش!" جرمن پہریدار کچھ اتنا دہشت زدہ ہوا کہ سانس بھی نہ لے سکا اس کے مغلوب ہوتے ہی "سویری" اور اس کے ساتھی پلانٹ کے "دل" تک پہنچ گئے۔ پلانٹ کا یہ حصہ "دل" ان معنوں میں تھا کہ ہٹلر کے پہلے ایٹم بم کے لئے ڈیٹیریم آکسائڈ اسی حصے میں تیار ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ جرمن پہریدار اس کے گیٹ پر کھڑا تھا جبکہ صدر پھاٹک تک کو پہریداروں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

جرمن پہریدار کو مغلوب کرنے کی دیر تھی کہ "سویری" اور اس کے جانباز ساتھیوں نے بہ عجلت پلانٹ کو اڑا دینے کی تیاری شروع کر دی پھٹنے والا بھیانک مادہ ان کے پاس تھا جسے وہ بڑی احتیاط سے ساتھ لائے تھے فوراً تار کھول کر پھیلائے جانے لگے۔ چند منٹ میں سارا اسٹیج تیار تھا صرف فیوز کرنے کی دیر تھی ـــــ !

"سویری" نے یہ احتیاطاً ایک نظر اور ڈالی اور تب عظیم خواب کی تعبیر کا اصل احساس اسے ہو گیا۔ "سویری" نے جھک کر بہ عزم و استقلال فیوز کا کلپ ہٹا دیا اور فوراً ہی پہلی بار چلا کر کہا :- "بھاگو" اور ساتھ ہی پھاٹک کی طرف سرپٹ بھاگ لیا۔ بیس سکنڈ بعد "سویری" اور اس کے جانباز ساتھی پلانٹ کی عمارت سے باہر نکل چکے تھے۔ ٹھیک اس وقت غضبناک دھماکے نے قرب و جوار کے پہاڑوں کی بنیادیں ہلا دیں اور خطرے کے خوفناک الارم بجنے لگے۔

جب دھماکہ ہوا تب "سویری" اور اس کے ساتھی پلانٹ کی بلڈنگ سے چالیس گز کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ دھماکے نے پلانٹ کی نصف سے زائد بلڈنگ کو آٹے کی طرح پیس دیا تھا اور بقیہ عمارت معلق تھی۔ اور چاروں طرف بھیانک اندھیرا اچھل کر دھوئیں کے غلاف میں اور بھیانک ہو گیا تھا۔ اس وقت بیرک میں موجود جرمن پہریدار گھبرا کر باہر [illegible] نکلے لیکن انھیں چند سکنڈ کی دیر ہو چکی تھی ان کا شکار نکل چکا تھا اس لئے کہ "سویری" اور اس کے جانباز ساتھی تاروں کے ادھر جا کر پہاڑوں کی اوٹ میں غائب ہو چکے تھے جرمن پہریداروں کو صرف دھواں اور شعلے ہی نظر آ رہے تھے ـــــ اور بس !

پلانٹ تباہ ہو چکا تھا اور بری طرح اس طرح ہٹلر کے پہلے ایٹم بم کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ لیکن اس عظیم کامیابی و اقدام کے باوجود "سویری" کو ایک شبہ تھا اور اسی شبہ نے اس کے قدم روک لئے تھے جبکہ اس کے دوسرے ساتھی دھماکے کے بعد سیدھے سویڈن کی سرحد کی طرف بھاگ لئے تھے۔ لیکن "سویری" اب تک ان ہی پہاڑوں میں موجود تھا۔ اسلئے کہ شبہ تھا کہ جرمن اتنی آسانی سے ایٹم کے تصور کو خیر باد نہیں کہیں گے "سویری" کی موجودگی کی یہی وجہ تھی۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے مضطرب تھا کہ اگلا جرمن اقدام کیا ہوگا ـــ ! ؟

اس دھماکے کی خبر جوں ہی نازی جرنیل "وان فالکن ہارسٹ" کو ہوئی اس نے حکم دیا کہ تباہ کاروں کی فوری تلاش تندہی سے شروع کر دی جائے لیکن سخت تلاش و جستجو کے بعد بھی کوئی ایسا آدمی ہاتھ نہ لگا۔ جس پر پلانٹ کی تباہی کی ذمہ داری عائد کی جاسکے ـــ !

دوسرے دن نازی جرنیل نے تلاش و جستجو کی مہم میں بارہ ہزار جرمن سپاہی جھونک دیئے لیکن اس پورے ڈیویژن نے چپہ چپہ چھان مارا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ "سویری" کے ساتھی سویڈن فرار ہو چکے تھے۔ جبکہ "سویری" غار میں پوشیدہ تھا تاکہ لندن کو دھماکے کے بعد کے حالات سے مطلع کر سکے ـــ !

اکتوبر ۱۹۴۳ء میں سویری نے لندن کو خفیہ پیغام سے باخبر ہی نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر سنسنی بھی کر دیا کہ پلانٹ کو جرمنوں نے پھر استعمال بنا لیا ہے نیز ڈیٹیریم آکسائڈ کی تیاری جاری ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی آٹھویں امریکن ہوائی بیڑے کو حکم ہوا کہ حملہ آور ہو اور پلانٹ کو ناکارہ کر دیں۔

اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ آٹھویں امریکن فضائی بیڑے نے پلانٹ پر اس قدر شدید حملہ کیا کہ پلانٹ کی حالت دگرگوں ہو گئی لیکن ڈیٹیریم آکسائڈ کی تیاری پھر بھی ہوتی رہی اس لئے کہ جرمنوں نے ایک حصہ پہاڑ کے نیچے بنا رکھا تھا۔ لہٰذا یہ فضائی حملہ ان معنوں میں [illegible]

خوف ہے کہ فضائی حملوں کا راستہ کھل گیا ہے اور پلانٹ کی کارکردگی
میں مخذر پڑ سکتا ہے لہذا انھوں نے ڈیٹیریم آکسائڈ پلانٹ کو جرمنی منتقل
کر دینے کا پروگرام بنالیا۔ "سویری" نے اس ارادے سے لندن کو باخبر کیا
اور ساتھ ہی اس امر کی اجازت چاہی کہ پلانٹ کی منتقلی روکنے کے لئے کل
اختیارات دیئے جائیں — یہ اس وقت کی بات ہے جب لندن میں
چرچل اور جنرل آئزن ہاور جنگ کا تجزیہ کر رہے اور صلاح و مشورے
میں موجود تھے۔ "سویری" کے مطالبہ پر دونوں نے مشترکہ طور پر غور کیا
اور اسی دن چرچل نے "سویری" کو مطلع کر دیا
جائے کہ اسے پلانٹ کی منتقلی تباہی کے سلسلے میں کئے جانے والے جملہ
اقدامات کی اجازت ہے۔ وہ جب چاہے اور جب پسند کرے
حسب موقع اقدام کر سکتا ہے!"

اس حکم نے "سویری" کو بے انتہا مسرور کیا اور اسی وقت سے اپنے
اقدام کے لئے تیاری شروع کر دی۔

"سویری" اگرچہ تنہا تھا لیکن اپنی کامیابی کی طرف سے ناامید نہ تھا
اس نے منتقلی کے سلسلے میں معلومات کا حصول شروع کیا اور اس وقت
مسرور ہوا جب منتقلی کے پروگرام اور طریقے کا اسے علم ہو گیا۔ جرمنوں نے
پلانٹ کو قسط وار منتقل کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور "سویری" کو علم ہو گیا
کہ پلانٹ کا خاص و اہم حصہ گیارہ فروری ۱۹۴۴ء کو جھیل کے ذریعہ منتقل ہو گا
لیکن انتہائی کوشش کے بعد "سویری" کو یہ علم نہ ہو سکا کہ جرمن پلانٹ کو کس
مقام پر منتقل کریں گے لیکن کافی معلومات پھر بھی اسے معلوم ہو چکی تھیں۔
"سویری" کا ابتدائی خیال یہ تھا کہ گیارہ فروری کے لئے ہوائی حملے کا پروگرام
بہتر رہے گا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے لندن کو ہوائی حملے کے لئے مطلع نہیں کیا
اسلئے کہ ناروے کا یہ مہینہ ہوائی حملے کے لئے کچھ زیادہ امید افزا نہیں ہوتا۔
مبادا موسم کی رکاوٹ سے حملہ نہ ہو سکے تو پلانٹ کا اہم حصہ منتقل ہو جائے گا
لہٰذا اس نے ابتدائی خیال بدل دیا!

اقدام کی جملہ ذمہ داری اب "سویری" پر منحصر تھی۔ جس کا عزم یہ تھا کہ
ہٹلر کا ایٹم بم کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہونے دے گا۔ چنانچہ کسی نہ کسی طرح
جرمنوں کا ملازم بن کر "سویری" پلانٹ کے سٹاف میں شامل ہو گیا اور
منتقلی کے [illegible] پلانٹ کے حصے جھیل تک لائے جا رہے تھے
[illegible]

اور اس جہاز میں محفوظ کئے جا رہے تھے جو اسی غرض سے لایا جا رہا تھا۔
دس فروری کو یعنی اہم حصص کی آمد سے قبل "سویری" اپنی جان پر کھیل گیا اور
اس نے وہ خطرناک فرض انجام دیا جس کی توقع اس سے ممکن نہ تھی یعنی —
جہاز کو ڈائنامیٹ کر دیا۔ دوسری صبح پلانٹ کا اہم حصہ لایا گیا اور تھوڑی ہی
دیر بعد انتظامات کا تکملہ ہو جانے کے بعد ہو جانے کے بعد جب [illegible]
تب "سویری" کو بھی جہاز چھوڑ دینے کا حکم ہوا۔ اس وقت "سویری" پہلے سے
بھی زائد خطرناک فرض کی انجام دہی کی یعنی فیوز کلب توڑ دیا اور جہاز سے
اتر کر جھیل کے ایک بلند کنارے پر اپنی کوششوں کا انجام دیکھنے کے لئے
مضطربانہ انداز سے کھڑا ہو گیا۔ آخر لنگر ہوا اور جہاز نے حرکت کی "سویری"
بار بار بے تابی سے گھڑی دیکھتا رہا اور جہاز جب وسط جھیل میں پہنچا
تو وہ شادی مرگ تھا۔ یعنی آگے پیچھے تین دھماکے ہوتے جہاز ٹکڑے
ٹکڑے ہو گیا اور سارا عملہ معہ آٹھ بڑے نازی جرنیلوں کے آگ کی نذر
ہو گیا۔ پلانٹ ٹوٹ پھوٹ کر جھیل کی گہرائی میں دفن ہو چکا تھا — اور
جس نے ہٹلر کے ایٹمی خواب کو ہمیشہ کے لئے پراگندہ کر دیا تھا!

جنگ تو ہٹلر نے جاری رکھی لیکن جس ہتھیار کا اسے زعم تھا
وہ اسے حاصل نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ ڈیٹیریم اکسائڈ کے بغیر ایٹمی تجربے ممکن
نہ تھے لہذا ایٹم کا خیال ترک کر دیا گیا لیکن پلانٹ کی تباہی نے بالآخر
جرمنی کو شکست سے قریب تر کر دیا!

دوسرے دن چرچل نے وائٹ ہال میں جنگی کونسل کا جلسہ
طلب کیا اور مسکراتے ہوئے اعلان کیا۔ "پلانٹ کی تباہی مکمل
ہو چکی ہے — ایٹم بم کی دھمکی بے اثر بن چکی ہے۔ اور جرمنی کی
شکست امر مسلمہ ہے —!"

"سویری" بھاگ لیا اور اسی روز اپنے گھر پہنچ گیا جہاں
وہ اپنی ماں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا لیکن اس کی خوشی بے حساب
تھی — اس کی ماں کو کیا معلوم تھا کہ اس کا بیٹا دنیا کا محسن
بن چکا ہے —!!؟

ہٹلر اپنے پہلے ایٹم بم کا خواب دیکھتے دیکھتے دنیا سے
رخصت ہو گیا لیکن اس کا ایٹم بم نہ بن سکا — [illegible]

شبی طارق

ملاقات

آج پہلی بار وہ کچھ اس طرح مجھ سے ملا
بال تھے الجھے ہوئے آنکھوں میں تھیں ویرانیاں
کرب کے آثار تھے یوں زرد چہرے سے عیاں
جیسے صدیوں سے کوئی ہو زندگی سے سرگراں

میں نے جب پوچھا بتا آخر تجھے یہ کیا ہوا
کس کے غم میں کھو گئی ہے تیرے ہونٹوں کی ہنسی
چھین لی ہے کس نے تیری زندگی کی ہر خوشی
"جیسی اب ہے ایسی حالت تو کبھی پہلے نہ تھی"

میری باتیں سن کے وہ کچھ اور غم میں کھو گیا
ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا

محمود خاور

ورثہ

رات ڈھلتے ہی بھڑک اٹھتے ہیں خوابوں کے بدن
دن نکلتے ہی پگھل جاتے ہیں تصویر کے رنگ
ہے وہی شہر وہی دورِ جراحت جس میں
لوگ پھرتے ہیں بھٹکتی ہوئی روحوں کی طرح
گرد اذکار کے شیشوں پہ جمی رہتی ہے
دل کی راہوں سے گزرتے ہیں فقط سناٹے
کون اپنا ہے یہاں۔ کون پرایا ہے یہاں
سب کے چہروں پہ لکھی ایک سی تحریریں ہیں
اپنی میراث ہیں صدیوں کا یہی درد تو ہے
آؤ آپس میں اسی درد کو تقسیم کریں
زندگی لائقِ تعظیم ہے...... تعظیم کریں

پناہ گیر

خواب شب کی منڈیروں پہ بیٹھے ہوئے
گھورتے ہیں مجھے
میری آنکھوں میں بسنے کو بے چین ہیں
اور میں خوف سے رات بھر
جاگتا ہوں کہ میں سوگیا گر
تو یہ میری آنکھوں میں بس جائیں گے
اور کل
ان کی قیمت چکانا پڑے گی مجھے

مقبول قریشی

آخری پرواز

وقتِ رخصت وہ تیرا ہنس کے دلاسے دینا
"اگلے اتوار کو لوٹ آؤں گی مرتے کیوں ہو!
یوں بھی کرتا ہے کوئی جذبِ وفا کی تذلیل
آنکھ میں اشک تو چہرے پہ غمِ ہجر کی دھول
لوگ کیا سوچیں گے اس کا بھی ہے کچھ تم کو خیال"
یک بیک سیٹی بجی ریل کے پہیے سرکے
دور تک جاتے رہے دیدۂ پُرنم کے سلام

ایسے ہی ملتے بچھڑتے کئی موسم بیتے
زہرِ فرقت بھی پیا قربتِ پیہم بھی ملی
پر یہ کیا اب کے جو بچھڑے تو خبر تک بھی نہ کی
نقشِ پا بھی نہ کسی راہ میں چھوڑا تم نے
ڈوبنے والوں سے منہ موڑ کے جانے والے
قلزمِ غم میں تو اب آس کا تنکا بھی نہیں

حرمت الاکرام

○

ماضی کی رونقوں سے ہے امروز شرمسار
یہ زندگی ہے یا کوئی اجڑا ہوا دیار

اک دھوپ تھی کہ ہم قدمِ فکر و جاں رہی
راہِ طلب میں کس کو ملا نخلِ سایہ دار؟

محرومیوں سے بھی نہ کہا یہ کہ لوٹ جاؤ
کس نے کیا ہے میری طرح زندگی سے پیار

خوابوں کی لوٹ کے وہ بھی بکھر گیا
شبنم کے موتیوں سے بنایا تھا ایک ہار

ہے عشق کے سماج کی تہذیب اور ہی
دل خوار جب ہوا تو ملا زیست کو وقار

اک تیرا غم تھا جس کی سمائی نہ ہو سکی
کیا کم تھی ورنہ جینے کو پہنائے روزگار

ہم مرگ کو یکن پہ نہیں نکتہ چیں مگر
کہنے کو ہو گیا کہ جنوں بھی تھا کم عیار

جھلسی ہوئی امیدوں کا چہرہ دمک اٹھا
بیتے دنوں کی یاد ہے یا نور کی پھوار!

حدت قدم قدم پہ کٹانا پڑا ہے سر
لمحات کا سفر ہے کہ چلتی چھری کی دھار

شاہد منصور

○

خندہ لبی کی دل سے عبث التماس ہے
اس سوختہ جگر کو اداسی ہی راس ہے

معلوم ہے کہ اس کی خبر دوست تک نہیں
محسوس ہو رہا ہے یہیں آس پاس ہے

ہنگام نزع آنکھ ہے در سے لگی ہوئی
اے کشتۂ ستم یہ تجھے کس کی آس ہے

کلیاں ترے خیال کی مرجھا چلیں تمام
اب غمگسار اپنی اگر ہے تو یاس ہے

یہ خانقاہِ زہد یہ ہنگامِ سرکشی
یارو حدیثِ شیخ میں کچھ التباس ہے

کشتوں سے زورِ بازوئے قاتل کی داد کیا
مقتل کا گوشہ گوشہ سراپا سپاس ہے

ہے اور کیا جو چھین سکے گردشِ جہاں
ہاں اک متاعِ کج کلہی اپنے پاس ہے

خمار انصاری

○

وقت کے جن پہ ستم ہوتے ہیں
کچھ وہی لوگ اہم ہوتے ہیں
دیکھ کر مجھ کو زمانے کو بھی دیکھ
باوفا اتنے بھی کم ہوتے ہیں
نہ ہیں یوں عرضِ تمنا پہ خموش
جیسے پتھر کے صنم ہوتے ہیں
کون جانے یہ بجز اہلِ دنیا
حاصلِ زیست بھی غم ہوتے ہیں
تجربہ یہ ہے کہ آلامِ جہاں
قسمتِ اہلِ قلم ہوتے ہیں
جادۂ زیست یونہی ہے پُرپیچ
جس طرح زلف کے خم ہوتے ہیں
ہم ہیں اس دورِ تمدن میں جہاں
سب دکھاوے کے بھرم ہوتے ہیں
اِک نئے عزم سے چلنا ہوگا
یوں کہیں فاصلے کم ہوتے ہیں
حادثہ جب کوئی ہوتا ہے قریب
وقت کے ذہن میں ہم ہوتے ہیں
لوگ پڑھتے ہی نہیں 'ہیں' ورنہ
درد چہروں پہ رقم ہوتے ہیں
حوصلہ چاہیئے چلنے کا خمار
سخت دو چار قدم ہوتے ہیں

صلاح الدین نیّر

○

موسمِ گل میں یوں تھمے ہوئے گلشن کی طرح
ایسی نظروں سے نہ دیکھو مجھے دشمن کی طرح

زندگی آج یہ کس موڑ پہ لے آئی ہے
آپ کی یاد بھی آتی ہے تو الجھن کی طرح
ذوقِ دیدار میں شامل جو ہر تہذیب نظر
ایک بیوہ بھی نظر آئے سہاگن کی طرح
ہم ملے جب کسی تہذیب کے دوراہے پر
جھک گئیں آپ کی پلکیں کسی چلمن کی طرح
خلوتِ دل میں تری یاد سمٹ آئی ہے
سیدھی سادی سی کسی گاؤں کی دلہن کی طرح
وادیٔ گل میں اندھیرا ہے بظاہر لیکن
زخم روشن ہیں ابھی آپ کے کنگن کی طرح
شعلۂ درد کی مانند سلگتے ارماں
دل کے مندر میں کہیں ہیں کسی جوگن کی طرح
آتشِ گل سے نہ سلگے کہیں دامن میرا
چار تنکوں کے سہارے ہوں نشیمن کی طرح

پھر بچھڑنے کا تو احساس نہیں ہے نیّر
ہے نمی آنکھوں میں بھیگے ہوئے ساون کی طرح

حزیں لدھیانوی

○

بزمِ تیرہ ہے، نہیں انجمن آرا خورشید
کاش آ جائے کوئی بن کے سراپا خورشید

کیوں نہ پلکوں پہ رہے چاند ستاروں کا ہجوم
دیکھتے دیکھتے گہنا گئے کیا کیا خورشید

آؤ اب جان کی مشعل کو فروزاں کر لیں
ہو گئی شام، لبِ بام نہ آیا خورشید

رات دل میں تھا مدو جزر تری یادوں کا
بارہا ذہن پہ ابھرا کبھی ڈوبا خورشید

کوئی خورشید کو دامن میں چھپائے رکھے
بزمِ رنداں میں ہے پیمانۂ صہبا خورشید

اے حزیں چھوٹ گیا شہرِ نگاراں جب سے
پھر کسی روز سرِ راہ نہ دیکھا خورشید

ظفر ابنِ متین

○

یہ پرسشِ غم کیا کہ پریشان سا کیوں ہے؟
سب حال عیاں تجھ پہ ہے انجان سا کیوں ہے

میں بھی تو اک انسان ہوں آئینہ نہیں ہوں
ہر شخص مجھے دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

خوش ہوں کہ انہیں آج کچھ احساس ہوا ہے
گھر دیکھ کے کہتے ہیں کہ ویران سا کیوں ہے

یارو ہک ہے نہ تب و تابِ بہاراں
جو کھلنے چمن میں ہے وہ بے جان سا کیوں ہے

کیا بات ہے رہ رہ کے دھڑکتا ہے مرا دل
سوکھا ہے سمندر تو یہ طوفان سا کیوں ہے

کچھ تو ہی بتا جھک گئیں کیوں تیری نگاہیں
میں تو نہیں کہتا کہ پشیمان سا کیوں ہے

گم ہو کے سمندر میں کہیں ملتا ہے موتی
پھر کھو کے تجھے پانے کا امکان سا کیوں ہے

جرعے

صبح دم کہہ کے اُڑ گئی شبنم
کیوں چھپوں میں کرن اگر نہ چھوئے
عفتِ حُسن کا تو کیا کہنا
حُسن وہ ہے جسے نظر نہ چھوئے

●

جانے کیوں جب مجھے مغرب کا خیال آتا ہے
آسمانوں سے لہو سا کوئی برساتا ہے
اور اس ملک کی تقدیر پہ رشک آتا ہے
جس میں مشرق کی طرف سجدہ کیا جاتا ہے

●

اس کے قدموں پہ سر جھکاتی ہے
کبھی جن کی ہنسی اڑاتی ہے
کس قدر ہے ذلیل یہ دنیا
بیشتر اپنے منہ کی کھاتی ہے

●

ڈاکٹر حمید رشاہین

○

آپ کیوں کرنے لگے ترکِ جفا میرے لئے
چھوڑیئے جو کچھ ہوا اچھا ہوا میرے لئے
اسکی آنکھوں میں مگر میرے چلے جانیکے بعد
دیر تک جلتی رہی شمعِ وفا میرے لئے
یوں بساطِ زندگی آلام سے پامال ہے
جیسے سرگرداں ہو ہر موجِ بلا میرے لئے
جام دیتے ہو تو کیا جب تم نے آنکھیں پھیر لیں
چھین لیں اور کیا باقی رہا میرے لئے
مجھ سا ... گلشنِ عالم میں ...
... بہلائے گئے ہیں جا بجا میرے لئے

قطعات

اب بھی پلکوں پہ ہیں رقصاں تری یادوں کے ...
زخم ہائے دلِ خوں گشتہ سے رستے ...
اب بھی پاتا ہوں مجھے اپنی رگِ جاں کے ...
اب بھی لاتی ہے صبا تیرے بدن کی خوشبو

●

کس کی پازیب کی جھنکار کی آواز ...
کس کی یادوں نے مرے دل سے ...
کس نے پھر میری غزل سا نغمہ ...
کس کی آواز نے کانوں میں ...

●

کس کی یاد آئی جلاتی ہے ...
گوشۂ ذہن معطر ہے ...
رفتہ رفتہ نظر آنے لگی دنیا ...
دل سے احساسِ غم ...

●

...دن پھوپی نے کس کے بچوں سے پیار نہ کیا تھا۔ گھر بھر کے سارے لڑکے جو اب تنومند جسم لیے ان کے پاس سے بے نیازی سے گزر جاتے تھے ان ہی کی گودوں کے کھیلے اور ان ہی کی محنتوں کے ثمر تھے۔ لیکن۔ پھوپی کبھی پھل دار درخت نہ بن سکیں۔ یہ تو سارے ادھر ادھر کے پھل تھے جو ان کی گود میں آ پڑے تھے۔ جب یہ لوتھڑے تنومند اور توانا ہو جاتے تو وقت کا بے رحم ہاتھ آگے بڑھتا اور پھوپی کی دولت چھین لیتا۔

آ۔ آ.... او بچہ۔ مل ہا.... او ان ہوں نہیں روتے ابھی۔ ہاں۔ اچھے بن چپ ہو جاؤ۔

پر وہ منحوس ریں ریں بہر حال جاری تھی۔ پھوپی جی جان سے جُتی ہوئی تھیں۔ اسے چپ کرانے پر۔

طویل برآمدے کے ایک کونے میں پھوپی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور سامنے فرش پر ایک گول مٹول سا بچہ اپنی منحوس آواز میں روئے جا رہا تھا۔ روٹی کے ٹکڑے، سیب کی کی قاشیں بچے کچھے کیلے اس کے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ایک آدھ دال میں لتھڑا ہوا روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں بھی تھا جسے وہ کبھی اپنے منہ میں ٹھال لیتا اور پھر جب رونے کو جی چاہتا تو ٹکڑا منہ سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیتا۔ پھر وہی ریں ریں شروع ہو جاتی اور پھوپی اسے منانے کے لئے عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگتیں۔

بڑی بڑی کٹورہ سی آنسو بھری آنکھیں ذرا کی ذرا رک کر اس مہربان وجود کو تکتیں جو اس سے پرے اس سے دور اونچے پر بیٹھ کر اس سے ہمدردی جتا رہا ہوتا۔ اور پھر رونا شروع ہو جاتا۔ وہ تو بس اسی وقت چپ ہونا جانتا تھا جب وہ اپنی ماں کے سینے سے لگ کر چپر چپر کا دلچسپ کام شروع کر دیتا۔ اور یہ اتنی دور سے اتنے پرے سے مہربانی کے پھول کون اس کی طرف پھینک رہا تھا۔ آنکھیں حیرانی سے دیکھتیں اور پھر یہ کام بھی بے کار لگتا وہ منہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا اور پھر وہی ریں ریں۔

ایسا کئی دن سے ہو رہا تھا۔

ہوا یوں کہ ہر کتے جب چھپنے سوا مہینے کی چھٹی کے بعد آئی تو اس کے گود میں ایک بچہ لٹکا ہوا تھا۔ پہلے پہل تو وہ اسے برآمدے کے ایک کونے میں ایک میلی سی گدڑی بچھا کر لٹا دیتی اور اپنا جھیر جھیر دوپٹہ اڑھا کر کام میں لگ جاتی۔ کئی دن یونہی گزر گئے۔ بچہ چپ چاپ پڑا سوتا رہتا اور ہر کتے اپنے کام میں لگی رہتی۔

پھر یوں ہوا کہ بچے نے گدڑی سے پاؤں نکالے ماں اسے بٹھاتی اور وہ بلکتا ہوا برآمدے کے چکنے فرش کو تیزی سے طے کر کے سیڑھیوں تک پہنچ جاتا۔ ماں پاس دوپٹہ ڈال کر جانا چاہتی اور یہ ریں ریں کرتا اس کے پیچھے دوڑتا وہ بغیر جھکے ہوئے چمکار کے پیار کرتی "ادھر بیٹھ بیٹا میں ابھی آتی ہوں" وہ دُلار سے کہتی یہ اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا دامن تھام لیتا۔ وہ رک جاتی لیکن دوسرے ہی لمحے سارے گھر کے بکھرے کام اس کی نظروں کے سامنے آ جاتے اور دوسرے بہت سارے گھروں کے بہت سے کام یاد آ جاتے وہ اسے کندھوں سے زور دے کر وہیں بٹھا دیتی [illegible] کھلونا یا روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں پکڑا کر وہ تیزی سے باورچی خانے میں گھس جاتی [illegible]

سوجاتا تھا۔ چہرے پر گذرے دنوں کی رونق بھی اس وقت تک نظر آتی جب تک منو گھر پہ ہوتا۔ ہمکتے ہاتھ پیروں کو جھٹکا کر ادھر برکتے فارغ ہوتی ادھر پھوپھی کے چہرے کی رونق اڑتی۔ اور جب برکتے منو کو کمر پہ لٹا کر چلتی تو گویا پھوپھی کا دل بھی ساتھ لئے جاتی۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا تعاقب کرتیں یہاں تک کہ برکتے گیٹ سے نکل جاتی۔

پھوپھی کی عنایتیں منو پہ رحمت کا بادل بن کر برس رہی تھیں اور وہ ہری بھری کھیتی کی طرح لہلہانے لگا سفید رنگت تو اس کی تھی ہی، سیب سے ٹکڑوں موسمی مالٹوں نے اس رنگ میں سرخی کی ملاوٹ یوں کی کہ چہرہ چمک اٹھا۔ گال یوں سرخ ہو گئے کہ خون ٹپکنے کو تیار۔

یہ جگر مگر کرتا چہرہ سب ہی کی آنکھیں خیرہ کر دیتا۔ پھوپھی کے دیئے ہوئے رنگ برنگے کپڑوں میں تو وہ اور بھی جگمگاتا۔

برکتے نے اپنے ہیرے ایسے بیٹے کی قدر چاہے نہ کی ہو پر پھوپھی خوفناک حد تک اس کی گرویدہ ہو گئیں۔ جب تک منو گھر رہتا چہرے پر خوشی کھیلتی رہتی۔ پھوپھی کی خوشی اور عنایات اپنی جگہ تھیں پر منو میں اور ان میں فاصلہ برقرار رہا وہ اب بھی اونچے پر بیٹھتیں۔ منو نے گھٹنیوں چلنا سیکھ لیا اور جب کبھی وہ رینگتا ہوا ان کی طرف بڑھتا تو پھوپھی جلدی سے پیر سمیٹ لیتیں۔ منو حیران منہ کھولے ان کی طرف دیکھتا رہ جاتا۔ محبت کے یہ انداز اس کے ننھے سے دماغ کے لئے ناقابل برداشت تھے۔ اس کا حیرانی سے کھلا منہ اور آنسو بھری آنکھیں پھوپھی کو اپنی وضع داری سے ایک انچ بھی نہیں کھسکا سکی تھیں۔ سوری کے کپڑے کو اپنے سے دور ہی رکھنے کی قائل تھیں۔ یوں بہت دفعہ ہوا کہ منو ان کی اس ادا پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا ہو لیکن پھوپھی پسیجنے والی نہ تھیں۔ سوپی اداؤں والی دو رنگی دونوں میں قائم رہی۔

برکتے تو اب منو کی طرف سے بے فکر ہو گئی تھی۔ منو کو یونہی پھوپھی کی نگرانی میں چھوڑ کر وہ اور گھروں کے کام بھی نپٹا لیتی۔ سڑک پر نکل کر جا بجا جھنکاتی اپنی سکھیوں کے ساتھ ہنسی ٹھٹھول کرتی چلتی کہ نہ تو اس کی کمر پہ بوجھ ہوتا اور دونوں ہاتھ خوب ہلا ہلا کر بولتی کہ ان خالی ہاتھوں کا مصرف یہی تھا اور اسے یونہی ہاتھ چلا کر بولنے کی عادت تھی۔ منو گود میں ہوتا تو ایک ہاتھ خواہ مخواہ ہی رکتا۔ یہاں اب تو اطمینان رہتا کہ کبھی منو تو مزے میں

ہمکتا اور یوں وہ منو کو ہر روز پھوپھی کے دل بہلانے کو چھوڑ آتی۔ اور اسی اطمینان میں ایک دن یوں ہوا کہ وہ بخار میں پھنکتے ہوئے منو کو چادر میں لپیٹ کر اٹھا لائی آخر گھر پر بھی تو کوئی دیکھنے والا نہ تھا یہاں تو پھوپھی تھیں مہربان اور مشفق! گھر پہ بھلا کون تھا؟

برکتے نے چھوٹی سی توشک بچھا کر منو کو اس کی مخصوص جگہ پہ لٹا کر خوب اچھی طرح چادر لپیٹ دی۔

"بی بی جی منو آیا ہے" پھوپھی مسکراتی ہوئی ننگ کا سامان سنبھالے کرسی پہ آ بیٹھیں۔

"ارے منو تو سو رہا ہے؟"

"ہاں بی بی جی اسے بخار چڑھا ہوا ہے آج تو تیز ہے"

برکتے برآمدے کی سیڑھیاں تیزی سے طے کرتی ہوئی بولی اسے ویسے ہی دیر ہو گئی تھی آج اور ابھی اسے کتنے گھروں کے کام نپٹانے تھے۔

برکتے نے جھاڑو سنبھالی بڑے سے آنگن میں جھاڑو لگا کر پیڑوں کے سوکھے پتوں کے ڈھیر کے ڈھیر اٹھا کر پھینکے۔ پت جھڑ کا زمانہ تھا۔ درخت ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ اپنی ساری پونجی لٹائے دے رہے تھے سارے میں ان کی یہ دولت بکھری ہوئی تھی۔ ایک پیلا پھڑ پھڑاتا پتہ پھوپھی کے قریب آکر گرا انھوں نے چونک کر دیکھا منو ابھی تک سو رہا تھا۔ برکتے شاید غسل خانے میں تھی پانی کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کی جھاڑو کی شڑ شڑ بھی گونج رہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے آپا بی آج پھر دم ڈلوا کر ہاتھ روم دھلوا رہی ہیں۔ برکتے کو بھی کے کام میں اتنی دیر لگ گئی اب آپا بی اسے جلدی نہ چھوڑیں گی۔

برکتے نے ایک نظر منو پر ڈالی وہ ابھی تک سو رہا تھا اور وہ گیٹ کھول کر برابر کے مکان میں چلی گئی "آج بہن پر اتنی دیر لگ گئی" اس کی بڑبڑاہٹ پھوپھی نے سنی۔

پھوپھی خاموشی سے سوئیٹر بنتے بنتے تنگ آ چکی تھیں۔ ہواؤں کے شور کے ساتھ صحن میں پتے گر گر کر برکتے کی محنت پر پانی پھیر رہے تھے۔

نہ جانے کب پھوپھی کی نظریں منو پہ جا ٹکیں۔ بخار کی غفلت میں ہاتھ مار کر منو نے چہرے پر سے چادر ہٹا دی تھی ایک ہاتھ سینے پر رکھے وہ بے ہنگم سی سانسیں لے رہا تھا۔ اس کا چہرہ بخار کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھول ایسا چہرہ کھلا کر اور بھی زیادہ معصوم لگ رہا تھا۔ بڑا کا

عادل رشید

عزت

کبھی تم نے کسی کے جوڑے میں پھول لگائے ہیں؟

وہ اُس کے بالکل ہی قریب آ کر اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اُس نے اپنے ٹورسٹ گائیڈ کو ہزار جان سے قربان ہو جانے والی نظروں سے دیکھا اور بڑی ادا سے مسکرا کر کہا۔

"تم پھولوں کا یہ گچھا میرے بالوں میں لگا دو"

"جی"۔ وہ ایکدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور سہمے ہوئے انداز میں بولا۔

"میں بہت غریب ہوں میم صاحب۔ پھول آپ خود اپنے بالوں میں لگا لیجئے۔"

پہلگام سے چندن واڑی تک راستہ اتنا خوبصورت تھا کہ نلنی کی آنکھیں چکا چوندھ ہو اٹھیں۔ وہ ان حسین نظاروں کو اپنی آنکھوں میں جذب کر لینا چاہتی تھی۔ وہ ان حسین نظاروں پر قربان ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بے اختیار پکار اٹھی۔

"سچ ہی تو ہے" اس نے اپنے پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھرنے کے لئے ایک لمبی سانس لی اور پھر اپنے پھیپھڑوں کی اس تازہ ہوا کو باہر خارج کرتے ہوئے وہ مدہوشی کی حالت میں بولی "کشمیر واقعی جنت ہے"۔

رہ رہ کر یہ سرسبز میدان اور جھیلیں رومانی لگ رہی تھیں جیسے کسی نے اس کے اوپر جادو کر دیا ہو۔ وہ بہت بار ان راستوں سے گزر چکی تھی۔ اور اب وہ سبز گھاس سے ڈھکے مرگ کا راستہ بڑے والہانہ انداز میں طے کر رہی تھی۔ سب سے آگے راجیش تھا۔ نلنی کا شوہر جس کی عمر پینتالیس سے اوپر تھی۔ اس سے پیچھے جگدیش تھا۔ چالیس کے قریب کا ایک بدنما سا موٹا سا آدمی۔ یہ فلم پروڈیوسر اور ڈائرکٹر تھا۔ اور یہ موٹا بھدا اور بدنما سا آدمی جگدیش نلنی سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرتا چل رہا تھا۔ وہ نلنی سے اس انداز میں باتیں کر رہا تھا جیسے کہ وہ بھی بیس اکیس سال کا ایک نوجوان ہو۔ وہ دونوں تقریباً ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ نلنی ذرا سا آگے تھی اور وہ ذرا سا پیچھے تھا۔ اور ان کے پیچھے ان کا ٹورسٹ گائیڈ تھا۔ بائیس سال کا ایک کشمیری نوجوان گٹھا ہوا مضبوط جسم، گورا چٹا رنگ، سیاہ چمکیلے اور گھنے بال، بڑی بڑی خمار آلود مقناطیسی آنکھیں، چوڑی پیشانی، چوڑا سینہ اور موزوں قد۔

یہ سب کے سب ٹٹوؤں پر سوار تھے اور یہ حسین راستہ طے کر رہے تھے۔ راستے کے دونوں طرف چیل اور دیودار کے گھنے جنگل تھے اور تمام راستہ حسین رنگا رنگ کے پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ ماحول حسین تھا اور ہواؤں میں خمار تھا، مستی تھی اور توانائی تھی۔ ایک ایسی توانائی تھی اس ماحول اور ان ہواؤں میں کہ بیمار سے بیمار آدمی بھی توانا اور تندرست ہو جائے۔

"اگر میں نے تمہاری اس فلم میں ہیروئن کا رول نہ لیا ہوتا تو سخت قسم کی حماقت کی ہوتی"۔ نلنی جذبات میں ڈوب کر بولی۔

"میرا جی بھی یہی چاہتا ہے" جگدیش بولا۔ "تم پہ مر مٹنے اور قربان ہو جانے کا میرا ارمان یہاں آ کر اور زیادہ جوان ہو گیا ہے"۔

"تم کو ہر وقت یہی سوجھتی ہے"۔ نلنی نے اپنا چہرہ دائیں طرف گھما کر جگدیش کو اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ "بدنیت زمانہ بھر کے"۔

"یہی میری بدنیتی تو در اصل میری زندگی ہے"۔ جگدیش مسکرایا۔ "جس دن میری یہ بدنیتی ختم ہو گئی ۔"

نلنی نے بات کاٹی۔ "تم فلمیں بنانا چھوڑ دو گے"۔ وہ مسکرائی۔ "یہی نا"

"بہت تھوڑی بات۔" وہ مسکرایا۔ "میں اس دن خودکشی کر لوں گا۔" اس نے اپنا ادھورا فقرہ پورا کر دیا۔ نلنی نے مسکرا کر اسے پھر دیکھا۔ بولی: "ارے ناجیش کہاں رہ گئے ہو؟"

"وہ ایک سمجھدار شوہر ہیں تمہارے۔" جگدیش نے جواب دیا۔ "وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ایک ایکٹریس کی بیوی کے شوہر کو کس طرح رہنا چاہئے۔ ورنہ وہ اپنی پہلی بیوی اور اپنے جوان جوان بچوں کو وطن میں رکھ کر تم جیسی نوخیز کلی سے بیاہ ہی کیوں رچا لیتے۔ اگر انہیں تمہارے ساتھ سائے کی طرح لگا رہنا ہوتا تو۔ بڑا ہوا نے تاڑ لیا ورنہ تم آج تک ایکسٹرا ایکٹریس ہی بنی رہتیں اور وہ ایکسٹرا سپلائر۔ آگے تم میں سے کوئی نہ بڑھتا۔ اور اب"

"اچھا اچھا بکومت۔" نلنی زیر لب مسکرائی۔ "اور ادھر دیکھو اس جھیل میں۔ وہ سرخاب اپنا سر اونچا کر کے کیا دیکھ رہا ہے؟"

"وہ اپنی مادہ کو دیکھ رہا ہے کہ وہ کہاں گئی۔" جگدیش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ ایکٹریس بیوی کا شوہر نہیں ہے بیچارہ۔"

"جگدیش۔" نلنی چڑ گئی۔ "تم میری اور میرے پتی دونوں کی توہین کر رہے ہو۔"

"لیکن وہ ایسا نہیں سمجھتے۔"

"کیوں؟"

"ایکٹریسوں کے شوہر۔" اور وہ زور زور سے قہقہہ لگانے لگا۔

ڈل کی سطح پہ ایک بجرا تیر رہا تھا۔ نلنی اپنے ٹورسٹ گائیڈ کے ساتھ بجرے پر سیر کر رہی تھی۔ انتہائی حسین اور پُرکیف منظر تھا۔ یہ جھیل ڈل کے دونوں طرف نرسری کے پودے جھوم رہے تھے۔ چنار کے درختوں کا سایہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ عشق پیچاں کی بیلیں جگہ جگہ لہرا رہی تھیں۔ بنفشہ کے پھول جگہ جگہ کھلے ہوئے تھے اور یہ پورا ماحول گل ہائے رنگا رنگ سے کیف جاں بنا ہوا تھا۔ نلنی اپنے ٹورسٹ گائیڈ پہ اپنی نظریں جمائے اسے بغور تک رہی تھی۔ وہ جیسے اپنی نظروں ہی نظروں میں اسے اپنے دل میں اتار لینے کے لئے بیقرار ہو۔ آخر کار اس کے لب کھلے۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں حضور۔" وہ بولا۔ "میں کچھ نہیں سوچ رہا۔"

"لیکن میں سوچ رہی ہوں۔"

وہ خاموش رہا۔ نلنی بولی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ میں کیا سوچ رہی ہوں؟"

"ہم غریب لوگ بڑے آدمیوں سے یہ کبھی نہیں پوچھتے کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں سرکار۔"

وہ چند لمحے رک کر بولی: "تمہیں یہ ماحول کیسا لگ رہا ہے۔ ہمیرا مطلب ان حسین اور مست کر دینے والے نظاروں سے ہے۔"

"یہ نظارے میرے روز کے دیکھے ہوئے ہیں صاب۔" گائیڈ بولا۔ "اور پھر ہم غریب لوگ صرف اپنا پیٹ دیکھتے ہیں مالک۔ اپنی غربت، اپنی مفلسی اور اپنی بھوک کے علاوہ ہماری نظروں میں اور کچھ نہیں ہوتا۔"

"پیٹ کی بھوک کے علاوہ بھی کوئی اور بھوک ہوتی ہے؟"

"ہوتی ہوگی۔" وہ درد کے ساتھ بولا۔ "لیکن وہ بھوک ہم غریبوں کو نہیں لگتی۔"

"پھر کسے لگتی ہے وہ بھوک؟"

"جن کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔"

"ہوں۔" وہ کچھ نہ بولی۔

ملاح نے کشتی کنارے لگا دی۔ وہ اتری۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا ٹورسٹ گائیڈ بھی اس کے پیچھے پیچھے اترا۔

"کتنا حسین منظر ہے یہ۔" نلنی اپنے بازوؤں کو ہوا میں اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ "جی چاہتا ہے ہم مر جائیں۔"

اور پھر وہ ایک مست و بے خود ہرنی کی طرح کلیلیں کرتی ہوئی دوڑ بھاگتی چلی گئی۔ وہ شاہ بلوط کے ایک درخت کی جڑوں پہ بیٹھ گئی۔ اس کا گائیڈ اس سے کچھ ہی دور پر کھڑا تھا۔

"لدر کا حسن دیکھا ہے تم نے؟"

"میں اس جھرنے کی جلتی بچپن سے دیکھتا آیا ہوں میم صاب۔"

"اور یہ ڈل جھیل؟"

"اسے بھی۔"

"یہ جھرنے، یہ جھیل، یہ شاہ بلوط کے درخت، یہ نرسری کے پھول

ان کی مست جھومتی ہوئی ڈالیاں، اور یہ چنار کے گھنے سائے۔ یہ عشق پیچاں کی نرم نازک کلیاں، یہ بنفشے کے پھول، یہ تم سے کچھ نہیں کہتے۔"

"کہتے ہیں میم صاب"

"وہ یکبارگی اٹھ کھڑی ہوئی۔"

"کیا کہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں کہ تم جو یہاں کے باسی ہو، غربت میں پیدا ہوئے ہو، غربت میں بڑے ہوئے ہو، اور جوان ہوئے ہو۔ پھر بوڑھے ہو جاؤ گے۔ اسی مفلسی میں اور پھر اسی بیکسی کی موت سے ایک دن مر جاؤ گے۔ اور یہ صدیوں سے ہم ہر ایک سے یہی کہتے چلے آئے ہیں۔"

"تم بہت بڑے بیوقوف ہو" نلنی بیزاری سے منہ بنا کر بولی۔

"روٹی سے آگے بھی کچھ سوچا کرو۔ یہ بھوک بھوک کیا لگا رکھا ہے تم نے"

"اس لئے کہ یہ آپ کو نہیں ہمیں لگی ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دے کر بڑے والہانہ انداز میں حسین پھولوں کا ایک گچھا توڑ لیا۔ وہ مسکرائی۔

"کیا سوچ رہے ہو" نلنی نے پوچھا۔

"جی کچھ نہیں" گائیڈ بولا۔

"کبھی تم نے کسی کے جوڑے میں پھول لگائے ہیں؟" وہ اٹھلاتے ہوئے انداز میں شوخیاں اور دل ربائیاں بکھیرتی ہوئی اس کے بالکل ہی قریب آ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے ٹورسٹ گائیڈ کو ہزار جان سے قربان ہو جانے والی نظروں سے دیکھا۔ وہ بڑی اداؤں کے ساتھ مسکرائی "تم پھولوں کا یہ گچھا میرے بالوں میں لگا دو۔"

"جی۔" وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "پھول آپ خود سے اپنے بالوں میں لگا لیجئے۔" وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ "میں بہت غریب ہوں میم صاب"۔ اس کی آواز میں لجاجت اور بے بسی تھی۔

اس کی تیوریوں پر غصہ کی نہیں بلکہ ٹھٹکنے والے انداز کی پیار بھری شکنیں پڑ گئیں۔

"تم کیسے بدھو ہو جی" وہ مسکرانے لگی "کیا غریب آدمی کسی عورت کے بالوں میں پھول نہیں لگا سکتے"۔ اس نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ "لگاؤ یہ پھول میرے بالوں میں۔"

وہ پھولوں کے اس حسین گچھے کو اس کے ہاتھوں میں تھما کر بڑی تیزی سے اس کی طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کے سینے تک کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے جسم، اس کے کپڑوں اور اس کے بالوں سے بھینی بھینی خوشبوؤں کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ اس کے ٹورسٹ گائیڈ کا جو کہ نوجوان تھا اور خوبصورت تھا دم سا گھٹنے لگا۔ اس نے اس کے بالوں میں پھول لگا دیئے لیکن اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔

"لگا چکے تم پھول؟"

"کتنے اچھے ہو تم" اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے گھما کر اپنی گوری گوری گداز اور حسین بانہیں اس کی گردن میں اتنی پھرتی سے ڈالیں کہ اسے پیچھے ہٹنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ اپنی مخمور آنکھیں بند کر کے جیسے کہ خواب میں بڑبڑائی۔

"تم کتنے اچھے اور کتنے خوبصورت ہو میرے نوجوان کشمیری۔ تم تو میری زندگی کے ان حسین خوابوں کی زندہ تعبیر ہو۔ میرے گائیڈ جنہیں میں اپنی الھڑ عمر سے لے کر آج تک دیکھتی چلی آ گئی ہوں۔"

اس نے اپنی گداز بانہوں کا حلقہ اور تنگ کر دیا۔

"تم اگر نہ ہوتے تو کشمیر کی یہ حسین اور گل پوش وادیاں کبھی نہ ہوتیں۔ تمہارے ساتھ رہ کر یہ نظارے میری نظروں میں اور بھی وہ حسین ہو گئے ہیں۔"

وہ یکبارگی اس کی بانہوں کو جھٹک کر اس سے الگ ہو گیا۔ وہ اپنی بے ترتیب سانسوں کے درمیان بولا۔

"غریبوں کے صبر اور ضبط کو آپ جیسے پیسے والے ہر ڈھنگ سے آزمانے کی کوشش نہ جانے کب تک کرتے رہیں گے۔" وہ کرب کے ساتھ بولا۔ "نہ جانے آپ جیسے پیسے والوں نے ہم غریبوں کو بے جان کھلونا کیوں سمجھ رکھا ہے۔"

وہ انتہائی تکلیف سے بولا۔ "میں ٹورسٹ گائیڈ ہوں میم صاب۔ کھلونا نہ سمجھئے مجھے۔"

نلنی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ "تم بے وقوف ہو۔"

وہ اپنی بانہیں سنبھال رہی تھی جو گائیڈ کے جھٹکے کی تاب نہ لا کر سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ جذبات سے بے قابو ہو کر بولی۔

"ہم تم پر مرتے ہیں۔ تم ہمیں بہت اچھے لگتے ہو۔ ہم تمہارا ساتھ

روپوں سے بھر سکتے ہیں۔

"دنیا کی ہر چیز نوٹوں سے نہیں خریدی جا سکتی میم صاب" وہ بولا "سونے چاندی کے ڈھیر بھی دلوں کو نہیں جیت سکتے۔"

"لیکن ہم تمہیں دل سے چاہنے لگے ہیں" اس کی آواز میں تمنائیں تھیں اور التجا تھی۔

"چاہے جانے کے لئے ایک دل بہت کافی ہوتا ہے میم صاب" وہ رک کر بولا۔ "اور ایک دل ایسا ہے جو مجھے چاہتا ہے۔"

"کس کا دل ہے وہ؟"

"میری منگیتر کا دل میم صاب" وہ قدرے حقارت سے بولا۔ "اور وہ دل ہے جو آپ کے دل کی طرح ہر کسی کو نہیں چاہتا ہے۔"

"میرا دل بھی تمہارے سوا کسی کو نہیں چاہتا ہے۔ وہ تمہیں چاہنے لگا ہے"

"اور وہ راجیش بابو؟"

"وہ میرا شوہر ہے اور بس۔ میرا دل اسے چاہتا نہیں ہے۔"

"اور وہ جگدیش بابو — جن سے آپ پیار و محبت کی باتیں کرتی ہیں؟"

"وہ فلم کا ڈائرکٹر اور پروڈیوسر ہے۔ میں اسے خوش رکھ کر اپنا کام نکالتی ہوں۔ چاہتی نہیں ہوں میں اسے۔"

"آپ کیسے کیسے خوش رکھ کر اپنا کام نکالتی ہیں میم صاب؟"

اور وہ اپنے اس کشمیری ٹورسٹ گائیڈ کی اس گرفت پر تلملا کر رہ گئی اس کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"جب سے میں یہاں شوٹنگ کے لئے آئی ہوں میرا جی چاہتا ہے کہ میں تم پر اپنا سب کچھ قربان کر دوں۔ تم میرے ساتھ بمبئی چلو۔ میں تمہیں فلم کا ہیرو بنوا دوں گی۔ تم ہماری فلموں کے کسی بھی ہیرو سے زیادہ پرکشش اور خوبصورت ہو۔"

"اور میں اپنی ہونے والی دلہن کا کیا کروں میم صاب؟"

"میں اسے بھی فلم کی ہیروئن بنوا دوں گی۔"

"اور پھر وہ بالکل آپ کی طرح بن جائے گی۔" وہ طنزاً بولا۔ "کیوں ہے نا میم صاب؟"

"بالکل میری طرح سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"یعنی یہ کہ جیسی آپ ہیں۔" وہ بولا۔ "لیکن معاف کیجئے گا میم صاب۔ میں آپ کے شوہر راجیش بابو کی طرح کبھی نہ بن سکوں گا۔"

"پاگل ہو تم۔" تلنی چسڑ گئی۔

"اگر میں اس لئے پاگل ہوں کہ میں آپ کے شوہر جیسا نہیں سکتا تو مجھے اپنے پاگل ہونے پر کوئی شرم نہیں میم صاب۔"

"تم خوبصورت ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ احمق بھی ہو۔"

وہ اس کے نزدیک آگئی اور بڑے پیار سے بولی۔

"تم — کاش کہ تم میرے ہوتے۔"

اس نے اپنے بازوؤں میں منہ چھپا لیا۔ بڑی اداؤں کے ساتھ مسکرائی وہ اسے اپنی مسکراتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"جانتے ہو تم بدھو داس۔ ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں نوجوان مجھے صرف ایک نظر دیکھ لینے کے لئے تڑپا کرتے ہیں۔"

"جانتا ہوں میم صاب" وہ اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کے درمیان بولا۔ "مجھے سب معلوم ہے۔"

"خاک معلوم ہے تمہیں۔"

"خاک میری قسمت جو ہے حضور۔"

"تم جیسے اپنا مقدر آپ بنانا نہیں جانتے۔"

"یہ سچ ہے میم صاب" وہ یکبارگی بولا۔ "آئیے ہم واپس چلیں۔" اسے اس کے ساتھ بہت زیادہ دیر تک اکیلے رہنے سے اب گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

"وہاں صاب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"وہ صاحب لوگ میری مرضی کے غلام ہیں میں اُن کی مرضی کی غلام نہیں ہوں۔ میں جو چاہے کروں انہیں کیا۔"

"اچھا" وہ مری ہوئی آواز سے بولا۔ "اب کہاں چلیئے گا؟"

"جہاں تم مجھے لیجانا چاہو" وہ ایک ادائے دلبری کے ساتھ بولی۔ "میں تمہاری کنیز ہوں۔"

وہ سٹ پٹا گیا۔ بولا۔ "تو پھر چلیئے ہم اچھل بل کے ڈاک بنگلے واپس چلیں —"

"وہاں کیا دھرا ہے" وہ بیزارگی سے بولی۔ "ہم ابھی یہیں گھومیں گے۔ میں ذرا جھیل میں نہاؤں گی ابھی۔" اور یہ کہہ کر وہ چنار کے ایک جھنڈ میں غائب ہو گئی۔ وہ اس کا محافظ اس کا ملازم تھا سمجھا اسے بھی اس کے پیچھے جانا پڑا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہ راستہ خود رو پودوں اور جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ چنار کے درختوں کے جھنڈ میں دور تک چلی گئی۔ یہ انتہائی گھنا جنگل تھا اور باہر کی کوئی چیز یہاں سے نہیں آ رہی تھی۔ وہ ایک جگہ گرتے گرتے بچی۔ اس کے ٹورسٹ گائیڈ نے اسے بچا لیا تھا وہ اس سے دیوانہ وار لپٹ گئی تھی۔ نلنی کے بچانے کی کوشش میں گائیڈ کا ہاتھ اس کی کمر کے گرد حائل ہو گیا تھا۔ وہ دونوں باہر نکل ہی رہے تھے کہ نلنی نے مچل کر اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ وہ دونوں گرد میں گر گئے۔

وہ نلنی کے اس اچانک بوجھ کو نہ سنبھال سکا تھا ——

نلنی اسے اپنی مسکراتی ہوئی نا تمام نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ اس سے کچھ ہی دور ملائم فرش پر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپائے بیٹھا تھا۔

”تم سدا کے لئے مجھے اپنے گلے کا ہار بنا لو میرے ٹورسٹ۔“ وہ جیسے نشہ میں بول رہی تھی۔

وہ یکبارگی جھنجلا گیا۔ اس نے اپنے چہرے پر سے دونوں ہاتھ ہٹا لئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ وہ رو رہا تھا۔ اتنی دیر سے اس کا چہرہ اس کے اپنے آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ کرب کے ساتھ بولا۔

”مجھے آپ نے جہنم میں دھکیل دیا ہے۔ اب میں منہ کیسے دکھا سکوں گا۔ کسے۔“! وہ اس پہ قربان ہوتے ہوئے بڑی اداؤں اور نزاکتوں کے ساتھ بولی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ”تم کسے منہ نہیں دکھا سکو گے؟“

”اپنی منگیتر، اپنی ہونے والی دلہن کو۔“

وہ انتہائی معصومیت اور بھولے پن سے بولا۔ اور پھر سے اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان اپنا منہ چھپا کر رونے لگا۔ اب وہ سسکیوں سے رو رہا تھا اور نلنی اسے انتہائی تعجب، حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

”ارے۔“ اس نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ”تم کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے کیا ہو گیا تمہیں؟“ وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

”میم صاحب! اب میں اپنی منگیتر کو کیسے منہ دکھا سکوں گا۔ میں اس کے لائق نہیں رہا۔ میری عزت لٹ گئی۔“

”کیا کہا۔ عزت لٹ گئی! —— کیا مردوں کی بھی عزت لٹتی ہے؟“ نلنی نے قہقہہ لگا کر پوچھا۔

”ممکن ہے آپ کی دنیا میں مردوں کی عزت نہ لٹتی ہو لیکن ہماری دنیا میں لٹتی ہے۔“

اس کی بات سن کر نلنی ہنسی۔ وہ بڑی لاپرواہی کے ساتھ اس کے سامنے ہی اپنے کپڑے ہوا میں سکھانے لگی اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔

یہ ڈم ڈم ایئرپورٹ تھا۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

”میں تمہیں اپنی زندگی میں کبھی نہ بھول سکوں گی۔“ اس نے اس کی مٹھی میں سو سو کے کئی نوٹ پکڑا دیئے اور پھر وہ بیقراری سے بولی۔

”اچھا اب میں جا رہی ہوں۔ وہ دیکھو میرے ساتھی ہوائی جہاز میں سوار بھی ہو گئے۔ اب کچھ ہی دیر میں جہاز کی سیڑھی بھی ہٹا دی جائے گی۔“

اس نے جاتے جاتے گھوم کر اسے ایک نظر اور دیکھا۔ اور اب وہ بڑے تیز تیز قدموں سے تقریباً بھاگنے والے انداز میں جہاز کی طرف جا رہی تھی۔ لوگ اسے دیکھ کر حواس باختہ ہوئے جا رہے تھے۔ وہ اُن کی دل پسند ہیروئن تھی۔ دیکھنے والوں کی نظریں اسے دیکھ کر جھکنے لگی تھیں۔

اور وہ اس جگہ بُت کی طرح کھڑا اسے نفرت اور حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سو سو کے وہ کئی نوٹ اس کی مٹھی میں کاغذ کا ایک گولا بن گئے تھے۔

اور پھر جہاز ہوا میں ایک عجیب قسم کے شور کے ساتھ معلق ہو گیا۔ وہ تیزی کے ساتھ اڑا چلا جا رہا تھا۔ اور وہ اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ہوائی جہاز کے اس شور سے کہیں زیادہ شور سمایا ہوا تھا۔ اس نے رن وے پر ایک حقارت بھری نظر ڈالی —— وہ مری ہوئی چال کے ساتھ ایئرپورٹ سے لوٹ رہا تھا۔

تلخیص و ترجمہ ایوب جوہر　　　　بنگالی کہانی

چڑیاں

ریلوے اسٹیشن پر لوگ پیسے پیسے پر دھیان نہیں دیتے بلکہ جلدی جلدی پیسے پھینک کر کسی صورت اپنی جان چھڑا کر ٹرین کے ڈبوں میں بیٹھ جانا پسند کرتے ہیں۔ انہیں پہلی فکر ڈبے میں داخل ہونے کی، دوسری فکر بیٹھنے کی جگہ بنانے اور تیسری فکر موقع ملے تو سونے کی جگہ بچھا لینے کی ہوتی ہے۔ اتنی فکریں ہوتے ہوئے دو چار آنے کی کون پرواہ کرتا ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ پاکستان کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا اور غیر ملکی آقاؤں نے تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے بیکاری میں اضافہ کر دیا تھا۔ روز بروز بیکار لوگوں کی فوج بڑھتی جا رہی اور ملازمتیں عنقا ہوتی جا رہی تھیں۔

میں نے بی اے فرسٹ ڈویژن میں کیا تھا۔ توقع تھی کہ فرسٹ ڈویژن کی وجہ سے معقول ملازمت دوسروں کے مقابلہ میں مجھے آسانی سے مل جائے گی۔ چنانچہ میں نے ابتدا میں افسر بننے کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے۔ لیکن جب یہ خواب چکنا چور ہو گئے تو پھر میں نے کلرکی کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ خیال تھا کہ کلرکی ملنا کوئی دشوار کام نہیں ہے لیکن مہینوں گزرنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ کلرکی ملنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے کیونکہ ملازمت کے بازار میں ڈگری یا فرسٹ کلاس کے بجائے سفارش سکہ رائج الوقت تھی۔ یوں تو ملازمت کے سلسلہ میں آئے دن نئی نئی خبریں سننے میں آتی تھیں کہ فلاں جگہ فلاں اسامیاں خالی ہیں اور تعلیمی قابلیت صرف میٹرک ہے۔ لیکن ان خالی اسامیوں کے لئے کسی بڑی اور زوردار سفارش کی ضرورت تھی۔ اس معاملہ میں اپنا یہ حال تھا کہ کوئی موٹی تازی صحت مند ہاتھی جیسی سفارش تو درکنار کوئی مریل، کمزور، ٹوٹی پھوٹی سفارش بھی اپنے پاس نہیں تھی۔ جب تقریباً سال بھر انگریزی اخبارات میں (وانٹیڈ) کے اشتہارات پڑھتے پڑھتے نظریں تھک گئیں اور دفتروں کی خاک چھانتے چھانتے واقعی جوتے گھس گئے تو ایک دن مجبوراً ملازمت کے تصور کو ذہن سے جھٹک دیا لیکن سوال یہ تھا کہ شہر میں رہیں یا گاؤں میں آخر کھائیں گے کہاں سے۔ آخر بہت سوچ بچار اور بازار کے چکر لگانے کے بعد میں نے سوچا کہ میں چڑیاں بیچنے کا دھندا شروع کر دوں۔ اس کاروبار میں اول تو زیادہ سرمائے کی ضرورت نہیں دوسرے اس کے گلی گلی کوچے کوچے پھر کر چڑیاں بیچنا کوئی دشوار کام معلوم نہیں ہوا جہاں تک پوزیشن کا سوال تھا تو صاحب جہاں پیٹ اور بھات کا مسئلہ درپیش ہو وہاں اپنی پوزیشن کون دیکھے۔ چنانچہ میں نے فوراً ایک عزیز سے بیس روپے لے کر ایک بڑے چڑیا فروش سے دو چار طوطے اور کچھ مینائیں خریدیں اور پھر اللہ کا نام لے کر کوچوں میں آواز لگانی شروع کی۔ چڑیا چاہئے۔ چڑیا . . . .

میں نے کوئی محلہ کوئی کوچہ نہیں چھوڑا۔ دو چار دن حوصلہ بھی برقرار رکھا لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ پیشہ کوئی خاص منفعت بخش نہیں ہے۔ پھیری لگانے کے باوجود چڑیوں کے بدلہ سے دو وقت کا کھانا ملنا آسان نہیں ہے کیونکہ چڑیوں کے خریدار دال چاول کی طرح چڑیاں خریدنے کے لئے مجبور نہیں ہیں یہ تو شوق کی چیزیں ہیں، اور اس قسم کا شوق اس وقت ہوتا ہے جب بھات اور دال کا مسئلہ آسانی سے حل ہوتا رہے۔ پھیری کرنے کے بعد پتہ چلا کہ نوے فیصد انسان اسی بھات اور دال دیا کے مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی میں نے ہمت نہیں ہاری کیونکہ مجھے بھی تو پیٹ کے لئے کچھ کرنا ہی تھا، لہٰذا مجبوراً اسی پیشہ کو اختیار کئے رہا۔ چوں دو

وقت کا کھانا نہ سہی ایک وقت کا ہی سہی۔

لیکن ایک دن اچانک مجھے اپنی قسمت کے دروازے کھلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس دن کا واقعہ مجھے آج بھی اسی طرح یاد ہے جیسے یہ واقعہ ابھی ابھی ظہور پذیر ہوا ہو،

اس دن میرے دل میں نہ جانے کیوں یہ بات سمائی کہ محلے محلے اور گلیوں گلیوں میں پھیری لگانے سے کیا فائدہ؟ یہ محلے اور گلیوں والے پیسے پیسے پر جان دیتے ہیں ان لوگوں سے سودے بازی مشکل ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ ریلوے اسٹیشن کا ہی چکر لگایا کروں، کیوں کہ یہاں یہ لوگ پیسے پیسے پر جان نہیں دیتے بلکہ جلدی جلدی پیسے پھینک کر کسی صورت اپنی جان چھڑا کر ٹرین کے ڈبوں میں مقید ہونا پسند کرتے ہیں انہیں پہلی فکر ہوتی ہے ریل کے ڈبے میں داخل ہونے کی، دوسری فکر بیٹھنے کی جگہ بنانے کی اور تیسری فکر موقع ملے تو سونے کی جگہ ہتھیا لینے کی، پھر اتنی ساری فکروں میں دو چار آنے کی کون فکر کرتا ہے، وہاں تو صرف دو باتیں ہوتی ہیں، اگر چیز پسند آئی تو فوراً پوچھا

کو تو دام؟ (کتنی قیمت؟)

اِتو دام (اتنی قیمت)

اور دوسرے ہی لمحے خریداروں کے ہاتھ جیب سے نکلتے ہیں اور چیز خریدی جاتی ہے، لہٰذا ان تمام دلائل کے مدِنظر مجھے فوراً خیال ہوا، بس اب اسٹیشن کی طرف ہی چلوں اور پھر میرے گھر سے اسٹیشن کوئی خاص دور بھی نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک میل کا فاصلہ تھا۔ میں اسٹیشن کی طرف چل پڑا، اس دن میرے پاس صرف دو مینائیں اور تین طوطے تھے، لیکن میں ان کا بھی پیٹ بھرنے سے قطعی معذور تھا، وہ بھوک کے مارے بُری طرح چیخ و پکار میں مصروف تھے اور اپنی حالت بھی ایسی ہی تھی، بھوک کی شدت سے پیٹ میں جان ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے پیٹ میں زخم پڑ گئے ہوں بدقت تمام میں سوکھے ہوئے گلے کی نحیف آواز سے پھیری لگاتا ہوا اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگا،

چڑیا چائی؟ ٹیاں چائی؟ مینا چائی؟ .....

میں آواز لگاتا ہوا پلیٹ فارم کے اندر داخل ہوا، یہاں جھلملاتی ہوئی روشنیوں میں اچانک میں چندھیا سا گیا، اور ایک لمحہ کو بھانت بھانت کے تمام مسئلے کو دور کر کے میں ان روشنیوں کو میٹھی نظروں سے گھورنے لگا اسی لمحہ میرے عقب سے ایک آواز ابھری،—

"اے چڑیا والا"—

اس آواز پر میں یوں اُچھلا جیسے مجھ میں اسپرنگ فٹ ہوں۔

میرے سامنے ایک ہندوستانی صاحب بڑی قیمتی سوٹ میں ملبوس کھڑے مجھے گھور رہے تھے،

"شاب ہام کو بولایا؟؟"—

"ہاں تم ہمارا ساتھ آؤ"— صاحب نے اشارہ کرتے ہوئے مجھے پیچھے پیچھے آنے کے لئے کہا،

"چڑیا لے گا شاب"— میں نے خوشی کے مارے پھر دریافت کیا،

ہاں، ہاں — صاحب نے کچھ اکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے کہا اور آگے کی طرف بڑھ گئے، اس وقت پلیٹ فارم نمبر ۳ پر ایک گاڑی آکر کھڑی ہو گئی مسافر ٹرین تبدیل کرنے کی خاطر جلدی جلدی دوڑ رہے تھے الغرض میں صاحب کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے قریب آکر رک گیا، صاحب بھی رُکے اور پھر انہوں نے رازدارانہ طور پر مجھ سے کہا

اے چڑیا والا تم ہمارا ایک کام کرو گے؟"

کیا کام شاب؟ میں نے کچھ سہمے ہوئے لہجہ میں پوچھا،

"دیکھو اس کمرہ کی کھڑکی کے پاس جا کر چلاؤ، چڑیا چائی، چڑیا"

"او ای پاکھی کین بین؟" (وہ چڑیا خریدیں گے؟) میں نے پوچھا

"ہاں خریدے گا"— صاحب نے مختصر جواب دیا، اور میرے قریب ہی کھڑے ہو گئے،

میں نے کمپارٹمنٹ کے اندر ایک نظر ڈال کر دیکھا، اور پہلی نظر میں ہی یہ تاڑنے میں کامیاب ہو گیا، کہ اس فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں جو واحد مسافر ہے وہ یقیناً کوئی بڑا آدمی ہے اگر جو پھنس جائے تو اپنے وارے نیارے ہو سکتے ہیں، لیکن دوسرے لمحے یہ دیکھ کر مجھے کچھ مایوسی ہوئی کہ کمپارٹمنٹ اس کے خراٹوں سے گونج رہا تھا، بالکل اس طرح جیسے مسلسل ریل کے انجن کی سیٹی بجتی چلی جاتی ہو، میں نے سوچا یہاں چلانا اور آواز لگانا بیکار ہی ہے، یہ سوچ کر میں مایوس ہو کر پیچھے کی طرف پلٹا۔

لیکن صاحب نے مجھے پلٹتے دیکھ کر فوراً ہی ہاتھ کے اشارے سے کہا،

"چلاؤ، چلاؤ، چپ کیوں کھڑے ہو؟"

"چڑیا چاہئی شاب! چڑیا چاہئی شاب؟" ـــــ صاحب کے اشارے پر کچھ نہ سمجھ کر بھی زور زور سے چلاتا رہا،

لیکن وہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے اور مسلسل خراٹوں کی آواز گونجتی رہی، میں نے ایک بار پھر مایوس ہو کر پیچھے کی طرف پلٹنا چاہا، لیکن اس صاحب نے ایک بار پھر سے گھور کر دیکھا اور ہاتھ سے آواز لگانے کا اشارہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر غصہ آگیا کہ یہ کیا مذاق ہے۔ یہ شخص خواہ مخواہ مجھے پریشان کر رہا ہے۔ پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ چلو اگر کسی صورت دو تین چڑیاں بھی بک گئیں تو اس مرغی اسامی سے دو وقت کے کھانے کا پیسہ تو مل ہی جائیگا

اس خیال کے آتے ہی میں پھر آگے کی طرف بڑھا اور اس بار اپنی پوری قوت مجتمع کر کے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانا شروع کر دیا،

"چڑیا لے گا شاب، چڑیا ـ چڑیا چاہئی ـــ چڑیا" ـــ

اور اس طرح تقریباً دس منٹ گلا پھاڑنے کے بعد مجھے امید کی جھلک دکھائی پڑی۔ وہ صاحب کسمساتے ہوئے پلٹے، میں نے انہیں اپنی طرف پلٹتے دیکھ کر فوراً ہی مزید ایک وار کیا۔

"چڑیا لے گا شاب، خوبصورت والا چڑیا، اچھا والا چڑیا" لیکن دوسرے لمحے انہیں دیکھ کر میں بری طرح گھبرا گیا۔ دیو ہیکل چہرہ، اور پہاڑ جیسی جسامت لئے ہوئے جب وہ صاحب میری طرف پلٹے اور پلٹتے ہی جو صلواتیں سنانی شروع کیں تو میری سٹی گم ہو گئی۔ ذلیل۔ کتے۔ بدمعاش اور پھر انہوں نے مسلسل ٹرین کی رفتار سے گالیاں بکنا شروع کیں۔ اس ماحول میں میں چڑیاں کیا بیچتا، دبک کر دس قدم پیچھے ہٹ گیا، اور پھر وہ صاحب ان صاحب پر الٹ گئے جنہوں نے مجھے ترغیب دی تھی، میں دور کھڑا تماشا دیکھتا رہا، آخرکار کسی صورت ان کی گالیوں کا ذخیرہ ختم ہوا اور وہ باتھ روم میں چلے گئے اور مجھے حکم دینے والے صاحب جلدی سے میری طرف آئے اور چپکے سے دس روپے کا ایک نوٹ مروڑ کر میری طرف بڑھایا،

"لو بھئی چڑیا والا" ـــــ دس کا نوٹ پا کر میرا غصہ ٹھنڈا ہوا، پھر میں نے اُن سے پوچھا،

"کون سا چڑیا لیجئے گا شاب؟"

"مجھے کسی چڑیا کی ضرورت نہیں"

"پھر؟ میں سوالیہ نشان بن گیا۔"

وہ صاحب میرے سوالیہ نشان بننے پر میری طرف اور کھسک آئے، اور میرے کان کے قریب اپنا منہ لا کر کہنے لگے،

"یہ تو تمہارے اس کام کا معاوضہ ہے، مجھے جس چڑے کو جگانا مقصود تھا وہ چڑا جاگ گیا، پھر مزید رازدارانہ طور پر کہنے لگے،

دراصل میاں، یہ صاحب پیر گنج کا نواب صاحب ہے۔ یہ جب سو جاتا ہے تو پھر اسے جگانا بہت مشکل ہے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ہمیں یہاں گاڑی تبدیل کرنی تھی اگر ان کو نہ جگایا جاتا تو نہ جانے ہم پر کیا عذاب نازل ہوتا۔ اور اگر جگایا جاتا تو پھر یہ گالیاں کون سنتا، کیونکہ بھئی یہ نواب لوگ ہیں ان کے مزاج کو تو سمجھنا بھی پڑتا ہے۔ بہرحال تم برا مت مانو، یہ دس روپے میں تمہیں اپنی جیب سے دے رہا ہوں"،

"لیکن آپ کون ہیں؟ کیا آپ نواب صاحب کے منیجر ہیں"؟ میں نے پوچھا۔ مگر وہ صاحب میرے اس سوال کو نظرانداز کر کے اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئے۔

اس واقعہ کو کئی سال ہو چلے۔ میں ایک چھوٹی سی فرم میں ملازم ہوں۔ لیکن یہ واقعہ آج مجھے اس لئے یاد آیا کہ میرے ایک دوست نے کل مجھے ایک بہت بڑے آدمی کے نام ایک سفارشی خط دیا ہے جسے ایک پرائیویٹ سکریٹری کی ضرورت ہے لیکن نہ جانے کیوں چھ سو روپے تنخواہ کی کشش کے باوجود میں نے اس ملازمت کا خیال چھوڑ دیا ہے۔

جوابِ طلب امور

کے لئے ہمیشہ جوابی کارڈ، لفافہ یا ٹکٹ ارسال فرمائیں تاکہ بروقت آپ کے مکتوب کا جواب دیا جا سکے۔ جو تخلیقات انتخاب میں نہیں آتی ہیں ان کی واپسی کا ادارہ اسی صورت میں ذمہ دار ہے کہ ان کے ہمراہ لفافہ یا ٹکٹ ہوں۔

(مدیر)

نعیم اقبال

طوفان

مگر وہ بڑبڑایا۔
کیوں نہ تو بھی میری طرح اجڑ جائے۔ تو کیوں
نہ زندگی کی تلخیوں کا مزہ چکھے۔ کیوں نہ تجھ کو بھی
کانٹوں میں گھسیٹ لاؤں۔ شاید اسی لئے وہ
تصویر جس میں ہم دونوں ہیں میرے پاس محفوظ
ہے — کیا یہ تصویر تیرے شوہر کو بدظن کرنے
کے لئے کافی نہیں۔ کیا تیری خوشیاں غموں میں
نہیں بدل سکتیں؟
وہ کسی کی خاموش زندگی میں طوفان اٹھانے چلا
مگر جب اس نے ششی کے ڈرائنگ روم میں
قدم رکھا تو ——!!

"یک نہ شد دو شد"

کالج کی لڑکیوں اور لڑکوں کے قہقہے دور تک نرقی کا پیچھا کرتے۔ اس کالج کے لئے وہ نیا تھا ایم اے میں داخلہ لئے اس کو چند مہینے ہی گذرے تھے ادبی محفلوں کے سوا وہ کالج کے کسی سوشل ایکٹویٹیس میں حصہ نہیں لیتا تھا، پک نک وغیرہ پارٹیوں کا وہ قائل نہیں تھا، کالج کی سرگرمیوں میں حصہ لینا اپنی تعلیم میں حرج سمجھتا تھا، وہ فطرتاً شرمیلا اور خاموش طبع واقع ہوا تھا۔

"یک نہ شد دو شد" کی بات اس کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی تھی اور یہ گتھی سلجھاتا تو کس سے سلجھاتا، اس کا کوئی گہرا دوست بھی تو نہیں تھا، اس کے لئے یہ معمہ تھا، جتنا حل کرنے کی کوشش کرتا اتنا الجھ کر رہ جاتا۔

ادبی محفلوں کی وہ جان تھا، اس کی تنقید اور اس کی رائے کو پروفیسر تک عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتے، اس سال افسانہ نویسی کے مقابلے کا سبھوں کو بری طرح انتظار تھا، گزشتہ تین سال سے یونیورسٹی کے اس قسم کے انعامات ششی کو ملتے آئے تھے، ششی اس کی کلاس فیلو تھی، ان آٹھ مہینوں میں نہ اس نے ششی سے بات کی تھی اور نہ ششی نے ہی کبھی اس سے ملنے کی کوشش کی تھی، ویسے ادبی محفلوں میں دونوں میں نوک جھونک ہو جاتی، بحث و مباحثہ میں دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے، جب محفل سے باہر آتے خاموشی دونوں کی زبان سی دیتی۔

اس سال افسانہ نویسی کے مقابلے میں جب پہلے انعام کے لئے نرمل کے نام کا اعلان ہوا تو ہال لڑکوں کی تالیوں سے گونج اٹھا، دوسرے نمبر پر ششی کی کہانی تھی، اس نے پہلی دفعہ ششی کے چہرے کا جائزہ لیا، اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے، اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔

جلسے کے اختتام پر وہ اپنے آپ میں کھو گیا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی باجی یہ دیکھ کر کہ اسے پہلا انعام ملا ہے کتنی خوش ہوگی، وہ اپنے خیالات میں محو چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی پیچھے سے اسے آواز دے رہا ہے، جب آواز قریب سے آئی تو وہ چونک پڑا۔

"میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے" ششی کی مدھر آواز گونجی "آپ اپنی کامیابی پر سرشار چلے جا رہے تھے، میرے آواز دینے پر بھی آپ نے مڑ کر دیکھنے کی تکلیف گوارا نہ کی۔"

"مجھے افسوس ہے ششی صاحبہ، دراصل میں تو اپنی باجی کی اس خوشی پر خوش ہو رہا تھا جو میرا انعام دیکھ کر انہیں ہوگی، پھر مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ آپ مجھ سے ملنا چاہیں گی۔"

آپ جیسے سنجیدہ انسان سے بات کرنے کوئی حرج نہیں ہے، آپ میں کالج کے دوسرے طلبا کا سا چھچھورا پن نہیں ہے جو ہر لڑکی کو خود پر فریفتہ دیکھنا چاہتے ہیں، لڑکی کو صرف محبوبہ کے روپ میں دیکھتے ہیں، بہن کا رشتہ تو ان کے لئے فراڈ ہے اور ناگوار، اگر ان بدتہذیب لڑکوں کے منہ نہ لگو تو مغرور کہلاؤ۔

"آپ تو گویا کالج کے ماحول پر تبصرہ کرنے لگیں" نرمل مسکرایا۔
"میرا بس چلے تو سارے دن کے سر منڈوا دوں" وہ جل کر بولی۔
"تو وہ ہالی ووڈ کے مشہور ایکٹر یل برنر بن کر آپ سے رومان لڑائیں گے"
"چھی، توبہ، . . . . . ہاں تو نرمل صاحب، میں گزشتہ ایک سال سے آپ کو لائبریری میں ریفرنس ورک کرتے دیکھ رہی ہوں، آپ نے کبھی اور کسی بہانے بھی مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی، یہی چیز مجھے بھا گئی آپ میری نظروں میں اور اونچے ہو گئے جبکہ آج میں نے آپ کو پروفیسر تاثیر سے یہ کہتے سنا کہ آپ کو ججوں کے فیصلے سے اتفاق نہیں ہے اور آپ میری کہانی کو پہلے انعام کا مستحق سمجھتے ہیں، یہ وصف کیا ہر فنکار میں ہوتا ہے؟"
"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں، میری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ اول انعام آپ کی کہانی کو ملنا چاہیئے تھا۔ دل کی بات کہہ دی ہے تو یہ کوئی کمال نہیں ہے۔"
"اس کے لئے بھی ہمت چاہیئے نرمل صاحب، پھر اپنے امتیاز سے دوسرے کے حق میں دست بردار ہونا کوئی کم بڑائی ہے؟"
"آپ شاید شرمندہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں"
"ہاں تو نرمل صاحب آپ کی یہ کہانی "یادوں کے کھنڈر" اتنی مؤثر کیسے ہو گئی؟ آپ کو میرا یہ سوال بے تکا سا تو ضرور معلوم ہوگا، میں جانتی ہوں کہ کہانی مؤثر اس وقت ہوتی ہے جبکہ بات دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے دوسری صورت یہ کہ ہر عظیم کہانی پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ یہ نہ سوچیے کہ میرا مطلب ہے کہ آپ بڑے افسانہ نگار نہیں ہیں۔ میں نے آپ کی تقریباً ساری کہانیاں پڑھی ہیں، ہر کہانی اپنی جگہ خوب ہے مگر یہ کہانی واقعی شاہکار ہے۔ کہانی جن خطوط پر مشتمل ہے ان کے ہر لفظ میں صداقت ملفوف ہے۔ یہ افسانہ نہیں ہے دل کی آواز ہے۔"
"ششی صاحبہ مجھے آپ کی ادبی بصیرت کا اعتراف ہے اور آپ کا قیاس سو فیصدی صحیح ہے کہ یہ کہانی حقیقت سے قریب تر ہے۔"
"آپ اگر برا نہ مانیں تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں . . . ."
"اب آپ غلطی کر رہی ہیں" نرمل مسکرایا "دراصل ان خطوط سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو میرے مرحوم دوست کے خط ہیں جس نے زندگی میں ہر بازی ہار دی، یہی خطوط اس کا سرمایہ تھے، میرا کام تو صرف ان کو ایڈیٹ کرنا تھا، ان خطوط میں میں نے ایک لفظ بھی اپنی جانب سے نہیں بڑھایا ہے، اسی لئے اس کہانی کو میں اپنی طبعزاد کہانی نہیں کہہ سکتا۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں پروفیسر تاثیر سے کہہ رہا تھا کہ آپ کی کہانی کو پہلا انعام ملنا چاہیے۔"
"مگر نرمل صاحب آپ نے جس طریقے سے ایڈیٹ کیا ہے اس کے لئے بھی کمال مہارت کی ضرورت ہے اور ہاں مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جس نے یہ خطوط لکھے ہیں وہ ضرور بڑی ادیبہ ہے، اُف کتنا پیارا انداز بیان ہے . . . . کیوں نرمل صاحب کیا میرا خیال سچ ہے؟"
"مس ششی، میں اب اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہوں گا، آپ تو سراغ رساں کی طرح سوالات کر رہی ہیں اور سب کچھ مجھ سے اگلوانا چاہتی ہیں، میرے صرف ہاں یا نہ سے سارا راز فاش ہو جائے گا، یہ تو دو دلوں کا راز ہے، میں اس راز کو راز ہی رکھنا چاہتا ہوں۔"
"میں معافی چاہتی ہوں، مجھے یہ سب کچھ پوچھنے کا حق نہیں ہے، میں خود متعجب ہوں کہ پہلی ملاقات ہی کس قدر گھل مل گئی ہوں جیسے برسوں کی پہچان ہو"
"ایک سال کی جان پہچان جو ہے" یہ اور بات ہے کہ تخاطب کا موقع اب ملا ہے" نرمل مسکرایا۔
آپ کی کوئی تازہ چیز چھپی ہو تو کل ضرور یونیورسٹی لیتے آیئے، میں پڑھنا چاہوں گی

ششی اور نرمل کو اب اکثر ایک ساتھ دیکھا گیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ لائبریری میں بیٹھے ریفرنس ورک کیا کرتے، دونوں ایک ساتھ کالج سے اس موڑ تک آتے جہاں سے ان کے راستے الگ الگ تھے، وہ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے، لڑکے ششی سے مخاطب ہونے کی ہمت نہیں کرتے تھے اسی لئے نرمل کو یوں ششی سے شیر و شکر دیکھ کر تلملا اٹھے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ان کا ششی کے ساتھ پانچ سال کا ساتھ بیکار گیا اور نرمل نے ایک سال ہی میں اس شاہزادی کو جیت لیا۔۔
"خوب گزرے گی مل بیٹھیں گے جو دیوانے دو" کی صدا اب اکثر سُنی جاتی، نرمل کے لئے "یک نہ شد دو شد" کی گتھی سلجھ نہ پائی تھی کہ یہ نئی پہیلی قہقہوں کے ساتھ دور تک پیچھا کرتی معلوم ہوتی، ایک دن اس نے ششی

سے اس کے متعلق پوچھ ہی لیا۔

"ششی جب میں نیا نیا اس یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا "ایک نہ شد دو شد" کے آواز سے کسے گئے" اور اب "مل بیٹھیں گے جو دیوانے دو" کی صدا بلند ہوئی ہے بھلا اس سے کیا مراد ہے؟"

ششی کھکھلا پڑی۔

"نرمل صاحب، ان لڑکوں کو میں نے کبھی منہ نہیں لگایا، میں کبھی پک نک پر نہیں گئی اور نہ میں کسی کے عشق میں اس کے ٹائی والے رنگ کی ساڑھی پہن کر گئی، میں نے ان لوگوں کے ساتھ سینما گھر یا کافی ہاؤس جاکر اپنے سوشیل ہونے کا ثبوت بھی کبھی نہیں دیا، پھر میں یونیورسٹی میں اول آتی رہی ہوں لہٰذا یہ لوگ مجھے مغرور سمجھنے لگے . . . . ."

"مگر دو شد کی بات . . . ."

جب آپ نے اس کالج میں داخلہ لیا تو میری طرح آپ نے بھی ادبی محفلوں کے سوا کسی سوشیل ایکٹوٹیس میں حصہ نہیں لیا، میری طرح پک نک کی پارٹیوں کو بیکار سمجھتے رہے، آپ نے کسی لڑکی کو لفٹ نہیں دیا لہٰذا آپ دوسرے مغرور انسان تھے، پہلے میں اکیلی تھی اور اب آپ کا ساتھ تھا"

"اور شاید یہی وجہ تھی کہ میری طرف کھنچی چلی آئیں"

ہاں یہی بات جو مجھے پسند آئی تھی"

"تب تو دو دیوانوں کی بات ٹھیک ہی ہے"

دونوں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

"اب دیکھتے جائیے ان کی بد مذاقی کے مظاہرے . . . خیر جانے دیجئے کئی دن سے میں ایک بات کہنا چاہتی تھی"

"کیا اتنی اہم ہے" نرمل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی، وہ کیا کہنا چاہتی ہے"

"ہم دونوں اس منزل پر ہیں کہ آپ کا مجھے آپ کہنا سہکی سوئیاں چبھنے کے برابر ہے"

"بھلا مجھے کب اچھا لگتا ہے" نرمل ششی کے چہرے کا جائزہ لیتے ہنستے ہوئے بولا۔ میں تو اس ڈر سے 'تم' سے تخاطب نہیں کرتا تھا مبادا تم برا مان جاؤ اور شائد تم کو اس بات کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں کسی قیمت پر تمہیں ناراض کرنا نہیں چاہتا۔"

"پھر دوسری بات یہ کہ نرمل کے ساتھ صاحب کا دم چھلا کچھ غیریت ظاہر کرتا ہے، صرف نرمل کہو، مجھے اعتراض نہ ہوگا"

"میں آپ کو نرمل بھیا کہہ کر پکاروں گی"

"مگر یہ دم چھلا . . . . . ؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

اس میں اپنائیت ہے، پھر مجھے اچھا لگتا ہے، میرا کوئی بھائی نہیں تھا"

ایم۔اے کا دوسرا سال بھی ختم ہونے کو آیا تھا، امتحانات بھی ہو گئے تھے، نرمل کو اپنے شہر لوٹنا تھا، اس دن دونوں بے حد اداس تھے۔

"نرمل بھیا، چلو آج اسٹوڈیو میں ہم دونوں ایک ساتھ تصویر کھنچوالیں نہ جانے پھر کب ملنا ہو، آپ کی تصویر تو دیکھ لیا کروں گی"

"تم نے میرے دل کی بات کہہ دی" خوشی سے اس نے ششی کی پیشانی چوم لی۔

"باجی، یہ تصویر دیکھیں گی تو نہیں بے حد پسند کریں گی"

خط لکھتے رہیے گا، کہیں مجھے بھلا تو نہ دو گے بھیا" ششی کے آنسو بھر آئے۔

"بھلا میں تمہیں بھول سکتا ہوں"

"میں آپ سے ایک اور وعدہ لینا چاہتی ہوں"

میں تمہاری ہر بات سنے بنا وعدہ کرتا ہوں، مجھ سے جو چاہے وعدہ لے لو۔ مگر کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں"

"آپ بہت اچھے ہیں، بہت اچھے"

"مگر تم نے وہ بات ہی نہیں بتائی"

"میں سوچ رہی ہوں کیسے کہوں، مجھ سے وہ بات کہی نہیں جا رہی ہے، ہندوستانی لڑکی چاہے ساری ڈگریاں سمیٹ لے مگر یہ بات اس سے ادا ہونی مشکل ہے"

"شادی بیاہ کی بات ؟" نرمل شرارت سے مسکرایا۔

"ہاں" ششی کے کانوں پر شفق پھوٹی" آپ ضرور آئیے گا نا ؟"

"میں نہ آؤں گا تو بھلا یہ شادی کیسے ہوگی ! " نرمل کی معنی خیز نگاہیں ششی کی جھکی جھکی پلکوں کو چوم رہی تھیں۔

کم از کم پندرہ بیس دن قبل آجائیے آپ، ایک بھائی سے بہن بہت کچھ کہہ سکتی ہے۔ اپنے پتا سے کہتے شرمائے گی، ہاں بھائی سے، آپ کا انتظا

خون کا رشتہ نہ سہی، کیا خون کے رشتے ہی سب کچھ ہوتے ہیں، منہ بولی بہن کو کیا وہ محبت نہیں دی جا سکتی، آپ نہیں جانتے میں بھائی کے لئے کتنی ترس گئی تھی، جب آپ سے ملاقات ہوئی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں بھائی کی نعمت سے محروم نہیں ہوں...... آپ کو کیا ہو گیا ہے نرمل بھیا، آپ یوں زرد کیوں ہو گئے جا رہے ہیں، آپ پر یہ سکتہ کیسے طاری ہو گیا..... نرمل بھیا، نرمل بھیا، دیکھا آپ نے، بہن کی جدائی ابھی سے آپ کو شاق گزر رہی ہے۔

نرمل اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کو ایسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی گہرے غار میں اندر ہی اندر چلا جا رہا ہے، اس کا جی چاہتا کہ وہ ان کالج کے لڑکوں کی طرح چیخ چیخ کر چلائے "یہ سب کچھ فراڈ ہے، میری کوئی بہن نہیں ہے، یہ ڈھکوسلہ ہے، فریب ہے، دھوکہ ہے، مجھے بہن نہیں چاہیئے، مجھے محبوبہ چاہیئے، میری روح چاہیئے میری جان"

وہ اپنے شہر لوٹ آیا تھا، ششی کے خط برابر آ رہے تھے، شکوہ شکایت سے بھرپور کہ اس نے شہر پہنچ کر بہن کو بھلا دیا۔ مگر نرمل ٹس سے مس نہ ہوا، اس نے ایک خط کا بھی جواب نہ دیا، ششی کی شادی کا رقعہ بھی آیا تھا اور ساتھ ہی خط، کتنی التجائیں تھیں اس کی خوشی میں شریک ہونے کی کس قدر ہاتھ جوڑے تھے مگر وہ شادی میں شرکت نہ کر سکا، وہ بزدل تھا، اس کو ششی سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں تھی، دن بادلوں کی طرح گزر جاتے ہیں، ایک سال بعد ششی کا اس کو ایک اور خط ملا "سزا تو خطا پر سبھوں کو دیتے دیکھا ہے مگر بغیر کسی جرم کے سزا دینا یہ کہاں کا انصاف ہے، کم از کم یہ تو بتا دیجیے کہ میری خطا کیا ہے.... منی پوچھ رہی ہے کہ اس کے ماما جی کیوں خفا ہیں"، نرمل نے اس کا بھی جواب نہیں دیا، تین سال یونہی بیت گئے۔ پھر ششی کا ایک خط آیا تھا، "ڈیڈی چل بسے، ایک شفیق سایہ اٹھ گیا کم از کم اب تو آ کر اپنی بہن کی خبر لیجیے، اس پر شفقت کا ہاتھ رکھیے... میرے لئے نہیں تو کم از کم اپنی نرملا کو ہی دیکھ جایئے، ہاں میں نے اپنی لاڈلی کا نام نرملا ہی رکھا ہے آپ کے نام سے ملتا جلتا، وہ اپنے ماما جی کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہے۔"

نہ جانے کیسے اتنے برسوں بعد انتقام کا جذبہ اچانک بیدار ہوا اس نے کیسے اب تک اس جذبے کو دبا رکھا تھا.... اپنی دنیا تو بسا لی اور مجھے برباد کر دیا، میرا چین لوٹ لیا، میرا سکون لٹ گیا.... وہ بڑبڑایا... کیوں نہ تو بھی میری طرح اجڑ جائے، تو کیوں زندگی کی تلخیوں کا مزا نہ چکھے، کیوں نہ تجھ کو بھی دانتوں پر گھسیٹ لاؤں، شاید اسی لئے وہ تصویر ابھی تک میرے سینے سے لگی میرے پرس میں رکھی ہوئی ہے، کیا یہ تصویر تیرے شوہر کو بدظن کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، کیا تیری خوشیاں غموں میں نہیں بدل سکتیں، وہ کسی کی خوشی لوٹنے کے لئے چلا۔ خاموش زندگی میں ایک طوفان اٹھانے چلا۔ وہ ششی سے ملنے کے لئے نکل پڑا۔

جب اس نے ششی کے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو اس کی نظر سب سے پہلے اس انلارج تصویر پڑی جس کی چھوٹی کاپی وہ اپنے پرس میں رکھ کر چلا تھا، ششی نرملا کو گود میں اٹھائے اسی تصویر کے سامنے کھڑی کچھ اس کے بارے میں بتا رہی تھی، آہٹ پا کر وہ مڑی اس کی آنکھیں حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے پر تھیں۔

"او بھیا میرے" وہ دوڑ کر اس کے سینے سے لگ گئی "نہ جانے کیوں میرا دل کہتا تھا کہ آج راکھی بندھن کے دن آپ ضرور آئیں گے" فرط خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تت ویر والے ماما جی ہیں نا ممی؟"

"ہاں، یہ وہی تصویر والے ماما جی ہیں بیٹی"

"ہاں بیٹے میں وہی ہوں" نہ جانے محبت کا کون سا دریا امڈ آیا

"آپ کیوں خفا تھے ہم سے"؟

میں کہاں خفا تھا بیٹے، میں کہاں روٹھا ہوں، میں تو بیمار تھا اس نے بچی کو اپنی گود میں بھر لیا، اس کے پھول جیسے گلابی گال میں اپنے ہونٹ دھنسا دیئے، آنسوؤں کا ایک سیلاب ٹوٹ پڑا تھا۔

"آپ بیمار تھے؟"

تین سال سینیٹوریم میں رہا ہوں، نرمل کو جھوٹ ہی میں چھٹکارا ملا، میرے بھگوان، تبھی تو آپ نے میرے خطوط کا جواب نہیں دیا مگر آپ نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔

میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا، میں سیدھا ہسپتال سے یہاں چلا آیا ہوں، میں بالکل خالی ہاتھ ہوں، نہ میں اپنی اس لاڈلی کے لئے کچھ لے آیا اور نہ اپنی بہن کے لئے ہی" ندامت کے سارے آنسو بہہ نکلے

"آپ بہت کچھ لے آئے ہیں بھیا، بہت کچھ... اپنی محبت... مجھے اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے" ششی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

پراسرار کہانی

نوشتہ:- ایس فرینٹ
تلخیص و ترجمہ:- احمد صغیر صدیقی

یہ پچھلے ہفتہ کی بات ہے۔

مارٹن آسٹریلیا جاتے ہوئے ایک دن کے لئے سنگاپور میں ٹھہرا تھا۔ میری عادت ہے کہ میں خصوصاً ایسے مہمانوں کو جو انگلینڈ سے آئے ہوں اپنا "بوٹانیکل گارڈن" ضرور دکھاتا ہوں۔ مارٹن بھی انگلینڈ ہی سے آرہا تھا۔ لہٰذا جونہی وقت ملا میں اسے گارڈن کی طرف لیکر نکل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ مارٹن باغیچہ کی سیر سے ضرور لطف اندوز ہوگا۔ لیکن ہوا کچھ اور ہی۔

جھیل کے کنارے کنارے جو راستہ باغیچہ تک جاتا تھا اس کے دونوں جانب لمبی لمبی گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں میں نے راہ چلتے کئی بار محسوس کیا کہ مارٹن راستہ چلتے ہوئے بڑے محتاط انداز میں قدم اٹھا رہا ہے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید وہ سانپوں کی موجودگی کے باعث خوف زدہ ہے۔ ایک بار تو وہ چلتے چلتے کچھ اس طرح اچھلا جیسے واقعی کوئی سانپ اس کے پاؤں تلے آگیا ہو۔ لیکن مجھے جلد ہی معلوم ہوا کہ اس کا پیر کسی سانپ پر نہیں بلکہ ایک ایسی جڑ پر جا پڑا تھا جو ایک جانب سے چل کر راستے کو کاٹتی ہوئی دور تک بل کھاتی ہوئی چلی گئی تھی۔ دور سے دیکھنے پر وہ کچھ ایسی لگتی تھی جیسے کوئی سانپ ہی ہو۔

"میاں۔ تم خواہ مخواہ خوف زدہ ہو۔ یہاں میں تقریباً روز ہی آتا ہوں۔ یہاں سانپ تو کیا سانپ کا بچہ تک تمہیں نہیں ملے گا۔"

میرے جملے کو سننے کے بعد اس نے اپنے خوف پر قابو پانے کی پوری کوشش کی اور قدم آگے بڑھا دیئے۔ البتہ مجھے اس میں پیدا ہونے والی تبدیلی بڑی عجیب سی لگی۔ اس کا چہرہ ہلدی کی مانند پیلا ہو گیا تھا۔ ہاتھ بھی کچھ ایسے ہی کپکپا رہے تھے جیسے ان میں رعشہ ہو گیا ہو۔

ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھا ہوگا کہ وہ یکایک ٹھٹھک گیا۔ اور اصرار کرنے لگا کہ اب واپس چلنا چاہیئے۔ بظاہر کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آرہی تھی جو اسے آگے بڑھنے سے روکتی۔ میں نے اصرار کیا تو تقریباً التجا کرتے ہوئے اس نے کہا "بھئی خدا کے لئے مجھے آگے نہ لے جاؤ۔ تم اس منحوس برگد کو دیکھ رہے ہو۔" اس نے اشارے سے مجھے سامنے لگے ہوئے برگد کی طرف متوجہ کیا۔

جادوگرنی نے مرتے وقت کہا — میں مرنے کے بعد بھی اُڑتی ہوئی آیا کروں گی، اور اس گاؤں کو ایک نہ ایک دن ضرور تاراج کردوں گی۔ یاد رکھو خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرتے ہی میرا وجود پرواز کے لائق ہو جائے گا۔

"ہاں ٹھیک ہے" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا "کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"کس قدر ڈراؤنی سی ہیں اس کی یہ جڑیں۔" اس نے جیسے خود کو مخاطب کرتے ہوئے جواباً کہا۔ "دیکھو تو کتنی دور تک بل کھاتی ہوئی چلی گئی ہیں۔"

"مگر جڑیں تمہارا کیا بگاڑ رہی ہیں۔" میں نے اسے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"میرے خدا۔" وہ لڑکھڑاتے ہوئے چیخا۔ اگر میں اسے پکڑ نہ لیتا تو شاید وہ بے ہوش ہو کر گر ہی جاتا۔

میں بڑی مشکل سے اسے کار میں بٹھا کر گھر لایا اور کافی پلائی۔

بیٹھا تھا جب جاکر اس کی جان میں جان آئی۔

"معاف کرنا میری وجہ سے آج تمہیں بڑی زحمت ہوئی۔"

خاموشی توڑتے ہوئے اس نے کہا۔ "میں یقیناً اس جگہ کبھی نہ جاتا اگر میرے علم میں ذرا سی بھی یہ بات ہوتی کہ وہاں لمبی لمبی جڑیں راستہ پر بھی پھیلی ہوتی ہیں ــــ اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ تلخ تجربات کی یادیں ابھی تک میرے ذہن سے نہیں نکل سکی ہیں۔"

"میرا خیال ہے بعض ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جنہیں اگر دوسروں سے کہہ دیا جائے تو دل کا بار بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔"

"ہوں۔" اس نے ہنکاری بھرتے ہوئے لمبی سانس لی۔ "تم میری کہانی پر شاید ہی یقین کرو۔ بعض اوقات مجھے خود بھی اپنی بات مذاق سے زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن ــــ میں کیا کروں ــــ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری کہانی اتنی ہی سچی ہے جتنا میرا وجود۔" لمحہ بھر رک کر اس نے پوچھا۔

"تم کبھی "ڈانک شائر" کے علاقہ کی طرف گئے ہو؟"

"ہاں۔ ایک بار ادھر سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے ــــ اچھی جگہ ہے۔"

اس علاقہ میں "روبن" کا جنگل اور پرانے جاگیرداروں کے قلعوں کے کھنڈرات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔" میں نے بچپن میں اپنی بہت سی چھٹیاں وہاں گزاری ہیں۔" اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "میں تو اسے ایک انتہائی منحوس علاقہ کہوں گا۔"

"لیکن مارٹن ــــ" میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "اس علاقہ میں نحوست تو کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے۔"

"تمہارا خیال ہے۔" اس نے جواباً کہا۔ "پہاڑیاں چٹیل سہی، لیکن پہاڑیوں کے درمیان پائی جانے والی وادیاں جھاڑیوں سے بھری پڑی ہیں۔ یقین نہ آئے تو صرف "ہیلوویل وادی" ہی کو جا کر دیکھ لو۔"

"ہیلوویل ــــ؟" میں نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس وادی کا تو نام تک میں نے نہیں سنا ہے۔"

"اچھا ہی ہے۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔ "ویسے یہ جگہ اب زیرِ آب ہے۔ میں اس جگہ انجینئر کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ ان دنوں ہیلوویل کو بھی "ذخیرہ آب" بنانے کی اسکیم پر عملدرآمد ہو رہا تھا۔

شروع شروع میں تو میں نے اپنی رہائش گاہ کے لئے ایک سرائے کو جس کا نام "بیرونس برج" تھا استعمال کیا۔ لیکن یہ سرائے کام کی جگہ سے بہت دور واقع تھی۔ مجھے آنے جانے میں خاصی زحمت تھی۔ لہٰذا میں نے قرب و جوار ہی میں رہائش کا مسئلہ حل کرنا چاہا۔ آخرکار مجھے ایک جھونپڑی دکھائی دے ہی گئی۔ ممکن ہے کبھی کوئی یہاں آ کر رہا ہو۔ لیکن اس وقت تو وہ قطعی ویران تھی۔ میرے کہنے پر کمپنی نے اسے ٹھیک ٹھاک کر کے میرے سپرد کر دیا۔ اس جگہ سے ایک راستہ سامنے کی پہاڑیوں کی جانب جاتا اور دوسرا ہیلوویل وادی کی جانب۔ وادی کو جانے والا راستہ خاصہ دشوار تھا۔ اس راستہ کے علاوہ ایک دوسرا راستہ جنگل کے درمیان میں سے ہوتا ہوا بھی وادی تک جاتا تھا۔ مگر شام کے وقت میں عام طور سے اسی ڈھلوان راستہ پر چلنا پسند کیا کرتا تھا۔ دوسرے راستہ پر کوئی دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر ایک جانب ایک پرانے گرجے کے کھنڈرات تھے۔ اور اس سے ملی ہوئی کئی ایک اجڑی ہوئی جھونپڑیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ شاید اسی جگہ ہیلوویل نامی گاؤں کسی زمانے میں پایا جاتا ہوگا ــــ میں ادھر سے ذرا کم ہی گزرا کرتا تھا۔ دراصل مجھے ان کھنڈرات سے گزرتے ہوئے کچھ عجیب سی وحشت ہوتی تھی۔

سردیوں کی آمد آمد تھی۔ میرا زیادہ وقت درختوں کی کٹائی کے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے اکثر ادھر ادھر گشت لگانا پڑتا۔ اکثر تو مجھے واپسی پر خاصی رات ہو جاتی تھی۔ ایسے موقعوں پر مجبوراً جنگل میں سے گزرنے والے راستے کو ہی منتخب کرنا پڑتا تھا۔ ہرچند کہ راستہ میں ہیلوویل کی اجڑی بستی پڑتی تھی۔ لیکن "شارٹ روٹ" ہونے کے باعث مجھے ادھر سے آنا کچھ ایسا برا بھی نہ لگتا تھا۔

گاؤں کے آثار شروع ہونے سے پہلے ہی سبزہ بالکل ختم تھا۔ لیکن کھنڈروں کے درمیان زمین پر خودرو گھاس البتہ بے حد پائی جاتی تھی ــــ

چاندنی راتوں میں گرجا گھر کا سناٹا عجیب عجیب سی آوازیں پیدا... ممکن ہے کہ وہ الوؤں کے بولنے سے پیدا ہونے والی آوازیں ہی ہوں۔ جگہ سے کوئی سو گز لمبا ایک ...... میرا مطلب ہے بالکل کھلی ہوئی تھی۔ یہ جگہ بہت عجیب تھی۔ تم اسے ایک ایسا چوراہا کہہ سکتے ہو

ہر راستہ آکر غائب ہو جاتا تھا۔ اس کے فوراً بعد ڈھلان شروع ہو جاتی تھی۔ اور یہ ڈھلوان راستہ سیدھا میری کاٹج تک جاتا تھا۔ یہ کھلی ہوئی جگہ جس کا میں نے تم سے ذکر کیا ہے مجھے اس دن بھی سخت عجیب اور منحوس سی لگتی تھی۔ میں ادھر سے گزرنا بھی نہیں پسند کرتا تھا مگر مجبوری تھی۔ تم جانتے ہو کہ مجھے یہ جگہ کیوں بری لگتی تھی ـــــ دراصل اس جگہ ایک "یو" کا درخت تھا۔ ان دنوں اس پر پھول کھلتے تھے اور یہ سیاہ درخت یوں لگتا تھا جیسے اس پر خون کی بارش ہوئی ہو ـــــ سرخ اور ننھے ننھے سے پھول کچھ ایسا ہی خوفناک سماں پیش کرتے تھے۔ یہی نہیں اس کی شاخیں اوپر پھیلنے کے بجائے نیچے پھیلتی ہیں بالکل سانپوں کی طرح بل کھاتی اور نوکیلی سی۔ اس کی شکل کچھ ایسی ہی تھی جیسے کوئی سیاہ اور بڑی سی چمگادڑ اڑنے کے لئے پر تول رہی ہو۔ اس درخت کے داہنے سرے پر قبرستان واقع تھا۔

نہ جانے کیوں یہ منظر دیکھ کر مجھے وحشت ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے ٹھیکیدار وائیکی سے اس ویرانی کا ذکر کیا تو وہ بولا۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ تم بروننس برج ہی میں رہو تو بہتر ہے۔ تم نے راتوں میں اڑنے والی ایک عجیب و غریب مخلوق کا تذکرہ یہاں کے لوگوں کی زبانی ضرور سنا ہوگا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کہانیاں کہاں تک صحیح ہیں لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تم نے اس تنہا کاٹج میں رہائش اختیار کر کے کوئی اچھا قدم نہیں اٹھایا ہے۔"

میں نے اس سے پہلے وہاں کے کسی شخص سے بھی کسی اڑنے والی شے کے بارے میں کوئی کہانی قطعی نہیں سنی تھی۔ میں خاصا چکرایا۔ میں نے لاکھ پوچھا لیکن بوڑھا وائیکی بات ٹال گیا۔ رات میں لیٹ کر میں نے اس کے جملہ پر خاصہ غور کیا۔ خزاں کے موسم میں یہ بات ضرور تھی کہ میں نے بارہا کچھ ایسی آوازیں کاٹج کے باہر اکثر سنی تھیں جیسے کوئی بڑا سا پرندہ اڑ رہا ہو۔ لیکن میں نے اسے ہمیشہ ہوا کا جھونکا سمجھ کر ٹال دیا تھا۔ اسی وقت مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ایک طوفانی رات کو مجھے کوئی دو بجے اپنے دروازے پر کسی شے کے ٹکرانے کی سی آواز بھی محسوس ہوتی تھی۔ بالکل یوں لگا تھا جیسے کوئی نوکیلے پنجوں سے دروازہ کھرچ رہا ہو۔ بہرحال ان توہمات سے خالی الذہن ہو کر میں نے سونے کی کوشش کی اور شاید سو گیا تھا کہ وہ تین بجے کے قریب اچانک میری نیند ٹوٹ گئی۔ کاٹج کا دروازہ بری طرح لرز رہا تھا جیسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی ہلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیٹے ہی لیٹے میں نے ہوا کو کوسا۔ لیکن جب میں اٹھ کر بیٹھا تو مجھے یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ رات بالکل پرسکون ہے ـــــ دروازہ بدستور ہل رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی دیو قامت پرندہ بار بار اپنے پر پھڑپھڑا رہا ہو۔ میں نے جلدی سے سرہانے رکھا ہوا لیمپ جلا دیا۔ اور پھر حالات کے وقوع پذیر ہونے کا انتظار کرنے لگا ـــــ

کچھ دیر تک تو دروازہ ہلا لیکن اس کے بعد سناٹا سا چھا گیا۔ البتہ باہر کسی وزنی شے کے رینگنے کی ہلکی ہلکی آواز اب بھی جاری تھی۔ میں سانس روکے منتظر تھا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ یکایک کاٹج کی چھت پر کسی شے کے کھرچنے کی سی آواز بلند ہوئی۔ میں نے دروازے سے نظر ہٹا کر اوپر دیکھا اور خوف سے جیسے جم کر رہ گیا۔ میرے خدا۔ تم یقین کرو، کوئی شے سانپ کی مانند لچکی اور مڑی ہوئی اوپر کے چھوٹے سے روشندان سے اندر کی جانب اترنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ پھر وہ کوئی گز بھر اندر کی جانب لٹک آئی اور یوں ادھر ادھر پھڑپھڑانے لگی جیسے وہ کسی شے کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہتی ہو۔ وحشت اور گھبراہٹ کے بے پناہ ہجوم میں گھر کر میں نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھیں اسی پر گاڑ دیں۔ جانتے ہو وہ شے کیا تھی۔ وہ ایک زندہ جڑ تھی۔ کسی درخت کی "متحرک جڑ" اس میں مٹی تک لگی ہوئی تھی۔ وہ جڑ اسی طرح تڑپتی اور پھڑکتی رہی لیکن لمبائی کم ہونے کے باعث یوں لگا جیسے وہ مایوس سی ہو گئی ہو۔ آہستہ آہستہ وہ پھر اوپر کی جانب بلند ہونے لگی اور چند ہی لمحوں میں روشندان اس سے بالکل خالی ہو گیا۔"

اس کے بعد میرا عجیب عالم تھا۔ جانے کب صبح ہوئی۔ میں اسے یقیناً ایک خواب ہی سمجھتا لیکن فرش پر گری ہوئی زرد مٹی اور میرا جلتا ہوا لیمپ واقعات کے صحیح ہونے کا ثبوت تھے۔ دروازے کے باہر جا بجا مٹی پہ ایسے نشانات بھی موجود تھے جن سے معلوم ہوتا تھا گویا بہت سے سانپ بل کھاتے ہوئے ادھر سے گزرے ہوں۔ یہی نہیں کاٹج کے دروازے پر سرخ دھبے والے چند پھول اور کچھ سیاہ پتیاں بھی دور تک بکھری ہوئی تھیں۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ پتیاں وغیرہ اسی منحوس "یو" درخت کے سوا کسی اور کی نہ تھی۔

سورج کے بلند ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وہ بدحواسی سے لکڑہارا دن

کی کہانیاں کی آمدنیاں ؟؟ شروع ہو چکی تھیں۔ مجھے اس وقت اپنی تنہائی کھائے کو دوڑ رہی تھی۔ میں نے ناشتہ تک کئے بغیر کپڑے پہنے اور جنگل سے گزر کر جانے والے شارٹ روٹ پر چل پڑا۔

جب میں وادی میں پہنچا تو بلڈوزر کے نزدیک ہی بوڑھے وائکی سے میری ملاقات ہو گئی۔ وہ اس وقت سخت غصہ میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "حد ہو گئی صاحب۔ وھٹ ٹیکر نامی مزدور خدا جانے کدھر غائب ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ چپکے سے کھسک لیا ہے۔"

میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے اس سے کہا۔ "چھوڑو مسٹر وائکی یہ بتاؤ آج کہاں سے شروع کرنے کا پروگرام ہے؟ میرا خیال ہے آج کام کا آغاز تم میری کاٹیج کے قریب واقع چڑھائی پر لگے ہوئے "یو" کے پیڑ کی کٹائی سے کرو۔"

میرے نزدیک کھڑے ہوئے مزدور میرا جملہ سنتے ہی یکایک آپس میں سرگوشیاں سی کرنے لگے۔ میرا خیال ہے وہ سب کے سب اس درخت کے بارے میں ہی کچھ کہہ رہے تھے۔ میرے استفسار پر وائکی نے کہا "یہ لوگ بھی گھاس کھا گئے ہیں۔ پتہ نہیں اس درخت کے بارے میں یہاں کیا کیا قصے مشہور ہیں۔"

"مسٹر وائکی۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "قصے جو کچھ بھی ہوں لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تم میرے ساتھ میری کاٹیج میں ایک رات تک نہیں گزار سکتے۔ میں شرط لگانے کے لئے تیار ہوں۔"

"شرط۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "کبھی خدا کے لئے آپ بھی ادھر ادھر کی سنی سنائی کوئی کہانی یہاں نہ دہرا دیجئے گا۔ ورنہ میرے آدمی یقیناً یہاں ٹھہرنے پر قطعی تیار نہ ہوں گے۔"

"ہم لوگ غلط نہیں کہتے۔" ایک مزدور نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔ "صاحب کے ساتھ اگر کوئی ڈراؤنا واقعہ پیش آیا ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ جس جگہ وہ رہ رہے ہیں وہ مقام کچھ ایسا ہی ہے۔"

"تم خاموش رہو۔" وائکی نے بات ختم کرنی چاہی لیکن میں نے اسے پھر چھیڑا۔ جوش میں آکر آخر وہ میرے ساتھ کاٹیج میں رات گزارنے پر تیار ہو گیا۔

وعدے کے مطابق شام ہوتے ہی وائکی میری کاٹیج میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک کلہاڑی دبا رکھی تھی اور تنہا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے ہمراہ ایک پادری کو بھی لیتا آیا تھا۔ پادری کا نام ویرنگ تھا۔ مسٹر ویرنگ سے میں سرائے سے دس بجے ہی میں پہلے ہی مل چکا تھا۔ اچھے خاصے سمجھدار انسان تھے۔

"مسٹر وائکی ۔۔۔ بھئی تم انہیں کیوں کھینچ لائے؟" میں نے پوچھا۔

مسٹر ویرنگ خود ہی بول پڑے۔ "در اصل میں خود بھی یہاں پھیلی ہوئی افواہ میں خاصی دلچسپی لے رہا ہوں۔ آپ کا تجربہ مجھے یہاں کھینچ لایا ہے۔" انہوں نے کسی ایک بار اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے بولے۔

"میرے پاس ایک کتاب موجود ہے۔ آج سے چالیس سال قبل اسے تحریر کیا گیا تھا۔ تحریر کرنے والا شخص میری معلومات کے مطابق کسی زمانے میں ہیلو ویل گاؤں کے گرجے کا پادری ایڈ نائر تھا۔ اس کی موت ۱۸۹۱ء میں ہوئی تھی۔ ہیلو ویل اس کی موت کے کوئی چار چھ سال بعد ویران ہو گیا تھا۔ اس پادری نے انتہائی مضحکہ خیز اور ناقابل یقین واقعات اس کتاب میں لکھے ہیں۔"

"مسٹر ویرنگ" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میرا خیال ہے پادری ایڈ نائر نے غلط نہیں لکھا ہے۔" پھر میں نے رات کا تمام واقعہ ان دونوں کے گوش گزار کر دیا۔ گفتگو کے دوران مسٹر ویرنگ نے بارہا میری جانب تیز نظروں سے بھی دیکھا۔ وائکی نے بھی کہا۔

"یہ حضرت ادھر ادھر کی سنی سنائی کہانی پر شاید یقین کر بیٹھے ہیں۔"

"خیر خیر ۔۔۔" مسٹر ویرنگ نے گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "حقیقت جلد ہی سامنے آ جائے گی۔"

ٹھیک آدھی رات کا وقت ہو گا کہ کسی دیو ہیکل پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے ساری فضا لرزنے لگی۔ رفتہ رفتہ آواز نزدیک ہوتی ہوئی ٹھیک کاٹیج کے دروازے پر آکر ختم ہو گئی۔ چند لمحوں سناٹا رہا۔ اس بار روشن دان یا دروازے پر حملہ آور ہونے کے بجائے اس نے کاٹیج کی چند اینٹیں نکال دیں۔ سوراخ ہوتے ہی سانپوں کی مانند لجلجی سی ہری ہری خاک آلود جڑیں اس میں سے نکل نکل کر اندر پھیلنے لگیں۔ ہم خوف اور دہشت سے یہ نظارہ دیکھ ہی رہے تھے کہ یکایک وائکی نے ایک بھیانک چیخ ماری۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ ادھر دیکھا۔ ایک لمبی سی جڑ بوڑھے وائکی کے پیروں سے بری طرح لپٹ گئی تھی۔ یک لخت میرا ہاتھ کلہاڑی کی طرف بڑھا۔ میں نے اس جڑ پر پوری طاقت سے ضربیں لگانی شروع کیں۔ تم یقین کرو بڑی مشکل سے میں اسے کاٹ سکا۔ اس دوران دوسری جڑیں بڑی تیزی سے

سوراخ کے راستے باہر کی جانب پیچھے دوڑنے لگیں۔

چند ہی لمحوں میں کمرہ ان سے بالکل خالی ہو گیا۔ باہر ایک بار پھر پروں کی خوفناک پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ اور یہ آواز رفتہ رفتہ وادی کی سمت جاتی ہوئی ختم ہو گئی۔

"میرا خیال ہے وہ پھر واپس آئے گی۔" لرزتے ہوئے دائکی نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے ایڈنر نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔ اس کے مطابق یہ شے ہمیشہ اسی انداز میں آکر آدمیوں کو لیجایا کرتی تھی۔ پادری نے اپنا ماتھا پونچھتے ہوئے کہا: "ممکن ہے کہ وہ پھر واپس آئے۔"

"مگر ہم آسانی سے چڑھائی طے کرکے دوسری جانب واقع برونس برج تک پہنچ سکتے ہیں۔" میں نے رائے دی۔

مگر وہ ہم کو چڑھائی تک پہنچنے سے پہلے ہی آ لے گی ۔۔۔ دائکی ایک بار پھر ہکلایا۔

"میرا خیال ہے نکل ہی چلنا چاہیئے۔"

"پھر ہم باہر نکل آئے۔ رات بالکل ساکن اور خاموش خاموش سی تھی۔ ابھی ہم چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ جیسے ہماری بُو اس نے سونگھ لی۔ وادی کی جانب سے آتی ہوئی ایک بار پھر بڑے بڑے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے ہوا لرزنے لگی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ دور آسمان میں ہمارے پیچھے جیسے کوئی عظیم چمگادڑ اڑتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے جسم کے نیچے لاتعداد جڑیں لچلچے سانپوں کی مانند جھول رہی تھیں۔"

"تیزی سے چڑھائی کے سرے تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اس شے کا دائرہ عمل اس جگہ سے آگے نہیں ہے۔ ایڈنر کی ڈائری یہی کہتی ہے۔ اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔" دوڑتے ہوئے پادری ویرنگ نے مجھے بتایا۔

ہم ابھی بمشکل چڑھائی تک پہنچے ہوں گے کہ ہمیں مسٹر ویرنگ کی چیخ سنائی دی۔ وہ ٹھوکر کھا کر بُری طرح گرے تھے اور ٹھیک اُن کے پیچھے ایک بڑی سی درخت نما مخلوق زمین پر رینگ کر گھسٹتی ہوئی ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔

پہلے تو میں ویرنگ کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ لیکن پھر مجھے یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ وہ بڑی مخلوق اب اڑنے سے قاصر ہو چکی ہے ۔۔۔ پادری ایڈنائر کے الفاظ صحیح ثابت ہو رہے تھے۔ اپنا دائرہ عمل ختم ہوتے دیکھ کر مجبوراً اس نے اپنی لمبی لمبی جڑوں کا سہارا لیا تھا۔ اب وہ انہیں پھیلا کر شکار کر سکتی تھی اور بس۔

"خدا کے لئے اٹھ جاؤ۔" میں نے رک کر پیچھے زمین پر پڑے ویرنگ کو آواز دی۔ "ہمت کرو ہمت۔ صرف چند قدم اور، تم محفوظ ہو گئے ۔۔۔ بالکل محفوظ ۔۔۔"

لیکن وہ محفوظ نہیں تھا۔ اس کے پیروں میں ایک لمبی سی جڑ بیڑی کی مانند پڑ چکی تھی۔

"خدا کے لئے کلہاڑی استعمال کرو۔" دائکی نے ہانپتے ہوئے مجھ سے کہا ۔۔۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک ضرب لگائی۔ "کچ" کی آواز کے ساتھ ویرنگ آزاد ہو گیا۔ پھر ہم وہیں لیٹ کر دم لینے لگے۔ ہم نے صرف چند قدم کے فاصلے پر وہ بدنما درخت اپنی لمبی شاخوں اور جڑوں کے سہارے ہمیں تلاش کرنے میں اب بھی منہمک تھا لیکن بیکار۔ ہم اس کے منحوس حلقے سے بہت پرے آچکے تھے ۔۔۔

دم لیکر ہم تینوں اٹھے اور پھر ڈھلوان راستے پر اترتے ہوئے برونس برج کی جانب چل پڑے۔ تھیلو ویل گاؤں پیچھے دور رہتا چلا گیا۔

مسٹر ویرنگ نے گھر پہنچ کر مجھے ایک مجلد کتاب تھما دی۔ کتاب خاصی پرانی لگ رہی تھی۔ اور پھر میں تمام رات بیٹھا پادری ایڈنائر کا عجیب و غریب روزنامچہ پڑھتا رہا۔

پادری ایڈنائر کے روزنامچے کے مطابق "یو" کے درخت میں جب پہلی بار پھول آئے تو وہ اپنے ساتھ مصیبتیں بھی لایا۔ ایڈنائر نے لکھا تھا کہ اس کے زمانے میں ایک عجیب روایت خاص شہرت رکھتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ سترھویں صدی کے وسط میں "ہیلو ویل" گاؤں میں ایک جادوگرنی رہا کرتی تھی۔ لوگوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے اسے تختہ دار پر لٹکا دیا۔ اس کی لاش اسی کھلی ہوئی جگہ پر دفن کی گئی تھی جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ دفن سے قبل جادوگرنی کی لاش میں دل کے مقام پر لوگوں نے لکڑی کی ایک میخ ٹھونک دی تھی اور یہ میخ دراصل اسی "یو" نامی درخت کی تھی۔ جادوگرنی کے آخری الفاظ بھی پادری ایڈنر نے اپنے روزنامچے میں درج کیئے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ "میں مرنے کے بعد بھی اڑتی ہوئی آیا کروں گی۔ اور اس گاؤں کو ایک نہ ایک دن ضرور سنسان کر دوں گی ۔۔۔ یاد رکھو

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

نئے شعر کا لہجہ

آج کا شاعر جذبات سے زیادہ ذہن کا شاعر ہے

*

جب ہم لفظ بیانیہ کا استعمال کرتے ہیں تو ہماری مراد کسی ایسی چیز سے ہوتی ہے جو پہلے سے موجود نہ ہو اور ابھی ابھی عالم وجود میں آئی ہو۔ یا پھر ہمارا مطلب ایسی چیز سے ہوتا ہے جس سے ہم مانوس نہ ہوں۔ چنانچہ جب شاعری کے ساتھ "نئے" کی صفت لگائی جائے تو کہنے والے کا اشارہ ایسی شاعری کی طرف ہوگا جس کا آج سے پہلے زمانی اور موضوعاتی ہر دو اعتبار سے وجود نہ رہا ہو، یا پھر پڑھنے والے اس سے مانوس اور اس کے عادی نہ ہوں۔ اس جگہ پہنچ کر ہم کو اپنی گذشتہ شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالنی ضروری ہو جاتی ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ہم اب تک کس قسم کی شاعری اور لب و لہجہ کے عادی تھے یا ہیں۔ میں فی الحال اپنے آپ کو نظموں تک محدود رکھوں گا۔ حالی سے پہلے تک صرف تین اصناف مرثیے قصائد اور مثنویاں (میں یہاں قدیم اردو یا دکھنی کی نیچرل نظموں کو بھی مثنوی کی ذیل میں شامل کر رہا ہوں) نظم کے زمرے میں آتی ہیں اور تینوں ہی کا انداز بیانیہ ہوتا ہے۔ مرثیے مجلسوں میں پڑھنے کے لئے ہیں۔ قصائد درباروں میں سنانے یا پیش کرنے کی خاطر اور مثنویاں کہانی بیان کرنے کے لئے استعمال ہوئی ہیں۔ گویا ان اصناف کو استعمال کرتے وقت شاعر سننے والے گروہ یا مجمع کو سامنے رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا لہجہ بلند اور خطیبانہ ہوتا ہے اور اسے اپنے نفسیاتی مطالعہ سے زیادہ اپنے مخاطبین کی نفسیات کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔

اردو نظم کے بڑی حد تک بانی حالی اپنے مسدس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بڑا دخل ہے، زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ ہے اور مسلمانوں کا موروثی حصہ، قوم کے بیدار کرنے کے لئے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔ اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لئے نہیں کی گئی ہے بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لئے کی گئی ہے۔"

چنانچہ اس طرز فکر کا لازمی نتیجہ خطابیہ اور بیانیہ شاعری کی شکل میں نکلا اور اردو کی پہلی طویل "قومی نظم" وجود میں آئی۔ چونکہ حالی اور ان کے ساتھیوں نے نظم نگاری کے ذریعہ قوم و ملک کی بیداری کا کام لینا چاہا۔ اس لئے ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ انداز اور لہجہ اختیار کرتے جس میں سننے والوں سے براہ راست تخاطب ہو۔ اور ان کی نفسیات کا نمایاں حد تک خیال رکھا جائے۔ اس سلسلے میں ان لوگوں نے اپنے آپ کو ایک "غمگسار ناصح" اور "دردمند مصلح" کے روپ میں پیش کیا۔ حالی کو بہ حیثیت فرد دردمندی غزل کے توسط سے ملی تھی اور ناصحانہ و مصلحانہ انداز وقت کا تقاضہ تھا کیونکہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جدوجہد آزادی اور انگریزی سامراج کی سخت گرفت کی وجہ سے پوری قوم میں بددلی، مایوسی اور شکست خوردگی کی ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی جسے ختم کرنے، قوم کو جھنجھوڑنے، بیدار کرنے اور اس کے مسائل پر ہمدردانہ غور کر کے نئے مسائل سے ہم آہنگ کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ اور یہ کام قوم کے ہمدرد رہنما ہی انجام دے سکتے تھے۔ چنانچہ حالی اور ان کے رفقاء نے شاعری کے ساتھ ساتھ رہنمائی کی ذمہ داریاں بھی قبول کر لیں۔ اور چونکہ وقت کے تقاضوں کے تحت قوم میں بیداری کی روح پھونکنا اور اسے اس کی کمزوریوں سے آگاہ کر کے ایک خاص سمت میں لے جانا تھا۔ اس لئے ان لوگوں کے لہجہ میں خطابت

کا درس آتا فرد ری تھا ۔ ویسے بھی شاعرانہ لب و لہجہ سماجی حالات ہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے، قوم و ملک کے اسی درد کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنی ذات کو تقریباً فنا کر دیا اور ان کی شاعری میں "ہم" نے "میں" کی جگہ لے لی۔ ہم دیکھتے ہیں حالی وغیرہ کی شاعری میں جنگ آزادی کے بعد کے ہندوستان اور خصوصاً مسلمان قوم کا غم و درد تو مل جاتا ہے لیکن خود شاعر کا پتہ کم ہی چلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ قوم کو اس کی موجودہ پسماندگی اور گزشتہ عظمت کا احساس دلاتے ہوتے حالی ایک تیسرے شخص (Third Person) کا کردار ادا کرتے ہیں۔

اقبال کا مقصد بھی کم و بیش وہی تھا جو ان کے پیشرو حالی اور ان کے دوسرے ساتھیوں کا تھا لیکن چونکہ ان کے دور تک آتے آتے سیاسی اور سماجی طور پر قوم کچھ آگے بڑھ چکی تھی اور اب وہ اپنے مسائل پر زیادہ سنجیدگی اور گہرائی سے سوچ سکتی تھی۔ اس لئے اقبال کے لہجے میں ایک فلسفیانہ انداز ملتا ہے اس کے باوجود اقبال اپنی نظموں میں ہمیں سوچتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص مسائل پر سوچ بچار کر کے ایک نتیجہ پر پہنچ چکا ہے اور اپنے پیروؤں کو "راہ نجات" دکھا رہا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مخاطبین یا اپنی قوم کی علامت نہیں بن پاتے۔ اقبال اپنی قوم کو ماضی کی عظمت یاد دلاتے ہیں۔ اس کی موجودہ زبوں حالی کا احساس دلاتے ہیں اور اس کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں۔ لیکن اس پورے عمل میں ان کا کردار بھی Third person ہی کا سا رہتا ہے۔ وہ ایک اونچے مقام سے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں، منظر کو دیکھ کر بے قرار ہو جاتے ہیں اور انتہائی کرب کے ساتھ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ ایک منظم فلسفۂ حیات کی شکل میں عموماً پوری انسانی برادری اور خصوصاً اپنی قوم کو جینے کا ڈھنگ بھی سکھاتے ہیں۔ لیکن زندگی کے اس کارواں میں ایک عام انسان کی حیثیت سے شامل نہیں ہوتے ۔ وہ اپنی ذات میں اپنے مخاطبین کا عکس دیکھنے کے بجائے اپنے مخاطبین کی ذات میں اپنے خیالات اور اپنی ذات کا پرتو دیکھنا چاہتے ہیں ۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے ۔۔۔ مرا عشق میری نظر بخش دے

اس لئے ان کی نظمیں پڑھتے وقت احساس ہوتا ہے کہ ہم تک کافی بلندی سے کوئی "عظیم آواز" پہنچ رہی ہے جو ہمیں راستہ تو دکھا سکتی ہے، ہمیں اپنی کمزوریوں سے آگاہ تو کر سکتی ہے۔ ہمارے غم و درد اور مسرت و انبساط سے واقف تو ہے لیکن ہم سے الگ بھی ہے اور بلند بھی، چنانچہ ہم اس آواز سے مرعوب بھی ہوتے ہیں اور متاثر بھی۔ لیکن اس آواز کو اپنی آواز نہیں سمجھ سکتے۔

تو مردِ میداں تو میرِ لشکر ؛ نوری حضوری تیرے سپاہی
کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی ؛ یہ بے سوادی یہ کم نگاہی

دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ
دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

دیکھا آپ نے۔ شاعر نے اپنی ذات کو اپنے مخاطبین کی ذات سے کس طرح بچا کے رکھا ہے۔

یہاں زیرِ بحث مسئلہ یہ نہیں ہے کہ بیانیہ شاعری کی بذاتِ خود کیا اہمیت ہے یا شاعری میں شاعر کا "شخصِ ثالث" کا سا رول بڑی شاعری کا ضامن ہوتا ہے یا نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ آج سے پہلے نظموں کے لہجے کا غالب رجحان کیا تھا۔ عشقیہ نظمیں صرف دو افراد کا معاملہ ہوتی ہیں اسلئے ان سے فی الحال بحث نہیں تاہم یہاں یہ اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دو افراد کے اس معاملے میں بھی عموماً سامعین کے گروہ کو شامل کر لیا جاتا رہا ہے اور شاعر کی آواز کافی اونچی اور لہجہ بڑی حد تک مقررانہ سا ہو گیا۔ گویا یہاں بھی خود کلامی یا سرگوشی کا انداز کم ہی ملتا ہے۔ اس سلسلے میں اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی کی رومانی نظموں کا مطالعہ کافی ہوگا ویسے بھی ان شعرا اور خصوصاً جوش کی آواز کی سطح کبھی بھی اتنی نیچی نہیں ہوتی کہ اس پر خود کلامی تو خیر دور کی بات ہے سرگوشی کا بھی گمان ہو سکے۔ مسائلی نظموں میں تو یہ سطح اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ اس پر کسی خوش گلو کے "ماشن" کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ جسے سن کر قاری چونک بھی پڑتا ہے اور مرعوب بھی ہو جاتا ہے لیکن آواز دینے والے سے اپنے آپ کو قریب محسوس نہیں کرتا۔

ترقی پسند شعرا پہا علانیہ بیان کی حد تک اقبال اور جوش کا اثر نمایاں طور پر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان شعرا کے پاس ایک واضح پیغام

نصب العین بن گیا ہے جس نے ایک عقیدے کی صورت اختیار کر لی ہے۔
اقبال اور جوش کی High volume شاعری کے ساتھ سیاسی
نصب العین اور راسخ العقیدگی کے ملاپ نے ان شعراء کے لہجے کو بہت
اونچا کر دیا ہے۔ جو بعض اوقات ناگواری کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ میں
یہاں بھی یہ بات دوہراؤں گا کہ ترقی پسندوں کے لہجے کو بنانے اور بگاڑنے
میں بھی ان کے اپنے دور کے سیاسی اور سماجی عوامل کارفرما تھے۔ سیاسی
اعتبار سے وہ دور بھی حالی اور اقبال کے دور سے بہت زیادہ مختلف
نہیں تھا۔ یعنی غیر ملکی سامراج سے اس وقت بھی چھٹکارا نصیب نہ ہو سکا
تھا۔ البتہ ایک عام بیداری کی لہر دوڑ رہی تھی۔ پہلے کے مقابلے میں غیر ملکی
حکومت کے خلاف نفرت اور بغاوت کا جذبہ شدت اختیار کر چکا تھا
کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں عام لوگوں اور پڑھے لکھے طبقے میں ایک
جو انتہا پسندی کا سا جوش پیدا ہو رہا تھا جو کانگریس کی نسبتاً "نرم پالیسی" سے
مختلف تھا۔ اسی اختلاف کی وجہ سے ۴۷ یعنی حصول آزادی کے بعد بھی ترقی
پسند شعراء کے لہجہ کی تلخی اور تیزی میں کمی نہ آسکی۔ چنانچہ ترقی پسندوں
کی آواز اتنی اونچی محسوس ہوتی ہے جس کی مثال اردو میں اس سے پہلے کہیں
نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کے لہجے پر عام سیاسی لیڈر کے لہجے کی چھاپ
نمایاں ہو گئی۔ اور نظموں پر جذباتی سیاسی نعروں کا گمان ہونے لگا (میں
یہاں فیض، مخدوم اور بڑی حد تک مجاز و جذبی کو مستثنیات میں شامل
کر رہا ہوں) لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس زمانے میں ترقی پسندی کی نمائندہ
مثال سردار جعفری اور ساحر کی نظمیں کہنے والے سمجھے جانے لگے تھے
جن کا لہجہ کچھ اس قسم کا تھا۔

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کو چلانے والے ہیں ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

اس کے علاوہ ایک اور بات جو ہمیں اس شاعری میں نظر آتی ہے وہ
یہ ہے کہ ان شعراء کے کلام میں کسان، مزدور اور پچھڑے ہوئے طبقہ کے
افراد کا ذکر تو ملتا ہے لیکن خود ان شعراء پر کسان، مزدور ہونے کا گمان
نہیں ہوتا۔ اور یہ شعراء بھی کسی اونچے پلیٹ فارم سے مجمع کو خطاب کرتے
ہوئے نظر آتے ہیں مگر خود مجمع کا جزو نہیں بن پاتے۔ یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی

اشیاع

ہے کہ ان کا "میں" ظاہری طور پر تو "ہم" بن جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود
وہ "میں" ہی رہتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی آواز بھی "تیسرے آدمی" (Third
person) کی آواز ہی رہتی ہے اور سننے والے کو اس پر اپنی آواز کا
گمان نہیں ہوتا جس کے نتیجے کے طور پر سامع جوشِ بیان سے مرعوب تو ہو
جاتا ہے لیکن ذہن کی اندرونی سطحوں تک متاثر نہیں ہوتا۔ ترقی پسند
شاعری میں ایسے چند ہی مقام آئے ہوں گے جب شاعر کی آواز پر پڑھنے
والے کو خود اپنی آواز کا گمان ہو سکے ورنہ عام طور پر شاعر اور سامع کے
درمیان ایک نمایاں خطِ امتیاز نظر آتا ہے۔

گو بڑی چیز ہے غمخواریٔ اربابِ وفا
کتنے بیگانۂ آئینِ وفا ہیں یہ لوگ
زخم در زخم محبت کے چمن زار میں بھی
فقط اک غنچۂ منطق کے گدا ہیں یہ لوگ (احمد ندیم قاسمی)

خط کشیدہ ردیف ہی شاعر اور سامع میں غیریت کی ضمانت دیتی ہے اور
یہی رویہ ترقی پسند شعراء کے یہاں عام طور سے ملتا ہے۔

حسینوں پہ بجلی گراتا گزر جا
تمنا کے شعلے بجھاتا گزر جا
نظر سے نظر یوں ملاتا گزر جا
تجھے جیسے آتا نہیں مسکرانا
مسافر کہیں راہ مت بھول جانا (جاں نثار اختر)

میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی مزید مثالیں دینے کی کوئی خاص ضرورت
نہیں ہے کیوں کہ ادب کے ہر طالب علم پر یہ بات روشن ہے کہ ترقی پسند شعراء
میں یہ لہجہ قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس پس منظر میں جب ہم نئی نظموں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ایک
واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ نیا شاعر جمع متکلم کے بجائے واحد متکلم کا
صیغہ استعمال کرتا ہے شاید اسی وجہ سے نئی شاعری پر سرسری نگاہ ڈالنے
والوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ شاعر اپنی ذات سے باہر ہی نہیں نکلتا
لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو بآسانی پتہ چل جاتا ہے کہ آج کے شاعر
کے "میں" میں ہر پڑھنے اور سننے والا اسی طرح پوشیدہ ہوتا ہے جس طرح خود
شاعر۔ گویا نئی شاعری کا "واحد متکلم" اپنے معاشرے کی علامت یا نمائندہ

بن کر ابھرتا ہے اور چونکہ وہ اپنے معاشرے کی علامت یا نمائندہ ہے اس لئے اس کا اپنے آپ سے خطاب بھی دراصل اپنے معاشرے سے خطاب ہوگا البتہ عام معنی میں کوئی بڑا مجمع یا گروہ اس کے سامنے موجود نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے پیش روؤں کی طرح اسے اپنی آواز کو اونچا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ اس میں خود کلامی کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

بدلتی رت کی اداس آواز میرے کانوں میں آ رہی ہے۔

میں صحنِ گلشن میں کیسے جاؤں
کیسے وہاں میں گلے لگاؤں
یہیں دریچے سے دیکھتا ہوں
بہار کے آخری شگوفوں کے گرد آلود زرد چہرے
صبا کے ٹوٹے ہوئے پروں سے
الجھ گئے سارے خواب میرے (بہار کے بعد۔ بلراج کومل)

اگر کبھی یہ لہجہ اونچا ہو بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ سرگوشی کی حد تک آتا ہے۔ گویا نیا شاعر مجمع یا گروہ سامعین سے اوپر اٹھ کر یا الگ ہو کر مخاطب ہونے کے بجائے اس کا جزو بن کر رہتا ہے اور اپنی ذات کے توسط سے ہر مخاطب سے فرداً فرداً گفتگو کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی آواز Third Person کی آواز نہیں معلوم ہوتی بلکہ ہر سننے والے کو اس پر اپنی آواز کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اس طرح سے شاعر اور سامع کا فاصلہ کم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی مٹ سا جاتا ہے اور ہر پڑھنے والا اپنے آپ کو شاعر کی جگہ محسوس کرنے لگتا ہے :۔

درختوں کے نیچے
کوئی زرد پتوں بھری کونپلوں
ادھ کھلی خشک کلیوں کی چادر بچھائے
ترا منتظر ہے

بتا کون ہے تو
کہ یہ دل ازل سے تجھے جانتا ہے
تجھے تیری آہٹ سے پہچانتا ہے (وزیر آغا)

آج کا شاعر جب اپنی ذات کا سفر کرتا ہے تو ذہنی طور پر اس کا سامع اور قاری بھی اس سفر میں اس کے ہمراہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اس سفر کو اپنی ذات کا سفر محسوس کرنے پر مجبور ہے۔ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ آج کا شاعر اپنے دور اور سماج کا نمائندہ ہے۔ اسی کا ایک جزو ہے۔ اس لئے ہم بڑی آسانی سے جزو "میں کل" کا تماشہ کر سکتے ہیں۔

گھر سے باہر آ کر وہ کبڑا بوڑھا
مجھ سے بولا
بیٹے مجھ کو پیٹھ پہ لاد کے تھوڑی دور ادھر پہنچا دے
میں نے سوچا
یہ بوڑھا یہ مٹھی بھر روئی کا گالا
اس کو تھوڑی دور ادھر پہنچانا ہے
کیا مشکل ہے
لیکن جب وہ پیٹھ پہ بیٹھا
ناچ گئے آنکھوں میں تارے
ہڈی ہڈی، پسلی پسلی چیخ گئی (عمیق حنفی)

میں قیدی ہوں، اسی لمحے، اسی جھونکے کا جو آنکھوں سے اوجھل ہے
مگر محسوس کرتا ہوں میں اس کے سخت ہاتھوں کو
کہ جن میں میرا جسم ناتواں جکڑا ہوا ہے
چھڑا پاتا بھی نہیں ممکن (کمار پاشی)

میں جب بھی لہجے کی اس تبدیلی پر غور کرتا ہوں تو ایک بات روشن ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ آج کا شاعر جذبات سے زیادہ ذہن کا شاعر ہے کیونکہ آج کے دور کا انسان "ذہن کی زبان" میں بات کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب ذہن کو زبان ملتی ہے تو بات سوچ سوچ کر اور رک رک کر کی جاتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر آواز یا لہجہ اونچا ہونے کے بجائے پھیل جاتا ہے۔ اس میں ایک قسم کی نرمی اور گہرائی راہ پانے لگتی ہے۔ ممکن ہے اس عمل میں کبھی کبھی وہ والہانہ پن گھائل ہو جائے جو ہماری شاعری اور خصوصاً غزلیہ شاعری کی جان ہے۔ لیکن یہی کمی ہمارے ذہن کو متحرک کر دیتی ہے اور ہماری سوچ کی راہیں کشادہ ہو جاتی ہیں۔

پھر چمکیلی دھوپ آ سکے گی
فصل پکے گی
گیہوں کے متوالے پودے سرمستی میں جھوم اٹھیں گے
رس آنے کا
پھر میرے کھیتوں کی ہوائیں خوشبوؤں میں جھولیں گی

. . . .

بیتے لمحوں کی آوازیں
پھر کانوں میں آتی ہیں
کل بھی یہی سورج نکلا تھا
صبح کی میٹھی نرم ہوا میں
ذرہ ذرہ پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا
شام ہوئی تو میرا اپنا سایہ مجھ سے روٹھ گیا تھا
میرے اپنے پاؤں کے نیچے دفن ہوا تھا (خلیل الرحمٰن اعظمی)

اس اقتباس کی پہلی پانچ سطریں ایک قسم کی "باآواز سوچ" ہے یا ہم اسے خود کلامی کا نام دے سکتے ہیں، شاعر اپنے آپ سے گفتگو کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ نیچے کی سطروں میں وہ "بیتے لمحوں" کی آواز بازگشت سے اپنا دامن چھڑا کر جب حقائق تک پہنچتا ہے تو ایک بھیانک سچائی سے دوچار ہوتا ہے اور یہی تضاد نظم کے حسن اور شاعر کے ذہنی عمل کے اظہار کا ضامن ہے۔

ایلیٹ کا قول ہے کہ "عظیم شاعری سے لطف اندوز ہونے میں ایک حصہ تو اس "لطف" کا ہے جو ہم ان لفظوں کو چپ چپاتے سننے سے حاصل کرتے ہیں جو ہم سے خطاب کر کے نہیں لکھے گئے" یہاں ایلیٹ کا اشارہ ایسی نظموں کی طرف ہے جن میں خود کلامی غالب عنصر کا درجہ رکھتی ہے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ کیا کوئی قطعی ذاتی یا انفرادی احساس یا ردِّ عمل قاری کے لئے بھی اتنا ہی اہم ہو سکتا ہے جتنا شاعر کے لئے نظم کہتے وقت تھا؟ کیوں کہ جب تک شاعر کا احساس، خیال یا ردِّ عمل پڑھنے والوں کے احساس، خیال یا ردِّ عمل سے ہم آہنگ نہیں ہو جاتا یا بہ الفاظ دیگر شاعر جب تک اپنے احساس یا ردِّ عمل میں کسی حد تک قاری کو بھی شریک نہیں کر پاتا عظیم شاعری کی تو دور کی بات ہے اچھی شاعری بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرگوشی یا خود کلامی کے لہجہ میں

عظیم شاعری ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود کلامی کے انداز کے باوجود شاعر بیرونی یا خارجی ماحول سے اپنا ناطہ نہیں توڑتا بلکہ وہ خارجی عوامل کو اپنے آپ میں جذب کر کے، ان پر اپنے انفرادی نقطۂ نظر سے غور کر کے اور ان میں اپنی ذات کو شامل کر کے دوبارہ اپنے قارئین کو لوٹا دیتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا میرے نزدیک ایک بہت بڑی غلطی ہو گی کہ خود کلامی کے لہجہ میں صرف قطعی داخلی موضوعات ہی نظم کا روپ دھار سکتے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ جب شاعر خارجی ماحول پر صرف سرسری انداز سے نظر نہیں ڈالتا بلکہ ان خارجی مظاہر کے اندر چھپے ہوئے رشتوں پر غور کرتا ہے اور اپنے ذاتی نقطۂ نگاہ سے ان کی اصل کا تجزیہ کرتا ہے تو خود کلامی کا انداز جنم لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس انداز کی نظمیں اپنے اندر ایک سے زیادہ معنوی سطحیں رکھتی ہیں اور ہر درجہ کا قاری ان سے حسب توفیق لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی نظمیں عام "نیچرل" نظموں سے زیادہ گہرائی کی حامل ہوتی ہیں، اور اپنے اندر عام بیانیہ نظموں کے مقابلے میں زیادہ ذہنی آسودگی بخشنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

ہر گھنا پیڑ نروان کی آس میں گم ہے
سوکھی ہوئی ٹہنیاں سب صلیبیں ہیں
ہر غار جیسے کسی جبرئیل امیں کے لئے وا ہے
کیلاش چپ چاپ ہیں

. . . .

جھاڑیوں میں پراسرار سی سرسراہٹ
کوئی پیغام —— قدموں کی آہٹ
نہیں —— کچھ نہیں
ایک چرواہا بھیڑوں کا گلہ لئے آ گیا
سبزہ زاروں پہ معصوم بھیڑیں بڑھیں
دیکھتے دیکھتے
پتی پتی کی تحریر، قدرت کے اسرار سب چر گئیں (قاضی سلیم)

میں نے اوپر کہا ہے کہ لہجے کی یہ تبدیلی (اونچی آواز سے خود کلامی یا سرگوشی تک کا سفر) شاعری میں سوچ کے غلبہ کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ شاعر نے اپنے آپ کو اپنی ذات کے خول میں محصور کر لیا ہے

الشعاع

میری اس بات کا ثبوت اوپر دیئے گئے اقتباسات سے مل جائے گا۔ یہاں میں ایک بار پھر عرض کروں گا کہ سطحی نظر سے دیکھنے پر جو بات قطعی انفرادی اور ذاتی نظر آتی ہے۔ وہ بھی درحقیقت اتنی ذاتی نہیں ہوتی۔

ایک سفر پہ نکلا تھا میں
اپنا سب کچھ چھوڑ کے ایک دن
سائے مجھ کو ڈھونڈنے آتے پا نہ سکے

. . . .

میرے کانوں میں بھی کبھی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ کی تھکی ہوئی آوازیں
قطرہ قطرہ بن کر ٹپکیں
ذہن میں اک طوفان اٹھا اور بادل بن کر
نئے خیالوں کے پودوں پہ برس گیا

(اپنے سفر کے آئینے میں — باقر مہدی)

یہ مصرعے صرف شاعر ہی کے نہیں بلکہ اس دور کے ہر حساس اور سوچنے والے فرد کے ذہنی سفر کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ شاعر کا "میں" ہر ذہن کے قاری کا "میں" بن کر ابھرتا ہے۔ اس طرح شاعر اور اس کے قاری کے درمیان کا وہ فاصلہ مٹ جاتا ہے جو بیانیہ اور خطابیہ انداز کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ خطابیہ انداز سے اس طرز اظہار تک کے سفر میں کتنے اہم، نازک اور خطرناک موڑ آتے ہیں جن سے گزرتے وقت ممکن ہے شاعر کہیں کہیں اپنا توازن کھو دے۔ لیکن جہاں جہاں وہ ان منزلوں سے سلامت روی کے ساتھ گزر گیا ہے نئی نظم میں خوشگوار اضافے ہوئے ہیں۔ مزید اقتباسات سے گریز کرتے ہوئے میں یہاں چند ایسے کامیاب نئے شعراء کا تذکرہ کروں گا جنھوں نے اس سفر کو کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے

وحید اختر۔ ساقی فاروقی۔ عرش صدیقی۔ مصطفیٰ زیدی۔
محمد علوی۔ ندا فاضلی۔ انجم اعظمی۔ محبوب خزاں۔

میں نے اپنے اس مضمون میں اختر الایمان۔ میراجی۔ مجید امجد مختار صدیقی۔ اور قیوم نظر کی نظموں کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا ہے کہ ان کے لہجے کی نسبت سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور یہ بات بھی قریب قریب طے ہو چکی ہے کہ نئے شعراء کے اس بدلتے ہوئے لہجے پر کسی نہ کسی حد تک اختر الایمان اور میراجی اثر انداز ہوئے ہیں تاہم ان شعراء اور نئے لکھنے والوں کے لہجے میں ایک نازک فرق بھی ہے جسے واضح کرنے کے لئے علیحدہ مضمون درکار ہوگا۔ چلتے چلتے اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دوں کہ لہجہ کا یہ دھیما پن اپنے خول میں سمٹنے کے رجحان کی پیداوار نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا اور نئے شاعر صرف اپنی ذات تک ہی محدود رہتے تو غزل میں رجحان تک قطعی داخلی احساسات کی آئینہ بردار تھی جس کی وجہ سے اس پر زیر لب گفتگو کا احساس ہوتا تھا) لہجہ کی وہ تبدیلی واقع نہ ہوتی جو موجودہ نئے غزل کہنے والوں کے ہاں ملتی ہے۔

صفحہ ۵۴ کا بقیہ

خونی درخت

خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرتے ہی میرا وجود پرواز کے لائق ہو جائے گا۔"

دوسری صبح ہم نے اپنے ساتھ زمین کھودنے کے اوزار اور پٹرول کے کئی ٹن ساتھ لئے اور اس جگہ چل پڑے جہاں وہ منحوس درخت اگا ہوا تھا۔ ہم نے پٹرول کے ڈبے اس پر خالی کر دیئے اور آگ لگا دی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت اس درخت سے کچھ ایسی ہی صدا بلند ہوئی تھی جیسے کوئی انتہائی کرب کے عالم میں چیخ پڑا ہو۔ ہم نے اسی پر ختم نہیں کیا بلکہ اس کی جڑوں تک کو کھود نکالا۔

اس کی جڑوں میں ہمیں عجیب عجیب اشیاء پھنسی ہوئی ملیں۔ کھودنے سے پیدا ہونے والے غار میں انسانی سروں کے بے شمار ڈھانچے، کپڑے، زیورات اور گمشدہ مزدور رحمت بیگ کی لاش بھی تھی جو کپڑوں سے پہچانی جا سکی۔ سب سے زیادہ خوفناک چیز جو ہمیں اس غار یا قبر میں ملی وہ ایک عجیب و غریب جسم تھا۔ میں اسے جسم ہی کہوں گا۔ ایسا جسم جس پر پیلے رنگ کے لمبے لمبے روئیں لگے ہوئے تھے۔ یہ سڑا ہوا جسم ہو بہو کسی بوڑھی اور موٹی عورت کا لاشہ معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے اسے بھی پھونک دیا۔ اور اس روز شام ڈھلے تک اس غار میں آگ جلتی رہی۔ مگر یہ عقدہ میرے لئے البتہ آج تک لاینحل بنا ہوا ہے کہ اس غار میں آخر اتنی بہت سی اشیاء پہنچ کس طرح گئی تھیں۔

خواجہ جمیل احمد

زمانہ قدیم میں تہذیب اور تمدن کے اہم ترین گہوارے فارس (ایران) کی تمدنی ترقی میں اسلام نے چار چاند لگائے اور زمانہ وسطیٰ میں اسے تہذیب و تمدن کی ترقی کے آخری منازل تک پہنچا دیا۔ دنیائے اسلام کے عظیم ترین مدبر ابن سینا۔ امام غزالی۔ البیرونی۔ زکریا رازی۔ نصیر الدین طوسی۔ اور عمر خیام۔ شہرہ آفاق شعرا فردوسی، سعدی، حافظ، رومی، عرفی اور خاقانی، نامور وزراء اور ناظمین سلطنت یحییٰ برمکی، جعفر برمکی۔ نظام الملک طوسی اور حسن بن سہل، فنون لطیفہ کے عظیم ماہرین اصفہانی۔ بہزاد مانی اور رضا عباسی اسی خطہ کی خاک سے اٹھے اور انہوں نے اپنے علم و فنون کی روشنی سے زمانہ وسطیٰ کی دنیا کو منور کر دیا۔ انہیں کے علوم و فنون کی ضوفشانیوں نے کرۂ ارض مغرب کی تاریکیوں کو دور کیا اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بنیں۔ ابن سینا، رازی، عمر خیام۔ بیرونی اور غزالی کی تصانیف اور ان کے افکار نے یورپ کو بہت زیادہ متاثر کیا اور ان کی تصانیف اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپ کے اعلیٰ ترین مدارس کے نصاب میں داخل تھیں۔

عرصہ دراز تک اصفہان اس مہذب اور ترقی یافتہ ملک کا صدر مقام رہا۔ خوبصورت مہکتے ہوئے باغوں لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں اور صاف و شفاف چشموں کے درمیان گھرا ہوا یہ بارونق شہر اپنی خوبصورت عمارتوں اور علوم و فنون کے ذخائر کے لیے مشہور تھا۔ فارس میں یہ علوم و فنون کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ فارسی کے مشہور شاعر کاشانی نے اس کی تعریف میں ۸۰ اشعار کا ایک معرکۃ الآرا قصیدہ لکھا ہے۔

اصفہان

اور فارس کی دیگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی ریشہ دوانیوں، چشمکوں اور رقابتوں کی وجہ سے مشہور فاتح تیمور صاحبقراں نے ۱۳۸۸ء میں اس شہر کو تاراج کیا، اور شہریوں کو ناقابل فراموش سبق دیا۔

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق اعظم کے عہد خلافت میں یہ شہر فتح ہوا۔ مشہور مورخ ابن رستا نے جو یہاں کا باشندہ تھا اور جس نے ۹۰۳ء میں اپنی شہرہ آفاق تاریخ لکھی تھی اس شہر میں چار عظیم الشان دروازوں اور ایک سو میناروں کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں یہ شہر سامانی کا ایک اہم مرکز بن گیا اور اس کے قرب و جوار میں چاندی۔ تانبہ۔ پیتل، سیسہ اور سرمہ کی کانیں تھیں۔ یہ شہر دریائے زائندہ رود کے کنارے واقع ہے۔ اس پر تین خوبصورت پل تعمیر کئے گئے ہیں۔ ان میں سب سے شاندار اور خوبصورت پل خاجو ہے جو دو منزلہ ہے اور اس پر دریا کی سیر کرنے کے لئے روشیں، برآمدے اور محرابیں تعمیر کی گئی ہیں۔

اصفہان جس نے بڑی حد تک اپنی سابقہ رونق کھو دی ہے اب بھی اپنے حسن اور خوشگوار آب و ہوا کے لیے مشہور ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں خاندان بویہ کے سلطان رکن الدولہ نے قرب و جوار کے متعدد دیہاتوں

کر اس شہر میں شامل کر لیا ان دنوں یہ شہر روئی، دوئی اور سات پولوں کی ترقی کر رہا تھا۔ اصفہان اور فارس کی دیگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی ریشہ دوانیوں اور چپقلشوں اور رقابتوں کی وجہ سے مشہور فاتح تیمور صاحبقراں نے [illegible] میں اس شہر کو تاراج کیا۔ اور اس کے باغی شہریوں کو ناقابل فراموش سبق دیا

سولہویں صدی عیسوی میں جب شاہان صفوی برسر اقتدار آگئے تو اصفہان نے اپنی شان و شوکت اور رونق دوبارہ حاصل کر لی اور جلد ہی یہ مشرق میں علوم و فنون کا اہم ترین مرکز بن گیا۔ یہ شہر شاہ عباس صفوی اول کے عہد حکومت میں اپنے انتہائی عروج پر پہنچا۔ شاہ عباس علوم و فنون کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ اور اس نے اس خوبصورت شہر کو بے شمار دلکش باغوں۔ پارکوں۔ فواروں۔ عظیم الشان کالجوں۔ محلوں۔ مسجدوں بازاروں، غسلخانوں اور کارواں سرایوں سے مزین کیا۔ اس کے عہد حکومت میں اس شہر کی آبادی چھ لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی۔ شاہ عباس کے عہد حکومت میں اصفہان میں ۱۶۲ عظیم الشان مساجد۔ ۴۸ کالج۔ ۲۷۳ غسلخانے۔ ۱۸۰۲ کارواں سرائے اور ۱۲ وسیع قبرستان واقع تھے سترھویں صدی عیسوی ہی میں "اصفہان نصف جہان" کا مقولہ زبان زد خاص و عام تھا۔ جدید اصفہان کو سب سے زیادہ نقصان اٹھارویں صدی عیسوی میں افغانیوں کے حملے سے پہنچا۔

اصفہان جو مشرق میں علوم و فنون کا اہم ترین مرکز تھا اپنے عظیم الشان مدرسوں اور فنون کے اداروں کے لئے مشہور تھا۔ سلجوقیوں کے شہرۂ آفاق وزیر نظام الملک طوسی جنہوں نے دنیائے اسلام کے متعدد شہروں میں اہم تعلیمی درسگاہیں تعمیر کی تھیں اصفہان میں بھی متعدد مدارس تعمیر کئے۔ شاہان صفوی کے زمانے میں ایک فرانسیسی سیاح نے ایسے ۴۸ مدرسے اصفہان میں دیکھے تھے۔ ان مدرسوں میں بڑے بڑے کتب خانے واقع تھے۔ اصفہان میں چار باغ کے مشرقی جانب مدرسہ شاہ سلطان حسین واقع تھا جو [illegible] میں تعمیر ہوا۔ لارڈ کرزن نے ۱۸۹۲ء میں فارس کا دورہ کیا تھا۔ اس مدرسے کے کھنڈرات کو فارس کے عظیم ترین کھنڈرات تسلیم کیا ہے۔ حال ہی میں اس مدرسے کی از سر نو تعمیر ہوئی ہے۔

شاہ عباس دوم کے عہد حکومت میں اصفہان فنون کا اہم ترین مرکز تھا اور اس کی شہرت اور عظمت میں برابر ترقی ہو رہی تھی۔ استاد مہدی نے جو یہاں کے شہرۂ آفاق مصور تھے۔ مصوری کے تبریزی اور اصفہانی اسکولوں کی درمیانی کڑی فراہم کی۔

وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مناظر قدرت کو کاغذ پر منتقل کیا۔ اور بڑی چابکدستی اور خوبصورتی کے ساتھ اپنے مشاہدہ کی عکاسی کی ہے ان کی جانشینی کا شرف رضا عباسی کو حاصل ہوا جو اصفہان کے باشندے تھے اور جن کا شمار ایران کے عظیم ترین مصوروں میں ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ جدید ایران کے عظیم ترین مصور تسلیم کئے جاتے ہیں۔ شادمانی کی دیگر تصاویر بنانے میں وہ اپنے جواب نہیں رکھتے ہیں اور انھوں نے عام موضوعات سے متعلق بہت کامیاب اور خوبصورت مصوری کی ہے۔ بحیثیت مصور کے وہ بہزاد کے ہم پلہ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مصوری میں محمد قاسم میر محمد علی اور محمد یوسف نے رضا عباس کی پیروی کی اور عباس کے طرز کو زندہ رکھا ایرانی مصوری نے مشرقی ممالک کی مصوری کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ اور ہندوستان میں مغل مصوری کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ مغلوں کی مصوری میں ایرانی مصوری کا اثر نمایاں طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔

اصفہان میں ایران کی بہترین اور خوبصورت ترین عمارتیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے شاندار اور خوبصورت اصفہان کی جامع مسجد ہے۔ "یہ شاہی مسجد جسے ۱۶۱۱ء میں شاہ عباس اول نے تعمیر کیا دنیا کی خوبصورت ترین عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے اور ساری کی ساری یہ خوبصورت رنگین ٹائلوں سے مزین کی گئی ہے" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)۔ ایرانیوں نے انہی مسجدوں کی تعمیر میں ایک جدت پیدا کی اور مسجدوں سے ملحق مدرسے تعمیر کئے۔ اس طرح وہ مدرسے والی مسجد کے بانی ہوئے۔ بعد ازاں اس قسم کی مساجد سارے عالم اسلام میں تعمیر ہونے لگیں۔ ایک یورپین مصنف کے قول کے مطابق "اپنے نازک میناروں۔ شاندار دالانوں اور دروازوں اور بلند منقش گنبدوں کی وجہ سے یہ عمارتیں (مساجد) مشرق کی بہترین اور حیرت انگیز عمارتوں میں شمار کی جاتی تھیں"۔

اصفہان جس کی شان میں فارسی شعرا ورطب اللسان ہیں، اسلامی علوم و فنون کا اہم مرکز تھا۔ اس شہر میں دنیائے اسلام کے عظیم ترین مفکر ابن سینا، شہرۂ آفاق موسیقی دان ابو الفرج اصفہانی۔

مشہور مورخ دنیا وری اور نامور عالم دین امام الدین خطیب نے اپنی زندگی کا کافی حصہ گزارا ہے۔ اصفہان کے فرمانروا علاء الدولہ نے ابن سینا کو اپنے دربار میں خوش آمدید کہا۔ اور اسی شہر میں ابن سینا نے اپنی متعدد لافانی تصانیف مکمل کیں۔ اسی شہر میں ابن سینا پہ درد قولنج کا شدید دورہ پڑا۔ اور اس مرض میں جس کے وہ دنیا میں سب سے بڑے ماہر تسلیم کئے جاتے تھے آخر کار ۱۰۳۷ء میں ابن سینا کا انتقال ہوا۔

ابوالفراج اصفہانی (۸۹۷-۹۶۷ء) دنیائے اسلام کا عظیم ترین ادبی مورخ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی مشہور تصنیف "کتاب الاغنی" جس کی پہلی نقل ہسپانوی خلیفہ الحکم ثانی نے ایک ہزار دینار سرخ کے بدلے خریدا تھا، ابن خلدون کے قول کے مطابق عربی ادب اور تاریخ کا ذخیرہ ہے۔ اصفہانی کی یہ عظیم تصنیف اکیس ۲۱ جلدوں پر مشتمل ہے۔ بعد ازاں اصفہانی نے موسیقی سے متعلق چار اور کتابیں لکھیں جو موسیقی سے متعلق نظریوں اور سائنس کا خزانہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہیں۔ مغربی نقادوں کے قول کے مطابق مغربی دنیا نے گذشتہ ہزار سال میں کوئی ایسی کتاب نہیں پیش کی جو اصفہانی الاغنی کا مقابلہ کر سکے۔ اس میں مشرقی موسیقی کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے عجائب خانہ میں جو قدیم ترین آسطرلاب محفوظ ہے وہ ۹۸۴ء میں اصفہان کے احمد اور محمود بن ابراہیم کا بنایا ہوا ہے۔

ایک اور مشہور مورخ ابوحنیفہ احمد ابن داؤد بھی اصفہان کے باشندے تھے۔ انھوں نے تاریخ کی ایک مشہور کتاب لکھی ہے۔

اصفہان کے ایک دوسرے مشہور ادیب حمزہ الاصفہانی تھے جن کا انتقال ۹۶۱ء میں ہوا انھوں نے ادبی تنقید پر ایک بیش بہا تصنیف چھوڑی ہے جو موجودہ یورپ میں بہت مقبول ہوئی۔ امام الدین خطیب اصفہانی جو مشہور عالم دین اور ادیب تھے، اپنی طرز تحریر کے لئے مشہور ہیں۔

فارس کے شاہان صفوی کے عہد حکومت میں اصفہان اپنی شہرت اور عروج کی آخری منازل پر پہنچ گیا تھا۔ جب بغداد اور قرطبہ کی تباہی اور زوال کے بعد دنیائے اسلام پر سائنسی علوم سے متعلق تگ و دو کم ہو گئی۔ اور سائنس سے متعلق جدوجہد ماند پڑ گئی تو مسلمانوں نے آرٹ اور ثقافت کی جانب زیادہ توجہ دینی شروع کی اور شاہان صفوی کے عہد حکومت میں آرٹ اور ثقافت اصفہان میں اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئے۔

صفحہ ۲۸ کا بقیہ ——— کفارہ

بڑی آنکھیں بالکل بند تھیں اور پلکیں گول گول رخساروں پر سایہ فگن۔ وہ ٹکٹکی باندھے منو کو دیکھتی رہیں۔ وقت کا احساس ان کے ذہن سے مٹ چکا تھا۔ منو کے کومل ہونٹ ہلے چہرہ تمتمانے لگا یوں جیسے بخار بہت شدید ہو گیا ہو۔ جیسے وہ ہلکے سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ اب تو وہ تتلا تتلا کر بولنے لگا تھا۔ پھوپی بے خود سی اٹھیں، کرسی سے اتر کر منو کے بے حد قریب آگئیں۔ منو کیا کہنا چاہتا ہے یہ سننے کے لئے وہ اپنے کان منو کے ہونٹوں کے قریب لے گئیں۔ اور پھر یہ تو خود وہ بھی نہیں جانتیں کہ یہ کیسے ہوا کہ ان کے ہونٹ منو کی گرم گرم پیشانی سے جا لگے۔ اپنے سرد ہونٹوں کو منو کی پیشانی سے لگا کر انھوں نے آنکھیں موندنا چاہا ہی تھا کہ منو جاگ پڑا۔ اس کی کھلی کھلی آنکھیں پھوپی کے اندر تک اتر گئیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ منو نے پھوپی کی چوری پکڑی تھی اور اب وہ اپنی فتح پر مسکرا رہا تھا۔ منو کی مسکراہٹ نے پھوپی کو جیسے بجلی کے ننگے تار سے چھوا دیا وہ جاگ پڑیں اور ایک جھٹکے کے ساتھ منو سے علیحدہ ہو گئیں۔ منو کلیجہ پھاڑ کر چلایا جاتے جاتے پھوپی نے پلٹ کر دیکھا برکتے جھاڑو اور ٹوکری سنبھالے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ انھوں نے بڑی بے دردی سے اپنے ہونٹوں کو مسل ڈالا۔

اور تب سے پھوپی اپنے "اس گناہ" کی بخشش کے لئے ہر وقت اپنے ہونٹ دھوتی رہتی ہیں اتنا کہ ان کے ہونٹ زخمی ہو گئے ہیں۔ منو کو تو اب وہ نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں پر ان کی آنکھوں کی چمک یہ کہتی ہے کہ ان کے گناہ کی کبھی بخشش نہیں ہوگی کیونکہ ان کی آنکھیں اب پہلے سے زیادہ چمکدار اور خوش نظر آتی ہیں اور یہ تو سب ہی کہتے ہیں کہ آنکھیں سب سے زیادہ سچی ہوتی ہیں انسان کی کہانی گناہوں کی کہانی ہے۔ حضرت آدم نے گناہ کیا تو اتنی حسین دنیا بنی اور اب پھوپی کا گناہ بھی اتنا حسین ہے جو انسان کے بہت سے دکھ مٹا دے۔ وہ سارے فرق مٹا دے جو انسانوں کو انسانوں سے الگ کرتے ہیں۔ سو پھوپی کی آنکھیں اسی دن کا حسین سپنا دیکھ رہی ہیں اور وہ یونہی دن رات ہونٹ دھو کر اپنے گناہ کا کفارہ نہیں ادا کر رہی ہیں بلکہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہی ہیں۔

رشیدہ رضویہ

کراچی کا پانی بصرہ کا دریا

ہم عرشے پر گرتے پڑتے ڈولتے ڈولتے ڈرائنگ روم میں پہنچے ——— آٹھ بج رہے تھے اور ہال میں انجانے مسافر بیٹھے تھے۔ میں اور فریدہ سوپ پینے لگے، اتنے میں ایک صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کر بہ کمال تکلفی ہماری میز پہ بیٹھ گئے۔ یہ بے تکلفی مجھے کچھ پسند نہ آئی اور میری تیوریاں چڑھ گئیں۔

"تم لوگ کیا بہت دور سے آرہے ہو؟" اُن صاحب نے دریافت کیا۔

"اجنبیوں سے بالکل بات نہ کرنا" اشفاق بھائی کی نصیحت ذہن میں گونجی۔ اور میں جواب دیے بغیر سوپ پیتی رہی۔

"تم لوگ لاہور سے آرہے ہو؟"

"جی ہاں۔ اب فریدہ نے جواب دے ہی دیا۔ وہ صاحب شاید کچھ اور سوال بھی کرتے لیکن قدرت کو حالتِ زار پہ رحم آگیا۔ اور لہروں کو جلال آگیا۔ میز اپنی چاروں ٹانگوں سمیت ناچنے لگی اور ہمارا سوپ حلق سے باہر آنے لگا۔ کھانا چھوڑ کر میز پہ رومال رکھ کر ڈائننگ ہال کے مسافروں کو متحیر چھوڑ کر ہم اپنے کیبن کی طرف بھاگے اور واش بیسن پہ جھک گئے۔ چند لمحات بعد بیرہ بھی پیچھے پیچھے آیا۔ وہ ہمارے یوں اٹھ آنے سے پریشان تھا۔ لیکن جب صورت حال کا علم ہوا تو خود ہی جہاز کے ڈاکٹر سے کوئی دوا لے آیا۔ دوا نگل کر ہم تینوں نے چادر تان لی۔

اس وقت شب کے نو بجے تھے۔ جب ہماری آنکھ کھلی تو سترہ ستمبر کی شام کے چھ بجے تھے گویا ہم کامل ۲۱ گھنٹے عالم خواب میں رہے تھے۔ اور بیرہ ناشتہ اور دوپہر کے ناشتے کے لئے دروازہ پہ دستک دے دے کر تھک گیا تھا۔ اب بھی وہ معاً پوچھ کر دریافت کرنا تھا کہ ہم رات

بقیہ

کا کھانا کھائیں گے یا نہیں؟

"کھائیں گے۔ لیکن کیبن میں"

"انگلش کھانا کیبن میں نہیں آتا ہے۔ مسلمان اور ہندو کھانا آتا ہے۔ بیرے نے مطلع کیا۔ اور انگلش کھانے کے بجائے ہم نے مسلمان کھانا منگوایا جو پلاؤ، گوشت کے سالن، پاپڑ، اچار اور چٹنی پر مشتمل تھا۔ کھانا تیل میں پکا تھا اور سرخ مرچوں سے بھرپور تھا۔ یہ کھانا ہمارے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے ہم جلدی سے کیبن سے باہر عرشے کی طرف نکل آئے۔ اور گہرے گہرے سانس لئے۔ سمندر بدستور تاریک لیکن قدرے پُرسکون تھا۔ لہروں کا وہ طوفانی عالم نہ تھا۔ اور جہاز بھی متوازن تھا۔ مسافر عرشے پر جمع ہنگامے کر رہے تھے۔

"یہ لڑکیاں مجھ سے ڈر کر ایسے بھاگیں کہ دن بھر غائب رہنے کے بعد اب نظر آرہی ہیں۔" دفعتاً کانوں میں آواز آئی۔ پلٹ کر دیکھا تو وہی لمبی ناک والا مسخرہ نظر آیا۔ جو ڈائننگ ہال میں کرسی گھسیٹ کر ہماری میز پہ بیٹھ گیا تھا۔

"امی، چو۔ پپی چو۔ بن چو۔ ماسٹر مکھن چو۔" آہستہ سے میں نے کہا۔ اور اخلاق نے شرارتاً یہی الفاظ زور سے دہرائے۔ ماسٹر مکھن چو نے تعجب سے اخلاق کو دیکھا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ہم نے درحقیقت اُسے ماسٹر مکھن چو کا خطاب دیا ہے۔ اسی لمحہ تمبولا کا اعلان ہوا۔ ماسٹر مکھن چو تمبولا کھیلنے میں مصروف ہوگیا۔ ہم بہن بھائی سیکنڈ کے عرشے پر آکر ڈیک کے مسافروں کا جائزہ لینے لگے۔ لوگ چیونٹیوں کی مانند جہاں جگہ ملی سامان سمیت بیٹھ گئے تھے۔ چوہا چو کا بھی کر رہے تھے۔ قہقہے بھی لگا رہے تھے اور تالیاں بھی بجا رہے تھے۔ یہ بھی زندگی کا ایک رُخ تھا۔

زندگی محض فرسٹ کلاس کا عرشہ اور تمبولا کا کھیل ہی نہ تھی۔ بلکہ ڈیک کا منظر بھی تھی۔ اور یہاں پانی کے تھپیڑوں میں تھی۔ بے خوف اور بے خطر اور قطعی غیر محفوظ تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ان تیسرے درجے کے مسافروں میں جا کر بیٹھوں۔ سوکھی مچھلی اور روٹی کھاؤں۔ ہیر وارث شاہ سنوں لیکن چست لباس کے ساتھ میں سوکھی روٹی کیونکر کھاتی۔ ہیر وارث شاہ کیوں کر سنتی۔ بہرحال بھی شب کے نو بج رہے تھے۔ کیبن سے باہر رہنا مناسب نہ تھا۔ ہم اپنے ٹھکانے پر آ گئے اور لمبی ناک والے ماسٹر محسن جی کو ایک مرتبہ پھر یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ یہ بہن بھائی مجھ سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر کی دعا کا اثر ہنوز باقی تھا۔ چادر تان کر دوبارہ بستر پر گرے تو پھر اٹھارہ ستمبر کی صبح نو بجے ہی آنکھ کھلی۔ تیار ہو کر ناشتہ کیا اور عرشہ پر آئے تو معلوم ہوا کہ جہاز لنگر ڈالے بیچ سمندر میں کھڑا تھا اور سامنے سیاہ دیوزاد چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ مسقط کی چٹانیں تھیں۔ چٹانوں کے اندر مسقط کا شہر تھا۔ شہر میں سلطان مسقط کا محل تھا ایام جوانی میں والد محترم زندگی کا تجربہ حاصل کرنے یہاں برطانوی ہائی کمیشن میں کام کرتے تھے۔ چٹانوں پر بحیرہ عرب میں چلنے والے مختلف جہازوں کے نام اور ملاحوں کے اپنے اسم ہائے گرامی بڑے بڑے جناتی حرف میں کھدے تھے اور دور سے بھی صاف پڑھے جاتے تھے۔ ان چٹانوں کو دیکھ کر قطعی محسوس نہ ہوتا تھا کہ یہاں آبادی بھی ہوگی۔ لیکن جب کشتیاں اندر سے نکل نکل کر جہاز کی طرف آنے لگیں تو قدرت کی نیرنگیوں پر یقین آ گیا۔ ان کشتیوں میں مسافروں اور مال کو اترنا تھا کشتیوں کے ملاح خوفناک حد تک سیاہ اور ڈراؤنے تھے۔ الف لیلیٰ دلیل کے جنات کا تصور دیتے تھے۔ الف لیلہ دلیل میں مسقط کا ذکر بھی تو ملتا ہے سندباد جہازی اپنے کسی سفر میں ان چٹانوں پہ بھی سرگرداں ہوا ہوگا۔ لیکن اب تو مسقط کے بچے مسافروں کو اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ مسافر سکے پانی میں اچھالتے۔ اور یہ ننگ دھڑنگ بچے غوطہ لگا کر سکے ڈھونڈ نکالتے۔ میں ان نوجوان بچوں کو دیکھ رہی تھی اور لطف اندوز بھی ہو رہی تھی۔ مجھے ان کی حالت زار نے قطعی متاثر نہ کیا تھا۔ نہ ہی غربت کے خلاف مختلف خیالات میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ نہ ہی میں جذباتی ہو کر ایک درد افسانہ تصنیف کرنے کی فکر میں تھی۔ یہ بچے جس حال میں تھے بڑے مطمئن تھے اور اپنے کرتبوں سے خود فرحاں تھے۔ بچے یونہی پانی سے کھیلتے کھیلتے چٹانوں کی جانب چلے گئے۔ اور کچھ دکاندار سگریٹ اور چاکلیٹ کی دکانیں سیکنڈ کلاس کے پچھلے عرشہ کی گلی میں سجانے لگے۔ ہم بہن بھائی چاکلیٹ خریدنے یہاں آ گئے۔ چند ہی لمحات بعد ایک پستہ قامت بھاری بھرکم صاحب سفید یونیفارم میں ملبوس تشریف لے آئے اور اپنا تعارف کرا کر ہماری خیریت طلب کرنے لگے۔ یہ ڈاکٹر سہگل تھے۔ مشہور مغنی سہگل کے بڑے بھائی۔ ان صاحب نے ہی ہمیں دوا بغیر فیس کے بھجوا دی تھی۔ حالانکہ فیس پہلے وصول کرتے تھے۔ بڑی عمر کے آدمی تھے۔ رویہ بھی شفقت آمیز تھا۔ لہٰذا ہم ان سے بہت جلد بے تکلف ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے چھوٹتے ہی سکھوں کے لطائف سنانا شروع کر دیئے۔ ایک لطیفہ یہ تھا کہ ایک خالصہ جی تازہ تازہ یورپ سے ہندوستان وارد ہوئے اور امرتسر سے دہلی روانہ ہوئے۔ ٹرین میں اوپر کی برتھ پہ غافل سو گئے۔ ٹرین دہلی پہنچی۔ دہلی سے پھر امرتسر کے لئے روانہ ہو گئی۔ تو کہیں خالصہ جی کی آنکھ کھلی اور نچلی نشست کے مسافر سے منزل دریافت کی تو معلوم ہوا کہ وہ امرتسر جا رہا ہے۔ یہ سنتے ہی سردار جی نے ایک نعرہ لگایا۔

بلے او بلے۔ ہندوستانی ٹرینوں نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اوپر کی برتھ دہلی جاتی ہے اور نیچے کی امرتسر"

"ارے ڈاکٹر صاحب، امرتسر تو ہم بھی جا چکے ہیں وہاں ہمارا سابقہ بھی سکھوں سے پڑا تھا۔ یہ ۱۹۵۶ء کا ذکر ہے۔

جنوری ۱۹۵۶ء میں ہم سب بہن بھائی حسب معمول لاہور گئے تو امرتسر کا بھی شوق ہوا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر واہگہ پار کر گئے۔ امرتسر میں گرانڈ ہوٹل میں قیام ہوا۔ نہ تو کوئی غسلخانہ تھا نہ گرم پانی ملتا تھا اور تاریک کمروں سے برف گرتی تھی۔ اردگرد لمبی داڑھیوں والے سکھ نظر آتے تھے۔ پنجابی کا ایک ادیب ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھا داڑھی لہرا لہرا کر اپنا ناول تصنیف کئے جاتا۔ گرانڈ ہوٹل کے سامنے اسٹیشن تھا۔ اسٹیشن کے باہر وہی مناظر دستیاب ہوتے تھے جو ایشیائی شہروں کا خاصہ ہیں۔ اور ہمیں ہر لمحہ اپنے قتل ہونے کا خدشہ رہتا تھا۔ ایسے عالم میں ہر وقوعہ

کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ جلیانوالہ باغ میں کرنل ڈائر کی گولیوں کے نشانات
اور دربار صاحب میں گھونگھٹ والی خواتین دیکھ کر ہم ہندوستانی
فلموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دن میں دو فلمیں دیکھی جاتی تھیں۔
ایک شام نوتن کی فلم "سیما" دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے کہ کانوں میں
آواز آئی۔

"اتنا قتل و غارت کرنے کے بعد یہ پاکستانی امرتسر میں اتنی
آزادی سے کیوں گھوم پھر رہے ہیں۔ میں دو روز سے انہیں دیکھ
رہا ہوں۔"

یہ الفاظ پنجابی میں کہے گئے۔ ہم پنجابی بولنے سے قاصر
ہیں لیکن سمجھنے سے نہیں۔ اشارہ صریحاً ہماری طرف تھا۔ خون خشک
ہو کر رہ گیا۔ لاہور پہنچنے کی قطعی امید نہ رہی، تاہم ہمت کر کے دم
سادھے فلم دیکھتے رہے۔ اور پیچھے سے آوازیں برابر پاکستانیوں کو
ماں بہن کی گالیاں اور نیست و نابود کرنے کی دھمکیاں دیتی رہیں۔
فلم ختم ہونے پہ ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا تو دو سکھوں کو اپنی جانب
گھورتے ہوئے پایا۔ ایک کی آنکھوں میں خون اترا تھا۔ دوسرا کچھ
متوازن معلوم دیتا تھا۔ اور پہلے کو سمجھا بجھا بھی رہا تھا۔ دوسرے
کا کہنا یہ تھا کہ اب تو پاکستان سے ہماری دوستی ہے۔ ہم لاہور جا کر سب
سے پہلے وہاں کا نمک خریدتے ہیں حق نمک ہی ادا کرنا چاہیئے۔ اور پھر
یہ بچیاں تو دوستی کا جذبہ لے کر آئی ہوں گی۔ ہمیں انسان ہونے
کا ثبوت دینا چاہیئے نہ کہ بھیڑیا ہونے کا۔

خون بھری آنکھوں والا بضد تھا کہ سکھ بچیاں مسلمانوں نے
بے دردی سے لوٹی کھسوٹی اور ماری تھیں۔ وہ دونوں سکھ جھگڑتے
جھگڑتے اور ہم ڈرتے ڈرتے باہر نکلے تو خون بھری آنکھوں والا پورا
راستہ ہم بہن بھائیوں سے مخاطب رہا۔ بھائی بیچارا تو ایک ہی
ہمارے ساتھ تھا۔ ہم بہنیں تین کی تعداد میں تھیں۔ لہٰذا بھائی کی
پریشانی اور گھبراہٹ بے جا نہ تھی۔ سکھ بہادر نے پنجابی کے بجائے
اردو میں ہماری منزل کے متعلق دریافت کیا۔

"ہم اپنے ایک دوست کے ہاں مقیم ہیں۔" بھائی نے
عافیت اسی جواب میں سمجھی۔

"غلط بات نہ کرو۔ تم لوگ گرانڈ ہوٹل میں مقیم ہو۔"

اب اس بات کا کوئی کیا جواب دیتا۔ ہم چپ چاپ سر جھکا کر
پیدل چلا کیئے۔ وہ ہمارے پیچھے پیچھے تھے۔ دشمن کا شہر تھا۔ ہم
کس پہ یقین کرتے اور کس پہ نہ کرتے۔ ہاں اتنا ضرور کیا کہ گرانڈ ہوٹل
پہنچ کر بجائے ہوٹل میں داخل ہونے کے دو رکشے کر کے آگے نکل گئے
اور تقریباً دو گھنٹے بعد لوٹ کر ہوٹل کے منیجر سے تمام واردات بیان
کر کے جان کی امان طلب کی۔ ہوٹل کے منیجر نے پولیس سے رابطہ قائم کیا۔
پولیس نے انکشاف کیا کہ ہم نے امرتسر آ کر سخت غلطی کی۔ امرتسر میں
ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں جو پاکستانیوں کو بالکل برداشت نہیں
کر سکتے۔ اور ہمارا یہاں زیادہ قیام مناسب نہیں۔

ہمارا خیال امرتسر سے دہلی کا تھا۔ لیکن یہ حالات دیکھ کر چپکے
سے لاہور کی راہ لی —— مسقط کی چٹانوں کو دیکھتے دیکھتے میں نے
ڈاکٹر سے کہا۔ ڈاکٹر اظہار رائے بھی نہ کر پایا تھا۔ کہ ایک پستہ قامت
بھاری جسم کے صاحب 555 سگریٹ کی تلاش میں وہاں آ نکلے
ان کی بھوری آنکھوں میں غضب کی تیزی تھی اور ہاتھ میں دستو
وسکی کی برادرز کراما زوف۔

بغداد کے سفارت الہندیہ کے فرسٹ سکریٹری سید نذیر حسین
ڈاکٹر نے تعارف کرایا۔ اور سید صاحب بغداد کے متعلق دریافت کرنے
لگے۔ وہ پہلی مرتبہ بغداد جا رہے تھے اور بغداد کی بابت کچھ بھی نہ جانتے
تھے۔ باتوں باتوں میں بغداد کی رسومات کا بھی ذکر ہوا۔ تو ڈاکٹر کو
اچانک اپنی بیٹی کانتا کا خیال آ گیا۔ کانتا کے جہیز کے واسطے وہ ہر جگہ سے
چیزیں جمع کرتا تھا۔ لیکن لڑکے والوں کے مطالبات بہت زیادہ تھے۔

"ہمارے ہاں تو مہر کی رقم سے لڑکی کا جہیز بنتا ہے"۔ میں بغداد کی
رسوماتِ بیاہ بیان کرنے لگی۔ اس وقت تک مجھے پاکستانی رسم و رواج
کا علم نہ تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ لڑکی اپنے شوق سے کچھ کپڑا اور زیور
والدین سے لیتی ہے۔ لڑکوں کے مطالبات اور لالچ سے میں آگاہ نہ تھی
بعد میں جب یہ تمام باتیں معلوم ہوئیں تو والد صاحب سے یہ معاہدہ
کر لیا کہ میرا شرعی حق پاکستانی جہیز کی صورت اختیار نہ کرے گا۔
بلکہ میرے سفروں پہ صرف ہوگا۔ زندگی باقی تو سفر بھی بے شمار۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ تقسیم ہند سے صرف دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔!

جم کو اُن کے دوست ٹھاکر صاحب گلریا مہاراج پور کے علاقہ میں ایک آدم خور شیر کے شکار کے دوران ایک پُر اسرار گروہ کی سرگرمیوں کا پتہ چلا۔ بات پولیس تک پہنچی اور پولیس کی تحقیقات کے دوران ٹھاکر صاحب کو اغوا کرلیا گیا۔ جس پر جم جونیئر نے صوبائی گورنر سے درخواست کرکے اس معاملہ کی تفتیش اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہ پُراسرار گروہ جس کا خفیہ نام آر آر آر تھا کوئی فوجی قسم کی تنظیم تھی جس کے مقاصد کا پتہ چلانے کے لئے جم اور ان کے پٹھان دوست عیسیٰ خان نے جلد سادھوؤں کا روپ دھار کر سراغ رسی شروع کی۔ اُن کے ہر قدم پر ایک نیا انکشاف ہوتا گیا۔ اور معاملہ الجھتا گیا۔ ان دونوں نے آر آر آر کے ایک خفیہ مستقر کا پتہ چلایا جو ہمالہ کی پہاڑیوں میں قائم تھا۔ مگر جونہی اس گروہ کو یہ احساس ہوا کہ ان کی نگرانی کی جا رہی ہے' انہوں نے اپنے اس خفیہ مستقر کو تباہ کردیا۔ اور جم کو اپنے دوست کے ساتھ ایک بار پھر بھیس بدل کر ایک طویل اور نامعلوم سفر پہ نکلنا پڑا۔ اسی سفر میں وہ پیلی بھیت جاتے ہوئے ایک انگریز لڑکی سے ملے جو اپنے منگیتر کی تلاش میں انگلستان سے آئی ہوئی تھی۔ جم جونیئر نے قیافے سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ لڑکی آر آر آر کے ایک نوجوان رکن پرسیول کی منگیتر تھی جو جم کے ہاتھوں گرفتار ہو کر خودکشی کر چکا تھا۔ جم نے اس لڑکی کو مزید حالات کا پتہ چلانے کے لئے لکھنؤ آکر ملنے کی دعوت دی اور خود پیلی بھیت پہنچے۔ وہاں ان کو پتہ چلا کہ پاس ہی ایک آبادی میں ان کے اغوا شدہ دوست ٹھاکر صاحب کے ایک اور دوست ٹھاکر حکم سنگھ رہتے ہیں جن سے جم کی پہلے ملاقات ہو چکی تھی اور جو جم کی نظروں میں خاصی پُر اسرار شخصیت تھے۔ جم اور عیسیٰ خان ٹھاکر حکم سنگھ سے ملاقات کرنے فوراً بعد روانہ ہوئے۔

وہاں کیا پیش آیا؟

یہ آگے مطالعہ فرمائیے۔

تاروں کی سہانی روشنی اور شبنم سے نہائے ہوئے کھیتوں کے درمیان کچا راستہ شبنم سے نم آلود نرم مٹی سے بھرا ہوا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے یہ نم آلود اور بھاری دھول بھی اڑتی اور میرے دماغ میں اس کی سوندھی اور سہانی خوشبو رچ گئی۔

کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ آگے ہم ایک گاؤں کے پاس سے گزرے دو ایک کتے اندھیری اور تنگ گلیوں سے بھونکتے ہوئے نکلے۔ کسی چوکیدار نے اپنی بھاری آواز میں پہلے تو ان کتوں کو ہاشت ہاشت کرکے ڈانٹا۔ اور پھر چیخ کر کہا

" نواب صاحب بندگی "

ہم چشم زدن میں اس کے سامنے سے گزر گئے اور مجھے پکا یقین ہوگیا کہ نواب صاحب اس راستے سے انہی گھوڑوں پر بارہا گزر چکے ہیں اور اس چوکیدار نے (جو چوکیدار کے علاوہ کوئی اور نہ ہوسکتا تھا) ہمیں بھی نواب صاحب سمجھا۔ چوکیدار کے اس سلام اور بندگی سے گونہ اطمینان بھی ہوا کہ گھوڑے اس راستے سے بخوبی واقف تھے جس پر ہم جا رہے تھے۔ اور اگر نواب صاحب کا ٹھاکر حکم سنگھ سے دوستی کا دعویٰ درست تھا تو یقیناً گھوڑے ہمیں پورن پور ہی نہیں بلکہ ٹھاکر صاحب کی گڑھی تک پہنچا سکتے تھے۔

عیسیٰ خاں گھوڑا بڑھا کر میرے برابر آیا اور چیخ کر پوچھا۔

" اس آدمی نے ہمیں کیسے پہچانا ۔۔۔ ؟ "

نواب صاحب شکار وغیرہ کے لئے ادھر سے گزرتے ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔

عیسیٰ خاں پھر پیچھے ہوگیا اور نواب صاحب کے قدآور اور جاندار گھوڑے بدستور سرپٹ دوڑتے رہے۔

گاؤں سے ملحق کھیتوں کی حدود سے نکل کر ہم ایک نسبتاً کھلے میدان میں پہنچے جس میں جابجا چھدری اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں جن میں بظاہر راستہ ملنا دشوار تھا لیکن گھوڑے راستے سے بخوبی واقف تھے اور بے تکان دوڑتے رہے۔ یہ کھلا میدان خاصہ وسیع تھا۔ جس کو گھوڑوں نے تقریباً آدھ گھنٹے میں طے کیا۔ اچانک ہم ایک جنگل کے تاریک اور گھنے اندھیرے میں پہنچ گئے۔ کوئی سرکاری جنگل تھا کیونکہ باقاعدہ

دس دس لمبی (یعنی دس فٹ چوڑی) کچی سڑک بنی تھی۔ جنگل میں داخل ہوتے ہوئے میرا گھوڑا ہلکی آواز میں ہنہنایا۔ میں نے اس کی گردن پر تھپکی دی۔ اس نے زور سے دم کو دائیں بائیں چنوری کی طرح ہلایا۔ رفتار ہلکی ہوئی اور جنگل میں کوئی سو گز اندر جاکر آپ سے آپ رک گیا۔ عیسیٰ خاں کا گھوڑا بھی رک گیا۔ جنگل بالکل تاریک تھا۔ کیڑوں مکوڑوں کی زیں زیں اور ہلکی ہوا سے ہلتے پتوں کی سرسراہٹ کے علاوہ کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں گھوڑوں کی چھٹی حس سے بخوبی واقف تھا۔ ان جیسے سدھے ہوئے اور نسل تعلیق گھوڑے بغیر کسی معقول وجہ کے دوڑتے دوڑتے رک ہی نہ سکتے تھے۔ دو لمحے ہم ایسے ہی خاموش کھڑے گھنیری تاریکیوں میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتے رہے۔ عیسیٰ خاں گھوڑا بڑھا کر میرے پاس آیا۔ اس کی سانس تیز اور گہری چل رہی تھی۔

" کیا بات ہے۔ آپ رک کیوں گئے ؟ " اس نے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔ وہ جنگل کی خاموشی سے بے حد متاثر معلوم ہو رہا تھا۔

معلوم نہیں گھوڑا آپ سے آپ رک گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شیر یا گلدار آس پاس ہے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ خاموشی سے اپنے گھوڑے کے پاس گیا اور بڑی آہستگی سے ٹٹول کے میرا اور اپنا ریوالور نکال لایا۔

میں نے ریوالور ہاتھ میں لے کر اسے تولا ۔۔ طبیعت میں ایک کہنہ مشق شکاری کی سی نوخیز امنگ پیدا ہوئی۔ اس ریوالور سے میں ایک شیر مار چکا تھا۔ مگر وہاں معاملہ دوسرا تھا۔ روشنی تھی۔ آڑ تھی اور اتنا موقعہ تھا کہ میں بڑی خاموشی سے شیر تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن اس سائیں سائیں کرتے ہوئے گھنے اور تاریک جنگل میں ریوالور سے شیر مارنے کا خیال بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ اگرچہ ہمیں یقین نہ تھا کہ اس راستہ پر یا آس پاس جنگل میں کوئی درندہ موجود ہے لیکن اس کا عین امکان تھا کہ گھوڑوں نے کسی درندے کی بو پائی ہو۔ بہرحال میں نے گھوڑے کو ہلکی سی ایڑ دی اور وہ چل پڑا مگر دوڑنے کے بجائے قدم قدم چلنا شروع ہوا۔ عیسیٰ خاں کا گھوڑا بھی آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ جب نواب صاحب ان گھوڑوں پر اس جنگل میں داخل ہوتے ہوں گے تو

دیر تک ہم دائفل وغیرہ ٹھیک کرتے ہوں گے اور پھر گھوڑوں کو قدم قدم چلاتے ہوں گے تاکہ کوئی جانور نظر پڑے تو اس پر فائر کر سکیں۔

اس طرح ہم آہستہ آہستہ کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ میرا گھوڑا چلتے چلتے پھر رک گیا اور بائیں طرف سر گھما کر بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ قدرتی طور پر میری توجہ بھی ادھر ہی ہو گئی۔ گھوڑا ہلکی آواز میں ہنہنایا اور میری رانوں نے اس کے جسم میں خفیف سی لرزش محسوس کی۔ یقیناً اس طرف کوئی جانور تھا۔ لیکن کیا جانور؟ میں بڑی دیر تک ریوالور اس سمت اٹھائے گھورتا رہا لیکن نہ کوئی آہٹ محسوس ہوئی اور نہ ہی اس اندھیرے میں کچھ نظر آیا۔ میں نے گھوڑے کو آہستہ سے ایڑ دی۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا اور الف ہو گیا — عیسیٰ خاں کا گھوڑا بھی بدکنے لگا۔ میں نے پھرتی سے اس طرف اندھادھند دو ہوائی فائر کئے اور دوسرے لمحے ہمارے گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

جنگل کی وہ پٹی کوئی ایک میل چوڑی ہو گی۔ یہ پورا فاصلہ گھوڑوں نے انتہائی تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے طے کیا۔ جب ہم جنگل سے نکل کر دوبارہ ایک کھلے میدان میں نکلے تو دونوں گھوڑے ہانپنے لگے تھے اور پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ جنگل سے باہر نکلتے ہی ان کی رفتار ہلکی ہو گئی اور ایک بار پھر وہ قدم قدم چلنے لگے۔ ستاروں کی روشنی سفید پڑ چکی تھی، اوس گر رہی تھی، اور چاروں طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ گھوڑے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے حتیٰ کہ سامنے بلند و بالا درختوں کی ایک اور قطار نظر آئی۔ میں سمجھا کہ ایک جنگل سے اور گزرنا پڑے گا مگر جب قریب پہنچے تو ثابت ہوا کہ ندی کا کنارہ تھا جس پر گھنے سایہ دار درخت لگے تھے۔ گھوڑے آگے بڑھے اور لکڑی کے بنے ہوئے ایک پل سے گزر کر ایک ٹیلے پر چڑھے۔ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ کر میں نے لگام کھینچی۔

سامنے جہاں زمین آسمان ملتے نظر آ رہے تھے سفیدۂ سحری نمودار ہو رہا تھا۔ صبح ہو رہی تھی۔ ہم سے کچھ آگے ایک بستی کے آثار تھے۔ جاتی تاریکی اور آتی روشنی کے ملگجے دھندلکے میں ایک مندر کا اونچا گاؤدم کلس صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ بستی پورن پور ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے گھوڑے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اتنی دیر آرام کرکے گھوڑے تازہ دم ہو چکے تھے۔ دوڑ پڑے۔ مجھے پورا اطمینان تھا کہ یہ گھوڑے ہمیں ٹھیک ٹھاکر حکم سنگھ کی گڑھی یا حویلی پر پہنچا دیں گے۔ کچھ دیر بعد ہم بستی کے پاس پہنچ گئے لیکن گھوڑے دائیں ہاتھ کو شمال کے رخ مڑے اور تیزی سے کھلے میدان میں دوڑنے لگے۔ میدان بہت وسیع تھا۔ صبح کی دودھیا روشنی میں میدان میں اگی ہوئی گھاس اور جھاڑیاں اتنا دکھائی پڑ رہی تھیں کہ دھبوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ دور دور تک نہ کوئی آبادی نظر آتی تھی اور نہ ہی کوئی جاندار! ہم کچھ نیم مدہوشی کے سے عالم میں برابر آگے بڑھتے رہے۔

اچانک سورج نکل آیا۔ پورا ماحول سنہری رنگ میں نہا گیا۔ سرسبز جھاڑیاں، ہری ہری گھاس، سفید آسمان، قدرت کا ایک ایک رنگ چمک اٹھا۔ نہ معلوم کہاں سے ہزاروں طرح کی چڑیاں اور دوسرے پرندے چہچہانے لگے اور فضا نغموں سے معمور ہو گئی اور ایک بار جو میری نظر اٹھی تو معلوم ہوا کہ سامنے ایک ٹیلہ ہے اور اس ٹیلے پر — !!

میں نے لگام کھینچی اور میری نظریں اس ٹیلے کی چوٹی پر بنی ہوئی لال پتھر کی اس پرانی اور شاندار قلعہ نما کوٹھی پر گڑی کی گڑی رہ گئیں۔

"ارے —" عیسیٰ خاں کے منہ سے نکلا۔

وہ گھوڑا بڑھا کر میرے پاس آیا۔

"ٹھاکر حکم سنگھ کی حویلی —" میں نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ گڑھی کے صدر دروازے یا پھاٹک کے کواڑ بند تھے۔ بلند محراب کے اس پھاٹک کی چھت پر دو برجیاں بنی ہوئی تھیں اور دونوں پر کیسری رنگ کے تکونے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ پھاٹک کے کواڑوں کے آگے دائیں بائیں دو موڑھے بچھے تھے جن پر انگرکھے پہنے اور پیلی پگڑیاں باندھے بلم بردار پہریدار بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

"ہاں اس کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ ٹھاکر حکم سنگھ کی گڑھی ہے —" میں نے کہا اور گھوڑے کو آگے بڑھنے کا اشارہ دیا۔

ٹیلے پر جانے کے لئے سیدھی صاف اور پختہ سڑک بنی ہوئی تھی جب ہم اس سڑک پر پہنچے تو گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سے وہ پہریدار چونک اٹھے۔ چند لمحے تک تو وہ آنکھیں مل مل کر اور پھاڑ پھاڑ کر ہماری طرف دیکھتے رہے، پھر ایک نے دوسرے سے کچھ کہا اور وہ بلم ٹیک کر کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ ہماری طرف آنے لگا۔ دوسرے نے پھاٹک سے لٹکی ہوئی ایک زنجیر کھینچی اور فضا ایک بڑے گھنٹے کی ٹن ٹن سے گونج اٹھی۔

وہ پہریدار اور ہم آدھے راستے میں ملے۔ میں لگام کھینچ کر گھوڑے کو روکا۔ وہ چند لمحے تک تعجب سے ہمیں دیکھتا رہا اور پھر بلم کو کندھے سے لگا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر بڑے ادب سے جھک گیا۔

" پالاگن مہاراج "

میں ہاتھ اٹھا کر اشیر واد دی۔ وہ آگے بڑھا اور بائیں طرف آکر گھوڑے کی رکاب پکڑ لی۔ میں نے گھوڑا آگے بڑھایا۔ وہ رکاب پکڑے پکڑے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اتنے میں پھاٹک کا دروازہ کھلا اور ایک گورے بدن کا ادھیڑ عمر شخص، جس کے بدن پر صرف ایک دھوتی اور گلے میں جنیو تھا باہر آیا۔ اس نے ہمیں اور ہم نے اسے تعجب بھری نگاہوں سے دیکھا ہم دونوں نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کا وزن کرنے لگے۔

دوسرے پہرے دار نے آگے بڑھ کر عیسیٰ خاں کی رکاب کو سہارا دیا۔ عیسیٰ خاں پھرتی سے اترا اور دوڑ کر میرے آگے آیا۔ ہاتھ جوڑ کر ڈنڈوت کی اور میری رکاب کے ساتھ ایک گھٹنا بچھا کر اور دوسرا کھڑا کر کے جھک گیا۔ یہ اترنے کا اشارہ تھا۔ میں بڑے وقار سے اترا۔ دوسرے پہریدار نے گھوڑے کی لگام پکڑی۔ میرے اترنے پر وہ برہمن نما شخص آگے بڑھا۔ ظاہر تھا کہ حلیے کے لحاظ سے میں اس سے کہیں زیادہ بزرگ اور مقدس معلوم ہو رہا تھا اور عیسیٰ خاں کی نیازمندی اور عقیدت بھی اپنا اثر دکھا چکی تھی۔ وہ مرعوب ہو چکا تھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔ اور نمسکار کیا۔

" سرکار اقدس کہاں سے تشریف لا رہے ہیں ؟ " اس نے ٹھیٹھ سنسکرت میں پوچھا۔

" عزیز گرامی حکم خداوندی کی تعمیل میں یہ فدوی ٹھاکر حکم سنگھ جی مہاراج کے درشنوں کو حاضر ہوا ہے " میں نے اس سے بھی زیادہ ٹھیٹھ زبان میں جواب دیا۔

" آہ، ہمارے آقا و مولا کے نصیب جاگ گئے۔ سرکارِ اقدس گزشتہ پچاس سال سے ہمارے مہاراج کے اس پرشکوہ اور گردوں رفعت قلعے کے صدر دروازے پر آنجناب کے سے پرنور و مقدس چہرے کی زیارت نصیب نہیں ہوئی ہے۔ زہے نصیب، قدم رنجہ فرمائیں۔ . . . " اور یہ کہہ کر وہ مڑا اور جھک کر دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے ہمیں حویلی میں داخل ہونے کے لئے کہا۔ ہم دونوں اس کے ساتھ پھاٹک کی طرف بڑھے

" اگر بندہ کم فہم غلطی پر نہیں ہے تو سرکار اقدس کے اسپ و ہماری حضور نواب بہادر کے اصطبل خاص سے تعلق رکھتے ہیں "

" آپ کا خیال درست ہے عزیز گرامی قدر، یہ مہربانی ہم ناچیزوں پر مہاراج کے دوستِ خاص نے ہی فرمائی ہے . . . . "

" میں نے عرض کیا نا۔ میں پہچانتا ہوں۔ میں پہچانتا ہوں۔ . " اس کی آواز مسرت سے پھول گئی۔

" اے عزیز کیا آپ مہاراج کے مشیر خصوصی نہیں ہیں ــ ؟ " میں نے تیر نہیں تو تُکّا کے اصول پر عمل کرتے ہوئے سوال کیا۔

" اے حضور یہ سرکار دوستدار مہاراج ادھیراج پنچ سوائی مہاراج فتری دھرم ویر ٹھاکر حکم سنگھ جی بہادر سسودیہ پرکاش کھشتری سُوریہ با القابہ کا کرم خاص اور عنایت ہے عنایت کہ انھوں نے فدوی جیسے فدوی بے مقدار کو یہ مقام عنایت فرمایا ہے ورنہ من حانم کہ من آنم "

" ہمیں بڑی مسرت ہوئی یہ جان کر کہ مہاراج براہمنوں کا اتنا اعزاز فرماتے ہیں " ، میں نے اندھیرے میں ایک تیر اور چلایا۔

اس نے جھک کر تین سلام کئے۔ خالص مغلیٔ درباری انداز میں۔

" سرکار اقدس کی جوتیوں کا طفیل ہے جو خلق خدا اس حقیر کو براہمن سمجھتی ہے ورنہ درست یہ کہنا ہوگا کہ فدوی صحیح معنوں میں ننگ اسلاف ہے "

نصف بند پھاٹک اور اس کی طولانی ڈیوڑھی سے گذر کر ہم ایک کھلے باغیچے میں پہنچے۔ میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ سامنے ایک بلند و بالا اور وسیع عریض چبوترے پر ایک انتہائی شاندار عمارت بنی ہوئی تھی۔

عمارت سنگ سرخ سے تعمیر کی گئی تھی اور مغل دور کے مخصوص قلعہ نما حویلیوں کی طرز پر بنائی گئی تھی۔ چبوترے پر لمبان لمبان میں محرابی در اور دروازے بنے تھے۔ صدر دروازے پر زرد رنگ کا ریشمی پھریرا لہرا رہا تھا جس پر سرخ ریشم سے سورج دیوتا کا خشمگیں چہرہ کڑھا ہوا تھا۔

باغیچہ انواع و اقسام کے پھولوں کی کیاریوں اور جا بجا مرمریں حوضوں، فواروں اور نشست گاہوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک مرمریں بنچ پر ایک نوعمر لڑکا بیٹھا پاس کی حوض میں مچھلیوں کو آٹے کی گولیاں ڈال رہا تھا۔ اس نے ہمیں آتا تو پہلے ہی دیکھ لیا تھا لیکن وہ ہمارے استقبال کو اس

وقت تک وہ شاید جب تک ہم بالکل اس کے پاس نہ پہنچ گئے۔ اور جب ہم اس کے پاس پہنچے تو وہ کھڑا ہوا اور بڑے باوقار انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر جو اندازہ لگایا ہوگا اس کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس باوقار انداز شان بے اعتنائی کے باوجود اس کی آنکھوں میں حیرت اور تعجب کا رنگ ابل رہا تھا۔

ادھیڑ عمر براہمن منیجر ایک قدم آگے بڑھا۔ اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔

" صاحبزادہ حضور راجکمار شری پرتاب سنگھ جی بہادر بلند اقبال مہاراج بہادر کے بھتیجے اور وارث "

اس لڑکے کے چہرے پر اور زیادہ وقار نکھر آیا۔ آنکھوں سے استعجاب کا رنگ دور ہوگیا۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر اس صبیح رنگ، اکہرے چہرے اور سیاہ روشن آنکھوں والے نوعمر لڑکے کو دعا دی وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر سامنے جھک گیا۔ میں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا

" پرتاب، خدائے ذوالجلال والاکرام تمہاری عمر، حوصلے اور ہمت دراز و بلند کرے ۔ اچھے تو ہو بیٹا — مچھلیوں کو دانہ کھلا رہے ہو ؟ " میں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

" سرکار اقدس کی دعاؤں کے طفیل بخیر ہوں — یہ مچھلیاں میں نے پالی ہیں۔ یہ اسی نسل کی مچھلیاں ہیں جو ماہی مراتب کے نشان میں بنائی جاتی ہیں " اس نے فخر سے کہا۔

" تو یہ مچھلیاں حوض میں کب تک رہیں گی ؟ ان کا صحیح مقام تو کہیں اور ہی ہے ؟ " میں نے پوچھا

" بہت جلد، بہت جلد، خدا نے چاہا تو بہت جلد. . . ." اور وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اور لمحاتی توقف کے بعد اس ادھیڑ عمر براہمن سے مخاطب ہوا۔

" گورو دیو — مہاراج کہاں سے تشریف لا رہے ہیں ؟ طولانی سفر کرکے آ رہے ہیں۔ چہرۂ اقدس گرد آلود ہے۔ آپ مہاراج کے آرام اور ناشتے کا اہتمام کرائیے۔ میں حضور کو مہمان خانے کی طرف لے کر چلتا ہوں "

گورو دیو نے جھک کر تین سلام کئے اور باغیچے کی روشوں پر تیزی سے روانہ ہوگئے۔ پرتاب نے ہمیں نہایت ادب سے صدر دروازے کی طرف چلنے کے لئے کہا۔ ہم تینوں اس طرف روانہ ہوئے۔ باغیچہ سے نکلکر جب ہم چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے تو پرتاب نے سامنے لہراتے ہوئے پھریرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: " یہ مچھلیاں ان جیسے پھریروں کی زینت بنیں گی "

میں نے حیرت سے اس نوعمر لڑکے کی طرف دیکھا۔ اس کے حوصلے میری توقع سے کہیں زیادہ بلند معلوم ہوتے تھے۔

" خدا نے چاہا تو جلد ایسا ہوگا " میں نے آہستہ سے جواب دیا

" سرکار اقدس کہاں سے تشریف لا رہے ہیں ؟ " اس نے پوچھا۔

" پیلی بھیت سے "

" پیلی بھیت سے — کس طرح — ؟ " اس نے سوال کیا

" نواب صاحب کے اصطبل کے شریف اور وجیہہ جانوروں کی پشت پر "

" خان چاچا کی سواری کے گھوڑے — اوہو۔ تو وہ کہاں ہیں۔ واہ کیا گھوڑے ہیں خان چاچا کے پاس، قسم خدا کی۔ کوئی جواب نہیں ہے۔ اتنے سمجھدار اتنے بہادر اور صبا رفتار. . . . اچھا — تو آپ مہاراج سے ملنے آتے ہیں ؟ "

" ہاں — "

" افسوس کہ مہاراج تو شکار پر گئے ہوئے ہیں "

" کہاں ؟ "

" گلریا مہاراج پور "

" میرے دل پر گھونسہ سا لگا۔ ٹھاکر حکم سنگھ اور ٹھاکر رگھوبیر سنگھ کے شاندار اور باوقار چہرے نظروں کے آگے گھوم گئے۔

ہم صاف ستھرے اور وسیع چبوترے کے وسط میں پہنچکر میں رک گیا۔ عمارت کا جائزہ لینے لگا۔ مگر میرے دل میں طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ میں اس لڑکے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ گلریا مہاراج پور کے زمیندار اور اپنے چچا کے گہرے دوست ٹھاکر رگھوبیر سنگھ کی گمشدگی کے بارے میں کیا جانتا ہے ؟

" گلریا مہاراج پور میں تو خیریت ہے نا صاحبزادے — ؟ "

میں نے سوال کر ہی لیا ۔

اس نے میری طرف بڑی معصومیت سے دیکھا۔

"ٹھاکر چاچا کا اب تک پتہ نہ چل سکا ہے ۔ مہاراج نے جنگلوں کا پتہ پتہ اور شہروں کے کنکر پتھر تک چھان مارے ہیں ۔ کوئی پتہ نہیں وہ کہاں ہیں ۔ کہاں گئے ۔ مجھے ان سے بڑی محبت ہے ۔ ان کا نشانہ بہت اچھا ہے ۔ ان سالا گوں اتنا پیارا صاف ستھرا اور خوبصورت ہے کہ بس کیا بتاؤں ۔ ان کے جنگلوں میں بڑا اشکار ہے ۔ شیر، ہاتھی، گلدار، ریچھ، سانبھر، چیتل، اگر مد، پاڑے، ہر چیز ملتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ گئے ہیں وہاں مہاراج ـــ ؟"

"نہیں، صرف نام سنا ہے ـــ"

"تشریف لے چلیں ۔" اس نے بڑے ادب سے دروازے کی طرف اشارہ کیا ـــ

میں آگے بڑھا ۔ میرے پیچھے عیسٰی خاں اور پھر راجکمار پرتاپ ۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا ۔ خوشبو تھی ۔ ایک خاص طرح کا گرم حبس تھا ۔ میں دو قدم آگے بڑھا ہوں گا کہ ایک مضبوط ہاتھ نے میری گردن پکڑ لی ۔ میرے منہ سے ایک گھٹی ہوئی چیخ سی نکلی ۔ عیسٰی خاں نے پھنکار سی لی ۔ شیر کی طرح غرایا ۔ کچھ دھڑ پڑ سی ہوئی ۔ پرتاب کے منہ سے ایک چیخ سی نکلی ۔ کوئی زمین پر گرا ۔ میری گردن پر گرفت ڈھیلی ہوئی ۔ سخت ہوئی ۔ کسی نے مجھے اپنی طرف کھینچا ۔ ایک اور ہاتھ نے میرا سیدھا بازو پکڑا ۔ کسی نے گھونسہ مارا جو میری کھوپڑی کے پچھلے حصے پر پڑا ۔ میری آنکھوں کے آگے تارے سے ناچے ۔ ایک تھپڑ نے حواس بحال کئے ۔ کسی نے میرے لات ماری جو میری پنڈلی کی ہڈی پر پڑی ۔ ایک اور تھپڑ اور ایک اور گھونسہ اور میں اپنے ہوش میں آ چکا تھا ۔ جس نے میرا سیدھا بازو پکڑ رکھا تھا اسے جو جھٹکا دیا تو وہ یا کوئی اوندھے منہ میرے آگے گرا ۔ جس طرف سے کسی نے میری گردن پکڑ رکھی تھی اس طرف میں نے اندھا دھند ایک گھونسہ چلایا جو کسی کی پسلیوں پر پڑا ۔ ایک سسکاری کی آواز آئی ۔ میری گردن آزاد ہو چکی تھی ۔ دوسرے لمحے کوئی مجھ سے لپٹ گیا ۔ اس کی گرم سانس میں نے اپنے چہرے پر محسوس کی ۔ میں کسانس روک کر جھکا ماری تو وہ ہائے کر کے گر گیا ۔ اچانک کسی کے دھاڑنے کرنے کی آواز آئی اور عیسٰی خاں نے فتحمندانہ لہجے میں پشتو میں گالی دی ۔ دھوں سے ایک اور آواز آئی اور "ہائے مرا" کی آواز کے ساتھ کوئی اور زمین پر دھڑام سے گرا ۔ کسی نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ۔ میں نے اس کے بھی ایک عدد گھونسہ رسید کیا جواب میں ایک پشتو گالی اور سنائی دی ۔

"خانا ـــ" میں نے آہستہ سے کہا ۔

"میرے ساتھ آؤ ـــ" اس نے ہاتھ کھینچا ـــ دوسرے لمحے ہم روشنی سے بھرے چبوترے میں کھڑے تھے ۔ پاس ہی پرتاپ اوندھے منہ پڑا تھا ۔ اس کے منہ اور پھٹے ہوئے سر سے خون بہہ رہا تھا ۔ کچھ زیادہ سوچنے کا موقعہ نہ تھا ۔ ہم دونوں پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے پھاٹک پر پہنچے ۔ خوش قسمتی سے گھوڑے وہیں کھڑے تھے اور پہریدار موڑھوں پر بیٹھے ان گھوڑوں کی بہادری اور تیز رفتاری کی شان میں قصیدے پڑھ رہے تھے ۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے آئے اور کود کر گھوڑوں پر بیٹھے اور دوسرے لمحے بگٹٹ اڑے چلے جا رہے تھے ۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ان پہریداروں کی کیا کیفیات ہوئی ہوں گی ۔ لیکن ہم اس منحوس قلعہ سے ایک فرلانگ دور نہ پہنچے ہوں گے کہ قلعہ کے دروازے سے ہم پر کسی نے فائرنگ شروع کر دی ۔ اور رائفل کی گولیاں سن سناتی اور سن سناتی ہمارے دائیں بائیں ٹپے کھانے لگیں لیکن چند ہی لمحوں میں ہم رائفل کی گولیوں کی زد سے بھی باہر تھے ـــ میں نے گھوڑے کو ایڑ دی ۔ عیسٰی خاں نے گالی دی ۔ گھوڑوں کی رفتار اور تیز ہوئی کہ اچانک ہمارے کانوں میں ایک اور آواز آئی ۔ موٹر کے انجن کی ! میں نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا ـــ ایک جیپ پوری رفتار سے ہمارے تعاقب میں آ رہی تھی ۔ جیپ میں ڈرائیور کی سیٹ کے برابر ایک شخص کھڑا تھا ـــ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی ۔ میرے پلٹ کر دیکھتے ہی اس نے اسٹین گن اٹھائی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(باقی آئندہ)

اس عنوان کے تحت اردو جرائد میں شائع ہونے والی بہترین تخلیقات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

بلونت سنگھ

ست رنگا کبوتر

ویراں کو پہلے اس بات کا احساس کبھی نہیں ہوا تھا کہ پیلی شلوار اور پیلی چنری میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔ اس بات کا علم اسے آج ہوا جب وہ گاؤں کے باہر کھیتوں میں سے ہوتی چلی آ رہی تھی تو اسے قریب ہی سے اچانک کسی کے گانے کی آواز سنائی دی۔ گانا کیا تھا محض ایک بول تھا۔

"کتھے چلی ایں نیں توں سرسوں دا پھل بن کے"
(تو سرسوں کا پھول بنی کدھر کو جا رہی ہے)

ویراں کا کرتا سفید تھا لیکن شلوار اور چنری کا رنگ تو پیلا تھا۔ اسی لئے تو وہ بے باک جوان ایک ہی بول گائے جا رہا تھا۔ اپنے بارے میں اس انکشاف سے جو مسرت اسے حاصل ہونی چاہیئے تھی اس کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ سوال تو یہ تھا کہ اس اجنبی مسٹنڈے کو اس بات کا کیا حق تھا کہ وہ آتی جاتی لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرے۔

ویراں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی۔ وہ اس کے گاؤں کا رہنے والا نہیں تھا۔ یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ وہ گاؤں والوں میں سے کسی کا مہمان تھا یا یوں ہی آوارہ گردی کرتا ادھر آ نکلا تھا۔ اس نے توتیا رنگ کا تہبند پہن رکھا تھا۔ اس پر ڈبل گھوڑا بوسکی کا کرتا، کرتے پر کالے رنگ کی واسکٹ جس پر سیپ کے بیسیوں بٹن چمک رہے تھے۔ ہاتھ میں ڈانگ (لاٹھی) جس کی برنجی شام دھوپ میں جھلملا رہی تھی۔ دیکھنے میں بھی بُرا نہیں تھا۔ لیکن ــــ

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے بھائی کے جیتے ہوئے گاؤں کے کسی نوجوان کی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ اور نہ آج تک اس کے کانوں میں ایسے بول پڑے تھے۔ اس وقت وہ اکیلی تھی۔ چنانچہ اس نے وہاں سے کھسک جانا ہی مصلحت سمجھی۔ یہی غنیمت تھا کہ اس پاجی نے اس کا پیچھا نہیں کیا گھر پہنچ کر بھی اس کے دل کی دھڑکن کم نہیں ہوئی۔ کپڑوں کے ساتھ اب اس کا چہرہ بھی پیلا پڑ گیا تھا۔

یہ واقعہ سہ پہر کے وقت پیش آیا۔ وہ چونکا دینے والا پریشان کن منظر اب بھی اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ اور بول کے الفاظ اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ حالانکہ دن ڈھل چکا تھا۔ اور آسمان پر پرندوں کی ڈاریں اپنے اپنے بسیروں کی جانب اڑتی دکھائی دے رہی تھیں ــــ

اُسن کے

منڈیر پر رکھے ہوئے ہاتھ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ اُس نے زور سے ہاتھ کھینچ لیا اور مڑ کر دیکھا تو کھیت میں بلکار سنگھ دُبکا ہوا بیٹھا تھا۔ اُسے اتنا قریب پاکر ویراں کا دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

ویراں نے دال بچن کرماں کے حوالے کر دی اور خود کپاس کی سوکھی چھڑیاں تندور میں جھونک کر انہیں آگ لگا دی۔ جب اس کی ماں دال چولہے پر چڑھا رہی تھی تو باہر سے بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ان کے اپنے بیلوں کی گھنٹیوں کی نہیں تھی۔ لمحہ بھر کو وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ یہ نئے بیل ان کے طویلے میں کیسے آنکلے۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کے بھائی نے صحن میں قدم رکھا تو اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا ——— اس کے ساتھ لمبی لمبی ٹانگوں والا وہی نوجوان تھا جس نے اس سے چھیڑ خانی کی تھی۔

اس کا جی چاہا کہ کاش اس کے پر نکل آتے تو وہ سیدھی اوپر کو اڑ کر سیدھی آسمان میں غائب ہو جاتی۔ ایک بار پھر اس کی آنکھیں اجنبی کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ اجنبی کی آنکھوں میں پُرمعنی چمک تھی۔ یہ دیکھ کر ویراں وہاں سے کھسکی اور کمرے کے اندر گھس کر بیٹھ گئی۔

اجنبی کو بیٹے کے ساتھ دیکھ کر بے بے (ماں) نے صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر چار خانے کا کھیس بچھا دیا ——— اور پھر واپس آکر پسار (برآمدے) میں چولہے پر رکھی ہوئی دال کے پاس بیٹھ گئی۔ ویراں کا بھائی کرتار سنگھ ماں کا اشارہ پاکر اس کے پاس چلا آیا۔ بے بے نے پوچھا۔ یہ لڑکا کون ہے؟

بچارا دور سے چلا آرہا ہے اس کے ساتھ گیہوں کے دو چھکڑے ہیں۔ وہ منڈی جا رہا ہے۔ پچھلے گاؤں میں کسی کام سے رُک گیا۔ ایک چھکڑا تو آگے نکل گیا اور اسے یہاں شام ہو گئی۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو ہم دوست بن گئے۔ میں اسے ساتھ لے آیا ہوں ——— رات کاٹ کر صبح چل دے گا۔

"اناج کے چھکڑے کے ساتھ اس کا کوئی نوکر تو ہوگا؟"

ہاں بے بے۔ ہر چھکڑے کے ساتھ ایک آدمی ہے۔ دوسرا چھکڑا ہمارے طویلے میں پہنچ چکا ہے ——— اب دو آدمیوں کا کھانا تیار کرنا ہوگا۔

"ہو جائے گا۔"

بے بے نے آواز دے کر ویراں سے اور زیادہ آٹا گوندھنے کو کہا

ویراں نے چپ چاپ کنستر میں سے آٹا پرات میں اُلٹ دیا۔

وہ آٹا گوندھے جا رہی تھی اور اجنبی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی کہیں وہ کوئی بہروپیا تو نہیں۔ باپو اس کی بڑی بہن کی سسرال گئے ہوئے تھے بھیا ٹھہرے بھولے بادشاہ ——— نہ جانے کیسے آدمی کو گھر لے آئے ہیں

بے بے کی آواز سے اس کے اندیشوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"ویرو تندور گرم ہو گیا ہے" بے بے کی آواز آئی۔

گندھے ہوئے آٹے کی پرات لے کر ویراں صحن میں آگئی۔ جہاں اس کا بھائی اور وہ اجنبی گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ اس نے پہلے تو آٹے کے پیڑے بنائے اور پھر ان دونوں کی طرف پیٹھ پھیر کر تندور میں روٹیاں لگانے لگی۔ اس کے باوجود اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اجنبی کی آنکھیں اس کی پیٹھ سے چپکی ہوئی ہوں۔ وہ بے چین سی ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے روٹیاں پکا کر جب وہ کمرے میں پہنچی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اجنبی کی آواز اس کے قد کی طرح ہی بلند تھی۔ وہ بڑا گپ باز معلوم ہوتا تھا۔ اس کی باتوں سے شیخی کی بو آتی تھی۔

صاف ستھری چمنی والی لالٹین روشن کر کے دیوار کی کیل سے لٹکا دی گئی تھی۔ ان دونوں نے پسار میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد اجنبی نے لمبی لمبی ڈکاریں لیں اور حلق میں انگلی گھما گھما کر مونہہ صاف کیا۔

اب وہ تینوں اطمینان سے پسار میں بیٹھ کر گپیں ہانکنے لگے۔ بے بے نے اپنی عادت کے مطابق اپنے دکھڑے رونے شروع کر دیئے۔ کمرے میں الگ تھلگ بیٹھی ویراں کو بڑا غصہ آرہا تھا۔ بے بے کو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ مسٹنڈہ تو اس قابل بھی نہیں کہ اسے اپنے گھر میں پناہ دی جائے۔ اور اگر رات کو رہنے کی اسے اجازت دے بھی دی تو اسے گھریلو باتیں بتلانے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟

بے بے نے اجنبی کو بتایا کو بتایا کہ وہ ماں بیٹے تو کھیتی باڑی کے کام سے پریشان ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ شہر میں کاروبار شروع کر دیں وہاں کافی روپیہ کمایا جا سکتا ہے۔

اجنبی نے پوچھا تو پھر آپ شہر میں ہی کیوں نہیں رہنے لگتے"

بے بے نے جواب دیا "بیٹا، ہمیں دیہات میں رہنا بہت اچھا لگتا ہے لیکن یہاں آمدنی بہت کم ہوتی ہے ——— سچ پوچھو تو ہم رہنا گاؤں میں ہی چاہتے ہیں اور کاروبار شہر میں کرنا چاہتے ہیں"

اب اس کا بھائی بول اُٹھا "اسی خیال سے تو ہم نے شہر کے نزدیک ریڑھی والا گاؤں میں زمین خریدی تھی، سوچا تھا وہاں مکان بنا کر رہیں گے اور کاروبار شہر میں کریں گے۔ گاؤں شہر کے اس قدر قریب ہے کہ سوچا تھا پیدل

گھر واپس آ سکیں گے، لیکن گھر خرید چکے تو پتہ چلا ہماری زمین کے سامنے کا مکان ملکھ چند سنگھ کا ہے، مکان بنانے کے حق میں نہیں ہے۔

اجنبی نے کہا "میں اس بڈھے کو جانتا ہوں وہ بڑا دھاکڑ بنتا ہے لیکن قانونی بات میں وہ ٹانگ کیسے اڑا سکتا ہے۔ آپ کو پورا حق حاصل ہے کہ آپ اپنی زمین پر مکان بنائیں یا جو بھی چاہے کریں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اس بدمعاش سے دشمنی مول کون لے؟

پہلے باپو نے اس کی بہت منت سماجت کی۔ وہ نہیں مانا تو باپو نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ زمین کسی کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔ لیکن زمین کے اس ٹکڑے کو کوئی خریدنا نہیں چاہتا۔ اب ڈیڑھ سال سے باپو نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا، ہم صبر کرکے بیٹھ گئے ہیں۔" کرتار سنگھ نے کہا۔

اجنبی چند لمحوں تک خاموش رہا، پھر بولا "یہ بات ہے، تو کل ہی میں تمہارے ساتھ ریڑھی والا چلوں گا۔ اس طرح صبر کرکے بیٹھ رہنا تو ٹھیک نہیں۔"

کرتار سنگھ نے اجنبی کے ڈیل ڈول کا ایک بار پھر جائزہ لیا تو اس نے محسوس کیا کہ اگر یہ اجنبی چاہے تو یقیناً اس خبیث بڈھے کا دماغ ٹھیک کر سکتا ہے۔

بے بے نہیں چاہتی تھی کہ اجنبی پرائی مصیبت اپنے سر لے لیکن بلکار سنگھ ــــ۔ وہ اجنبی مصر رہا۔

ایک پہر رات باقی تھی۔ ویراں حسبِ معمول اپنی ماں کے ساتھ کھیتوں کو گئی۔ وہ تو جلد ہی کھیت سے باہر نکل آئی۔ اس کی ماں ابھی کھیت میں ہی تھی۔ چوڑے ریتیلے راستے کے دوسری طرف کھیت میں اونچی فصل کھڑی تھی۔ ویراں کھیت کی منڈیر پر جا بیٹھی۔ وہ اجنبی کے بارے میں سوچ رہی تھی، کیا سوچ رہی تھی ــــــــ یہ اسے خود معلوم نہیں تھا۔

اتنے میں اس کے منڈیر پر رکھے ہوئے ہاتھ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے زور سے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ مڑ کر دیکھا تو کھیت میں بلکار سنگھ دبکا بیٹھا تھا۔ اسے اتنا قریب پا کر ویراں کا دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

بلکار بولا "ویراں بُرا نہ ماننا، تم نے راہ چلتے راہی کا سب کچھ لوٹ لیا ہے۔ اب میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر تمہارے کام سے جا رہا ہوں اگر زندہ بچ گیا تو انعام میں تمہارا ہاتھ مانگوں گا۔ . . . . . اور اگر مر گیا تو تم یاد رکھنا کہ ایک پردیسی نے تمہاری محبت کی راہ میں جان دیدی۔"

اتنا کہہ کر بلکار کھیت میں غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب ویراں ماں کے ساتھ گھر لوٹ رہی تھی تو راستے میں کرتار سنگھ اور بلکار سنگھ گھوڑوں پر سوار جاتے ملے۔ ماں نے انہیں اشیرواد دیا، اور وہ آگے بڑھ گئے۔

گھر پہنچتے ہی ویراں چھت پر چڑھ گئی ــــ گاؤں سے دور ایک نہر کرپان کی طرح بل کھاتی ہوئی سی نظر آ رہی تھی۔ دھندلکے میں دونوں گھڑ سوار دو متحرک دھبوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

شام کو باپو لوٹ آیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ کرتار سنگھ ریڑھی والا گیا ہے تو اس نے اپنی بیوی کو بہت ڈانٹا کہ لڑکے کا خون گرم تھا تو ماں کو ہی عقل سے کام لینا چاہئے تھا ــــ لیکن اب انتظار کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

چوتھے دن سب گھبرا گئے۔ باپو نے اگلے دن خود ریڑھی والا جانے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن اسی رات ابھی انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا کہ کرتار سنگھ لوٹ آیا ــــ وہ اکیلا تھا۔

وہ آ کر چولہے کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ سب کے اصرار کرنے پر وہ بولا "کام نہیں بنا۔ بلکار سنگھ ہسپتال میں ہے۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے . . . . ."

ویراں کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ اس کے حواس گم ہو گئے۔ اس نے یہ بھی نہیں سُنا کہ اس کے بعد اس کے بھائی نے کیا کہا ــــ۔ پھر کرتار سنگھ زور سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا "اچھا بے بے! اب روٹی دو بہت سخت بھوک لگی ہے۔"

باپو نے کہا "ایک پردیسی ہمارے پیچھے اپنی جان گنوا بیٹھا اور تجھے بھوک لگی ہے؟"

"ہاں باپو! سنسار میں ایسے پاگل بھی ہوتے ہیں۔"

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

ڈاکٹر منیب الرحمٰن

پگڈنڈی

چلتے ہوئے اس پگڈنڈی پر
جب سامنے پیڑ آجاتے تھے
ہوتا تھا گماں حد آپہنچی
کہتے تھے قدم اب لوٹ چلو
اب لوٹ چلو اس راہ پہ جس سے آئے تھے
کچھ دور پہ جاکر لیکن یہ مڑ جاتی تھی
پیڑوں کی صفوں میں تیزی سے گھس جاتی تھی
بکھرے ہوئے پتے اوس میں تر
چھنتی ہوئی کرنوں کا سونا
چپ چاپ فضاؤں کی خوشبو
ناگاہ کسی طائر کے پروں کی گھبراہٹ
ہم آگئے ان میدانوں میں
پھیلے ہوئے میداں اور افق کی پہنائی
اب آؤ یہاں سے گھر لوٹیں
چلتے ہوئے اس پگڈنڈی پر

(شب خون الٰہ آباد)

روشن صدیقی

غم باندازۂ راحت ہی سہی
نہ سہی شکر، شکایت ہی سہی

اک قیامت ہے سنبھل کر چلنا
جادۂ ترکِ محبت ہی سہی

ہوش مندوں سے نہیں دل ملتا
اب یہ وحشت ہے تو وحشت ہی سہی

جی بہلنے کے کچھ آثار تو ہیں
شورِ طوفانِ ملامت ہی سہی

عہدِ حاضر کا غزل خواں ہے روشن
دوش پر بارِ قدامت ہی سہی

(شاعر)

شہریار

سائے کی موت

دن کا دروازہ ہوا بند شبِ تار آئی
راستے کروٹیں لینے لگے
گلیوں میں اداسی چھا گئی
سارے ہنگامے وہ سب رونقیں رونق کی بہار
گونگی جیلوں میں ہوئیں قید
چلو اب نکلیں
اپنی تنہائی کے اس خول سے باہر
دیکھیں
اپنا سایہ کہاں جاتا ہے شبِ تار میں آج
کونسی یادوں کو چمکاتا ہے
کس پل کو صدا دیتا ہے
آج کیا کھوتا ہے کیا پاتا ہے
کس طرح بڑھتا ہے گھٹتا ہے، بکھر جاتا ہے
کیسے مر جاتا ہے؟

(معراج بھوپال)

پیارے ساتھیو!

گزشتہ دو ماہ سے تم کے امتحانات کی مصروفیات کی وجہ سے اچھے مضامین ارسال نہیں کیئے تھے اس لئے تمہارے صفحات شامل نہیں تھے۔ اب بہت سے ساتھیوں نے مضامین ارسال کیئے ہیں اور بیشتر نے لکھا ہے کہ وہ جلد مضامین اور کہانیاں ارسال کر رہے ہیں۔ اس یقین دہانی پر ہونہار شہری کے صفحات اس بار شامل ہیں۔

(نگراں ہونہار شہری)

عابد نوگانوی

فرض

اور اس نے کار کی زد میں آنے سے پہلے ہی بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ کار دور نکل چکی تھی لیکن وہ گرد و پیش سے بے خبر اس بچے کو سینے سے چمٹائے اس کے معصوم رخساروں کے بوسے لیتا رہا۔

"میرا بچہ!" — اچانک ہی ایک آواز ابھری۔ اور یہ آواز اسے اپنے دل کی آواز معلوم ہوئی لیکن دوسرے لمحے وہ بچہ ایک نوجوان عورت کی گود میں تھا وہ بڑی بیتابی سے اس کے رخساروں اور پیشانی کو چوم رہی تھی۔

وہ پھر مرے مرے قدموں سے چلنے لگا۔ جیسے اس کی آس ٹوٹ گئی تھی اور اس کے دل میں جینے کی کوئی خواہش باقی نہ رہی تھی — وہ چلتا رہا۔ چلتے چلتے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور پھر اس کے قدم ماضی کے اندھیروں میں بھٹک گئے۔ یہ جو آج اتنے اندھیرے
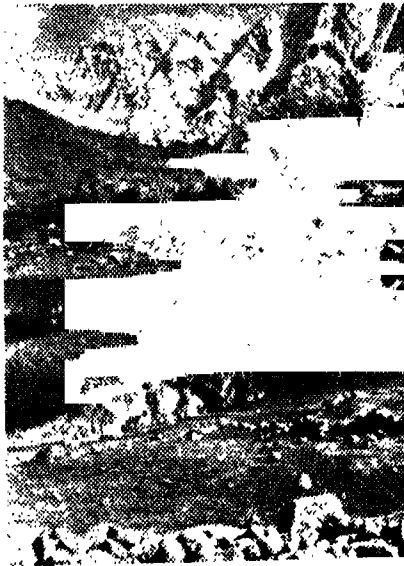
معلوم ہو رہے تھے وہی ایک دن اجالے بھی تھے اور ان اجالوں میں اس کا بھی ایک گھر تھا اس کا بھی ایک بچہ تھا۔ نہیں کئی بچے تھے۔ بھرپور گھر تھا۔ اس گھر میں اس کی بیوی شکیلہ تھی اس کے دو بچے تھے نعیم اور کلیم۔ اس کی بیوی شکیلہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی صرف چند مذہبی کتابیں ہی گھر پر پڑھی تھیں۔ لیکن اسے تعلیم کا بہت شوق تھا۔ مگر پرانی رسم و رواج نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ اور اس نے خود بھی نہ چاہا تھا پھر بھی وہ کتابیں بھی بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔ ایک دن شاہد نے اسے ایک ناول لا کر دیا۔ جس کو پڑھنے کے بعد اس نے بڑی تعریف کی تھی۔ اور کہا تھا۔ "خدا کرے تم بھی ایک دن اتنے ہی بڑے آدمی بن جاؤ" مگر شاید بڑا آدمی نہ بن سکا تھا۔ حالات نے اسے صرف ایک ہیڈ کانسٹبل بنا دیا تھا۔ مگر وہ شکیلہ کو پا کر ایک نئی زندگی اور تازہ روح اپنے اندر محسوس کر رہا تھا۔ ازدواجی زندگی میں بھی شکیلہ بہت قابل ثابت ہوئی۔ اس نے شاہد کی زندگی کو بہار بنا

سوات کا ایک منظر

عکاس: — محمود احمد سید و شریف

ہونہار شہری کے نئے ممبر

کے علاوہ گھر کو بھی جنت بنا دیا تھا۔ اسے شاہد کی خدمت کرنے میں ایک عجیب سا لطف محسوس ہوتا۔ وہ شاہد کو خدا تو نہیں مگر اپنی کشتی کا ناخدا ضرور سمجھتی تھی اور جس کی عبادت کرنا اس کا فرض اولین اور ایمان بن گیا

۲۱۹ - اطہر نور کراچی
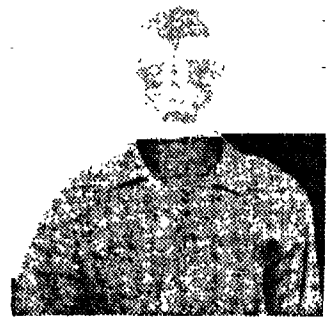
تھا۔ شام و سحر مسرت اور شادمانی کا پیغام لاتے۔ تین سال بعد یکے بعد دیگرے اس کی پر بہار دنیا میں دو چاند طلوع ہوئے۔ پھر تو جیسے تمام کائنات کی رعنائیاں اسی کے گھر میں سمٹ آئی ہوں۔ وہ خوش تھا۔ اس کی خوشی لامحدود وسعتوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی زندگی ان وادیوں سے ہمکنار رہی جہاں ہمیشہ بہاریں ہوتی ہیں۔ اور سدا پھول مسکراہٹیں بکھیرتے رہتے ہیں۔ اور تا قیامت یونہی رہے گی۔ جیسے وہ اس دنیا کا فرد نہ تھا جس میں غم بھی ہوتے ہیں غموں کے افسانے دہرائے جاتے ہیں۔ جہاں ہر روز غم خوردہ کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ جہاں کی ہر شے غم میں ڈوبی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ غم اس سے کوسوں دور تھے۔ اور یہ دنیا صرف اس کے لئے ایک جنت تھی۔

جب وہ ڈھاکہ سے چاٹگام منتقل ہو کر آیا تو اس کے چمن میں دو مسکراتے ہوئے پھول تھے۔ چاٹگام آکر بھی اس کی زندگی میں وہی بہاریں رہیں۔ بلکہ مزید اضافہ ہو گیا۔ چند ہی دنوں میں یہاں کا ہر فرد اس کے اخلاق و معاملات کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ اپنے اصول اور فرض کا بہت پاس کرتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا تھا نہ کسی پہ بے جا رعب ڈالا تھا۔ اس کے دل میں انصاف تھا۔ انصاف جو خدا کو بھی پسند ہے۔ نہ کبھی اس نے اپنی ڈیوٹی پر عجلت پسندی سے کام لیا تھا۔ اس کی انہیں تمام باتوں سے متاثر ہو کر افسران نے اسے بہت قریب رکھا تھا۔ اور اس کے لئے ترقی کی راہیں ہموار کر دی تھیں۔ اس نے اپنی محنت کی کمائی سے ایک چھوٹا سا مکان بھی یہاں آکر خرید لیا تھا۔ جو بہت اچھا تو نہ تھا لیکن شکیلہ نے اسے شیش محل بنانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا۔ اسے چاٹگام کی آب و ہوا بہت بھا گئی تھی۔ اس لئے شاہد نے اسی جگہ پر مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

زندگی بہت پرسکون گزر رہی تھی۔ گھر اس کے لئے جنت تھا۔ جب وہ اکیلا ہوتا تو اس کا ذہن مستقبل کی حسین وادیوں تک پرواز کر جاتا۔ اور وہ سوچتا کہ ایک دن اس کا نعیم بڑا آدمی بنے گا۔ وہ اسے خوب پڑھائے گا۔ اسے انجینئر ہونا چاہئے۔ آج ہمارے ملک کو ایسے لوگوں کی بہت ضرورت ہے۔ اور پھر کلیم کے لئے سوچتا۔ کلیم سے اسے بہت پیار تھا۔ کلیم بھی اونچی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا اور ملک کی خدمت کرے گا۔

وہ ان سوچوں کے جال میں الجھا برابر چلے جا رہا تھا۔ دفعتاً اسے ٹھوکر لگی اور گرتے گرتے سنبھل گیا۔ اسے اپنی ڈیوٹی کا خیال آیا اور تیزی سے اس کے قدم اٹھنے لگے۔ لیکن چند قدم چل کر ہی اس کے پیر بوجھل ہو گئے اور ایک بار پھر وہ ماضی کے کھنڈرات میں جا پہنچا۔ اور وہ ٹوٹی ہوئی دیواریں اس کے سامنے آگئیں جو کبھی ایک محل کی شکل میں اس کے سامنے تھیں۔

ہونہار شہری کے نئے ممبر

اسے ان دنوں کی بات یاد آگئی جب نعیم نے ہائی اسکول امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔ کلیم ابھی چھوٹا تھا لیکن بہت ضدی تھا۔ ضدی اور شرارتی بچے اکثر ذہین ہوتے ہیں اس لئے شاہد کو اس کی ضدیں اور شرارتیں بہت

۲۲۰ - فراست اللہ کراچی

آج کا بچہ، کل کا ہونہار شہری

پسند تھیں۔ اس کی ضدیں بھی عجیب تھیں۔ نعیم ہائی اسکول میں پاس ہوا تو وہ بھی ضد کرنے لگا۔

"ابا جان میں بھی ہائی اسکول پاس کروں گا۔"

"ہاں بیٹا ضرور پاس کرنا۔" شاہد نے کہا۔

"لیکن میں تو ابھی پاس کروں گا۔"

اطہر پرویز۔ لاہور

بھائی جان نے بھی تو ابھی پاس کیا ہے۔"

اور کلیم کی معصوم زبان سے ایسے الفاظ سنکر اس کا دل بے اختیار مچل اٹھا تھا۔ اور اسے اپنے سینے سے چمٹا کر اس کے ہزاروں بوسے لے ڈالے تھے۔

لیکن آج ۔۔ آج یہ سب کچھ اس کے لئے ایک حسین خواب تھا جو چند لمحے بعد ختم ہو گیا۔ اور وہ بالکل تنہا کسی قافلے سے بچھڑے مسافر کی طرح راستوں کے نشیب و فراز میں بھٹک رہا ہے۔ اور ان راہوں میں خار ہیں، اندھیرے ہیں۔ نہ شکیلہ ہے، نہ نعیم ہے، نہ کلیم ہے۔

آخر یہ سب اس کی زندگی سے کہاں چلے گئے؟ اسے کیوں بھٹکنے کے لئے تنہا چھوڑ گئے۔ اور جواب میں اس کی نگاہوں کے سامنے وہ بھیانک طوفان آ گیا جس نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس کی محبت چھین لی تھی۔ بس کا مستقبل چھین لیا تھا۔

اس دن طوفان آیا ہوا تھا۔ ہوائیں چیخ رہی تھیں۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی۔ اور دلوں کو دہلا رہی تھی۔ چاروں سے برابر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ دلوں میں خوف تھا۔ لبوں پر دعائیں تھیں بار بار دھماکے ہو رہے تھے۔ مکان گر رہے تھے۔ غریب گھر سے بے گھر ہو رہے تھے ایک رات بہت خوفناک تھی۔ پورے شہر کو تاریکیوں نے اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ اور اس رات وہ اپنی ڈیوٹی پر تھا۔ اپنے فرض کی تکمیل کر رہا تھا۔ اچانک ایک مکان کے گرنے کی آواز آئی اور اسے اپنا گھر یاد آ گیا۔ بیوی بچے یاد آ گئے جو اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اجازت لے کر وہ گھر کے لئے چل کھڑا ہوا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اس کی نگاہوں نے وہ منظر دیکھا جس کی تاب ایک پتھر دل بھی نہیں لا سکتا۔ اس کا گھر گر گیا تھا ۔۔ وہ شیش محل اس طوفان کی شدت کا مقابلہ نہ کر سکا تھا۔ اور اس شیش محل کے تمام چراغ بھی گل ہو چکے تھے۔ صرف کلیم اس طوفانی رات میں کھڑا سسک رہا تھا۔

پھر اس کی تمام تر محبت ایک ہی پھول کے لئے مجتمع ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن ایک دن وہ پھول بھی مرجھا گیا۔ کلیم جس نے اسکے تمام دکھوں کو بھلا دیا تھا۔ جس کی شرارتیں اس کے زخموں کا مرہم بن گئی تھیں۔ وہ بھی ایک دن ایک کار کی زد میں آ کر داغ دے گیا۔ وہ کبھی نہ رویا تھا لیکن اس دن پتھر پگھل گیا تھا اور اس مرجھائے ہوئے پھول کو اپنے سینے سے چمٹائے گھنٹوں تک روتا رہا تھا۔

"کلیم۔ کلیم" وہ چلتے چلتے یکایک چیخا۔ اس کی باہیں ایک لمحہ کے لئے پھیلیں اور سکڑ گئیں۔ دوسرے ہی لمحہ اسے یوں لگا جیسے کوئی دیوانہ اچانک اس پر آ گرا ہے۔ خیال آیا۔ "میری ڈیوٹی" اور وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا تھانہ پہنچ گیا۔
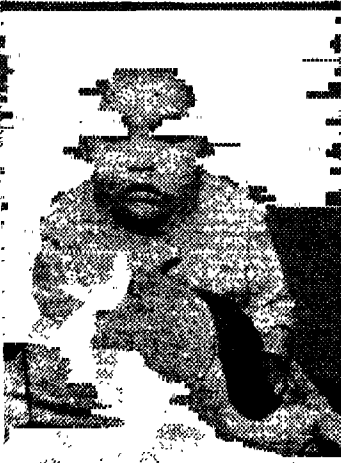
عظیم کمال

آج کی بچی کل کی ہونہار شہری

راحیلہ بانو۔ کراچی

چونی

چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ گاؤں کے گاؤں تباہ ہو گئے تھے۔ باپ بیٹے سے بھائی بہنوں سے

اور شوہر بیوی سے جدا ہوگئے۔ کہیں رہنے کو درخت کی چھاؤں بھی نہ ملتی تھی اس لئے کہ درخت بھی پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لوگ بھوک اور بیماری سے ہلاک ہو رہے تھے۔ جب یہ خبریں شہروں میں پہنچیں تو بہت سے نوجوان اپنے دیہاتی بھائیوں کی مدد کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

ایک صاحب ناک پر سنہری عینک لگائے، بڑھیا سوٹ پہنے اور کلائی میں بندھی ہوئی چاندی کی گھڑی کی نمائش کرتے ہوئے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ ہم ان کی طرف بڑی امیدوں کے ساتھ بڑھے۔

"جناب بارش اور سیلاب سے غریب لوگوں کا جو نقصان ہوا ہے وہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ ہم آپ سے مدد کی درخواست کرتے ہیں۔"

"کیسی مدد؟ آپ ہیں کون؟" ان صاحب نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہم لوگ طالب علم ہیں اور سیلاب میں پھنسے ہوئے لوگوں کے لئے چندہ جمع کرنے نکلے ہیں۔" ہم نے جواب دیا۔

"خوب! آپ کالج میں پڑھتے ہیں یا ان بیکار باتوں میں اپنا وقت گنواتے ہیں؟ آپ کو ان باتوں سے کیا کام؟" انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا۔ "اگر چند پیسوں کی امداد سے ہم کچھ غریب لوگوں کی مدد کر سکیں تو اس میں کیا حرج ہے؟"

"ناک میں دم کر رکھا ہے ان روز روز کے چندوں نے۔ ہر گھڑی چندے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ بتائیے کسے دیں کسے نہ دیں۔ پھر اسٹیشن بھی کوئی چندہ مانگنے کی جگہ ہے۔ سفر میں کوئی خزانہ لے کر تو ساتھ نہیں چلتا۔" یہ کہہ کر وہ صاحب ایک پھل والے سے مول تول کرنے لگے ———

ہم ایک تیسرے درجہ کے ڈبے میں داخل ہوئے اور امداد کی اپیل وہاں بیٹھے ہوئے تمام مسافروں ... ایک رحم دل بڑھیا بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ ہماری راہ میں بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ اس کے بدن کے کپڑوں کو کپڑا کہتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ اس سے کچھ مانگنا مناسب نہ سمجھ کر ہم آگے بڑھنے لگے تو اس نے ہمیں روکا۔ معلوم ہوتا تھا کہ خدا نے اس کی دو چھوٹی چھوٹی ٹمٹماتی آنکھوں میں ساری کائنات کی چمک بھر دی ہے۔ گرہ سے ایک "چونی" کھول کر اس نے ہمارے ہاتھ پر رکھ دی اور بڑی عاجزی سے معافی مانگی۔ اس کے پاس شاید وہی آخری چونی تھی لیکن اس میں ایک غریب کی روح تھی۔

صفحہ ۷۶ کا بقیہ ——— ست رنگا کبوتر

ویراں کے دل پر جیسے گھونسہ سا لگا۔ اسے اپنے بھائی سے نفرت کا احساس ہوا۔

کرتار سنگھ پھر بولا "باپو! ایک خوش خبری بھی لایا ہوں — میں نے ویراں کا رشتہ طے کر دیا ہے۔"

بے بے حیران ہو کر بولی "کس سے؟"

"ارے بے بے! وہ بڈھا بدمعاش چار مہینے ہوئے مر بھی گیا۔ بلکار نے اس کی زمین اور مکان وغیرہ خرید لیا۔ بلکار کو ہمارے مکان بنانے پر بالکل اعتراض نہیں ہے۔"

باپو اور بے بے آنکھیں پھاڑے بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ کرتار سنگھ نے کہا "میں نے ویراں کا رشتہ بلکار سنگھ سے طے کر دیا ہے۔ مانا ہوا خاندان ہے۔ ان کی زمین ہے، مکان ہے...."

بے بے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں پھنسا کر بولی "ارے تو بے کار کی باتیں کیوں بنا رہا ہے؟"

کرتار سنگھ نے کنکھیوں سے ویراں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تو کیا یہ بھی بتانا پڑے گا؟"

ویراں شرما کر اندر بھاگ گئی اور اپنے گھنگرووں والے رنگ رنگیلے چرخے سے یوں لپٹ گئی جیسے وہ اس کی جگری سہیلی ہو۔

بازگشت

گزشتہ شمارے میں جو سوالات شائع ہوتے تھے۔ ان میں جناب ممتاز احمد سبزواری پشاور کا سوال سب سے بہتر اور انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اعلان کے مطابق اس ماہ سے ان کے نام ایک سال کے لئے الشجاع جاری کر دیا گیا ہے۔ (ادارہ)

ارجمند اختر چاٹگام

س :- میری مادری زبان بنگالی ہے۔ اس کے باوجود میں اردو میں ایم اے کرنا چاہتی ہوں۔ آج کل میں "دکنی ادب" پر ایک مقالہ لکھ رہی ہوں اس مقالہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر زور کی کتابوں سے مجھے بڑی مدد ملی ہے۔ حال ہی میں ایک مشفق نے مجھے ڈاکٹر زور کی کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" کے مطالعہ کا مشورہ دیا ہے لیکن جب میں نے اس کتاب کو تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ اس نام سے زور صاحب نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے، کیا آپ اس سلسلہ میں میری رہبری فرمائیں گے ؟

ج :- محترمہ! "یورپ میں دکنی مخطوطات" ڈاکٹر زور کی تالیف نہیں ہے۔ اس کے مؤلف نصیر الدین ہاشمی ہیں۔ کہنے کو یہ کیٹیلاگ ہے لیکن اس کو جس انداز سے ترتیب دیا گیا اسی کی بنا پر اس کی حیثیت تالیف کی ہے۔ اس میں ان مخطوطات کے اقتباسات دیئے گئے ہیں جو یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مخطوطات پر مولف نے جس علمی انداز سے تبصرہ کیا گیا ہے اس سے اس کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے آپ کو یہ کتاب حیدرآباد دکن کے کسی کتب فروش سے مل سکے گی۔

سلمیٰ شمیم کراچی

س :- رتن ناتھ سرشار کو اردو کا عظیم ناول نگار کہا جاتا ہے لیکن ان کی تصانیف "فسانۂ آزاد" اور "جام سرشار" سے یہ بات ثابت ہے کہ ان کے ہاں مقصدیت نہیں بلکہ وہ ادب برائے ادب کے قائل ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سرشار کو عظیم ناول نگار کہا جاتا ہے؟ کسی ممتاز نقاد کے حوالے میرے سوال کا جواب دیجئے۔

ج :- محترمہ۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں ہم خود اظہار خیال کے بجائے اردو کے ممتاز نقاد وقار عظیم اور پروفیسر شعیب کے مضامین کی چند سطور درج کر رہے ہیں ان کے مطالعہ سے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائیگا۔

" سرشار اردو کے پہلے ناول نگار جنھوں نے زندگی کے پھیلاؤ اور اس کی گہرائی پر احاطہ کرنے کی طرح ڈالی اور اردو ناول کو ایک ایسی روایت سے آشنا کیا جسے فنی عظمت کا پیش خیمہ کہنا چاہئے۔"

" سرشار اپنے ماحول اور معاشرہ کی کیفیتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے انھوں نے رعایت اور تعصب، قدیم اور جدید، بدلتی ہوئی اخلاقی قدریں، رسموں اور رہن سہن کے طریقوں کے راز فاش کئے ہیں۔ سرشار کی تحریروں میں زندگی کی پنہائی، کرداروں کی رنگا رنگی، جذبات کا تنوع اور ظرافت و رنگینی کی جو کیفیت ہے وہ اسے زندگی سے بہت قریب کر دیتی ہے۔"

عبداللہ خان دھار

س :- ن۔م۔ راشد نے اردو میں سب سے پہلے آزاد نظمیں کہہ کر اردو کے شعری ادب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ وہ آزاد شاعری کے امام ہیں۔ اصولاً ان کو خراج تحسین پیش کرنا چاہئے تھا مگر یہ اردو ادب کا المیہ ہے کہ جدید نسل کے شعراء اردو میں آزاد نظم کا بانی راشد کو قرار نہیں دیتے۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟

ج :- محترم۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزاد نظم گو کی حیثیت سے راشد نے اردو شاعری میں اضافہ کیا ہے۔ آزاد نظم کہنے والوں میں ان کا نام سرفہرست ہے لیکن یہ کہنا کہ انھوں نے اردو شاعری کو آزاد نظم سے روشناس کرایا صحیح نہیں۔ کیونکہ ان سے بہت پہلے نادر کاکوروی۔ عظمت اللہ خاں، اور عبدالحلیم شرر آزاد نظمیں کہہ چکے تھے۔ اور اس قسم کی کئی نظمیں عبدالحلیم شرر کے رسالے "دلگداز" لکھنؤ میں شائع ہوئی تھیں۔ جہاں تک راشد کی ادبی حیثیت کا سوال ہے اس سے کوئی منکر نہیں ہے۔ اور ہر نقاد نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔

مثلاً

۱۰۰ روپے سے ۱۸۰ روپے
۱۰۰۰ روپے سے ۱۸۰۰ روپے
۱۰،۰۰۰ روپے سے ۱۸،۰۰۰ روپے

شرط یہ ہے کہ آپ

ڈیفینس سیونگز سرٹیفکیٹس

میں روپیہ لگائیں
زیادہ سے زیادہ منافع
انکم ٹیکس میں رعایت

اگر آپ یہ سرٹیفکیٹ پانچ برس تک اپنے پاس رکھیں گے تو منافع ۶ فیصد ملے گا۔
اور اگر مزید پانچ برس تک رکھیں گے تو منافع ۸ فیصد ہو جائے گا یعنی ۹ فیصد منافع اور مزید ۲ فیصد بونس۔
اس طرح دس برس میں آپ کے ۱۰۰ روپے ۱۸۰ ہو جائیں گے۔
انفرادی طور پر سرمایہ کاری ۲۵،۰۰۰ ہزار روپے تک
اجتماعی طور پر سرمایہ کاری ۵۰،۰۰۰ ہزار روپے تک
ادارے اس سے زیادہ رقم لگا سکتے ہیں۔
پراویڈنٹ فنڈ کے لئے کوئی حد مقرر نہیں۔
نامزدگی کی اجازت ہے۔

Reg. No. S. 1796

ASH-SHUJA

A TIMES PRESS PUBLICATION
Mansfield Street Sadar Karachi-3

سوات کی ایک دیہاتی عورت اپنے کھیت سے
لوٹ آتے ہوئے

اپنے وطن میں

دریائے سندھ کا ایک منظر

ادارۂ صحت و تحقیقاتِ طبیّہ (انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبی ریسرچ)

کی تکمیل ملک کی بہت بڑی خدمت ہو گی!

سب کی بھلائی کے لئے آپ بھی کچھ نہ کچھ دے سکتے ہیں

پاکستان کے اہلِ خیر سے حکیم محمد سعید کی اپیل

ہمدرد ٹرسٹ کے چیرمین حکیم محمد سعید دہلوی نے قوم سے اپیل کی ہے کہ وہ ادارہ صحت و تحقیقاتِ طبیہ کے عظیم منصوبے کی تکمیل میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ یہ مرکز جس کا سنگِ بنیاد گزشتہ دنوں صدر ایوب نے کراچی میں رکھا تھا خلقِ خدا کی صحت و امراض کے ازالے کے لیے تعمیر کیا جا رہا ہے۔ حکیم محمد سعید نے اپنی اپیل میں کہا ہے کہ ہر اس شخص کو جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کا کچھ قرض اپنے ذمہ سمجھتا ہے، اس کارِ خیر کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور ادا کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ وہ پندرہ لاکھ مریض جن کی بے لوث خدمت اور علاج پر انھوں نے اپنی زندگی کا ایک تہائی حصہ صرف کیا ہے، اگر کم از کم پانچ روپے فی کس بھی دیں تو یہ کام بہت جلد پورا کیا جا سکتا ہے۔

حکیم صاحب کی اپیل کا مکمل متن درج ذیل ہے

میرا خطاب اپنے ان مریضوں سے ہے جن کو میں نے گزشتہ ۱۹ برس میں اپنی پوری توجہ دینے کی کوشش کی میری زندگی کے کل اوقات کا ایک تہائی حصہ مریضوں کو دیکھنے اور ان کے دکھ درد کو سمجھنے میں صرف ہوا یہ ایک سعادت تھی جو مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نصیب ہوئی میں اس کے لئے اس کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں۔ ایسے مریضوں کی مجموعی تعداد جن کی خدمت کا شرف مجھے حاصل ہوا آج کی تاریخ تک ۱۵ لاکھ ہوتی ہے ان میں اکابرین و سربراہان مملکت سے لے کر ہر طبقے ہر فرقے اور ہر پیشے کے اعلا و ادنیٰ افراد شامل ہیں۔

بیماریوں کے ہاتھوں انسانی تکلیف اور مصیبت کا جس قدر مشاہدہ میری آنکھوں نے کیا ہے شاید ہی کسی اور شخص کو اس کا موقع ملا ہو ادارۂ صحت و تحقیقاتِ طبیہ (انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبی ریسرچ) کے عظیم مرکز کا موجودہ منصوبہ میرے انھیں مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ خلق خدا کی صحت میرا مقصود اور امراض کا ازالہ میری زندگی کا مشن ہے یہ مقصد ہر اس شخص کو عزیز ہونا چاہیے جو خدا کا خوف دل میں رکھتا ہو۔ اس وقت میں خصوصاً اپنے ان مریضوں سے جن کے علاج کی مجھے توفیق ہوئی انسانیت اور خدا ترسی کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس عظیم مقصد کی تکمیل میں اپنے اہلِ قوم کا ہاتھ بٹائیں۔ ادارۂ صحت و تحقیقاتِ طبیہ (انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبی ریسرچ) کی بنیاد ہمارے صدرِ مملکت کے ہاتھوں رکھی جا چکی ہے میں اس کی تکمیل میں دل و جان سے شریک ہوں گا مگر اس کی تعمیر دراصل قوم ہی کے ہاتھ میں ہے

اگر آپ کبھی میرے زیرِ علاج رہے ہیں تو آپ جانتے ہوں گے کہ میں نے کبھی کسی سے کوئی فیس نہیں لی۔ شاید میں آپ کو دیکھنے کے لیے آپ کے گھر پر بھی حاضر ہوا ہوں بیشمار ایسے لوگ ہیں جن پر میں نے ان کی دوا کا بار بھی پڑنے نہیں دیا پھر بھی میرا آپ پر کچھ قرض نہیں لیکن اگر آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کا کچھ قرض اپنے ذمے سمجھتے ہیں تو اس میں سے کچھ قدرِ قلیل اس کارِ خیر کے لیے ضرور ادا کیجیے۔ اگر میرے سب مریض ۵ روپے فی کس بھی دیں تو یہ کام بہت جلد پورا کیا جا سکتا ہے۔

عطیات کی ترسیل براہِ راست نہ کریں بلکہ تمام عطیات کامرس بینک لمیٹڈ، یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ، حبیب بینک لمیٹڈ اور نیشنل بینک آف پاکستان کی کسی بھی برانچ میں جمع کرائیں۔

(مطبوعہ ... [illegible])

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات بموجب سرکلر نمبر ڈی ای او/کراچی/وی ۶۶۶۶۹-۳۴-۸۹
مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۱ء

ترتیب

ایس ایم غیاث الدین ـــ سلمان ارشد

طابع و ناشر

ایس ایم شجاع الدین

زیر اہتمام

سلطان کلیم

زر سالانہ: پانچ روپے ـــ فی شمارہ پچاس پیسے
فون نمبر ۵۲۳۳۳ (پریس) ـــ ۵۵۲۱۲ (شعبۂ ادارت)

شعبۂ نشر و اشاعت

ٹائمز پریس

مینسفیلڈ اسٹریٹ ـ صدر کراچی

ایس ایم شجاع الدین پرنٹر پبلشر نے ٹائمز پریس صدر کراچی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الشجاع صدر کراچی سے شائع کیا۔

اس شمارے کے چند فنکار

- آل احمد سرور
- کرشن چندر
- والٹر بی ہیکاس
- افضل صدیقی
- فراق گورکھپوری
- ضیاء الحسن فاروقی
- اشتیاق طالب
- رشیدہ رضویہ
- زکی انور
- حرمت الاکرام
- خواجہ جمیل احمد
- حسن اجمل مسرت
- بشیشر پردیپ
- قمر اقبال
- نریش کمار
- احمد صغیر صدیقی
- خورشید جامی

اس کے علاوہ
اور دو شعراء
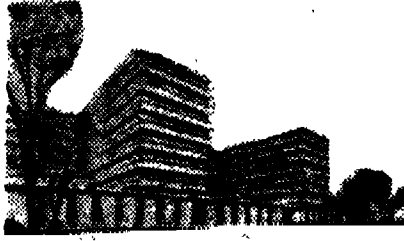
اس عظیم منصوبے کی تعمیر دراصل آپ ہی کے ہاتھ میں ہے

(انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبی ریسرچ)

ایک نہایت اہم قومی اور انسانی ضرورت کو پورا کرے گا

ہمدرد (وقف) نے اس ادارے کی عمارت کے لئے
۰۰۰,۰۰,۲۸ رُپے سے زیادہ
مالیت کی زمین بطور عطیہ دی ہے
لیکن اس کی تعمیر کے لئے کل ۰۰۰,۰۰,۰۰,۵
رُپیہ فراہم کرنا ہے جو صرف
آپ کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے۔

صدر محترم فیلڈ مارشل محمد ایوب خان
نے کراچی میں ۳ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو اس ادارہ کا سنگ بنیاد
رکھا اور ۲۵٬۰۰۰ رُپے کا پہلا عطیہ بھی مرحمت فرمایا
اس عظیم مقصد کے لئے اپنے عظیم رہنما کی پیروی کیجئے
اور اس کارِ خیر میں فراخ دلی سے حصہ لیجئے۔

---

۵ رُپے یا اس سے زیادہ کے تمام عطیات سارے ملک میں مندرجہ ذیل بینکوں کی کسی بھی شاخ میں جمع کرائے جا سکتے ہیں۔

نیشنل بینک آف پاکستان

حبیب بینک لمیٹڈ

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

کامرس بینک لمیٹڈ

یہ تمام بینک عطیات کی وصولیابی کے سلسلے میں آپ سے مکمل تعاون کریں گے اور جمع شدہ رقم کی رسید بھی دیں گے۔ عطیات کی رقوم انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

ادارۂ صحت و تحقیقات طبیہ بھی تمام عطیات کی رسیدیں شکریہ کے ساتھ فرداً فرداً ہر شخص کو روانہ کرے گا۔ عطیات دینے والوں کے نام ہر ماہ ہمدرد صحت (ڈائجسٹ) میں شائع کئے جائیں گے

قومی صحت کے اس عظیم منصوبے کی تعمیر میں دل کھول کر حصہ لیجئے

تعمیراتی پروگرام:- انسٹیٹیوٹ، ۵۰۰ بستر کا ہسپتال، لائبریری، کالج آف میڈیسن، ڈرگ ریسرچ سنٹر، نیشنل ہیلتھ سنٹر، ہیلتھ اینڈ میڈیکل میوزیم وغیرہ وغیرہ۔

لمبریٹا اسکوٹر
حفاظت
کفایت
اور کارکردگی میں اعلیٰ

التماس .. . . ناشر ۶

خصوصی فیچر

سب دوست ہیں . . افضل صدیقی . . ۷

تاریخ

غزنی .. .. . خواجہ جمیل احمد ۱۳

معلوماتی جائزہ

عرب اور اسرائیل .. . ضیاء الحسن فاروقی .. ۱۶

تحقیق و تنقید

جگر مراد آبادی .. . . اشتیاق طالب .. ۲۲

ناقابل فراموش

ہاٹان کا بھوت .. . والٹر بی ہیکاس . . ۲۸

شعری ادب

ترائیلے .. . . نریش کمار شاد . . ۳۶

غزل .. . . حرمت الاکرام .. ۳۷

غزل . . . . خورشید جامی . . ۳۷

غزل .. .. . . قمر اقبال ۳۸

غزل . . . . صلاح الدین نیّر . ۳۸

غزل .. . . . حزیں لدھیانوی . ۳۹

غزل . . . . نقی ثاقب . . ۳۹

دوہے .. .. . مقبول قریشی . . ۴۰

غزل .. . . ضیا انصاری . . ۴۰

غزل .. . . سرور اکبر آبادی . . ۴۱

آئینے .. . . شاہد کبیر . . ۴۱

غزل . . . . ظہیر قلادی . . ۴۱

افسانے

گناہ .. .. .. نکی انور ۴۲

بازگشت .. .. .. حسن اجمل مشیر .. ۴۶

دو زخم .. . . رعنا بنت اختر .. ۴۹

دریچہ .. . . ڈاکٹر ذکیہ شبیر . ۵۴

رپورتاژ

پتھروں کے درمیان .. . بشیشر پردیپ .. ۶۰

پراسرار کہانی

تاریک کمرہ .. . . احمد صغیر صدیقی .. ۶۳

سیر و سفر

کراچی کا پانی .. . . رشیدہ رضویہ . . ۶۸

طنز و مزاح

اسٹیج پر .. .. . بھارت لکھنو .. ۷۱

حاصلِ مطالعہ

ہاتھ کی چوری .. . کرشن چندر .. ۷۳

عزم کوہ کنی (نظم) .. . آل احمد سرور .. ۷۷

غزل .. .. . فراق گورکھپوری . ۷۸

غزل .. . . شمیم حنفی . . ۷۸

مستقل عنوانات

ہمارے نام .. . قارئین ۷۹

بازگشت .. . . ادارہ . . . ۸۰

التماس

۲۷ اکتوبر ملت اسلامیہ پاکستان کے لئے ایک ناقابل فراموش تاریخ ہے۔ اس تاریخ کے پس منظر میں پاکستان کی نشاۃ ثانیہ کا عکس نظر آتا ہے۔ الشجاع کی روایات کے مطابق زیر نظر شمارے میں انقلاب اکتوبر ۱۹۵۸ء سے متعلق ملک کے ممتاز صحافی جناب افضل صدیقی کا ایک فکر انگیز مضمون "اب سب درست ہیں" پیش کیا جا رہا ہے۔ مضمون گو مختصر ہے مگر اپنی اہمیت کے اعتبار سے مستقل قدر و قیمت کا حامل ہے۔

صدر ایوب کی حکومت نے پاکستان کے حقیقی نصب العین، قومی موقف سربلندی اور عظمت کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دئیے ہیں فاضل مضمون نگار نے ان کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے صدر ایوب کی حکومت کی کارکردگی کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ مضمون قارئین کو پسند آئے گا۔

ناقابل فراموش اور اسلامی تاریخ کے تحت جو مضامین شائع کیے جا رہے ہیں الشجاع کے قارئین نے ان کو پسند کیا ہے۔ اور ان کی خواہش ہے کہ ان تمام مضامین کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ ہم نے قارئین کی آراء کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔ مگر اپنے محدود وسائل کی بناء پر اس سلسلہ میں ہم فوری طور پر کوئی وعدہ نہیں کر سکتے البتہ یہ یقین دلاتے ہیں کہ اگر ہر دو کتابچے کے اتنے آرڈر آگئے کہ ہمیں نقصان نہ ہو تو ہم اپنے پڑھنے والوں کے حکم کی تعمیل کی کوشش کریں گے۔ اسلامی تاریخ اور ناقابل فراموش کے تحت "غزنی" اور "بانان کا بھوت" اس شمارے کی زینت ہیں۔

"پراسرار کہانی" کو قارئین نے بیحد پسند کیا ہے مگر بعض پڑھنے والوں کو اس پر اعتراض ہے۔ ان کی رائے میں سنسنی خیز کہانیاں الشجاع کی ادبی حیثیت کو مجروح کرتی ہیں۔ اس ذیل میں نہایت ادب سے عرض ہے کہ اس عنوان کے تحت جو کہانیاں شائع کی جا رہی ہیں وہ مغرب کے ممتاز ادیبوں کی ذہنی کاوشوں کا ماحصل ہیں اور یہ منفی اقدار کی عکاس نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے مطالعہ سے اذہان پر ناخوشگوار تاثرات مترتب ہوتی ہیں۔

"گلریا کے آدم خور" کے سلسلہ میں کافی شکایتی خطوط موصول ہوئے ہیں۔ اکثر پڑھنے والے اس پر برہم ہیں کہ اس مستقل سلسلہ کو اچانک کیوں روک دیا گیا۔ دراصل اس مضمون کی عدم اشاعت کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ چند ماہ سے مترجم جونیئر صاحب فراش ہیں اور ابھی تک اس قابل نہیں ہوئے ہیں کہ باقاعدگی سے اقساط روانہ کر سکیں۔ لیکن انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے اس ادھورے مضمون کو مکمل کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اس وضاحت کے بعد شاکی حضرات مطمئن ہو جائیں گے۔

اس بار ذکی انور، حسن جمل مسرت اور رعنا اختر کی خوبصورت کہانیوں نے الشجاع کے معنوی حُسن میں اضافہ کیا ہے۔ تحقیقی و تنقیدی سلسلہ کا مضمون۔ جگر مراد آبادی موضوع کے اعتبار سے انفرادی نوعیت کا حامل ہے۔ شعری حصہ میں فراق گورکھپوری آل احمد سرور حرمت الاکرام خورشید جامی، قمر اقبال، نرلیش کمار شاد، حزیں لدھیانوی اور ضیا انصاری کے نام نمایاں ہیں۔

ہمیشہ کی طرح اس شمارے کے مضامین نظم اور نثر کے بارے میں بھی ہم آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے۔

آپ کا مخلص

شجاع الدین ناشر

افضل صدیقی

اب سب دوست ہیں

(صدر ایوب اور صدر جانسن کی ملاقات کا ایک منظر)

انقلاب کا لفظ سنتے ہی خونریزی، ہنگامے، قتل و غارت کا تصور ابھرتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جب کسی ملک میں انقلاب آیا۔ کسی حکومت کا فوج نے تختہ الٹا وہاں خون خرابہ ضرور ہوا۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں۔ سرکردہ لیڈروں کو جیلوں میں ٹھونسا گیا اور سارا نظام حیات تلپٹ ہو کر رہ گیا۔ پاکستان کا فوجی انقلاب اس اعتبار سے بالکل مختلف تھا۔ یہ انقلاب پرامن طور پر برپا ہوا۔ اور اس کے زیر اثر تمام شہریوں کی پوری زندگی میں اور معاشرہ کے ہر شعبہ میں تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔ یہ تبدیلیاں بڑی صحت مندانہ اور تعمیری تھیں جن کی قیام پاکستان کے بعد ہی سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ تعلیم، قانون، زراعت، صنعت، صحت، غرضیکہ کون سا شعبہ تھا جو پسماندگی، زبوں حالی اور بدعنوانیوں کا شکار نہ تھا۔ مگر گزشتہ ۹ سال کے عرصہ میں رفتہ رفتہ سب کچھ بدلتا چلا گیا۔ ہمارے سیاسی راہبروں کی کج روی اور ناعاقبت اندیشی سے ملک میں جو ذہنی اور سیاسی انتشار رونما ہوا اس کے مکمل خاتمہ ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ مگر قوم اب ایسے راستے پر چل پڑی ہے کہ وہ اِن اثرات کو روندتی ہوئی خود بخود سیاسی استحکام، ترقی

اور خوشحالی کی منزل کی طرف بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء کی ستائیسویں تاریخ قومی زندگی کی اتنی ہی اہم تاریخ ہے جتنی مارچ ۱۹۴۰ء کی تیئیسویں تاریخ یا اگست ۱۹۴۷ء کی چودھویں تاریخ۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء کی ستائیسویں تاریخ اس اعتبار سے اہم اور یادگار تاریخ رہے گی کہ اس روز قوم کو ایک سازشی اور عیار آمر سے نجات ملی اور ہماری قومی تاریخ کا ایک دور ختم ہو کر دوسرا دور شروع ہوا۔ محب وطن عناصر نے بروقت اسکندر مرزا کی سازش کو بے نقاب کر دیا اور ملک ایک سنگین خانہ جنگی کا شکار ہونے سے بچ گیا۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے آغاز معرکہ ستمبر یعنی ستمبر ۱۹۶۵ء تک تقریباً سات برسوں میں پاکستان میں تقریباً ۴ سال تک تو مارشل لاء قائم رہا۔ شہری اور آئینی حکومت

ملک بدترین قسم کی سیاسی اور اقتصادی ابتری میں مبتلا رہا اور اس انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت میں ہماری مستقل دشمن برہمنی قیادت نے پاکستان دشمن سرگرمیوں میں انتہائی تیزی سے اضافہ کر دیا۔ سیاسی بازیگروں کی بدولت ملک صرف مغربی طاقتوں کا کاسہ لیس ہو کر رہ گیا۔ جس سے پاکستانیوں کی عزت خاک میں مل گئی۔ ترم مغربی طاقتوں کے شکنجے میں اس طرح پھنستی چلی گئی کہ اس سے چھٹکارا مشکل ہو گیا۔

۱۹۵۸ء میں جب ملکی قیادت میں انقلاب آیا تو ہمارا نازک ترین مسئلہ یہ تھا کہ ہم کس طرح مغربی طاقتوں سے ایسا رشتہ استوار کریں جس سے ہم دنیا کی دو عظیم طاقتوں روس اور چین کو جو نظریاتی اعتبار سے مختلف ہیں اپنے اعتماد میں لیکر ان کو یہ یقین دلائیں کہ ہم مغربی طاقتوں کے حاشیہ بردار

لندن میں صدر ایوب ملکہ الزبتھ کے ہمراہ

نظروں سے اوجھل رہی۔ آخر اہم اصلاحات کے بعد ۱۹۶۲ء میں آئینی حکومت قائم کر دی گئی۔ قومی تاریخ میں یہ سات سال کا عرصہ کئی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ملکی مسائل سے نبٹنے کے لئے جو اقدامات اس دور میں کئے گئے ان سے زیادہ موثر پہلے کبھی نہیں کئے گئے تھے۔ تعصب کی عینک چڑھا کر حالات کا مطالعہ کرنے والے زبان سے نہ سہی مگر دل سے اس امر کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ خواجہ ناظم الدین کی برطرفی سے اسکندر مرزا کے ملک بدر کئے جانے تک شہری

نہیں ہیں۔ اور یہ کہ ہمارے دل میں ان دو عظیم پڑوسیوں کے لئے بھی جذبات خیر سگالی موجود ہیں۔ اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ موجودہ قیادت سے پہلے کبھی کسی مقتدر سیاست داں کو یہ جرأت یہ حوصلہ یہ سیاسی بصیرت حاصل نہ ہو سکی کہ وہ مغربی طاقتوں کی مرضی کے خلاف اور ملکی مفاد کی خاطر خارجہ پالیسی میں نئی راہیں تلاش کرتا اور بلا خطر ان عظیم ہمسایہ ملکوں سے روابط استوار کر کے پاکستان کو عالمی سیاست میں ممتاز مقام دلاتا۔ مغربی طاقتوں خاص طور پر

عوام جو اپنے عقائد کی سربلندی اور اپنے مقصد کی صداقت پر ایمان کامل رکھتے ہیں اللہ کے نام پر فرد مجاہد کی طرح متحد ہو کر ان کے خلاف جنگ آزما ہوں گے۔ نوع انسانی کو اللہ تعالیٰ
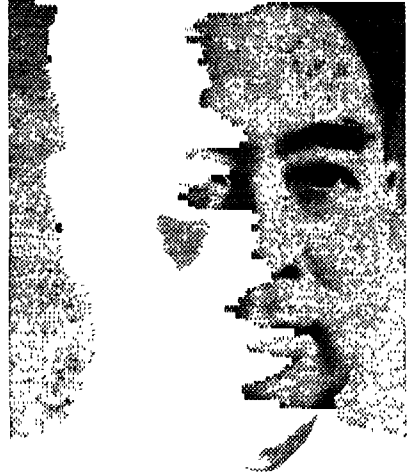
مسٹر چو این لائی۔ وزیر اعظم چین

کی یہ بشارت ہے کہ حق کا ہمیشہ بول بالا ہوگا۔ مردانہ وار آگے بڑھو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہے۔"

اس آواز ہی کا کرشمہ تھا کہ تورخم سے لیکر چاٹگام تک قوم ایک سیسہ پلائی دیوار کی طرح متحد ہو کر دشمن کے سامنے ڈٹ گئی۔ اور اس کی فوجی طاقت کا گھمنڈ خاک میں ملا دیا۔ دشمن کی سترہ سالہ جنگی تیاریاں سترہ دن کے اندر تہس نہس کرکے رکھ دی گئیں۔ یہ سب کچھ اسی ہستی کی بدولت ہوا جسے تائید ایزدی حاصل تھی۔ جو صحیح معنوں میں محب وطن ہے جس کے دل میں قوم کا درد ہے۔ جو قومی تعمیر نو کے ہر مرحلے میں پیش پیش رہا ہے۔ جس نے قیام پاکستان کے فوراً بعد فوج کی تنظیم پر سب سے زیادہ توجہ دی اور اسے چند ہی برسوں میں نہ صرف منظم کر دیا۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کی تربیت یافتہ بہادر اور مضبوط فوج بنا دیا جب پاکستان قائم ہوا تو فوج کی حالت دیگر قومی شعبوں کی طرح بہت خراب تھی۔ ساز و سامان جنگ بہت کم تھا۔ بھارت سے تقسیم کے حصے کا سامان پاکستان کو نہیں مل سکا۔ جو کچھ سامان تھا وہ بہت ناکارہ تھا۔ جس سے کسی حملہ آور کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فوج کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل محمد ایوب خان ایک طویل اور مشکل جدوجہد کے بعد جس میں کئی سال لگ گئے ایک پھرتیلی اور کارگر فوج بنانے میں کامیاب ہو گئے جو ہر خطرہ کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ انہوں نے جو نئے جنگی نظریات وضع کئے اور فوجی افسروں اور جوانوں کو نئے سرے سے جو تعلیم و تربیت دی اسی کی بدولت آج پاکستان کی فوج کو یہ عظمت اور امتیاز حاصل ہے کہ یہ اپنے سے کئی گناہ زیادہ تعداد والے غنیم کے دانت کھٹے کر سکتی ہے۔ ملک میں کئی سیاسی اتار چڑھاؤ آئے۔ پل پل پر حکومتیں بنتی بگڑتی رہیں مگر ان سب کے باوجود فوج نے اپنی وطن دوستی کی اعلیٰ روایات کو برقرار رکھا۔

اور وہ رفتہ رفتہ ملک و قوم کے استحکام کا ایک وسیلہ بن گئی۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے نظام اقتدار سنبھالتے ہی اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ ایسی آزاد خارجہ پالیسی وضع کی جائے کہ دشمن ملک دوست بن جائیں

صدر جمال عبدالناصر

صدر ایوب اور شہنشاہ ایران

امریکہ بہادر کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ پاکستان ایسی خارجہ پالیسی اختیار کرے جو محض اس کے قومی مفادات اور ملکی تقاضوں اور امنگوں کے مطابق اور اُن کی تابع ہو۔ چنانچہ موجودہ قیادت کے انقلابی اقدام سے امریکہ کی تمناؤں کا خون ہوگیا۔ کیونکہ اس اقدام سے پاکستان کی صحیح معنوں میں قومی خارجہ پالیسی وضع ہوئی تھی۔ اور اب امریکہ یا کوئی اور طاقت پاکستان کو اپنے سیاسی مہرہ کے طور پر استعمال نہیں کر سکتی۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہم خارجی معاملات میں مغربی ممالک کے حلقہ اثر سے نکل کر چین اور روس سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے لگے۔ اس پر امریکی سامراجیوں نے ملک کے اندر مختلف ذرائع سے انتشار پیدا کرنے کی سازشیں کیں مگر اُن کی ہر سازش ناکام بنا دی گئی۔

جب انہیں اپنے مشن میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو انہوں نے بھارت کو اکسایا۔ اسے چین کا خوف دلا کر جنگی ساز و سامان سے لیس کر دیا۔ اور اسے اس قدر جنگی جنون میں مبتلا کر دیا کہ وہ ۱۹۶۲ء میں چین سے بری طرح شکست کھانے کے بعد ۱۹۶۵ء میں اپنے سے کم طاقت ملک پاکستان سے نبرد آزما ہوا۔ مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے۔ کس نوع سے ٹکر لی ہے۔ اور اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ساری دنیا نے دیکھ لیا۔ سترہ روزہ جنگ نے پاک افواج اور پاکستانی عوام کے آہنی اتحاد نے دشمن اور حملہ آور بھارت کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اور اس کے پشت پناہ امریکہ کو بھی خوار ہونا پڑا۔ اُس کی آخری چال بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ پاکستان آج کے آگے گھٹنے نہ ٹیک سکا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ کامران، سرخرو اور سربلند ہو کر ابھرا۔ اور یہ صرف "لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" کی نسبت ہی سے ممکن ہو سکا۔ آزمائش کی اس گھڑی میں ایک آواز بلند ہوئی اور قوم کے ہر فرد کے سینے میں اترتی چلی گئی۔

"پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دلوں میں لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے مقدس کلمات لیے ہوئے ہیں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک بھارتی توپیں ہمیشہ کے لئے سرد نہیں ہو جاتیں۔ بھارتی حکمران نہیں جانتے کہ انہوں نے کس قوم کو للکارا ہے۔ پاکستانی

صدر ایوب ترکی کے وزیر اعظم ڈیمرل کے ساتھ

اور دوست ملکوں سے دوستی کے رشتے اور مضبوط ہو گئے۔ اندرونِ ملک اصلاحات کے ساتھ خارجہ تعلقات پر یکساں توجہ دینا آسان کام نہ تھا مگر صدر ایوب نے سیاسی سوجھ بوجھ سے کام لے کر یہ مشکل آسان کر دی۔ وہ اگر چاہتے تو فوج کو ملک میں انتشار پھیلانے والے سیاسی عناصر کے خلاف استعمال کر سکتے تھے مگر انھوں نے اس سے گریز کیا۔ انھوں نے اپنی خودنوشت سیاسی سوانح عمری "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"اس دوران میں یہ ذکر بھی آیا کہ ملک میں مارشل لا کا وہی ضابطہ نافذ کیا جائے جیسے ۱۹۵۳ء میں لاہور مارشل لا کے موقع پر نافذ کیا گیا تھا اور جس کی رو سے ان لوگوں کے خلاف کارروائی کی جا سکتی تھی جو ملک میں نظم و ضبط کی بربادی کے ذمہ دار تھے انقلاب کے موقع پر ہم نے سب سے پہلے اسی قاعدے پر عمل کرنے کی ٹھانی تھی۔ اس سے ہمیں ان سیاست دانوں کے خلاف اقدام کرنے کا اختیار مل جاتا جو ملک کو تباہی کے کنارے پہنچانے کا باعث ہوئے تھے لیکن میں چاہتا تھا کہ لوگ جلد از جلد اپنی اپنی جگہ پر جم جائیں اور ملک کی تعمیرِ نو اور معاشرہ کی بحالی کے کاموں میں مصروف ہو جائیں۔ ان کا بخار جلد سے جلد اتر جائے۔ مارشل لا ایسی آسانی سے جاری ہو گیا جیسے کوئی بجلی کا بٹن دبا دے۔ حالات آپ سے آپ سدھرنے شروع ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے لوگ بنیادی طور پر بڑے باشعور تھے اور ہماری سول ملازمتوں میں بھی اچھے لوگ موجود تھے۔ یہ بھی ایک سبب تھا کہ میں نے مارشل لا کو لوگوں کی پچھلی حرکتوں پر سزا دینے کا ذریعہ نہیں بنایا تھا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو اس کارروائی کی تعمیری نوعیت کے خلاف ہوتا۔"

صدر ایوب نے ایک دوراندیش قائد کی طرح یہ سمجھ لیا تھا کہ ہمارے عوام بنیادی طور پر بڑے باشعور ہیں اور مشکلیں جھیلنا جانتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے سخت گیری کا اختیار نہیں کی۔ اور بڑے بڑے خطاکاروں کو بخش دیا۔ اس طرح ملک بھر میں تعمیری کاموں کی لہر پھر دوڑ گئی ـــ اگر سختی برتی جاتی سزائیں دی جاتیں تو ساری قوم کی توجہ تعمیری کاموں میں حصہ لینے کے بجائے ان سزاؤں سے بچنے پر مرکوز ہو جاتی اور صدر ایوب کا اصل مقصد فوت ہو جاتا۔"

ملک کو اندرونی طور پر استحکام و ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے بعد صدر ایوب نے خارجہ تعلقات پر توجہ دی۔ ایک خاص پالیسی وضع کی۔ بیرونی ملکوں کے دورے کئے۔ اپنی پالیسی کی وضاحت کی اور غیر ملکی سربراہوں پر واضح کر دیا کہ پاکستانی قوم آزاد اور خوددار قوم ہے۔ اسے من مانی شرائط پر نہیں خریدا جا سکتا۔

جو ملک آڑے وقت میں ہمارا ساتھ دے گا وہ ہمارا دوست ہے۔ خواہ وہ کمیونسٹ ہو یا کمیونسٹ دشمن۔ اس کی اپنی پالیسی اور نظریات اس کے ساتھ۔ ہماری پالیسی۔ نظریات اور قومی تقاضے کچھ اور ہیں۔ اور ان تقاضوں کو قومی امنگوں کے مطابق ہی پورا کرنا ہوگا۔

جو ملک یہ سمجھ کر پاکستان کو امداد دیتے ہیں کہ وہ اس کے بدلے میں اس کی خارجہ پالیسی کو اپنی مرضی کا تابع بنا لیں گے وہ غلطی پر ہیں۔ پاکستان آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت سے کسی بیرونی طاقت کا حاشیہ بردار نہیں بن سکتا۔ اس پالیسی سے پاکستان کو اپنے حلقۂ اثر میں لینے والی مغربی طاقتوں خاص طور پر امریکہ کی آنکھیں کھل گئیں۔

صدر ایوب نے چین اور روس کا بھی دورہ کیا۔ کمیونسٹ ملکوں سے بھی تعلقات بڑھائے۔ اور ان کے رہناؤں کو بتایا کہ پاکستان مغربی طاقتوں کا حلقہ بگوش نہیں۔ اسے دوستوں کی ضرورت ہے آقاؤں کی نہیں۔ یہی بات انھوں نے مغربی رہنماؤں پر بھی واضح کر دی تھی جو خود کو پاکستانی قوم کا آقا

اور ان کا نتیجہ بیٹھ گئے۔ اس آزاد خارجہ پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں کے لئے ہر طرف سے امداد ملنے لگی۔ خاص طور پر روس، چین، پولینڈ، چیکوسلاویکیہ، یوگوسلاویہ، مغربی جرمنی اور برطانیہ نے پاکستان سے قرضوں کے کئی معاہدے کئے۔

روس نے تیل کی تلاش کے لئے اپنے ماہر بھیجے جو کئی سال سے اندرون ملک تیل کی تلاش میں مصروف ہیں۔ اور ان کی کوششیں بار آور ہو رہی ہیں۔

چین سے سرحدی سمجھوتہ ہوا۔ معرکہ ستمبر میں امریکہ نے کھلم کھلا بھارت کی حمایت کی۔ مگر چین نے پاکستان کی سب سے زیادہ مدد کی۔ اس کے علاوہ اسلامی ملکوں کی اعانت وحمایت بھی حاصل رہی۔ یہ سب ملک آزمائش کے اس لمحے میں پاکستان کا پوری طرح ساتھ دینے پر کیوں تیار ہو گئے۔ کیا سابقہ حکومتوں کے دور میں ایسا ہو سکتا تھا۔ ان کے دور میں تو ملک ایک ہی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ اور دوسرے ممالک دشمن بنتے چلے جا رہے تھے۔

صدر ایوب کے دور حکومت میں پہلی بار پاکستانی قوم کو آزاد اور خوددار قوم ہونے کا احساس ہوا۔ یہ احساس قومی تعمیر کے ہر شعبے میں دوڑ گیا۔ اور بیرونی دنیا میں بھی ملک کی عزت اور وقار میں اضافہ ہوا۔ اب پاکستان کا مخالف صرف ایک ہی ملک ہے۔ بھارت جو اپنی ہٹ دھرمی کے باعث کسی مسئلہ پر پاکستان سے مصالحت پر آمادہ نہیں۔

بھارت کی قیادت میں ابتدا ہی سے ایک ذہنیت کارفرما رہی ہے۔ خواہ وہ نہرو کا دور ہو۔ شاستری کا یا اندرا گاندھی کا۔ ہر دور میں بھارت کی نام نہاد غیر جانبداری اور سیکولرزم کا بھانڈا پھوٹتا رہا ہے۔ اب وہ وقت دور نہیں جب بھارت کی امداد کرنے والی بڑی طاقتیں ہاتھ کھینچ لیں گی اور بھارت جیسا بہت بڑا ملک دنیا بھر میں یکہ وتنہا رہ جائے گا۔

جو شخص

جو ادیب وشاعر ہے، جیسے شعر، افسانہ، ناول، ڈرامہ یا کسی اور تخلیقی صنف ادب کا ذاتی تجربہ ہے، اس پر تو بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے تنقیدی خیالات کو قابل اعتنا سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن جو شخص خود ادب کی تخلیق نہیں کرتا اور نہ اسے ان تمام مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جن سے ایک تخلیقی فنکار گزرتا ہے وہ کیسے ان مسائل کو سمجھ سکتا ہے اور ان پر کوئی حکم لگا سکتا ہے۔ اس طرح کا سوال اٹھانے والے ایسے ادیب کے وجود کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں جو "نقاد محض" ہے بلکہ بعض لوگ تو ایسے نقادوں کو ادیب ہی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ایک مخلوق جو ادب میں بے جا مداخلت کرتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ادبی تخلیق کا اپنے آپ کو اہل نہ پا کر یا ادب کے میدان میں ناکام ہو کر تنقید کی طرف رخ کرتے ہیں ان کی حیثیت طفیلی کی سی ہے۔ یہ ادیبوں کے بل بوتے پر نام کمانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو کسی کی مدح سرائی کرتے ہیں اور اس کی تخلیقات کو مقبول بنانے کے لئے ایسے مضامین لکھتے ہیں جن سے ان کے ممدوح کا اشتہار ہو۔ یا کسی کی مخالفت کر کے اس پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی تصور کے ماتحت بہت سے ادیبوں نے نقادوں کے نام پر لعنت بھیجی ہے۔ کسی نے انہیں ادبی جونک کہا، کسی نے انہیں ایسی مکھیوں سے تشبیہ دی ہے جو گھوڑوں کے اوپر بیٹھتی، انہیں پریشان کرتی اور کام کرنے سے روکتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک نقاد کا وجود ادب کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

افغانستان کے وسطی علاقہ میں ۷۲۰۰ فیٹ کی بلندی پر غزنی کے قدیم شہر کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں جو دسویں صدی عیسوی میں اسلامی علوم و فنون، تہذیب و تمدن کا اہم ترین مرکز تھا جسے دنیائے اسلام کے مشہور فاتح محمود غزنوی نے علمی اور ... نی خزانن سے مالامال کر دیا تھا۔ اور جہاں دنیائے اسلام کے عظیم ترین مفکرین اور شعراء اکٹھا ہو گئے تھے۔

> **مشہور مورخ الفنسٹن کے قول کے مطابق ـــ**
> **سلطان محمود غزنوی کی حقیقی عظمت ان کی فتوحات کے ساتھ ان کی علم پروری میں مضمر ہے۔**
> **ان دونوں خصوصیات کا اس سے بہتر امتزاج کسی دوسرے حکمران میں مشکل سے ملتا ہے۔**

غزنی جو غزنا کے نام سے بھی مشہور ہے افغانستان کا ایک قدیم شہر تھا جو اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے اور اسے دیکھ کر ایک مستحکم قلعہ اور شاہان غزنی کے چند مقبرے اس کی گزشتہ عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ اس کے شمال مشرقی علاقہ میں عظیم الشان عمارتوں کے کھنڈرات اور ٹیلے اس کی عظمت پارینہ پہ نوحہ خواں ہیں

غزنی اب ایک معمولی قصبہ رہ گیا ہے اور اس کی جگہ اب کابل نے لے لی ہے۔ لیکن اب بھی یہ غلزئی قبیلہ کا مستقر ہے۔ جو ہر سال موسم سرما میں دو ٹوچی اور گومل کے راستے پاکستان کو ہجرت کر جاتے ہیں۔

غزنی کی قدیم تاریخ پر نا واقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ مورخین اور محققین نے اسے بطلیموس کے شہر غزاقہ سے وابستہ کیا ہے۔ مشہور چینی سیاح ہیون شان نے اس شہر کو دیکھا تھا۔ اس نے اپنے سفر نامہ میں [illegible] اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس زمانہ میں غزنا ایک بدھ حکومت کا صدر مقام تھا لیکن غزنا کی حقیقی شہرت اور عظمت شاہان غزنوی کے زمانہ میں ہوئی جنہوں نے اسے علوم و فنون سے مالامال کر دیا۔ اور اس طرح غزنوی خاندان کے نام پر غزنی کا نام پڑا۔

الپتگین نے اس شہر کو لاویک سے فتح کیا تھا لیکن وہ زیادہ عرصہ تک اس پر قابض نہ رہ سکا اور یہ شہر دوبارہ لاویک کے قبضہ میں چلا گیا۔ الپتگین کے ایک غلام سبکتگین نے دوبارہ اس شہر کو فتح کیا اور اسے اپنی ہندوستانی مہمات کا مستقر بنایا۔ ۹۹۸ء میں جب سلطان محمود تخت نشین ہوئے تو غزنی کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگ گئے۔

سلطان محمود کا شمار دنیائے اسلام کے عظیم ترین فاتحین اور حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت میں ایک عظیم فاتح کی شجاعت اور فراست کے ساتھ ساتھ علوم و فنون سے بے پناہ محبت پائی جاتی تھی جس نے دنیائے اسلام میں علوم و فنون کے عظیم ترین سرپرستوں کی صف میں سلطان محمود کو ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔

سلطان محمود کی فتوحات کی داستان بڑی طویل ہے۔ انہیں ورثہ میں ایک چھوٹی سی ریاست ملی تھی لیکن انہوں نے اپنی قوت بازو سے اس کی سرحد پر بحیرہ کیسپین سے ہمالیہ تک پھیلا دیں۔ وہ اپنے زمانے میں دنیائے اسلام کے

کے عظیم ترین حکمران تھے جن کی اسلامی فتوحات اور عظمت کو خلیفۂ بغداد نے بھی تسلیم کیا ہے۔

سلطان محمود نے ہندوستان پر سولہ حملے کئے اور بڑے بڑے نامور راجاؤں اور ہندو سورماؤں کو شکست فاش دی۔ ہندوستان میں ان کا سب سے مشہور حملہ سومنات پر ہوا جہاں ان کا مقابلہ ہندوستانی راجاؤں کی متحدہ افواج سے ہوا جو محمود کی تھکی ماندی فوج سے دس گنا زیادہ تھی۔

سلطان محمود اپنی دھن کا پکا تھا۔ سندھ اور راجپوتانہ کے بے آب و گیاہ ریگستانوں سے گزرتا ہوا وہ سومنات پہنچا۔ جہاں اس کی تھکی ماندی فوج کا مقابلہ ہندوؤں کے ایک لشکر جرار سے ہوا۔ لیکن افواج کی کثرت محمود کو دل شکستہ نہ کر سکی۔ اس نے خدا سے اسلامی افواج کی کامیابی اور نصرت کی دعا کی۔

سلطان کی فوج نے ہندوؤں پر ایک زبردست حملہ کیا۔ میدان جنگ اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا اور مسلمان دور تک غنیم کی صفوں کو چیرتے ہوئے گھس گئے۔ محمود کے چند ہزار فوجی ہندوؤں کے لشکر جرار کے سمندر میں مثل جزیروں کے نظر آتے تھے۔

لڑائی زور و شور سے جاری تھی۔ محمود کی مٹھی بھر فوج اپنے سے دگنی فوج کا بڑی پامردی سے مقابلہ کر رہی تھی لیکن لڑائی کا پانسہ پلٹ نہیں رہا تھا۔ آخرکار سلطان نے اپنے تازہ دم دستے سے ایک آخری حملہ کیا۔ ہندو فوج اس زبردست حملہ کی تاب نہ لا سکی۔ اس کے قدم اکھڑ گئے اور ہزاروں کشتوں کو چھوڑ کر وہ میدان سے فرار ہو گئی۔

سومنات کا مشہور مندر اب سلطان کے رحم و کرم پر تھا۔ اس میں ایک عظیم بت رکھا تھا۔ مندر کے پجاریوں نے سلطان کو اس بت کے عوض بے انتہا دولت دینے کی پیشکش کی لیکن سلطان نے جواب دیا کہ وہ تاریخ میں "بت فروش نہیں بلکہ بت شکن" کے لقب سے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے گرز سے بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اس بت کے جسم کے اندر سے بیش بہا جواہرات کا خزانہ برآمد ہوا۔ سومنات سے سلطان اپنے ساتھ بہت سے نوادرات غزنی لے گیا۔ اس میں صندل کی لکڑی کا ایک عظیم الشان دروازہ تھا جسے سلطان نے اپنے محل میں نصب کیا۔

سلطان کی فتوحات کا سلسلہ ساری زندگی جاری رہا۔ جہاں کہیں بھی وہ جاتا اپنے ساتھ علوم و فنون کے ذخائر لاتا اور غزنی کو ان سے مزین کرتا۔ دنیائے اسلام کے دور دراز مقامات سے مفکرین، شعراء اور علماء کو اپنے دربار میں اس نے مدعو کیا۔ اور اس طرح غزنی دنیائے اسلام کا عظیم ترین علمی اور فنی مرکز بن گیا۔

سلطان محمود نے غزنی کو ایک عظیم الشان دارالخلافہ بنا دیا، جو مشرق کا خوبصورت ترین شہر شمار کیا جانے لگا۔ اس نے غزنی میں ایک عالیشان جامع مسجد تعمیر کی۔ جو "جنت کی دلہن" کے نام سے مشہور تھی اور اس زمانہ کے عجائبات میں شمار کی جاتی تھی۔ سلطان نے اپنے دارالخلافہ غزنی کو محلوں، کتب خانوں، عجائب خانوں، خوبصورت مساجد، عظیم الشان مدرسوں، فواروں، میناروں اور نہروں سے مزین کیا۔ اس نے شہر میں آب رسانی کا ایک بہت اچھا نظام رائج کیا۔

مشہور مورخ الفنسٹن کے قول کے مطابق، "سلطان محمود غزنوی کی حقیقی عظمت ان کی فتوحات کے ساتھ ان کی علم پروری میں مضمر ہے۔ ان دونوں خصوصیات کا اس سے بہتر امتزاج کسی دوسرے حکمران میں مشکل سے ملتا ہے۔"

سلطان محمود نے غزنی میں دنیائے اسلام کے نامور مفکرین، شعرا اور علما کو جمع کر لیا تھا۔ اس کا دربار علوم و فنون کے ستاروں سے جگمگایا کرتا تھا۔ اس کے دربار میں دنیائے اسلام کے عظیم مفکر ابوریحان بیرونی اور فارسی کے عظیم ترین شاعر فردوسی موجود تھے۔ سلطان نے حکیم بوعلی سینا کو بھی مدعو کیا تھا لیکن ابن سینا نے اپنا وطن چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔

سلطان خود بھی بڑا عالم و فاضل انسان اور ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ فرصت کے اوقات وہ مفکروں اور علما کی صحبت میں گزارتا۔ اس کے دربار میں چار سو سے زائد شعرا تھے۔ لین پول کے قول کے مطابق "یہ نہ تھکنے والا مہم جو سلطان محمود ہندوستان کے علاقہ میں سیکڑوں میل تک طوفانی حملہ کرنے اور بغداد کے قریب ہمدان کے علاقہ میں مثل باز کے ٹوٹ پڑنے کے بعد فرصت کے اوقات شعرا کے کلام اور بزرگوں کے اقوال سننے پر صرف کرتا تھا۔ بقول الفنسٹن "وہ ایشیا میں علماء اور مفکروں کا سب سے بڑا سرپرست تھا۔ اور انہیں انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا کرتا تھا۔"

ایران کے قومی ادب پر سلطان محمود کا بڑا احسان ہے۔ اس نے اسے بڑا فروغ دیا۔ پروفیسر حبیب کے قول کے مطابق "ایران کی نشاۃ ثانیہ کے سرپرستوں میں سلطان محمود کو بلند ترین مقام حاصل ہے۔"

غزنی میں سلطان محمود کے دربار میں جو علما۔ اور فقہا، شعراء اور مفکرین جمع ہو گئے تھے ان میں دنیائے اسلام کے عظیم ہمہ داں مفکر ابوریحان بیرونی زمانہ وسطیٰ کے مشہور فلسفی اور موسیقی داں ابونصر فارابی، ماہر زبان فلسفی عنصری، مزاحیہ شاعر منوچہری، مشہور شاعر اسجدی اور فارسی ادب کا عظیم ترین رزمیہ شاعر فردوسی قابل ذکر ہیں۔

ابوریحان بیرونی ایک ہمہ داں مفکر تھا جس نے سائنس، تاریخ، طبیعات، مابعدالطبیعات، طب اور ہیئت میں لافانی تصانیف چھوڑی ہیں۔ دنیائے اسلام کا عظیم ترین مفکر بوعلی سینا بھی جو اس کا ہم عصر تھا اس سے مقابلہ کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ مشہور مورخ سر جادو ناتھ سرکار کے قول کے مطابق "بہت کم ایسے مفکر گزرے ہیں جو علوم طبعیات اور مابعدالطبیعات پر یکساں مہارت رکھتے ہوں۔ اور ایشیا میں ایسے مفکروں میں عظیم ترین مفکر بیرونی تھا جو فلسفی کے ساتھ ساتھ سائنس داں بھی تھا۔ اور دونوں متضاد علوم میں انتہائی مہارت رکھتا تھا۔"

ابوریحان بیرونی اپنے سرپرست سلطان محمود کے ہمراہ اس کی مہمات پر جایا کرتا تھا۔ ہندوستان میں اس نے بیس[۲۰] سال گزارے سنسکرت زبان سیکھی اور وہاں کے علوم و فنون میں مہارت حاصل کرکے اپنی لافانی تصنیف "تحقیق ہند" لکھی جو قدیم ہند کی تاریخ اور اس کے علوم و فنون پر بہترین تصنیف ہے جس کا مقابلہ ابوالفضل کی آئین اکبری بھی نہیں کر سکی۔ جو بیرونی کی کتاب کے پانچ سو سال بعد لکھی گئی۔ ایک مورخ کے قول کے مطابق "بیرونی کے ہاتھ سے قلم کبھی جدا نہیں ہوا۔ اور اس کی نگاہ کتاب سے کبھی نہیں ہٹی۔"

بیرونی نے اپنی دوسری بیش بہا تصنیف "قانون المسعودی" جو علم ہیئت کی انسائیکلوپیڈیا ہے سنہ ۱۰۳۰ء میں لکھی اور اسے اپنے سرپرست سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود کے نام معنون کی۔ سلطان مسعود نے حکم دیا کہ ہاتھی کے وزن کے برابر چاندی بیرونی کو بطور انعام دی جائے۔ لیکن اس نے اسے واپس کر دیا۔ اس سے بیرونی کی عالی ظرفی کا پتہ چلتا ہے۔

بیرونی ایک بلند پایہ منجم تھا۔ علم ہیئت میں اس کی مہارت کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں اور تاریخوں میں درج ہے۔ سلطان محمود ایک سچا مسلمان فرماں روا تھا۔ اور نجومیوں کو جھوٹا تصور کرتا تھا۔ ایک بار اس نے بیرونی کا امتحان لینا چاہا۔ وہ ایک ایسے مکان میں بیٹھا ہوا تھا جس میں چار دروازے تھے۔ اس نے بیرونی کو بلا بھیجا۔ بیرونی فوراً حاضر خدمت ہوا۔ محمود نے کہا۔ "اچھا تم اپنے علم سے مجھے بتاؤ کہ میں کس دروازے سے باہر جاؤں گا؟" بیرونی نے جواب دیا کہ میں اپنا جواب ایک پرچے پر لکھ دیتا ہوں۔ آپ اسے صندوق میں مقفل کر دیں۔ اور جب مکان سے باہر نکل جائیں تو اسے کھول کر دیکھیں۔ سلطان نے اسے منظور کر لیا۔ بیرونی کا پرچہ ایک بکس میں مقفل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان نے حکم دیا کہ ایک نیا دروازہ دیوار توڑ کر بنایا جائے۔ تھوڑی دیر میں دروازہ تیار ہو گیا۔ سلطان اسی دروازہ سے باہر گیا۔ بعد ازاں بکس سے اس نے بیرونی کا پرچہ نکال کر دیکھا۔ اس میں لکھا تھا:-

"سلطان چار دروازوں میں سے کسی سے بھی باہر نہیں جائے گا۔ وہ ایک نیا دروازہ نکلوائے گا اور اس سے باہر جائے گا۔" سلطان بیرونی کی ہیئت دانی پر انگشت بدنداں ہو گیا۔

علم طبیعات میں بیرونی نے ۱۸ پتھروں کے صحیح اوزان دریافت کیے اور یہ دریافت کیا کہ روشنی آواز سے بہت زیادہ تیز رفتار ہے۔ اس کی شہرہ آفاق تصنیف "اسرار الباقیہ" میں قدیم قوموں کی تاریخ، حالات اور ان کے ممالک کا جغرافیہ تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ اس میں اس نے پہلے سے اس نظریہ کی وضاحت کی ہے کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہے۔ اس نے مختلف مقامات کے صحیح عرض البلاد اور طول البلاد دیے ہیں۔ اور قدرتی چشموں کے حقیقی اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ بیرونی کی ہمہ دانی اور تبحر کی بنا پر اس کے ہم عصر اسے "جادوگر" کے لقب سے خطاب کیا کرتے تھے۔

سلطان محمود کے دربار کی دوسری عظیم ترین شخصیت فردوسی تھا جو ایران کا عظیم ترین رزمیہ شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس کا شاہنامہ دنیا کی عظیم ترین رزمیہ نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

سلطان نے شاہنامہ لکھنے پر فردوسی کو مامور کیا اور اپنے محل کا ایک حصہ فردوسی کے لئے مخصوص کر دیا۔ یہ حصہ ہر قسم کے آلات حرب اور

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

ضیاء الحسن فاروقی معلوماتی جائزہ

عرب اور اسرائیل

اسرائیلی پارلیمنٹ کی عمارت

پر جلی حروف میں لکھا ہے:۔

"ہمارے ملک کی سرحدیں دریائے

فرات سے دریائے نیل تک پھیلی ہوئی ہیں"۔

یہ گویا مقصد ہے

جسے یہودی حاصل کرنا چاہتے ہیں

——— ظاہر ہے کہ ———

پھر کس طرح ———

دنیا کے اس حصہ میں امن قائم

رہ سکتا ہے۔ اور کیسے عرب قوم

اسرائیل کے وجود

——— کو ———

برداشت کرسکتی ہے؟

تاریخ نے فلسطین کے علاقے اور اس سرزمین کو جو فرات اور نیل کے درمیان واقع ہے ایک ممتاز حیثیت دی ہے۔ زمین کا یہ ٹکڑا تہذیب و تمدن، مذہب و روحانیت جغرافیہ اور سیاست، غرض ہر پہلو سے ہمیشہ سے اہم رہا ہے۔ چشم فلک نے یہاں ہزاروں برس تک فوجوں کی یلغار، تجارتی قافلوں اور تہذیبی کاروانوں کی آمد و رفت قوموں کی ذلت و نکبت، اور تمدنوں کی شکست و ریخت کے جو مناظر دیکھے ہیں وہ کسی اور علاقہ میں اس نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ اس لئے ۵ جون سے ۸ جون تک ابھی جو جنگ ہوئی ہے اور اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کو جس طرح پسپا ہونا پڑا ہے وہ ہمارے لئے تو بہت ہی عجیب و غریب اور حیرت میں ڈال دینے والا واقعہ ہو سکتا ہے۔ مگر گردش دوراں کے لئے اس میں کوئی خاص عجوبہ نہیں۔

اسرائیل کی ریاست جن حالات میں قائم ہوئی ان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کے قیام کو "بین الاقوامی رہزنی" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ آج جہاں اسرائیل ہے وہاں عربوں کی بھاری اکثریت تھی لیکن آج اسرائیل میں عربوں کی تعداد بہت کم ہے۔

> یورپ کے جو یہودی یورپی ملکوں کے شہری تھے اور صدیوں سے ان ملکوں کے شہری چلے آرہے تھے۔ آخر انہیں یورپ کیوں نہ برداشت کرسکا۔ انہیں آخر کیوں عربوں کے سر پر مسلط کیا گیا؟
>
> انصاف، جمہوریت اور بین الاقوامی اخلاق کے کس زاویے سے یہ جائز اور صحیح ہے۔

گذشتہ بیس سال میں یہ انقلاب کیسے ہوگیا۔ یہ واقعہ بذات خود اس کا شاہد ہے کہ اسرائیل کا وجود ظلم و جبر اور خون ریزی اور چیرہ دستی کے سہارے عمل میں آیا ہے۔ آج بھی لاکھوں فلسطینی عرب دوسروں کے دیئے ہوئے آذوقہ پر زندہ ہیں اور صحرا میں پڑے ہوئے ہیں۔ قدیم زمانے میں کسی وجہ سے بھی قوموں اور نوع انسانی کے مختلف گروہوں کی جو ہجرت اور منتقلی ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوئی اور مشرق کے رہنے والے مغرب اور شمال کے رہنے والے جنوب میں جو جا کر بس گئے تو آج کیا یہ صحیح مناسب اور ممکن ہوگا کہ ساری ایسی قومیں اپنے قدیم اصلی وطن کی طرف مراجعت اور نئی ریاستوں کا مطالبہ کریں۔ ظاہر ہے ایسا نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیئے۔ جس طرح خلا میں دو سیاروں کے ٹکرانے سے کم از کم قیامت صغرا برپا ہو سکتی ہے اسی طرح تاریخ کے ارتقائی عمل کا رخ پیچھے کی طرف پھیرنے کی کوشش کرنے سے کرۂ ارض

پر قیامت آسکتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کوئی شخص جس کا ذہنی توازن درست ہے۔ آج اس قیامت کے لئے تیار نہیں ہے۔

عہد وسطیٰ میں بظاہر مذہب کے نام پر صلیبی جنگیں لڑی گئیں اور یروشلم پر مستقل قبضہ کرنے کے لئے پورے یوروپ کی مادی طاقت اور کیتھولک کلیسا کی مذہبی قوت کام میں لائی گئی۔ لیکن آخر میں یوروپ کو ناکامی ہوئی۔ میں نے "بظاہر" اس لئے کہا کہ یوروپ نے حقیقتاً یہ جنگیں بحیرۂ روم اور شرق اوسط پر جہاں سے اس وقت کے مشرق کو جانے والے تمام راستے گزرتے تھے۔ اپنے سیاسی اور فوجی اقتدار کے لئے لڑی تھیں۔ اس وقت یہ لڑائیاں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی تھیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس زمانے میں عیسائی کلیسا اور حکومتیں یہودیوں پر عرصۂ حیات تنگ کئے ہوئے تھیں اور مسلمانوں کی حکومتوں میں یہودی نہ صرف یہ کہ اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے بلکہ زندگی کے بعض شعبوں میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ صلیبی جنگوں میں عیسائی دنیا کو جو ہار ہوئی تھی، اسے اس نے کبھی فراموش نہیں کیا اور غالباً یہ داغ اس کے سینہ پر تازہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں پہلی جنگ عظیم کے دوران جب ترکوں کو مشرق وسطیٰ کے محاذ پر شکست ہوئی۔ اور برطانوی فوجوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا تو لارڈ ایلنبی نے جو ان فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔ یروشلم پہنچ کر یہ کہا کہ صلیبی جنگیں آج ختم ہوئی ہیں۔ اگر ہم مذہبی تعصب کی بنا پر اس واقعہ کو صلیبی جنگوں کے سلسلہ کی ایک کڑی مان بھی لیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں فلسطین اور یروشلم پر برطانوی قبضہ صلیبی جنگوں کا خاتمہ نہیں بلکہ تجدید تھی کیونکہ اس کے بعد برطانوی سامراج نے صیہونیت کی تحریک کی جس طرح سرپرستی کی اور مغربی ایشیا میں اپنے سیاسی اور معاشی اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے جس طور پر یہودیوں کی ریاست قائم کرنے میں مدد دی، وہ سب باتیں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہو گئی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انگریز قوم بہت دور اندیش اور محتاط ہے۔ وہ سیاست کے جھگڑوں [illegible] راستہ سونگھ سونگھ کے [illegible] حضرات

سے وہ بخوبی واقف تھی۔ بیسویں صدی کی بدلتے ہوئے حریت وقومیت کے رخ کو سمجھتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکی تھی کہ انیسویں صدی میں سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کی جو نوعیت تھی وہ ختم ہوگی۔ عرب قوم صرف مسلمان عربوں ہی پر نہیں بلکہ عیسائی عربوں پر بھی مشتمل ہوگی۔ اس لئے شرق اوسط کے قلب میں ایسا کانٹا بونا چاہئے جس سے مسلمان اور عیسائی عربوں دونوں کے دامن تار تار ہوں چنانچہ اس قوم نے کمال ہوشیاری سے اس کا انتظام کیا اور اپنے قومی مفاد کے پیش نظر امریکہ اور سوویٹ یونین دونوں اس کے دام تزویر میں پھنس گئے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مغربی ایشیا میں اسرائیل ایک طرح سے برطانیہ اور امریکہ بلکہ یوں کہئے کہ بہت بڑی حد تک نیٹو طاقتوں کی فوجی چھاؤنی ہے۔ اور صیہونیت کے پردہ میں "صلیبی جنگوں" کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں یہودی قوم پر بڑے ظلم وجبر ہوئے ہیں۔ وہ خانماں برباد اور مصائب وآلام کا شکار رہے ہیں، لیکن یوروپ کے جو یہودی یوروپی ملکوں کے شہری تھے اور صدیوں سے ان ملکوں کے شہری چلے آرہے تھے انھیں یوروپ کیوں نہ برداشت کر سکا۔ انھیں آخر کیوں عربوں کے سر پر مسلط کیا گیا؟ انصاف، جمہوریت اور بین الاقوامی اخلاق کے کس زاویے سے یہ جائز اور صحیح ہے۔؟

عرب بھی بے قصور نہیں ہیں۔ فلسطینی عربوں نے دنیوی حرص وطمع میں مبتلا ہو کر یوروپ سے آنے والے یہودیوں کے ہاتھوں اپنے مکانات اور زمینیں بیچیں۔ وہ عرب جو اس کے نتائج سے آگاہ تھے انھوں نے خوشامدیں کیں اور اپنے ہم وطنوں کو روکنا چاہا۔ مگر برائے نام کامیابی ہوئی۔ پھر اس وقت کی کمزور اور خود غرض عرب حکومتوں کا باہمی نفاق واختلاف ان کے لئے سم قاتل ثابت ہوا۔ اور وہ اسرائیل کا قیام نہ روک سکے۔ یہ نفاق اور اختلاف ابھی ختم نہیں ہوا ہے اور نتیجہ کے طور پر اسرائیل اپنے علاقہ کو بتدریج بڑھاتا جا رہا ہے۔ یہ فرق ہے کہ [illegible] کی طرح آج بھی اسرائیل کی توسیع پسندی اور طاقت کے [illegible]

بھی نا تقیا اعد سدے لیکن یہودی قوم محنتی اور ذہین ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم اور فنی مہارت جیسی ان میں ہے غالباً دنیا کی بہت کم قوموں میں ہو گی۔ اسرائیل کا ہر فرد چوبیس گھنٹہ میں چودہ سے اٹھارہ گھنٹے تک کام کرتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے یہودی اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی اخبارات، نیوز ایجنسیوں تجارت اور صنعت پر چھائے ہوتے ہیں اور وہ دامے، درمے، قدمے، سخنے اسرائیل کی پوری مدد کرتے ہیں اور اپنی حکومتوں کی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے دانشکدوں میں یہودی عالموں کا سکہ چلتا ہے۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں یہودی قوم کے ذہن کی تیزی اور محنت اور سخت کوشش کو دخل نہ ہو۔ اس کے برخلاف عربوں کا معاملہ تقریباً بالکل الٹا ہے اور واقعہ کا یہ پہلو اتنا بھیانک ہے کہ اس سے متعلق کچھ نہ کہنا بھی بہت کچھ کہنا ہے۔ قانون فطرت بالکل اٹل ہے۔ اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس موقع پر میں مسلمانوں کے اس طبقہ سے جو یہ کہتا ہے کہ اگر صدر ناصر اسلام کے نام پر عربوں کی تنظیم کرتے تو یہ ذلت و خواری نہ ہوتی، یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو عرب ممالک اسلام کا نام لیتے ہیں، خود ان کی اخلاقی حالت کیا ہے۔ ان کی خوشحالی ان کے لئے عذاب بن گئی ہے۔ یہودی قوم میں جو صفات ہیں ان کا عشر عشیر بھی ان کے یہاں نہیں ملتا۔ یہ باتیں تلخ ضرور ہیں لیکن سچی ہیں۔ یہاں یہ مسئلہ نہیں کہ اپنی فطرت کے لحاظ سے یہ انسان "نوری" یا "ناری" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فطرت عمل دیکھتی ہے اور عمل سے دنیا بھی بنتی ہے اور آخرت بھی سمجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ اخلاقی، روحانی اور دنیوی، غرض مادی اور غیر مادی، ہر لحاظ سے مسلمانوں سے زیادہ بے عمل، خواہ وہ عرب ہوں یا اہل عجم، کوئی انسانی گروہ آج صفحۂ ہستی پر نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مکافات عمل کا فطری دھارا محض اس وجہ سے مڑ نہیں سکتا کہ آپ اسلام کے نام پر اپنی تنظیم کرتے ہیں یا کسی اور نام سے۔ کارخانۂ قدرت میں نام کوئی چیز نہیں، سب کچھ "کام" ہے۔ یہاں "کام" کا لفظ "عمل" کے معنی میں پڑھنا چاہئے۔

(الشہاب)

عربوں نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اور غالباً وہ کسی منزل میں اس کے وجود کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اس سلسلہ میں صدر ناصر کا وہ بیان قابل ذکر ہے جو اخباروں میں چھپا ہے۔ صدر ناصر نے اعلان کیا ہے کہ مصر پسپا ہو کر سوڈان میں چلا جانا پسند کرے گا لیکن اسرائیل کو تسلیم نہیں کرے گا۔ اسرائیل کے قیام سے لے کر اب تک جو کچھ اس علاقہ میں ہوا ہے اگر اس کا سلسلہ وار مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی بنیاد ہی میں جارحیت اور توسیع پسندی ہے۔

ع مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

کہا جاتا ہے کہ اسرائیلی پارلیمنٹ کی عمارت پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ "ہمارے ملک کی سرحدیں دریائے فرات سے دریائے نیل تک پھیلی ہوئی ہیں۔" یہ گویا مقصد ہے جسے یہودی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پھر کس طرح دنیا کے اس حصہ میں امن قائم رہ سکتا ہے اور کیسے عرب قوم اسرائیل کے وجود کو برداشت کر سکتی ہے؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اسرائیل دریائے اردن کے پانی سے نجیف کے صحرا کو سیراب کرنا چاہتا ہے۔ بظاہر اس میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ اگر اسرائیل شام کی سرحد کے قریب واقع طبریہ جھیل سے جس میں اردن اپنے معاون دریاؤں کا پانی لے کر گرتا ہے اور پھر اس سے نکل کر شرق اردن کے علاقوں کو سیراب کرتا ہوا بحیرۂ مردار میں اپنی ہستی کھو دیتا ہے۔ پانی لے کر کسی اونچی جگہ پر اس کا ذخیرہ کر لے اور پھر اسے پائپ لائن کے ذریعہ صحرائے نجیف میں پہنچائے تو شرق اردن کا سب سے زرخیز علاقہ بنجر ہو کر رہ جائے گا اور لاکھوں عرب تباہ و برباد ہو جائیں گے اور اُدھر نجیف کا صحرا تقریباً بیس لاکھ یہودیوں کی آبادکاری کے قابل بن جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہودیوں کی آبادی عربوں کی بربادی پر منحصر ہے۔

اسرائیل کا یہ منصوبہ بالکل تیار ہے اور اس پر کافی کام بھی

ہو چکا ہے۔ طبریہ جھیل سے اس نے پائپ لائن نکالی ہے اور ایک ریزروائر (RESERVOIR) بھی بنالیا ہے۔ جس میں بیس کروڑ مکعب پانی جمع ہوسکتا ہے اور اب صرف اتنا کام باقی ہے کہ اس میں طبریہ کا پانی پہنچادیا جائے کیونکہ شامی سرحد پر (حالیہ جنگ میں یہ سرحد ختم ہوگئی ہے۔ اسرائیل نے اس کی پہاڑیوں پر قبضہ کرلیا ہے اور اس کے آگے بڑھ گیا ہے) جو طبریہ کے شمال اور مشرق میں ہے۔ شامی توپ خانہ اس منصوبے کا دشمن ہے۔ اور جب بھی اسرائیل نے پمپنگ کی مشینوں کو نصب کرنے کا ارادہ کیا، شام کی توپوں نے اسے ناممکن العمل بنادیا۔ یہی وجہ ہے کہ امسال مئی کے وسط میں اس نے شام پر حملہ کرنے کی اسکیم بنائی تھی تاکہ طبریہ کو شامی توپ خانہ کی زد سے محفوظ رکھا جائے۔

دوسری طرف خود عربوں نے اسرائیلی منصوبے کے جواب میں اپنا منصوبہ تیار کرلیا ہے۔ وہ بالائی اردن۔ طبریہ اور اردن کی معاون دریاؤں پر بند بنا رہے ہیں تاکہ ان کا پانی اپنے کام میں لاسکیں۔ نتیجہ میں جس کے بعد طبریہ کا پانی تازہ پانی نہ ملنے سے کھاری اور نمکین ہوجائے گا اور زراعت اور آبپاشی کے لائق نہ رہے گا۔ یہ صورت حال بھی اسرائیل کو حملوں پر اکساتی رہتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اردن عرب دریا ہے اور اسرائیل کا خود غرضانہ منصوبہ عربوں ہی کو اس کی برکتوں سے محروم کردینا چاہتا ہے۔ ظلم اور جارحیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوسکتی ہے؟

تیسرا مسئلہ خلیج عقبہ کا ہے۔ یہ خلیج "اندرون ملک سمندر" کی تعریف میں آتی ہے۔ اس کے ایک طرف سعودی عرب اور اردن کا علاقہ ہے اور دوسری طرف متحدہ عرب جمہوریہ ہے بالکل شمالی سرے پر ایلات کی بندرگاہ ہے جسے اسرائیل نے ۱۹۴۹ء میں عارضی جنگ بندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے "ام الرشراش" کی چوٹی پر قبضہ کرکے تعمیر کیا تھا۔ خلیج عقبہ کی لمبائی ۹۸ میل ہے۔ زیادہ سے زیادہ چوڑائی کے مقام پر بھی یہ خلیج بارہ میل سے کم ہی چوڑی ہے۔ اس خلیج کا ایک ہی دروازہ ہے جو بحیرۂ احمر کی طرف کھلتا ہے۔ یہ بھی نو میل سے زیادہ چوڑا نہیں ہے۔ خلیج کے دروازے کے قریب الشیخ

یہ دو جزیرے ہیں جو پانی میں چھوٹے ہیں۔ یہ سعودی عرب کے حق واختیار میں ہیں۔ اس اعتبار سے تو یہ آبی گذرگاہ چار میل سے بھی زیادہ چوڑی نہیں ہے۔ جزیروں میں سے ایک کا نام تیران ہے اور چونکہ اس جزیرے کی چٹانوں نے اس خلیج کا راستہ روک رکھا ہے۔ اس لئے خلیج میں داخل ہونے والے جہازوں کو متحدہ عرب جمہوریہ کے ساحل سے صرف ایک میل کے فاصلے سے ہوکر گزرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں متحدہ عرب جمہوریہ کسی طرح نہ تو دشمن ملک کے جہازوں کو اور نہ ایسے دوسرے جہازوں کو جو دشمن ملک کو فوجی اہمیت کا سامان پہنچائیں۔ اس راستے سے گزرنے کی اجازت دے سکتی ہے۔ بین الاقوامی قانون یہی ہے اور ساری قومیں اسے تسلیم کرتی ہیں۔ ویسے تو اسرائیل کے دوست ملک اسے فوجی امداد بحیرۂ روم کے ذریعہ پہنچاتے رہے ہیں اور اب بھی پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن خلیج عقبہ پر اسرائیل کی نظر دو وجہوں سے ہے۔ ایک تو یہ کہ ایشیا اور افریقہ سے اس کی بحری تجارت کا یہی راستہ ہے اور دوسرے یہ کہ خلیج عقبہ پر اسرائیلی قبضہ کے بغیر نہر سویز کے مقابل ایک دوسری نہر بنانے کا منصوبہ پورا نہیں ہوسکتا۔ ۱۹۵۶ء میں جب برطانیہ، فرانس اور اسرائیل تینوں نے مل کر متحدہ عرب جمہوریہ پر حملہ کیا تھا اور پورٹ سعید کو خطرہ پیدا ہوگیا تھا تو اس کو بچانے کے لئے مصری فوجوں نے سینائی کا علاقہ خالی کردیا تھا اور اسرائیل نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خلیج تیران کے مقابل "شرم الشیخ" کے علاقہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ مئی ۱۹۶۷ء میں اس علاقہ سے اقوام متحدہ کی فوجیں متحدہ عرب جمہوریہ کی فرمائش پر ہٹالی گئیں کہ وہ اس کی مرضی اور اجازت سے وہاں تھیں۔ اور صدر ناصر نے مصر پر سہ طاقتی حملہ سے قبل کی صورت حال سینائی کے اس حصہ میں بحال کردی۔ اور بین الاقوامی قانون کے مطابق اپنے حق اور اختیار کو استعمال کرتے ہوئے خلیج عقبہ میں اسرائیلی جہازوں کی آمد ورفت پر پابندی لگادی۔ متحدہ عرب جمہوریہ کے اس اقدام کو کسی طرح جارحانہ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن دوسری طرف خلیج عقبہ پر متحدہ عرب جمہوریہ کے قبضہ کے معنی یہ ہیں کہ اسرائیل کا یہ منصوبہ کہ نہر سویز کے مقابلہ میں ایک دوسری نہر بنائی جائے جو بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر کو

[illegible] بن جائے جو اسرائیل کے قبضہ میں ہو کبھی [illegible] نہیں ہو سکتا۔

پروفیسر آرنلڈ ٹوائن بی نے جو انگلستان کے شہری ہیں، اپنی سمجھ کے مطابق عرب اور اسرائیلی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے اور اگرچہ وہ اس کے حق میں معلوم ہوتے ہیں کہ چونکہ اسرائیل اب ایک حقیقت بن چکا ہے اس لئے عربوں کو چاہئے کہ اس کے وجود کو تسلیم کرلیں۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عربوں کے نقطۂ نظر سے اگر مسئلہ پر نظر ڈالی جائے تو عربوں کے ساتھ ہمدردی کے جذبہ کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہیں ہو سکتا۔ ان کے تجزیہ کا خلاصہ درج ذیل ہے :-

اسرائیلی نظریہ یہ ہے

۱۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں سے ایک قبیلہ یہودہ تھا۔ ہم اسی قبیلہ کے زندہ نمائندے ہیں۔ تیرھویں صدی قبل مسیح میں اس قبیلہ نے فلسطین کے خاصے بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ ہم اس علاقہ پر کوئی سات سو برس تک قابض رہے یہاں تک کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں ایرانی حکمران بخت نصر نے ہم کو نکال دیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد ہم پھر وہاں پہنچے اور آباد رہے تا آنکہ دوسری صدی عیسوی کے شروع میں رومیوں نے پھر ہم کو نکال دیا۔

۲۔ سرزمین اسرائیل پر ہمارا جو حق ہے اس سے ہم کبھی دستبردار نہیں ہوئے۔ اور اس حق کا ہم نے بار بار اعلان کیا ہے۔

۳۔ کوئی اٹھارہ سو برس سے زیادہ کی مدت کے بعد ۱۸۸۲ء میں ہمیں اس علاقہ میں قدم جمانے کا موقع ملا (۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے بالفور اعلان جاری کیا۔ اور اس کے بعد فلسطین میں جو برطانیہ کے انتداب میں آگیا تھا۔ یورپ کے یہودیوں نے آباد ہونا شروع کیا) اس وقت سے لے کر اب تک ہم نے محنت جفاکشی اور فوجی طاقت سے کام لے کر اسرائیل کی نئی ریاست کو قائم کیا ہے اور اس کی حفاظت کی ہے۔

۴۔ ہم نے صدیوں ظلم سہے ہیں۔ جب سے رومی حکومت نے عیسائی مذہب اختیار کیا مغرب کی عیسائی اکثریت نے جس کے درمیان ہم رہتے تھے۔ ہم پر مسلسل ظلم کیا اور ہمیں ستایا ہے۔ اس لئے دوسری قوموں کی طرح ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا بھی ذاتی وطن ہو۔

۵۔ عیسائی دنیا میں ہم پر ظلم وستم کی اس وقت انتہا ہوگئی جب جرمنی میں ہماری نسل کشی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہم پر بہت ظلم ہوئے لیکن تاریخ میں اتنا بڑا ظلم اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ اب جبکہ ہم کو موقع ملا ہے ہم عربوں کو اس کا موقع نہیں دیں گے کہ وہ ہمارے آباو اجداد کی سرزمین میں ہم کو ختم کر دیں۔

عرب نقطۂ نظر یہ ہے

۱۔ ساتویں صدی عیسوی سے جب ہم نے فلسطین کو رومیوں سے لیا۔ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہماری کتنی ہی نسلیں یہاں پروان چڑھیں اور ختم ہوگئیں۔ ہم یہاں گزشتہ تیرہ سو برس سے آباد ہیں۔ اس لئے مسلسل آباد رہنے سے قدامت کی بنیاد پر جو دائمی حق قائم ہوتا ہے اس سے ہم کبھی دستبردار نہیں ہوں گے، ۱۹۱۸ء میں ایک جنگجو اور حملہ آور غیر ملکی جماعت کو ہم پر مسلط کیا گیا اور یہ ناجائز تسلط ابھی باقی ہے۔

۲۔ یہ ظالمانہ کارروائی ہمارے مسلسل احتجاج کے باوجود برطانوی سنگینوں کے حفاظتی سائے میں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت برطانیہ کی فوجی طاقت کا مقابلہ ہم نہیں کر سکتے تھے۔ پھر انگریزی استعمار چپکے سے اس علاقہ سے کھسک گیا اور ہمیں ہماری قسمت پر چھوڑ گیا۔ ہماری دردناک کہانی یہ ہے کہ کوئی دس لاکھ فلسطینی عرب پناہ گزینوں کی زندگی گزار رہے ہیں۔

۳۔ تھوڑے سے فلسطینی عرب جو اسرائیل میں ہیں ان کے ساتھ اسرائیلی حکومت کا سلوک دوسرے درجہ کے واجب التعزیر شہریوں جیسا ہے۔

۴۔ جبکہ عرب علاقہ پر اسرائیلیوں نے زبردستی قبضہ کیا ہے وہ بحیرہ روم سے خلیج عقبہ کے شمالی سرے پر واقع مقام ایلات تک پھیلا ہوا ہے۔ غیر ملکیوں کے تصرف میں آیا ہوا یہ علاقہ عرب دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

۵۔ جب ہم نے رومیوں سے فلسطین جیتا تو ہم نے پانچ سو برس بعد یہودیوں کو یہودیہ میں رہنے بسنے کی اجازت دی ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا۔

۶۔ جب ہم نے اسپین فتح کیا تو وہاں کے یہودیوں کو گوتھ قوم کے نازیوں جیسے لرزہ خیز مظالم سے نجات دلائی۔

۷۔ ہمارے پیغمبرؐ نے قانون کا احترام کرنے والے عیسائیوں اور یہودیوں سے اچھے سلوک اور ان کی حفاظت کا حکم دیا تھا۔ ہم نے اس پر ہمیشہ عمل کیا۔ لیکن اب عیسائی دنیا نے یہودیوں پر جو ظلم کیا اس کا خمیازہ ہمیں بھگتنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ گویا ظالم مغرب کا فیصلہ یہ ہے کہ یہودیوں پر مسلسل ظلم کرتے رہنے سے مغرب کے ضمیر پر جو بوجھ ہے اس کا کفارہ اہل مغرب نہیں بلکہ ہم ادا کریں۔

۸۔ ہم مغرب کے اس سامراجی ظلم کو برداشت نہیں کرینگے یہ ناانصافی ہے۔ اس کے آگے ہم سر نہیں جھکائیں گے اسرائیل مغربی استعمار کا آلہ کار رہے۔ اس واقعہ سے بہت پہلے فلسطین میں ہم مغرب کی جارحیت کا شکار رہ چکے ہیں۔ اس وقت حملہ آور صلیبی مہم جو تھے۔ ہم نے صلیبی حملہ آوروں کو بالآخر نکال دیا۔ اگرچہ اس میں ہمیں کوئی دو سو برس کا عرصہ لگا۔ ہم اسرائیلیوں کو بھی نکال کر رہیں گے چاہے ہمیں اس میں کتنا ہی عرصہ کیوں نہ لگ جائے۔

کوئی انصاف پسند پروفیسر موصوف کے اس تجزیے کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ اسرائیلیوں کو حق بجانب قرار دے۔ لیکن آج انصاف ہے کہاں اور انصاف پسند کہاں ملتے ہیں؟ سب کو اپنی اپنی قوم کے قومی مفاد کا پاس ہے۔ صنعتی تہذیب کا۔ باوجود اس کے روشن پہلوؤں کے۔ سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ وہ اعلیٰ انسانی قدروں کا جن میں جمہوری حقوق اور عدل و انصاف بھی شامل ہیں۔ نام تو لیتی ہے لیکن انھیں مطلق اعلیٰ قدر نہ مانتے ہوئے عارضی قومی مادی مفاد پر قربان کر دیتی ہے۔ ﴿ دلیل استعمال جمہوری قبا میں پائے کوب

صفحہ ۱۵ کا بقیہ — غزنی

قدیم فارس کی رزم اور بزم کی تصاویر سے آراستہ تھا۔ سلطان نے ہر شعر کے لئے ایک اشرفی دینے کا وعدہ کیا۔

فردوسی نے شاہنامہ کے ساٹھ ہزار اشعار ۳۵ سال میں مکمل کیے اور ایک قول کے مطابق شاہنامہ کی تکمیل کے بعد سلطان محمود نے فردوسی کو ساٹھ ہزار اشرفیوں (سونے کے سکّوں) کے بجائے چاندی کے سکّے دینا چاہا جسے فردوسی نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور خفیہ طور سے بغداد چلا گیا۔

لیکن جدید تحقیق نے اس مفروضہ کا پردہ چاک کر دیا ہے اور سلطان محمود سے فردوسی کی ناچاقی اور سودے بازی کا واقعہ ایک مفروضہ داستان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سلطان محمود ایسے کٹر مسلمان حکمران سے جو اپنے زمانے میں علوم و فنون کا سب سے بڑا سرپرست تھا۔ ایسی بدعہدی کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی ہے۔

غزنی کا عروج زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا اور سلطان محمود اور سلطان مسعود کے عہد حکومت تک محدود رہا۔ غزنوی حکمران سلطان ارسلان کے عہد حکومت میں اس کا بڑا حصہ بجلی گرنے سے جل کر تباہ ہو گیا۔ بعد ازاں علاؤ الدین حسین شاہ نے شہر میں قتل عام کیا۔ پھر بھی غوری حکمرانوں کے زمانہ میں یہ صدر مقام رہا۔ لیکن ۱۲۲۱ء میں چنگیز خان کے بیٹے اوگوتائی نے اس میں قتل عام کیا اور بعد ازاں اسے تباہ کر دیا۔ اس کے ایک سو سال بعد ۱۳۳۲ء میں جب مشہور سیاح ابن بطوطہ یہاں پہنچا تو اسے چہار جانب کھنڈرات ہی کھنڈرات نظر آئے۔ ۱۵۰۴ء میں جب مغل سلطان بابر نے اسے فتح کیا تو سلطان محمود مسعود اور ابراہیم کے مقبرے موجود تھے۔ اور سلطان محمود اور مسعود کے تعمیر کردہ "فتح کے مینار" بھی موجود تھے۔ مغل اور درانی حکمرانوں کے زمانے میں غزنی ایک ناقابل تسخیر قلعہ کی حیثیت سے مشہور تھا۔

ا۔ میاں طالب

جگر: ایک تجزیاتی مطالعہ

علی سکندر جگر مراد آبادی اس دور کے نمائندہ شاعر ہیں جب ملک میں آزادی کی لہر پورے جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ عوام میں بدیسی حکمرانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ نہایت تیزی سے پیدا ہو رہا تھا۔ پرانے جاگیردارانہ سماج کی کوکھ سے سرمایہ داری سر ابھار رہی تھی۔ آزادی اور جذبۂ حریت کے ساتھ ساتھ سیاسی کشمکش شدید سے شدید تر ہو رہی تھی۔ جب ہم اس دور کے پس منظر میں جگر کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں سیاسی اور سماجی زد اور انسانی جدوجہد کی جھلکیاں حسن و عشق کے پردوں میں چھپی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہنا پڑتا ہے کہ حسن و عشق کے مضامین کے جلو میں جگر کی شاعری اور لب و لہجہ گہری جذباتیت اور مستی و سرخوشی کے ذریعہ خیالی دنیا کی بھول بھلیوں سے نکال کر حقیقی دنیا سے ہم کنار کرتا ہے۔ جو پرانے جاگیردارانہ سماج میں پروان چڑھی تھی۔ اس لئے جگر کی شاعری بڑی حد تک قدیم و جدید کا حسین سنگم ہے۔

جگر ایک غزل گو شاعر ہے۔ ہمارے نقاد اس بات سے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جگر نے غزل کو حیاتِ نو سے ہم کنار کیا۔ یوں تو جگر کے زمانے میں متعدد شعراء آسمانِ ادب پر ضیاء پاشی میں مصروف تھے جن میں حسرت۔ فانی۔ اصغر۔ یگانہ اور فراق کے نام قابل ذکر ہیں لیکن جگر اپنی سرمستی و سرخوشی کی بدولت سب سے الشباع منفرد ہے۔ جگر نے غزل کو سادگی اور پرکاری عطا کی۔ فانی نے اسے تہذیب غم سے آشنا کیا۔ اصغر نے تصوف کے ذریعہ اس میں گہرائی پیدا کی۔ یگانہ نے کس بل اور فراق نے اس کی جمال کو نکھارا۔ ان شعراء کے یہاں دل کی دھڑکنوں کے زیر و بم۔ فکر کی بلند پروازی معنویت اور گہرائی ملتی ہے۔ جگر صرف واردات اور کیفیات کا شاعر ہے اسلئے حساس اور جذباتی ہے۔ یعنی جگر کی شاعری جذباتی شاعری ہے۔ فکری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جگر کی شاعری میں گیرائی تو ملتی ہے مگر گہرائی نہیں۔

> جگر کی عشقیہ شاعری میں۔
> لیکن۔ جذبات برانگیختہ نہیں ہوتے۔ نوجوان دلوں کی دھڑکنیں ضرور سنائی دیتی ہیں۔
> یہ اس لئے کہ جگر نہ روایتی عاشق ہے۔ اور نہ
> اس کا محبوب اردو شاعری کا خیالی محبوب ہے۔!

جگر کی ابتدائی شاعری کیفیاتی اور جذباتی ہے۔ جس پر کہیں کہیں داغ کی چھاپ نظر آتی ہے "شعلۂ طور" اس کی واضح مثال ہے۔ اس مجموعہ میں شامل غزلیں ایک طرف رندانہ۔ جذباتی اور عاشقانہ ہیں تو دوسری طرف سطحی اور بے مغز پھر بھی ایک نیا پن ضرور ملتا ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی "جگر کے اشعار میں جو نیا پن ہے اس کا تعلق دراصل انداز و اسلوب سے زیادہ ہے فکر و احساس سے کم ہے" اس سطحیت، جذباتی۔ اور رندانہ شاعری کے پیش نظر مجنوں گورکھپوری اور کلیم الدین احمد نے جگر کو داغ کے قبیلے کا شاعر کہا ہے۔ حالانکہ جگر اور داغ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ داغ کی شاعری میں جو لاگ ڈانٹ۔ دھینگا مشتی۔ تیزی و طراری ہے وہ جگر کے یہاں مشکل سے نظر آتی ہے پھر داغ کی زبان،

روزمرہ، محاورات، بانکپن اور تیور جگر کے پہلے پہلے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ داغ کی تمام تر شاعری معاملات کی شاعری ہے۔ جیسے شکستہ تر عیاشانہ شاعری کہلاتی ہے۔ جگر کی شاعری کیفیاتی شاعری ہے۔ "شعلۂ طور" کے بعد جگر کی شاعری میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ زمانے کے تغیر و تبدل کے ساتھ جگر کی شاعری میں نئے پہلو ابھرنے لگے اور جلد ہی عام تقلیدی روش سے ہٹ کر ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی۔ ایک وقت وہ آیا کہ جگر کا انفرادی رنگ نکھر گیا اور اس انفرادیت نے دلوں کو مسخر کر لیا۔

جگر کی شاعری کا بڑا حصہ حسن و عشق کے رنگین و دل دوز موضوعات پر مبنی ہے۔ جگر کا فلسفۂ حسن و عشق مروجہ فلسفہ سے بالکل علیحدہ ہے جگر کے نزدیک حسن اور عشق دونوں ایک ہیں۔ دونوں میں کسی ایک کو فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ حسن بغیر عشق اور عشق بغیر حسن کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ تکمیل پا سکتا ہے اس فلسفہ کی تفسیر ان اشعار سے ہو جاتی ہے۔ ؎

حسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حسن
کونسی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں

دل نے کچھ ایسی دھن میں آج نغمۂ شوق گا دیا
عشق بھی جھوم جھوم اٹھا حسن بھی مسکرا دیا

عشق کیا ہے پرتو حسن تمام
شوق کیا ہے حسن کا عکس شباب

دراصل واردات، کیفیات اور جمال پرستی کا دوسرا نام جگر کی شاعری ہے جسے ہم اپنی آسانی کے لئے عشقیہ شاعری کہہ سکتے ہیں۔ جگر کی عشقیہ شاعری میں نوجوان دلوں کی دھڑکنیں ضرور سنائی دیتی ہیں لیکن جذبات برانگیختہ نہیں ہوتے۔ یہ اس لئے کہ جگر روایتی عاشق ہے اور نہ اس کا محبوب اردو شاعری کا خیالی محبوب ہے جگر کا محبوب گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان ہے جو اس کی شاعری میں اپنے اصل خدوخال کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس لئے جگر کا عشق مریضانہ ہونے کے بجائے ایک صحت مند انسان کا عشق ہے جس میں درد و غم بھی ہے خوشی و مسرت بھی، محرومی و مایوسی بھی ہے اور امید و کامرانی بھی۔ اسی طرح اس کے محبوب میں روٹھنے اور من جانے والی دونوں خصوصیات موجود ہیں۔ جگر کا یہ محبوب خالص مشرقی ہے جو نسائیت، حیا اور وفا کا پتلا ہے۔ جگر صنفِ نازک کا والا و شیدا ہے وہ اس سے عشق بھی کرتا ہے اور احترام بھی۔ وہ اسے صرف جسمانی لذت کا ذریعہ نہیں سمجھتا بلکہ معاشرہ کا ایک اہم فرد سمجھتا ہے۔ اس اعتبار سے جگر مزاجاً حسرت کے بہت قریب ہیں۔ حسرت کی طرح جگر نے بھی حسن و عشق کے گیت گاتے اور ہر واقعہ کو حسن و عشق کے پردے میں بیان کیا۔ حسرت کی طرح جگر کی شاعری میں بھی حسن و عشق کے بیان اور معاملات میں سادگی، جذبات میں معصومیت، شوخی اور نیاپن ملتا ہے۔ مثال کے طور پر دونوں کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں حسرت کا انداز یہ ہے ؎

آ کے سن کر میرے نالوں کو ز راہِ التفات
زیر لب اس نے بھی کھینچی ایک آہِ التفات

ہم ان کی جفا سے بھی راضی تھے مگر ناحق
اب ہو کے وہ خود نادم سرگرمِ تلافی ہیں

حسنِ بے پرواہ کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

وہ بار بار سزا جرم شوق پہ دیتے
مگر قصور وہی بار بار ہم کرتے

جگر اس انداز سے نغمہ سرا ہیں ؎

عرضِ نیازِ شوق کا چاہئے اور کیا صلہ
میں نے کہا بچشم نم اس نے سنا بچشم تر

یا وہ خفا تھے ہم سے یا ہم خفا ہیں ان سے
کل ان کا زمانہ تھا آج اپنا زمانہ ہے

غلط معاف زمانے سے بدگماں ہو کر
تری وفا پہ بھی کیا کیا نہیں گماں گذرے

لیکن اس مماثلت کے باوجود دونوں میں فرق ہے۔ اس فرق کو رشید احمد صدیقی نے یوں واضح کیا ہے "حسرت محبوب کے شاعر ہیں اور جگر محبت کے۔ حسرت محبوب کی موجودگی کے اور جگر دوری کی...

اکتوبر ۱۹۷۶ء

کی عظمت کے قائل ہیں۔ غالب نے سب سے پہلے نہایت واضح طور پر عاشقی کی سطح کو اونچا کیا۔ تہذیب رسم عاشقی حسرت کے یہاں غالب سے آئی جسے جگر نے تادیب عاشقی تک پہنچا دیا۔"

مجھے رشید صاحب کی اس رائے سے اتفاق بھی ہے۔ اور اختلاف بھی۔ اختلاف صرف اس بات سے ہے کہ غالب نے اردو غزل کی عشقیہ سطح کو اونچا نہیں کیا بلکہ اس کے تہذیبی عنصر کو نظر انداز بھی کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا عشق ایک نارمل آدمی کا عشق ہو گیا ہے جو محبوب پر فقرے بھی کستا ہے اور اس سے بگڑتا بھی ہے۔ منہ بھی چڑاتا ہے اور دھول دھپے سے بھی اس کو عار نہیں اور یہ بات عشقیہ سطح کو اونچا نہیں کرتی بلکہ عشق کے "احترام" کی روایت کو ٹھیس پہنچاتی ہے۔

جہاں تک فانی اور جگر کا تعلق ہے دونوں میں کوئی مماثلت نہیں۔ کیونکہ جگر کی شاعری کی بنیاد رندی و سرمستی پر ہے اور فانی کی حزن و یاس پر۔ جگر کی شاعری میں زندگی کی رعنائیاں خوشیاں اور مسرتیں ہیں۔ فانی کی شاعری میں زندگی کا کرب۔ محرومی مایوسی اور دکھ ہیں۔ جگر کی شاعری نور و نکہت اور رنگ و بو کا مرقع ہے اور فانی کی شاعری حزن و ملال کا آئینہ۔ جگر فانی کے برعکس اپنے غموں کو غرق مے ناب کر کے فرار حاصل کرتے ہیں۔ فانی کے یہاں غم فلسفۂ حیات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی وجہ سے فانی کے یہاں جگر کے مقابلے میں زیادہ گہرائی ہے۔ لیکن جو بے ساختگی، روانی، دل کشی اور سپردگی جگر کے یہاں ہے وہ فانی کے یہاں نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ فانی کی شاعری بار غم کو نہ سہار سکی جس کی وجہ سے شاعری چیخ بن گئی جس سے یاسیت اور قنوطیت پیدا ہو گئی۔ جگر مست الست تھا اس نے بار غم کو مسکرا کر اٹھا لیا۔ اس بے خودی و سرمستی کی وجہ سے غم بوجھ نہیں بن سکا بلکہ غم نے نشاط غم اور پھر عرفان غم میں تبدیل ہو کر جگر کی شاعری کو اور لطیف و شگفتہ بنا دیا۔

فانی کے یہاں جبر و اختیار کا فلسفہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے لیکن اختیار سے زیادہ جبر حاوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فانی کی شاعری میں زندگی کے تابناک پہلو کے بجائے تاریک پہلو کی ترجمانی زیادہ ہے

اشتہاء

فانی زندگی کا مقابلہ کرنے کے بجائے زندگی کی طاغوتی قوتوں کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں۔ جگر کے یہاں جبر کے مقابلے میں اختیار کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ جگر زندگی کی چیرہ دستیوں اور ناساعد حالات کے آگے سپر ڈالنے کے بجائے مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اسی لئے جگر کے یہاں رجائیت بھی ملتی ہے اور زندگی کرنے کا حوصلہ بھی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ؎

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہل دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

اجل خود زندگی سے کانپتی ہے
اجل کی زندگی پر دسترس کیا

اس دور میں یہ رجائی انداز یگانہ اور جگر کے یہاں نظر آتا ہے۔ اس رجائیت کے ساتھ حزن و یاس بھی پہلو بہ پہلو ہے لیکن جگر کا حزنیہ انداز بھی کچھ ایسا ہے کہ ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ فانی کی حزنیہ فضا اسقدر بوجھل ہے کہ ہم زیادہ دیر تک سانس نہیں لے سکتے۔ جگر کے یہاں یہ فضا اسقدر بوجھل نہیں ہے۔ فانی کہتے ہیں۔ ؎

دو تین ہچکیوں میں دم نزع کہہ گیا
شرح دراز زندگی مختصر کو میں

اجل بس ایک ہی کانٹا نکال کر چل دی
ٹھہرا کہ خار تمنا ابھی کھٹکتا ہے

جل رہے ہیں آج تک دل کے چراغ
طور پر ایک شمع جل کر رہ گئی

جگر کا انداز یہ ہے ؎

قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی
نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی

جسے رونق ترے قدموں نے دیکر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہوں اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

اصغر گونڈوی بنیادی طور پر تصوف کے آدمی ہیں۔ اردو شاعری میں میر درد کے بعد متصوفانہ شاعری میں اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے

تو وہ صرف اصغر کا ہے۔ کیونکہ درد کی طرح اصغر نے بھی تصوف کو ایک
تجربہ کے طور پر اپنایا۔ میر درد بھی خواص کے شاعر تھے اور اصغر بھی
لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے اور وہ یہ کہ درد کا تعلق اپنے زمانے کے
اجتماعی شعور اور اس کے بدلتے ہوئے معاشی اور سیاسی زوال سے بھی بڑا
مربوط ہے وہ جب بھی بات کرتے ہیں تو ہمیں ایک ایسے معاشرہ کی اکھڑی
اکھڑی سانسوں کی آواز سنائی دیتی ہے جو عقیدے اور یقین پر پوری
طرح عمل پیرا ہو کر بھی معاشی اور سیاسی ابتری اور زوال کی وجہ نہیں سمجھ
سکا۔ اس کے برخلاف اصغر کا زمانہ بالکل بدلا ہوا زمانہ ہے۔ ان کی
شاعری جس فضا میں سانس لے رہی ہے اس کا ربط اپنے معاشرے سے
مصنوعی قسم کا ہے۔ جہاں تک جگر اور اصغر کا تعلق ہے ہم بآسانی دونوں
کی شاعری میں فرق کر سکتے ہیں۔ اصغر کی شاعری تصوف کی بنیادوں پر
قائم ہے، جگر کی شاعری حسن و عشق کے ساتھ ساتھ تصوف اور بعد میں
سیاسی و سماجی بنیادوں پر قائم ہوئی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جگر نے
اصغر کی صحبت سے بہت کچھ حاصل کیا ہے اور جگہ جگہ اپنی عقیدت کا
اظہار بھی کیا ہے لیکن وہ اصغر کے رنگ کو نہیں اپنا سکے۔ اس کی ایک وجہ
یہ بھی ہے کہ جگر کا ہماری دنیا سے اصغر کے مقابلے میں گہرا جذباتی تعلق ہے
اس لئے کہ جگر کی شاعری کی جڑیں اس زمین میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں
جس پر ہم گھروندے بناتے اور ڈھاتے رہتے ہیں۔ اصغر کی شاعری
ماورائی ہے وہ جب بھی ہماری زندگی اور ماحول پر نظر ڈالتے ہیں تو
اتنی اونچی سطح سے جہاں سے انھیں ہر چیز صاف نظر نہیں آتی یہی وجہ ہے
کہ اصغر جگر کے مقابلے میں اپنی تمام تر سنجیدگی اور متانت کے باوجود
ہم سے بہت دور رہے۔ جگر ہم میں گھل مل جاتے ہیں۔ پھر بھی جگر کے
یہاں تصوف کے جو مضامین ملتے ہیں ان میں بھی وہی سرشاری اور
کیف و مستی ہے جو عشقیہ مضامین کے بیان میں ملتی ہے۔ دوسری
بات یہ کہ جگر کے یہاں جو والہانہ پن ہے وہ اصغر کے یہاں نہیں ہے۔
جو سپردگی، برجستگی اور دلوں کو موہ لینے والا انداز جگر کے یہاں خاصہ
کی چیز ہے اصغر کو نصیب نہیں۔ اس بات کی وضاحت اصغر
اور جگر کے کچھ اشعار سے ہو جاتی ہے۔ اصغر کا انداز
یہ ہے۔ ؎

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی
تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے

ہم ایک بار جلوۂ جانانہ دیکھتے
پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے

جگر یوں نغمہ سنج ہوتے ہیں ؎

نقوش پرتو رنگینیٔ دل دیکھنے والے
کبھی خود کو بھی دیکھو اے خود سے غافل دیکھنے والے

خود حسن استعارہ ہے جس کے جمال کا
وہ جانِ حسن و حسن سراپا ہی اور ہے

جلوہ پھر جلوہ ہے نظارہ ہے پھر نظارہ
حیرت آئینے میں ہے آئینہ حیرت میں نہیں

اصغر کی شاعری اپنی تمام تر ماورائیت اور وسعتوں کے باوجود
وقت کی آواز نہ بن سکی۔ جگر کی شاعری ماورائی نہیں ہے بلکہ ارضی ہے
لیکن اس ارضیت میں بھی ماورائیت ہے۔ اصغر کا انداز خالص تصوف
کی وجہ سے کسی قدر گرانبار بھی ہو گیا ہے لیکن جگر کے یہاں جو سوز و گداز
سرمستی اور والہانہ پن ہے اس کی آمیزش نے جگر کے لہجہ کو نرم اور
شگفتہ بنا دیا۔

یگانہ اور فراق اپنی فکر اور مزاج کے اعتبار سے حسرت، فانی
اصغر اور جگر سے مختلف ہیں۔ اردو شاعری میں یگانہ وہ واحد شاعر
ہے جس کا لب و لہجہ، انداز اور تیور سب سے منفرد ہے اس کے لہجہ
میں سبک روی اور نسائیت کے بجائے سختی اور مردانگی ہے بانکپن
ہے۔ یگانہ کی شاعری میں انسانی نفسیات کی الجھنیں اور فکر کی گہرائی
ہے، خود اعتمادی اور بے باکی ہے۔ یگانہ کی شاعری بڑے کس بل
اور تیور والی ہے۔ یگانہ نے اردو غزل کے امکانات کو وسیع کیا یگانہ
کی غزل معصوم نہیں ہے بلکہ باشعور ہے جو ہر کڑے وقت پر اپنی حفاظت
خود کرنا جانتی ہے۔

فراق کی شاعری بڑی نرم و سبک ہے۔ فراق نے اردو شاعری کو

ہندی دیومالائی حسن سے اور نکھار دیا ہے۔ حسن وعشق کے بیان میں۔
فراق کی شاعری پیچیدہ اور تہہ دار ہے۔ فراق نے اردو شاعری کو نیا
ذہن اور نیا فکری نظام دیا اور نئے افق کی نشاندہی کی۔ نئے تجربوں سے
گزرنا سکھایا۔ لیکن جگر نے جس طرح سیاسی و سماجی موضوعات کو اپنی
غزل کا موضوع بنایا اس طرح فراق ان موضوعات کو جگر کے سے رچے ہوئے
انداز میں نہیں نبھا سکے۔ لیکن جو سیاسی اور سماجی بصیرت فراق کے یہاں ہے
وہ جگر کے یہاں نہیں ہے۔

اس تجزیہ سے اتنا ضرور واضح ہو گیا ہے کہ جگر اپنے مزاج، افتادِ
طبع اور رندانہ بیان کے اعتبار سے ایک منفرد شاعر ہے جس کی شاعری
خلوص اور صداقت سے معمور ہے وہ حسن وعشق کا ترجمان ہے لیکن اس
کی ذاتی واردات عشق میں ہر شخص کو اپنی واردات معلوم ہوتی ہے۔ جگر اپنی
ذات سے جس قدر پرخلوص اور سچا انسان ہے اسی طرح عاشق صادق بھی۔
اس کے یہاں سیاست عشق کے بجائے عشق کا بھولا پن اور معصومیت
ہے لیکن اس میں خودداری بھی ہے۔

کبھی کبھی یہی خودداری اور راز خود رفتگی اس مقام پہ پہنچ جاتی ہے
جہاں جگر خود کو محبوب سمجھنے لگتا ہے ؎

جگر اب تو وہ بھی یہ کہتے ہیں مجھ سے
ترے ناز اٹھانے کو جی چاہتا ہے
یوں بھی ہو کاش غمِ عشق کی تاثیر جگر
میں تمنا نہ کروں اور وہ تمنائی ہو

غرض جگر کی شاعری غزل اور اس کی دنیا حسن وعشق تک محدود
ہے لیکن زمانہ کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ جگر کی شاعری نئے رجحانات
سے آشنا ہوتی ہے۔ "شعلۂ طور" سے "آتش گل" کے سفر تک شاعری میں
بتدریج ارتقاء ملتا ہے۔ عمر کی پختگی کے ساتھ شاعری میں بھی سنجیدگی،
متانت اور پختگی آئی۔ واقعہ کا نپور، قحط بنگال اور دوسری مسلسل غزلوں
میں جگر نے جس انداز سے اپنے خیالات کا بے باکانہ اظہار کیا ہے اس بھی
جگر کے سیاسی و سماجی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

ہر ادیب و شاعر اپنے معاشرہ کا ترجمان ہوتا ہے اگر اس کی
تخلیقات ماحول، تحریکات، روایات و اقدار اور حالات و مسائل کی بھرپور
الشباع

انداز میں نہیں تو کسی نہ کسی طور پر ترجمانی ضرور ہوتی ہے ملک میں جو
تحریکات چلتی ہیں وہ بھی متاثر کرتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد آزاد
اور حالی نے نئے ذہن کی تشکیل کے لئے جدید شاعری کی طرح ڈالی اور نئے
رجحانات سے ہم آہنگ کر کے وسعت بخشی۔ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک نے
بھی یہی کام انجام دیا۔ اس تحریک کا سب سے بڑا مقصد حصول آزادی، سیاسی
بیداری اور معاشی مساوات تھا۔ ان سب محرکات کی وضاحت غزل کے
بجائے نظم بڑی آسانی اور خوبصورتی کے ساتھ کر سکتی تھی۔ دراصل یہ
دور سیاسی دور تھا اور سیاسی بیداری اور نظریاتی پرچار کے لئے سب سے
مؤثر ذریعہ تھا۔ یہ دور حسن وعشق کے نغمے الاپنے کے بجائے آزادی اور
مخصوص انداز کے گیتوں کا دور تھا۔ غزل نے بھی سیاسی موضوعات کو
سمیٹا لیکن غزل وضاحت کے بجائے ایجاز و اختصار اور ایمائیت
کا نام ہے کیونکہ غزل کے ذریعہ اس مشن کو پوری طرح کامیاب نہیں بنایا جا
سکتا تھا اس لئے شاعروں نے نظم کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ
بنایا۔ جگر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ جہاں تک ہو سکا جگر نے اپنی
غزل کے ذریعہ اپنے ماحول کی ترجمانی کی۔ اس دور میں جگر کی شاعری
خیالی اور رومانی فضا سے نکل کر حقیقتوں سے ہم کنار ہوئی۔ اپنے
دور کے ذہنی رویہ کو دیکھ کر وہ بھی نظم کی طرف مائل ہونا چاہتے تھے لیکن
ان کا مزاج نظم سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا۔ اس لئے انھوں نے باقاعدہ
نظموں کے بجائے مسلسل غزلوں کے ذریعہ اپنے حالات، ماحول، سیاسی
و سماجی معاملات پر بے لاگ تبصرہ کیا۔

فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل
کہاں سے بڑھ کے پہنچے ہیں کہاں تک علم و فن ساقی
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی نہ من ساقی

ان مسلسل غزلوں سے جگر کے ذہنی انقلاب کا پتہ چلتا ہے۔ ان غزلوں
میں نظم کا انداز ضرور ہے لیکن انھیں نظم نہیں کہا جا سکتا۔ بعض نقادوں
نے اس ذہنی تبدیلی پر حیرت کا اظہار بھی کیا ہے جیسے مجتبیٰ حسین نے اپنے مضمون
"دورِ حاضر اور غزل" میں ایک جگہ لکھا ہے "جگر جو کر قنوطی تھے انھوں نے
بھی نظم کا سہارا لیا ہے اور یہاں تک کہہ دیا ہے "شاعر نہیں ہے وہ جو
اکتوبر ۱۹۵۶ء

غزل خواں ہے آجکل" یہ ان کی شاعری کی وفات ہے۔ تقسیم تقریباً چالیس سال کی مشق پر جگر نے جس طرح لکیر کھینچ دی وہ حالات کی صفائی اور جگر کی بے دریغ حقیقت شناسی کا پتہ دیتی ہے۔ مجھے اس میں زیادتی محسوس ہوتی ہے ۔" اس اقتباس میں جگر کی ترک غزل گوئی پر اظہارِ افسوس نہیں ہے بلکہ اس دور کے ذہنی رویہ کی ترجمانی ہے جس میں ننانوے فی صد شاعر نظم لکھ رہے تھے اور نظم ہی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ غزل کے خلاف جد و جہد اس دور میں نظر آتی ہے وہی مجتبیٰ حسین کے اس اقتباس میں پردوں میں چھپی ہوتی ہے۔ ایک طرف غزل کی جگر کے ذریعہ مخالفت کی گئی ہے اور دوسری طرف نظم کا قصیدہ ہے۔ وہ دور دراصل نظم کا دور تھا۔ تحریکات کا زور تھا۔ ہر مسئلہ کی وضاحت اور موضوعات کے تنوع کی وجہ سے غزل اس بارِ گراں کو فوراً اٹھا نہیں سکتی تھی نظم نے اس کو مسکرا کر اٹھالیا۔ جگر نے جو نظم نما غزلیں کہیں وقت کے تقاضوں کے عین مطابق کیا۔ پھر بھی جگر نے نظم کو غزل کی جگہ نہیں دی۔ جونہی سیاست نعرہ بازی اور نظریات کے پرچار کی گھٹائیں چھٹیں۔ دھماکے ختم ہوتے اور نظم کا شور و ہنگامہ بھی ختم ہوا۔ فضا میں جو نظریاتی گھٹن پیدا ہوگئی تھی ختم ہوتے ہی جگر نے پھر اپنا ساز اٹھا کر مدھر غزل چھیڑ دی۔ لیکن اب غزل میں سطحیت، فرسودگی، جذباتیت، ہیجان اور صرف حسن و عشق کا بیان نہیں رہا بلکہ زندگی کی عکاسی اور ترجمان بن گئی۔

جگر کی اس ذہنی تبدیلی کے باوجود جگر کی جمالیاتی حس اور رومانی طرزِ اظہار میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی اور نہ لب و لہجہ کی نرمی کرختگی میں بدلی۔ اس نئی تبدیلی سے جگر کے یہاں طنز کا پہلو مزید ابھر آیا۔

کیا جانئے کیا ہوگیا اربابِ جنوں کو
جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد
عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے
عشق ہے کارِ شیشہ و آہن

جگر کی شاعری پر تقسیم ہند کا گہرا اثر پڑا۔ اس تقسیم کے بعد جو تعصب۔ نفرت۔ تنگ نظری۔ منافقت۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا اور مفاد پرستوں نے اپنے مفاد کی خاطر انسانیت کو خون میں نہلایا اس پر بھی جگر نے بڑے موثر انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ نام نہاد لیڈروں کے بارے میں یوں طنز کرتے ہیں۔

ہندوستان میں خیر سے ان کی کمی نہیں
لب پر ہیں جو خلوص کا دفتر لئے ہوئے
کہتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام
پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے

اس نام نہاد لیڈری، مفاد پرستی، منافقت اور انسانیت پر کئے جانے والے مظالم نے سادہ لوح جگر میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ وہ جو ہر شخص سے بصد خلوص ملتا تھا اور ذرا چونکتا ہے۔ ٹھٹکتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں مہر و وفا اور مروّت اور خلوص و پیار کسی میں نہیں ملتا۔ کہتے ہیں سب

آدمی آدمی سے ملتا ہے — دل مگر کم کسی سے ملتا ہے
وفا کا نام کوئی بھول کر نہیں لیتا — ترے سلوک نے چونکا دیا زمانے کو

یا جگر کا گیت "بھاگ مسافر بھاگ" اپنے دور کی منافقت، دھوکہ دہی اور ظاہرداری پر بھرپور طنز ہے

بہرحال جگر ایک ایسا شاعر ہے جس کے یہاں زندگی کے مختلف روپ مختلف ہلکے گہرے رنگوں میں بکھرے ہوئے ہیں وہ حسن کا پجاری ہے اور حالاتِ زمانہ پر نوحہ کناں بھی۔ اس کے یہاں حسن کے جلوے بھی ہیں اور جراحتوں کے چمن بھی لیکن جگر کے یہاں غالب اور اقبال جیسا کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ مشہور نقاد کلیم الدین احمد۔ جگر کو صاحبِ طرز شاعر نہیں مانتے۔ یہ ان کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں جگر صاحبِ طرز شاعر ہے۔ جگر کے یہاں شروع سے آخر تک ایک انفرادیت ملتی ہے ایسی انفرادیت اردو غزل کے بہت کم شاعروں کو ملی ہے۔ بہرحال جگر نے غزل کی تشکیل میں جو کارِ نمایاں انجام دیا اور اسے جن صحت مند قدروں اور رجحانات سے ہم کنار کیا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ جگر کی غزل قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ جدید بھی ہے۔ روایتی ہونے کے ساتھ حقیقی اور تابندہ، اپنے وقت کی نمائندہ اور نئی نسل کے غزل گو شعراء کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

اکتوبر ۱۹۶۷ء

نوشتہ۔ والٹر بی ہیکاس
ترجمہ۔ اختر ملیح آبادی

باٹان کا بھوت

جنوری ۱۹۴۲ء کی ایک خنک رات —!

فلپائن کی خلیج باٹان کا ایک محاذ جنگ۔! رات اندھیری اور خاموش ہے۔ امریکی بریگیڈ کا پڑاؤ — تھکی ہاری فوج محو خواب ہے، اور ایسا نظر آتا ہے کہ کوئی متنفس بھی بیدار نہیں، زندگی مفقود۔

لیکن نصف شب کے قریب زندوں کے قبرستان میں ایک سایہ ابھرتا ہے اور بے آواز قدموں سے کوئی پڑاؤ سے نکل کر پڑاؤ کے باہر چلا جاتا ہے۔ لیکن کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی اور نہ کسی کو جاننے کی فکر ہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ کون گیا اور وہ کس کا سایہ تھا جو ادھر سے ادھر ہو گیا۔ سرد ہوا البتہ سیٹیاں بجا رہی تھی اور کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ سرد ہوا کی سیٹیوں کے معنی کیا ہیں؟

کیپٹن آرتھر ویر میتھ جا نتہائی خاموشی اور رازداری سے پڑاؤ سے نکل کر جنگل کی سمت ہو لیا تھا۔ اپنے مشن پر رواں دواں تھا۔ اگرچہ اس کی چال محتاط تھی پھر بھی اس کے قدم عزم و استقلال اور خود اعتمادی سے محروم نہ تھے۔ اس کا رخ "کالگنان" گاؤں کی طرف تھا جہاں جاپانیوں کا قبضہ [illegible] ہو چکا تھا اور جاپانی گاؤں پر بری طرح مسلط تھے۔ کیپٹن ویر میتھ کا رخ اسی طرف تھا اس لئے کہ اسے ایک انتہائی خطرناک اور ناممکن العمل فرض کو پورا کرنا تھا۔ "کالگنان" کی تباہی کے ساتھ ساتھ کیپٹن ویر میتھ کو اس پل کو بھی اڑا دینا تھا جو بانس اور کنکریٹ سے بنا تھا اور جس کی تباہی امریکی فوج کے لئے انتہائی ضروری تھی ورنہ —

کیپٹن ویر میتھ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کالی رات میں وہ مجسم سیاہ پوش تھا۔ یہاں تک کہ گیسولین کے ٹن بھی سیاہ تھے تاکہ کسی قسم کی چمک کا امکان باقی نہ رہے۔ اور دشمن چونک نہ پڑے۔ گیسولین اور ڈائنامیٹ کے ٹنوں کو بھاری بھرکم کیپٹن ہاتھوں میں لئے تھا۔ رائفل کے بجائے ۴۵ بور کا ریوالور کمر سے بندھا تھا اور ایک لمبے چاقو کے علاوہ کیپٹن کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ البتہ دل میں عزائم کا غبار ضرور تھا اور بس۔

آج کی جاپانی پیش قدمی اور پسپائی کے بعد ہی افسر کمانڈنگ کرنل آرنلڈ فنک نے کیپٹن کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

"حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ کئی بیرونی چوکیاں ہمارے ہاتھوں سے نکل چکی ہیں۔ کالگنان کی اہم چوکی بھی گئی"۔ اتنا کہہ کر کرنل فنک کے

• جاپانیوں کو تعجب تھا کہ باٹان کا بھوت بنا کس دھات سے ہے کہ نہ اس پر گولیاں اثر کرتی ہیں نہ سنگینیں۔ وہ گولیوں کی بوچھاڑ سے کھیلتا کودتا نکل جاتا ہے۔

• جلد ہی جاپانیوں کو یقین ہو گیا کہ پوری امریکی فوج کو ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ لیکن گزند نہیں پہنچایا جا سکتا تو باٹان کے بھوت کو

دیوار سے ٹنگے ہوئے نقشہ کی طرف اشارہ کیا اور پھر کہا "ہم جاپانی جال میں پھنس چکے ہیں اور ستاون انفنٹری فلپائن اسکاؤٹس موت کے منہ میں ہے۔ جاپانی اس پوزیشن میں ہیں کہ جب چاہیں پل سے دریا پار کرلیں اور ہم پر ٹوٹ پڑیں ہم انہیں روک نہیں سکتے اور اگر ایسا ہوا تب ہم عظیم خطرات سے دوچار ہو جائیں گے . . . . کالگنبان کے مکانات گھاس اور پھونس سے بنے ہیں . . . . اگر ہمیں ایک صرف باعزم و باہمت جیالا سپاہی میسر ہو تب اس گاؤں اور گاؤں کے پل کو تباہ کیا جاسکتا ہے . . . . لیکن اس فدائی کو اس یقین کے ساتھ اس فرض کو پورا کرنا ہوگا کہ وہ خود تو زندہ نہیں ہوگا لیکن اپنے وطن کو زندگی کی گارنٹی دے سکے گا . . . . . ."

اتنا کہہ کر کرنل فنک نے بڑی مونچھوں کو چھوا استفساریہ انداز سے کیپٹن ویرمیتھ کو دیکھا اور پوچھا "کیپٹن! کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسا فدائی وطن ہے . . . . . ؟"

"آپ کے سامنے موجود ہے جناب والا!" کیپٹن ویرمیتھ نے بڑے سکون سے کہا۔

"تم ؟ — کیپٹن !" کرنل فنک نے مسکراتے ہوئے کہا "شاباش — !"

درحقیقت کرنل فنک نے کیپٹن ویرمیتھ کو یہ سمجھ کر ہی طلب کیا تھا کہ اس کے علاوہ کوئی اس فرض کو پورا نہیں کرسکتا کرنل فنک نے بڑھ کر ویرمیتھ کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا۔ میں تمہاری کامیابی و سلامتی کے لئے دعا کروں گا .

کیپٹن ویرمیتھ نے اپنے کرنل کو بعد ہدایات سیلوٹ کیا اور چلا گیا — نصف رات کیپٹن ویرمیتھ کالگنبان کی طرف تن تنہا اسی لئے رواں دواں تھا

کیپٹن ویرمیتھ نے جنگل کے آخری کنارے کے ایک پیڑ کی آڑ سے جھانکا تو جاپانی سپاہی لمبی سنگین لئے ہوئے پل کی حفاظت کر رہا تھا اور آہستہ قدموں سے پل کے ارد گرد ٹہل رہا تھا کانوں اور آنکھوں کو کھولے ہوئے وہ بہت مستعدی کے ساتھ پہرہ دے رہا تھا کیپٹن ویرمیتھ چند لمحے سانس روک کر جاپانی سنتری کے انداز نوٹ کرتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ پل کی طرف بڑھنے کا پلان بناتا رہا — چند لمحوں بعد یہ اندازہ لگانے کے بعد اور اس یقین کے ساتھ کہ جتنی دیر وہ پیٹھ کئے رہے گا اپنا مقررہ فاصلہ طے کرے گا وہ چشمے کی طرف یقیناً بڑھ جائے گا کیپٹن نے خود کو تیار کیا اور جوں ہی جاپانی سنتری کی پیٹھ ہوئی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ پیڑ کی آڑ سے نکلا اور چشمے کی طرف دم سادھ کر چلا — یہ لمحات بڑے کٹھن اور صبر آزما تھے کیپٹن ویرمیتھ کے لئے — لیکن یہ دشوار گزار لمحے آخر گزر ہی گئے اور کیپٹن ویرمیتھ پل کی آڑ تک پہنچ گیا اور جاپانی سنتری کو پتہ بھی نہ چلا — جب تک جاپانی سنتری کے دو راؤنڈ مکمل نہ ہو گئے اس وقت تک کیپٹن ویرمیتھ چپ چاپ بیٹھا رہا لیکن تیسری بار جوں ہی جاپانی سنتری نے پیٹھ موڑی کیپٹن ویرمیتھ نے اپنا کام شروع کردیا اور پل کو ڈائنامیٹ کر دیا۔ اور اب وہ زیادہ کٹھن منزل کے متعلق سوچ رہا تھا کیپٹن ویرمیتھ کو محسوس ہوا کہ وہ کالگنبان تک پہنچ ہی نہیں سکتا جب تک کہ جاپانی سنتری کا مسئلہ نہ حل ہو جائے!! اور دوسرے لمحہ کیپٹن ویرمیتھ نے اس خطرہ کو راہ سے ہٹانے کی اسکیم بنالی — اور جوں ہی جاپانی سنتری قریب آیا اور فوجی انداز سے گھوما کہ کیپٹن ویرمیتھ نے لپک کر بڑی چابکدستی سے اس کی گردن اس طرح شکنجے میں جکڑ لی کہ نہ تو وہ جاپانی سنتری بول سکتا تھا اور نہ سانس لے سکتا تھا۔

اس گرفت کے بعد ہی دوسرے لمحے کیپٹن کا لمبا چاقو جاپانی سنتری کے دل میں پیوست ہو گیا — اور وہ زمین پر بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو گیا۔ کیپٹن نے لاش وہاں اٹھا کر جنگل میں رکھدی — خطرہ دور ہو چکا تھا کالگنبان کا راستہ اب بالکل صاف تھا — اور کیپٹن بغیر مزاحمت گاؤں تک گیسولین کے ایک ٹن کے ساتھ پہنچ گیا۔ اور گیسولین بانس اور پھونس کے مکانوں پر چھڑکنے لگا۔

اس کام سے فارغ ہوتے ہی کیپٹن ویرمیتھ نے اطمینان کا سانس لیا اور پل کی طرف دیکھا کہ فرار کا راستہ محفوظ ہے

ہا نہیں ؟ بعد اطمینان کیپٹن نے ماچس نکالی اور ایک ماچس کی تیلی ایک جھونپڑی کو دکھادی ـــــ شعلہ بھڑکا اور پھر ہر طرف شعلے ہی بھڑکنے لگے۔ دوسرے لمحے محو خواب جاپانی سپاہی گھبراہٹ اور دہشت کیساتھ چیختے چلاتے اور گالیاں دیتے باہر نکلنے لگے۔ ادھر ان کا شور تھا ادھر شعلوں کی بغاوت بپا تھی فوراً ہی کیپٹن ویر میتھ نے پل کی راہ لی اس لئے کہ شعلوں نے اجالا کردیا تھا اور پہلے سے زائد اس کے لئے خطرہ تھا۔ کیپٹن ویر میتھ پل کی طرف بھاگا اور دوسری ماچس پل کو دکھائی پھر جنگل کی طرف ہو لیا اس لئے کہ بچت کی یہی صورت تھی اس وقت جاپانی سپاہیوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کردی اور فضا گولیوں کی آواز سے لرز گئی!

کیپٹن ویر میتھ دوڑ رہا تھا۔ بھاگ رہا تھا جاپانیوں کا شور و غل بڑھ چکا تھا۔ فائرنگ برابر جاری تھی اور کیپٹن عزم راسخ کے ساتھ بھاگ رہا تھا کہ جان بچانی ہے تب گولی لگنے کے باوجود قدم رکنا نہیں چاہئے اور اسی ارادے کے ساتھ وہ گولیوں کے جھرمٹ میں بھی دوڑتا رہا یہاں تک کہ جنگل میں داخل ہوگیا ـــــ کالگنان کا گاؤں بُری طرح آگ کی گود میں تھا۔ کیپٹن نے مڑ کر دیکھا۔ فاتحانہ انداز سے مسکرایا بلند شعلے اٹھ اٹھ کر کیپٹن کو جنگل سے گزرتے وقت راہ دکھا رہے تھے

دوسری صبح اتحادی لائن کے عقبی حصے میں کیپٹن ویر میتھ اسپتال میں لیٹا تھا اور ڈاکٹر کہہ رہا تھا: "خوش قسمت ہو کیپٹن! گولی ہڈی کے پاس جاکر رک گئی۔ ورنہ تم ڈھیر ہوجاتے"! ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اس جملے کا کیپٹن پر مطلق اثر نہ ہوا۔ نہ معلوم وہ کہاں تھا ڈاکٹر نے کہا: "کچھ دن اسی طرح لیٹے رہنا پڑے گا"۔ تب کیپٹن اچانک چونکا اور قدرے گھبرا کر پوچھا، "اسی طرح بغیر کسی حرکت کے"؟

"ہاں!" ڈاکٹر نے مختصر جواب دیا تو کیپٹن کے چہرے کا رنگ بدل گیا کیونکہ اسے اس طرح مریض بن کر لیٹے رہنا منظور نہ تھا کل کی کارگزاری نے کیپٹن کو خطرات سے دوچار ہونا سکھا دیا تھا اس کے علاوہ جاپانیوں نے اسے جو نیا لقب دیا تھا اس کی بھی تو اسے لاج رکھنی تھی۔ جاپانی کیپٹن ویر میتھ کو "باٹان کے بھوت" کے نام سے یاد کر رہے تھے جس نے پورا گاؤں جلا کر راکھ کردیا تھا۔ ایسی صورت میں بھلا "باٹان کا بھوت" اسپتال میں بستر کا سہارا کیسے لے سکتا تھا!؟

لیکن ڈاکٹر نے کیپٹن کو بستر سے اٹھنے نہیں دیا اس لئے کہ جاپانی رائفل کی گولی نے پیر کا گوشت پھاڑ دیا تھا اور وہاں زخم تھا جس کا مندمل ہونا ضروری تھا جس کے بغیر "بھوت" کا گشت بیکار رہتا۔ لہٰذا کیپٹن مجبوراً دبے بس سا ہوگیا تھا مگر وہ ایک ایک لمحہ گن رہا تھا کہ کب اسپتال سے رخصت ملے اور وہ پھر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

کیپٹن ویر میتھ بستر پر لیٹے لیٹے سوچا کرتا تھا کہ جنگ شروع ہونے کے بعد سے وہ اب تک جاپانی دباؤ سے پچاس میل تک پیچھے ہٹا ہے اور یہ سوچ کر اسے کوفت ہوتی۔ لیپانی خلیج کے اہم قصبہ مبٹانگ تک ہو چکی تھی یہ وہ اہم جگہ تھی جو منیلا کو جانے والی شاہراہ کی شہ رگ تھی اور کیپٹن محسوس کر رہا تھا کہ اب مزید پسپائی کسی لحاظ سے بھی مناسب نہیں ہوگی۔

مبٹانگ کے اردگرد پہاڑی سلسلے اور جنگل تھے جہاں جاپانی ہوائی فوج سے بمباری کر رہے تھے جس کا جواب امریکی فوج دینے سے قاصر تھی لیکن گردوپیش کے قدرتی حالات جاپانیوں سے دو دو ہاتھ لینے کے حق میں تھے مگر کمک کے سارے راستے کٹ چکے تھے اسی صورت حال کے پیش نظر جاپانی بری طرح نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے تھے۔ اور یہ امر امریکی دفاعی فوج کے لئے ایک اہم سوال بن چکا تھا کرنل فنک کی پریشانی میں اضافہ ہو چکا تھا ان ہی دنوں "باٹان کا بھوت" اسپتال سے آگیا ـــ!

کرنل فنک نے کیپٹن سے مشورہ کیا۔ کیپٹن نے حل پیش کردیا وہ یہ کہ جس طرح جاپانی ایک ایک کرکے ہمیں موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں اسی طرح جاپانیوں پر الٹ کر یہی وار کیا جا سکتا ہے۔

"کیسے؟" کرنل نے پوچھا۔

"ہم بھی چن چن کر جاپانیوں کو ہلاک کرسکتے ہیں!" کیپٹن ویر میتھ نے کہا: "مجھے فدائی دستہ منتخب کرنے کی اجازت دی جائے۔ میں

جاپانی لائن میں گھس کر یا قریب جا کر آگ کا جواب آگ سے دونگا۔"
کرنل فنک کچھ لمحے سوچتا رہا اور پھر کہا: "اجازت ہے۔ اپنا دستہ منتخب کر لو۔"

اجازت ملتے ہی کیپٹن نے ایک سو پچاس سپاہی منتخب کئے اس دستے میں کیپٹن نے اپنے "ایڈی" لفٹیننٹ کرسپ جیکب کو بھی شامل کیا اور اپنے دستے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "ہم جنگل میں چھپ جائیں گے اور آنے والے جاپانیوں کی گھات میں لگے رہیں گے۔ یاد رکھو کہ ہر ایک کو صرف ایک ہی موقعہ ملے گا لہذا پہلا موقعہ ضائع نہیں ہونا چاہئے ... پورے یقین کے ساتھ حملہ ہونا چاہئے۔" کیپٹن ویرمیتھ نے پھر اشارہ کیا اور اندھیرے میں جانباز دستہ جنگل میں گھس گیا۔ اور دھان کے کھیتوں میں چھپ کر جاپانیوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ خود کیپٹن ویرمیتھ ایک دھان کے کھیت میں لیٹ گیا۔ یہاں تک کہ سردی محسوس ہونے لگی لیکن بہت جلد انتظار کے لمحے بیت گئے اور جاپانیوں کی آمد شروع ہو گئی۔ کیپٹن کے پاس سے پانچ جاپانی گزرے۔ ان میں سے ایک قدرے آگے تھے اور پیچھے چار جاپانی قریب قریب بڑھ رہے تھے۔ پھر چند لمحے بعد چھٹا جاپانی گزرا۔ اب کیپٹن سے ضبط نہ ہوا اور اس نے چھٹے جاپانی پر وار کیا۔ جاپانی چلایا اور کیچڑ میں لوٹنے لگا۔ آگے جانے والوں نے گھبرا کر دیکھا اور فائر کرنے ہی والے تھے کہ جیکب نے فائر کیا۔ ایک جاپانی مرا۔ دوسرا فائر ہوا۔ ایک اور شکار ہوا۔ باقی خوف و دہشت سے بھاگے لیکن وہ بھاگ نہ سکے۔ چھ کو موت کے گھاٹ اتار کر کیپٹن ویرمیتھ نے جگہ تبدیل کر دی اور دوسرا مورچہ سنبھال لیا۔

کیپٹن ویرمیتھ کا چھاپہ مار دستہ بری طرح معروف تھا اور چند ہی راتوں میں اس نے دشمن کو مزہ چکھا دیا جس سے دشمن ہراساں نظر آنے لگا اور "بانان کا بھوت" کی دہشت نے جاپانیوں کو لرزہ براندام کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپانی چھاپہ مار دستے پیچھے ہٹ گئے۔ یہ بانان کے بھوت کی دوسری کامیابی تھی!

۱۳ جنوری [illegible] کو کرنل فنک نے کیپٹن ویرمیتھ کو پھر طلب کیا اور ایک نقشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ کھیت جاپانیوں کے لئے ڈھال کا کام کر رہا ہے۔ جاپانی کھیت میں گھس کر ہماری لائن کو نقصان پہنچاتے ہیں لہذا اس کا سدباب ضروری ہے۔" چند لمحے رک کر کرنل فنک نے کہا: "اگر اس کھیت کو صاف کر دیا جائے تب جاپانی چوری چھپے نہیں بلکہ کھل کر مقابلہ پر مجبور ہو جائیں گے جو ہمارے لئے زیادہ مفید صورت ہو گی۔"

"کھیت میں کونسی فصل ہے؟" کیپٹن ویرمیتھ نے پوچھا۔

"یہ بید کا کھیت ہے اور بید خشک ہے۔" کرنل فنک نے فوراً کہا۔

"اس کا علاج یہ ہے کہ خشک بیدوں میں آگ لگا دی جائے۔" کیپٹن نے فوراً کہا، "جاپانیوں کو کھیت میں آنے دیا جائے اور تب چاروں طرف سے آگ لگا دی جائے اور پھر ہمارے دستے جاپانیوں کو ہر طرف سے گھیر کر ہلاک کر دیں۔"

"ٹھیک ہے!" کرنل فنک نے پوچھا: "آگ لگانے کا کونسا طریقہ تمہارے ذہن میں ہے؟"

جب کیپٹن ویرمیتھ نے اپنی اسکیم بتائی تو کرنل فنک نے کہا:

"مجھے پوری امید ہے کہ تم جاپانیوں کو ایسا سبق دو گے کہ انہیں زندگی بھر یاد رہے گا۔ جاؤ خدا تمہاری مدد کرے گا۔"

کیپٹن ویرمیتھ نے سیلوٹ کیا اور کرنل کے پاس سے آتے ہی اس نے جیکب کو طلب کیا اور اسے ہدایات دیں اور کہا: "جملہ انتظامات مکمل کر لو آج کا سبق جاپانیوں کے لئے نیا ہے۔"

جیکب ہنستا ہوا چلا گیا۔

شام ہوتے ہی کیپٹن ویرمیتھ اپنے آدمیوں کو لے کر جنگل کی طرف ہو لیا اور جنگل کی تاریکی میں کھو گیا!

جاپانی جنگل سے ہوتے ہوئے بید [illegible] میں جا کر چھپ رہتے تھے ان کا راستہ یوں کہ گھنے جنگل سے ہو کر جاتا لہذا [illegible] اس حرکت سے باز رکھنا اتحادیوں کے بس میں نہ تھا۔ راتوں پوزیشن لے کر جاپانی اتحادی لائن پر باڑھیں مارتے اور بم پھینکتے اور پورے غور و فکر کے بعد کیپٹن ویرمیتھ نے آگ لگانے

والے تاریک کا جال کھیت میں پھیلایا۔ ایک طرف خلا ریک اور اس کا رخ جنگل کی جانب کھلی جگہ کی طرف تھا جس کے ارد گرد پیڑوں کی آڑ میں کیپٹن نے اپنے سپاہی چھپا دیئے جن کے پاس مشین گنیں تھیں تاکہ جاپانی جب گھبرا کر بھاگیں تو انہیں بھاگنے نہ دیا جائے۔ اس طرح فرار کے راستے بند کر کے کیپٹن نے اپنی پوزیشن لی اور جاپانیوں کا انتظار کرنے لگا ایک دستہ اس نے جنگل کے ایک گوشے میں کمک کے طور آزاد رکھا تاکہ بوقت ضرورت اسے استعمال کیا جا سکے۔ اب کیپٹن مطمئن تھا۔

قریب دو گھنٹے بعد جاپانیوں کی آمد شروع ہوئی بڑے جوش و خروش سے جاپانی سیدھے کھیت میں گھس رہے تھے جاپانیوں کو گمان بھی نہ تھا کہ باٹان کا بھوت ان کا منتظر ہے اور یہ کہ انہیں جال میں پھانسنے کے لئے مکمل کارروائی ہو چکی ہے۔ جاپانی بے خبر تھے کہ وہ موت کے جنگل میں پھنس چکے ہیں۔ آخر طویل انتظار ختم ہوا اور جاپانیوں نے پچھلی شب اپنے اسلحہ فٹ کرنے شروع کر دیئے۔ وہ تیاری کر رہے تھے کہ صبح ہوتے ہی اتحادی مورچے کو بھون کر رکھ دیں آج وہ بھاری اسلحہ بھی ساتھ لائے تھے لیکن انہیں کیا خبر تھی وہ سب اپنی قبروں میں پہنچ چکے ہیں۔ وہ اتحادیوں کو بھوننے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ اچانک سگنل ہوا اور سگنل ہوتے ہی کھیت کے ایک گوشے میں آگ کا شعلہ بھڑکا۔ جاپانی ابھی کچھ سمجھ نہیں پائے تھے کہ دوسرے پھر تیسرے گوشے سے شعلے بھڑکنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے تین سمتوں نے آگ اگلنی شروع کر دی۔ یہ آگ کیسی تھی اور کیا چاہتی تھی جاپانی سمجھ نہ سکے بلکہ گھبرا کر پیچھے ہٹے یہ سوچ کر فرار کا راستہ شعلوں کی لپیٹ میں نہ آئے انہوں نے بدنظمی سے بھاگنا اور کھیت سے نکل جانا چاہا لیکن ٹھیک اس وقت تین طرف سے بیک وقت باڑھیں ماری جانے لگیں۔ جاپانی نکل جانا چاہتے تو مشین گنیں انہیں بھوننے لگتیں یہ دیکھ کر وہ پھر جلتے ہوئے کھیت کی طرف پلٹتے ادھر بڑھتی آگ کے شعلے انہیں چاٹنے کے لئے منہ پھیلاتے۔ اب جاپانیوں نے موت کو سامنے ناچتے دیکھا تب ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ باٹان کے بھوت کے شکنجے میں پھنس چکے ہیں اور اس احساس نے ان کو اور گھبرا دیا ساری فضا آگ دھوئیں تپش اور جاپانیوں کی چیخ و پکار سے معمور ہو چکی تھی۔ جاپانیوں نے شعلوں کو چیر کر نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن آگ کے دریا کو کون عبور کر سکتا ہے؟ جنگل میں منگل منایا جا رہا تھا اور کیپٹن ویر میتھ چلا چلا کر کہہ رہا تھا "شاباش بہادرو ایک بھی دشمن بچ کر نکلنے نہ پائے"۔

قریب دو گھنٹے تک یہ خونی کھیل ہوتا رہا اور جب جاپانیوں کا صفایا ہو گیا تب گنتی شروع ہوئی پورے ساڑھے تین سو جاپانی آگ اور گولیوں کا شکار ہو چکے تھے اور پچاس جاپانی مردہ حالت میں گرفتار ہوئے کیپٹن ویر میتھ جب فاتحانہ انداز سے واپس ہوا تو اس کا استقبال جیتے جاگتے نعروں سے ہوا۔

اس حادثے نے جاپانیوں کو از حد ناراض کر دیا اور وہ باٹان کے بھوت کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے اس لئے کہ محض ایک واحد آدمی نے ان کو جتنے گہرے زخم لگائے تھے وہ اب تک پوری فوج بھی انہیں نقصان نہیں پہنچا سکی تھی لہٰذا جاپانیوں نے تابڑ توڑ کوشش شروع کی کہ وہ کیپٹن ویر میتھ کو یا تو ہلاک کر دیں یا قید کر دیں انہیں تعجب یہ تھا کہ باٹان کا بھوت بنا کس دھات سے ہے!؟ اس لئے کہ متعدد موقعوں پر یہ ثابت ہو چکا تھا کہ باٹان کے بھوت پر نہ تو گولی ہی اثر کرتی ہے اور نہ ہی سنگین۔ جب اس نے ٹالگنان کو جلایا تھا تب وہ گولیوں کی بوچھاڑ سے کھیلتا کودتا اور ہنستا ہوا صاف نکل گیا تھا۔

جلد ہی جاپانیوں کو یقین ہو گیا کہ پوری امریکی فوج کو ہلاک کیا جا سکتا ہے لیکن گزند نہیں پہنچایا جا سکتا تھا تو باٹان کے بھوت کو

آخر تھک ہار کر جاپانیوں نے طے کیا کہ اتحادی مورچے کو اپنی موجودہ پوزیشن سے اکھاڑ پھینکنا چاہیئے اس لئے کہ ان کی یہ پوزیشن اب جاپانی پیش قدمی کے لئے منحوس ثابت ہو چکی تھی۔ لہٰذا بڑی تیاریوں کے بعد انہوں نے اتحادی مورچہ پر حملہ کیا اور کرنل فنک نے کافی مقابلے کے بعد پیچھے ہٹ کر مورچہ بنا لینے کا حکم دیا۔

نیا اتحادی مورچہ بمقام "ماریولیس" قائم کر دیا گیا تھا جہاں "پی لار" اور "باگاک" اہم دفاعی لائن کے مقام تھے۔ اس نئے اتحادی مورچہ کے قیام کے ساتھ ہی کیپٹن ویر میتھ کو مشاورتی

مرکز کا انچارج بنا دیا گیا۔

کیپٹن کو مشاہداتی سنٹر گھنے جنگل اور دھان کے کھیتوں میں قائم کرنا تھا۔

۱۹ جنوری کو کیپٹن ویر میتھ نے پیش قدمی کی اور گھنے جنگل کی تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

کیپٹن ویر میتھ کو اپنے اس مشکل کام کی اہمیت کا احساس تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جنگل جتنا گھنا ہے اس قدر خطرناک اس لئے اور بھی ہے کیوں کہ جاپانی پہلے سے جنگل میں بکھر چکے ہیں اور مشاہداتی سنٹر قائم کر چکے ہیں اس الجھی ہوئی مبہم اور خطرناک جگہ میں جاپانیوں سے مورچہ لینا موت کو دعوت دینا تھا لیکن اس کے باوجود کیپٹن ویر میتھ کیڑوں کی طرح رینگ کر اپنے چھاپہ ماروں کو لے کر جنگل میں داخل ہوا اور کیڑوں کی طرح رینگ کر اپنے سپاہیوں کو ادھر ادھر بکھیر دیا۔ اور اسی وقت سے اپنے وقت کا خون ریز معرکہ شروع ہو گیا۔ آغاز اتفاق سے کیپٹن ہی سے ہوا۔ جنگل میں ابھی داخل ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ہلکی سرسراہٹ نے کیپٹن کو چونکا دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پٹھان کے بھوت کو دہشت کا احساس ہوا۔ جنگل کی تاریکی میں یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ دشمن ہے یا اژدھا! یہی وجہ تھی کہ کیپٹن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن جو مورچہ ہوا اس دوہری تاریکی میں وہ ایک جاپانی کے قتل پر ختم ہوا۔ کیپٹن کو اس حادثے سے علم ہوا کہ جاپانی جنگل کے چپے چپے پر چھائے ہوئے ہیں جنگل کی لڑائی شبانہ روز تین روز جاری رہی۔ تب جا کر کیپٹن نے جنگل پر مکمل کنٹرول حاصل کیا۔ اس خونریز معرکے میں قریب دو سو جاپانی ہلاک ہوئے جب کہ کیپٹن کا کوئی آدمی ہلاک نہ ہوا البتہ متعدد زخمی ضرور ہوئے یہ کامیابی خلاف توقع ہی نہیں بلکہ عظیم بھی تھی۔

جنگل پر قبضہ اگرچہ اتحادیوں کا ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود جاپانیوں کی یلغار برابر جاری تھی یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ جاپانی جنگل کی اہمیت کو بری طرح محسوس کر رہے تھے اور جنگل پر قبضہ کے لئے بے چین تھے۔

جاپانیوں کو بڑی سہولت یہ تھی کہ ان کے پاس آدمیوں کی کمی نہ تھی یہی وجہ تھی کہ جاپانی کمانڈر ایک کی جگہ پانچ سپاہی بھیج رہا تھا جب کہ اتحادیوں کی بڑی مجبوری یہ تھی کہ ان کو کمک کی قطعی امید نہ تھی۔ ان حالات میں جاپانیوں سے ٹکر لینا ایک عجیب کارنامہ تھا!

۱۸ فروری کو جاپانیوں نے خونریز معرکے کا بگل بجا دیا اور اس چشمے پر قبضہ کرنا چاہا جو قدرے کھلی جگہ پر بہہ رہا تھا۔ کیپٹن ویر میتھ کے لئے جاپانیوں کا یہ اقدام انتہائی خطرناک ثابت ہوا۔ جاپانیوں نے بھرپور حملہ کیا اور چشمے تک پہنچ گئے اس حملے کے لئے وہ بھاری اسلحہ بھی لے آئے تھے جب کہ کیپٹن کے آدمیوں کے پاس چھوٹے اسلحہ تھے جن سے جاپانیوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن چشمے پر اگر جاپانیوں کا قبضہ برقرار رہا تب کیپٹن اور اس کے آدمیوں کی موت یقینی تھی۔ کیپٹن نے اس خطرناک پوزیشن کو بھانپ لیا تھا۔ اس کے علاوہ اتحادیوں کے لئے بھی یہ قبضہ خطرناک انجام کا حامل تھا۔ مجبور ہو کر کیپٹن نے اپنے آدمیوں کو جمع کیا اور اپنے چھوٹے اسلحے سے مل کر چشمے کی طرف یلغار کا پروگرام بنایا۔ جاپانی محفوظ پوزیشن میں تھے ان کے پاس مشین گنیں بھی تھیں جن سے وہ آگ اگل رہے تھے لیکن اس آگ میں کودنا لازمی تھا آخر کیپٹن نے مارچ کا حکم دیا اور چشمہ پر جاپانی پوزیشن پر حملہ کر دیا۔ جم کر خونریز جنگ ہوئی یہاں تک کہ چشمے میں پانی کی جگہ خون بہنے لگا کئی گھنٹوں کی دوبدو لڑائی کے بعد ایک جاپانی گولی نے کیپٹن ویر میتھ کو ڈھیر کر دیا لیکن گرتے گرتے اس نے حکم دیا۔

"حملہ جاری رہے جب تک کہ موت نہ آ جائے"۔

پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال میں تھا۔ ہوش آتے ہی کیپٹن نے چشمے کی جنگ کے متعلق سوال کیا۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ ابھی تک جاپانیوں سے خونریز لڑائی جاری ہے تب اسے سکون ہوا حالانکہ گولی بائیں پھیپھڑے کو زخمی کر چکی تھی۔

یہ وہ خون ریز لڑائی تھی جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ آخر مجبور ہو کر ۵ اپریل کو جب اتحادی کرنل نے پسپائی کا حکم دیا تو کیپٹن ویر میتھ انتہائی اداس اور مغموم تھا!

نیا مورچہ سومٹ پہاڑ کے درمیان قائم ہوا لیکن جاپانی قبضہ

کیستر دئے اور اتحادیوں کو مبلتے ہوئے نئے مورچے تک پہنچ گئے اور ایک خونریز جنگ کے محرک بن گئے ۔ اس جنگ میں باٹان کا بھوت دوران لڑائی زخمی ہوا اور پہاڑی سے پھسل گیا اور پہلی بار جاپانیوں کی مراد برآئی اور وہ گرفتار ہوگیا ۔!

جاپانی بھوت کو اپنے مورچے میں لے گئے۔ جاپانی ڈاکٹر نے اس کا علاج کیا اور جب کیپٹن ویر میتھ کو ہوش آیا تو جاپانیوں کی باچھیں کھل گئیں ۔ ایک جاپانی آفیسر نے پوچھا: " تمہارا نام ؟" کیپٹن ویر میتھ نے پھر آنکھیں موند لیں اور ڈاکٹر پھر پریشان ہوگیا ۔ اور جب دوبارہ ہوش آیا تو پھر وہی سوال دہرایا گیا ۔

کیپٹن ویر میتھ ان کا سوال سمجھ چکا تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ میرا نام کیوں پوچھا جا رہا ہے ؟ کیا یہ لوگ میرے نام سے واقف نہیں ؟ اچانک تند و ترش آواز بلند ہوئی اور کیپٹن سے اس بار سختی سے پوچھا گیا: "نام بتاؤ ؟"

آواز کی سختی نے کیپٹن کو اس آدمی کی طرف متوجہ کیا جو سوال کر رہا تھا ۔ چینی صورت چوڑی آنکھیں اور سرخ چہرہ اس کے سامنے تھا ۔۔۔ تب کیپٹن نے آہستہ سے جواب دیا ۔ " ویر میتھ "

" رینک ۔۔۔ ؟" دوسرا سوال تھا ۔

اور کیپٹن کا دماغ پھر الجھ گیا ۔۔۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ہوا کیا ہے اور یہ کہ وہ ہے کہاں ؟ اور تب اسے ۔۔۔ دریا کے کنارے ایک چشمہ کے ارد گرد کی خونریز لڑائی یاد آئی پھر اسے یاد آیا کہ وہ زخمی ہو کر پہاڑی سے پھسلا تھا ۔

کیپٹن ویر میتھ کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اب جاپانی قید میں ہے !

جاپانی قید میں وہ بھیانک آدمی تھا جس نے تن تنہا جاپانیوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے جس کی غیر معمولی شجاعت نے جاپانیوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا اور جس کے نام سے جاپانی لرزہ براندام ہو جاتے تھے جس نے صرف اپنے ہاتھوں سے قریب دو سو جاپانی سپاہیوں کو ہلاک کیا تھا ۔۔۔ وہی بھیانک آدمی آج جاپانیوں کا قیدی تھا ۔ وہ فکر مند تھا اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ جاپانی جنگی قیدیوں سے بدسلوکی کرتے ہیں اور ایذا دیتے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود کیپٹن ویر میتھ نے طے کر لیا تھا کہ وہ دشمن کو کوئی مفید کار آمد اطلاع کسی قیمت پر نہیں دے گا ۔

جلد ہی کیپٹن ویر میتھ کو ایک ٹرک پر لاد کر منیلا جیل پہنچا دیا گیا اور وہاں سے " کابانوٹان " جہاں جاپانیوں نے جنگی قیدیوں کا کیمپ قائم کر رکھا تھا اور جنگی قیدیوں سے سخت بیگار لیا کرتے تھے ۔ اس کیمپ میں کیپٹن کو پانچسو امریکی قیدیوں کا انچارج بنا دیا گیا ۔ لیکن کچھ عرصہ بعد کیپٹن کو وہاں سے ہٹا کر دوسرے جبری کیمپ بھیج دیا گیا ۔ یہ جبری کیمپ ان معنوں میں کیپٹن کے لئے بہتر تھا کیوں کہ یہاں غذائی حالت بہتر تھی نیز کیمپ کا انچارج رحم دل تھا لیکن یہ آسانیاں اسی وقت ختم ہوگئیں جب انچارج تبدیل کر دیا گیا اور نیا انچارج آیا جو طاقت و سختی کا قائل تھا اور ہنٹر سے ہمہ وقت کام لینا اسے مرغوب تھا ۔ بات بات پر اس کا ہنٹر چلتا اور معمولی غلطی پر اندوہناک سزا دیتا ۔ اسی صورتحال نے کیپٹن کو متوحش کر دیا ۔! اور اس نے ایک دن اعلان کر دیا کہ جنگی قیدیوں سے اگر زراعتی کام لینا ہے اور زیادہ سے زیادہ چاول کی کاشت درکار ہے تب ہنٹر کو علیحدہ رکھو ورنہ قطعی کام نہیں ہو سکے گا ۔

یہ سنتے ہی ظالم جاپانی آفیسر برافروختہ ہوگیا اور ویر میتھ کو لال آنکھوں سے گھورا اور کہا: " ناممکن "

" تب چاول کی کاشت بھی ممکن نہ ہو سکے گی " کیپٹن ویر میتھ نے نتائج سے لاپرواہ ہوتے ہوئے کہا ۔ یہ سنتے ہی ہنٹر مشغول ہو گیا اور کیپٹن کی پیٹھ چند ہی سیکنڈ میں لہولہان ہوگئی !

کیپٹن ویر میتھ دانت پیستے ہوئے ظالم جاپانی آفیسر سے گتھ گیا لیکن دو جاپانی سپاہیوں نے اسے علیحدہ کر دیا اور ہنٹر پھر اس پر چلنے لگا ۔ دوسرے لمحے کیپٹن ویر میتھ بے ہوش ہو گیا لیکن ہنٹر پھر بھی نہ رکا ۔۔۔ کیپٹن ویر میتھ بری طرح زخمی ہو چکا تھا ۔!

سال گزر گئے ۔۔۔ !

بالآخر ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی اکا دکا خبریں قیدیوں کے کیمپ تک پہنچنے لگیں ۔

یہ وہ دن تھے جب امریکہ جنوبی پیسیفک سمندر میں جاپانیوں کی شہ رگ پر حملہ کرنے کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا ۔ اور امریکی بحری بیڑہ جزائر سالومن، بیوگانسا، رابل، اور گام کی جانب جھپٹ پڑا اور اکتوبر میں فضائی فوج نے ٹوکیو کو اپنا نشانہ بنایا ۔ !

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو اچانک کیپٹن ویرمیتھ اور اس کے ساتھیوں کو کھیتوں سے ہٹا کر جاپانیوں نے "بیلی بڈ" جیل پہنچا دیا اور کوٹھڑیوں میں محبوس کر دیا۔ کیپٹن کے ساتھ دوسرے جنگی قیدی جو جیل میں ٹھونسے گئے ان کی تعداد ایک ہزار چھ سو انیس تھی۔ جیل کی تنگ و تاریک زندگی انتہائی دردناک تھی۔ کھانا مفقود، پانی غائب، زندگی کی معمولی سے معمولی آسائش ناپید۔ بھوک اور غیر صحت مندانہ ماحول نے سب کو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر رکھ دیا تھا ۔ !

اللہ اللہ کر کے جیل کی زندگی ختم ہوئی اور جملہ قیدیوں کو جیل سے نکال کر ایک دقیانوسی فرانسٹر جہاز جس کا نام تھا "آدریکو مارو" پر پہنچا دیا گیا لیکن کھلی جگہ میں سانس لینا انہیں پھر بھی نصیب نہ ہوا ۔ اس لئے کہ عرشہ کے بجائے انہیں محبوس کیا جانا پسند کیا گیا۔ اور اس طرح جیل کی گھٹن، گرمی، تعفن برقرار رہا۔

بعد میں یہ قیدی جہاز "اولنگاپو" ہاربر پہنچا دیا گیا۔

اور وہیں ایک دن کیپٹن ویرمیتھ اور اس کے ساتھیوں کو امید کی پہلی کرن نظر آئی ۔۔ وہ خوشی سے چیخ اٹھے جب انہوں نے امریکی فضائی فوج کے بمباروں کو فضا میں غالب پایا ۔۔ جاپانی فضائی طاقت لاپتہ تھی اور طیارہ شکن توپوں کے بم باروں نے پرواہ نہیں کی اور نہ بمباروں کو من مانی کرنے سے روک ہی سکے۔

اتحادی بمباروں نے ہاربر میں شدید بمباری کی اور جاپانیوں کو شدید نقصانات پہنچائے۔ اور خوشی کے نعرے دہشت زدہ بےچیخوں میں بدل گئے جب ایک بم قیدی جہاز کے عرشہ پر پھٹا اور جہاز کا نصف حصہ پرخچے اڑ گیا ۔

فضائی حملے کے بعد جنگی قیدیوں کو اظہار خوشی کی سزا اس طرح ملی کہ انہیں جانوروں کی طرح ہانک دیا گیا اور ایک ٹینس کورٹ میں سب کو محبوس کر دیا گیا۔ چٹیل زمین پر جہاں کہیں ذرا سا بھی سایہ نہ تھا۔ تپتے ہوئے سورج میں کیپٹن ویرمیتھ اور اس کے ساتھی چنوں کی طرح بھن رہے تھے۔ یہاں نہ کھانا تھا اور نہ ان بدقسمتوں کے لئے پانی ۔ یہ پانچ دن ان سب کے لئے قیامت سے کم نہ تھے ۔ بیسوں پاگل ہو گئے اور پچاسوں مر گئے ۔ کیپٹن ویرمیتھ سب کی نگہداشت میں پھر بھی مصروف تھا ۔ لیکن وہ نہ کسی کو موت سے بچا سکتا تھا اور نہ پاگل ہونے سے ۔۔ ! ابھی ان کی مصیبت ختم نہیں ہوئی تھی چھٹے دن انہیں پھر ایک جہاز میں بھر لیا گیا اور جاپان کے سمندر میں جزیرہ "موجی" پہنچا دیا گیا ۔ یہ دوسری مصیبت تھی ۔ وہاں گرمی نے ستایا اور مارا تھا یہاں شدید سردی نے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہزار چھ سو انیس میں سے کل ایک سو دس قیدی جاپانی جزیرے تک صحیح سلامت پہنچ سکے تھے اور جواب سردی سے ٹھٹھر رہے تھے ۔ کیپٹن ویرمیتھ اب تک زندہ تھا وہ خود اپنی زندگی پر حیران و ششدر تھا اور نہیں جانتا تھا کہ ابھی اس کو اور کتنے دن زندہ رہنا تھا ۔ ! ؟

اپریل میں بقیہ قیدیوں کو مع کیپٹن ویرمیتھ کو "مکڈن" پہنچا دیا گیا جہاں چاول کے کھیت ہی کھیت تھے لیکن اب ان میں سے کسی میں اتنی سکت نہ تھی کہ کام کر سکے یہاں اگرچہ مارپیٹ نہ تھی لیکن ہر جاپانی کو دیکھ کر ان کا فرض تھا کہ خم ہوں اور سیلوٹ کریں ۔۔ اچانک ۱۵۔ اگست کو انہوں نے یہ افواہ سنی کہ جنگ ختم ہو گئی ! !"

کیپٹن ویرمیتھ کو بے چینی سے اس افواہ کی تصدیق مطلوب تھی۔

۱۷۔ اگست کو روسی سپاہی کیمپ میں داخل ہو گئے ۔۔ ان کے ہمراہ ایک امریکی جنرل بھی تھا جس نے کیمپ پہنچتے ہی کیپٹن ویرمیتھ اور اس کے ساتھیوں کو خاتمہ جنگ کی خوشخبری سنائی ۔۔ اور جن کوٹھڑیوں میں کیپٹن ویرمیتھ اور اس کے ساتھی اب تک قید کئے جاتے تھے روسی سپاہیوں نے جاپانیوں کو قید کر دیا تھا ۔ !

کیپٹن ویرمیتھ ۔۔ "باٹان کا بھوت" شادی مرگ تھا ! ۔۔ اور پہلی بار اسے اپنا گھر اور گھر والے یاد آئے اور وہ بھی بڑی شدت سے ! ۔۔

ترائیلے

(فرانسیسی شاعری کی ایک مقبول صنف)

انتقاماً

میسّر تو نہیں ہے شادمانی
مگر دل انتقاماً شادماں ہے

بہت پُردرد ہے میری کہانی
میسّر تو نہیں ہے شادمانی

نہیں مجھ پر کسی کی مہربانی
خدائی کیا خدا نامہرباں ہے

میسّر تو نہیں ہے شادمانی
مگر دل انتقاماً شادماں ہے

ایک سوال

آپ کی زندگی میں شادِ حزیں
کیا کوئی زندگی کی بات بھی ہے

زندگی کی تو کوئی بات نہیں
آپ کی زندگی میں شادِ حزیں

آپ ہی کہیے اس کھنڈر میں کہیں
کوئی ہنگامۂ حیات بھی ہے

آپ کی زندگی میں شادِ حزیں
کیا کوئی زندگی کی بات بھی ہے

کارنامہ

باایں سیاہ نصیبی باایں شکستہ دلی
جہانِ شب کو پیامِ سحر دیا ہم نے

غموں کے مارے ہوئے ہیں مگر ہے اک یہ خوشی
باایں سیاہ نصیبی باایں شکستہ دلی

نفس نفس کو تب و تاب آگہی بخشی
نظر نظر کو شعورِ نظر دیا ہم نے

باایں سیاہ نصیبی باایں شکستہ دلی
جہانِ شب کو پیامِ سحر دیا ہم نے

حرمت الاکرام

ظلمت و نور کا ہر خواب پگھل جاتا ہے
کبھی خاور کبھی مہتاب پگھل جاتا ہے

سرِ محراب لرزتی ہے کوئی شوخ کرن
کوئی سجدہ نہ محراب پگھل جاتا ہے

کون جانے کبھی شبنم نے یہ سوچا کہ نہیں
کیوں یہ ہر گوہرِ خوش آب پگھل جاتا ہے

بجھتے شعلوں میں کہاں اتنی حرارت باقی
خود ہی اکثر دلِ بیتاب پگھل جاتا ہے

چشمِ بے خواب کو دو کوئی جہانِ بے صبح
رات ڈھل جاتی ہے مہتاب پگھل جاتا ہے

ڈوبنا سیکھ لو پہلے تو بتاؤں تم کو
کس طرح وقت کا گرداب پگھل جاتا ہے؟

تپشِ فکر سے لرزاں ہوں کہ اکثر حرمت
فقط اک آنچ سے ہر خواب پگھل جاتا ہے

خورشید احمد جامی

شاخِ گل کہتے ہیں یا دشتِ وفا کہتے ہیں
زندگانی کو ترے شہر میں کیا کہتے ہیں

فکر و احساس کے جلتے ہوئے صحراؤں میں
یادِ محبوب کو ساون کی گھٹا کہتے ہیں

دار کو کوچۂ دلدار بنا لیتے ہیں
درد کو پیار کے موسم کی صدا کہتے ہیں

کوئی پوچھے تو شب و روز کے ویرانوں سے
کتنے افسانے یہ نقشِ کفِ پا کہتے ہیں

ہائے کیا پاسِ روایت ہے کہ تیری خاطر
اپنے ہر زخم کو پیمانِ وفا کہتے ہیں

سوچتا ہوں کہ مرے غم کو سمجھنے والے
میری غزلوں میں تجھے دیکھ کے کیا کہتے ہیں

غم زمانے میں نیا بھی تو نہیں ہے لیکن
غم کے اسلوب کو کچھ لوگ نیا کہتے ہیں

اپنے دیکھے ہوئے ہر خوابِ سحر کو جامی
ہم بھٹکتی ہوئی صدیوں کی دعا کہتے ہیں

قمر اقبال

کچھ نہ کچھ میرے تعلق سے کہا ہی ہوگا
وہ ملا تھا تو مرا ذکر کیا ہی ہوگا

وہ جو مل جائے تو لگ جاتے ہیں پھر وقت کو پر
اُس سے مل کر تو یہ احساس ہوا ہی ہوگا

اپنی منظوم کہانی نہ کبھی ہم نے کہاں
وہ کسی بزم میں موجود رہا ہی ہوگا

ذکر پر سرخئ خوں کے نہ خفا ہو ہم سے
خیرہ آنکھوں میں مرے رنگ حنا ہی ہوگا

جس نے چوما ہے تجھے نکہتِ گل ہی ہوگی
جس نے چھیڑا ہے تجھے دستِ صبا ہی ہوگا

لوگ مجھ کو قمر اقبال کہا کرتے ہیں
نام تم نے بھی کہیں تو یہ سنا ہی ہوگا

صلاح الدین نیّر

کب تک مرے لہجے کے تاثر سے بچو گے
تم خود بھی کسی دن مری آواز بنو گے

یوں درد کی مانند مرے دل میں رہو گے
لیکن مرے احساس کو تم چھو نہ سکو گے

اتنا دلِ ناشاد سے تم پیار کرو گے
آنکھیں تو کھلی ہوں گی مگر چونک پڑو گے

مانا دلِ نازک پہ ہر ایک بات گراں ہے
لیکن مری باتوں کو کبھی یاد کرو گے

ہر پہلا قدم ابھرے گا منزل کی طرح سے
جس راہ سے بھی تم مرے ہمراہ چلو گے

جو بھی دمِ رخصت تمہیں کہنا ہے کہے جاؤ
جذبات کو کب تک نظر انداز کرو گے

نیّر سے اگر وقت تمہیں دور بھی کر دے
جب تک مرا احساس ہے تم ساتھ رہو گے

حزیں لدھیانوی

وقت کی رو میں یوں بہتا ہے اک آشفتہ شاعر
جیسے تیز ہوا میں بھٹکے کوئی ننھا طائر

دوست اچٹتی ٹیڑھی ترچھی نظریں ڈال رہے ہیں
میں بھی ان کو دیکھ رہا ہوں آج بچشمِ غائر

میری آنکھ میں غم کے آنسو میری راہ میں ظلمت
میں آکاش کا ٹوٹا تارا، میں انوار کا زائر

زیست بنا لے گی خود ان کو روشنیوں کے ہالے
زلفوں والو! بنتے جاؤ غم کے لاکھ دوائر

میں دیوانۂ گیسوئے ہستی جس جانب سے گزرا
کوئی پکارا انساں انساں، کوئی شاعر شاعر

کیوں نہ حزیں پھر چاروں جانب پھیلیں گھور اندھیرے
چہروں پر ہے جگمگ جگمگ اور تاریک ضمائر

نقی علی خاں ثاقب

فضائے صبحِ بہاراں کسی کو راس نہیں
مسرتوں سے ابھی کوئی روشناس نہیں

کسے خبر کہ چرا لی ہے کن اندھیروں نے
وہ روشنی جو شبِ غم کے آس پاس نہیں

تمہارے شہر میں پھرتا ہوں اجنبی کی طرح
تمہارے شہر میں کوئی وفا شناس نہیں

غموں کی شاخ پہ کھلتے ہیں پھول یادوں کے
تمہارے ہجر کا موسم ابھی اداس نہیں

فروغِ مستیِ صہبا کا ہوش باقی ہے
شعورِ تلخیِ ایام بدحواس نہیں

نہ انتظار، نہ آنسو، نہ خود فریبیِ دل
بہت اداس ہوں جب سے بہت اداس نہیں

جو ہو سکے تو کبھی تم بھی غور کر لینا
سنا ہے زہرِ محبت کسی کو راس نہیں

دلِ حزیں میں کچھ ایسے بھی گیت ہیں ثاقب
کہ جن کے واسطے الفاظ کا لباس نہیں

مقبول قریشی

دوہے

میں متلاشی پریت نگر کا جرس ہے تیرا گاؤں
میری راہ میں تند بگولے تیری راہ میں چھاؤں

میں نے جنوں کی تپتی لو میں درد کے پتھر ڈھوئے
تو سپنوں کی سیج پہ مور کھ لمبی تان کے سوئے

تیرے کارن میں نے جگ سے رشتے ناطے جوڑے
تو ہی مجھ کو دیکھ کے پیارے چاند سا مکھڑا موڑے

نین لہو اگلیں اور تو اس پار کھڑا مسکائے
اس دھرتی پر اس سے بڑا اب کیا ہو گا انیائے

دشتِ ہوس میں پھول سا چہرہ جب بھی ذرا سنولائے
بہتر ہے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے

ضیا انصاری

رنگ برنگے پھول کھلے تھے ڈالی ڈالی گلشن میں
جانے کن یادوں نے آکر آگ لگا دی تن من میں

گہری نیند میں سوئے تھے ہم خوابوں کی چادر تانے
بھور بھئے جب آنکھ کھلی تو پھول کھلے تھے آنگن میں

وحشی بادل رات گئے چنگھاڑ رہے ہیں رہ رہ کر
خوفزدہ سی اک پرچھائیں کانپ رہی ہے چلمن میں

وجہِ سکونِ دل تھی یارو! جس کی تلخ مزاجی بھی
آج اسی کی ہمدردی نے ڈال دیا ہے الجھن میں

تیر رہا ہے جھیل کے اجلے پانی میں پونم کا چاند
دیکھ رہا ہو جیسے کوئی اپنا مکھڑا درپن میں

جیون پتھ پر کتنے ہی ہمراہی آئے اور گئے
سب سے پہلے رنگ بھرا ہے تو نے میرے جیون میں

کانوں میں رس گھول رہی ہے وہ مدماتی آواز ضیاء
اک جانا پہچانا چہرہ ڈول رہا ہے انکھین میں

پہچانے ہیں مجھ کو نہ کوئی بات ہوئی ہے
اپنوں سے بھی یوں میری ملاقات ہوئی ہے

معلوم نہیں یاد ہے یا بھول گئے ہو
پہلے بھی کبھی ہم سے ملاقات ہوئی ہے

وہ بات جسے ہم نے زمانے سے چھپایا
عنوانِ فسانوں کا وہی بات ہوئی ہے

غنچوں پہ شباب اور نہ پھولوں پہ جوانی
اللہ یہ کس رنگ کی برسات ہوئی ہے

رکھتے ہیں سرورؔ آپ بھی دنیا سے امیدیں
دنیا سے وفا کی کہیں کچھ بات ہوئی ہے

شاہد کبیر

آئینہ

تو اک آئینہ ہے
وہ آئینہ جس نے
مری زندگی کو نگاہوں کا مرکز بنایا
مری ہر ادا میرے ہر روپ سے اپنا پیکر سجایا

یہ پیکر
یہ میری مرادوں کی دنیا
کہ ہر عکس جس کا حسیں ہے
مگر عکس پھر عکس ہی ہے
حقیقت نہیں ہے۔

ظہیر قادری

یا اب آئینِ محبت کا وہ دستور نہیں
یا کہیں دار نہیں یا کوئی منصور نہیں

فاش ہو رازِ محبت ہمیں منظور نہیں
ورنہ یہ ہاتھ گریباں سے تو کچھ دور نہیں

کیوں سمجھ لوں کہ مجھے حشر میں مل جائیں گے آپ
میں کوئی شیخ نہیں آپ کوئی حور نہیں

ہائے وہ یاد جو سینے میں سلگتی ہے ابھی
ہائے وہ درد کہ درماں جسے منظور نہیں

ہے ہر اک قطرۂ خوں شاہد دعویٰ انا
کون کہتا ہے کہ اب دار ہے منصور نہیں

ذکی انور

گناہ

شبنم کے اس پہلے قطرے نے جو غلطی سے دھتورے کے ایک پھول کی پتی پہ آگرا تھا آنکھیں مل مل کر دیر تک گرد و پیش پر نظریں دوڑاتا رہا۔ بہت ہی گھبرایا ہوا۔ اکتایا ہوا۔ پچھتایا ہوا اور پریشان پریشان سا۔

"میں کہاں ہوں؟"

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ لیکن صبح کی خنک اور معطر ہوا جو سب کے دل کا حال جانتی ہے ہنس کر بولی۔

"تم ایک واہیات سے پھول کی پتی پر پڑے ہو جب کہ تمہارے اور ساتھی دوسرے خوب صورت اور خوشبودار پھولوں کی نرم و نازک اور کنواری پتیوں سے لپٹے پڑے ہیں۔"

"مجھے اس کی فکر نہیں کہ میں کیسے پھول کی پتی پر ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں کہاں ہوں؟"

شبنم کے قطرے نے کہا۔ "یقیناً اب میں فرشتوں کی دنیا میں نہیں۔"

"ہاں۔" ہوا بولی۔ "یہ فرشتوں کی دنیا نہیں ہے۔"

"پھر؟" شبنم کا قطرہ ہوا کا منہ تکنے لگا اور ہوا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ انسانوں کی دنیا ہے۔"

"یہ انسان کیا ہوتا ہے؟" شبنم کے قطرے نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں اس سوال کا جواب اس وقت تک نہ دوں گی" ہوا بولی۔ "جب تک تم میرے ایک سوال کا جواب نہ دو گے۔"

"پوچھو۔" شبنم کا قطرہ ہوا کے سوال کا انتظار کرنے لگا۔

ہوا نے پوچھا۔

"دنیا فرشتوں کی ہو، انسانوں کی یا پھر شیطانوں کی۔ یہ بتاؤ ان ساری دنیاؤں کی سب سے بڑی طاقت کون سی ہے؟"

"ساری دنیا کا خالق" شبنم کے قطرے نے کہا۔ "خدا۔ سب"

انسان کے جسم میں تو ایک سے ایک زہر بھرا ہے۔ جوں جوں انسان مہذب ہوتا جا رہا ہے اس کی رگوں میں خون کم ہوتا جا رہا ہے اور زہر زیادہ مثلاً نفرت کا زہر، بغاوت کا زہر، دشمنی کا زہر، جنس کا زہر، اور نہ جانے کون کون سے زہر۔

بڑی طاقت — سب سے بڑی ہستی ؟ شبنم کے قطرے نے عقیدت کے ساتھ سر جھکالیا۔

" اور تم انسان کے بارے میں جاننا چاہتے ہو ؟ ہوا از رہِ مسخری: میرے دوست، اُس سب سے بڑی طاقت کی دریافت کرنے والے کو ہی انسان کہتے ہیں۔

شبنم کا وہ قطرہ کچھ اس انداز سے ہوا کا منہ تکنے لگا جیسے اس نے کوئی حد سے زیادہ عجیب و غریب بات کہہ دی ہو۔

" یہ حقیقت ہے میرے دوست " ہوا نے اپنے بیان کو اور بھی زور دار بناتے ہوئے کہا۔ " اور اس حقیقت سے میں آشنا ہوں کیوں کہ میں خدا کی سب سے پہلی مخلوق ہوں "

" میں چاہتا ہوں کہ اس عظیم ہستی کو سجدہ کروں " شبنم کا قطرہ کچھ اس انداز سے بولا جیسے اس کی روح کا گوشہ گوشہ منوّر ہوگیا ہو —

" ہاں میں انسان کو سجدہ کروں گا "

" بسم اللہ —" ہوا بولی

لیکن شبنم کا قطرہ جیسے ہی جھکا، وہ دھتورے کے پھول کی پتی پر سے لڑھک کر زمین پر آگرا اور گرتے ہی سوکھی زمین میں جذب ہوگیا۔
ہوا نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی اور پھر آہیں بھرتی ہوئی گزر گئی —

دھتورے کے پھول کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوگیا

ناگ پھنی نے پوچھا —

" کیا بات ہے پھولے نہیں سمارہے ہو "

" تم تو کانٹے ہو " دھتورے کے پھول نے کہا۔

" تمہیں کیا خبر اس دنیا میں کیا کیا گل کھلا کرتے ہیں "

" ناگ پھنی نے سینہ تان کر کہا۔

" کانٹوں کی بھی رگوں میں ہے خون سبزہ زار کا — پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا "

" درست ہے " دھتورے کا پھول بولا — " تو پھر سنو — ابھی ابھی ہوا نے شبنم کے اس پہلے قطرے کی جان لے لی جس نے ابھی دنیا دیکھی تک نہیں تھی

" ہاں " ناگ پھنی بولا — " میں نے ایک زوردار دھماکہ تو سنا تھا۔ یقیناً یہ آواز اس قطرے کے گرنے کی ہوگی .... خیر چھوڑو ان باتوں کو شبنم کے اس قطرے کو مرنا ہی تھا، ہوا سے بچ جاتا تو سورج کی کرنیں برچھی گھونپ دیتیں.... یہ بتاؤ رات کو اس جوڑے کا کیا بنا ؟ "

" کس جوڑے کا ؟ " دھتورے کے پھول نے پوچھا

" رات تو کئی جوڑے آئے تھے "

" ارے بھئی وہی جنہیں اپنے کانٹے چبھو چبھو کر تم نے پاس سے بھگا دیا تھا حالانکہ وہ تمہاری پناہ میں آئے تھے " ناگ پھنی بولا — " ٹیریلین کی ساڑھی والی عورت جس کا سارا جسم لیونڈر کی خوشبو سے معطر تھا اور جس کے ساتھ گھونگھریلے بالوں والا ناٹے قد کا مرد تھا اور اس کی کلائی پر بہت ہی قیمتی گھڑی بندھی ہوئی تھی اور اس نے ..... "

" میں سمجھ گیا " دھتورے کا پھول ہنسا " میرے بستر ایک زہریلا کیڑا رہا کرتا تھا جو میرا رس چوسا کرتا تھا اس جوڑے کے چھو جانے سے میرا پودا ہلنے لگا اور وہ زہریلا کیڑا اس عورت کی ران پر جا گرا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ ہولے سے چیخی اور وہ دونوں ہی میرے پاس سے اٹھ کر بھاگ گئے۔ پھر کہاں گئے مجھے نہیں معلوم۔ وہ کیڑا کچھ اتنا زہریلا نہیں ہوتا کہ وہ عورت مرگئی ہوگی "

اور پھر انسان کے جسم میں تو ایک سے ایک زہر بھرا ہوا ہے " ناگ پھنی بولا۔ " ایک دن ایک حکیم کسی جڑی بوٹی کی تلاش میں میرے پاس آنکلا اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔ غالباً وہ اس کا بیٹا تھا۔ وہ حکیم ہم سب کا تعارف اپنے بیٹے سے کرا رہا تھا چنانچہ باتوں ہی باتوں میں زہر کی بات نکل آئی اور حکیم نے اپنے بیٹے سے کہا کہ جوں جوں انسان مہذب ہوتا جا رہا ہے اس کی رگوں میں خون کم ہوتا جا رہا ہے اور زہر زیادہ — پھر میاں دھتورے! وہ حکیم زہروں کے نام گنانے لگا۔ نفرت کا زہر، بغاوت کا زہر، دشمنی کا زہر، جنس کا زہر اور اب تو یاد نہیں اس نے اور کتنے زہروں کا نام لیا تھا.....
لیکن وہ جوڑا کہاں گیا، مجھے اس جوڑے کی اس عورت سے ہمدردی ہے "

" کیوں ؟ —" دھتورے کے پھول نے پوچھا "

" میں نے اس کے جسم میں بڑی بے دردی سے اپنے کانٹے چبھوئے تھے " ناگ پھنی ندامت کے ساتھ بولا — " اگر وہ مل جائے تو میں اس

سے معافی مانگتا ہوں۔ پتہ نہیں وہ کہاں گئے؟"

"میں جانتا ہوں ...... میں جانتا ہوں"

بٹوس کا ایک بہت بڑا اور پرانا درخت اپنی جھاڑی میں سے سر اٹھا کر چیخا۔ "میں جانتا ہوں۔ مجھ سے پوچھو۔"

"اوہ" ناگ پھنی ہنس پڑا۔ "تو دھتورے کے پاس سے جانے کے بعد انہوں نے تمہارے آغوش میں پناہ لی تھی؟"

"ہاں میری آغوش میں" بٹوس نے کہا۔ "آدھی رات تک وہ ہماری جھاڑی میں گھسے رہے تھے۔ رات تو ہمارے ہاں بڑی گھما گھمی رہی۔ ان سے پہلے بھی ایک جوڑا آکر جا چکا تھا اور غالباً ان کے بعد بھی، لیکن اس وقت تک مجھے نیند آچکی تھی۔"

"میں ایسی گھما گھمی پسند نہیں کرتا۔" ناگ پھنی بولا۔ "اس میں اپنا کیا فائدہ ہے۔ نہ کچھ لینا نہ دینا اور خواہ مخواہ گناہ میں کوئی کیوں شریک ہو۔"

"یار تم بڑی دقیانوسی باتیں کرتے ہو۔" بوڑھے بٹوس نے اپنی بزرگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"عورت اور مرد کا تعلق تو فطرت کا تقاضہ ہے۔ پھر گناہ کا ہے کا؟ — یہ بات رات وہی عورت اپنے ساتھ کے مرد سے کہہ رہی تھی۔"

"کون عورت؟" ناگ پھنی نے پوچھا

"وہی نیلے ٹرالین کی ساڑھی والی عورت۔"

بوڑھے بٹوس نے کہا۔ "لیکن میں تمہیں، تمہارے اس سوال کا جواب دینا چاہ رہا تھا کہ اس میں اپنا کیا فائدہ ہے؟"

"ہاں ہاں اپنا کیا فائدہ ہے۔" ناگ پھنی نے دہرایا۔ "کوئی فائدہ نہیں۔"

"میرے دوست۔" بوڑھے بٹوس نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔ "کاش تم ایسے بدذوق نہ ہوتے! میرے یار! ایسے ایسے مکالمے اور ایسی ایسی شاعری سننے کو ملتی ہے کہ دل باغ باغ ہو اٹھتا ہے۔ اور پھر یونڈر کی بھینی بھینی خوشبو سے نشہ سا چھا جاتا ہے اور میں تو جھوم جھوم اٹھتا ہوں اس کی خوشبو سے ... اور اگر تم ... ہاں اگر تم چل پھر سکتے تو میں تم سے درخواست کرتا کہ ذرا میرے پاس آؤ اور میری ڈالی میں اٹکا ہوا بہت ہی قیمتی تحفہ دیکھو جو وہ نیلے ٹرالین کی ساڑھی والی عورت مجھے دے گئی ہے۔" بوڑھا بٹوس قہقہے لگانے لگا اور جب اس کا قہقہہ ختم ہوا تو ناگ پھنی نے بڑی التجا سے کہا۔

"کیا ہے وہ تحفہ۔ میں چل پھر تو نہیں سکتا۔ تم سے کم مجھے بتلا تو دو۔"

"ہیرے کا ایک قیمتی جڑاؤ ایئر رنگ۔" بوڑھے بٹوس نے سینہ تان کر کہا۔ "جی ہاں! ہیرے کا۔"

"سچ؟" ناگ پھنی نے لپک کر کہا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بڑی اداسی سے کہا۔ "لیکن تم اس ایئر رنگ کا کیا کرو گے؟"

"ہاں۔" بوڑھا بٹوس کچھ سوچتا ہوا بولا۔

"اس سلسلے میں تو میں نے بھی کچھ نہیں سوچا ہے کہ اس قیمتی ایئر رنگ کا کروں گا کیا۔ میرا خیال ہے یہ ایئر رنگ اس بچی کے ہاتھ لگے گا۔"

"کس بچی کے؟" ناگ پھنی نے پوچھا۔

"ایک بڑی پیاری سی بھولی بھالی سی بچی ہے۔" بوڑھا بٹوس کہنے لگا۔ "وہ ہر روز صبح سویرے میری جھاڑیوں سے سوکھی لکڑیاں توڑنے آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی بھوکی پیاسی ہی آنکھیں ملتی ہوئی لکڑیاں توڑنے کے لئے نکل پڑتی ہے اور کبھی کبھی جب وہ میرے پھل توڑ توڑ کر کھانے لگتی ہے تو میں لرز اٹھتا ہوں کیوں کہ ہمارے پھلوں میں سے بعض زہریلے ہوتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" ناگ پھنی بولا۔ "ابھی تو دھتورے کو اس حکیم کا قصہ سنا رہا تھا تو کیا تم نے نہیں سنا تھا۔ اب انسان کے جسم میں زہر ہی زہر ہے اس پر کوئی زہر اثر نہیں کر سکتا۔"

"لیکن اس بھولی بھالی مفلس بچی کے جسم میں کوئی زہر نہیں اس کا مجھے یقین ہے۔" بوڑھے بٹوس نے پھر اپنی تجربہ کاری ظاہر کی۔ "میرا خیال ہے زہر یقیناً صرف ان انسانوں کے جسم میں ہوتا ہوگا جو مہذب ہیں جیسے رات کے جوڑے۔ اس بے چاری بچی کے جسم میں زہر نہیں صرف آگ ہوگی۔"

"آگ؟" ناگ پھنی نے حیرت سے پوچھا

"کیسی آگ؟"

"بھوک کی آگ۔" بوڑھے بٹوس نے جواب دیا

"جب ہی تو بڑے چاؤ سے میرے بدمزاج کھایا کرتی ہے اگر یہ ایرینگ اس لڑکی کے ہاتھ لگ جائے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

"ہاں بات تو بے شک خوشی کی ہے۔" ناگ پھنی نے کہا۔ "بے چاری غریب بچی۔"

"ہمیں دعا کرنی چاہئے۔" دھتورے کا پھول بولا۔

"تمہاری جھاڑی گناہوں کا اڈہ ہے۔" ناگ پھنی نے بڑی حقارت سے کہا۔ "میں تو کسی کو اپنے پاس ٹکنے نہیں دیتا۔"

"ہاں۔" بوڑھا ٹیوس شکست خوردہ آواز سے بولا۔ "مجھے سخت ملال ہے، کچھ لوگ تو خواہ مخواہ آجاتے ہیں... اب رات کے ہی اس جوڑے کے بارے میں سوچو، ہیرے کی ایرینگ پہننے والی عورت یقیناً کافی مالدار رہی ہوگی، وہ کہیں اور بھی جا سکتی تھی لیکن خواہ مخواہ ہمارے پاس آگئی۔"

"تمہاری جھاڑیوں میں اطمینان جو ہے۔" ناگ پھنی بولا۔ "کون آتا ہے اس دور افتادہ جنگل کی طرف۔"

اُسی وقت جعلی سکے کا کاروبار کرنے والوں کا ایک گروہ آتا ہوا نظر آیا اور وہ تینوں خاموش ہو گئے۔

گروہ کے تمام لوگ بدن چرا چرا کر ٹیوس کی جھاڑی میں اندر گھستے چلے گئے۔ اور جب بوڑھے ٹیوس نے دیکھا کہ ان میں سے کسی کی بھی نظر ٹیوس کی اس خشک ڈالی پر نہ پڑی جس میں ہیرے کا ایرینگ لٹکا ہوا تھا تو اس نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی اور خدا کے حضور میں اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

ایک خوش پوش مرد نے چائے کی میز پر بیٹھے ہوئے اپنی بہت ہی خوب صورت اور بنی سنوری بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ——— "تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"نہیں ——— آج میرا برت ہے۔" بیوی نے کچھ اس انداز سے اس کی طرف دیکھا جیسے وہ خدا کی طرف دیکھ رہی ہو، پیار، عقیدت، اور قربانی کا جذبہ اس کی آنکھوں سے صاف نمایاں تھا ——— "آج میں نے برت رکھا ہے۔"

"کیسا برت" مرد نے پوچھا

"تمہاری عمر درازی کے لئے۔" عقیدت سے اس کی نظریں جھک گئیں ———

"اوہ۔" مرد نے بڑے اکتائے ہوئے انداز سے کہا۔ "خدا کی پناہ / جب دیکھو برت جب سنو عبادت،... ماں... کیا تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے کبھی مرنے نہ دو گی؟"

"کبھی نہیں۔" وہ اس کی گردن میں جھول گئی۔ "کبھی نہیں میرے خدا، کبھی نہیں۔"

اور مرد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ لیکن وہ ابھی اسے آغوش میں نہیں لے سکا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

دوسری طرف مقامی تھانہ کا انچارج بول رہا تھا۔

"لو بھئی مبارک ہو۔" مرد فون کے چونگے پر ہتھیلی رکھ کر چیخا۔ "سنا تم نے تمہارا ایرینگ مل گیا ہے...."

"سچ؟" عورت لہک اٹھی، لیکن دوسرے ہی لمحے بجھ سی گئی اور مری ہوئی سی آواز سے اس نے پوچھا۔ "کہاں ملا؟"

اور تھانہ انچارج کہہ رہا تھا۔

"..... مسٹر تین دن تو کیا، میں تین برس اور تین یُگ تک بھی چور کی جان چھوڑنے والا نہیں کمینی چور لڑکی میں نے اسے مار مار کر بے ہوش کر دیا ہے.... چاہے اس کی جان چلی جائے... کوئی پرواہ نہیں لیکن میں اس کتیا سے اگلوا کر رہوں گا اس کا باپ چور ہے۔ ابھی تک تو یہ کمینی کہے جا رہی ہے کہ اس نے جنگل میں پایا تھا۔ لیکن اسے ذرا ہوش آئے تو میں اس کی ہتھیلی پر انگاروں کے ڈھیر لگا دوں گا، پھر دیکھتا ہوں کہ کیسے نہیں قبولتی کہ اسے ایرینگ کہاں سے ملا ہے.... آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ میں جہاں بھی رہا ہوں میں نے چن چن کر عادی مجرموں کو پکڑا ہے۔ یقین کیجئے کہ بہت جلد یہ علاقہ بھی جرائم سے پاک ہو جائے گا۔

حسن اجمل مسرت

بازگشت

اور اس رات جب چنو نے کہانی کے لئے ضد کی تو بی اماں نے آہستہ آہستہ وہ کہانی کہنا شروع کی جو بہت دنوں سے اُن کے ذہن میں پرورش پا رہی تھی۔

● بہو لاکھ بری سہی۔ لڑکا لاکھ لاپرواسہی۔ چنو ہر زیادتی اور لاپروائی کا مداوا بن گیا۔ اور جب بی اماں اسے چھاتی پر لٹا کر لوری دیتیں تو چنو کے معصوم وجود کی مہک انہیں اپنے سراپا میں جذب ہوتی محسوس ہوتی اور ہر دکھ پگھل جاتا۔ ہر زخم مندمل ہو جاتا۔

"ایک تھا مالی۔ اس نے بڑی محنت سے ایک پودا لگایا۔ اور اسے اپنے خون سے سینچ کر بڑا کیا۔ یہاں تک کہ وہ پودا ایک سایہ دار درخت ہو گیا۔ تب اس مالی نے ایک راہ گیر کو اس سایہ دار درخت کے نیچے پناہ دیدی۔ اور اس راہگیر نے ایک دن مالی کو اس کے سائے سے بھی محروم کر دیا......"

کہانی یہیں تک پہنچی تھی کہ شاکرہ کھانا چھوڑ کر اٹھی اور چنو کو بی اماں کی چھاتی سے گھسیٹ لیا۔

چنو مچلنے لگا "امی میں کہانی سنوں گا۔ دادی اماں کہانی"

"چولہے بھاڑ میں گئی کہانی۔" شاکرہ نے کہا۔ پھر اس طرح جیسے اسلم کو جتانا چاہتی ہو کہنے لگی "اب بچوں کی ذہنیت بھی خراب کی جانے لگی۔"

اور بی اماں کھسیا گئیں۔ انہوں نے بیچارگی سے اسلم کی طرف فریادی انداز میں دیکھا مگر وہ سر جھکائے کھانے میں مشغول رہا۔

"اے ہے دلہن۔ تو میں نے ایسی کونسی بات کہدی جو تمہیں بری لگ گئی"

"جی نہیں۔ آپ تو قصیدے پڑھ رہی تھیں میری شان میں۔ بی اماں میں کہتی ہوں کبھی شکوے شکایت سے جی بھی بھرے گا آپ کا؟"

"الہی توبہ۔ اب مری کہانی بھی شکوہ شکایت ہو گئی۔"

بی اماں نے دبی زبان سے بس اتنا کہا اور اپنے کھٹولے پر لیٹ کر پنکھیا ہلانے لگیں۔ ان کی چھاتی ابھی تک چنو کے لمس سے گرم تھی اور انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے شاکرہ نے چنو کو نہیں چھینا ان کی چھاتی کا گوشت نوچ لیا ہے۔ مگر اسلم نے سر اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ جیسے یہ کوئی بات ہی نہ تھی۔ اور بیٹے کی اس لاپرواہی کے احساس سے بی اماں کا جی بھر آیا اور آنکھیں چھلک پڑیں۔

اسلم بی اماں کی واحد اولاد تھا۔ میاں جوانی میں چل بسے تھے۔ اور اسلم کو انہوں نے درحقیقت اپنا خون پلا کر جوان کیا تھا۔ پھر ایک عمر کی ریاضت اور ایک جنم کی محرومی کے بعد جب اسلم کسی قابل ہو گیا اور بی اماں کے سُکھ کے دن واپس آنے کو ہوئے تو انہیں اسلم کا گھر بسانے کی دھن سوار ہو گئی۔ کئی اچھی لڑکیاں بھی نظر میں تھیں مگر بی اماں کو تو شاکرہ کا ارمان تھا۔

"اپنا پھر بھی اپنا ہے بہن۔" وہ اٹھنے بیٹھنے والیوں سے کہا کرتیں "شاکرہ بہن کی اولاد ہے۔ کچھ اور نہیں تو خالہ سمجھ کر دو روٹیاں دے دیگی۔"

مگر بی اماں دھوکہ کھا گئیں۔ ایک شاکرہ کیا کسی لڑکی کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کنواری لڑکی تو اس سانپ کی طرح ہوتی ہے جس کی پہلی کینچلی نہ اتری ہو۔ اور اس کا اصل رنگ مستور ہو۔ چنانچہ یہی شاکرہ جو پہلے ان کی جوتیاں سیدھی کرتے نہ تھکتی تھی گھونگھٹ اٹھتے ہی کچھ سے کچھ ہو گئی۔

زیور گہنا بی اماں پہلے ہی بہو پر چڑھا چکی تھیں ایک آم کا باغ تھا سو انہوں نے اسلم کے نام لکھ دیا تھا۔ اب ان کے تلے کچھ نہیں تھا۔ لے دے کے ایک مامتا تھی یا محبت۔ مگر شاکرہ نے جو قاعدہ پڑھا تھا اس میں شاید ان مقدس جذبات کے معنے نہیں سمجھائے گئے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے آہستہ آہستہ بی اماں کو گھر کے کارخانے سے بے دخل کر دیا۔

بی اماں چٹوری نہیں تھیں مگر بہو نے نعمت خانہ میں تالہ ڈال دیا۔ پان تمباکو سے چونکہ خود کو رغبت نہیں تھی اس لئے مہینہ کے مہینہ جب سودا سلف آتا تو اس میں چھالیہ کتھے کی کوئی مد نہ ہوتی اور بی اماں بیچاری ہفتوں دھنواں جیسا منہ باندھے پڑی رہتیں، حتیٰ کہ جب آم کی فصل پکی اور گھر میں ڈالیاں آنا شروع ہوئیں تب بھی بی اماں ٹکر ٹکر تکتی رہ گئیں۔ ٹوکرے بھر بھر کے آم شاکرہ کے میکے گئے اور بی اماں ساری فصل جو بھر کے آم کھانے کو ترستی رہیں۔ پھر جب موسم بدلا تو بی اماں کو اپنے کمرے تک میں امان نہ ملی۔ ان کے حصہ میں صرف دالان آیا اور وہ جاڑا گرمی برسات اسی دالان کی ہو کر رہ گئیں۔ سردی ہوتی تو لحاف میں گُڑمُڑائی پڑی رہتیں۔ حبس ہوتا تو ننگے پلنگ پر لیٹی پنکھا ہلایا کرتیں۔ بس یہی ان کی زندگی تھی۔

مگر شاکرہ کو پھر بھی صبر نہ آیا۔ اب اسے یہ گلہ تھا کہ بی اماں ہر وقت بلا وجہ منہ چڑھائے رہتی ہیں۔

"اگر پوت کی کمائی ایسی ہی پیاری تھی تو مجھے کیوں بیاہ لائیں؟" پاس پڑوس والیوں سے وہ کہا کرتی۔

"ایسا نہیں کہتے بی بی، آخر کو وہ تمہاری خالہ ہیں۔" کوئی بی اماں جیسی بھی کہہ دیتا۔

اور اس پر شاکرہ سلگ اٹھتی۔

"خالہ سمجھ کے تو گزر کر رہی ہوں۔ جس روز ساس سمجھ لوں گی اس روز اس گھر میں یا وہ رہیں گی یا میں!"

اور جب بی اماں کے کانوں تک ایسی کوئی بات پہنچتی تو وہ صرف دعا دے کر خاموش ہو جاتیں۔

جب گھر میں جنو کا اضافہ ہوا تو بی اماں کے اجاڑ دل میں جیسے بہار آ گئی۔

بہو لاکھ بری سہی۔ لڑکا لاکھ لاپروا سہی۔ جنو ہر زیادتی اور لاپرواہی کا مداوا بن گیا۔ اور جب بی اماں اسے چھاتی پر لٹا کر لوری دیتیں تو جنو کے معصوم وجود کی مہک انھیں اپنے سراپا میں جذب ہوتی ہوئی محسوس ہوتی اور ہر دکھ پگھل جاتا۔ ہر زخم مندمل ہونے لگتا۔

شاکرہ نے بھی ہر ماں کی طرح جنو کے لئے اپنا سکھ چین قربان کر دیا تھا۔ راتوں میں وہ اسے گھنٹوں چھاتی سے چمٹا کر ٹہلاتی۔ اسے ذرا سی بے کلی ہوتی تو دہل دہل اٹھتی اب نہ اسے کھانے کا ہوش تھا نہ پہننے کا۔ وہ اب جنو کو دیکھ دیکھ کر جی رہی تھی۔ لیکن یہ عجیب اندھی مامتا تھی۔۔۔ اس لطیف جذبہ سے سرشار ہونے کے باوجود بھی وہ بی اماں کے جذبات کی قدر نہ کر سکی۔ لیکن بی اماں کو صبر آ گیا تھا۔ جنو کے ننھے سے وجود نے انھیں ہر دکھ سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اب جنو ہی ان کی نگاہوں کا مرکز تھا۔ جب شاکرہ بڑی لگن سے جنو کو نہلانے بیٹھتی یا اس کی معصوم آنکھوں میں کاجل لگاتی تو بی اماں بڑی دلچسپی سے اس منظر کو دیکھتیں اور جب جنو ہمکتا تو انھیں اس میں سے ننھا سا اسلم جھانکتا دکھائی پڑنے لگتا۔ اسلم جسے انھوں نے اپنے خون

سے سینچ کر بڑا کیا تھا اور جب وہ ایک سایہ دار درخت بن گیا تھا تو شاکرہ نے انہیں اس کے سائے سے بھی محروم کر دیا تھا۔ اور یہی تب بی اماں کے ذہن میں وہ کہانی سنسنانے لگی جو اس روز انہوں نے جینو کو سنانا شروع کی تھی اور جسے باہر کوری نہال شاکرہ نے جھپٹ لیا تھا۔ اور اسی واقعہ کے بعد بی اماں جینو سے بھی محروم کر دی گئیں۔

جینو جب سے اپنے ہاتھ پیروں کا ہوا تھا بی اماں کے چھوٹے موٹے کام کرنے لگا تھا۔ ان کی سوئی میں تاگہ ڈال دیتا۔ بلا بلا سے وہ پیسے کی چھالیہ لے آتا۔ وضو کے لئے لوٹا بھر کے رکھ دیتا۔ یعنی جتنی دیر بھی وہ بی اماں کے سامنے رہتا وہ کھلی رہتیں لیکن جہاں اسے دیر ہوئی اور شاکرہ نے آواز لگائی۔

" جینو چلو کھانا کھاؤ "

" جینو نہا لے چلو "

" جینو اسکول کی دیر ہو رہی ہے "

کبھی کبھی جینو شاکرہ کی نہ سنتا ۔" ابھی دیر کہاں ہو رہی ہے امی۔ دادی اماں کی تسبیح جوڑ دوں پھر جاتا ہوں۔"

تب شاکرہ تلملاتی ہوئی آتی اور جینو کو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لے جاتی۔

اور بی اماں اندر ہی اندر سسک کر رہ جاتیں۔ اور رو پڑتیں۔

اور پھر ایک دن جب ان کی آنکھوں میں رونے کی سکت نہ رہی تو وہ دنیا سے چل بسیں۔

اور تب شاکرہ نے بیاہ کے بعد پہلی مرتبہ اطمینان کی سانس لی۔ حالانکہ بی اماں کا وجود برائے نام تھا۔ اور وہ ایک سوکھے ہوئے درخت کی طرح ایک کونے میں بے جان سی زندگی گزار رہی تھیں۔

مگر شاکرہ نے جو قاعدہ پڑھا تھا۔ اس میں اس متبرک درخت کے صندل کی محبت نہیں سکھائی گئی تھی۔ اسے جلا کر خاک کر دینا سکھایا گیا تھا۔

وقت بڑی تیزی سے گزر گیا۔ اسلم ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گیا۔ شاکرہ بوڑھی ہو گئی اور جینو جوان ہو گیا۔ اور پھر جب پاکستان بنا تو جینو شاکرہ کو لے کر پاکستان چلا آیا اور نئے ملک میں قدم جماتے ہی شاکرہ نے جینو کا گھر بسا دیا۔

اور اس رات جب جینو کے لڑکے گڈو نے کہانی کے لئے ضد کی تو شاکرہ نے آہستہ آہستہ وہ کہانی سنانا شروع کی جو بہت دنوں سے اس کے ذہن میں پرورش پا رہی تھی۔

" ایک تھا مالی۔ اس نے بڑی محنت سے ایک پودا لگایا۔ اور اسے اپنے خون سے سینچ کر بڑا کیا۔ یہاں تک کہ وہ پودا ایک سایہ دار درخت ہو گیا۔ تب اس مالی نے ایک راہ گیر کو اس سایہ دار درخت کے نیچے پناہ دے دی۔ اور اس راہ گیر نے ایک دن مالی کو اس کے سائے سے بھی محروم کر دیا "

کہانی یہیں تک پہونچی تھی کہ ممتاز جھلا کر اٹھی اور گڈو کو شاکرہ کی چھاتی سے گھسیٹ لیا۔

" اب بچوں سے بھی دکھڑا روئیے گا ؟ "

اور تب شاکرہ کو محسوس ہوا جیسے ممتاز نے گڈو کو نہیں چھینا۔ اس کی چھاتی کا گوشت نوچ لیا ہو۔ اور اس روز پہلی بار اسے بی اماں کے دکھ کا احساس ہوا۔ پہلی بار اس نے اس مالی کے کرب کو جانا جو اپنے لگائے ہوئے درخت کے سائے سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اور زندگی میں پہلی بار وہ سچے دل سے بی اماں کے لئے روئی۔

اور ابھی ایک عمر اسے یہ کفارہ ادا کرنا ہے۔!!

جواب طلب امور

ہمیشہ جوابی کارڈ، ٹکٹ یا لفافہ ارسال فرمایئے۔ تاکہ آپ کے مکتوب کا بر وقت جواب دیا جا سکے۔

مینجر

الشجاع

عنایت اختر

ایک دل دو زخم

ننھے ننھے بچے اسکول کے باغیچے میں کھیل رہے تھے اور فاطمہ ایک سرسبز پیڑ کے نیچے بیٹھی وہ خط پڑھ رہی تھی جو اس کے منگیتر کیپٹن مراد نے صحرائے سینائی کے مصری مورچے سے اسے لکھا تھا۔

— مراد نے تڑپ کر کہا:

— فاطمہ! مصر ایک لڑائی ہارا ہے نہ کہ جنگ — جنگ ابھی جاری ہے اور جاری رہے گی۔ اور اسرائیل کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

مصری بچے دنیا سے بے نیاز تھے اور کھیل رہے تھے۔ بچپن کا تقاضہ تھا۔ ادھر فاطمہ کو محبت نے بے نیازی عطا کی تھی اور وہ بگڑتے ہوئے حالات کو بھول کر اپنے منگیتر کے خط میں کھو گئی تھی۔

فاطمہ خط کل شام سے کئی مرتبہ پڑھ چکی تھی اور اب پھر پڑھ رہی تھی تو پہلی بار کی طرح خط کنوارا معلوم ہو رہا تھا کیپٹن مراد نے سینائی کے کسی مقام سے لکھا تھا۔

"فاطمہ پیاری! رات کا وقت ہے، چاند ابھی نہیں ابھرا ہے۔ ہر طرف خاموشی اور سکوت ہے۔ صحرائے سینائی گم سم ہے۔ تم جانتی ہو کیوں؟ اسرائیل کی دھمکیوں، ملوکیت پسندی اور جارحیت کے سبب سینائی کا صحرا خوف زدہ محبوبہ کی طرح چپ ہے۔ اور اسی لئے سینائی کی طرف میں اپنا ٹینک دستے کے ساتھ لایا ہوں تاکہ صحرائے سینائی کو زندگی، خوشی اور مستقبل کی ضمانت دوں۔ میں اپنا پہلا اور بنیادی فرض ادا کر چکا ہوں یعنی مادر وطن کے دفاع کے لئے اقدام کر چکا ہوں۔ میں نے مورچہ سنبھال لیا ہے ٹینکوں کو خاکِ سینائی کے تودوں کے پیچھے اس طرح چھپا دیا ہے کہ دشمن ہمیں دیکھ نہ پائے اور ہم اس پر بھرپور وار کریں۔ تاکہ دشمن پھر کبھی ہمیں غلام بنانے کے خواب نہ دیکھ سکے۔ یہ پہلا فرض انجام دینے کے بعد اپنا دوسرا فرض انجام دے رہا ہوں۔ جسے میں کہیں بھی ہوں اور کسی حالت میں ہوں پہلے فرض کے ساتھ بھول نہیں سکتا یعنی اپنی فاطمہ کو یاد کرنا اور خط لکھنا۔ صحرائے سینائی کی طرف بڑھتے ہوئے تم میرے قریب ہی تھیں۔ اور سچ تو یہ ہے فاطمہ کہ تمہارا زندگی بخش تصور نہ ہوتا تو شاید میں سینائی آتا ہی نہیں۔ مجھے یہ جدائی شاق گزر رہی ہے لیکن بقول تمہارے گھر کے دروازے دشمن سے پہلے محفوظ کرتے جائیں اور پھر ہم حسین زندگی گزارنے کے خواب دیکھیں — کیوں فاطمہ؟ — خدا نے برتر نے چاہا تو معرکے کے بعد میں فاتح بن کر آؤں گا قاہرہ۔ اس وقت تم میرا کس طرح استقبال کروگی۔ بولو فاطمہ؟"

فاطمہ نے مسکرا کر لمبی سانس لی اور خط سینے سے لگا لیا اور پھر آنکھیں

سونڈلیں اور اس وقت چونکی جب بمبار جہازوں کا جھنڈ فضا میں شور کرتا اوپر سے نکل گیا۔

صبح حسین تھی قاہرہ شاداں و فرحاں تھا اور دریائے نیل کی لہریں سبک روی کے ساتھ رواں دواں تھیں ـــ آج ۳۱ مئی ۱۹۶۷ء تھا۔ امیدوں کا دن۔ تابنا کیوں کا دن۔ اور فاطمہ کے لئے تو آج کا دن اس لئے اور بھی حسین تھا کیونکہ انتظار کے بعد اسے اپنے منگیتر کا پیارا خط ملا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ ۵ جون ۱۹۶۷ء کا دن آ گیا ـــ عزم، امیدوں اور استقلال کو لئے ہوئے کہ اچانک سارا قاہرہ خطرے کی گھنٹیوں سے گونج اٹھا۔ ہر آنکھ آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ لوگ گھبراہٹ کے ساتھ پناہ گاہوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ان میں فاطمہ بھی تھی ـــ اسرائیل نے مکاری سے فضائی حملہ کر دیا تھا ـــ جارحیت کا آغاز کر دیا تھا۔

فاطمہ پناہ گاہ میں بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ فکرمند تھا۔ خوف سے نہیں بلکہ دشمن کی دغابازی کے تحت وہ اگلے لمحوں کے پروگرام بنا رہی تھی اس لئے کہ ساری مصری قوم ان ہی لائنوں پر سوچ رہی تھی۔ ہمت، عزم و استقلال کے ساتھ۔

ادھر اسرائیلی بم زندگی کا چہرہ مسخ کرنے میں مصروف تھے۔ اور پناہ گاہ میں فاطمہ ان زخموں کو مندمل کرنے کی راہ سوچ رہی تھی۔ جب خطرے کی گھنٹیاں بجیں اس وقت وہ خوف زدہ تھی اس لئے کہ صنف نازک تھی۔ لیکن اب ڈر دور ہو چکا تھا اور اس کی جگہ استقلال ابھر آیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اپنے منگیتر کی طرح اسے بھی اپنے وطن کی خدمت کرنی لازمی ہے۔ اگر کیپٹن مراد وطن کے لئے اپنا سکھ تج سکتا ہے تو وہ کیوں نہیں ایسا کر سکتی ہے؟ وہ بھی تو نیل کی بیٹی ہے۔ اگر وطن نہ رہا تب وہ کہاں رہے گی۔ اُس کا حُسن و جمال کیسے برقرار رہے گا؟ اس کی امیدیں اور آرزوئیں کیسے پنپ پائیں گی اور زندگی کا خواب شیریں کیسے پورا ہوگا؟ اچانک فاطمہ چونک پڑی اور "سب ٹھیک ہے" کا جب اس نے الارم سُنا تو مضبوط قدموں سے باہر کی طرف چلی۔ اس وقت وہ حسینۂ نیل نہیں بلکہ دختر نیل بن چکی تھی۔

پناہ گاہ سے نکل کر فاطمہ اپنے گھر نہیں گئی جہاں وہ بالکونی میں بیٹھ کر نیل کی سبک خرامی سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ بلکہ قاہرہ کے بڑے ہسپتال پہنچی۔ اپنا ملاقاتی کارڈ ڈاکٹر کو بھیجا اور اضطراب میں ٹہلنے لگی۔ جب وہ ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچی تو ڈاکٹر نے سنہرے بالوں والی فاطمہ کو غور سے دیکھا۔ فاطمہ نے جاتے ہی اپنا مدعا بیان کیا تو ڈاکٹر کو تعجب ہوا۔ اس نے حسین فاطمہ سے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ اسرائیل نے حملہ کر دیا ہے اور یہ کہ جنگ چھڑ چکی ہے۔ ہر محاذ پر آگ و خون کا کھیل شروع ہو چکا ہے۔ ایسے میں تم نرسنگ کر سکو گی؟ ....."

"میں وطن کی بیٹی ہوں۔" فاطمہ نے کہا۔ "وطن کی بیٹی مصیبت میں وطن کو فراموش نہیں کیا کرتی۔"

فاطمہ اسی دن سے ہسپتال میں نرس ہو گئی۔ نرسنگ کی ٹریننگ وہ پہلے ہی لے چکی تھی جو اس وقت کام آئی۔ اور اس کی روح کو سکون ملا۔ خدمت ہر مسلمان لڑکی کا ایمان ہے۔ اس لئے کہ بے لوث خدمت کرنے والے خدا سے قریب ہوتے ہیں۔ فاطمہ اسی اعلیٰ جذبہ کے تحت ہسپتال آئی تھی تاکہ قومی ضرورت میں ہاتھ بٹائے وہ قاہرہ سے باہر بھی جا سکتی تھی۔ وہ مجبور و بے بس بھی نہ تھی۔ لیکن احساس فرض کی شدت و شعور کی بیداری نے اسے یہ دن کسی محفوظ پر فضا مقام پر بسر کرنے سے روک دیا جس طرح کہ اس کی اور سہیلیاں فرار اختیار کر چکی تھیں جب کہ فاطمہ صبح سے شام تک ہسپتال میں مصروف رہ کر اپنے بھائیوں کی بے لوث خدمت میں مصروف تھی اور زندگی حاصل کر رہی تھی۔ وہ زندگی اور وہ مسرت جو ادائیگی فرض کے بعد ہی میسّر آ سکتی ہے۔

زخمی برابر آ رہے تھے۔ فاطمہ کا کام بڑھ رہا تھا۔ فاطمہ اسی لئے ہسپتال آئی تھی کہ ہو سکتا ہے اس کا منگیتر بھی زخمی ہو کر آئے۔ اس وقت وہ مراد کی خدمت سب سے بہتر طور پر کر سکے گی۔ اس لئے کہ اس نے مراد کو دکھ اور سکھ میں رفاقت کا یقین دلایا تھا پھر وہ اپنا وعدہ کیسے بھول سکتی تھی۔ زخمیوں کی بڑھتی ہوئی گنتی سے دوسری نرسیں مغموم ہوتیں لیکن فاطمہ مسکراتی تھی اس لئے کہ اس کے کسی بھائی کی پیٹھ پر زخم نہیں ہوتے تھے۔ یہ اس بات کا بیّن ثبوت تھا کہ وطن کے بیٹوں میں وطن کی محبت کا جذبہ کتنا شدید ہے۔ یہی زخمی بیٹے کل تندرست ہو کر دشمن کو روند ڈالیں گے..... یہی وجہ تھی کہ فاطمہ مایوس نہ تھی۔

لیکن اسے بس ایک فکر تھی۔ مراد کا کوئی پتہ نہ تھا۔ وہ شرم الشیخ کے مورچہ پر گیا تھا جہاں گھمسان کی جنگ ہوئی تھی اور وہ مورچہ خاموش بھی ہو چکا تھا۔ یہودیوں نے مصری ٹینکوں کو گھیر کر تباہ کر دینا چاہا تھا۔ لیکن دشمن

کو روندتے ہوئے ٹینک دستہ پیچھے ہٹ آیا تھا لیکن مراد واپس نہیں آیا تھا اس نے وزارت دفاع سے رجوع کیا۔ جواب ملا کہ "کیپٹن مراد کا نام غائب شدہ فہرست میں ہے۔"

اس جواب نے فاطمہ کو بدحواس کر دیا تھا اور طرح طرح کے وسوسوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ لیکن اس آزمائش کے موقع پہ فاطمہ نے اللہ کا دامن تھاما اور اپنے فرائض میں منہمک رہی۔ کسی سپاہی کو محسوس ہونے نہیں دیا کہ ان کی خدمت کرنے، ان کو بہلانے اور خوش رکھنے والی فاطمہ کے دل میں بھی کوئی کھٹک ہے۔ فاطمہ خود غرض تو نہ تھی کہ اپنی پھانس سے ان کے زخموں کو چھیڑ دیتی۔

جنگ کا التواء ہو چکا تھا۔

اسرائیلی دستے نہر سویز کے مشرقی کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ لیکن قنطرہ، اسماعیلیہ اور پورٹ فواد کی پٹی یہودیوں کے زور لگانے کے باوجود اب تک مصری دفاعی فوج کے ہاتھوں میں تھا۔ وزارت دفاع کے مایوس کن جواب کے بعد بھی فاطمہ نے اپنے منگیتر کی جستجو بند نہیں کی تھی۔ جب اسے رات میں چھٹی ملتی تب فاطمہ مراد کو قاہرہ کے دوسرے ہسپتالوں میں تلاش کرتی، اس لئے اور بھی کہ وہاں زخمیوں سے مل کر اگر ممکن ہو تو مراد کا پتہ معلوم کرلے۔ وہ ہسپتال ہسپتال چکر لگا رہی تھی اور پوچھتی پھرتی:۔

"تم شرم الشیخ کے مورچے پر تھے۔ کیپٹن مراد کو جانتے ہو؟" لیکن اب تک مراد کا پتہ نہ چل سکا تھا۔ آخر ایک ہسپتال میں فاطمہ کو مراد کی خبر مل گئی۔ ایک زخمی نے اسے بتایا کہ کیپٹن مراد گھمسان کی جنگ میں ٹینک لئے دشمن کے مورچے میں دور تک گھستا چلا گیا۔ دشمن نے ساری طاقت مراد کے خلاف استعمال کی اس لئے کہ مراد کا ٹینک مورچہ کو بڑا نقصان پہنچا رہا تھا وہیں وہ زخمی ہوا۔ اور پھر کچھ معلوم نہ ہوا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے؟ جس پر فاطمہ نے جلدی سے کہا:۔

"ہو سکتا ہے کہ دشمن نے اسے گرفتار کر لیا ہو؟"

زخمی سپاہی نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ایسا بھی ہو سکتا ہے۔"

اور جب فاطمہ چلی گئی تو اس مصری زخمی سپاہی نے اپنے درد کو بھولتے ہوئے کہا۔ "یہ لڑکی شاید کیپٹن مراد کی محبوبہ معلوم ہوتی ہے ــ"

نرس زیرلب مسکرائی تو زخمی سپاہی نے کراہتے ہوئے کہا۔ "نرس ابھی میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنی محبوبہ کا بھی دشمن سے انتقام لینا ہے۔۔۔۔"

ایک دن فاطمہ کو مراد کی خبر مل گئی۔ وہ دشمنوں کے ہاتھوں قید تھا۔ اور زخمی بھی تھا لیکن زخمیوں کا تبادلہ ہونے والا تھا جو فہرست مصر کی طرف سے دی گئی تھی اس میں کیپٹن مراد کا نام سرفہرست تھا۔ وزارت دفاع اپنے جیالے سپاہی کو واپس لینا چاہتی تھی۔ اس خبر نے فاطمہ کی کھوئی ہوئی ہنسی اسے واپس کر دی۔ ویسے تو زخمیوں کے لئے وہ روز ہنستی تھی۔ لیکن اس وقت وہ دل سے ہنسی تھی اور اسی وقت اپنے پروردگار کا شکریہ ادا کرنے اور نماز شکرانہ ادا کرنے کے لئے اپنے کمرے کی طرف ہولی۔

تیسرے دن فاطمہ کو بتایا گیا کہ کل پورٹ فواد کے قریب سپاہیوں کا تبادلہ ہونے والا ہے۔ فاطمہ اسی وقت ڈاکٹر سے ملی اور رخصت چاہی۔ ڈاکٹر نے نرمی سے فاطمہ کی درخواست رد کر دی۔ یہ کہتے ہوئے کہ اس کے جانے کے بعد ہسپتال بے روح ہو جائے گا۔ اس لئے کہ جس شدت، محنت، خلوص اور وفا کے ساتھ فاطمہ نے خدمت کی ہے اس کی وجہ سے پورا ہسپتال اس کا مداح ہے۔ اور یہ کہ اس کے چلے جانے سے نقصان ہو سکتا ہے۔ فاطمہ کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ــ فاطمہ کو جہاں اپنی تعریف پر خوشی تھی وہیں ان آنسوؤں میں وہ آنسو بھی گھل مل گئے جو محبت کی آنکھوں میں اس وقت آ جاتے ہیں جب دل پر چوٹ لگے۔

ڈاکٹر کمرے سے جانے لگا تو فاطمہ نے بھرائی ہوئی آواز میں پھر درخواست کی تو ڈاکٹر نے تیز لہجہ میں جواب دیا "نہیں۔"

"ڈاکٹر۔" فاطمہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "یہ فرار کیوں؟"

"یہ فرار نہیں ہے ڈاکٹر۔" فاطمہ نے کہا۔ "میں اپنے فرض سے اور زیادہ قریب ہونے جا رہی ہوں۔"

ڈاکٹر ہنسا اور اس نے پوچھا۔ "فرض کیا قاہرہ میں رہ کر پورا نہیں ہو سکتا۔" تب فاطمہ نے نظریں نیچی کیں اور دل کی بات بتا دی۔ ڈاکٹر یکدم سے نرم پڑ گیا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "اچھا دل لئے جا رہا ہے۔ لیکن تم نے

پہلے ہی بتادیا ہوتا۔ شرمانے کی کیا ضرورت تھی؟"

فاطمہ زیر لب مسکرائی۔ اس کے گالوں پہ سرخی دوڑ گئی اور اس نے منہ پھیر لیا۔ ڈاکٹر نے اجازت دیدی ـــــ فاطمہ کا تبادلہ نہر سوئز کے مشرقی کنارے فورسٹ نوادے کے ہسپتال کر دیا گیا ـــــ اسی رات کو فاطمہ نے نہر سوئز دشمن کے حملے کے باوجود پار کرلی۔

جنگی سپاہیوں کا تبادلہ ہوا اور کیپٹن مراد آ گیا۔ فاطمہ کتنی خوش تھی لیکن زخموں کو دیکھ کر فاطمہ کی خوشی بے رنگ ہو گئی۔ مراد کو فوراً ہسپتال لایا گیا۔ اس لئے کہ شقی القلب یہودیوں نے اسے کوئی طبی امداد نہیں دی تھی۔ مراد ابتک کیسے زندہ رہا تھا؟ ڈاکٹر دیر تک یہی سوچتا رہا۔ سوائے اس کے کہ رب العزت کو اسے زندگی دینی منظور تھی اور یہیں سے فاطمہ کو تابناک مستقبل کی جھلک ملی تھی اس کے بھورے گالوں کی طرف سے۔

حالانکہ یہودیوں نے کیپٹن مراد کو یہ سمجھ کر واپس کیا تھا کہ اب اس میں کچھ باقی نہیں رہا۔ لیکن ڈاکٹروں نے بڑی توجہ سے مراد کا علاج شروع کیا اور فاطمہ نرسنگ میں مصروف تھی جب کہ مراد کو معلوم ہی نہ تھا کہ اس کی منگیتر اس کے قریب آ چکی ہے۔ تیسرے دن جب مراد میں قدرے سکت آئی اور اسے ہوش آیا تو فاطمہ کو دیکھ کر اسے بہت تعجب ہوا۔ قبل اس کے کہ مراد پریشان ہو فاطمہ نے اسے اپنی کہانی خود ہی سنا دی۔ جب کیپٹن مراد اپنے ٹینک دستہ کے ساتھ قاہرہ کی سڑک سے ہوتا ہوا صحرائے سینائی کی طرف جا رہا تھا۔ اور وہ کیپٹن مراد کو الوداع کہنے آئی تھی اور پھولوں کی بارش کر رہی تھی مراد مسکرایا۔ فاطمہ کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔

"تم عظیم ہو فاطمہ! طرابلس کی فاطمہ کی طرح۔"

"وطن کے لئے خون بہانے والے ہی زندہ جاوید ہوتے ہیں۔" فاطمہ مسکرائی ـــــ

مراد کو فائدہ ہو رہا تھا اسی لئے فاطمہ کے گالوں پہ پھر سرخی واپس آ رہی تھی۔

تیسرے دن ہسپتال کی فضا اس وقت مکدر ہو گئی جب گشتی پٹرولنگ دستہ ایک ایسے مصری آفیسر کو جاں بلب حالت میں لایا۔ دستے کے آفیسر کا کہنا تھا کہ وہ شاہراہ سے ہٹ کر اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کے پیروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے وہ پیدل چل رہا ہو۔ بھوک، تھکن اور زخموں نے اسے بے ہوش کھڑا تھا۔ یہ رات گئے کی بات تھی۔ اسی وقت فاطمہ کی طلبی ہوئی۔ ایسے نازک موقعوں پہ فاطمہ ہی کو بلایا جاتا تھا۔ فاطمہ گھبرا کر اٹھی۔ اس کا خیال مراد کی طرف گیا۔ لیکن جب وہ کمرے میں پہنچی تو اس سے منظر دیکھا نہ گیا۔ جسم کا اگلا حصہ منہ سے لیکر جھلس گیا تھا۔ سر، بازو اور سینہ زخمی تھا اور وہ دم توڑ رہا تھا۔ مضروب کا منہ کھلا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ فاطمہ اس کے باوجود رات بھر پلنگ کے پاس رہی اور ہر گھنٹہ دوا پلاتی رہی۔ اور دعا کرتی رہی۔ صبح سے اسے مراد کے پاس جانے کا موقع نہیں ملا تھا حالانکہ وہ اسے ناشتہ خود کراتی تھی۔ لیکن آج اس نے دوسری نرس کو یہ ڈیوٹی دیدی تھی اور خود وہیں رہی جہاں رات بھر رہی تھی۔ اس لئے کہ نئے مریض کو مراد سے زائد اس کی ضرورت تھی۔

تین دن اور تین راتیں گزر گئیں۔ بقول ڈاکٹر کے یہ تین شب و روز اس کے لئے اہم تھے۔ اگر سانس جاری رہی تب وہ زندہ رہے گا۔ ورنہ زندگی کی امید نہ ہوگی۔ اسی لئے فاطمہ اس کے پاس سے نہیں ہلی اور وہ مسلسل خدمت کرتی رہی۔ اور چوتھے دن اس کو اطمینان ہوا تب وہ مراد کے پاس پہنچی تو مراد نے فاطمہ کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ فاطمہ نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیا خفا ہو گئے؟" اور واقعی وہ خفا تھا۔ تین دن سے فاطمہ نے صورت نہیں دکھائی تھی اور وہ بھابھی کیپٹن عارف کا خیال رکھتی رہی تھی۔ اس کی ناراضگی کی یہی وجہ تھی۔ مراد کی ناراضگی پہ فاطمہ ہنستی رہی پھر اس نے کہا۔

"وہ بھی فدائی ہے اور وطن کا فرزند!"

مراد اس وقت مسکرایا جب فاطمہ نے کہا کہ وہ نہر سوئز میں ڈوب کر جان دیدے گی۔ اگر مراد کی خفگی دور نہ ہوئی تب مراد ہنس ہی نہیں دیا بلکہ فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "میں تو آزما رہا تھا۔"

"کیا میری آزمائش ابھی پوری نہیں ہوئی؟"

"فاطمہ!" مراد نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری آزمائش ۵ جون کو پوری ہو گئی تھی جب تم نے آرام تج کر وطن کی خدمت شروع کر دی تھی۔ اس کے بعد تمہارا کون امتحان لے سکتا ہے؟"

"لیکن میرا دل ابھی دھڑکتا ہے۔۔۔۔"

"مصری ہار پھر؟" مراد نے تڑپ کر کہا۔ "فاطمہ مصر ایک لڑائی ہارا ہے نہ کہ جنگ ـــ جنگ ابھی جاری ہے اور جاری رہے گی۔ اسرائیل کو اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔"

"انشاء اللہ!" فاطمہ نے دور خلا میں دیکھتے ہوئے اور زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ چند لمحے نہ جانے کیا گھورتی رہی تب اس نے کہا۔ "فاطمہ بھی مل جائے گی۔ میں اسے تلاش کروں گی۔۔۔۔؟"

"کیسے؟" مراد نے چونک کر پوچھا۔ فاطمہ ہنس دی اور تب اسے بتایا کہ کیپٹن عارف کی محبوبہ کا نام بھی فاطمہ ہے۔۔۔۔۔ اور یہ کہ کیپٹن عارف اسے اپنی ہی فاطمہ سمجھ رہا ہے — فاطمہ نے محسوس کیا کہ کیپٹن مراد کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا ہے — فاطمہ نے کہا: "وہ قابل رحم ہے۔ میں نے اس غلط فہمی کا ازالہ نہیں کیا۔ ایسی حالت میں اسے دکھ نہیں ملنا چاہیئے۔ وہ مجھے فاطمہ ہی کہہ کر مخاطب کرتا رہا اور میں جواب دیتی رہی۔ اسے آج بھی امید ہے کہ وہ تندرست ہو جائے گا اور پھر زندگی کو قریب سے پیار کرے گا۔ اگر اس کے سنہرے خواب اس سے چھین لئے گئے تو شاید وہ غم نہ برداشت کر سکے اور شاید۔۔۔۔۔"

"اور اگر میں مر گیا تب؟" کیپٹن مراد نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ فاطمہ اچھل پڑی۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اور پہلی بار اپنے منگیتر کو خفگی کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ اچانک مراد نے اپنا شکوہ کیا اور کہا۔

"اگر عارف تم کو مجھ سے چھین لے تب۔۔۔۔۔؟"

"میں کھلونا تو نہیں ہوں؟" فاطمہ نے کہا اور ہنس دی۔

فاطمہ کے جانے کے بعد بھی کیپٹن مراد کچھ بے چین سا رہا۔ مرد کا شک جب جاگتا ہے تو دھوئیں کی طرح دیر تک پھیلا رہتا ہے۔

کیپٹن عارف مسکرا رہا تھا اور فاطمہ کے دونوں ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔ "فاطمہ! تمہاری عظمت کا مجھے پہلے احساس نہ تھا۔۔۔۔۔ مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔۔۔۔۔ آدمی کچھ کھو کر سیکھتا ہے۔۔۔۔۔ میں زندگی بھر تمہاری قدر کروں گا۔۔۔۔۔۔ فاطمہ معاف کر دو مجھے۔۔۔۔!" فاطمہ ہنس دی اور کیپٹن عارف کو مطمئن کر دیا۔ وہ اب مسرور بھی تھا اور مطمئن بھی۔

دوسرے دن جب فاطمہ عارف کے قریب آئی اور حال پوچھا تو عارف نے پوچھا۔ "فاطمہ کیا میں زندہ رہوں گا؟" فاطمہ نے چند الفاظ میں اسے تشفی دی اور کہا: "خدا نے تمہیں زندگی بخش دی یقین مانو۔" عارف کے ہونٹوں پر ہنسی ابھر آئی اور اس نے تڑپ کر کہا۔ "بس دو ارمان ہیں۔ ایک ارمان ہے کہ دشمن سے انتقام لوں اور دوسرا ارمان یہ ہے کہ تم کو کبھی ناراض نہ ہونے دوں۔" دونوں ساتھ ہنس دیئے۔

ایک دن عارف نے خوش ہو کر فاطمہ کو بتایا کہ اس کی بینائی کے لئے آنکھوں کا آپریشن ہونے والا ہے۔ اسے اس حسین دن کا انتظار ہے جب وہ ہر طرف فاطمہ ہی کو مسکراتے دیکھے گا۔ فاطمہ کو بھی معلوم تھا اور وہ دل سے آرزو مند تھی کہ کیپٹن عارف کو جہاں خدا نے زندگی بخش دی ہے وہیں اس کی بینائی بھی بخش دے۔ تاکہ وہ اپنی فاطمہ کو تلاش کر سکے۔

کیپٹن عارف العریش کے مورچے پر اسرائیلی فوجوں کا مقابلہ کر رہا تھا کہ وہیں زخمی ہوا تھا۔ پھر وہ زخمی ہوا تو دشمن اسے دیکھ نہ پایا اور وہ زخمی حالت میں پیدل چل پڑا تھا۔ قسمت نے یاوری کی اور مصری گشتی دستے کے ہاتھ لگ گیا۔ ورنہ اس کے خاتمہ میں کیا شک باقی رہ گیا تھا۔ فاطمہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی تھی کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوا۔ تاکہ وہ اپنی محبوبہ سے جا ملے۔ اب لے دے کر جو کسر تھی وہ صرف بینائی کی تھی۔

فاطمہ کی طرح مراد کو بھی عارف سے ہمدردی پیدا ہو چکی تھی اور وہ بھی کیپٹن عارف کی طرح اس کی بینائی کا آرزو مند تھا۔ آپریشن ہو گیا۔ ایک ہفتہ بھی گزر گیا۔ جب پٹی کھلی تو فاطمہ موجود تھی۔ جب ڈاکٹر نے فاطمہ کو دیکھ کر نفی میں سر ہلایا تو فاطمہ ضبط نہ کر سکی اور باہر نکل کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ لیکن عارف کو مطلق غم نہ تھا۔ وہ ایک بدصورت نرس کا ہاتھ تھامے جس کو فاطمہ نے اپنی جگہ دیدی تھی کہہ رہا تھا۔ "فاطمہ اگر مجھے آنکھیں نہ ملیں تو کیا ہوا۔ تم میرے پاس ہو۔ میں بے نور آنکھوں سے تمہیں دیکھتا رہوں گا۔ اور مطمئن رہوں گا۔ بدصورت نرس منہ پھیرے بسور رہی تھی۔

ایک ماہ بعد کیپٹن مراد اپنی منگیتر فاطمہ کے ساتھ ہسپتال سے چھٹی منانے جا رہا تھا تاکہ آرام کر لے اور پھر سینہ سپر ہو کر اسرائیلی دشمن سے لڑنے کے لئے مورچہ پر آ جائے تو کیپٹن مراد جب کیپٹن عارف سے ملنے اور مصافحہ کرنے گیا تو عارف نے کہا۔ "ڈاکٹر نے یقین دلایا ہے کہ میری آنکھوں میں روشنی آ جائے گی۔ اس وقت میں بھی تمہارے شانہ بشانہ مورچہ پر رہوں گا میرا انتظار کرنا کیپٹن مراد۔"

فاطمہ جب ہسپتال سے مراد کے ساتھ نکل رہی تھی تو رومال سے آنسو پونچھ رہی تھی اور دل میں دو پھانسیں چبھتی محسوس کر رہی تھی۔ کیپٹن عارف کی بے نور آنکھیں اور اس کی محبوبہ۔ یہ دو داغ فاطمہ کے دل سے معلوم نہیں کہ مٹ سکیں گے یا نہیں۔

نوشتہ:۔ ڈاکٹر سمتی شیترمانڈے
ترجمہ۔ سالم انصاری

مرھٹی کہانی

دریچہ

تنہائی دور کرنے کے لئے چندر کانت ایک کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا۔ لیکن تنہائی میں مطالعہ کے دوران بھی انسان سوچ میں ہی زیادہ الجھا رہتا ہے۔ ماں اور لتا کو گئے پورا ڈیڑھ مہینہ ہو گیا تھا۔ یہ ڈیڑھ مہینہ اس نے پورے سکون سے گزارا تھا لیکن اس سکون میں بھی لتا کی یاد دل پر دستک دیتی رہی ماں کی یاد پریشان کرتی رہی۔

ویسے دیکھا جائے تو چندر کانت ملکرنی کی جہاں شادی طے ہوتی تھی تو ان لوگوں کے لئے چندر کانت کا رشتہ ہر لحاظ سے اچھا تھا داور میں ایک ذاتی ملاک۔ ڈھائی سو روپے ماہانہ کی اچھی سی نوکری۔ لیکن اس میں دو بڑی خرابیاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اس کی دوسری شادی تھی۔ اور دوسرے یہ کہ پہلی بیوی سے اس کی ایک دو سالہ بچی بھی تھی۔

سسرال کے بارے میں بتلاتے ہوئے تارا کے پتا نے کہا تھا "کہنے کو تو اس کی یہ دوسری شادی ہے لیکن اس کی عمر ابھی صرف اٹھائیس برس کی ہے پہلی شادی پچیس برس کی عمر میں ہوئی۔ پہ دو سال کے بعد ہی اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ جبکہ اکثر لوگ پہلی شادی کے وقت ہی کافی عمر رسیدہ ہوتے ہیں"

پتا نے عمر کے بارے میں جو حساب بتایا وہ بالکل صحیح تھا۔ بھلا اونچے درجوں کو جو حساب پڑھاتا ہو اس کا حساب غلط کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر محض درست جواب پر ہی تو پورے نمبر نہیں ملتے۔ اس کے حل کرنے کا طریقہ بھی تو درست ہونا چاہیئے۔

مگر دوسری شادی کا یہ "طریقہ" تارا کو بالکل پسند نہ تھا۔ عمر کم ہے تو کیا ہوا۔ دوسری شادی کا داغ جو لگا ہوا ہے۔ داغ سے چاند کا حسن تو نکھرتا ہے۔ لیکن گھریلو زندگی کا نہیں۔ خیر یہ بھی ایک حد تک قابلِ برداشت ہے۔ پر سوتیلی بچی..... تیزاب کا داغ۔ مجھ جیسی پڑھی لکھی گریجویٹ لڑکی اور ایک رنڈوے سے شادی۔ بچی، بچی.... لیکن پتا جی کو ایک لڑکی کے بوجھ سے سبکدوش ہونے کی بڑی جلدی ہے۔ دل ہی دل میں وہ کڑھتی رہتی تھی۔

لیکن جب چندر کانت اسے دیکھنے آیا تو اس کا غصہ دھیما ہو گیا۔ چندر کانت کا ہنس مکھ اور بشاش چہرا دیکھ کر بدنما داغ تو درکنار اس کا سایہ بھی تارا کو نظر نہ آیا۔ ملجا ایک خرابی کا احساس تو دور ہو گیا۔ لیکن "سوتیلی

بچی ـــ دوسری خرابی کے اس احساس کو وہ اپنے ذہن سے نہ جھٹک سکی ـ"لیکن" کو نظر انداز کر دیا جائے تو چندر کانت اسے ہر لحاظ سے پہلی ہی نظر میں پسند آ گیا تھا۔

آخر کار دوسری بیوی کی حیثیت سے اس نے چندر کانت کی دنیا میں قدم رکھا ـ مگر اپنے نئے گھر میں وہ سوتیلی بچی کے اذیت ناک احساس کے ساتھ داخل ہوئی ـ پیار کے جذبات سے سرشار ساس نے دروازے پر اپنی نئی بہو کا استقبال کیا ـ بہو کے استقبال کے لئے خاص طور پر تیاری کی گئی تھی ـ پہلے سے ہی ساری گھر گرہستی جمی جمائی تھی ـ بہت خوبصورت طریقے ـ اور سلیقے سے ـ

تارا کی سوتیلی بچی لتا اپنی نانی کے گھر تھانہ میں تھی ـ شادی کے موقع پر وہ موجود نہ تھی اس لئے اب تک تارا نے اسے دیکھا نہیں تھا ـ تیسرے دن چندر کانت اسے لے آیا ـ شبنم کے قطروں سے بھیگے ہوئے گلاب کے پھول کی طرح شفاف گلابی رنگ کا چہرہ ـ کالی چمکدار آنکھیں ـ بھرے بھرے گال ـ نازک سی ٹھوڑی ـ اور بھرا ہوا خوبصورت جسم ـ فن کی ساری نزاکتوں اور مہارتوں کے بعد بھی کوئی مصور اتنی خوبصورت تصویر نہیں بنا سکتا تھا ـ اسے دیکھتے ہی تارا کے دل میں محبت اور خوشی کے جذبے نے انگڑائی لی ـ لیکن دوسرے ہی لمحے ـ سوتیلے پن کے احساس نے اس کے جذبات پر اوس گرا دی ـ ڈرائنگ روم میں چندر کانت کی پہلی بیوی کی قد آدم رنگین تصویر آویزاں تھی ـ اس کا چھوٹا روپ تارا کو اپنے سامنے لتا کی شکل میں کھڑا ہوا نظر آیا ـ پھر محبت اور خوشی کے وہ پھول ـ جو لمحہ بھر کے لئے اس کے دل میں کھلے تھے اچانک کانٹوں کی طرح چبھنے لگے ـ اور دل میں حسد کی ایک لہر سی دوڑ گئی ـ پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں ـ اور وہ کام کا بہانہ کر کے وہاں سے چلی گئی ـ لتا نے اپنی کالی اور گول گول چمکدار آنکھوں سے اس نئی شخصیت کا جائزہ لیا اور اپنی دادی کی گود میں دھنستے ہوئے پوچھا ـ

" دادی یہ کون آئی ہے ـ کون ہے یہ عورت ؟ "

شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی دادی نے کہا " وہ جو ہے نا ـ وہ تیری نئی ماں ہے ـ اسے ماں کہہ کر پکارنا ـ" لتا سوچنے لگی ـ تارا نے دور سے چہرے پر ابھری ہوئی سلوٹوں کے ساتھ کہا ـ" میں کسی کی ماں نہیں ہوں ـ مجھے کوئی ماں کہہ کر نہ پکارے ـ" زہریلے اور تکلیف دہ جملے کہنے اور بحث کرنے کی عادت ساس کو نہ تھی ـ اس لئے وہ خاموش ہی رہی ـ نئی بہو کے یہ تیور دیکھ کر وہ بےچین سی ہو گئی ـ اب تک گھر میں جو سکون اور خوشی کا ماحول تھا وہ تو ختم نہیں ہو جائے گا ـ اس کے دل میں ایسا خوف اور شک جاگنے لگا تھا۔

لیکن تارا بھی کہاں خوش تھی ـ گھر اور پڑوس میں لتا کی تعریف ہوتی ہے ـ بچی خوبصورت ہے ـ کھیل کود میں مست رہتی ہے ـ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے ـ خوبصورت آنکھیں ـ ستواں ناک ـ بھرے بھرے گال ـ ہو بہو ماں کی طرح ـ اس قسم کی تعریف سن کر تارا کو لگتا کہ لوگ اس کی خوبصورتی میں کیڑے نکال رہے ہیں ـ تب حسد کی آگ اس کے سینے میں دہک اٹھتی ـ سوتیلے بچے کا ہونا گناہ ہے ـ خوبصورت ہونا اس سے بھی بڑا گناہ ـ اور خوبصورت ماں سے مشابہت رکھنا سب سے بڑا گناہ !

بزرگ ہونے کے ناطے ساس ہمیشہ تارا کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتی رہتی تھی ـ گرہستی کی ذمہ داری ـ اور گھر میں ہر فرد کی ذمہ داری ـ لیکن تارا صرف اپنے شوہر کی حد تک ہی اپنی ذمہ داریاں سمجھتی تھی ـ

گھر میں آتے ہی اس نے پرانی زندگی کی ساری نشانیاں ایک ایک کر کے مٹانے کی کوشش کی ـ رکشیدہ کاری کے کئے ہوئے بہترین کُشن کور ـ میز پوش ـ پردے ـ سبھی چیزیں پرانے ڈیزائن کی ہونے کے بہانے اس نے بدل ڈالیں ـ نئی بیوی کو خوش کرنے کے لئے چندر کانت بھی تارا کی مرضی پر چلتا تھا ـ پہلی گرہستی کی ساری نشانیاں تو اس نے مٹا ڈالی تھیں ـ لیکن سوتیلی بچی ـ زندہ اور چلتی پھرتی نشانی ـ اسے وہ کیسے الگ کر سکتی تھی ـ ؟ چندر کانت کو ذرا بھی پسند نہیں تھا کہ بچی اس کی نظروں سے ذرا سی دیر کو بھی اوجھل ہو ـ چندر کانت جب بھی بچی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا تو تارا کے دل میں حسد کے جذبات کی لکیر گہری ہو جاتی ـ آہستہ آہستہ یہ چیزیں ظاہر ہونے لگیں ـ چندر کانت

کی غیر موجودگی میں ساس اور بہو میں جھگڑے شروع ہو گئے۔
لیکن جب شام کو وہ گھر لوٹتا تو گھر میں خاموشی چھائی رہتی۔ مگر یہ خاموشی جھگڑوں کی علامت ہوتی تھی اور یہ سب دیکھ کر وہ بے چین ہو جاتا تھا۔ ہمیشہ زینے پر چندر کانت کے قدموں کی آہٹ سن کر "پپا پپا" کر کے بھاگتے ہوئے آ کر اس سے لپٹ جانے والی لتا اب خاموش کسی کونے میں بیٹھی ہوئی نظر آتی تھی۔ بیوی کا چہرا اترا ہوا اور پیشانی پر شکنوں کا جال بچھا ہوا دکھائی دیتا۔ اور ماں کے خاموش چہرے پر اداسی پھیلی رہتی تھی۔ وہ آہستہ سے لتا کو اٹھا کر پوچھتا "کیا ہوا لتا؟"

محبت کی گرمی کا احساس پاتے ہی لتا رونے لگتی اور جواب دیتی۔

"مجھ سے نانی نے جھگڑا کیا اور مجھے مارا۔"

بچی کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہی بیوی کے بارے میں چندر کانت کے دل میں غصے کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ لیکن وہ غصہ پی جاتا۔ اور ہنستے ہوئے اسے جواب دیتا۔

"نانی نا۔ وہ بالکل دیوانی ہے۔ ہم اس کو اب چاکلیٹ نہیں دیں گے۔"

معصوم بچی کو تو وہ پانچ منٹ میں بہلا سکتا تھا۔ مگر بیوی کے چہرے پر شکنوں کا جال سمیٹنے کے لئے پانچ گھنٹے بھی کافی نہ ہوتے تھے۔ نیند کی دیوی کو دھکیل کر اپنی دیوی کی منت سماجت کرنے میں اکثر اس کی آدھی رات گزر جایا کرتی۔ ایک رات اسی طرح سمجھاتے ہوئے اس نے تارا سے کہا۔

تارا تم ہوشیار ہو، سمجھدار ہو اور پڑھی لکھی ہو، روز گھر میں جھگڑے کا ماحول پھر کیوں۔؟ مجھ سے تم جس خلوص سے پیش آتی ہو اسی طرح لتا سے کیوں نہیں بات کرتیں۔ وہ بھی تو آخر ہماری بچی ہے۔"

"سمجھدار اور پڑھی لکھی لڑکی کے بھی جذبات ہوتے ہیں۔ میں تم سے پوچھتی ہوں فرض کرو مجھ سے تمہاری دوسری شادی ہوتی اور میری کوئی بچی ہوتی تو اس سے کیا تم اسی طرح محبت کر سکتے تھے جس کے لئے اب مجھے نصیحت کر رہے ہو۔"

یہ سوال سننے کے بعد گھریلو جھگڑوں کے معاملہ میں چندر کانت کے نظریے میں موڑ آ گیا۔ بیوی نے اس معاملہ میں جو رخ پیش کیا تھا وہ چمکتے ہوئے سورج کی طرح صاف اور روشن تھا۔ لیکن اس "چمکتے سورج" کی حدت کا احساس چندر کانت کی ماں ہی کر سکتی تھی۔ اور ایک دن یہ آتش فشاں پھٹ پڑا۔

وجہ کوئی خاص نہ تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ ساس روٹی پکا رہی تھی کہ لتا کیچڑ میں لت پت آئی۔ ساس نے وہیں سے آواز لگائی۔

"ذرا لتا کو نہلا دو۔"

"میں ایسی غلیظ بچی کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔"

"کل تمہارے بچے ہوتے تب کیا کرو گی۔؟" ساس نے باورچی خانے سے باہر آتے آتے کہا۔

"جب دیکھا جائے گا۔" تارا نے غصہ میں جواب دیا۔

"تو پھر شادی ہی کیوں کی۔"

دوسروں کے بچوں کو نہلانے دھلانے کے لئے شادی نہیں کی۔"

"دوسروں کے۔؟ لتا کسی پڑوسی کی بچی نہیں ہے، چندر کانت ہی کی بچی ہے۔ اور یہ بات تمہیں شادی سے پہلے ہی معلوم تھی۔"

باہر کے کمرے میں بیٹھا ہوا چندر کانت یہ سب سن رہا تھا۔ وہ اندر آیا اور جھنجھلا کر کہا۔ "ماں! فضول کیوں بحث بڑھاتی ہو۔ کتنی معمولی سی چیز ہے۔ تارا اگر کوئی بات پسند نہیں کرتی تو اس کے لئے اصرار کیوں۔؟ دوسروں کے جذبات کا تمہیں بالکل خیال نہیں۔ سوتیلے پن کا تمہیں کیا تجربہ۔؟ تمہارے سوتیلے بچے ہوتے تب تمہیں پتہ چلتا۔"

اپنے بیٹے کی باتیں ماں نے خاموشی سے سن لیں۔ اور ٹھنڈی سانس لے کر اتنا ہی کہا۔

"تیرا کہنا سچ ہے بیٹا۔"

باہر جاتے جاتے چندر کانت نے کہا۔

"اسی طرح تم دونوں کے روز جھگڑے ہوتے رہے تو بہو کا تمہارے ساتھ نباہ ہونا مشکل ہے۔"

یہ آخری جملہ تیر کی طرح اس کے دل میں لگا۔ بیٹے کے اتنے سخت الفاظ عمر میں پہلی بار اس نے سنے تھے۔ اب اسے کھانا پینا بھی اچھا نہیں لگتا۔

رات کی نیند غائب ہو گئی۔ لیکن اس نے اپنے رویے سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

چار پانچ دن کے بعد جب چندر کانت اچھے موڈ میں تھا تو وہ بولی۔

" چندو میں کچھ دنوں کے لئے ناسک جانے کا سوچ رہی ہوں۔ رام بھئو نے کئی بار ناسک آنے کے لئے لکھا بھی ہے "

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ گزشتہ چھ مہینوں میں ناسک سے اس کے بھائی کا کئی بار بلاوا آیا تھا۔ ویسے تو اس نے کچھ دنوں کے لئے جانے کا کہا تھا۔ مگر تیاریوں سے ایسا پتہ لگتا تھا جیسے وہ زیادہ دنوں کے لئے جا رہی ہو۔ تارا بہت خوش تھی کیونکہ ساس کے ساتھ لتا بھی جانے والی تھی۔ ان دونوں کو چھوڑنے کے لئے چندر کانت کے ساتھ تارا بھی اسٹیشن گئی۔

" تارا، چندو اچھی طرح سے رہو " وہ اس سے زیادہ بول ہی نہ سکی۔ آنکھوں میں آئے آنسو چھپانے کے لئے اس نے لتا کا فراک درست کرنے کے بہانے گردن جھکا لی۔

اسٹیشن سے لوٹتے وقت چندر کانت افسردہ تھا۔ لیکن تارا کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اب گھر میں اس اکیلی کا راج۔ پوری آزادی۔ گھر میں سب من مانا کرنا۔ موسم بہار میں جس طرح پھول کے گرد ہمیشہ تتلی ناچتی رہتی ہے اسی طرح تارا بھی چندر کانت کو گھیرے رہتی۔

ایک دن چندر کانت کی چھٹی تھی۔ چھٹی کے دن کا پورا پروگرام دونوں نے رات ہی میں بنا لیا تھا۔ پروگرام کے خیال سے ہی وہ خوش تھی۔ لیکن خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ اسے اچانک اس دن اپنی ایک سہیلی کے گھر جانا پڑا۔ وہاں سے وہ بھاگتے دوڑتے دو گھنٹے میں واپس آ گئی۔ اس اثنا میں چندر کانت تنہائی کو دور کرنے کے لئے ایک کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا تھا۔ لیکن تنہائی میں مطالعے کے دوران بھی انسان سوچوں میں ہی زیادہ الجھا رہتا ہے۔ اچانک اس کی نظر سامنے ٹنگے ہوئے کیلنڈر پر پڑی۔ ماں اور لتا کو گئے ہوئے پورا ڈیڑھ مہینہ ہو گیا تھا۔ یہ ڈیڑھ مہینہ اس نے مکمل سکون کے ساتھ گزارا تھا۔ لیکن اس سکون میں بھی کہیں چھپی ہوئی بے چینی کا احساس اسے ستاتا رہتا۔ لتا کی یاد دل پر دستک دیتی رہتی۔ ماں کی یاد پریشان کرتی رہتی۔ وہ انھیں خیالوں میں گم تھا۔ کہ باہر دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ سامنے پوسٹ مین کھڑا تھا۔ پوسٹ مین کا دیا ہوا لفافہ لے کر اس نے دیکھا ماں کا خط پاکر اسے تعجب ہوا۔ اندر آکر دروازہ بند کر کے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے لفافہ کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

بیٹے!

سدا سکھی رہو

گزشتہ ہفتہ میں خیریت کی اطلاع دے چکی ہوں۔ آج یہ دوسرا خط ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ کم از کم میرے بارے میں تو یہی ہوا ہے ایسا نہ ہوتا تو آج یہ خط لکھنے کی نوبت نہ آتی۔

چندو اس دن تم نے کہا تھا۔

" سوتیلے پن کا تمہیں کیا تجربہ۔ تمہارے سوتیلے بچے ہوتے تب تمہیں پتہ چلتا "

تمہارے یہ الفاظ تیر کی طرح میرے دل میں چبھے۔ اور زندگی کا ایک واقعہ جسے گزشتہ اٹھائیس سال سے میں اپنے دل میں دبائے ہوئے تھی۔ اس پر اچانک چوٹ پڑی۔ تکلیف کی شدت برداشت سے باہر ہو گئی اور مجبوراً آج وہ زخم تمہیں دکھانا پڑ رہا ہے۔ اٹھائیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت ہم پونا میں تھے۔ تمہارے پتا جی اوورسیر تھے۔ شہر کی سرحد پر واقع ایک بڑے بنگلے میں وہ، میں اور ڈھائی سال کی شریو ہم تینوں رہا کرتے تھے۔ شہرت اور دولت دونوں کی ریل پیل ہونے کی وجہ سے بنگلہ ہمیشہ بھرا بھرا سا نظر آتا تھا مجھ پر ان کی محبت اتنی تھی کہ مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں اس محبت کو میری نظر نہ لگ جائے۔ دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد شریو پیدا ہو چکی تھی۔ آہستہ آہستہ ان کے دفتر کا کام بڑھنے لگا شریو کی پیدائش کے ڈھائی سال کے بعد مندا کی پیدا ہوئی اور اس وقت دفتری کاموں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کو باہر دورہ پر بھی جانا پڑتا تھا۔ اکثر گھر لوٹتے لوٹتے گیارہ بج جاتے تھے اور کئی کئی دن دورہ

پر ہی گزارا دیتے تھے۔ میں اکثر یہ دیکھ کر چڑھ جاتی تھی ۔ ان پر نہیں
بلکہ ان سے اتنا کام لینے والے افسر اور محکمے پر ۔ مجھے جھنجھلائے دیکھ کر
وہ ہنس کر کہتے ۔

" آفیسر بیچارے کو دونوں طرف سے باتیں سننی پڑتی ہیں ۔ پہلے
میں اکثر گھر پر رہتا تھا تو اس وقت تم ہی ناراض ہو کر کہتی تھیں ۔ کیا تم
سے کوئی کام نہیں لیا جاتا ۔ اور اب کام پر جاتا ہوں تو بھی ناراض "

پھر محبت بھرے لہجے میں کہتے " مجھے ترقی ملنے والی ہے نا ۔
اس لئے کام زیادہ بڑھ گیا ہے "

ان کا کہنا ایک لحاظ سے صحیح تھا ۔ مگر مجھے تو ان کا قرب چاہیئے
تھا اور وہ مجھے ملتا نہ تھا ۔ اس لئے میں چڑتی تھی ۔ کام کی زیادتی کی وجہ
سے کچھ دنوں بعد ان کی طبیعت میں بھی چڑچڑا پن آگیا ۔ ایک مرتبہ ان کا
دورہ بہت لمبا ہو گیا ۔ سات دن کے بعد وہ گھر لوٹے تھے ۔ لوٹتے وقت
وہ دن کی رخصت لے کر آئے ۔ یہ ایک طرح سے ٹھیک ہی ہوا ۔ ورنہ میں ان
پر خوب بگڑنے والی تھی ۔ رات میں فرصت کے وقت بات چیت کے دوران
میں نے ان سے کہا " مجھ پر تمہاری محبت آجکل کچھ کم سی ہو گئی ہے ۔
کیوں ہے نا ۔۔ ؟ "

یہ سنتے ہی وہ اچانک چونک پڑے اور ہنس کر کہنے لگے ۔

" تمہارا مطلب کیا ہے ۔۔ ؟ "

میں نے بھی ہنس کر جواب دیا ۔

" پہلے جیسا گھر گرہستی میں تمہارا دل نہیں لگتا ۔ اس کا میرے پاس
ثبوت بھی ہے ۔ آج دوپہر تمہارے کپڑے دھوبی کو دیتے وقت کوٹ
کی جیب سے یہ ثبوت برآمد ہوا " میں نے ریل کا ٹکٹ ہنستے ہنستے ان
کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا ۔

" گھر گرہستی سے اکتائے بغیر کوئی پنڈھرپور نہیں جاتا ۔ تمہارے
دورے کے پروگرام میں پنڈھرپور شامل نہیں ۔ اتنا تو مجھے بھی معلوم
ہے ۔ پھر اگر جانا ہی تھا تو ہم دونوں ساتھ چل کر درشن کرتے "

ٹکٹ دیکھتے ہی وہ چونک پڑے ان کا چہرہ اتر گیا ۔ کچھ دیر
خاموش بیٹھے رہے ۔ گردن نیچی کئے ہوئے ۔ یہ حالت دیکھ کر مجھے
[illegible] سے پوچھا " کیا ناراض ہو گئے ۔ ؟ "

انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر انکار میں گردن ہلائی پھر
کچھ دیر بعد بولے ۔۔ " مُنّا مجھ سے ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہوا ہے ۔
جو نا قابل معافی ہے "

" میں نے مذاق سے پوچھا ۔ کونسا ایسا گناہ ہے جو مجھے
نہیں معلوم "

پھر بھی وہ سنجیدہ رہے اور کچھ دیر سوچتے رہے ۔ پھر
کہنے لگے " میں تمہیں کیسے بتاؤں ۔ معلوم ہونے کے بعد تم مجھ سے نفرت
کرنے لگو گی "

" تم جیسے بھی ہو میرے پتی ہو ۔ اور تم مجھے بے حد پسند ہو ۔ کیا
ہوا جلدی بتاؤ نا ۔

پھر بھی وہ خاموش تھے ۔ شاید اس سوچ میں کہ کس طرح کہا جائے
ادھر میری بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی ۔ کافی دیر کے بعد انھوں نے کہا ۔

" گزشتہ سال میرے ایک دوست کے ساتھ ۔ جوشی کے ساتھ
اس کی بہن ہمارے یہاں آئی تھی ۔ شکنتلا ۔ میں اسی کے چکر میں پھنسا ہوں "

مبہم ۔ ہلکی لکیروں اور خاکوں سے بھی کسی تصویر کا بخوبی اندازہ
ہو جاتا ہے ۔ ان کے اس جملہ سے میں بھی پوری بات سمجھ گئی تھی ۔ مجھے
بڑا دھکا لگا ۔ لیکن آہستگی سے میں نے پوچھا " اس کی آئندہ زندگی کا
کیا ہوا ۔ اس کی ذمے داری تمہیں پر ہے "

" گزشتہ مہینے پنڈھرپور سے اس کا بھائی اسے ناگپور لے گیا
گزشتہ ہفتہ اس کی شادی جمشید پور میں ہوئی ۔ میں نے ڈھائی ہزار
روپے دیئے "

" بچہ کہاں ہے ۔۔ ؟ "

" پنڈھرپور کی اناتھ شالہ میں "

" کیا ہے ۔ ؟ "

" لڑکا "

رات بستر پر لیٹنے کے بعد بھی میں سو نہ سکی ۔ عجیب عجیب خیالات
پریشان کرتے ۔ کام کے بہانے ان کا اکثر باہر رہنا ۔ رات بے رات کبھی
بھی واپس لوٹنا .... سب ۔ سب کچھ [illegible] تھا ۔ زخموں
سے دل چھلنی ہونے لگا ۔ لیکن ان خیالات کے [illegible]

بجائے عقلمندی سے کام لینے میں ہی بہتری تھی۔ رات بھر میرے خیالوں میں پنڈھرپور کی اناتھ شالہ والا بچہ بھٹکتا رہا۔ اس کے پتا زندہ ہوتے ہوئے بھی وہ لاوارثی کی زندگی گزارے؟ میری مامتا جاگ اٹھی۔ اور میں نے فیصلہ کیا..... اور ان سے کہا۔ وہ سنتے ہی تعجب اور خوشی سے بے قابو ہو کر مجھ سے لپٹ پڑے اور کہا:" اُما۔ اُما تم محبت کی دیوی ہو۔" میں نے کہا:" میں کسی پر احسان نہیں کر رہی ہوں۔ کیا تمہارا بچہ میرا بچہ نہیں ؟"

رات ہی میں ہم دونوں نے طے کیا۔ دوسرے دن پنڈھرپور جا کر بچے کو لے آئے۔ "میری سہیلی کا بچہ ہے۔ بیچاری اچانک مر گئی" جو کوئی بھی اس کے بارے میں مجھ سے پوچھتا میں یہی جواب دیتی۔ دو مہینہ کا بچہ۔ لیکن بہت ہی کمزور! مندا اس وقت دس مہینے کی تھی۔ کافی تندرست۔ میں نے اس کا دودھ چھڑا کر بچے کو پلانا شروع کیا۔ اس کی پرورش میں دن رات لگی رہی۔ خوش قسمتی سے مہینہ بھر کے اندر ہی ان کا تبادلہ بمبئی ہو گیا۔ بمبئی پہنچتے ہی میں بچے کی ماں بن گئی۔ بس مندا کی عمر تھوڑی سی بڑھانا پڑی۔ پڑوسنیں کہتیں "عجیب ہو تم بھی۔ بچے سے اتنی محبت کرتی ہو اور بچی کا کچھ دھیان نہیں رکھتیں۔ بیچاری مندا کو بالکل ہی نظر انداز کر رکھا ہے"۔ ان لوگوں کا کہنا ٹھیک ہی تھا۔ کیونکہ ممتا کی جتنی بارش بھی میں کر سکتی تھی وہ سب اس بچے پر ہی ہوتی تھی۔

کچھ دنوں بعد مندا اور شرد سے زیادہ اس بچے کی طرف دھیان دینے کا خود مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا۔ وہ تھا بھی بہت ہی معصوم اور پرکشش! آنکھیں اور پیشانی دیکھتے ہی آدمی اس کی طرف کھنچ جاتا۔ وہ بچہ یعنی چندو۔ یعنی میرا سوتیلا بچہ! لیکن میں نے کبھی بھولے سے بھی اسے اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔

چندرو۔ ! تم کہتے ہو کہ تعلیم سے آدمی کے خیالات اونچے ہوتے ہیں۔ کیسے پتہ۔! لیکن اکثر لڑکیوں کے بارے میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ تعلیم سے ذہن تو ضرور کھل جاتا ہے لیکن جذبات کی وسعت میں کمی آ جاتی ہے۔ آجکل ہر طرف محبت کی داستانیں گونجتی رہتی ہیں پر یہ محبت سچی نہیں ہوتی۔ جس محبت میں پھیلاؤ نہیں۔ ٹھہراؤ نہیں۔ ایثار کا جذبہ نہیں۔ اونچے خیالات کی پاکیزگی نہیں۔ وہ محبت کیسی؟

تارا کو صرف تم ہی نظر آتے ہو۔ اور وہ صرف تمہارے وجود کو ہی چاہتی ہے۔ ایسی عورت کی محبت نئے چاند کی طرح ہوتی ہے جو دیکھنے میں تو خوبصورت نظر آتا ہے۔ لیکن دنیا کو اجالا دینے کی شکتی اس میں نہیں ہوتی ہے۔ ایسی شکتی تو صرف پورے چاند میں ہی ہوتی ہے جس کی برستی ہوئی ٹھنڈی روشنی سے کائنات جاگ اٹھتی ہے۔

چندرکانت اس سے آگے وہ خط نہ پڑھ سکا۔

پتھروں کے درمیان

اندر سے تقریباً چالیس کلو میٹر جنوب کی طرف ہمارا کیمپ لگا ہے۔

کچھ لوگ سروے پر مامور ہیں اور کچھ کے ذمّہ پوریٹنگ کروانے کا کام ہے۔ کیمپ سے کئی کلو میٹر دُور پہاڑیوں اور سنگلاخ زمین پر گھوم کر مختلف قسم پتھر اور مٹی کے نمونے اکٹھے کئے جارہے ہیں۔ اور ڈرپوشیٹ پر معدنیات، مقامات اور راستوں کو مناسب نشانات سے ظاہر کرتے ہوئے نقشے کو ایک نئی ترتیب دی جارہی ہے۔ سروے پر جانے والے اکثر رات کسی پہاڑی گاؤں میں بسر کر لیتے ہیں اور تین تین چار چار دِن کے بعد کیمپ میں لوٹتے ہیں۔

مَیں مُنہ اندھیرے ہی جاگ گیا ہوں۔ اور بتّی جلائے بغیر ہی خیمے سے باہر آگیا ہوں۔ فروری کے آخری دِنوں کی ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ میری آنکھوں میں ابھی نیند کا خمار ہے۔ تمام کیمپ سو رہا ہے۔ پہاڑی کے دامن میں، ایک چوڑی اور نسبتاً ہموار جگہ پر ایک درجن سوئِس ٹینٹس (SWISS TENTS) پر مشتمل یہ کیمپ ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں دکھائی دیتا ہے۔ سفید تکونے گھروں والا ایک گاؤں! ہر خیمہ ایک کمرے کا ایک فلیٹ ہے جس میں پیچھے گھیرا ڈال کر ایک اور چھوٹا سا کمرہ بنالیا گیا ہے جسے غسل خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خیمے کے دائیں بائیں دونوں دیواروں میں رسیوں کی جالی نما کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں جو آمنے سامنے ہونے کی وجہ سے کمرے کو ہوادار رکھتی ہیں اور وقت ضرورت پردے کی مدد سے بند بھی کی جاسکتی ہیں۔ اپنے جنریٹر کی مدد سے ہم لوگوں نے بجلی پیدا کر رکھی ہے اور ہر خیمے میں بلب لگے ہوئے ہیں۔ خیموں کے سامنے، بیچ میں ایک گول سا ٹکڑا خالی رکھ چھوڑا ہے جس کے مرکز میں لکڑی کے ایک پول سے پانچ سو پاور کا ایک بلب لگا ہے جو ساری رات جلتا رہتا ہے۔ کیمپ تک آنے کے لئے دور تک سٹریٹ لائٹ بھی کر رکھی ہے۔

پاس کے خیمے میں بتّی جل گئی ہے۔ اسٹیٹ جیالوجسٹ وارشنی بھی تیار ہو رہا ہے۔ اُسے بھی سروے پر جانا ہے۔ میں اپنے خیمے کے اندر آگیا ہوں اور اب مجھے اپنے گائیڈ کا انتظار ہے۔ ہم لوگ سروے کے دِنوں میں آس پاس کے کسی پہاڑی گاؤں کا کوئی باشندہ مُلازم رکھ لیتے ہیں۔ جو ان پیچیدہ پہاڑی راستوں سے واقف ہونے کے سبب ایک اچھا گائیڈ ثابت ہوتا ہے۔ جگن سنگھ بہت محنتی شخص ہے۔ میں تھک جاتا ہوں لیکن وہ کبھی نہیں تھکتا۔ میں غسل خانے میں ہوں اور کھٹ پٹ کی آواز سے ظاہر ہو رہا ہے جگن سنگھ آگیا ہے۔ وہ جھولے میں ساتھ لے جانے والا سامان رکھ رہا ہے۔ فیتہ۔ سروے کا نقشہ کھانے پینے کا سامان، بسکٹ خشک میوے۔ پتھروں کی فوری جانچ کا سامان۔ اب میں بھی تیار ہو رہا ہوں۔ میں نے پتلون کی پیٹی سے لگے چمڑے کے خول میں سمتوں کی جانچ کا آلہ کمپاس رکھ لیا ہے۔ کیمرے کو گلے میں ہار کی طرح لٹکا لیا ہے۔ پتلون کی ہپ پاکٹ میں فیلڈ ڈائری ٹھونس لی ہے۔ ہاتھ میں ہتھوڑی اور چھینی لے لی ہے اور گائیڈ کو چلنے کا اشارہ کر دیا ہے۔ خیموں میں اب بھی خاموشی چھائی

ہوئی ہے ۔ روشنی جا چکا ہے ۔ ہم کیمپ کے دوسری طرف پہنچ گئے ہیں جہاں چونے کے پتھر ڈولومائیٹ کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں ۔ سورج ابھی نہیں نکلا ۔ کہیں کہیں ڈولومائیٹ کی چٹانیں زمین سے تین چار فٹ اونچی ہیں ۔ دُور سے یوں لگ رہی ہیں جیسے بہت سارے بھینسے بیٹھے ہوں ! ہمیں ان بھینسوں کو پار کر کے آگے جانا ہے ۔ جہاں مینگنیز کے ملنے کی امید ہے ۔ اب گھڑ گھڑ ۔ گھرڑ ۔ گھرڑ کی آواز سنائی دے رہی ہے ۔ یہ ڈرلنگ مشین کے چلنے کی آواز ہے ۔ کیمپ سے تقریباً چار سو میٹر پرے بورنگ کروائی جا رہی ہے ۔ ہیڈ ڈرلر چودھری تو اس وقت کیمپ میں ہے ۔ یہاں اس کا اسسٹنٹ عثمان کام کروا رہا ہے ۔ ہم بورنگ والے مقام پر پہنچ گئے ہیں ۔ عثمان نے مجھے سلام کیا ہے ۔ اُس نے خاکی قمیض اور خاکی پتلون پہن رکھی ہے ۔ جو تیل کے داغوں سے تقریباً سیاہ ہو چکی ہے ۔ عثمان کے علاوہ آٹھ دس پہاڑی مزدور ہیں ۔ یہاں بھی دو چھوٹے چھوٹے خیمے لگے ہیں جن میں یہ لوگ رہتے ہیں ۔

" کتنے میٹر جا چکے ہیں عثمان — ؟ "

" دو سو میٹر سر — "

عثمان نے اُس گہرائی کا نکلا ہوا سٹراٹا (STRATA) میرے ہاتھ میں دے دیا ہے ۔ اور میں سٹراٹا کو ہاتھ سے مسل رہا ہوں ۔ گیلی گیلی ریت اور بجری کے ٹکڑے ۔ لال پیلے کالے سفید ۔ اور اس بجری اور ریت کو ہاتھ میں لیتے ہی جیسے میں خود وہاں پہنچ گیا ہوں جہاں سے یہ ریت اور بجری نکلی ہے ، جس جگہ میں کھڑا ہوں اس سے دو سو میٹر نیچے سے یہ ریت ، یہ بجری نکل کر اوپر آئی ہے ۔ اور اس وقت میرے ہاتھ میں ہے ۔ جانے وہاں کتنے عرصے سے دبی پڑی تھی ۔ ! میں ایک چٹان پر بیٹھ گیا ہوں اور عثمان کو مشین کے ساتھ کام کرتے دیکھ رہا ہوں ۔ گھڑ گھڑ ۔ گھڑ گھڑ انجن چل رہا ہے ۔ مشین کے ڈرلنگ راڈ گھوم رہی ہے ۔ واٹر پمپ پانی پھینک رہا ہے ۔ ڈرلنگ راڈ کے نیچے ہیرے کے ٹکڑوں سے مرصّع نمونے کاٹنے کا پائپ لگا ہے ۔ جو پتھر یا سخت سٹراٹا کو کاٹ دیتا ہے ۔ اور پتھر کا کور (CORE) پائپ میں آ جاتا ہے ۔ اس وقت پتھر ختم ہو چکا ہے اور نیچے سے بجری اور ریت نکل رہی ہے ۔ آٹھ بج رہے ہیں ۔ میں گائیڈ کے ساتھ آگے روانہ ہو گیا ہوں ۔ ایک پتلی سی پگڈنڈی پر سے ہم گذر رہے ہیں ۔ پگڈنڈی اس بات کی شاہد ہے کہ اس راستے پر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں ۔ جب بھی انسان زمین کے کسی ٹکڑے پر چلتا ہے ۔ پگڈنڈی بن جاتی ہے ۔ راستہ بن جاتا ہے ۔ راستے بنتے اور مٹتے رہتے ہیں ۔ مگر وہی راستے رہتے ہیں جو ایک جگہ کو دوسری جگہ سے ملاتے ہیں ۔ میں نے گائیڈ کے ساتھ مل کر کئی راستے بنائے ہیں ۔ جانے ان میں کتنے راستے مٹ جائیں گے ۔ کتنے رہ جائیں گے ۔ ؟!

اس وقت ہم جہاں سے گذر رہے ہیں وہاں جھاڑیاں کثرت سے اُگی ہوئی ہیں ۔ ان میں کئی پیلو کی جھاڑیاں ہیں ۔ کہیں کہیں بیر کے درخت بھی نظر آ رہے ہیں ۔ ہم نے بہت سے بیر توڑے ہیں اور جی بھر کے کھائے ہیں ۔ میٹھے اور رسیلے بیر ۔ جھاڑیوں کے پیچھے ہمیں کالے مرغوں کا ایک غول نظر آیا ہے ۔ کچھ دن پہلے سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ برجی ایک کالا مرغ مار کر لایا تھا بہت ہی لذیز گوشت تھا ۔ میں بندوق ساتھ نہیں لایا ہوں ۔ مرغ کا شکار نہیں کر سکتا ۔ اس کا مجھے افسوس ہوا ہے ۔ میگنز کا علاقہ شروع ہو گیا ہے ۔ میں نے کئی جگہ سے پتھر کے ٹکڑے نمونے کے طور پر لے لئے ہیں ۔ اب شام ہو رہی ہے ۔ جگن سنگھ کا ایک جھولا پتھر کے نمونوں سے بھر گیا ہے ۔ جگن سنگھ کہہ رہا ہے ۔ اس جگہ ریچھ اکثر مل جاتے ہیں بابو ۔ اب لوٹنا چاہئے ۔ اور میں سہم گیا ہوں ۔ ہم واپس کیمپ کی طرف جا رہے ہیں تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے ۔ لیجئے وہ سامنے کیمپ نظر آ رہا ہے چیف جیالوجسٹ ماتھر صاحب کے خیمے کے باہر کرسیوں پر چند لوگ بیٹھے گپ بازی میں مشغول ہیں ۔ ماتھر صاحب بہت خوش مزاج انسان ہیں ۔ اُن کی آمد کی وجہ سے آج رات کیمپ فائر منانے کا پروگرام طے پایا ہے ۔ آٹھ بج رہے ہیں ۔ خیموں کے بیچ خالی جگہ پر کرسیاں لگائی جا رہی ہیں ۔ ایک طرف دری بھی بچھا دی گئی ہے ۔ الاؤ جلا دیا گیا ہے ۔ ایک ایک کر کے سب اکٹھے ہو رہے ہیں ۔ کام کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں ۔ اسسٹنٹ جیالوجسٹ الور نے انکشاف کیا ہے کہ مشرق کی طرف تقریباً آٹھ کلومیٹر دور ہماٹائیٹ یعنی لوہے کا پتھر ملا ہے ۔ اور ماتھر صاحب یہ جان کر خوش ہوئے ہیں ۔ اور اپنی فیلڈ ڈائری میں بنائے گئے نقشے سے

ہاتھ صاحب کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا ہے ۔

دفعتاً گولی چلنے کی آواز آئی ہے ۔ سب چونک کر دائیں طرف دیکھنے لگے ہیں ۔ ہیڈ ڈرلر چوہدری کندھے سے بندوق لٹکائے چلا آ رہا ہے ۔ گٹھا ہوا جسم ، ناٹا قد ، بڑی بڑی مونچھیں اور گول بھرا بھرا چہرہ ۔ اس نے صرف بنیان اور نیکر پہن رکھی ہے ۔ اُس کے پیچھے اس کا چپراسی ایک بہت بڑی مچھلی ہاتھ میں لٹکائے چلا آ رہا ہے ۔

" سر ! صرف ایک گولی ضائع کی ہے اِس پر ۔ کیمپ فائر مچھلی کے بغیر منائی جاتی یہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا سر ! دیکھئے ۔ کیا چیز ہے ۔" اور وہ مچھلی کے جسم پر یوں ہاتھ پھیر رہا ہے جیسے اُسے پیار کر رہا ہو ۔ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا ہے ۔ اور پھر انگلیوں سے دو کا اشارہ کیا ہے ۔ اُس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھرک رہی ہے ۔ وہ نیکر کی جیب میں کچھ ٹٹول رہا ہے ۔ میں سمجھ گیا ہوں ۔ اُس کے پاس میری بیوی کا خط ہے ۔ جب جیپ نیچے سے ڈاک لے کر آتی ہے تو ڈرلنگ کی جگہ سے ہو کر آتی ہے ۔ جہاں چوہدری کام کر رہا ہوتا ہے ۔ چوہدری چپراسی کے ہاتھ سے ساری ڈاک لے لیتا ہے ۔ اُسے اپنے خط سے زیادہ میرے خط کی تلاش ہوتی ہے ۔ جہاں میرا خط نظر آتا ہے وہ رکھ لیتا ہے ۔ میری شادی کو ابھی چھ ماہ ہی ہوئے ہیں ۔ میں ششی کے ساتھ دو ہی ماہ رہ سکا ہوں ۔ اور اُس کے بعد مجھے کیمپ میں آنا پڑا ہے ۔ اب چار ماہ ہو چکے ہیں ۔ میں یہاں صرف اس کے خطوں کے سہارے دن کاٹ رہا ہوں ۔ ہمارا کیمپ اِتنی الگ تھلگ جگہ پر ہے کہ ہم تک ڈاک چھٹے یا ساتویں دن پہنچ پاتی ہے ۔ اور یہ چوہدری اس عرصہ کو اور بھی بڑھانے کی کوشش کرتا ہے ۔ اور خط بھی جب دیتا ہے جب ایک یا دو کارتوس معاوضہ میں مجھ سے لے لیتا ہے ۔ شکار اس کی ہابی ہے ۔ اور کارتوسوں کا خرچ وہ اس بار مجھ سے پورا کر رہا ہے ۔ میں نے دو کارتوس کی منظوری دے کر خط لے لیا ہے اور جیب میں ڈال لیا ہے ۔

الاؤ کی آگ تیز ہو رہی ہے ۔ شعلے ناچ رہے ہیں ۔ اور ساتھ ہی پیٹالیاں پڑ رہے ہیں ہم لوگوں کے سائے ۔ چوہدری مچھلی کے ٹکڑے بھون رہا ہے ۔ بنرجی مرغ کا گوشت روسٹ کر رہا ہے ۔

میں نے پیاز اور ٹماٹر کا سلاد بنالیا ہے ۔ لالتا چپراسی نے روٹیاں پکائی ہیں ۔ اور اب کھانا تیار ہو گیا ہے ۔ ایک اور میز پر چن دیا گیا ہے ! کھانا کھا چکنے کے بعد شعر و شاعری کا دور شروع ہوا ہے ۔ میں ابھی تک وہاں سے اُٹھ کر اپنے خیمے میں نہیں جا چکا ہوں ۔ ابھی تک ششی کا خط نہیں پڑھ سکا ۔ لفافے پر اُس کے ہاتھ کا لکھا پتہ ہی پڑھ پایا ہوں ۔ اور اُس کی اِس چھوٹی سی تحریر نے بھی میرے اندر مسرت کی لہر دوڑا دی ہے ۔ اس کا خط آتا ہے تو میں خوش ہوتا ہوں ۔ بے چین بھی ۔ اور اداس بھی ۔ اُس سے سینکڑوں میل دور بیٹھا ہوں ۔ جدائی کے وقت کی اس کی آنسو بھری آنکھیں ۔ مجھے ہر دم یاد آتی ہیں ۔ ابھی تو ایک ماہ اور رہنا ہے اُس سے دُور ! میں جیب میں پڑے خط کو ہلکے سے دبا رہا ہوں ۔ اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں اُس کے ہاتھ کو دبا رہا ہوں ۔ کیمپ فائر ختم ہو تو میں اپنے خیمے میں جا کر اُس کا خط پڑھوں ۔ اُسے جواب لکھوں ۔ لیکن ابھی تو یہ سلسلہ جاری ہے ۔ ابھی تو کیمپ سپروائیزر مائیکل نے اپنی بینجو اٹھائی ہے ۔ اِس نے اُس پر کسی انگریزی گیت کی دُھن چھیڑ دی ہے ۔ اور دھن پر چوہدری بنرجی اور سری واستوانے ٹویسٹ شروع کر دیا ہے ۔ سب اپنے آپ میں مگن ہیں ۔ اور میں وہیں بیٹھا بیٹھا ششی کو خط لکھ رہا ہوں ۔ بغیر قلم کے ۔ بغیر کاغذ کے !

پراسرار کہانی

نوشتہ:- بی رائٹ

تلخیص و ترجمہ:-

احمد صغیر صدیقی

— • ● • —

> مجھے انجیا کی بے وفائی پر تعجب ہوا
> شاید اسے بھی یقین تھا کہ بی نو نہیں بچ سکے گا
> جبھی تو اس نے اپنی محبت ڈے منڈو پر نچھاور کرنی شروع کر دی تھی
> بی نو کا چہرہ بے نور لگ رہا تھا میں نے سوچا
> اب اس کے پاس تو طاقت بھی نہیں رہی
> جس کے بل بوتے پر ممکن تھا کہ وہ جیت جاتا!!

میرے وطن میں مدتوں سے ایک دستور چلا آرہا ہے۔ اس دستور کے مطابق عورت یا کسی اور شئے پر دو اشخاص کے درمیان تنازعہ کی صورت میں فیصلہ ایک مقابلہ پر منحصر ہوتا ہے دونوں فریقین کے درمیان ہونے والے اس مقابلے کا نام "ڈوئل" ہے۔ آپ یقین کریں اس مقابلے کے بعد متنازعہ مسئلہ ضرور حل ہو جاتا ہے۔

اس مقابلہ کا انتظام باقاعدہ ایک کمیٹی کے سپرد ہوتا ہے۔ یہ کمیٹی ایک ایسے مکان کا انتظام کرتی ہے جس میں صرف ایک دروازہ والا ایک کمرہ ہوتا ہے۔ دروازہ بند ہونے کے بعد یہ کمرہ اندر سے بالکل تاریک ہو جاتا ہے۔ پھر زمین پر سطح سے کوئی انگل بھر اونچی ریت بچھا دی جاتی ہے۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ چلنے سے کسی قسم کی بھی آواز یا چاپ بلند نہیں ہونے پاتی۔

دونوں فریقوں کے تمام کپڑے اتروا لئے جاتے ہیں البتہ انھیں ایک ایک چاقو ہاتھ میں رکھنے کی اجازت ضرور ہوتی ہے۔ اس کے بعد فریقین میں سے ایک کو ایک گوشے میں اور دوسرے کو اس کے مقابل دوسرے گوشے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بچنے والے بقیہ دو گوشوں میں ایک ایک سانپ بھی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے فوراً بعد کمیٹی کے اراکین باہر آ جاتے ہیں اور دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ یہاں سے یوں سمجھے کہ ڈوئل کا آغاز ہوتا ہے۔

بند دروازہ کے باہر آدمیوں کی ٹولیاں فاتح کے باہر نکلنے کا انتظار صرف ایک منٹ تک کرتی ہیں اور بس۔ اس کے بعد بھی اگر دونوں فریقوں میں سے کوئی باہر نہیں نکلتا تو کمیٹی کے اراکان تیل کے خالی ڈبوں سے بند دروازے کو چُن دیتے ہیں، پھر لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں کیونکہ کسی کو کچھ پتا نہیں ہوتا کہ جیتنے والا باہر کب نکلے گا۔ کبھی کبھی دو دو روز اندر جنگ جاری رہتی ہے۔ دروازہ کھلنے کی صورت میں خالی ڈبے گر کر آواز پیدا کر دیتے ہیں اور اس طرح رات ہو یا دن گاؤں کی ساری آبادی کو خبر مل جاتی ہے کہ فاتح باہر آ چکا ہے۔

اس جنگ میں صرف ایک منٹ میں جیتنے والے بہت کم لوگ دیکھے گئے ہیں سچ پوچھے تو ڈوئل بڑے صبر، احتیاط اور مہارت کا کھیل ہوتا ہے۔ دونوں حریفوں میں سے ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنا سراغ دیئے بغیر ہی دوسرے کو جا لے اور ختم کر دے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سارا کھیل دل و دماغ پر مکمل کنٹرول کا کھیل ہوتا ہے کچھ گھنٹے اندھیرے میں گزرنے کے بعد سے ہی دماغ پر دھندسی طاری ہونے لگتی ہے۔ اور ایک لمحہ کی چوک کو موت کا پیغام بنتے دیر نہیں لگتی۔

کمرے میں سانپ چھوڑنے کا مقصد بھی ایک ہوتا ہے۔ مقصد دراصل یہ ہوتا ہے کہ دونوں حریف برابر کا خطرہ محسوس کرتے رہیں۔ چنانچہ بعض اوقات اسی خوف کے باعث دونوں حریف بغیر لڑے ہی معاملہ طے کر کے اپنی اپنی جانیں بچا لیتے ہیں۔ البتہ سارے گاؤں والوں کا عقیدہ ہے کہ اگر ہر دو اشخاص میں لڑنے کی نیت خراب نہیں ہے

تو وہ سانپ کی موجودگی کے بعد بھی ضرور لڑیں گے ــــ بالکل
ایسا ہی معاملہ ڈے منڈو اور پی ٹو کا تھا۔ یہ دونوں ہی میرے چچیرے
بھائی تھے۔ ہمارے گاؤں میں ہر شخص اگر سگا بھائی نہیں ہوتا تو چچیرا
بھائی ضرور سمجھا جاتا ہے۔

ڈے منڈو کو گاؤں میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔
اس کی عمر کوئی تیس برس تھی۔ اس کا رنگ سیاہ جسم مضبوط اور قد لانبا
تھا۔ اس کے چہرے پر اگی ہوئی مونچھیں ہمیشہ تیر کی طرح اوپر اٹھی رہا
کرتی تھیں۔ ڈے منڈو کا خیال تھا کہ اسے کوئی مرد شکست نہیں دے
سکتا اور نہ ہی کوئی عورت اسے نظرانداز کرسکتی ہے۔ کسی حد تک اس
کا کہنا صحیح بھی تھا۔

پچھلے دو برس میں وہ کوئی پانچ بار ڈوئل لڑ چکا تھا اور ہر
بار فتح اسی کی ہوئی تھی۔ مشکل سے کوئی پانچ دس منٹ لگے ہوں گے
اسے ہر ڈوئل جیتنے میں۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ اسے ان ڈوئلوں
میں ایک ہلکا سا زخم تک نہیں آیا تھا۔ یہ بات ہمارے گاؤں کی تاریخ
میں ایک بالکل نئی چیز تھی۔ ہر سال وہ کوئی مہینے دو مہینے کے لئے
باہر جاتا تھا اور جہازوں پر کام کرکے واپسی پر اپنے ساتھ خاصا
سامان لایا کرتا تھا۔ ان اشیاء میں بیرونی دنیا کی بنی ہوئی عجیب
عجیب چیزیں ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً مٹھائیاں۔ کنگھے۔ تیل۔ خوشبو۔
کھلونے وغیرہ۔

پی ٹو بھی ڈے منڈو ہی کی مانند میرا چچیرا بھائی تھا۔ ڈے
منڈو کے برخلاف ہم سب پی ٹو کو بے حد پسند کرتے تھے۔ اس کا قد بھی
لمبا تھا اور وہ چھریرے جسم کا ایک نوجوان تھا عمر میں وہ مجھ سے کوئی
تین چار ماہ بڑا رہا ہوگا۔ اس کی مسیں ابھی ابھی بھیگنی شروع ہوئی تھیں
لیکن وہ اپنے کو پورا آدمی سمجھنے لگا تھا۔ پی ٹو کا رنگ گندمی تھا۔ اور
چھریرا تیلا ہونے کے باعث اس پر گاؤں کی نوجوان لڑکیوں کی نظریں
اکثر پڑتی رہتی تھیں۔ سمندر کے کنارے میں۔ پی ٹو کے ساتھ اکثر سیر کے
لئے جایا کرتا تھا۔ وہیں انجیا بھی آجایا کرتی تھی اور پھر انجیا اور پی ٹو
بڑی دیر تک بھیگی ریت پر گھروندے بنا بنا کر توڑا کرتے تھے۔ انجیا
ہمارے گاؤں کی چند خوبصورت لڑکیوں میں سے ایک تھی وہ صرف
خوبصورت ہی نہیں بلکہ خاصی سنجیدہ بھی تھی۔ عمر میں وہ پی ٹو اور
مجھ سے سال دو سال چھوٹی تھی اور ہم میں بڑی اچھی دوستی تھی۔

اس دن بھی میں انجیا اور پی ٹو سمندر کے کنارے ریت
کھودنے کے شغل میں لگے ہوئے تھے کہ گھومتا گھامتا ڈے منڈو بھی
ادھر آنکلا۔ ہم نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور ریت میں سے گھونگھے
اور سیپیاں نکال نکال کر اپنے تھیلوں میں بھرتے رہے۔

ڈے منڈو چند لمحے ہمیں دیکھتا رہا پھر اس نے اپنی جیب سے
ایک چھوٹی سی چمکتی ہوئی سنہری شیشی نکال کر انجیا کی گود میں اچھال
دی۔ انجیا نے متحیر ہوکر شیشی کو اٹھالیا اور ڈے منڈو کی سمت
دیکھنے کے بجائے اپنی نظریں نیچی ہی رکھیں۔ میں اور پی ٹو اب بھی اپنے
کاموں میں مصروف رہے۔

ڈے منڈو نے انجیا کے تحیر کو بھانپتے ہوئے جھک کر اس سے
شیشی لے لی اور پھر اس نے چند ہی لمحوں میں ناخن سے کھرچ کر اس کی
ڈاٹ کھول دی۔ ڈاٹ کھلتے ہی خوشبو کا ایک ننھا سا بھبکا سا اٹھا اور ہمارے
چاروں طرف پھیل گیا۔ نتیجہ میں ہم دونوں نے بھی ہاتھ روک لئے اور
ادھر دیکھنے لگے۔ ڈے منڈو نے ایک بار پھر ہاتھ بڑھایا اور شیشی
انجیا کو دے دی۔ انجیا نے شیشی لے کر ایک بار اسے نتھنوں سے لگایا
اور پھر اس نے وہ شیشی پی ٹو کو تھمادی۔

پی ٹو جو گھٹنے کے بل زمین پر جھکا ہوا تھا شیشی لے کر اٹھ کھڑا
ہوا۔ پھر اس نے شیشی ڈے منڈو کو واپس دینے کے لئے ہاتھ آگے
بڑھا دیا۔ جواب میں ڈے منڈو کا ہاتھ گھوما اور شیشی پی ٹو کے ہاتھ
سے نکل کر دور جاگری۔ گرم ہوتے ہوئے ڈے منڈو نے کہا۔

" ننھے بچے ــــ میں نے یہ شیشی انجیا کو تحفتاً دی تھی۔"

" انجیا کو تحفہ صرف میں دے سکتا ہوں" پی ٹو نے سنجیدگی
سے کہا "صرف میں" اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوتا چلا جارہا تھا۔
اس کی آنکھیں ڈے منڈو کے جسیم ہیولے پر جمی ہوئی تھیں یکایک ڈے
منڈو نے ایک طنزیہ قہقہہ بلند کیا۔ پھر چند ہی لمحوں میں آس پاس
کے دوسرے لوگ بھی اس قضیئے میں دلچسپی لینے کے لئے ادھر ہی
متوجہ ہوگئے۔

ڈے منڈو کا یہ قہقہہ دراصل اس غصہ کی ابتدار تھی جو اس پر طاری ہوتا جا رہا تھا۔ رک کر اس نے کہا "ہوں ـــ تمہارا خیال ہے کہ صرف تم ہی انجیا کو تحفہ پیش کر سکتے ہو اور بس۔ مگر ننھے بچے یاد رکھو ـ تم ابھی بچے ہو۔ تحفہ تو صرف میرے جیسا جوان ہی کسی کو پیش کر سکتا ہے ـ کیا سمجھے !!"

" میں بھی تم سے کم تو نہیں ـــ" پی ٹو کا لہجہ یکایک پورے آدمی کی آواز لئے ہوئے ابھرا۔

پی ٹو کی ماں اسی لمحے بھاگتی ہوئی ادھر آئی اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی ـــ "بیٹے بھاگ کر ذرا بچھڑے کو تو پکڑنا۔ اس نے رسی تڑا لی ہے ـ ؟"

جواباً پی ٹو نے اپنی ماں کو ایک طرف آہستگی سے ہٹا دیا۔ اسی وقت طنز کرتے ہوئے ڈے منڈو نے اپنا بھاری بازو انجیا کے شانے پر رکھ دیا اور پی ٹو کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

ایک بڑے ہنگامے کی ابتدار ہو چکی تھی اس لئے دستور کے مطابق ڈے منڈو کو اس کا ایک دوست وہاں سے ہٹا لے گیا۔ اور پی ٹو کا دوست ہونے کے باعث پی ٹو کو ہٹانے کا فرض مجھے انجام دینا پڑا۔ انجیا اب بھی وہیں کھڑی رہی اس کی نظریں زمین پر پڑی ہوئی شیشی پر جمی ہوئی تھیں۔ ہمارے ہٹتے ہی اس نے جھک کر زمین پر پڑی ہوئی شیشی اٹھا لی۔

اسی روز شام میں ہم کئی احباب اور عزیز پی ٹو کے مکان پر جمع ہوئے۔ میں نے ایک اچھا سا چاقو حاصل کیا اور اسے تیز کرنے میں مصروف ہو گیا۔

ہمارے درمیان دوسرے دن ہونے والی ڈوئل پر کوئی بات چیت نہیں ہو رہی تھی۔ ہم لوگ تو دراصل اپنی دوستی کے اظہار کے لئے وہاں جمع ہوئے تھے۔

پھر تھوڑی دیر بعد پی ٹو کا باپ پی ٹو کے تینوں بوڑھے چچاؤں کے ساتھ ہم میں آ شامل ہوا۔ پی ٹو کے تینوں چچا پہلے "فاتحین" میں سے تھے اور خیال تھا کہ پی ٹو اپنے آمدہ جنگ کے لئے ان سے بہت کچھ سیکھ سکے گا۔

" دروازہ بند ہوتے ہی ..." بوڑھے چچا چاکو نے پی ٹو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "فوراً ہی اپنے گوشے میں بیٹھ جانا۔ اپنا چاقو یوں پکڑنا۔ ڈے منڈو اگر دوڑ کر تم تک آیا تو وہ اوپر وار کرے گا تم یوں نیچے محفوظ رہو گے۔"

" نہیں نہیں۔۔" دوسرے بوڑھے چچا کنتو جو نابینا تھے۔ بولے "یوں نہیں تم فوراً ہی گوشے میں بائیں سمت ایک قدم سرک جانا۔"

" بیکار بات ہے" تیسرے چچا جینا نے اپنا رعشہ زدہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا ـ ڈے منڈو اتنا بیوقوف نہیں ہے۔"

" خیر خیر ـ اس صورت میں تم دیوار سے لگے کھڑے رہنا" چچا چاکو نے ایک اور مشورہ دیا۔

" غلط بات ہے" چچا جینا نے پھر کہا "سانپ کو کیوں بھولتے ہو۔ سانپ دیوار سے لگ کر ہی بڑھے گا اسے دراصل کسی سوراخ کی تلاش ہو گی۔ اس کے چلنے کی آواز پر تم گھبرا کر ہٹو گے اور ڈے منڈو تمہاری پوزیشن سے واقف ہو جائے گا ـ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ تم زمین پر لیٹ جانا۔"

" ہاں یہ کسی حد تک ٹھیک ہے" چچا کنتو نے کہا ـ "اور اپنے پیر دیوار کی طرف رکھنا۔ اپنے اوپر ریت بکھیرنا بھی نہ بھولنا۔ اس صورت میں سانپ اگر آیا بھی تو وہ تمہارے اوپر سے گذر جائے گا۔ یہی نہیں ڈے منڈو کے قدموں کی چاپ بھی تم زمین پر لیٹ کر باآسانی سن سکو گے۔"

" اور ہاں" چچا چاکو نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا "وقت کا خیال ضرور رکھنا۔ صبح ہوتے ہی گاؤں کے جانور اپنی آواز بلند کرتے ہیں، یہ وہ موقع ہوتا ہے کہ تم دشمن کو دھوکا دے سکو۔ آہستگی سے حرکت کرنا۔ میں اسی طرح جیتا تھا۔"

" مجھے یاد پڑتا ہے ـ" چچا کنتو نے سوچتے ہوئے کہا "دوسرے دن میرے مقابل نے مجھ سے سرگوشیوں میں بات کرنی شروع کر دی تھی وہ بغیر لڑے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ ہم پھر دروازے تک جا پہنچے تھے اور وہیں میں نے اپنا کام کر لیا تھا ـ"

" ٹھیک ہے" چچا جینا نے کہا "حریف کی کسی بات پر یقین مت کرنا۔ اور دیکھو حرکت کرتے وقت بدن کو جھکائے رکھنا اس سے

الشجاع

سانپ کو گرمی محسوس ہوگی اور وہ تم سے دور رہے گا۔"

ادھر مشورے پر مشورے دیئے جاتے رہے اور پھر میں نے چاقو کو تیز کر کے ایک بار اس کی دھار کو انگلی پر آزمایا۔ چاقو بے حد تیز ہو چکا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر پی ٹو کو دیکھا۔

پی ٹو اپنے چچاؤں کے درمیان گھرا خاموش بیٹھا تھا۔ شاید بوڑھے فاتحین کی باتیں اس کے پلّے نہیں پڑ رہی تھیں۔

" اگر تمہاری حرکت کوئی آواز پیدا کر دے تو اس جگہ سے تیزی سے ہٹ جانا۔" چچا کنتو نے کہا۔

" لڑکا ابھی نوجوان ہے۔" چچا جینا نے پی ٹو کے باپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "اس نے شراب اور تمباکو سے اپنے جسم کو خراب نہیں کیا ہے۔ ڈے منڈو اس کے برخلاف شرابی بھی ہے اور تمباکو نوش بھی اس طرح پی ٹو کا پلّہ بہرحال بھاری کہا جا سکتا ہے۔"

" تم ٹھیک کہتے ہو۔" چچا جینا نے سوچتے ہوئے لمبی سانس لی۔" مگر ڈے منڈو پانچ بار لڑ چکا ہے اور ہر بار جیت اسی کی ہوئی ہے۔"

" قسمت! اسے قسمت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"

" میرا خیال ہے اسے کوئی ایسا گر معلوم ہے جو ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم..." جواب میں خاموشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھوں کی پارٹی منتشر ہوئی تو پی ٹو نے میری طرف دیکھا۔ میں نے خاموشی سے اسے تیز کیا ہوا چاقو تھما دیا۔ میں نے چاقو کو اچھی طرح تیز کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں اس سے پہلے بھی دو بار ڈے منڈو کا چاقو دیکھ چکا تھا۔ یہ چاقو بیرونی دنیا کا بنا ہوا تھا اس کے دستے پر جواہرات سے جڑے تھے اور کچھ عجیب سی شکل تھی اس کی۔ عجیب اور خوفناک۔ میں نے پی ٹو کی ہمت افزائی کے لئے اس سے کہا۔" پی ٹو۔ جو چاقو میں تمہارے لئے لایا ہوں۔ یہ ڈے منڈو کے چاقو سے کئی انچ لانبا بھی ہے اور چوڑا بھی۔"

جواب میں پی ٹو مسکرا دیا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔" میرے اچھے ساتھی۔ باقی باتیں چھوڑو۔ البتہ چاقو تم نے تیز خوب کیا ہے۔"

دوپہر کے قریب کمیٹی کے اراکین نے کمرے کا انتظام مکمل کر لیا۔ — سورج تیزی سے سر پر چمک رہا تھا۔ اسلئے کچھ لوگوں نے اندر جا کر معائنہ کیا کہ آیا کمرہ واقعی تاریک بھی ہے یا نہیں۔ دو ایک سوراخ چھت میں موجود تھے جنہیں فوراً بند کر دیا گیا۔ پھر اسی لمحے سانپ بھی لے آئے گئے۔

دروازے کے شمالی سرے پر ڈے منڈو اپنے چند دوستوں کے ساتھ کھڑا بڑے اطمینان سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ بات کرتے وقت اس کا لہجہ خاصا اونچا تھا اور شاید وہ جان بوجھ کر ہمیں سنانے کے لئے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے حریف کو شکست دے کر اسی کمرے میں دوپہر گزارے گا کیونکہ دن بے حد گرم ہے۔ شام کا پروگرام بھی اس نے بنا رکھا تھا۔

دروازے کے جنوبی سرے پر دستور کے مطابق پی ٹو بھی اپنے دوستوں کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن ہم لوگ بالکل خاموش تھے۔

چند لمحوں کے بعد انجیا بھی وہاں آ پہنچی۔ اس وقت اس نے اپنا بہترین لباس پہن رکھا تھا اور بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ پی ٹو اور ڈے منڈو کے درمیان جھڑپ کے بعد سے دستور کے مطابق وہ گھر سے پہلی مرتبہ نکلی تھی۔ اس وقت وہ دراصل دونوں فریقوں کو الوداع کہنے آئی تھی۔ ہمارے دستور میں یہ بات بھی شامل ہے۔

پی ٹو کو الوداع کرتے وقت انجیا کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نہ تھی۔ وہ پی ٹو کے زیادہ قریب بھی نہیں آئی بلکہ چند لمحوں اسے تک کر ڈے منڈو کی جانب بڑھ گئی۔ اب اس کی پیٹھ ہماری جانب تھی ہمیں پتا نہیں کہ اس وقت انجیا کے چہرے کے تاثرات کیا تھے۔ البتہ اس کے نزدیک پہنچتے ہی ڈے منڈو کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ پھر اس نے بڑے اطمینان سے اپنے دونوں ہاتھ انجیا کے شانے پر رکھ دیئے جواب میں انجیا نے بھی اپنے ہاتھوں سے اس کے سر کو چھوا اور پیچھے ہٹ گئی۔

" میری لڑکی۔ آج رات ہم ملیں گے۔ یہ کپڑے نہ اتارنا۔ یہ مجھے پسند ہیں۔" ڈے منڈو نے اس کے پیچھے ہٹتے ہی کہا۔

اس منظر پر میری ہی مانند خود پی ٹو بھی بھونچکا اور متحیر سا لگ رہا تھا۔ شاید اسے انجیا سے ایسے برتاؤ کی توقع نہ تھی۔ میری نظر میں انجیا نے جو برتاؤ ڈے منڈو کے ساتھ روا رکھا تھا اس کا مستحق تو دراصل پی ٹو تھا۔ کیونکہ پی ٹو محض انجیا ہی کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے

جا رہا تھا۔ میں نے سوچا عورت بھی کیا چیز ہے۔ شاید انجیا کو بھی ہماری طرح یقین تھا کہ پی ٹو بچ نہیں سکتا۔ غالباً اسی لئے اس نے اپنی محبت اب ڈے منڈو پر نچھاور کرنی شروع کر دی تھی۔ مجھے انجیا کی بے وفائی پر تعجب ہوا۔ اب مجھے پی ٹو کا چہرہ بے نور سا لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا اب اس کے پاس وہ طاقت بھی نہیں رہی تھی جس کے بل بوتے پر ممکن تھا کہ وہ جیت جاتا۔ پی ٹو بلا وجہ مارا جائے گا۔

اس کے فوراً بعد ہی کمیٹی کے اراکین کے ساتھ ڈے منڈو اپنا ہاتھ ہلاتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمیٹی کے اراکین نے واپسی پر اس کے کپڑے لا کر ایک طرف ڈال دیئے۔

اس کے بعد پی ٹو نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے پھر ہماری طرف مڑا۔ ہمیں نظروں ہی نظروں میں الوداع کہتا ہوا وہ بھی کمرہ میں داخل ہو گیا۔ کمیٹی کے اراکین جب باہر آئے تو ان کے ہاتھ میں پی ٹو کے کپڑے دبے ہوئے تھے۔

اس رسم کے ختم ہونے پر کمیٹی کے سربراہ نے سانپ کا تھیلا ہاتھوں میں سنبھالا اور اندر داخل ہو گیا پھر جلد ہی وہ واپس نکل آیا اب اس کے ہاتھ میں دبا تھیلا خالی تھا۔ اس نے دروازے پر رک کر اندر کی جانب جھانکتے ہوئے کہا "تم میں سے ایک کو ہمارا آخری سلام"۔ پھر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

دروازے پر رسم کے مطابق فاتح کا ایک منٹ تک انتظار کیا گیا۔ لیکن جب کوئی نہ نکلا تو تیل کے خالی کنستر دروازہ پر بجنے جانے لگے۔ ابھی یہ سلام جاری ہی تھا کہ ہمیں تاریک کمرے میں سے گونجنے والی ایک تیز چیخ سنائی دی۔ اور یہ چیخ بلاشبہ میرے ساتھی پی ٹو کی تھی۔

مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ وہاں سے تھکے قدموں سے ہٹ کر میں ساحل سمندر پر جا کھڑا ہوا اور میں نے قسم کھائی کہ میں ڈے منڈو سے اپنے دوست کی موت کا انتقام ضرور لوں گا۔

رات بھر ہم وہاں رہے صبح ہوئی تو میں اپنی ماں کیساتھ گھر واپس چلا آیا میرا مکان گاؤں سے ذرا ہٹ کر واقع ہے۔ میں اس وقت غالباً گلے کو چارا ڈال رہا تھا جبھی میرے کانوں میں خالی کنستروں کے بجنے کی پر شور آواز آئی۔

میں اپنا کام چھوڑ کر پوری رفتار سے ادھر بھاگا۔ اور جب میں تاریک کمرے کے نزدیک پہنچا تو اس وقت تک پی ٹو اپنے کپڑے پہن چکا تھا اور کمیٹی کے اراکین ڈے منڈو کے چاقو کا معائنہ کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مقتول ڈے منڈو کا چاقو دبا ہوا تھا۔ یہ چاقو ہینڈل سے دراصل کھل سکتا تھا۔ ڈے منڈو اس ہینڈل میں سیل رکھتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ٹارچ میں رکھے جاتے ہیں اور پھر وہ چاقو ٹارچ بن جاتا تھا۔ اندھیرے میں اس ننھی ٹارچ کی روشنی کسی کو اندھا کرنے کے لئے کافی تھی۔ لوگوں کی سمجھ میں اب آ رہا تھا کہ ڈے منڈو نے کس طرح پانچ ڈوئیلیں جیتی تھیں۔

پی ٹو بھی دراصل اسی ٹارچ نما چاقو کے باعث چیخا تھا۔ اگر اس کا دماغ کام نہ کرتا تو شاید وہ بھی ختم ہو گیا ہوتا۔ اس نے فوراً جھک کر مٹھی بھر کر ریت اُدھر اچھال دی تھی جدھر ڈے منڈو کھڑا تھا۔ نتیجے میں ڈے منڈو کی آنکھیں ریت سے بھر گئی تھیں اور مجبوراً اسے روشنی گل کرنی پڑی تھی۔

"مگر تمہیں پتا کیسے چلا تھا کہ ڈے منڈو کدھر ہے" چچا جاکو نے پوچھا

"چچا" ہنستے ہوئے پی ٹو نے کہا — "ابھی نہیں چچا — ابھی مجھے بوڑھا ہو لینے دو۔ پھر میں بتاؤں گا کہ میں نے کیسے اپنے حریف کو زیر کیا تھا"

اس کے بعد وہ ادھر چل پڑا جدھر انجیا کھڑی تھی۔ اپنے ہونٹوں پر ایک خوبصورت سی مسکراہٹ لئے۔ پھر اس کے بعد جو گفتگو ان کے درمیان ہوئی اسے سوائے میرے شاید ہی کسی نے سنا ہو۔

"میں بہت دیر کے بعد سمجھا تھا انجیا۔ بہت دیر کے بعد کہ تم نے ڈے منڈو کو الوداع کہتے وقت "خاص مراعات" کیوں بخشی تھی۔ اور ہاں —" رک کر پی ٹو نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ انجی۔ تم نے اپنے ہاتھوں کو اچھی طرح دھو لیا ہے کہ نہیں —" ؟

"خوب اچھی طرح — میرے پیارے"

"خوب — پی ٹو نے اس کے ہاتھوں کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "میں نقلی خوشبو قطعی پسند نہیں کرتا"

پھر وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اپنے گھر کی طرف بڑھ گئے — (پلاٹ پی رائٹ سے ماخوذ)

رشیدہ رضویہ

سفر پارہ
(۵)

کراچی کا پانی بصرے کا دریا

۲۷ ستمبر کی صبح ہم تھے اور بغداد کی گلیاں کیونکہ بصرہ سے بغداد جانے کے لئے باقاعدہ بصرہ کے فوجی گورنر کے اجازت نامے کی ضرورت تھی۔ جو بروقت مل نہ سکا۔ اس لئے ۲۷ کے بجائے ۲۹ ستمبر کی سیٹیں مخصوص ہوئیں اور بصرہ کی تفریح کے لئے کچھ وقت مل گیا۔ بصرہ مختصر سا ساحلی اور تجارتی شہر ہے۔ جہاں کوئی اجنبی بھی اجنبی نہیں رہ سکتا ہندوستانی اور پاکستانی درزی کافی تعداد میں یہاں آباد ہیں اور دولت کما کر خود کو رئیس قرار دیتے ہیں۔ یہ درزی ایک ہی طویل و تنگ بازار میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں کا دریا بھی جو شہر کے درمیان بہتا ہے، انتہائی گندا اور کراچی کے کسی نالہ سے مشابہ ہے۔ یہ غالباً دجلہ ہی ہے۔ لیکن بغداد کے دجلہ سے قطعی مختلف! ایک کشادہ سی سڑک پہ ایک چھوٹا سا پارک ہے جسے اہل بصرہ لندن کے خوبصورت پارکوں سے بھی بہتر تصور کرتے ہیں اور افتخار کرتے ہیں کہ یہاں ملکہ بہار کا جلوس بھی نکلتا ہے۔ سیاست کے معاملے میں یہ شہر کافی سرد ہے اور عموماً غیر جانبداری کا ثبوت دیتا ہے۔ گو سیاسی جماعتوں کی شاخیں یہاں موجود ہیں۔

عدنان کے گھر کے سامنے ہی ایک آشوری خاندان کی کوٹھی تھی۔ گھر کی بہو نے ہمیں اپنے گھر بلایا۔ اور ساس نندوں کی غیبت شروع کر دی۔ لیکن جب ساس نندیں گھر آئیں تو ان کی خوشامدوں میں لگ گئی۔ اور میری سمجھ میں نہ آیا۔ برا در اصل کون ہے۔ اور اچھا کون؟ ساس بہو کے جھگڑے بھی کہاں کہاں تھے؟

بصرہ میں عراق سپورٹس میں ڈاکٹر سہگل سے آخری مرتبہ ملاقات ہوئی اور شہر بھر کی خاک چھان ڈالنے کے بعد ۲۹ ستمبر کی شام بذریعہ ٹرین بغداد کی راہ لی۔

الشجاع

ایک پورا ڈبہ ہم بہنوں اور بھائیوں کے پاس تھا، ساتھ کے ڈبہ میں کچھ فوجی بڑے سوز سے بربط پہ نغمے گا رہے تھے۔ ان کی درد بھری آواز ہر طرف گونجتی اور دل میں آگ لگاتی تھی۔ یہ سپاہی کردستان جا رہے تھے۔ جہاں بارزانی کے باغی برسرپیکار تھے۔ برطانیہ برابر کردوں کو نئی عراقی حکومت کے خلاف اکسا رہا تھا۔ کریم قاسم کے سامنے مسائل ہی مسائل تھے۔ بغداد اور موصل میں باغی عنصر حکومت سے الجھ رہا تھا۔ نئی حکومت کا استقلال خطرہ میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر چیز ہر جگہ فوجی تحفظ میں تھی۔ شب کے بارہ بجے چار فوجی افسر ٹرین میں تحقیقات کے لئے سوار ہوتے اور ایک ایک ڈبہ اتھل پتھل کر ڈالا۔ بغیر اجازت نامہ کوئی عراقی بھی ایک شہر سے دوسرے شہر نہ جا سکتا تھا۔ فوجی افسران کے علاوہ پولیس بھی سوار ہوئی جو سامان کی تلاشی لیتی تھی۔ ہمارا سامان بصرہ کسٹم پاس کر چکی تھی اس لئے معافی مل گئی۔ اور ۳۰ ستمبر کی صبح گیارہ بجے ہم بغداد۔ اسی پیارے بغداد پہنچ گئے۔ بغداد کے وہی بیل و نہار تھے اور دجلہ کا رنگ زیادہ گہرا اور سرخ ہو گیا تھا۔ انقلاب ۱۹۵۸ء کے بعد قتل و غارت ایک مشغلہ بن گیا تھا۔ کریم قاسم نیک طبع اور شریف النفس انسان تھا۔ ماحول اسے پاگل کئے دے رہا تھا اور موت آنکھوں کے عین سامنے ناچتی تھی۔ لیکن حکمرانوں کو موت یہاں کب اپنے سامنے نظر نہ آئی تھی۔ اور اس طلسماتی شہر میں خانہ جنگیاں کب نہیں ہوتی تھیں۔ یہ شہر بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ ابتدا میں یہ ساسانیوں کا ایک چھوٹا سا قریہ تھا۔ ۷۶۲ء کی ایک دلآویز صبح بہار کی لطیف، جنون خیز ہوائیں دجلہ کے پانی کو چھوتی اِدھر اُدھر دوڑتی پھرتی تھیں۔ ادھ کھلے پھولوں کی مہک ہر طرف پھیلی تھی کہ ایسے ہی

اکتوبر ۱۹۶۷ء

تازگی بخش لمحات میں خلیفہ منصور اپنے مصاحبین کے ہمراہ دارالخلافہ کے لئے کوئی مقام پسند کرنے نکلا۔ کوفہ کے خلیفہ ابوالعباس کا یہ بھائی اور عباسیوں کا عظیم بادشاہ فرات سے ہوتا دجلہ تک جا پہنچا اور اپنے مصاحبین و چند فلاحین کے مشورہ سے فیصلہ کر لیا کہ ساسانیوں کے اس قریہ کو اپنا دارالخلافہ قرار دے گا۔ بسم اللہ پڑھ کر اس نے نئی بستی کا سنگ بنیاد رکھا۔ چار سال کے عرصہ میں شہر بغداد زر کثیر صرف کر کے تعمیر کیا۔ یہ شہر بابل و نینوا اور اُر کی دولت اور آثار قدیمہ سے معمور تھا۔ اور حسن و جمال۔ شان و شوکت اور ارتقا کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ایرانی رسم و رواج۔ روایات و فیشن بھی اختیار کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ایرانی القاب۔ ایرانی شراب۔ بیویاں لونڈیاں۔ قالین اور رقص و موسیقی یہاں کی زندگی میں شامل ہو گئی۔ جفاکش و جنگجو عرب عیش و عشرت میں پڑنے لگے۔ عجمی فکر و خیال اور فلسفہ و سائنس نے عربوں کا رخ حیات ہی بدل دیا۔ منصور کے پوتے ہارون الرشید نے بغداد کو انتہا تک پہنچایا۔ دنیا کے گوشہ گوشہ سے لوگ گویا کسی طلسم کے زیر اثر یہاں چلے آتے تھے ہارون الرشید کا بغداد گویا موسم بہار تھا جس سے ہر چمن گلزار تھا۔ بے فکری و شادمانی کے دھارے بغداد کے گلی کوچوں میں بہتے تھے۔ ان دھاروں کے کنارے زندگیاں رقص کرتیں۔ رقص اور فن موسیقی بھی عہد رشیدیہ میں اپنی انتہا تک پہنچ گیا تھا۔ بغداد کی گلیوں میں رقص و سرود کی محفلیں بپا ہوتیں۔ اس کی نالیوں میں شراب بہتی۔ دجلہ کی ہر لہر بغداد کے ادبا۔ مترجمین۔ مفکرین اور فلاسفر کے لئے نئی کتاب، نیا نظریہ بن کر آگے بڑھتی۔ یہ بغداد ابونواس کا تھا۔ آل برامکہ کا تھا۔ جن سے ہارون الرشید تک حسد کرنے لگا تھا۔ اسی حسد کے زیر اثر ہارون الرشید نے یحییٰ برمکی کے بیٹے جعفر کا سر دجلہ کے پل پر لٹکا دیا آل برامکہ کو تباہ کر دیا۔

ہارون الرشید اپنے اتالیق اور وزیر یحییٰ برمکی کی مدد سے اپنے بھائی ہادی کو قتل کر کے ۱۴ ستمبر ۷۸۶ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ بغداد کو ایک ایسا شہر بنا دیا تھا جس کے کشادہ بازار۔ بلند و بالا مساجد اور عالیشان حمام دیکھ کر عقل دنگ ہوتی تھی اور ہندوستان الشہاب

خراسان۔ چین و افریقہ کے تجارتی قافلے یہاں آتے تھے۔ یہی نہیں۔ بغداد سے تعلیم حاصل کئے بغیر نہ کسی عالم کو شہرت نصیب ہوتی تھی۔ نہ وہ علما میں شمار ہوتا تھا۔ بغداد ایک ایسی باعظمت سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ جو ہندوستان اور تاتار سے بحر اوقیانوس تک پھیلی تھی اور ماسوا اسپین باقی تمام اسلامی دنیا ہارون الرشید کے تابع تھی لیکن ایرانی مزاج نے اس مملکت کو ختم کر دیا۔ یہاں امام موسیٰ کاظم قتل ہوئے اور خوارجیوں نے زور پکڑا۔ اور ہارون الرشید کے بعد بغداد خانہ جنگیوں کی آماجگاہ بن گیا۔ امین و مامون میں تخت کی خاطر جنگ ہوئی۔ امین مارا گیا۔ مامون برسر اقتدار آیا تو ہارون الرشید کے بغداد کو تباہ کر دیا جو دجلہ کے مغربی کنارے کرخ میں واقع تھا۔ مامون نے مشرقی کنارے۔ صافہ میں اپنا شہر آباد کیا۔ مامون کے بعد ہارون الرشید کی ترک لونڈی کا بیٹا معتصم آیا۔ تو بغداد کے بجائے سامرہ کو دارالخلافہ قرار دیا اور یہیں سے بغداد کا زوال شروع ہوا۔ بغداد سلجوقی ترک طغرل بیگ کے ہاتھ آ گیا۔ اغتائی کے بیٹے ہلاکو نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور عباسی حکومت نیست و نابود ہو گئی۔

عثمانی ترکوں کے زیر اثر دنیائے شہرزاد نے از سر نو عظمت حاصل کی۔ لیکن عربوں نے برطانیہ سے سازشیں کر کے ترکوں کو عراق سے دھکیل دیا۔ عراق نوری السعید کے ہاتھ آیا۔ نوری السعید ۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کو ختم ہوا۔ اور سات اکتوبر ۱۹۵۹ء کی شام چھ بجے ہم نے کریم قاسم پہ قاتلانہ حملہ کی خبر سنی۔

حملہ کیسے ہوا ؟

کریم قاسم کے قتل کی اس سازش میں کامل چھ ماہ اور پانچ ہزار دینار صرف ہوئے تھے۔ کریم قاسم کے برسر اقتدار آتے ہی ۱۹۴۱ء کی تحریک آزادی کے ایک لیڈر رشید علی گیلانی نے ایک سازش تیار کی تھی۔ حالانکہ طویل جلاوطنی کے بعد کریم قاسم کی دعوت پہ بغداد آیا تھا۔ چونکہ خود کو بغداد کا جائز حکمران تصور کرتا تھا۔ لہٰذا کریم قاسم کا جانی دشمن ہو گیا۔ اور عبدالسلام عارف کے ساتھ گرفتار

ہو گیا۔ اس گرفتاری کے بعد موصل میں بغاوت ہوئی۔ بغاوت ناکام ہوئی۔ اور اس کے سرغنہ کرنل شوّاف اور طبقا چلی مارے گئے۔ تو حزب البعث نے فی الفور نئی سازش تیار کی۔ جس کے تحت دمشق سے ایک لاری اسلحے سے بھر پور بغداد آئی اور حزب البعث کے جوانوں میں تقسیم ہو گئی۔ عراق کے ایک سابق وزیر فواد الرکابی نے اپنے ساتھی حبیب فیصل خوبران کے ساتھ سازش تیار کر کے عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک چھبیس سالہ طالب علم ایاد سعید ثابت کے سپرد کر دی۔ ایاد حزب البعث کا سرگرم کارکن اور بغداد کے ایک اخبار کے دولتمند مالک کا لاڈلا بیٹا تھا۔ اس کی بہن کا منگیتر حمید مرعی خالص دمشقی تھا۔ اور بغداد سے مفرور تھا۔ دوران سازش بدوی بھیس میں غلط نام سے بغداد آیا۔ اور حزب البعث کے زمین دوز دفتر میں سازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔ سازش میں حزب البعث کے ۷۸ کارکن شریک تھے۔ سب سے کم عمر کارکن ۱۹ سالہ فوجی سپاہی عبدالمنعم قدوس تھا۔ اور سب سے زیادہ عمر کا کارکن ۵۱ سالہ ٹرک ڈرائیور توفیق لدیدی تھا۔ جو اسلحہ لے کر بغداد آیا تھا۔ سازش کا دائرہ بغداد تا میتب اور میتب تا رومادی پھیلا تھا۔ تاکہ ناکامی کی صورت میں بہ آسانی راہ فرار اختیار کی جا سکے۔

حزب البعث کے نوجوانوں نے راس القریہ شارع الرشید دو فلیٹ کرائے پہ لئے۔ ایک فلیٹ میں حزب البعث کے ایک ڈاکٹر نے اپنا مطب قائم کیا۔ اور دوسرے فلیٹ میں مختلف اراکین جمع ہو کر تبادلہ خیال کرتے اور شارع الرشید کی ایک گلی میں واقع قہوہ خانہ میں بیٹھ کر ان مقامات کی نشان دہی کرتے جہاں سے کریم پہ فائرنگ کا ارادہ تھا۔ فائرنگ اور کریم قاسم کی موت کے لئے سات اکتوبر ۱۹۵۹ء کی شام مقرر کی گئی۔

سات اکتوبر کی شام ساڑھے پانچ بجے حزب البعث کے دو جوان قلعی گر کا جیسا بھیس بدلے ڈاکٹر کے مطب میں داخل ہوئے۔ اور اس دیوار پہ قلعی کرنے لگے۔ جو کئی روز سے ان کے چونے اور برش کا نشانہ بن رہی تھی۔ دیوار پہ دو چار ہاتھ لگانے کے بعد ایک قلعی گر ڈاکٹر کا فون اٹھا کر اور نمبر گھما کر بولا۔ گاڑی پہنچ رہی ہے۔

یہ الفاظ بذریعہ فون دوسرے فلیٹ تک پہنچے۔ اور ایاد سعید ثابت چند ساتھی لے کر نیچے اترا۔ کچھ تو قہوہ خانہ میں اور کچھ گلی میں کھڑے ہو گئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ قہوہ خانہ کا مالک بھی شریک سازش تھا۔ کچھ سازشی چھوٹی چھوٹی پستولیں ہاتھوں میں چھپائے شارع الرشید کی فٹ پاتھ پہ تھے۔ ایاد سعید نے اپنی مرسی۔ ڈیز اٹھائی۔ اور شارع الرشید کا ایک چکر کاٹ کر راس القریہ پہ عین ان لمحات میں آ پہنچا۔ جبکہ کریم قاسم کی موٹر کے عین سامنے پہنچ کر راستہ روک دے اور پھر ہر جانب سے گولیاں وزیر اعظم کے سینہ میں پیوست ہو جائیں۔ لیکن مرسی ڈیز اور کریم قاسم کی موٹر کے درمیان اچانک ایک لاری آ کر حائل ہو گئی۔ جبکہ ایاد سعید اپنے ساتھیوں کو فائرنگ کا اشارہ بھی کر چکا تھا۔ لاری کی مداخلت سے گولیاں دو جانب سے چلیں۔ ایک گولی کریم قاسم کے بازو کو لگی۔ اور وہ تیزی سے سیٹ کے نیچے ہو گیا۔ بقیہ گولیاں سازشیوں کا ہی سینہ چیر کر رہ گئیں۔ کریم قاسم کا وفادار ڈرائیور اپنی جان پہ کھیل کر موٹر سازشیوں کے درمیان سے نکال کر لے گیا۔ سازشیوں کو اتنی مہلت نہ ملی۔ وہ محض ایک کو موٹر میں ڈال کر لے گئے۔ ایک نے وہیں سڑک پہ دم دے دیا۔ اور یہی تمام تر سازشیوں اور حزب البعث کے اراکین کی عام گرفتاری کا باعث بنا۔ نومبر کے اواخر تک تمام گرفتاریاں عمل میں آ گئیں۔ ۷۸ سازشیوں میں ۲۱ تو سات اکتوبر کی شام ہی مصر کی طرف فرار ہو گئے۔ اور بقیہ ۵۷ گرفتار ہو کر محکمۃ الشعب یعنی قومی عدالت میں آ گئے۔ قومی عدالت کی تمام عمارت مشین گنوں اور بھاری بھاری ٹینکوں سے آراستہ تھی۔ مسلح فوجی جوان چاروں طرف تھے۔ اور عمارت میں پریس رپورٹرز کے علاوہ روسی۔ چینی۔ بلغاری اور البانوی طلباء بھی موجود تھے۔

(باقی آئندہ)

بھارت چند کھنہ

گھر کے اسٹیج پر

گھر کے اسٹیج پر بیوی کا روپ وہ نہیں ہوتا جو گھر کے باہر ہوتا ہے گھر سے جب بیوی باہر نکلتی ہے تو اسی طرح متاط ہو جاتی ہے جس طرح پرائے دیس میں مسافر یا پانی پیتے وقت چڑیا۔ وہ بات کرتے شرماتی ہے، لجاتی ہے۔ بالکل خاموش جیسے منہ میں زبان نہیں۔ اور جب کبھی منہ کھولتی ہے تو پہلے بات کو تولتی ہے۔ آواز دھیمی، چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ جیسے کسی کلاکار نے سارنگی پر آہستہ سے ایک سُر کو ذرا سا چھیڑا اور بند کر دیا۔

بیچاری چپ چاپ اور موقعہ کے لحاظ سے مظلوم بنی بیٹھی رہتی ہے۔ آخر کار یہی خاموشی و معصومیت محفل پر گھٹا کی طرح چھا کر میاں شوہر کے لئے عذاب جان ثابت ہوتی ہے۔ جیسے دیکھیئے بیوی کا طرفدار اور شوہر کے در پئے آزار۔ آن کی آن میں ذرا سی بات بتنگڑ بن جائے تو غریب شوہر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نہ نکلے تو کیا کرے۔ غرض بڑی مشکل سے جان چھڑا کر اور بے آبرو ہو کر جب شوہر باہر نکلتا ہے یا اگر ملاقاتی اس کے اپنے ہی گھر آئے ہوں تو ان کے

- آنسو! بیوی کے ترکش کا آخری تیر ہیں۔
- ان کو آپ ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم سمجھئے جو نائٹروجن سے ملا کر بیوی روزمرہ کے استعمال کیلئے ہمیشہ تیار رکھتی ہے اور شوہر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

پھول جھڑتے ہیں، موتی بکھرتے ہیں۔ مٹھاس برستی ہے۔ ایسی خاموش، ایسی باحیا، ایسی نیک اور ایسی اچھی بیوی تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ جب بیوی کی تعریف کیلئے لوگوں کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر شوہر کی خوش قسمتی کا ذکر ہونے لگتا ہے۔ اور اگر شوہر نے کسی موقع پر بیوی کی شکایت میں غلطی سے اشارتاً بھی کوئی بات کہہ دی ہو تو پھر اسے ناشکرا، ناقدردان، بے عقل، جاہل، پاگل، بے وفا، ظالم، نادان، بدھو، احمق، نالائق، جھوٹا، مکار اور اسی اندازکی اور کتنی خصوصیات والا شوہر کہا جاتا ہے۔ بیچارا شوہر اپنی معمولی سی کی ہوئی تنقید کی تائید میں اگر غلطی سے یہ کہہ دے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی تو پھر بھری محفل میں اس کی گت بنتی ہے۔ محفل کے لوگ خصوصاً محفل کی دوسری بیویاں آنکھیں چمکاتی ہوئی اپنی اپنی باتوں میں زور پیدا کرنے کے لئے ہاتھوں کی چوڑیاں کھنکھناتی ہوئی ناگ دھمی ہسن کے ناگ کی طرح اچھل پڑتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر جال ہے کہ موضوع سخن یعنی بیوی کے ماتھے پر بل بھی آجائے وہ

پیٹ بلنے کے بعد اطمینان کا سانس لیتا ہے تو صرف یہی سوچتا ہے کہ "جان بچی اور لاکھوں پائے" بلکہ خلاصی پر خوش ہو کر وہ چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ ٹارزن کی سی آواز میں سینہ کا نعرہ لگائے، اپنی چھاتی ٹھونکے اور پھر کسی بھوکے شیر کی طرح کھانے بیٹھ جائے۔ نہ معلوم ان شوہروں کو اتنی بھوک کیوں لگتی ہے غرض کہ خوشی کی طغیانیوں میں ڈوبا ہوا شوہر کھانے کی تلاش میں جو نظر اوپر اٹھاتا ہے تو آہ پر بجلی سی گرتی ہے۔ اس کی ساری خوشیاں آنِ واحد میں مٹ جاتی ہیں کمرے کا فرش گھومتا نظر آتا ہے۔ دیوار کی تصویریں چوکھٹوں میں سے نکل کر اس پر حملہ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اور معدہ کی غذا ایک خشک دوپٹوں میں بدل چکی ہوتی ہے۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ ٹارزن کا سا نعرہ لگانے کی خواہش اور چھاتی ٹھونکنے کی آرزو مرحوم ہو چکی ہوتی ہے۔ جانتے ہیں آپ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب شوہر نظر اوپر اٹھاتا ہے تو سامنے گھر کے اسٹیج پر اس کو بیوی اپنے اصلی روپ میں نظر آتی ہے۔

کڑوی، کسیلی، خشمگیں اور در پئے آزار شوہر سے بیزار، منتظر ٹکراؤ، لڑنے کے لئے بیقرار، وہ جانتی ہے کہ اب مطلع صاف ہے۔ گھر کے اسٹیج پر وہی پروڈیوسر، وہی ڈائرکٹر ہے حتی کہ وہ خود ہی ڈرامہ نگار بھی ہے۔ پلاٹ کو جس طرح چاہے ڈھال لے۔ ایکٹروں کے منہ سے جو چاہے کہلوائے۔ اس وقت آس پاس اس کے انصاف اور نا انصافی کو سمجھنے والا کوئی نہیں۔ اس لئے شوہر جس کو وہ اوروں کی نظروں میں اپنا مجازی خدا، اس کی عزت و آبرو، اس کا مالک اور اس کا سرتاج سمجھا جانا پسند کرتی ہے۔ گھر کے اسٹیج پر وہ اسی کو اپنا غلام اور تابعدار سمجھتی ہے، رموز حکمرانی سے وہ خوب واقف ہے۔ محفل میں دوسروں کی موجودگی میں شوہر کی وہ شکایت جو زیر بحث ہے اس کی نظروں میں بغاوت سے کم درجہ نہیں رکھتی۔ اسے معلوم ہے کہ بغاوت اور بغاوت کے جذبہ کو فوراً کچل دینا چاہیئے۔ اس لئے اس کی آنکھیں شعلے برساتی ہیں۔ انگ انگ سے غصہ ٹپکتا ہے۔ اور یہ کیفیت اس درجہ تک پہنچتی ہے کہ وہ کانپنے لگتی ہے اور اس کے کانوں کی بالیاں اس طرح تھرکتی ہیں جس طرح کوندتی ہوئی بجلی۔ چوڑیوں کی کھنک پرانے زمانے کے سورماؤں کے جنگ کی اس آواز کی یاد دلاتی ہے جو تلواروں کو بے نیام کرتے وقت نکلتی تھی۔

یہ روپ ایک فاتح کا روپ ہوتا ہے ایسا فاتح جس کو جنگ سے پہلے ہی اپنی فتح کا یقین ہو۔ جو یہ جانتا ہو کہ اس کا حریف محض ایک دکھاوے کی مورت ہے۔

سامنے شوہر دم بخود۔ خاموش اور اس مینڈک کی طرح حواس باختہ بیٹھا ہوتا ہے جس نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے سانپ کو دیکھ لیا ہو۔ وہ اپنے کو کوستا ہے۔ اپنی زبان کو کوستا ہے جس نے یہ خانہ جنگی کی حالت پیدا کر دی تھی۔ اپنے والدین کو کوستا ہے جنہوں نے اپنے خاندان کا نام قائم رکھنے کی آرزو میں اسے اس جھنجھٹ میں ڈال دیا۔ وہ اس ماحول کو کوستا ہے۔ شہر، ملک اور پھر اس دنیا کو بھی کوستا ہے جس میں اس نے جنم لیا۔

آخر دل کڑا کر کے وہ بیوی کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نے تو محض ہنسی میں کچھ کہہ دیا تھا۔ اس کا مطلب بیوی کا دل دکھانا یا لوگوں کی نظروں میں اسے گرانا ہرگز ہرگز نہ تھا۔ اور بیچارہ شوہر اس جنگ و جدال کی کیفیت کو کم کرنے کی خاطر چہرے پر مسکراہٹ پیدا کر کے دوستی کا ہاتھ آگے بڑھاتا ہے۔ بیوی جس کی خشمگیں آنکھیں کچھ دیر پہلے شعلے برساتی تھیں اب آبگیں ہو جاتی ہیں۔ شوہر سمجھ جاتا ہے کہ اب معاملہ نازک سے نازک تر ہو گیا ہے۔

گھر کے اسٹیج پر بیوی کے روپ میں آنسو اس کے ترکش کا آخری تیر ہیں۔ ان کو آپ ایٹم بم یا ایسا ہائیڈروجن بم سمجھئے جو نائٹروجن سے ملا کر بیوی لوز مرہ کے استعمال کے لئے ہمیشہ رکھتی ہے۔ اب بیچارہ شوہر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے اور کیونکر شوہر بیوی کو مناتا ہے یہ ایک ایسا مضمون ہے جس کو سب شوہر اور اپنے اپنے روپ میں سب بیویاں جانتی ہیں کیونکہ میاں بیوی کا جھگڑا روز ازل سے ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ لیکن اس بارے میں صرف اتنا یاد رکھیئے کہ ؎

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے
کہ صلح ہو جائے جنگ ہو کر

حاصلِ مطالعہ

اس عنوان کے تحت اردو جرائد میں شائع ہونے والی بہترین تخلیقات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے
(ادارہ)

کرشن چندر

ہاتھ کی چوری

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی۔ تو کیا دیکھا کہ میرا بایاں ہاتھ غائب ہے۔ رات کو جب سویا تھا تو موجود تھا۔ بہت حیران ہوا۔ کہاں غائب ہو گیا۔ بستر پر ادھر اُدھر ڈھونڈا۔ کہیں نہ ملا۔ کہنی (دائیں کہنی) مار کر بیوی کو جگایا۔ اس سے پوچھا "بھلی مانس تم نے کہیں میرا بایاں ہاتھ دیکھا ہے؟" وہ بولی "کیا دایاں، کیا بایاں۔ ہاتھ تو تمہارے ایسے ایسے دیکھ چکی ہوں کہ اب تمہارے سارے ہتھکنڈوں سے واقف ہو چکی ہوں۔ اس وقت تم کونسے ہاتھ کی صفائی دکھا رہے ہو؟"

میں نے کہا "نیک بخت۔ میں ہاتھ کی صفائی کیا دکھاؤں گا؟ میرا خود بایاں ہاتھ غائب ہے۔ یقین نہ آئے تو خود دیکھ لو!"

اس پر وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ میرا بایاں شانہ ٹٹول کر کہنے لگی:۔

"واقعی غائب ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کبھی تھا ہی نہیں!"

پھر میری طرف شبہ بھری نظر سے تاکتے ہوئے بولی "کس کو دے آئے ہو؟"

"اری کس کو دینا۔ اور کون لیتا ہے ہاتھ۔ اور وہ بھی بایاں!"

"تم نے ضرور کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہوگا۔ اور وہ رنگین چڑیا۔ آفت کی پڑیا اسے لے کے چل دی ہوگی۔ یا تم نے کسی کی کمر میں ہاتھ ڈالا ہوگا اور پھر نکالنا بھول گئے ہوگے!"

"میڈم۔ یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ دیکھتی نہیں ہو۔ میرا بایاں ہاتھ غائب ہے!"

"تو میں کیا کروں؟" وہ ایک جماہی لے کر بولی "ڈھونڈو۔ کہیں اِدھر اُدھر رکھ کے بھول گئے ہوگے۔ تمہاری پرانی عادت ہے۔ چیزیں اِدھر اُدھر رکھ کے بھول جاتے ہو!"

سارا گھر چھان مارا۔ پتلون کی دونوں جیبیں دیکھ ڈالیں۔ غسل خانے کا لوٹا تک دیکھ لیا۔ نوکر کو ڈانٹ ڈپٹ کے پوچھا "تو نے میرا بایاں ہاتھ تو نہیں لیا؟ سچ سچ بول۔ نہیں تو ابھی ایک ہاتھ دوں گا!"

وہ بے چارا گھبرا کر بولا "حضور میں آپ کا ہاتھ لے کر کیا کروں گا۔ میرے دونوں ہاتھ پہلے سے موجود ہیں۔ دیکھ لیجئے!"

واقعی بات تو ٹھیک تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ موجود تھے۔ پھر وہ تیسرا ہاتھ لے کر کیا کرتا اور جسم کے کس حصے پر لگاتا؟ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اور گھبرایا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ اور اس سڑک پر ہو لیا جہاں میں رات کا کھانا کھانے کے بعد سیر کے لئے جاتا ہوں۔

میری پرانی عادت ہے کہ چلتے وقت دونوں ہاتھ جھلا کر چلتا ہوں۔ ممکن ہے رات کو سیر کرتے وقت بایاں ہاتھ ذرا زور سے جھلا دیا ہو اور وہ بے چارا میرے

● وہ سینے پر دوہتھڑ مار کر بولی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟

ہولے ہولے تم اپنی ساری چیزیں گم کر رہے ہو۔ تم جان بوجھ کر اپنے آپ کو DISMAKE کر رہے ہو۔ ایک دن تم خود اِس گھر سے غائب ہو جاؤ گے اور کسی دوسری ہوتی سوتی کا گھر آباد کرو گے۔

میں تمہارے سب چلتّر جانتی ہوں۔"

الشجاع

شانے سے کھسک کے کسی گڈھے میں گر پڑا ہو!

سڑک کے سارے گڈھے دیکھ لئے۔ ہاتھ کہیں نہیں ملا! بنئے کی دوکان پر گیا جو نکڑ پر واقع تھی اور جہاں سے میں نے رات کو گھر جاتے ہوئے رک کر کچھ فردی سودا سلف خریدا تھا۔!

بنیا میری بات سن کر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا: "ناں بابو جی، ہم کسی کا پرایا ہاتھ نہیں رکھتے۔ رام رام۔ ایسا برا کام ہم کبھی نہیں کرتے!"

"ارے مٹھو مل، تمہاری تو پرانی عادت ہے۔ رام رام جپنا اور پرایا مال اپنا۔ نکال میرا بایاں ہاتھ۔۔۔!"

"نہیں بابو جی۔ ہم نے آپ کا بایاں ہاتھ نہیں دیکھا۔ ہماری دوکان پر اگر کوئی گاہک اپنی چیز بھول جاوے ہے تو ہم اسے سنبھال کے رکھیں ہیں۔ ایک دفعہ ایک گاہک برسات کے زمانے میں اپنی چھتری بھول گیا تھا۔ اگلی برسات کو ہم نے اس کی چھتری واپس کر دی۔ اب چھتری تو بھلا کام کی چیز ہے۔ آپ کا بایاں ہاتھ کس کام کا ہے"؟

تھک ہار کر میں پولیس میں جانے والا تھا۔ پھر بنئے کی بات یاد آگئی۔ واقعی بایاں ہاتھ کس کام کا؟۔۔۔ سارا کام تو میں دائیں ہاتھ سے کرتا ہوں۔ لکھتا دائیں ہاتھ سے ہوں، کھاتا دائیں ہاتھ سے ہوں لڑتا دائیں ہاتھ سے ہوں اور آداب کرتا دائیں ہاتھ سے ہوں۔ ایک ہاتھ جوڑنے کے وقت دونوں ہاتھ کام آتے ہیں۔ چلو اچھا ہوا۔ بائیں ہاتھ کے غائب ہونے سے بار بار ہاتھ جوڑنے کی خوشامدانہ عادت چھوٹ جائے گی۔ بائیں ہاتھ کا کونسا ایسا کام ہے جو میں دائیں ہاتھ سے نہیں کر سکتا؟ پھر پولیس میں رپٹ ہو گی تو طرح طرح کے سوال پوچھے جائیں گے۔ تمہارا کیا نام ہے۔ باپ کا نام کیا ہے۔ دادا کا نام کیا تھا؟ کس وقت چوری ہوئی؟ کہاں پر چوری ہوئی؟ تمہارے پاس اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارا کبھی بایاں ہاتھ بھی تھا؟۔ اگر رات کو سوتے وقت تمہارا بایاں ہاتھ گم ہوا تو بیوی کی شہادت درکار ہے۔ اسے تھانے میں پیش کرو۔ ممکن ہے تمہاری بیوی نے تمہارا ہاتھ چرا کر اپنے بینک کے لاکر میں بند کر دیا ہو؟ ورنہ بیوی کی نیک چلنی کی ضمانت پیش کرو۔ ممکن ہے تم نے خود ہی اپنا بایاں ہاتھ غائب کر دیا ہو۔ آجکل ایسے قصے بہت سننے میں آتے ہیں کہ خود ہی چیز غائب کر دی اور چوری کا الزام دوسرے پر تھوپ دیا۔ ممکن ہے اس بائیں ہاتھ سے تم نے کوئی لمبا ہاتھ مارا ہو۔ اور اب پکڑے جانے کے ڈر سے اسے خود ہی غائب کر دیا ہو۔ کس رنگ کا ہاتھ تھا؟ کتنا لمبا ہاتھ تھا؟ کتنی انگلیاں تھیں؟ اگر پانچ تھیں تو کیا پانچوں کی پانچوں لگی میں تھیں؟ اور اگر پانچوں انگلیاں لگی میں تھیں تو سر کہاں پر تھا؟ تفصیل سے بیان کرو۔۔۔"

غرضیکہ میں نے پولیس میں رپورٹ کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ چند دنوں تک سڑک پر ہر آتے جاتے کو بڑے غور سے دیکھتا رہا کہ کہیں کوئی تین ہاتھ والا آدمی ملے تو اسے فوراً پکڑ کر دبوچ لوں۔ مگر شومئ قسمت سے کوئی تین ہاتھ والا آدمی نہ ملا۔ ایسے تو کئی ملے جن کا ایک ہاتھ میری طرح غائب ہو چکا تھا۔ آخر کار ایک ہی ہاتھ پر صبر کر لیا۔ کچھ دنوں ہی دوسرے ہاتھ کی کمی کا احساس بھی جاتا رہا۔ کیونکہ بایاں ہاتھ تھا۔ جو اکثر مجھے بیکار اور فاضل عضو معلوم ہوا۔ کبھی کبھی تو اس سے حد درجہ رقابت محسوس ہوئی۔ مثلاً آپ اپنی محبوبہ کی کمر میں اپنا دایاں ہاتھ ڈالے چل رہے ہیں تو آپ کے ساتھ ساتھ آپ کا بایاں ہاتھ بالکل ایک تیسرے اور اجنبی آدمی کی طرح چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس سے آپ پیچھا بھی نہیں چھڑا سکتے۔ اچھا ہوا۔ کمبخت خود ہی کہیں غائب ہو گیا۔ چند ماہ کے بعد میں یہ تک بھول گیا کہ میرا کبھی کوئی دوسرا ہاتھ بھی تھا!

پھر ایک دن میرا ایک کان غائب ہو گیا۔ اس دن بھی میں سو کے اٹھا ہی تھا۔ اور منہ پر ہاتھ پھیر رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرا ایک کان غائب ہے۔ دو تین بار چہرے پر ہاتھ پھیر کے دیکھا۔ واقعی میرا دایاں کان غائب تھا اور جہاں اسے ہونا چاہئے تھا وہاں کی جلد بالکل صاف اور سپاٹ تھی جیسے کبھی یہاں کوئی کان تھا ہی نہیں۔ جلدی سے بستر سے اٹھ کے آئینے کے سامنے گیا، واقعی میرا دایاں کان غائب تھا۔!

چند لمحے عجیب سکتے اور حیرت کے عالم میں گزرے۔۔۔ کہاں گیا کان میرا؟ تکئے اٹھا کے دیکھا، کھاٹ کو اٹھا کے جھاڑا، شور سن کر بیوی جاگ گئی "سونے نہیں دو گے۔ اب کیا افتاد آ پڑی"؟ وہ آنکھیں بند کئے غنودگی بھرے لہجے میں بولی۔

"میرا دایاں کان غائب ہے"!

"ارے کہاں غائب ہے۔ تمہارے تو شیطان کے سے کان ہیں۔ وہ کیسے غائب ہو سکتے ہیں بھلا۔۔!"

" نہیں غور سے دیکھو۔ نیک بخت۔ واقعی ایک کان غائب ہے!"

ارے تم تو سُنی اَن سُنی کر دیتے ہو۔ ایک کان سے سنتے ہو۔ دوسرے سے اڑا دیتے ہو۔ میں تمہیں کیا جانتی نہیں ہوں، کان غائب ہے، تمہارے کان تو ہر وقت غائب رہتے ہیں۔ !"

" آنکھیں کھول کے دیکھو پیاری۔ واقعی میرا دایاں کان غائب ہے!"

اب کے وہ بہت چکرائی۔ سینے پر دو ہتھڑ مار کر بولی۔" یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہولے ہولے تم اپنی ساری چیزیں گم کر رہے ہو۔ پہلے ہاتھ گیا۔ اب کان گیا۔ کل کو ٹانگ جائے گی۔ پرسوں دھڑ۔ میں تو سمجھتی ہوں تم ہولے ہولے جان بوجھ کر اپنے آپ کو DISMAKE کر رہے ہو۔ ایک دن تم خود اس گھر سے غائب ہو جاؤ گے اور کسی دوسری ہوتی سوتی کا گھر آباد کرو گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی؟ میں تمہارے سب چلتر جانتی ہوں!"

اس دفعہ سب یار دوستوں نے صلاح دی کہ مجھے ضرور پولیس میں جانا چاہئے اور اس عجیب و غریب چوری کی واردات کی رپورٹ لکھوانی چاہئے۔ بہت غور و خوض کے بعد میں نے پولیس میں رپورٹ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ آخر کوئی اتنا بڑا نقصان تو نہیں ہوا میرا۔ ایک کان چلا گیا تو کیا ہوا۔ دوسرا تو موجود ہے۔ کام کی بات تو اس سے بھی سنی جا سکتی ہے اور بیکار باتیں سننے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے اور اب ایک کان بھی نہیں ہے تو اب بیوی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ تم اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دیتے ہو۔ کیوں کہ دوسرا کان موجود نہ ہونے کی صورت میں وہ ایسی شکایت نہیں کر سکتی۔ پھر صرف ایک کان ہونے پر دنیا کا شور بھی آدھا ہو جائے گا اور اس صنعت زدہ مشینی زندگی میں شور اسقدر ہے کہ اس شور سے زندگی آدھی ہو جاتی ہے لہذا ایک کان ہونے سے میری زندگی بڑھ جانے کی صلاحیت بڑھ سکتی ہے۔ چنانچہ اس امر پر جتنا زیادہ غور کیا۔ ایک کان کو اپنے لئے دو کانوں سے زیادہ مفید پایا۔ لہذا پولیس میں جانے کا خیال ترک کیا۔!

چند ماہ بڑے سکون اور اطمینان سے گزرے۔ پھر ایک دن میری ایک آنکھ غائب ہو گئی۔ ہوا یہ کہ میں اپنے مطالعہ کے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ کتاب بیحد دلچسپ تھی اور موضوع دقیق۔ لہذا چند صفحے پڑھنے کے بعد میں کرسی پر بیٹھا بیٹھا سو گیا۔ جب جاگا تو معلوم ہوا سہ پہر ڈھل چکی ہے اور شام آ چلی ہے۔ میں نے اٹھ کے جلدی سے کمرے میں روشنی کی۔ غسل خانے میں گھس کر ہاتھ منہ دھویا۔ منہ ہاتھ دھوتے دھوتے یکایک میری انگلیوں نے محسوس کیا کہ میرے چہرے سے میری ایک آنکھ غائب ہے۔ گھبرا کر دوسرا اٹھا کر میں نے سامنے کے دیوار گیر آئینے میں دیکھا۔ واقعی بائیں ابرو کے نیچے جہاں آنکھ کو ہونا چاہئے تھا وہاں سے آنکھ غائب تھی۔ صاف غائب تھی۔ وہاں نہ پپوٹے رہے، نہ پلکیں، نہ پتلی۔ صاف شفاف جلد تھی اور کچھ نہیں... بار بار آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ دوسری آنکھ نظر نہ آئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں چہرے پر.... !

" یہ کیا ہوا ؟" دماغ چند لمحوں کے لئے بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا جب ہوش میں آیا تو میں نے زور کی ایک چیخ ماری !

میری چیخ سن کر میری بیوی دوڑی دوڑی غسل خانے میں گھس آئی بولی:" کیا ہوا ؟ آنکھ میں صابن پڑ گیا ؟ !"

" نہیں، میری ایک آنکھ غائب ہے" !

" کونسی ؟"

" بائیں — !"

ایک لمحہ کے توقف کے بعد وہ بولی" ضرور تم نے کسی پر بری نظر ڈالی ہو گی !"

" ڈارلنگ "

" یا کسی حرافہ سے آنکھیں چار کی ہوں گی.... " !

" اف — !"

" یا کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہو گا۔ کہیں آنکھ ملائی ہو گی۔ کسی سے آنکھ لگائی ہو گی اور وہ اچک کے لے گئی ہو گی۔ !"

میں نے بیوی سے مزید پوچھ تاچھ کرنا مناسب نہ سمجھا کیوں کہ اس کی تو ایک ہی رٹ ہے۔ اس لئے میں نے اپنی کتاب کا ایک ایک ورق چھان مارا۔ کرسی کے نیچے دیکھ لیا۔ عینک کے خول کو ٹٹول ٹٹول کے دیکھ لیا۔ کئی دن تک دوسرے دوستوں کے گھروں میں اپنی آنکھ ڈھونڈتا رہا۔ مگر آنکھ کہیں نہ ملی۔ اگر کسی نے چرائی بھی ہو گی تو کوئی واپس دینے کے لئے تیار نہ تھا۔

ہیں بزنس مین ہوں۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ آجکل لوگوں کی آنکھ کا پانی بھر گیا ہے۔ مروت نام کی کوئی شئے نہیں رہی۔ مثل مشہور ہے مارے گھٹنا، پھوٹے آنکھ۔ مگر میں نے تو کہیں گھٹنا بھی نہیں مارا۔ پھر آنکھ کدھر غائب ہو گئی ؟

اس دفعہ تو بیوی نے بھی پولس میں جانے کی صلاح دی۔ مگر عقل نے اس کے خلاف رائے دی۔ دیکھئے ایک تو میں معروف بزنس مین ہوں اور دھندا اتنا پھیلا رکھا ہے کہ اس چھوٹی سی چیز کی گمشدگی کی رپورٹ کرنے پر میرا جو وقت صرف ہوگا۔ وہ میں کسی بہتر دھندے میں صرف کر سکتا ہوں۔ ٹھیک ہے ایک آنکھ گئی مگر دوسری تو موجود ہے اور ایک آنکھ کے جانے سے دوسری آنکھ کی بینائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ دونوں آنکھوں کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ اسے فطرت میں Law of Compensation کہتے ہیں۔ پھر ایک آنکھ رکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ اب بھی ساری دنیا کو ایک آنکھ ہی سے دیکھتا ہوں۔ یعنی تقریباً تقریباً سوشلسٹ محسوس کرتا ہوں۔ ایک آنکھ کے چلے جانے سے میری صورت ضرور بگڑ گئی تھی۔ چند دنوں کے لئے مگر اب تو میرے ماہر چشم ساز اور عینک ساز ڈاکٹر سوز آتی نے ایسی عمدہ نقلی آنکھ لگا دی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اپنی اصل آنکھ بھی نکال کر اس کی جگہ دوسری نقلی آنکھ لگوا لی جائے۔ غرضیکہ جس نہج سے دیکھئے، مجھے ایک آنکھ میں فائدہ ہی فائدہ نظر آتا ہے۔!

پرسوں میرا بٹوہ چوری ہو گیا۔ تکئے کے نیچے پڑا تھا۔ بٹوے میں دس روپے تھے۔ کیوں کہ اس سے زیادہ رقم میں بٹوے میں نہیں رکھتا۔ رات کو سیف میں رکھ دیتا ہوں۔ مگر دس روپے ضرور تھے۔ اور دس روپے آخر دس روپے ہوتے ہیں !

میں نے اس چوری کا بیوی سے ذکر کیا تو اس نے کانوں پہ ہاتھ دھرے۔ جھاڑو بہاڑو کرنے والی نوکرانی سے پوچھا۔ تو وہ چیخنے چلانے لگی اور اپنی بے گناہی کی قسمیں کھانے لگی۔ بالآخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ نوٹ باورچی کے تکئے کے نیچے سے مل گیا۔ جو چار روز سے بخار میں پڑا تھا۔ میرے ڈرانے دھمکانے سے اس نے اقبال کر لیا کہ دس کا نوٹ اس نے چھپایا تھا !

میں نے اسے زور کے دو دھپ مارے اور کان سے پکڑ کر اٹھا دیا۔" حرامزادے ہمارا نوکر ہو کر ہمارے ہی گھر میں چوری کرتا ہے۔"

"جانے دو، جانے دو" میری بیوی اس پہ ترس کھا کر بولی۔ "دیکھتے نہیں ہو۔ چار روز سے بخار میں پڑا ہے۔ انجکشن کے لئے پیسے مانگ رہا تھا۔ میں نے نہیں دیئے۔ میں بھول گئی !"

"تم بھول گئیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ چوری کرے ؟" میں نے باورچی کے ایک زور کی ٹھوکر ماری۔ وہ دھڑام سے فرش پہ گر پڑا۔ اور کراہنے لگا ۔۔۔ !

"جانے دو، جانے دو۔" میری بیوی ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "دیکھتے نہیں ہو۔ بے چارا غریب چار روز سے بخار میں پھنک رہا ہے۔ دس روپے تمہارے لئے تو تمہارا کون ایسا نقصان ہو گیا ہے۔ تم لاکھوں کماتے ہو۔!"

"دس روپے !" میں نے گرج کر کہا۔ "دس روپے کی تم قدر و قیمت کیا جانو۔ کتنی بے ایمان محنت، کیسی غلیظ ضمیر فروشی سے میں یہ دس روپے کماتا ہوں۔ تم ان دس روپوں کی اہمیت کیا جانو۔ یہ میں جانتا ہوں "!

"اب درگزر کر دو !"

"نہیں۔ اس نے میرے دس روپے غائب کئے ہیں۔ میں اس چور کو اس کی چوری کی قرار واقعی سزا دلواؤں گا"

یہ کہہ کر میں نے باورچی کو پکڑا گردن سے۔ اور لے چلا اسے پولس میں رپورٹ کرنے . . . !

(شاعر بھتی)

آل احمد سرور

عزمِ کوہ کنی

یہ سوچتے تھے چمن میں بہار آتے ہی
ہمارے پھولوں سے مہکیں گے بام و در کتنے
ہماری تانوں پہ جھومیں گے کتنے دل والے
ہمارے قدموں سے سج جائیں گے رہگذر کتنے

لہو دیا ہے ہر اک نوکِ خار کو ہم نے
خزاں کے دور میں پوجا بہار کو ہم نے
جو زعمِ حسن میں اہلِ وفا کو بھول گیا
سکھائے ناز و ادا اس نگار کو ہم نے

عروس وادیٔ گنگ و جمن کی زلفوں کو
دیے ہیں کتنے دلآویز پیچ و خم ہم نے
طلوعِ مہر کی خاطر سیاہ راتوں میں
ستارے کتنے لٹائے ہیں بیش و کم ہم نے

نمازِ شاہ و گدا، شیخ و برہمن کا گداز
سرشکِ چشمِ وفا، سرگذشتِ زلفِ دراز
ہر اک عارف و عالی کے قلب کی دھڑکن
بہارِ شاہدِ معنی، دکانِ آئینہ ساز

مورّخ اپنے ہی زریں ورق کو بھول گئے
معلم آج کے کل کے سبق کو بھول گئے
جو اس کے نام کی مالا جپا ہی کرتے تھے
حکومت آئی تو اردو کو وہ بھی بھول گئے

"ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز"
غرورِ عشرتِ پرویز و عزمِ کوہ کنی
چراغ اہلِ محبّت کب آندھیوں سے بجھا
خرد کو راس ہی آئی جنوں کی خندہ زنی

وہ موجِ نور نہیں ہے، فریبِ ظلمت ہے
جو اپنے جلوۂ صد رنگ کو غبار کہے
سنو نہ اہلِ چمن لاکھ باغباں کوئی
روش کو سبزۂ بیگانہ گل کو خار کہے

یہ قہر کون سہے گا کہ اپنی محفل میں
ہجومِ شوق نہ ہو لطفِ داستاں نہ رہے
دلوں میں شاعرِ سرشار کا ترانہ ہو
لبوں پہ غالب و اقبال کی زباں نہ رہے

ابھرنے دو ابھی موجوں کا سازِ زیرِ لبی
یہ نقشِ عشرتِ ساحل مٹا ہی دیتا ہے
بلا سے ریت میں ہوتا ہے جذب ہونے دو
یہ قطرہ قطرہ لہو گل کھلا ہی دیتا ہے

(موہ چم گیا)

فراق گورکھپوری

○

گلہ کوئی نہیں جورِ بتاں سے
نہ شکوہ کوئی دورِ آسماں سے

نہ دھوکا کھائیں میری خود روی کا
الگ مجھ کو نہ سمجھیں کارواں سے

زمیں ہے روکشِ گردوں کہ اُٹھے
ہزاروں مہر و مہ اِس خاکداں سے

ان آنکھوں نے کہا بھی کچھ نہیں اور
کہاں تک بات پہنچی ہے کہاں سے

حجابِ ناز ہے حُسنِ دو عالم
اُٹھائیں کیوں یہ پردہ درمیاں سے

ادھر بھی شاید اس نے آج دیکھا
نظر آتے ہیں ہم بھی شادماں سے

ہمیں اے کاش ان رازوں کو سمجھیں
نہ جن کو کہہ سکے ہم رازداں سے

ہمارے سامنے سے ہو کے گزرے
یقیں کے بھیس میں وہم و گماں سے

اسی اک بات کو تم پوچھتے ہو
وہی اک بات باہر ہے بیاں سے

(مزاج بھوپال)

شمیم حنفی

○

اب قیس ہے کوئی نہ کوئی آبلہ پا ہے
دل آٹھ پہر اپنی حدیں ڈھونڈھ رہا ہے

احساس کی وادی میں کوئی صوت نہ صورت
یہ منزلِ عرفان تک آنے کا صِلہ ہے

زخموں کے بیاباں میں کوئی پھول نہ پتھر
یادوں کے جزیرے میں نہ بت ہیں نہ خدا ہے

خوں رنگ، شفق رنگ، خزاں رنگ ہیں چہرے
جسموں پہ کفن ہیں نہ کوئی سُرخ قبا ہے

اب نخلِ رہِ شوق نہ سائے نہ منازل
اب آبروئے عشق نہ سودا نہ وفا ہے

ہر آنکھ چلاتی ہوئی تشکیک کے نیزے
ہر ذہن تجسس کی ردا اوڑھ چکا ہے

کیوں شام کو راہوں میں الجھنے کی ہوس ہے
کیوں صبح کی پلکوں میں کوئی خواب چھپا ہے

سورج کی ہتھیلی پہ لکیروں کی تمنا
اب چاند کی تھالی میں نہ کرن ہے نہ دیا ہے

دیوار بھی دیوار سے آزاد نہیں ہے
موہوم خلاؤں میں بھی زندانِ ہوا ہے

(شب خون الہ آباد)

ہمارے نام

میمونہ کمال آفندی

خدا نظرِ بد سے بچائے۔ الشجاع کا حسن دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔ جب پرچہ آتا ہے تو گھر کے سب لوگ ہی پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ نئے عنوانات شروع کر کے آپ نے واقعی الشجاع کو گھر کے ہر فرد کا رسالہ بنا دیا ہے۔ ناقابلِ فراموش کے تحت اختر ملیح آبادی نے سچی جنگی کہانیوں کا جو نیا سلسلہ شروع کیا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ تازہ شمارے میں "کیبل ہاربر کی تباہی" پہلے شائع ہونے والے مضامین کی طرح بہت دلچسپ ہے۔ میری رائے ہے کہ یہ سب مضامین آپ کتابی صورت میں شائع کر دیں۔ (راولپنڈی)

حسن آرا۔ ایم۔ اے

الشجاع میں نے پہلی بار دیکھا۔ اس کا رنگ روپ دوسرے رسالوں سے بالکل ہی مختلف ہے۔ متنوع مضامین کے اعتبار سے یہ اپنی نوعیت کا منفرد جریدہ ہے۔ تینوں افسانے اچھے ہیں۔ لیکن جمیل زبیری کے مختصر افسانہ "دولہا کی بزل" میں ایک اذیت کوش تڑپا دینے والی کیفیت ہے جمیل زبیری نے حسن خوبصورتی سے ایک محبت کرنے والے نوجوان کے احساسات کو پیش کیا ہے اس سے مصنف کے مشاہدہ کی گہرائی اور فن پر دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ (دہلی)

شفیق احمد شفق

جولائی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اداریہ بڑا حقیقت افروز ہے۔ صہبا وحید اور ظفر احمد کے مقالے فکر انگیز ہیں۔ آپ کی کاوشوں نے پرچے کے حسن میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔

(ڈھاکہ)

بشیر پردیپ

جس محنت لگن اور خلوص سے کام لیکر آپ الشجاع کے ادبی معیار کو اونچا رکھے ہوئے ہیں وہ قابلِ صد تحسین ہے۔ (لکھنؤ)

نعیم اختر

تازہ شمارے میں تنقیدی مضمون "شعر کی رو" اس شمارے کا سب سے بہتر مضمون ہے۔ البتہ "مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک" اور "الشجاع

اُن کے سربراہ" بہت کمزور ہے اور بلا وجہ آٹھ نو صفحات ضائع ہوئے ہیں۔ اس مضمون میں نہ تو اسلامی ممالک پر سیر حاصل تبصرہ ہے اور نہ ان کے نظریات پر کوئی بحث کی گئی ہے۔ اندازِ تحریر بھی کچا ہے۔ معلوم نہیں آپ نے کس مصلحت سے یہ مضمون شائع کیا ہے۔ (لاہور)

معید انور جیلانی

جولائی کے شمارے میں آپ نے شاہد احمد دہلوی مرحوم پر جو اداریہ لکھا ہے وہ آپ کی وسعتِ نظر، اخلاص، دیانت اور بینائی کا مظہر ہے۔ جہاں تک میرے علم میں ہے آج تک کسی رسالے نے دوسرے رسالے کی بقا کے لئے خریداری کی اپیل نہیں کی تھی۔ آپ نے یہ اپیل کر کے شاہد دوستی کا صحیح ثبوت دیا ہے۔ (ملتان)

حکیم محمد سعید (ستارۂ امتیاز)

جناب شجاع صاحب محترم۔

اسلام آباد میں "ٹائمز پبلیکیشنز" کے سنگِ بنیاد کی خبر ملی۔ طبیعت بڑی خوش ہوئی۔ میں آپ کو اور عزیزی غیاث الدین اور آپ کے تمام ساتھیوں کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ صحت مند رکھیں اور مراتب بلند فرمائیں۔ نیز کاروبار میں توسیع ہو۔

آپ کا مخلص:۔ محمد سعید۔

نجمہ رفیق

اگر آپ برا نہ مانیں تو یہ عرض کروں کہ اس بار شعری حصہ بہت کمزور رہا۔ اسی طرح اس شمارے کا خصوصی مضمون "مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک" الشجاع کے شایانِ شان نہیں ہے مضمون پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے مختلف سفارت خانوں سے مواد جمع کر کے پیش کر دیا ہے۔ اس میں کام کی بات کوئی نہیں ہے۔ حالانکہ ان ممالک کے داخلی اور خارجی مسائل پر بہت خوبصورت انداز میں بصیرت افروز اور فکر انگیز مضمون لکھا جا سکتا تھا۔ اس قسم کے مضامین تو بچوں کے رسالے میں بھی پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ (کراچی)

محمد نبی خان

خدارا مشترکہ شمارے شائع کرنے کی روایت کو نہ اپنائیے۔ پرچہ پابندی سے شائع کیجئے۔ اس تعطل سے قارئین کے ذہنوں پر ناخوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں نصیر صاحب کا مضمون "مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک" بہت پسند آیا۔ صاحبِ مضمون نے سمندر کو کوزے میں سمو دیا ہے۔ (حیدر آباد)

گزشتہ شمارے میں جو سوالات شائع ہوئے تھے ان میں محترمہ رشیدہ بیگم کراچی کا سوال سب سے بہتر اور انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔
اعلان کے مطابق اس ماہ سے ان کے نام ایک سال کے لئے الشجاع جاری کر دیا گیا ہے ۔ (ادارہ)

صوفیہ اکبر چاٹگام

س:- میرے ملنے والوں میں چند پڑھے لکھے افراد کا دعویٰ ہے کہ نذیر احمد بحیثیت شاعر حالی سے کسی طرح کم نہیں تھے مگر نقادوں نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ میں ادب کی ایک طالبہ کی حیثیت سے ان حضرات کی رائے سے متفق نہیں ہوں۔ براہ کرم آپ اس پر روشنی ڈالیں اور بتائیں کہ حالی اور نذیر احمد کی شاعری میں کیا فرق ہے؟

ج:- محترمہ! نذیر احمد شاعر ضرور تھے مگر وہ خود کو نہ تو بڑا شاعر سمجھتے تھے اور نہ حالی کی طرح اپنے کو صاحب طرز شاعر کہلوانے کے متمنی تھے جس کا ثبوت خود ان کی تحریروں سے ملتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"میں لیکچر سے پہلے تبرکاً اپنی نظم پڑھ لیا کرتا ہوں۔ اگرچہ وہ نظم بولی پھسپھسی اور نامربوط سی ہوتی ہے۔ اس واسطے میں شاعر ہوں تو نہیں مگر نظم سے طبیعت میں جولانی اور گویائی میں روانی آجاتی ہے۔"

ایک اور موقع پر اعتراف کرتے ہیں:-

"میں نے ساری عمر شعر گوئی کو اپنا مشغلہ نہیں بنایا، یہاں تک کہ ہنوز اپنا کوئی تخلص بھی نہیں رکھا۔ کبھی کوئی شعر موزوں کر لیا تو اس کی قسم بھی نہیں کھاتا۔ مگر اتنا کرنے سے میں شاعر نہیں ہو گیا اور نہ میں شاعر ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ اور جب شاعری کا دعویٰ نہیں تو مدح کی توقع کیوں کر ہو۔ مدح و ستائش نہیں تاہم یہ بات کیا کم ہے کہ مجھ جیسے اناڑی عطائی کی وجہ سے خواجہ الطاف حسین حالی جیسے کاملان فن کی حق قدر و قدر کی جائے گی۔"

ایک نوجوان نقاد اسد نذیر کے بقول "نذیر احمد کو وہ شعری بالیدگی میسر نہ آسکی جو حالی اور شبلی کو نصیب تھی۔ حالی کی شاعری میں اگرچہ روایت سے انحراف اور مبالغے سے اجتناب ہے مگر اس حقیقت پرستی میں بھی شیفتہ اور غالب کی صحبت کی وجہ سے تغزل کا حسن اور سوز پیدا ہو گیا ہے۔ نذیر احمد کے ہاں حقائق اور واقعات کے اظہار میں شاعرانہ حسن کم ہی ملتا ہے۔ وہ جس ماحول اور جس طبقے کے لئے شاعری کر رہے تھے اس کے لئے نازک خیالی اور باریک بینی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دعوت عمل دے رہے تھے۔ ایسے حالات میں شعوری طور سے ان کی توجہ حسن ترتیب، نزاکت خیالی، تلمیح و استعارات، صنائع بدائع اور شاعرانہ حسن کے بجائے سلاست اور روانی کی طرف رہی۔ ان کا مقصد صرف ایک تھا۔ اپنے پیغام کو موثر انداز میں پیش کرنا۔ اسی لئے وہ شاعری برائے شاعری کے قطعی قائل نہ تھے۔" (ماہل الشجاع)

ایس ایم وصی کراچی

س:- المیہ کہانیاں یا ڈرامے لکھنے سے کیا فائدہ۔ اس کا اثر پڑھنے والوں یا سننے والوں پر کیا پڑتا ہے۔ براہ کرم جواب ضرور دیں۔

ج:- وصی صاحب! المیہ کے موضوع پر ممتاز نقادوں نے بہت کافی لکھا ہے۔ اس صفحے میں تفصیل سے کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ مختصر طور پر ہم ارسطو کی رائے درج کر رہے ہیں جسے پڑھ کر آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔ بقول ارسطو:-

"المیہ سے انسان کے خیالات اور جذبات میں وسعت اور جامعیت پیدا ہو جاتی ہے۔ المیہ کا کام یہ ہے کہ افراد کے اعمال اور ان کے مکافات، حوادث روزگار اور ان کے پہلو بہ پہلو مختلف اشخاص کے عروج و زوال اور رنج و راحت کی سچی تصویریں پیش کر کے خوف و ہراس اور ہمدردی اور عبرت کا احساس پیدا کرے۔ روح میں توازن اور سنجیدگی و بلند حوصلگی پیدا کرنے کی "المیہ" سے بہتر کوئی صورت نہیں۔ دوسروں پر کف افسوس مل کر ہم خود اپنے حسرت و تاسف کے جذبات پر قابو پا جاتے ہیں۔ اور ہماری روح رنج و راحت کی قیود سے آزاد ہو جاتی ہے۔ المیہ میں ہماری ہمدردی اور دلچسپی کا باعث صاحب قصہ کی غلط کاریاں اور اس کی پاداش نہیں ہوتیں بلکہ ہمارے دل میں درد کا احساس تو یہ دیکھ کر پیدا ہوتا ہے کہ خارجی اثرات نے اس کے غلط اندیشوں اور غلط کاریوں میں کہاں تک حصہ لیا۔ المیہ ایک قدرتی اور متوسط انسان کی زندگی کا مرقع پیش کرنا چاہیئے ورنہ وہ اثر پیدا نہ ہوگا جو المیہ کا اصل مقصد ہے۔"

اپنے وطن میں

دریائے راوی کا نظارہ

بوڑھی گنگا کا ایک منظر

Reg. No. S. 1796

ASH—SHUJA

A TIMES PRESS PUBLICAION
Mansfield Street Sadar Karachi-3.

Phone No. 55214

ماہنامہ الشجاع

رسالہ گھر کے ہر فرد کے لیے

اس شمارے میں

- امریکی قیدی (سچی جنگی کہانی) * **ہماری موسیقی** (تصویری فیچر)
- فضا اور معیار (ایک فکر انگیز مقالہ) * (ڈرامہ) وہ کون ہے ؟
- شعری ادب ، مخدوم محی الدین ، حرمت الاکرام ، شاذ تمکنت ، ڈاکٹر وحید اختر ، خورشید جامی -
- تحفہ ، عفت موہانی کا ایک خوبصورت طویل افسانہ -

مشترکہ شمارہ نومبر **دسمبر**

اپنے وطن میں

کافرستان کا ایک منظر

سوات کا ایک دلکش نظارہ

ہمارے نام

شبنم رومانی

الشجاع

ایک رسالہ
گھر کے ہر اک فرد کی خاطر
ہر عورت ہر مرد کی خاطر

ہلکے پھلکے

شعر و ادب کے فن پاروں سے مُزیّن ہے
ہلکی پھلکی باتیں شبنم !
دل کو موہ لیا کرتی ہیں
پتھر جیسے لفظوں کی دیواروں سے ،
کیا سر ٹکرانا ؟
فلسفیانہ تکراروں سے
علمی دوزخ کے جلتے انگاروں سے ، جل جاتے ہیں
خوابوں کے زرتاب محل
جیسے موم پگھل جاتا ہے
زرّیں خواب پگھل جاتے ہیں

ہلکی پھلکی باتیں شبنم !
دل کو موہ لیا کرتی ہیں
ہلکے پھلکے شعر و ادب ہیں لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے دل کی دھڑکن ہے
اور یہی سچا فن ہے

(کراچی)

پروفیسر شفیع ھدایت

الشجاع نظر سے گزرا۔ یہ دیکھ کر بے پایاں مسرت ہوئی کہ الشجاع صحت مند ادب کا نقیب اور معیاری تخلیقات پیش کرنے والا جریدہ ہے۔ آپ کے حسن ترتیب نے اسے ایک باوقار اور قابل قدر الشجاع

مقام عطا کر دیا ہے۔ اس کی بتدریج ترقی اس کے بلند معیار کی ضامن ہے۔ (دوتیا)

آنسہ اعیندہ عزیز ایم۔ اے

اکتوبر کے شمارے میں جناب ضیاء الحسن فاروقی کا مضمون "عرب اور اسرائیل" انفرادی نوعیت کا حامل ہے۔ موصوف نے جس ہمت کے بھلے دیانت داری کے ساتھ مسائل کا جائزہ لیا ہے جس کی وجہ سے اس مضمون کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ فاروقی صاحب مشرق وسطے کے سیاسی مسائل پر اسی انداز سے مسلسل لکھتے رہیں اس سے نہ صرف عام پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ یہ قومی خدمت ہوگی۔ (ڈھاکہ)

رفیق پراچہ

یوں تو متعدد رسائل اور اخبارات نے انقلاب نمبر شائع کئے ہیں۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ الشجاع کے انقلاب نمبر کا سرورق سب سے اچھا ہے۔

نفیسہ بری

اس بار الشجاع کا افسانوی حصہ رسالہ کا سب سے جاندار حصہ ہے۔ حسن اجمل مسرت اور زکی انور کی کہانیاں بہت خوبصورت اور معیاری ہیں۔ لیکن ان دونوں کہانیوں سے بڑھ کر رعنا اختر کی کہانی ہے۔ کیونکہ ابھی تک اس موضوع پر میری نظر سے اور کوئی افسانہ نہیں گزرا۔ (پشاور)

مقصود سحری

اسلامی تہذیب کے گہوارے کے تحت آپ جو تاریخی مضامین شائع کر رہے ہیں۔ وہ اس قابل ہیں کہ ان کو کتابی صورت شائع کیا جائے۔ یہ اردو ادب کا المیہ ہے کہ ہمارے ہاں تاریخی اور علمی مضامین کے مجموعے شائع کرنے کی کوئی ناشر جسارت نہیں کرتا۔ اس لئے یہ ذمہ داری اب ادبی جرائد پر عائد ہوتی ہے کہ وہ معیاری ادب کی اشاعت کا فریضہ انجام دیں۔

(لائل پور)

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات بموجب سرکلر نمبر ڈی ای/جی وی ۶۶۶۶۹ - ۸۹۴
مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۱ء

الشجاع

ـــــ ترتیب ـــــ

ایس ایم غیاث الدین ـ سلمان لارشد

ـــــ طابع و ناشر ـــــ

ایس ایم شجاع الدین

ـــــ زیر اہتمام ـــــ

سلطان کلیم

زرِ سالانہ پانچ روپے ـــــ فی شمارہ پچاس پیسے
فون نمبر ۵۲۳۳۳ (رہائش) ـــــ ۵۵۲۱۲ (شعبہ ادارت)

ـــــ شعبۂ نشر و اشاعت ـــــ

ٹائمز پریس

منسفیلڈ اسٹریٹ۔ صدر۔ کراچی

ایس ایم شجاع الدین پرنٹر پبلشر نے ٹائمز پریس صدر کراچی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الشجاع صدر کراچی سے شائع کیا۔

اس شمارے کے چند فنکار

- مخدوم محی الدین
- جیک ریان
- ڈاکٹر ابو محمد سحر
- حرمت الاکرام
- شاذ تمکنت
- عفت موہانی
- ابراہیم یوسف
- خواجہ جمیل احمد
- سی پولیس
- رشیدہ رضویہ
- خورشید جامی
- قمر اقبال
- مجتبیٰ حسین
- وحید اختر

ان کے علاوہ

اور دوسرے

جلد- ۱۵ نومبر ۱۹۶۷ء شمارہ- ۱۱

التماس .. . ناشر .. . ۵

تصویری فیچر

ہماری موسیقی .. . جمیل زبیری .. . ۶

ناقابل فراموش

امریکی قیدی .. . جیک ریان .. . ۱۰

تاریخ

سمرقند .. . خواجہ جمیل احمد .. . ۱۸

تحقیق و تنقید

فضا اور معیار .. . ڈاکٹر ابو محمد سحر .. . ۲۱

شعری ادب

دو نظمیں .. . حریت الاکرام .. . ۲۵
پس دیوار .. . قاضی سلیم .. . ۲۶
میرے بعد .. . حزیں لدھیانوی .. . ۲۶
غزل .. . شاذ تمکنت .. . ۲۷
اجنبی .. . محمود خاور .. . ۲۷
غزل .. . خورشید جامی .. . ۲۸
غزل .. . ثمر اقبال .. . ۲۸
غزل .. . عنوان چشتی .. . ۲۹
غزل .. . قیصر قدیر .. . ۲۹
غزل .. . مہر اظہر .. . ۳۰
غزل .. . فہیم فہمی .. . ۳۰

افسانے

تحفہ .. . عفت موہانی .. . ۳۱
روپ .. . میح الزماں .. . ۳۵

پراسرار کہانی

وہ عورت .. . سی پولیس .. . ۴۹

ڈرامہ

وہ کون ہے؟ .. . ابراہیم یوسف .. . ۵۲

سیر و سفر

کراچی کا پانی .. . رشیدہ رضویہ .. . ۵۹

طنز و مزاح

تکیہ کلام .. . مجتبیٰ حسین .. . ۶۲

حاصل مطالعہ

سوال (افسانہ) .. . آخر الوالحسن .. . ۶۶
شہر (نظم) .. . مخدوم .. . ۷۱
جستجو (نظم) .. . وحید اختر .. . ۷۱

مستقل عنوانات

ہمارے نام .. . قارئین .. . ۲
بازگشت .. . ادارہ .. . ۷۲

سرورق:- ہماری موسیقی سے متعلق
تصویر:- اقبال
رنگ آمیزی:- ایم فاروق

اِلتماس

ادب یا تو اچھا ہوتا ہے یا بُرا، اس کے علاوہ اس کی کوئی تیسری قسم نہیں ہوتی۔ ہر دور میں نقاد اپنے عہد کے ادب کا جائزہ اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق لیتے ہیں۔ ان کو اظہار خیال کی پوری آزادی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ نقادوں کی آرا حکم آخر کا درجہ رکھیں یا مستقبل بھی نقادوں کے فیصلے کو تسلیم کرلے۔ دراصل اچھے اور بُرے ادب کی پہچان کم از کم پچاس سال یا ایک صدی بعد ہوتی ہے۔ زمانہ بہت بڑا نقاد ہے۔ اچھا ادب وہی ہوتا ہے جس میں زندہ رہنے کی سکت ہوتی ہے اور بُرا ادب خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے آج جو بحث مختلف رسائل میں "قدیم و جدید" کے سلسلہ میں چھڑی ہوئی ہے خواہ وہ کتنی سنجیدہ کیوں نہ ہو اس سے ادب کے ارتقا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ ہی اس قسم کے مباحثوں سے تخلیقی کاموں میں تیز رفتاری پیدا ہونے کا کوئی امکان ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو ایک عرصہ تک عامیانہ سطحی اور مبتذل قرار دیا گیا۔ لیکن آج نظیر اردو کا پہلا عوامی شاعر کہلاتا ہے۔ اس مثال کو سامنے رکھ کر جب ہم "قدیم و جدید" کی بحث کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ بحث اور مخالفت و موافقت قبل از وقت ہے۔ اس موضوع پر زیر نظر شمارے میں جناب ڈاکٹر ابو محمد سحر کا ایک فکر انگیز مضمون "فضا اور معیار" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے غیر جانبدارانہ انداز میں "قدیم و جدید" کی بحث پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ قیمتی مضمون علمی ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

گزشتہ ماہ پر اسرار کہانیوں کی اشاعت کے سلسلہ میں ہم نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا تھا۔ ہمیں مسرت ہے کہ الشجاع کے بیشتر قارئین نے ہماری رائے سے اتفاق کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ سلسلہ ختم نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس شمارے کی زینت سی پولیس کی کہانی ہے۔ جناب احمد صغیر صدیقی نے روایات کے مطابق اس کہانی کو بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔

افسانوی حصہ میں اس بار اردو کی ممتاز ادیبہ محترمہ عفت موہانی کی ایک طویل کہانی "تحفہ" شامل ہے۔ یوں تو عفت کی بیشتر کہانیاں بلند معیار کو چھوتی ہیں لیکن خصوصیت سے یہ کہانی انفرادی نوعیت کی حامل ہے اور اس کا شمار ۱۹۶۸ء کی بہترین کہانیوں میں ہوگا۔

قارئین کی خواہش ہے کہ الشجاع میں ڈرامے پابندی سے شائع ہوں اور ہم خود بھی چاہتے ہیں لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ اردو میں اچھے ڈرامہ نگار انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور اچھے ڈراموں کا وصول جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ سعی کے باوجود اگر اچھے ڈرامے ملتے بھی ہیں تو وہ اتنے طویل ہوتے ہیں کہ الشجاع کے مختصر صفحات ان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بہرنوع ہم کوشش کریں گے کہ قارئین کو اس سلسلہ میں ہم سے کوئی شکایت نہ ہو۔ اس بار پروفیسر ابراہیم یوسف کا ڈرامہ "وہ کون ہے؟" شائع کیا جا رہا ہے۔ موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے یہ ایک خوبصورت ڈرامہ ہے۔

شعری حصہ میں مخدوم محی الدین، حرمت الاکرام، شاذ تمکنت، قمر اقبال، خورشید جامی، قاضی سلیم، وحید اختر، حزیں لدھیانوی، محمود خاور، علوان چشتی، اور مہر الہر کے نام نمایاں ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس شمارے کے بارے میں بھی اپنی رائے سے نوازئیے۔ تاکہ ہمیں اندازہ ہو کہ ہم کس حد تک آپ کی توقعات پوری کرنے میں کامیاب رہے۔

آپ کا مخلص

شجاع الدین

ناشر

تصویری فیچر

ہماری موسیقی

جمیل زبیری

● آصف الدولہ کے عہد میں پنجاب کے ایک مشہور گائک استاد شوری نے ٹپے کو رواج دیا۔ اس طرح موسیقی درباروں کی چہاردیواری سے نکل گئی۔ اسی زمانہ میں ٹھمری کا رواج ہوا۔

●

پاکستان ایک نوزائیدہ ملک سہی لیکن اس کی جڑیں ہزاروں سال پرانی ہیں یہ علاقے جہاں آج پاکستان واقع ہے یوں تو قدیم اور زبردست تہذیبوں کا گہوارہ رہے لیکن آج سے بارہ سو سال قبل مغربی پاکستان کے جنوبی علاقوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اور تین سو سال بعد شمالی علاقوں پر بھی مسلمانوں کا پرچم لہرانے لگا۔ بارھویں صدی کے آخر میں مسلمان برصغیر پاک و ہند کے پورے شمالی علاقہ پر حکومت کرنے لگے۔ اور اسی وقت سے اس برصغیر میں مسلمانوں کی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے زمانے میں اس برصغیر نے ثقافتی میدان میں بڑی ترقی کی جب مسلمانوں نے یہاں قدم رکھا تو وہ اور فنون لطیفہ کے ساتھ ایک ترقی یافتہ فنِ موسیقی کو بھی اپنے ساتھ لائے۔ عربوں نے شروع سے ہی اس فن کی ترقی میں بڑی دلچسپی لی تھی۔ ابن سینا، الفارابی اور الکندی جیسے مفکرین نے موسیقی پر کتابیں لکھی تھیں۔ جس وقت برصغیر میں اس موسیقی کی بنیادیں پڑیں اس وقت تک ایرانی اور وسطی ایشیا کی موسیقی بھی اس پر اثرانداز ہو چکی تھی۔ اگرچہ برصغیر میں خود فن موسیقی ترقی کی بہت منزلیں طے کر چکا تھا۔ اور یہاں بڑے بڑے باکمال ماہرین فن موجود تھے۔ لیکن مسلمانوں کے قدم یہاں جم جانے کے بعد اس قدیم موسیقی کی کایا پلٹ گئی۔ جس کے نتیجہ میں ایک نئی موسیقی نے جنم لیا جو سرتاسر مسلمانوں کی اختراع ہے۔ وہ شخص جس نے سب سے پہلے یہاں کی موسیقی کو ایک نئی شکل عطا کی حضرت امیر خسروؒ تھے۔ یہ زمانہ موسیقی میں تجدید و اجتہاد کا زمانہ تھا۔ اور مجتہد امیر خسرو تھے۔ اس بات کا اعتراف معروف مورخ پروفیسر رانا ڈے نے بھی کیا ہے۔ اس قسم کے شواہد موجود ہیں کہ خسروؒ سے پہلے فارسی نغمے بارہ مختلف ایرانی اسالیب پر گائے جاتے تھے جنہیں ایرانی موسیقی میں "مقام" کہا جاتا تھا اور یہی مقام رنگولہ راگوں کی تخلیقی اساس تھے۔ ان مقاموں سے چوبیس شعبے پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح ایرانی موسیقی میں چوبیس گھنٹے کے چوبیس راگ پیدا ہوتے تھے۔ مثلاً نوروز عرب، نوروز عجم۔ مبارک اور رہاوی وغیرہ۔ اور موسیقی کے اس سارے نظام کو "نقش" کہا جاتا تھا۔ خسروؒ نے ان ایرانی راگوں کو بعض مروج دھنوں اور راگنیوں سے ملا کر ایک نئی چیز پیدا کی اور ان کے امتزاج سے جو راگ پیدا ہوئے وہ آج بھی بڑے ذوق و شوق سے گائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ "ستار" بھی امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ یہ سہ تار یعنی ابتداء میں تین تاروں کا ساز تھا۔ بعد میں اس میں اور تاروں کا اضافہ ہوا۔ دراصل یہ قدیم بینا کا

امیر خسروؒ کے بعد ہماری موسیقی کا بہت بڑا ماہر جونپور کا آخری تاجدار سلطان حسین شرقی تھا۔ اس نے موسیقی میں گرانقدر اضافے کئے اور نئے نئے راگ اور راگنیاں اختراع کیں اور دُھرپد کی جگہ خیال کو رواج دیا۔ سلاطین تغلق اور بیجاپور کے زمانہ میں بھی فن موسیقی کو بڑا فروغ ہوا۔ اور اسی زمانے میں امیر شمس الدین تبریزی جیسا بڑا موسیقار پیدا ہوا۔ سلطان عادل شاہ اور اسمٰعیل عادل شاہ خود ماہر موسیقی تھے۔

اس جگہ چنچل سین، باز بہادر فرمانروائے مالوہ سورج خان قوال، چاند خاں کبیر اور غلام رسول لکھنوی جیسے باکمال لوگوں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ بہادر شاہ فرمانروائے گجرات مانا ہوا استاد

راگوں کے روپ ۔ راگ کمبھ

راگوں کے روپ ۔ راگ بسنت۔

ترقی یافتہ شکل ہے۔

اس زمانہ میں نائیک گوپال جگت گرو تسلیم کئے جاتے تھے۔ ایک روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ علاؤالدین خلجی کے دربار میں امیر خسروؒ اور نائیک گوپال میں مقابلہ ہوا۔ امیر خسروؒ نے دھرپد کے مقابلہ میں اس قدر اختراعیں پیش کیں کہ نائیک گوپال ان سے بڑا متاثر ہوا۔ اور ان کا لوہا مان گیا۔ قول یا قوالی بھی حضرت امیر خسروؒ کی ہی ایجاد ہے جو آج بھی نہ صرف فقراء اور صوفیاء بلکہ عوام کی محفلوں میں بھی بڑے ذوق و شوق سے گائی اور سُنی جاتی ہے۔ قوالی ہماری موسیقی کا نہایت نادر قابلِ فخر اور دلکش اسلوب ہے۔

راگوں کے روپ ۔ راگ گمبھیر

تھا۔ زین العابدین نے جو ۱۴۱۶ء سے ۱۴۶۷ء تک کشمیر کا حکمراں تھا فنِ موسیقی پر ایک قابل قدر کتاب لکھی ـــــ مختلف شاہی درباروں کے علاوہ فن موسیقی کو عروج دینے میں بہت سے صوفیاء کا بڑا حصّہ ہے۔ مثلاً پیر بودھانی جو سلطان حسین شرقی کے ہمعصر تھے موسیقی سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کے بعد ان کی خانقاہ میں ان کے صاحبزادے شیخ بہاالدین نے فن موسیقی کی خدمت جاری رکھی۔ اِس خانقاہ میں پورے برصغیر کے بڑے بڑے موسیقار حاضر ہوتے تھے۔ ان صوفیاء نے فن موسیقی کو ایک نیا رنگ دیا جس کا اثر آج بھی پاکستان کے لوک گیتوں میں موجود ہے۔ مرشدی سعرفتی اعدلول شرقی پاکستان میں اور کافیاں سندھ اور پنجاب میں اس کی مثال ہیں۔ کشمیر میں بعض لوگ آج تک کلاسیکی موسیقی کو صوفیانہ کلام ہی کہتے ہیں ـــــ اکبر کا عہد فنون لطیفہ کا ایک زرّیں عہد تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس بادشاہ کو فن موسیقی سے بے حد لگاؤ تھا اور اس کے دربار میں بڑے بڑے موسیقار موجود تھے ـــــ میاں تان سین گوالیاری دربار اکبری کا سب سے بڑا موسیقار تھا۔ تان سین نے جن راگوں کا اختراع کیا ان میں سے بعض نام یہ ہیں۔ میاں کی ٹوڑی، میاں کی ملہار، درباری، میاں کا سارنگ وغیرہ وغیرہ ـــــ کچھ محققین کی رائے کے مطابق ساز رباب بھی سب سے پہلے تان سین ہی نے استعمال کیا تھا ـــــ دربار اکبری میں تان سین کے علاوہ جو ممتاز موسیقار تھے ان کے نام یہ ہیں۔ سبحان خاں، ہری گیان خاں، میاں لال محمد خاں ڈھاڈی، داؤد

راگوں کے روپ ۔ سندھی بھیرویں

ڈھاڑی۔ تان رنگ خاں۔ اور بلاس خاں، ملا اسحٰق اور سدرنگ سیو ہے۔
ساز بجانے والوں میں پیر منڈل خاں، شہاب خاں، استاد دوست
مشہدی، میر سید علی مشہدی، استاد یوسف ہرانی، قاسم اور
استاد شاہ محمد تھے۔۔ اور قوالوں میں شیخ منجھو قوال مشہور ہیں۔
جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں بھی موسیقی کو برابر فروغ ہوتا رہا۔
شاہجہاں خود بھی اچھی موسیقی جانتا تھا۔ اس زمانہ کے مشہور لوگوں
میں درنگ خاں اور لال خاں تھے۔ تان سین کے بعد اس کے اسلوب کو
بلاس خاں نے زندہ رکھا۔ محمد خاں رنگیلے کے زمانے میں فن موسیقی کی
مقبولیت اور شاہی قدردانی کمال کو پہنچ گئی تھی۔ اس زمانے میں
جلیل القدر فنکار سدا رنگ کا طوطی بولتا تھا۔ جس نے خیال کو بے حد
مقبول بنایا اور بہت سے راگ راگنیوں کے بول بنائے۔ مثلاً سے
محمد شاہ تم سدا رنگیلے مینہا برسے بوند بوند۔ اپنے پیا کو جانے نہ دونگی۔
بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی موسیقی کا خاصا چرچا تھا اور
اس زمانے کے سب سے بڑے موسیقار تان رس خان تھے۔ ان کے
خاندان میں اس وقت تک دھرپد کا رواج تھا۔ لیکن تان رس خان نے
خیال رنگ کو اختیار کیا۔ دربار اودھ میں موسیقی کے ایک نئے دور کا
آغاز ہوا۔ آصف الدولہ کے عہد میں پنجاب کے ایک مشہور گائک
استاد شوری نے ٹپے کو رواج دیا۔ اس طرح موسیقی درباروں کی
چہار دیواری سے نکل کر جمہوری انداز اختیار کر گئی۔ اسی زمانے میں
ٹھمری کا رواج ہوا۔ خود واجد علی شاہ فن موسیقی کے ماہر تھے
انہوں نے بہت سی ٹھمریاں خود مرتب کیں۔ اسی زمانہ میں اودھ میں محرم کے
زمانے میں موسیقی نے سوز کا رنگ اختیار کیا۔ مجالس عزا میں اس سے
پہلے بھی نوحے ترنم سے پڑھے جاتے تھے لیکن بعد میں اسی کو ایک فن بنا دیا
گیا۔ حیدری خاں میر علی اور ناصر خاں۔ میر علی حسن اور میر بندہ حسن نے اس
فن میں بڑا کمال حاصل کیا۔ جتنے سازوں نے مقبولیت حاصل کی ان میں
زیادہ تر یا تو مسلمان اپنے ساتھ باہر سے لائے تھے یا ان کی اختراع
انہوں نے بعد میں کی۔ ان سازوں کے نام یہ ہیں۔ رباب۔ چنگ۔
مچنگ، طنبورہ، قانون، عود۔ نے، دف، نقارہ، شہنائی،
سربہار، ستار، جلترنگ، طاؤس، دلربا، طبلہ اور سارنگی، اور
بین میں ترمیم کر کے عبدالعزیز خاں بین کار نے وچتر بین اختراع کی۔
واجد علی شاہ کے مٹیا برج میں منتقل ہو جانے کے بعد اس موسیقی
کا رواج بنگال اور موجودہ مشرقی پاکستان کے علاقوں میں بھی ہو گیا۔
البتہ کشمیر کے علاقہ میں ایرانی موسیقی زیادہ مقبول ہوئی۔ اور اسی
لئے وہاں کی موسیقی کی بنیاد فارسی کے "مقام" پر رکھی گئی ہے۔ ان
علاقوں میں جو اب پاکستان کا حصہ ہیں۔ گو کلاسیکی موسیقی کا خاصا چرچا
تھا لیکن یہاں کی علاقائی موسیقی بڑی فطری ہے اور یہاں کے باشندوں
کی رہائش اور رسم و رواج کی آئینہ دار ہے۔ جھومر، ٹپہ، مرشدی، معارفتی
جھنڈیالی، چاربیتہ، ڈھولک گیت وغیرہ وغیرہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔
غرض فن موسیقی ہمارا بیش بہا ثقافتی سرمایہ ہے اور
یہ فن اس قدر ترقی پا گیا کہ اب اس برصغیر کے شمالی حصہ میں وہی موسیقی
رائج ہے جو سرتاسر مسلمانوں کی اختراع ہے۔

نوشتہ:- جیک رنائٹ

*

تلخیص و ترجمہ:- اختر ملیح آبادی

میجر کو حلف کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے ملٹری اکیڈمی میں ادا کئے تھے:
"میں حلف اٹھاتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس تصور کو فراموش نہیں ہونے دوں گا کہ میں ایک سپاہی ہوں۔ میں سانس تک اپنے وطن کا وفادار رہوں گا۔ میں حلف اٹھاتا ہوں کہ میں وقفِ گرفتاری میں کوئی ایسا بیان نہیں دوں گا جس سے اُن اصولوں اور قدروں کو جو میرے وطن کو عزیز ہیں کوئی نقصان پہنچے۔"

جیسے ہی سینتالیس ساخت کے طیارے نے پہلی بار جھٹکا کھایا تو اسے خیال ہوا کہ انجن مس کر رہا ہے۔؟

اور یہ صورت اکثر دورانِ پرواز آتی ہی رہتی ہے۔ اڑتے اڑتے ایسے جھٹکے معمولات میں شمار ہوتے ہیں۔

جھٹکے کے باوجود میجر لارنس۔ آر بیلی فوجی طیارے کی سیٹ پر اسی طرح سینہ تانے بیٹھا رہا۔ اس وقت فوجی طیارہ شمالی لاؤس کے میدان "پلینس ڈی جارڈن" پر سے گزر رہا تھا۔

لیکن جب جنگِ عظیم دوم کے تجربہ کار ہوا باز نے جو فوجی طیارے کی پائلٹنگ کر رہا تھا میجر لارنس کو مطلع کیا کہ "خبردار" ــــ تب پہلی بار میجر لارنس کو فکر لاحق ہوئی اور فوراً کھڑکی کھول کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ابھی چند لمحے قبل مطلع صاف تھا لیکن اب میجر کو بادل کے روئی جیسے ٹکڑے ادھر ادھر نظر آئے اور ٹھیک اس وقت میجر نے ایک طیارہ شکن توپ طیارے کی طرف منہ کئے دیکھی اور دوسرے لمحہ اسے طیارے کے عقبی حصہ میں چمک نظر آئی۔ اور دوسری طرف آگ کے شعلے بلند ہوتے ہوئے دکھائی دئے۔

ہوا باز نے اپنی کوششیں تمام کیں اور طیارے کے چاروں فوجی مسافر گھبرا کر دروازے میں سمٹے کھڑے نظر آئے۔ آخر میجر نے پہل کی اور کہا:-

"پٹرول میں آگ لگی ہے ــ بڑھو ــ کود و ــ"

یہ کہتے ہوئے میجر لارنس نے بڑھ کر زور سے لات ماری اور ایمرجنسی دروازہ کھول دیا اور بعجلت پیراشوٹ پہننے لگا۔ جب کہ وہ سوچ رہا تھا کہ دوسرے ساتھی کیوں رک رہے ہیں؟

یہ فوجی طیارہ ایک گھنٹہ قبل سیگاؤں سے اڑا تھا۔ لاؤس کے دارالسلطنت جارہا تھا کہ اب بھڑکتے شعلوں میں گھر چکا تھا۔ میجر لارنس تیار تھا جب کہ اس کے بقیہ تین ساتھی کھڑے کانپ رہے تھے اس لئے کہ ان کے پیراشوٹ طیارے کے آخری حصہ میں تھے جہاں آگ تھی۔ میجر ایمرجنسی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس وقت طیارہ ہچکولے کھانے لگا اس نے یہ کہتے ہوئے باہر چھلانگ لگا دی۔ "کود و" ــ

باہر چھلانگ لگاتے ہی طیارے نے بھی ڈبکی لگائی اور زمین کی طرف چلا اور میجر لارنس کو زد میں لیتے ہوئے۔ یہ صورتِ حال کتنی خطرناک تھی میجر لارنس کے لئے کہ جلتا ہوا اس کے تعاقب میں تھا.....

طیارہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور ہوا میں منتشر ہو گیا۔ میجر لارنس زمین کی طرف بہہ رہا

کر رہا تھا اور دفاع بھی مبادا کوئی ٹکڑا اس کو زخمی کر دے اور وہ زمین پر اس طرح گرے کہ سنبھل ہی نہ پائے پھر چھلانگ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا تھا! میجر لارنس نے شروع سے اپنے حواس پر قابو رکھا تھا لیکن اس صورت حال سے وہ گھبرا گیا۔ فضا میں جلتے طیارے اور اس میں جنگ جاری تھی لیکن چند لمحوں بعد صورت حال بدل گئی اور خطرہ دور ہو گیا اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ کوئی شے تیزی سے آکر اس کے ہاتھ سے ٹکرائی اور وہ چیخ اٹھا اس لئے کہ برباد شدہ طیارہ کا ایک گرم ٹکڑا اس کے ہاتھ کو زخمی کر گیا تھا۔ میجر اگر ہوشیار نہ ہوتا تو اس کی موت یقینی تھی۔!

دوسرے لمحے میجر نے طیارہ کو زمین پر آواز کے ساتھ گرتے اور بکھرتے دیکھا۔ دھوئیں کا بادل فضا میں پھیل گیا اور شعلے بھڑکنے لگے۔ فضا تعفن سے معمور ہو گئی۔ اس وقت میجر لارنس نے متوحش ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ اپنے سوا اسے کوئی دوسرا پیراشوٹ کہیں نظر نہیں آیا یہ اس بات کی علامت تھی کہ اس کے بقیہ ساتھی طیارے سے چھلانگ نہیں لگا سکے اور اسی کے ساتھ جل کر بھسم ہو چکے ہیں۔

میجر لارنس جو آج سے قبل کبھی اس طرح خطرناک و تکلیف دہ تنہائی سے آشنا نہیں ہوا تھا اپنے ساتھیوں کے متعلق سوچ رہا تھا اور زمین کی طرف بڑھتا آ رہا تھا کہ بائیں ہاتھ میں درد کی شدت نے اسے سب کچھ بھلا کر خود اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا بایاں ہاتھ ٹوٹ چکا تھا اگر قدرے نا اہلی برتی تو زمین پر آتے آتے زندگی کا خاتمہ بھی یقینی تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میجر لارنس نے ساری توجہ اپنے خطرناک کام کی طرف مرکوز کر دی ساتھیوں کا ماتم وہ بعد میں بھی کر سکتا تھا اس وقت جبکہ وہ زمین پر صحیح وسالم پیر ٹیک دے۔

میجر نے زمین کی طرف نظر ڈالی اور جائزہ لیا وور تک خشک لمبی گھاس جس کے سرے چاقو کے مانند تھے کھڑی نظر آئی اور ساتھ ہی طیارہ کے جلنے سے پھیلی ہوئی بدبو ناک میں آئی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ زمین پر اترنے کے بعد ممکن ہے وہ طیارے سے اپنے کسی اور ساتھی کو نکالنے میں مدد دے سکے۔ اس لئے کہ طیارہ فاصلہ پر نہیں گرا تھا۔ حالانکہ میجر لارنس زخمی ہو چکا تھا لیکن پھر بھی انسانیت کا جذبہ

الشجاع

جوں کا توں تھا۔

زمین پر آتے آتے میجر چت ہو گیا۔ چند لمحے وہ اسی طرح پڑا رہا جس طرح کہ وقت نے اسے اس وقت پچھاڑا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے ایک ہاتھ کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش بارآور نہ ہو سکی۔ لیکن ہمت ہارنا اسے آتا ہی نہ تھا۔ وہ پھر بصد کوشش اٹھا اور پیراشوٹ سے اس نے نجات حاصل کی۔ جلدی اسے اس لئے اور بھی تھی کہ وہ طیارہ تک پہنچ کر آخر وقت میں بھی جو خدمت اور مدد کر سکتا تھا اس میں اسے دیر نہیں کرنی تھی۔ پیراشوٹ سے آزاد ہو کر اور بائیں ہاتھ کو فراموش کرتے ہوئے جوں ہی وہ آگے بڑھا تو اسے معلوم ہوا کہ بائیں ہاتھ کے علاوہ بایاں گھٹنہ بھی جواب دے چکا ہے۔ اس وقت گھبرا کر اس نے طیارہ کی طرف دیکھا تو مایوس ہو گیا اس لئے کہ وہاں اب کچھ نہ تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ شعلے تھے صرف اور آگ کا ہالہ تھا۔ شعلوں کی تہہ میں کیا شئے چھپی تھی یہ معلوم کرنا ممکن نہ تھا۔ میجر لارنس نے گہری سانس لی اور مایوس ہو کر خود کو گھاس پر اس طرح گرا دیا جیسے کہ کسی نے اس کو دھکا دے دیا ہو اور گھاس کے بستر پر لیٹتے ہی میجر لارنس نا امیدی کی دنیا میں چلا گیا۔ جو ہمت۔ عزم۔ خوشی اور امید کی دنیا سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔!

شمالی ویٹ نام و شمالی لاؤس کے درمیان جنگلاتی سلسلہ ہے ان کے درمیان جارڈن کا میدان پلیٹو کی شکل میں نمودار رہے۔ اسی میدان میں میجر لارنس کے طیارہ کو طیارہ شکن توپ سے ۲۳ مارچ ۱۹۶۱ء میں تباہ کیا گیا اور اس کی جان پر حملہ ہوا۔ یہ علاقہ فوجی کارروائیوں سے بے نیاز علاقہ تھا جبکہ اس میدان کو چھوڑ کر امریکہ نواز حکومت اور گوریلاؤں کے درمیان معرکہ آرائیاں جاری تھیں۔

میجر لارنس نے اپنی عسکری زندگی کا آغاز سن ۱۹۵۵ء میں امریکی ہوائیہ سے کیا تھا اور آجکل وہ لاؤس کے امریکی سفارت خانے میں اسسٹنٹ ملٹری اٹیچی کے عہدے پر مامور تھا۔ یہ حملہ گوریلاؤں نے کیا تھا اور میجر لارنس گھاس پر لیٹے لیٹے غور کر رہا تھا کہ یقیناً گوریلا کسی قریبی پہاڑی سے اپنے کارنامے کو دیکھ رہے ہوں گے اور

اپنی کامیابی پر مسرور ہوں گے۔

لیکن میجر لارنس کو معلوم تھا کہ اس اطراف کے پہاڑی لوگ قطعی غیر جانب دار ہیں اور جنگ سے نالاں بھی ہیں اسے امید تھی کہ پہاڑیوں نے اگر اپنے مہمان کو تلاش کر لیا تب وہ قطعی طور پر محفوظ ہو جائے گا برخلاف اس کے اگر دشمنوں نے اسے تلاش کیا تب وہ یقیناً غیر محفوظ ہوگا اور اس کی گرفتاری لاؤس کی امریکہ نواز حکومت کے لئے سخت پریشانی کا باعث ہوگی۔

یہ سوچ کر میجر لارنس نے گہری سانس لی اور پیشانی پر سے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹا اس وقت اسے درد اور گرمی کا احساس ہوا، ساتھ ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور سوچنے لگا کہ اب اسے کرنا کیا ہے؟ لیکن اسے کوئی جگہ محفوظ نظر نہیں آئی میجر لارنس مایوسی کے عالم میں گھاس ہی میں بیٹھا رہا۔ طرح طرح کے خیالات آتے اور جاتے رہے کبھی وہ مطمئن ہو جاتا اور کبھی فکر مند۔

سورج کی گرمی بڑھ چکی تھی اور میجر لارنس متفکر تھا کہ آنے والے سخت لمحوں سے وہ کیسے دامن بچا سکے گا کہ اچانک اسے آہٹ محسوس ہوئی اس نے چونک ادھر ادھر دیکھا تو قریب بیس آدمیوں کا ایک جتھا اپنی طرف بڑھتے ہوئے نظر آیا۔ پہلی نظر میں لارنس پہچان نہ سکا کہ اس کے میزبان کون تھے؟ حکومت لاؤس کے طرفدار یا مخالف؟ لیکن آنے والے مسلح تھے اسقدر اس نے ضرور دیکھ لیا تھا۔ وہ قدرے اضطراب کے ساتھ آنے والوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اور جب وہ لوگ قریب آئے تب میجر لارنس پہچان سکا کہ اس کے میزبان پہاڑی لوگ نہیں بلکہ لاؤس کے باغی تھے۔!

دشمن کے افسر نے میجر لارنس کو جوں ہی دیکھا اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر چلایا اور کہا "تم۔۔ تم۔۔!" گویا اس طرح اشارہ سے وہ کہہ رہا ہو کہ میجر لارنس دونوں ہاتھ فضا میں اٹھا دے!۔ میجر لارنس اشارہ سمجھ گیا اس نے سیدھا ہاتھ اٹھاتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے اور اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہاتھ ٹوٹ چکا ہے۔ میں زخمی ہوں!"

اس وقت ایک فوجی نے رائفل چھین لی۔ مبادا امریکی کوئی شرارت کر بیٹھے۔!؟

"ہپ!۔۔ ہپ!!" افسر نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔ "کیا تم ہلاک کر دو گے؟"

میجر لارنس نے اشارہ سے بائیں ہاتھ کے متعلق بتایا کہ وہ بیکار ہے اور یہ کہ اسے اٹھانا ممکن نہیں۔ تب افسر ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا: گارڈ ساتھ تھا اور رائفل کے گھوڑے پر ہوشیاری سے انگلی رکھے تھا افسر نے قریب آکر ٹوٹے ہوئے ہاتھ کا معائنہ کیا۔ تب اسے یقین آسکا کہ میجر غلط بیانی نہیں کر رہا ہے۔

گوریلا دستے کے افسر کو جب ٹوٹے ہوئے ہاتھ کا یقین ہو گیا تب اس نے اطمینان سے اشارہ کیا، سب کے سب بیسوں گوریلا رائفلیں تانے میجر کے اردگرد پھیل گئے اور اس وقت میجر کی تلاشی کا کام شروع ہوا۔ میجر کے پاس جو بھی اشیا تھیں سب لے لی گئیں، جامہ تلاشی کا مقصد بھی یہی تھا۔ بعد تلاشی گوریلا دستے نے کوچ کا ارادہ کیا۔ میجر لارنس کو وہ ساتھ لے جانا چاہتے تھے انھوں نے کوشش کی کہ میجر ان کے ساتھ چلے۔ لیکن میجر کا بایاں پیر چونکہ اس قابل نہ تھا کہ وہ پیش قدمی کر سکے جس پر افسر پریشان ہوا اور کہا کہ وہ جلد از جلد اس کھلی جگہ سے ہٹ جانا چاہتا ہے۔

جب انھیں احساس ہوا کہ امریکی میجر چل نہ سکے گا تب انھوں نے میجر کو خود اٹھا کر لے جانے کا ارادہ کیا اور اس پر عمل بھی کیا۔ قریب ایک میل چل کر وہ سب ایک جنگل میں پہنچے اور چھپ گئے اس لئے کہ ان کو احساس تھا کہ کھلی جگہ ان کے لئے خطرناک اس لئے ہے کہ پہاڑیوں نے اگر انھیں دیکھ لیا تو ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور میجر کو چھڑا لے جائیں گے جو انھیں منظور نہ تھا۔ راستے میں میجر نے چاہا تھا کہ جنگل کی طرف پیش قدمی میں خلل ڈالے تاکہ ممکن ہے پہاڑی اسے دیکھ لیں اور اس کی رہائی فوری ہو سکے لیکن میجر لارنس کی یہ امید پوری نہ ہوئی۔

جنگل میں پہنچ کر میجر لارنس اپنے مستقبل کے متعلق بری طرح سوچنے لگا۔ طیارے کی تباہی اور ممکن ہے کہ اس کی گرفتاری کی اطلاع جوں ہی امریکی نواز حکومت کو ہوگی اس وقت حکومت تلاش و جستجو میں تاخیر نہ کرتے ہوئے اقدام کرے گی۔ اس صورت میں اگر کمیونسٹ اسے محفوظ مقام پر نہ پہنچا سکے تب ممکن ہے اپنے "انعام" کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر کمیونسٹ

الشجاع

پسپائی کے وقت اسے ہلاک کر دیں . . . ! ؟

اچانک میجر لارنس چونک پڑا اس کے خیالات منتشر ہوگئے اسلئے کہ کمیونسٹ افسر چلا کر کچھ کہہ رہا تھا اور ہاتھ سے اشارہ بھی کر رہا تھا۔ اس نے کہا کیا میجر لارنس سمجھ نہ سکا لیکن جملہ گوریلا فوراً چلے گئے صرف افسر موجود تھا۔ پھر اس نے پستول نکالا اور میجر کے سامنے ایک گرے ہوئے پیڑ کی شاخ پر بیٹھ کر پہرہ دینے لگا۔ اب میجر کی سمجھ میں بات آ گئی۔ برباد شدہ طیارے کی چھان بین مقصود تھی نیز اس کے اپنے پیراشوٹ کی تلاش تھی تاکہ گوریلا استعمال کر سکیں۔

میجر لارنس پھر اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ اس وقت اس کے تصور میں اس کی بیوی تھی۔ "بے ٹی" "اس وقت کیا کر رہی ہوگی۔ ؟ میجر سوچ رہا تھا اور اس کے تین بچے۔ "باربرا" "لارے" اور "ایلائینی" اس وقت میجر لارنس کے اندر زندہ رہنے کی بری طرح خواہش ابھری۔ کچھ بھی ہو وہ اپنی بیوی اور بچوں کے لئے زندہ رہنے کی پوری کوشش کرے گا۔ اگرچہ زندگی کا راستہ محدود ہو گیا ہے لیکن پھر بھی وہ ایسے دا کرے گا۔ اچانک اسے کوریا کے ان امریکی افسروں کا حشر یاد آیا۔ جنھیں ایذائیں دی جاتی تھیں تاکہ وہ اپنا مسلک تبدیل کر دیں۔ لیکن میجر کو حلف کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے ملٹری اکیڈمی میں ادا کئے تھے۔ "میں حلف اٹھاتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس تصور کو کبھی فراموش نہ ہونے دوں گا کہ میں، ایک سپاہی ہوں۔ میں اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوں گا۔ اور ان نظریات، تصورات، اصولوں اور قدروں کے لئے اپنی جان دینے سے بھی نہیں ہچکچاؤں گا جن پر میرے وطن کی آزادی کا انحصار ہے۔ میرا عقیدہ خدا پر رہے گا اور میں آخری سانس تک اپنے وطن کا وفادار رہوں گا۔ اگر میں گرفتار ہوا تب بھی میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا بلکہ ہر ممکن طور پر جدوجہد جاری رکھوں گا۔ میں حلف اٹھاتا ہوں کہ وقتِ گرفتاری میں کوئی ایسا بیان نہ دوں گا جس سے ان قدروں یا اصولوں کی جو میرے وطن کو عزیز ہیں نقصان پہنچے۔ بیان نہ زبانی ہوگا اور نہ تحریری . . . !"

دن بھر جنگل میں رہنے کے بعد گوریلا میجر لارنس کو جنگل کے اس اندرونی حصے تک لے گئے جہاں ایک چھوٹی پہاڑی تھی۔ یہاں ایک

الشجاع

ایسا آدمی سامنے آیا جو انگریزی داں تھا۔ میجر لارنس زمین پر دراز ہو گیا تو انگریزی داں افسر ہاتھ میں ریوالور لئے آیا اور انتہائی غصہ و طنز سے پوچھا۔ "لعنت ہو تم پر! اس خطے میں تمہارا کیا کام ؟" میجر لارنس نے ریوالور کو اپنی طرف تنے دیکھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب اس نے پھر کہا "ہم تمہیں بھی قتل کر دیں گے۔ سمجھے ؟" میجر نے سر ہلایا۔ تب اس نے کہا۔ "دیکھو! تمہارے کاغذات ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ تم ملٹری ایجی ہو ۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تم کہاں سے آ رہے تھے اور کہاں کا قصد تھا ؟ (رک کر) یہ نہ بھولنا کہ جواب ناکافی ہوا تب تمہاری ہلاکت یقینی ہے . . . !"

لیکن ہاتھ کا درد ابھر چکا تھا۔ پھر بھوک نے میجر لارنس کو موت سے بے خوف کر دیا تھا۔ یہ سچ تھا کہ ایک لمحہ کے لئے اس کی نگاہ ریوالور سے ہٹ نہ سکی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دھمکیاں بے معنی ہو کر رہ گئیں ۔۔۔ !

شاید افسر کو اپنی دھمکیوں کی بے اثری کا احساس تھا۔ جبھی سے وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ سوچتا رہا پھر اس نے حکم دیا اور چند لمحوں میں ایک چھوٹا ٹرک لایا گیا۔ تب ریوالور میجر کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے اس نے پھر ہٹے غصے سے کہا۔ "آخری موقع ہے تمہارے لئے . . . ورنہ بتاؤ کہ تم سیٹو (SEATO) کے متعلق کیا معلومات رکھتے ہو ۔۔۔ ؟ بتاؤ کہ سیٹو نے لاؤس کے متعلق کیا پلان بنایا ہے ؟"

میجر نے آنکھیں بند کر لیں اور جب وہ گہری سانس لے رہا تھا تب اس نے گھوڑا اٹھنے کی خفیف آواز سنی اور پھر سانس روک لی۔ ایک لمحہ گزرا۔ دوسرا تیسرا اور چوتھا بھی گزر گیا لیکن ریوالور سے گولی نہ نکل سکی میجر نے آنکھیں اس وقت کھولیں جب چار آدمی اسے پکڑ کر اٹھا رہے تھے۔ اور ٹرک میں لاد رہے تھے۔ جب وہ ٹرک میں بٹھا دیا گیا تو گوریلا افسر آگے بڑھا اور اس نے پہلی بار نرم لہجے و با انداز اخلاق کہا۔ "کوئی بات نہیں میجر! تم تھکے ہوئے ہو اور زخمی بھی ہو تمہیں علاج و آرام کی ضرورت ہے۔ جب تم اچھے ہو جاؤ گے اور ذہنی طور پر پرسکون، تب ہم باتیں کریں گے۔ ہمیں تمہاری خاطر داری منظور ہے۔ تم ہمارے معزز مہمان ہو اور تمہاری شخصیت ہمارے لئے بہت اہم ہے۔"

دوسرے لمحے رات کی خاموشی ٹرک کی آواز سے لرز اٹھی۔
ٹرک جھٹکے کے ساتھ شمال کی طرف ہو لیا۔

میجر اس رات ایک میدانی اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اسپتال عارضی معلوم ہوتا تھا اور ایک ہوائی اڈے کے قریب تھا۔ میجر کے جاتے ہی ایک ڈاکٹر نے میجر کے زخمی ہاتھ کا علاج شروع کیا اور دو محافظ دن رات میجر کی نگرانی کے لئے تعینات کر دیئے گئے۔ ایک ہفتہ اسپتال میں گزر گیا۔ اس وقفہ میں علاج کے ساتھ ساتھ سوالات کا سلسلہ بھی جاری رہا جو اچانک اس تصور کے تحت روک دیا گیا کہ صحت میجر کے لئے اول درجہ رکھتی ہے اس لئے کہ توانا و تندرست آدمی ہی موت کی دھمکی سے متاثر ہو سکتا ہے نہ کہ اذیت میں گھرا ہوا انسان!

جوں جوں ہاتھ کو افاقہ ہو رہا تھا میجر لارنس کو یقین ہوتا جاتا کہ اس کی قید کا یہ ابتدائی دور جلد ہی ختم ہونے والا ہے اور یہ کہ اذیت ناک قید و بند کا آغاز جلد ہی ہونے والا ہے — وہی ہوا۔ چند دن بعد میجر لارنس کے آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور چار آدمی اسے اٹھا کر لے چلے تا کہ میجر کچھ دیکھ نہ سکے لیکن قیاس سے میجر نے جان لیا کہ اسے ہوائی اڈے لایا گیا ہے۔ اس لئے کہ تھوڑی دیر بعد اسے ایک طیارہ میں لٹا دیا گیا جو اسے لے کر پرواز کر گیا۔!

میجر کو ایک دریائی شہر پہنچا دیا گیا بعد میں میجر کو علم ہوا کہ وہ شمالی ویٹ نام و لاؤس کے ایک سرحدی گاؤں "سام نیوا" میں مقیم ہے۔ جس عمارت میں میجر کو لایا گیا وہ ساخت کے لحاظ سے فرانسیسی تھی اور میجر کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ عمارت فرانسیسی اقتدار کی یادگار ہے جو فرانسیسی حاکموں نے تعمیر کی تھی اور ایشیا کی بیداری تک وہ ان کے استعمال میں رہی اسلئے کہ عمارت کے آگے جو باغ تھا وہ اگرچہ خراب حالت میں تھا پھر بھی فرانسیسی اقتدار کا نوحہ خواں ضرور تھا!

میجر کو ایک پرانے لوہے کے پلنگ پر لٹا دیا گیا جس پر ایک معمولی سا بستر تھا۔ کمرے میں روشنی کا انتظام نہ تھا بلکہ روشنی کا ریڈر سے چھن کر کمرے میں آتی تھی اور جب دروازہ باہر سے بند ہو گیا تب میجر نے دیکھا کہ وہ گرد و دھول سے مزین کمرے میں آرام سے لیٹا ہوا ہے! کمرہ بوسیدہ اور پر تعفن تھا اس میں عرصے سے صفائی ہوئی ہی نہ تھی۔ دیواروں کے پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑ رہے تھے اور کچھ پھوٹے ہوئے گرنے کی راہ دیکھ رہے تھے۔

اپنی نئی رہائش گاہ میں میجر لارنس رات بھر جاگتا رہا اور قطعی سو نہ سکا۔ صبح میجر کو چاول اور مچھلی ناشتے میں دی گئی۔ ناکافی چاول اور ایک چھوٹی مچھلی۔ میجر کے ناشتے میں آتی جسے ہاتھ لگانا بھی بار تھا کھانا تو در کنار۔ ناشتہ کے بعد ایک نہیں بلکہ چھ عدد جاسوس میجر کے کمرے میں در آئے۔ اور اس کے پلنگ کو گھیر لیا۔ کمرے میں تاریکی تھی جو روشنی کو ریڈر سے چھن کر آرہی تھی اسی کو کافی خیال کیا۔

چند لمحے خاموشی کے بعد ایک جاسوس نے کہا: "ہم یقین کرتے ہیں کہ تم سیٹو کانفرنس میں شریک تھے۔ تمہارے کاغذات اس کے گواہ ہیں... ایشیا میں امن و فارغ البالی کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں سیٹو کانفرنس کا پورا حال معلوم ہو۔ چونکہ تم ملٹری اتیچی ہو لہٰذا یہ باور کیا جاتا ہے کہ تمہیں سیٹو کی اندرونی پالیسی اور پروگرام کا پورا علم ہوگا میجر۔"

چند لمحات بعد میجر لارنس سے ٹھوس سوالات ہونے لگے۔ لیکن میجر آغاز سے خاموش تھا اور اب بھی چپ رہا۔ تب وہ خود ہی سوال کرتے اور خود ہی جواب دینے لگے۔ لیکن میجر ان کی چال سمجھ گیا۔ مطلب یہ باور کرانا تھا کہ میجر کو یقین دلا دیا جائے کہ وہ پورے راز سے واقف ہیں۔ میجر اگر چاہے تو تصدیق یا تردید کرے یا ان کے بیانات میں ترمیم۔ لیکن میجر نے ان کی چال کامیاب نہ ہونے دی۔ لیکن ان کے سوالات و جوابات کا جو تانا بانا تھا اس سے میجر تاڑ گیا کہ ان کی معلومات قطعی ناکافی و ابتدائی تھیں وہ لوگ محض بھرا دے رہے تھے میجر کو۔

"کیوں میجر!" سوال ہوا "یہ امریکن مشیر کار جو کہلاتے ہیں ان کی تعداد کتنی ہوگی؟"

میجر کی خاموشی پر دوسرا سوال ہوا "کیا یہ صحیح ہے کہ پچھلے ہفتے مزید تیس مشیر کار آئے ہیں؟ — ہم باقاعدگی کے ساتھ ان مشیروں کی بہت خبر رکھ رہے ہیں۔"

سوالات کا رخ سیٹو، امریکی فوجی پالیسی سے مڑا تو سیاسی روپ دھار لیا۔ دراصل دو جدا جدا ٹیمیں میجر لارنس سے اپنے اپنے مطلب کے سوالات کر رہی تھیں۔ ایک مارکسسٹ ٹیم تھی دوسری ٹیم کا تعلق کمیونسٹ گوریلا تنظیم سے تھا جن کی ذمہ داری پہلی ٹیم سے جدا تھی۔ پہلا کورس تین چار

گھنٹے کا تھا اور پھر کسی دھمکی کے شروع ہو کر ختم ہو گیا۔ اور پھر کچھ دنوں کے لئے میجر کو تنہا چھوڑ دیا گیا کہ اچانک پھر سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو دن یا رات کی مطلق شرط نہ رہی رات گئے میجر کو جگا کر سوالات ہونے لگے اور اس کے بعد پھر اچانک خاموشی تھی۔

میجر نے خاص بات یہ محسوس کی کہ ایک مترجم ایک بار آ کر دوبارہ صورت نہیں دکھاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر میٹنگ میں نیا مترجم سامنے آتا۔ ایسا کیوں تھا میجر کچھ سمجھ نہ سکا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر نیا مترجم اپنے انداز و تکنیک سے سوالات کرتا تھا جس کی وجہ سے میجر کو اکثر ذہنی پریشانی سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اپریل اور مئی پورے کا پورا سوالات کی نذر ہو گیا تھا ان دو مہینوں میں میجر لارنس نے دماغی انحطاط بھی محسوس کیا۔ اس لئے کہ غذا جو مل رہی تھی وہ جینے کے لئے بھی ناکافی تھی۔ پھر آسایش ضروری کے فقدان اور شب و روز کے سوال و جواب نے میجر کو کمزور کر دیا تھا۔

ایک میٹنگ میں جبکہ سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی میجر نے محسوس کیا کہ سوالات اچانک ختم ہو چکے ہیں۔ میجر نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تب اس کے کانوں میں یہ الفاظ پڑے۔ "ہم ہفتوں سے غیر معمولی صبر سے کام لے رہے ہیں۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ تم ایک غیر ملکی حملہ آور ہو لیکن پھر بھی ہم نے صبر سے کام لیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ تم اپنی نادانی کے سبب سامراجی مشین کا پرزہ بن گئے ہو۔ جبکہ ہم تمہیں نئی روشنی سے آشنا کرانا چاہتے ہیں۔ سوشلسٹ ڈیموکریسی تمہارے لئے یقینی طور پر زیادہ مفید ہے لیکن ہمیں حیرت ہے کہ اب تک تم نے ہمیں کوئی اشارہ نہیں دیا۔"

یہ کہہ کر مترجم واپس چلا گیا اور اس کی جگہ ایک محافظ اندر آیا جس کے کاندھے سے رائفل ٹنگا تھا لیکن میجر کے پلنگ کے پاس آتے ہی کاندھے سے اس نے رائفل اتار لیا اور میجر لارنس کی طرف نشست باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور میجر کی جملہ توجہ دنیا سے ہٹ کر رائفل کے سوراخ کی طرف مرکوز ہو گئی۔ جب گارڈ نے رائفل کا گھوڑا چڑھایا تو میجر لارنس نے سانس روک لی اور آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ اور جب میجر نے آنکھیں کھولیں تو وہاں نہ محافظ تھا اور نہ رائفل کا سیاہ سوراخ بلکہ وہ خود تنہا ٹوٹے ہوئے پلنگ پر لیٹا تھا اور کمرے کی بدبو تیز ہو چکی تھی۔ کوریڈور سے مترجم کی تند و تیز آواز آ رہی تھی وہ کہہ رہا تھا۔ "یاد رکھو میجر! اگر تم تعاون نہ کرو گے تب ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم گارڈ کو تمہیں گولی مار دینے کا حکم دیدیں گے۔ لہٰذا سوچ لو اور جب ہم دوبارہ آئیں تب تمہیں بدلا ہوا پائیں ورنہ"

لیکن وہ جلد واپس نہیں آیا۔ دن اور ہفتے گزر گئے۔ لیکن جو محافظ آڑ میں اب تک رہتے تھے اب وہ سامنے کھڑے نظر آنے لگے جو میجر کی موت کا اعلان کرتے رہتے تھے اور اس طرح میجر کو زندگی کا کوئی پرسکون سانس لینے کی مہلت نہیں دیتے تھے۔ میجر لارنس کسی وقت منتشر ہو کر غور کرتا اور خود سے پوچھتا۔ "کہاں میں مزید مقابلہ کر سکوں گا؟"

جب میجر میں استقلال ابھرتا تب وہ حالات پر غور کرتا تو اس نتیجے پر پہنچتا کہ اسے قتل کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اس کا قتل اگر ضروری ہوتا تو اب تک ہو چکا ہوتا۔ یہ سوالات کا سلسلہ اس خیال کی کھلی تردید تھا۔ اس کے علاوہ اب تک خاموش رہ کر زندہ رہا ہے تو کیا وجہ ہے کہ وہ آئندہ خاموش رہ کر زندہ نہ رہ سکے۔۔۔!؟۔

چاول اور سڑی مچھلی نے میجر کو بیمار بنا دیا تھا۔ ساتھ ہی کمرے کی غلاظت ہوا کی کمی۔ دھوپ کا فقدان میجر کو زردی دے رہا تھا۔ میجر نے جب محافظوں سے حفظان صحت کی آسائش و ضرورت کے لئے بات کی تو تلخ جواب ملا اور قطعی طور پر انکار کر دیا گیا۔ اس گھٹن میں میجر کے لئے زندہ رہنا کیسے ممکن تھا!؟۔

اور ایک دن ایک مترجم نے آ کر بڑے اخلاق سے کہا۔ "شاید غذا کی خرابی کی وجہ سے تم ہم سے ضد کر رہے ہو؟۔ ہم تمہیں بھیجنے کے لئے کیلے دے سکتے ہیں۔ ہمارے پاس بھیڑ کا گوشت بھی ہے اور ڈبوں میں بند غذائیں بھی یہاں تک کہ دودھ بھی۔" میجر کو امید بندھی کہ غذا اب بہتر ملنے لگے گی اس وقت اس کو بہت کوفت ہوئی جب بہتر غذا کے بجائے کھرے سوالات پوچھے جانے لگے۔ جب میجر نے پھر خاموشی اپنائی تو اسے خوش کرنے کے لئے میجر سے ان غذاؤں پر تبادلہ خیال ہونے لگا جو میجر کے لئے ضروری تھیں لیکن غذا کا آنا اس بات پر منحصر تھا کہ میجر ان کے سوالات کا جواب بھی دے۔ جو ممکن نہ تھا لہٰذا غذا بھی ناممکن کے دائرے میں رہی۔۔ اور اسی رات ایک بھیانک صورت محافظ مع رائفل کے میجر کے سر پر تعینات کر دیا گیا جو رات بھر رائفل تانے میجر کو ڈراتا اور دھمکاتا اور کہتا رہا۔ "مار دوں۔۔ گولی!"

دوسری صبح کو نرالی سزا تجویز ہوئی۔ بہتر غذا سامنے لائی گئی اور مترجم نے مسکرا مسکرا کر میجر کو دکھائی اور یقین دلایا کہ یہ صرف اس کے لئے ہے بس سوال کا جواب ملنے پر غذا حوالے کر دی جائے گی۔ میجر کے لئے وہ وقت بڑا صبر آزما تھا۔ پھر بھی اس نے آنکھیں بند کرلیں تاکہ وہ غذا کو نہ دیکھ سکے لیکن غذا کی خوشبو دماغ تک کو منتشر کئے دیتی تھی!

ایک دن جب مترجم اپنا سوال لے کر آیا تو میجر نے پوچھا:۔
میرے خاندان کو میرے متعلق کیا معلوم ہے؟ کیا صلیب احمر کو میرے متعلق معلومات دے دی گئی ہیں؟۔ کیا میری بیوی "بوبی" کو میرے متعلق کچھ علم ہے۔؟"

میجر کو زبردست دھچکا لگا جب مترجم مسکراتا رہا لیکن اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میجر کے دماغ میں لاوا پھوٹ نکلا۔ "لاریل" میں اس کی بیوی اور اس کے تین بچے اندھیرے میں ہوں گے انھیں معلوم نہیں ہے کہ اس کا شوہر اور ان کا باپ کہاں ہے؟۔ زندہ ہے یا مرچکا ہے؟.... وہ سب کسقدر حیران و پریشان ہوں گے اور مغموم بھی؟.... کیا وہ اپنی بیوی اور بچوں کو خط لکھ سکتا ہے....؟
اچانک میجر لارنس نے تڑپ کر پوچھا۔ "کیا میں اپنے گھر خط لکھ سکتا ہوں؟"

"ہاں!" مترجم بولا۔ "شاید کل۔"

"کیا انھیں میری زندگی سے متعلق باخبر کیا جاسکتا ہے؟"

اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔

"کیا میرے لئے کوئی پیغام آیا ہے؟"

"میجر!" مترجم نے ٹھنڈی آواز میں کہا۔ "پہلے تم ہمارے سوال کا جواب دو۔ پھر ہم تمہارے سوال کا جواب ضرور دیں گے۔!"

میجر لارنس اب اپنی موجودہ زندگی سے خوگر ہو گیا تھا۔ اب اسے کسی بات کا شکوہ نہ تھا۔ اگر وہ مہینوں سے نہایا نہیں تھا تو کیا ہوا اگر داڑھی بڑھ کر بے ہنگم ہوگئی تھی تب کیا حرج تھا۔ ناخن بڑے ہوگئے تھے اسے قطعی ملال نہ تھا۔ کمرے کی گندگی اور غلاظت کا احساس ہی مٹ گیا تھا۔

صبح وہ روشندان سے سورج کی کرنوں کے آتے ہی اپنے پروگرام میں مصروف ہو جاتا۔ بڑے بڑے ناخنوں سے پلاستر پر نشان بناتا تاکہ وقت کا اندازہ ہوسکے۔ امریکہ کی جملہ ریاستوں کی گنتی کرتا۔ وہاں کے کوائف کو ذہن میں لکھتا۔ ترمیم کرتا۔ یا پھر ساحلی مقامات کی سیر کرتا اور دوسرے ملکوں سے اس کا موازنہ۔ اس طرح دن گزر ہی جاتا تھا۔

لیکن ایک صبح جب محافظ ناشتہ لایا جس کا اب وہ عادی ہوچکا تھا تو اس نے ایک پیکٹ بھی میلے بستر پر پھینکا۔ میجر لارنس کے لئے وہ پیکٹ ایک 'نئی دنیا' سے کم نہ تھا۔ لپکا پیکٹ کھولا تو خطوط تھے۔ خوشی سے وہ شادی مرگ ہوگیا۔ اور بھوکے جانور کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا ایک خط 'بے بی' اس کی بیوی کا تھا۔ ایک ماں کا خط تھا۔!

سب سے پہلے میجر نے بیوی کا خط پڑھا۔ لکھا تھا:۔
" تمہاری زندگی پر ہم خدا کے شکر گزار اور احسان مند ہیں ہمارے لئے پریشان نہ ہونا۔ ہم سب بخیر ہیں۔ تمہارے منتظر ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ تمہیں ہم سے ملائے۔"
جنگی قیدی کے خطوط میں پچیس الفاظ سے زائد نہیں ہوسکتے تھے۔ لہٰذا ہر خط پچیس الفاظ پر مشتمل تھا۔ وہ ان مختصر خطوط کو بار بار پڑھ رہا تھا جیسے کہ پہلی بار پڑھ رہا ہو۔ کمرے میں اگرچہ ملگجی سی روشنی تھی لیکن پھر بھی میجر خط پڑھتا ہی رہا۔

میجر لارنس گندے فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کتنا خوش تھا آج۔ آج کا دن کتنا حسین تھا۔! بیٹھے بیٹھے وہ ذہنی کیلنڈر سے آج کی تاریخ تلاش کرنے لگا۔
۱۸ اکتوبر ۱۹۶۵ء۔ اف! سات ماہ بعد آج خوشی کا پہلا دن اسے نصیب ہوا تھا۔ پھر بھی آج کی خوشی اتنی زائد تھی کہ سات ماہ کے دکھ درد۔ مصائب۔ اور گھٹن وہ اچانک بھول بیٹھا تھا۔
اس رات میجر لارنس سوچ رہا تھا کہ گوریلاؤں کا دوسرا قدم کیا ہوگا۔!؟

دوسری صبح کو وہ مترجم کا منتظر رہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ آئے گا۔ لیکن دن مایوسی میں گزر گیا کوئی نہیں آیا۔ اگلی صبح کو اس کی امیدیں جوان ہوئیں لیکن رات ہوتے ہی مرجھا گئیں یہانتک کہ ہفتے گزر گئے اور کوئی بھی نہیں پھٹکا سوائے محافظوں کے۔ اور یہ سزا اس کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی۔ اس وقت میجر کو خیال

آیا کہ اس نے پانشٹ لاؤ کو سمجھنے میں غلطی کی۔ اس کا ذہن دیگر ظالمانہ سزاؤں کے متعلق سوچتا رہا جبکہ سرد سزاؤں کی طرف اس کا دھیان تک نہیں گیا تھا۔ میجر لارنس کو تنہائی میں رکھا گیا تھا۔ جہاں نہ کوئی اس سے بات کرنے والا تھا نہ کچھ سننے والا۔ میجر دور سے آوازیں سنتا تھا۔ اس وقت اسے اچانک احساس ہوتا کہ اس کے کمرے کے باہر زندگی ہے لیکن وہ زندگی سب کے لئے تھی سوائے میجر کے اور اس طرح میجر لارنس نے اپنی قید تنہائی کا ایک سال پورا کر لیا—!

۲۳ مارچ ۱۹۶۲ء کی رات تھی — کل اسے پورا ایک سال ہو جائے گا۔ میجر لارنس رات بے چینی کی وجہ سے سو نہ سکا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی قید کے لئے کیا گوریلاؤں نے ایک سال کی مدت مقرر کی تھی؟ اگر ایسا ہے تو کل اس کو ہلاک کر دیا جائے گا—!؟ اگر اس کا خیال غلط نہیں تو اسے اس تاریک کمرے سے نکالا جائے گا۔ اس کے ارد گرد محافظ ہوں گے۔ رائفل اور ریوالور والے اسے ایک جج یا فوجی افسر کے سامنے پیش کیا جائے گا اور پھر چند لمحوں میں اس کی زندگی کا فیصلہ ہو جائے گا۔

پچھلے پہر میجر لارنس کو بہر حال نیند آگئی—!

صبح اس کا خواب پورا ہو گیا۔۔۔!!

اسے تنگ و تاریک و متعفن کمرے سے نکالا گیا۔ پہریداروں کے جھرمٹ میں لیکن اس کا مقدمہ پیش نہیں ہوا اور نہ اسے سزا ہی ملی بلکہ دوسرے آرام دہ کمرے میں اسے منتقل کر دیا گیا اور بس!

ایسا کیوں؟۔ میجر لارنس کا دماغ بری طرح منتشر تھا۔ یہ بہتر تبدیلی کیوں اور کس لئے—؟ نیا کمرہ ہر لحاظ سے اس تنگ و تاریک کمرے سے افضل تھا۔ آرام دہ بستر۔ ہوا۔ روشنی۔ نیز پانی بھی میجر کو پہلی بار ملا۔ ساتھ ہی اچھی غذا ایک سال بعد پہلی بار نظر آئی۔ یہی نہیں بلکہ شام کو چند منٹ کے لئے باغ کی سیر بھی اسے نصیب ہوتی۔ لیکن تنہائی پھر بھی باقی رہی۔ کسی سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن نئی تبدیلی کا میجر لارنس نے خیر مقدم کیا—!

لیکن یہ تبدیلی کس لئے تھی۔ اس کا میجر لارنس کو علم نہ تھا کہ ایک رات کمرہ کا دروازہ کھلا اور سامنے ایک آدمی فوجی وردی میں نہیں بلکہ سیویلین لباس میں کھڑا کہہ رہا تھا، "جنگ ختم ہو گئی — جلد ہی صلح نامہ پر دستخط ہو چکے ہیں۔ جنگی قیدی جلد از جلد رہا ہو جائیں گے جونہی تفصیلات طے ہو گئیں—!" یہ کہہ کر وہ افسر چلا گیا اور میجر لارنس سوچنے لگا کہ یہ کوئی چال تو نہیں!؟ لیکن ٹھیک اس وقت محافظ نے پینتالیس خطوط میجر لارنس کو دیئے — میجر کی بیوی ہر ہفتے خط لکھتی تھی جو اسے حوالے نہیں کئے جاتے تھے بلکہ افسر اعلیٰ کے حکم پر روک لئے جاتے تھے۔ ساتھ ہی محافظ نے میجر کو پنسل اور کاغذ دیا اور کہا "خط لکھ دو— بھیج دیا جائے گا۔" میجر رات بھر بے چین رہا اس لئے کہ وہ اپنی بیوی کو پہلا خط لکھے تو اس میں کیا لکھے—!؟

۳ اگست ۱۹۶۲ء — میجر لارنس کو ہانگ کانگ پہنچا دیا گیا جہاں تین امریکن قیدی اور ملے۔ اور وہاں سے میجر اور اس کے ساتھیوں کو امریکہ روانہ کر دیا گیا۔

میجر لارنس جب گھر پہنچا تو کمزور، ناتواں، مریض تھا۔ خاموش خاموش سا اور نابینا سا۔ لیکن یہ حالت عارضی تھی اور عارضی رہی اس لئے کہ— اسپتال سے نکلنے کے بعد وہ پھر کل کی طرح تندرست، توانا اور طاقتور تھا—

طویل رخصت اپنے گھر پر گزار کر جب میجر لارنس اپنی ڈیوٹی پر پہنچا تو ان جملہ طاقتوں اور صلاحیتوں کو سمیٹ کر جن کی آزمائش اس نے گوریلاؤں کا نہتے ہو کر مقابلہ کیا تھا۔

اشتہار

شاعر اور نثر نگار

دونوں تخلیقی جوہر رکھتے ہیں لیکن ان کی افتاد طبع مختلف ہوتی ہے۔
شاعر میں تخیل اور جذبے کا عنصر زیادہ ہوتا ہے وہ تخلیقی اور ترکیبی ذہن رکھتا ہے۔
نثر نگار میں عقل و استدلال کا عنصر نسبتاً حاوی ہوتا ہے اور اس کا ذہن تعمیری اور تجزیاتی ہوتا ہے۔
(خلیل الرحمٰن اعظمی)

خواجہ جمیل احمد

دنیا کا عظیم فاتح صاحبقراں امیر تیمور شیراز میں جلوہ افروز تھا۔ اس مردم خیز شہر کے عمائدین اور دانشور اس کے حضور میں پیش کئے جا رہے تھے۔ لیکن ان میں بلبل شیراز حافظ شیرازی کا جو اس وقت باحیات تھے کہیں پتہ نہ تھا۔ تیمور ان سے ملنے کا خاص طور سے خواہاں تھا۔ اس نے حکم دیا کہ حافظ شیرازی کو بہت ادب و احترام کے ساتھ اس کے حضور میں پیش کیا جائے۔

حافظ کی تلاش میں عمائدین شہر دوڑ پڑے وہ اپنے مکان کے ایک گوشہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر شعر و شاعری کے عالم میں کھوئے ہوئے تھے۔ عمائدین سلطنت انہیں بڑے احترام کے ساتھ لے آئے اور تیمور کے حضور میں پیش کیا۔

حافظ کی خستہ حالی ان کے بوسیدہ لباس سے عیاں تھی۔ تیمور نے پرسش احوال کے بعد بلبل شیراز سے سوال کیا۔ کیا آپ ہی کا یہ شعر ہے۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

"جی ہاں۔ یہ میرا ہی شعر ہے۔" حافظ نے جواب دیا۔

"کیا آپ کو نہیں معلوم ہے۔" تیمور نے سنجیدگی سے کہا۔ "کہ میں نے سمرقند کی تعمیر پر کتنی کثیر دولت اور کتنا زیادہ وقت صرف کیا ہے اور آپ اسے اپنے معشوق کے ایک تل کے عوض بخش دینے کو تیار ہیں۔"

الشجاع

"جی ہاں! اسی اسراف بیجا کی وجہ سے تو میرا یہ حال ہو گیا ہے۔" حافظ نے فی الفور جواب دیا۔

صاحبقراں تیمور حافظ شیرازی کے اس جواب سے بہت محظوظ ہوا اور اس نے بہت انعام واکرام دے کر حافظ کو رخصت کیا۔

> تیمور کو سمرقند سے ایسا ہی پیار تھا جیسا ایک عاشق کو اپنے محبوب سے ہوتا ہے۔ دس سال کے قلیل عرصہ میں تیمور نے سمرقند کو دلہن کی طرح سنوارا اور اسے عظیم الشان عمارتوں، کشادہ سڑکوں، بارونق بازاروں اور سرسبز باغوں کا شہر بنا دیا۔

پہاڑوں اور سرسبز وادیوں میں گھرا ہوا سمرقند وسطی ایشیا کا ایک قدیم شہر ہے جس کی شہرت کو صاحبقراں تیمور نے جو دنیا کا عظیم ترین فاتح تسلیم کیا جاتا ہے اپنی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اور دیکھتے دیکھتے یہ شہر چودھویں صدی عیسوی میں دنیا کا اہم ترین سیاسی، تجارتی اور علمی مرکز بن گیا۔ جسے صاحبقراں تیمور نے خوبصورت عمارتوں، شاداب باغوں، کشادہ سڑکوں اور بارونق بازاروں سے مزین کیا۔ دنیا کے دور دراز حصوں سے علوم وفنون کے ذخائر کو حاصل کر کے یہاں جمع کیا۔ ایشیا کے گوشے گوشے سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین اور دستکاروں کو سمرقند میں اکٹھا کیا جنہوں نے سمرقند کو چودھویں صدی عیسوی میں علوم وفنون کا اہم ترین مرکز بنا دیا۔ سمرقند کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ سکندر اعظم نے اسے فتح کر کے یہاں جشن منایا تھا۔ کلائیٹس کو اس نے یہیں قتل کیا۔ تیمور کی آمد سے قبل مشہور فاتح چنگیز خان نے یہاں اپنی افواج کا ہیڈ کوارٹر بنایا تھا۔ اور یہیں سے وہ ایشیا اور یورپ کے ممالک پر حملہ آور ہوتا اور انہیں

تاخت و تاراج کرتا تھا۔ اسی قتل و غارت کی بناء پر چنگیز خان کو تاریخ میں "عذاب الٰہی" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی یہاں آیا تھا۔ اس کے قول کے مطابق سمرقند کا دنیا کے خوبصورت اور عظیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہ دریائے پوتر کے کنارے آباد تھا۔ جس کے کنارے دور دور تک پن چکیاں اور نہریں واقع تھیں۔ یہ نہریں سمرقند کے باغوں کو سیراب کرتی تھیں۔ روزانہ شام کو شہر کے باشندے دریا کے کنارے بڑی تعداد میں جمع ہوتے اور تفریح کرتے تھے۔ یہاں کے مکانوں میں مچھلیوں اور بیٹھکوں کا عام رواج تھا اور پھل کی دوکانوں کی کثرت تھی۔ شہر میں عظیم الشان محلات اور یادگار عمارتیں واقع تھیں جو یہاں کے باشندوں کی عالی ہمتی کا پتہ دیتی تھیں۔ شہر کا بڑا حصہ تباہ ہو چکا اور کچھ کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا تھا اور شہر میں فصیل اور دروازے نہیں تھے۔ اور شہر کے باہر کوئی باغات نہیں پائے جاتے تھے۔"

عباسیوں کے عہد خلافت میں سمرقند کا کاغذ ساری دنیا میں مشہور تھا۔ سمرقند اور بخارا کے درمیان کی وادی کو جو اپنی سرسبزی اور شادابی کے لئے مشہور تھی، "چوتھی ارضی جنت" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس وادی میں پیدا ہونے والے تربوز اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ نامور عباسی خلیفہ مامون کو یہ تربوز بے حد پسند تھے۔ یہ قلعی کے ڈبوں میں برف کی تہوں میں جما کر اسے بغداد روانہ کیا جاتا تھا۔ بغداد میں ایک ایک تربوز سات سات سو درہم میں فروخت ہوتا تھا۔

سلجوقیوں اور خوارزم شاہ کے عہد حکومت میں بخارا اور سمرقند علوم و فنون کے اہم مراکز تھے۔ اور بہت بارونق اور مشہور شہر تھے۔ لیکن اس کے بعد منگولوں اور تاتاریوں کا سیلاب آیا۔ جس نے سمرقند اور بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور انہیں مٹی کا ڈھیر بنا دیا۔ سمرقند کو نذرِ آتش کر دیا گیا اور بخارا کے تیس ہزار باشندوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔

بعد ازاں جب صاحبقراں تیمور نے سمرقند کو اپنا پایہ تخت بنایا تو اس شہر کی قسمت پھر جاگ اٹھی۔ اور اس کی عظمت کو چار چاند لگ گئے۔ جلد ہی یہ شہر دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار کیا جانے لگا۔ خوبصورت عمارتوں، کشادہ سڑکوں، بارونق بازاروں، شاندار محلوں، باغوں، کالجوں کے ساتھ ساتھ سمرقند علوم و فنون کا اہم مرکز بن گیا۔

بغداد کے سلطان احمد سے نپٹنے کے بعد صاحبقراں تیمور کے دس سال قدرے سکون سے گزرے اور جنگ و جدال سے اسے قدرے فراغت رہی۔ یہ عرصہ اس نے سمرقند کی تعمیر پر صرف کیا۔ اور اس قلیل مدت میں اس نے سمرقند کو ایشیا کا روم بنا دیا۔

مفتوحہ علاقوں سے وہ سائنسدانوں، فلسفیوں اور مفکروں کو اپنے ہمراہ لاتا اور سمرقند میں انہیں آباد کرتا۔ انہیں بڑے بڑے کتب خانے فراہم کرتا اور عظیم الشان مدارس میں انہیں ملازم رکھتا، فنکاروں اور معماروں سے تجارت، صنعت اور تعمیر کو فروغ دینے کا کام لیتا۔ اس نے عجیب عجیب چڑیوں اور جانوروں کا ایک چڑیا گھر سمرقند میں تعمیر کیا اور نجومیوں اور ہیئت دانوں کے لئے ایک عظیم الشان رصد گاہ بنایا تھا۔

الف لیلیٰ کے خوابوں کے شہر بغداد کی طرح صاحبقراں تیمور نے سمرقند کو اپنے خوابوں کا شہر بنایا۔ جہاں کہیں بھی وہ جاتا۔ جس ملک کو وہ فتح کرتا ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا کہ وہاں کی کونسی چیز سمرقند کی عظمت اور خوبصورتی کو دوبالا کرنے کا کام دے سکتی ہے۔ ان مفتوحہ ممالک سے علوم و فنون کے ذخائر حاصل کر کے وہ سمرقند کو مزین کرتا تھا۔ تبریز سے سفید سنگ مرمر، ہرات سے چمکدار ٹائل (Tiles)، بغداد سے نقرئی مینا کاری کے کام۔ اور ختن سے شفاف پتھر لا کر سمرقند کی عمارتوں کو مزین کیا گیا۔ تیمور کو سمرقند سے ایسا ہی پیار تھا جیسا ایک عاشق کو اپنے محبوب سے ہوتا ہے۔ دس سال کے قلیل عرصہ میں تیمور نے سمرقند کو دلہن کی طرح سنوارا اور اسے عظیم الشان عمارتوں، کشادہ سڑکوں، بارونق بازاروں اور سرسبز باغوں کا ایک عظیم الشان شہر بنا دیا۔

سمرقند سے ایک میل قبل ہی جب مسافر شہر کی نواحی آبادیوں میں داخل ہوتا تھا تو اسے دور فاصلے پر ایک عظیم الشان یونیورسٹی (مدرسے) کی عمارت نظر آتی تھی جس پر جلی حروف میں یہ عبارت کندہ تھی۔ "خدا عظیم ہے اور سدا رہے گا" بعد ازاں مسافر ایک کشادہ سڑک سے جس کے دونوں جانب شاہ بلوط کے قد آور درخت ایستادہ تھے

میں داخل ہوتا تھا اور متعدد نہروں اور پلوں کو پار کرتا باغوں کے پاس سے گزرتا شاندار عمارتوں کو دیکھتا بارونق بازاروں میں داخل ہوتا تھا۔

شاہی محل کی سہ منزلہ عمارت کا خاکہ دنیا کے مشہور معماروں نے تیار کیا تھا اور اس کی تعمیر میں ہندوستان اور بغداد کے شہرہ آفاق معماروں نے حصہ لیا تھا چینی اور ایرانی مصوروں نے اسے مصوری کے شاہکاروں سے آراستہ کیا تھا۔ اس سے ہی ملحق ایک دوسری عمارت تھی جن میں ڈرامے اسٹیج کئے جاتے تھے اور تہواروں کے موقع پر اس میں جشن منعقد کئے جاتے تھے۔

خزانہ کی عمارت اور چڑیا خانہ سے ملحق سفید سنگ مرمر کی ایک خوبصورت عمارت تھی جس میں تیمور اکثر شب باشی کرتا تھا اس عمارت کے صحن میں ایک عظیم الشان درخت ایستادہ تھا جس کا تنا سونے کا اور شاخیں چاندی کی تھیں اور اس کے پھل مختلف جواہرات سے تراشے گئے تھے۔ ان درختوں پر رنگ برنگ کی مصنوعی چڑیاں اس طرح پر پھیلائے ہوئے نظر آتی تھیں جیسے وہ اڑنا چاہتی ہوں۔ نقل پر اصل کا دھوکہ ہوتا تھا۔ خزانہ کی عمارت میں ایک محل کا نمونہ رکھا تھا جس کے چار میناروں میں زمرد جڑے ہوئے تھے۔

تیمور نے ایک سفری مسجد بنوائی تھی جسے وہ اپنے ساتھ سفر میں لیجایا کرتا تھا۔ لکڑی اور رنگین شیشوں کی بنی ہوئی یہ مسجد توڑ کر بڑی بڑی گاڑیوں میں لاد دی جاتی تھی۔ بی بی خانم کی عمارتیں ایک چھوٹی پہاڑی پر واقع تھیں۔ ان میں ایک مسجد اور عظیم الشان مدرسہ بھی شامل تھا۔ مسجد روم کے مشہور گرجے سینٹ پیٹرز کے برابر تھی۔ اور اس کے چاروں مینارے دو سو فیٹ بلند تھے۔

تیمور نے سمرقند کو اپنے نظریے کے مطابق تعمیر کیا تھا۔ اس نے ایرانی فن تعمیر کی اندھی نقالی نہیں کی تھی۔ وہ اپنے مفتوحہ علاقوں کی خوبصورت عمارتوں کو دیکھتا وہاں سے معماروں کو اپنے ساتھ لاتا۔ لیکن سمرقند میں اس نے ایک نئے فن تعمیر کا مظاہرہ کیا جو تاتاری فن تعمیر کے نام سے موسوم ہوا۔ سمرقند میں اس کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ سنگی عمارتوں میں عظمت پائی جاتی ہے اور ان میں پھول پتیوں اور بیل بوٹوں کی تعمیر پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

ہندوستان کی فتح کے بعد تیمور نے اس کی یادگار میں ایک شاہی مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس مسجد کے لئے پتھر جمع کرنے کے لئے پانچ سنگ تراشوں کو مختلف پہاڑوں پر بھیجا گیا اور سو رتھوں ہاتھیوں کے ذریعہ انہیں سمرقند تک پہنچایا گیا۔ اس مسجد میں ۴۸۰ ستون تیار کئے گئے پیتل کے دروازے بنائے گئے اور منبر پر سونے اور چاندی کا استعمال کیا گیا تین ماہ کے قلیل عرصہ میں مسجد تعمیر ہو گئی۔ مسجد کے مینارے سے اذان کی آواز بلند ہوئی اور اس میں شہنشاہ تیمور کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

ایک بار سمرقند کے بازار سے گزرتے ہوئے تیمور کو خیال آیا کہ شہر کا بازار اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے بہت چھوٹا ہے اور اس کی سڑکیں بہت تنگ ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ بیس دن کے اندر سڑکوں کو کشادہ کیا جائے اور اس کے دونوں جانب نیا بازار تعمیر کیا جائے۔ اس کام کی نگرانی پر اس نے اپنے دو امراء کو مقرر کیا اور انہیں تنبیہ کی کہ اگر بیس دن کے اندر اندر کام ختم نہ ہوا تو ان کا کام تمام کر دیا جائے گا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ رات دن کام ہوتا رہا اور مقررہ وقت سے قبل ہی سڑک اور بازار تیار ہو گئے۔ اور دوکاندار دکانوں میں آباد ہو گئے۔ بیسویں دن جب شہنشاہ تیمور بازار سے گزرا تو اسے پسند کیا اور اپنے امراء کو انعام دیا۔

منگولوں اور تاتاریوں کے حملے سے قبل بھی سمرقند علوم و فنون کا اہم گہوارہ تھا۔ شہرہ آفاق محدث امام بخاری نے جو ۱۹۴ھ میں بخارا میں پیدا ہوئے ۲۵۶ھ میں سمرقند میں انتقال فرمایا اس زمانہ میں بھی یہ شہر علم ہیئت کا اہم مرکز تھا۔

عہد تیموری میں سمرقند میں علوم و فنون کو بڑی ترقی ہوئی اور دنیائے اسلام میں یہ علوم و فنون کا اہم مرکز تسلیم کیا جانے لگا۔ تاریخی یادگاریں مثلاً "حضرت شاہ زندہ" اور "ریگستان" اس عہد کی یادگاریں ہیں۔

نئے لکھنے والوں

سے درخواست ہے کہ مضامین صاف خوشخط اور ایک طرف لکھیں تاکہ پڑھنے میں دشواری نہ ہو۔

(ادارہ)

شہلا ع

ڈاکٹر ابو محمد سحر

فضا اور معیار

اہل علم اور اہل ادب کو عموماً علم و ادب کے رموز و نکات ہی سے سروکار رہتا ہے لیکن کبھی کبھی اہل علم اور اہل ادب کے رویّے پر بھی غور کرنا پڑتا ہے اردو ادب کی تاریخ میں اس کی ضرورت بارہا پڑ چکی ہے مصحفی کا ایک شعر ہے ؎

ان لوگوں کی محفل میں یہ شور نہیں دیکھا
بزم شعرا ہے یا مرغوں کی پالی ہے

تو صورتِ حال خاصی تشویشناک ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم و ادب کی ترقی میں فضا اور معیاروں کو خواہ معیار پیمانے ہوں یا نئے بڑی اہمیت ہے۔ ان کی خرابی نہ روایت کے لئے اچھی ہے اور نہ بغاوت کے۔ غیر علمی اور غیر ادبی مقاصد اور معیاروں کے ابھرنے کا معاملہ علم و ادب کے بجائے اہلِ علم اور اہل ادب کے ذاتی کردار سے وابستہ ہے۔ اور ذاتی کردار کا تعلق پورے اردو سماج سے ہے۔

- جو ادیب تنقید کے شاکی ہیں، وہ ذرا گہرائی سے سوچیں تو انہیں ناقدین کی دریوزہ گری سے نجات مل سکتی ہے، اور وہ ادب کی تخلیق پر زیادہ توجہ صرف کر سکتے ہیں۔
- صحیح شاعری نقاد کی انگلی پکڑ کر نہ کبھی چلی ہے اور نہ آئندہ چلے گی۔ اگر نقاد شاعر کا ہم سفر ہو تو سفر خوشگوار اور منزل آسان ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ خوشی کا سودا ہے جبر و تشدد کا نہیں!

اسمٰعیل میرٹھی نے بھی کہا ہے ؎

مشاعرہ ہو تو لڑتے ہیں جیسے ٹینی مرغ
لہولہان ہیں پنجے شکستہ ہے منقار

ادھر کچھ عرصے سے بعض رسائل میں مرغوں کی پالیاں یا ٹینی مرغوں کی لڑائیاں بڑے زور و شور سے ہو رہی ہیں۔ زبان و ادب کے متعلق یہ معرکے ایڈیٹر کی خوش مذاقی "ڈاک" اور "حاجی بلغ" قسم کی تحریروں کی اشاعت سے کہیں بہتر ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ان کی تعمیر میں بھی خرابی کی ایک نہیں کئی صورتیں مضمر ہیں۔

علم و ادب کی دنیا میں بحث و مباحثہ بجائے خود نقصان دہ نہیں ہے۔ لیکن اگر علم و ادب کے نام پر غیر علمی اور غیر ادبی مقاصد کو سر اٹھانے کا موقع مل جائے اور ان سے کسی بالواسطہ فائدے کی بھی امید نہ ہو

سماج کے چھوٹے سے چھوٹے حلقے سے لے کر بڑے سے بڑے قومی ادارے تک آج ذاتی نمود و نمائش، جوڑ توڑ، الزام تراشی، جھلاہٹ، احتجاج اور بیزاری ہی کا رنگ شاید سب سے زیادہ غالب ہے۔ اس عہد کا ایک اور کرشمہ دماغ کی زرخیزی ہے۔ اہم مسائل پر ذہنی طلبیا بازی اور خود ساختہ خیالات کی اتنی فصلیں اس وقت تک کٹ چکی ہیں کہ اس فصل کے پیداوار سے زیادہ فائدہ ہو سکتا تھا ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں نے اکثر بنے بنائے کام بھی بگاڑ دیے ہیں اور یہ حال ہوا ہے کہ۔

ہے انتہائے شوق بھی اک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی کام کی بات نہیں ہوتی لیکن ماحول اتنا بگڑا ہوا ہے کہ اگر کوئی کام کی بات نہ ہو سکے تو تعجب

سمجھنا چاہئے۔ اردو دنیا میں عہدہ و مفاد، انعام و اکرام اور شہرت و ناموری کے مواقع زیادہ نہیں ہیں۔ لیکن جو کچھ ہیں انھیں کے لئے ایک ہلچل مچی ہوتی ہے۔ کام کی باتیں اس میں بھی مفقود نہیں ہیں۔ لیکن سطحی طرز عمل اور بے نتیجہ افراط فکر کا دباؤ بڑی طرح پڑ رہا ہے۔

اردو کے کچھ لوگ اردو دنیا سے بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں اردو زبان، ادب، تنقید، تحقیق اور تعلیم کسی میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ ان کا حلقہ اوسط درجہ کے ادیبوں سے لے کر اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں تک پھیلا ہوا ہے۔ زبان و ادب کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اظہار رائے میں انہیں تامل ہو۔ کبھی رسائل کے اداریوں میں کبھی مستقل مضامین کی صورت میں اور زیادہ تر اخبارات و رسائل کے باب المراسلہ میں انہیں ہر طرح کے اظہار خیال کا موقع مل رہا ہے۔ ان میں سے کچھ معصوم و نیک نیت ہیں ان کے ذہن میں جو بات آتی ہے لکھ ڈالتے ہیں۔ لیکن کچھ ذاتی پندار و نمائش، مستی شہرت، رشک و حسد اور طرح طرح کے دوسرے احساسات میں گرفتار ہیں۔ ان کے مقاصد کچھ اور ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ ان کا لب و لہجہ زیادہ تلخ اور شدت آمیز ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اہم مسائل پر متفرق تحریروں میں باہمی عیب جوئی، خردہ گیری، طنز و تعریض، تمسخر و استہزا کا لطف چھانٹے، جملے بازی، احتجاج اور جھلاہٹ کے حربوں سے دوسروں کی پگڑی اچھال دیں اور دنیا پر ثابت کر دیں کہ وہ بھی کوئی چیز ہیں۔

اس پس منظر میں بعض تحریروں پر ایک نگاہ بازگشت ڈالتا ہوں تو مجھے فضا خاصی مسموم دکھائی دیتی ہے کیونکہ ان میں اردو زبان و ادب کی نامناسب عیب جوئی کے علاوہ اردو کے ادیبوں، نقادوں، استادوں اور شیدائیوں پر نا روا حملے کئے گئے ہیں۔ اردو والوں کے لئے "تارک اندازان اردو" کا لقب تراشا گیا ہے۔ اساتذہ کو جہالت کا تمغہ دیا گیا ہے۔ یونیورسٹیوں میں اردو کے تحقیقی کارناموں کو جو بڑھاوا مل رہا ہے ان کو اردو کشی کا ذریعہ قرار دینے کے لئے دور کی کوڑی لائی گئی ہے۔ جن لوگوں کی سرکردگی میں تحقیقی کام ہو رہا ہے ان کا شکوہ کیا گیا ہے کہ وہ الیمات کی سانس کیوں لے رہے ہیں اور ان کے ستروں کے اوپر مضبوط الشیاع

چھتیں کیوں تعمیر کی گئی ہیں۔ مکتبی اور نصابی باتوں سے نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ جدیدیت کے زعم میں ادیبوں کے ریٹائرمنٹ یہاں تک کہ مرسی کلنگ کی بات کی گئی ہے۔ نقد و تبصرہ کے نام پر کسی ذاتی مخاصمت کی وجہ سے قابل قدر کارناموں کو رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان باتوں کے پیچھے کوئی ٹھوس طرز فکر یا پیغام عمل نہیں ہے۔ لعنت و ملامت، شکوہ و شکایت اور اشتعال انگیزی کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ یا طول طویل واسوخت نگاری جس کی حدیں جا بجا زور زبردستی سے جا ملی ہیں۔ فکر کی خامہ کاری کا محور اگر خود پرستی اور ذاتی نمود و نمائش ہو تو انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جو اردو دنیا کے سامنے ہے۔

تصویر کا صرف تاریک رخ نمایاں کرنے والوں میں کچھ ذمہ دار اور مخلص حضرات بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی نکتہ چینی میں ذاتی نمود و نمائش کا پہلو نہیں ہے۔ لیکن ماحول خراب ہو تو ایسے اصحاب بھی چوک جاتے ہیں۔ اور ان کے ذہن پر بھی سطحی اور سرسری خیالات کی پرچھائیں پڑ جاتی ہے۔ ان کی نظر بھی صرف خامیوں پر پڑتی ہے۔ مسائل کے تمام پہلوؤں کو وہ بھی نہیں دیکھتے۔ تھوڑے سے فرق کے باوجود ان کے معیار اور اصول بھی خود ساختہ ہیں۔ انہوں نے جس نہج سے خود کوئی علمی و ادبی کام کیا ہے یا کر رہے ہیں وہی ان کی کسوٹی ہے۔ اور اسی پر ساری اردو دنیا کو کسنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کا تعلق پرانی نسل سے ہے تو نئی نسل کی محنت و کاوش میں انہیں کوئی کشش نہیں دکھائی دیتی۔ ان کے نزدیک علم و ادب کا معیار جو پہلے تھا اب نہیں رہا۔ قطع نظر اس کے کہ ہر زمانے میں پرانی نسل کے لوگ عموماً اپنے آپ کو زیادہ باصلاحیت، باشعور، ذی علم، یہاں تک کہ مہذب سمجھتے رہے ہیں۔

اس وقت میرا مقصد اردو زبان و ادب کے حقیقی مسائل سے بحث کرنا نہیں ہے بلکہ میں صرف اس مسئلہ پر گفتگو کر رہا ہوں جو ان مسائل پر غیر سنجیدہ بحث و مباحثہ یا غیر محتاط اظہار رائے سے پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے جو نمونے میں نے پیش کئے ہیں ان کے بھرپور تجزیے کے لئے بھی ایک دفتر درکار ہے۔ غالباً نئی شاعری کی بحث کا تھوڑا سا تجزیہ متوازن نقطۂ نظر کے فروغ کے لئے مفید ہوگا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں بڑی اہم سیاسی و سماجی

تبدیلیوں کی وجہ سے اردو شاعری کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب آیا تھا اور جدید شاعری کی ابتدا ہوئی تھی۔ حالی اور ان کے ہمعصروں کے بعد چکبست، اقبال اور جوش کی شاعری اور پھر ترقی پسند تحریک میں اس انقلاب نے ارتقائی منزلیں طے کیں۔ درمیان میں رومانی تحریک بھی ابھری۔ ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے رجحانات بھی نمودار ہوئے جن کو ترقی پسندی سے الگ سمجھنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ طرز فکر (فکر نہیں) اور ہیئت دونوں میں یہ رجحانات جن کی نمائندگی ن۔م۔ راشد اور میراجی وغیرہ کی شاعری کرتی ہے، "ترقی پسندی" سے زیادہ ترقی پسند تھے۔ یہی وہ دوراہہ تھا جہاں سے آزادی کے بعد اردو شاعری کو آگے بڑھنا تھا۔ پچھلے دس پندرہ سال میں اگر وہ کچھ آگے بڑھی ہے یا آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے تو اس میں قصہ قدیم و جدید کو دہرانے کی ضرورت کہاں سے پڑ گئی۔

حالی اور ان کے ہمعصروں کے زمانے میں قدیم و جدید کی کشمکش بڑی بنیادی اور انقلاب آفریں تھی۔ اس میں میدان جدید کے ہاتھ رہا اور تھوڑے ہی عرصہ میں قدیم نے جدید کے لئے جگہ چھوڑ دی۔ قدیم اگر کسی شکل میں باقی رہا یا آج تک باقی ہے تو اس سے الجھنا بے سود ہے کیونکہ جدید کے راستے میں نہ وہ کوئی رکاوٹ ہے نہ خطرہ۔ جدید کے ساتھ افادیت اور مقصدیت کی ایک خاص شکل کا امتزاج حالی کے زمانہ کا ایک لازمی تقاضہ تھا۔ بنیادی چیز شاعری کے فطری محرکات کا شعوری ادراک اور رسمی و روایتی شاعری کے خلاف بغاوت تھی۔ اس کے خلاف بغاوت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ ہم قدیم کی طرف لوٹ جائیں۔ جدید کے فطری ارتقاء یا اس کے کسی رنگ کو ترک کرنے کی خواہش کا سوال کوئی بنیادی سوال نہیں ہے۔ بنیادی سوال تقریباً ایک صدی پہلے ہی حل ہو چکا ہے۔ جو لوگ نئے موضوعات، نئے نقطہ نظر، نئے اسالیب اور آزاد نظم وغیرہ کے مخالف ہیں، انہوں نے گویا ابھی تک جدید ہی کو قبول نہیں کیا ہے۔ ان کے خیالات خارج از بحث ہونا چاہئیں۔ ان کے علاوہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو شاعری "ترقی پسندی" کے مرکز پر ہمیشہ کے لئے ٹھہری رہے گی۔ وہ بھی صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ ترقی پسندی ہی کی منزل تک کیوں کر پہنچ پاتی۔

ان لوگوں کی طرح جو نئی شاعری کے محض اس لئے مخالف ہیں کہ وہ نئی ہے۔ وہ لوگ بھی زیادہ قابل تحسین نہیں ہیں جو صرف نئی ہونے کی وجہ سے اس کی حمایت کرتے ہیں۔ اس سے قطع نظر کرکے اس کی حمایت میں کسی شدّت پسندی کا بھی کوئی معقول سبب نہیں ہے۔ نئی شاعری کا طرز فکر اور انداز بیان کوئی نئی بغاوت نہیں ہے کہ اس پر حد سے زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا جائے۔ جدید کے بنیادی تصور سے ہم آہنگی کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی شاعری کے بعض رجحانات کے زیر اثر یہ عناصر ترقی پسندی کے دوش بدوش ہی پیدا ہوئے تھے اور اس وقت سے برابر فروغ پا رہے ہیں۔ پاکستان کے اردو شعراء میں اس کی ترقی کی رفتار زیادہ تیز رہی ہے۔ موضوعات کا تھوڑا بہت اضافہ زمانے کے فرق کا نتیجہ ہے۔ نئی شاعری کی انحطاطی خصوصیات کی حمایت اور ان لوگوں سے برہمی جو ان کی گرفت کرتے ہیں اور بھی غلط ہے۔ کیونکہ نئی شاعری کی انحطاطی خصوصیات زیادہ تر تقلیدی ہیں۔ ان سے بچنے کی ضرورت ہے نہ کہ ان پر اڑنے کی۔

سچ پوچھئے تو نئی شاعری کی پرخروش علمبرداری کچھ نئے شعراء خود ہی کر رہے ہیں۔ اور وہ بھی اپنی شاعری کے ذریعہ سے نہیں بلکہ نہایت غلط اندیش قسم کے تنقیدی خیالات اور جارحانہ نثر سے۔ تمام نئے شعراء بھی غالباً اس رویہ سے متفق نہیں ہیں۔ بہتوں کو اگر اس پر تشویش ہو تو تعجب نہیں۔ کیونکہ نئی شاعری کی حد سے زیادہ مخالفت اس وقت اسی کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ اظہار خیال میں بے محل انتہا پسندی اور طنز و تعریض کی یہی روش رہی تو چاہے نئی شاعری کا مستقبل تاریک نہ ہو لیکن اس کے اعتراف میں وقت ضرور لگ جائے گا۔ فضا ایک شخص بگاڑتا ہے لیکن اس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑتا ہے۔

ادب میں مستقل حیثیت حاصل کرنے کے مطالبات کو خودستائی اور جلد بازی کی زبان کاہ پر بھینٹ چڑھانا دانشمندی نہیں ہے — برنارڈ شاہ اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی صلاحیتوں کو نظر انداز کرکے ان کی ادبی تعلیوں، بالاخوانیوں اور ٹیڑھی ترچھی چالوں سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔ ادب میں مقام بنانے کی کنجی "محسن" ادبا اور نقاد کے ہاتھوں میں نہیں ہوتی بلکہ خود ادیب کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اگر نہیں ہے تو تاریخ ادب اور تنقید میں رونق افروز ہونے سے بھی ادب میں

مقام نہیں بنتا۔ محفل ادب میں ان کا داخلہ یا تو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا یا "آگے بیٹھے کبھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے" کی نوبت آتی ہے۔ جدید ادب تنقید کے شاکی ہیں وہ ذرا گہرائی سے سوچیں تو نہیں ناقدین کی دریوزہ گری سے نجات مل سکتی ہے۔ اور وہ ادب کی تخلیق پر زیادہ قوت صرف کر سکتے ہیں۔

نقاد اگر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تخلیقی قوتوں پر کوئی پابندی لگا سکتے ہیں تو یہ ان کی بھول ہے۔ حالی نے جدید شاعری کے آغاز کے تقریباً پچیس برس کے بعد مقدمہ لکھا تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو صرف ان کے مقرر کئے ہوئے خطوط پر جدید شاعری کا ارتقا نہیں ہوا۔ خود انہوں نے غزل میں قومی اور اخلاقی مضامین ضرور نظم کئے لیکن باپ بیٹے اور آقا و غلام وغیرہ کی محبت کے بیان میں کوئی غزل نہیں کہی۔ روایت کے حدود میں غزل کے احیاء کا انہیں کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ نہ انہیں اس کی خبر تھی کہ قومی اصلاح کے فریضہ سے الگ رہ کر بھی اچھی شاعری ہو سکتی ہے۔ صحیح شاعری نقاد کی انگلی پکڑ کر نہ کبھی چلی ہے اور نہ آئندہ چلے گی۔ نقاد شاعر کا ہمسفر ہو تو سفر خوشگوار اور منزل آسان ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ خوشی کا سودا ہے' جبر و تشدد کا نہیں۔

غرض یہ کہ اردو زبان و ادب تنقید و تحقیق اور درس و تدریس کی اصلاح و ترقی کے مسائل اس وقت بہت سنگین ہیں۔ ان پر سرسری ریزہ خیالی اور رہنما سنجی کی مشق کے بجائے سنجیدہ غور و فکر اور جامع اظہار خیال کی ضرورت ہے۔ خامیوں کے ساتھ ساتھ خوبیوں پر بھی نظر رکھنا چاہئے کیونکہ ان کے عملی نمونے موجود ہیں۔ جلد بازی اور سراسیمگی میں اگر خوبیاں اصلاح کی زد میں آگئیں تو بہت سی اچھی باتوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اور معلوم نہیں اصلاح کے بعد ہمیں کونسے زمین و آسمان ملیں گے۔ موجودہ دور اردو دنیا سے زیادہ گہرے اور زیادہ صالح معیار کا تقاضہ کر رہا ہے۔ اس کی صدا پر لبیک کہنے کے لئے خود نمائی سطحی طرز فکر، ستی شہرت اور مفادات کے قلعوں پر شب خون مارنے کی فرصت ہے نہ کہ ان قلعوں میں بیٹھ کر علم و ادب پرواز کرنے کی۔ یوں تو اس کی ذمہ داری کچھ نہ کچھ ہر شخص پر عائد ہوتی ہے لیکن اہل علم کو اس کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ ان کے نورانی دماغ سے جو شعاعیں پھوٹیں وہ برق خرمن کا ہیولیٰ نہ ثابت ہوں۔

دو نظمیں

حاصل

موجوں کے بے رحم کچوکے سہتا
میں ساگر کی تہ تک پہنچا
پانی کے اندھے صحرا میں
ساتھ ہی یہ آنکھیں دیتیں بھی کیا
ہاتھوں ہی کو آنکھ بنایا
پونجی اک چھوٹی سی میٹی

اور مٹھیاں بھینچے
تھرّاتے انفاس سنبھالے
اوپر آیا،
خوشی خوشی مٹھیوں کو کھولا
جن میں تھوڑے سے کنکر تھے
دو اک خالی سیپ

انتظار

لڑکھڑاتا زرد پتہ
رات کے تاریک بن میں
دیکھتا ہے راہ کب سے
راہ ۔ اک رہرو کی
جس کے پاؤں کا گہرا دباؤ
ہانپتے پتے کو پہنچا دے فنا کی گود میں
اور اک مدھم کراہ
اپنا نوحہ خود سنے اور ڈوب جائے

قاضی سلیم

پسِ دیوار

دیکھیں کیا ہے
آؤ پسِ دیوار چلیں
گہرے نیلے گنبد کے اس پار چلیں
چاند ستاروں کی آنکھوں سے پیار کا امرت چھنتا ہے
ذہن میں صدیوں سے اک مشفق باپ کا چہرہ بنتا ہے
انجانی فردوس میں شاید اپنا بھی کچھ حصّہ ہے
خوف و عقیدت کے یہ پردے اور ہٹیں کچھ اور ہٹیں
گھنگھور گھٹائیں اور چھٹیں کچھ اور چھٹیں

اِس دھرتی کے سینے پہ تاریک گڑھوں کے زخم ملے
رینگتے کیڑے سانپ دفینے گند فضائیں بند ہوا
کتنی ہاہاکار مچی
کھوج میں سونے چاندی کی
پاتال تلک پیکار چلی
جو زہر تھا اپنا بانٹ چکے
اپنی اپنی لاشوں سے دھرتی کے گڑھے سب پاٹ چکے
نئے نئے ارمانوں کو ہے خواہش نئے مزاروں کی
یا آج خلا میں کھینچ رہی ہے چاہت چاند ستاروں کی
جو کچھ بھی ہو
آؤ پسِ دیوار چلیں

حزیں لدھیانوی

میرے بعد

ہو گی کم پرورشِ سرو سمن میرے بعد
موجِ خوں کے لئے ترسے گا چمن میرے بعد

میں نے ہر ذرّۂ صحرا کو کیا ہے سیراب
راہ دیکھیں گے مری دشت و دمن میرے بعد

میں نے ہر رہ پہ جلائے ہیں محبت کے چراغ
مجھ کو کیا بھولیں گے یارانِ وطن میرے بعد

دیکھنا پیار کے نغموں کے لئے ترسیں گی
یہ ہوائیں یہ فضائیں یہ چمن میرے بعد

یاد آ جائیں گے مٹی کے خداؤں کے ستم
جب بھی روئے گا کوئی سیم بدن میرے بعد

تیر بن کر مرے دل میں جو ہمیشہ کھٹکی
تم بھی محسوس کرو گے وہ چبھن میرے بعد

جان اِس رنگ سے دیدی سرِ میدانِ ستم
مٹ گئی سلطنتِ دار و رسن میرے بعد

شاذ تمکنت

○

پھر وہی نکہتِ بادِ سحری کیسی ہے
دل دکھا جاتا ہے یہ خوش خبری کیسی ہے

کیا یہ دنیا مرے ہاتھوں سے نکل جائے گی
دست کوتاہ تری بے خبری کیسی ہے

ایک بیاباں کوئی قدموں میں بچھا جاتا ہے
ہم سفر کوئی نہیں ہم سفری کیسی ہے

سوزنِ اشک سے سیتا ہوں گریبانِ نشاط
یہ جنوں کیسا ہے یہ بخیہ گری کیسی ہے

کیا قیامت ہے ترے غم کی نگہ داری بھی
لوگ کیا جانیں مری خود نگری کیسی ہے

آس رہزن کی طرح مرے تعاقب میں ہے شاذ
کیا خبر اس کو یہ بے بال و پری کیسی ہے

محمود خاور

اجنبی

ہم نے خود اپنے دل کا دروازہ
مدتوں بعد کھٹکھٹایا تھا

یہ توقع تھی۔ یہ تمنا تھی
کوئی آئے گا بہرِ استقبال

ہاتھ میں شمعِ آرزو ہوگی
اور اک کیف سا نگاہوں میں

منتظر دیر تک رہے لیکن
دیر تک کوئی روشنی نہ ہوئی

پھر یکایک سکوتِ شب ٹوٹا
اور گونجی تھکی تھکی آواز

کون ہے۔ کوئی اجنبی ہوگا
اب ملاقات ہو نہیں سکتی

خورشید احمد جامی

○

پیاسی نظر کے سامنے جلتے سراب تھے
تم بھی تو انتظار کی راتوں کا خواب تھے

اِس طرح پھانسیوں نے پکارا ہمیں کہ ہم
جیسے کوئی رسول تھے اہلِ کتاب تھے

ہر اجنبی سے اپنا پتہ پوچھتے پھرے
ہم سے جہاں میں اور بھی خانہ خراب تھے

یوں تو نفس نفس میں اندھیروں کا زہر تھا
لیکن نظر نظر میں نئے آفتاب تھے

کل ہم وہاں سے آکے یہی سوچتے رہے
آخر ہر ایک چہرے پہ کتنے نقاب تھے

کرتے دلِ تباہ سے کچھ دیر گفتگو
لیکن ہمارے ساتھ کئی انقلاب تھے

جب تک لہو زمینِ ہنر کو دیا نہ تھا
مہکے ہوئے کہاں یہ قلم کے گلاب تھے

ایک ایک کرکے وقت کی راہوں میں کھو گئے
راتوں کے ہمسفر جو حسیں ماہتاب تھے

دستِ خزاں میں دیکھ کے سوکھی سی پتیاں
جامی خود اپنی یاد کے لمحے عذاب تھے

قمر اقبال

○

اک عجب دھن میں رواں ہیں برق رفتاری سے ہم
کس کو چونکاتے ہیں دیکھیں اپنی فنکاری سے ہم

قرض تنہائی کا جب ہو جائے گا سارا ادا
دوستو! نکلیں گے گھر کی چار دیواری سے ہم

راہ میں جیسے ترے ملنے کا پھر امکان ہو
آج گھر سے اِس طرح نکلے ہیں تیاری سے ہم

پھر زیادہ دن نہ شاید خود کو زندہ رکھ سکیں
آج اکتا جائیں گر خوابوں کی بیماری سے ہم

ہر قدم پر ہاتھ پھیلانا پڑے جس شہر میں
ایک مدت سے وہاں رہتے ہیں خودداری سے ہم

اپنی مجبوری کا یہ تیشہ اٹھا کر اے قمر
ایک دن ٹکرا نہ جائیں کوہِ مختاری سے ہم

عنوان چشتی

○

آگہی کی تنویریں گم ہیں یوں اصولوں میں
خوشبوئیں لپٹ جائیں جس طرح بگولوں میں

رنگِ بے اصولی ہے چھپی اصولوں میں
جھولتی ہے تاریکی روشنی کے جھولوں میں

ذہن میں۔ خیالوں کے یوں بھنور پڑتے ہیں
ناچتے ہیں کچھ پتّے جس طرح بگولوں میں

ہم خزاں نصیبوں کو یہ بہار کیا کم ہے
رنگ و بو کی شہزادی ناچتی ہے پھولوں میں

شوخ شوخ خوابوں کی۔ زرد زرد تعبیریں
حسرتوں کے کانٹے ہیں آرزو کے پھولوں میں

اپنے کفرِ ایماں کا کچھ جواز مل جاتا!
کاش کچھ خدا ہوتے حسن کے رسولوں میں

زندگی نگاہوں سے کیوں نہ ہو نہاں عنواںؔ
کون دیکھ سکتا ہے دور تک بگولوں میں

قیصر قدیر

○

کی جس نے بھی فریاد وہ گردن زدنی ہے
اس انجمن نو میں تو اب چپ ہی بھلی ہے

ہیں ہی تری فرقت میں نہیں نقش بہ دیوار
پائے مہ و انجم میں بھی زنجیر پڑی ہے

دیکھو تو کہیں راہ میں حائل نہیں خم بھی
گزرو تو ہر اک گام پہ دیوار کھڑی ہے

خورشید ڈھلا ہے کہ تری یاد سرِ شام
آغوش کشادہ مرے آنگن میں کھڑی ہے

دل میں سمٹ آئی ہیں گئیں دور کی یادیں
مرجھائے ہوئے پھول پہ جب آنکھ اٹھی ہے

کل رات کئی بار خود اپنی ہی صدا پر
دل نے کہا دروازے کی زنجیر ہلی ہے

مہر ظہیر

تھے دیدۂ ہر شخص میں پتھر کی طرح چپ
مہکے ہیں مگر پھر بھی گلِ تر کی طرح چپ

وہ بُت تو حسیں تر ہے مگر اس کا تغافل
چبھتا ہے جو دل میں کسی نشتر کی طرح چپ

اے ہمنفسو پھر کوئی اک فتنۂ تازہ
کب تک یونہی بیٹھے رہیں پتھر کی طرح چپ

وہ رنگِ سیاست ہے کہ الفاظ سمیٹے
ہونٹوں کو سیے بیٹھے ہیں ہم در کی طرح چپ

وہ درد کی آندھی ہے کہ خونِ دلِ وحشی
پلکوں میں اتر آیا ہے گوہر کی طرح چپ

خواجہ فہیم احمد فہمی

○

دل میں کوئی رہتا ہے
کتنا سُندر دھوکا ہے

مدت سے وہ بچھڑا ہے
زخم ابھی تک تازہ ہے

یاد کسی کی مہکی ہے
درد سا دل میں جاگا ہے

آس کا سُورج ڈوب گیا
ہر سُو اب اندھیارا ہے

تم سے یہ امید نہ تھی
تم نے وہ غم بخشا ہے

انجانا اک چہرہ تھا
آئینہ جب بھی دیکھا ہے

یادوں کی اک بستی ہے
فہمی جس میں رہتا ہے

عفت موہانی

بالآخر کوٹھی نیلام ہوگئی۔

بڑے سے خوبصورت گیٹ پر نئے مالک کا قفل لگ گیا۔ اور ایک آدمی نے جو اس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوٹھی سے دست برداری کے چند کاغذات تھما کر بڑے تاسف اور قلق کی ایک نگاہ اس پر ڈالتا ہوا غلام گردش

کی طرف چلا گیا۔

آسمان پر گہرے بھورے رنگ کے بادل اکٹھا ہو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی مظلوم و ستم رسیدہ کے دکھ پر آسمان کا دل بھی بھر آیا ہو۔ بجلی ایک بار اور چمکی۔ اس نے آنسوؤں میں ڈوبی نگاہیں ایک بار اور اپنی تقدیر کے لکھے پر ڈالیں اور ساتھ ہی ایک طویل نگاہ کوٹھی کے در و دیوار پر۔ جیسے اس کی ایک ایک اینٹ کو آنکھوں ہی سے بوسے دے رہی ہو۔ پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی کمپاؤنڈ سے بھی گزر گئی۔ دور و نزدیک سناٹا تھا۔ آنے والی بارش کے اندیشے سے سڑک جلد ہی خالی ہوگئی تھی۔ اونچی اونچی عمارتوں کے دریچے، کھڑکیاں اور برآمدوں کے شٹر بند تھے۔ کچھ دور مڑ کر اس نے پھر اپنے گھر کو دیکھا اور اس سے ضبط

نہ ہو سکا۔

"الوداع — الوداع ..... میرے بچپن کے مسکن۔ اب کبھی میرے قدم تیرے آنگن میں نہیں پہنچیں گے۔ اب تو کہاں اور میں کہاں۔ امی۔ امی — آہ — آج اپنا گھر دوسروں کا ہو گیا۔"

اس کی آواز سسکیوں میں اونچی ہوگئی۔

"کیا تم مجھے یاد نہ کرو گے۔ روبینہ جس نے تمہاری گود میں جنم لیا — تمہارے آنگن میں گھٹنوں چلنا سیکھا۔ جس کے ایک ایک کمرے میں وہ دوڑتی پھرتی تھی — وہ روبی۔ کہاں ہے۔ کہاں گئی؟"

دفعتہً وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کسی نے اسے یوں پاگلوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے سن لیا تو کیا کہے گا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ فٹ پاتھ تک سنسان تھے۔ ایک سنسنی سی اس کے جسم میں تیر گئی۔ ابھی تک نیلی نیلی برجیاں دکھائی دے رہی تھیں جیسے اینٹ اور پتھر کی زبانیں پکار رہی تھیں۔

"روبینہ واپس آؤ۔ یہ چوکھٹ چھوڑ کر تم کہاں جاؤ گی۔

— مجھے ایسا لگتا ہے کہ ابھی پاپا اپنے کمرے سے نکل آئیں گے۔ کسی طرف سے امی آجائیں گی۔ یہاں میرے پاپا کی خوشبو ہے، میری امی کی مہک ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے کبھی میرے پاپا اور امی کی روحوں کو تو نہیں دیکھا؟

دنیا بہت بڑی جگہ ہے۔ یہاں کتنے اونچے نیچے راستے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں ٹھوکر کھاؤ اور کوئی سہارا دینے والا بھی نہ ملے۔۔۔۔۔

پھر میں کیا کروں ؟

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ پاپا۔ اگر آپ امی پر اتنا ستم نہ ڈھاتے تو یہ سب کچھ کیوں ہوتا۔ امی اسی غم میں چل بسیں۔ مگر کبھی نہ دیکھا کہ ان کے بعد ان کی روبینہ کا کیا ہوگا ؟ وہ تو جانتی تھیں خدا کی اس بھری پُری دنیا میں ان کی بیٹی بالکل اکیلی ہے ــــ سر عرفان کی اکلوتی بیٹی۔ جو پنکھڑیوں کی سیج پر سوتی تھی۔ جس نے کبھی اس صورت حال کا تصور بھی نہیں کیا تھا کبھی یہ وقت بھی آ سکتا ہے۔ نہ ماں باپ رہیں گے نہ گھر بار۔ اسے اپنے ہی مکان سے اس طرح نکلنا پڑے گا جس طرح ارمان اپنے دل سے نکلے۔

گہری دھند میں بجلیاں چھپ چکی تھیں۔ دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ عمارتوں کے پیچھے ہوا خوفناک سیٹیاں بجا رہی تھی۔ وہ سراسیمہ اور ہراساں سی دیکھ رہی تھی۔ کہاں جائے۔ کدھر جائے ؟

"میرے اللہ مجھے بھی میری امی کے پاس پہنچا دے۔"

"آئیے۔ میں پہنچا دوں۔ غالباً آپ راستہ بھول گئی ہیں۔"

اپنے پیچھے ایک نئی آواز سن کر وہ سنبھل گئی۔

سفید لباس اور گہرے کتھئی کارڈیگن میں وہ خاصہ جاذب نظر اور مہذب نظر آ رہا تھا۔ روبینہ نے بڑی شرمندگی سے اپنے آنسو پونچھ لئے اور سر جھکا کر آنچل کلائی پر لپیٹنے لگی۔

"اگر کچھ حرج نہ ہو تو بتا دیجئے۔ آپ کہاں سے آ رہی ہیں۔ کہاں جائیے گا۔ موسم طوفانی ہو رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہیں بارش آ لے"

"کہیں نہیں شکریہ!" وہ یہی بے معنی سی بات بول سکی ــــ نہ جانے کون ہے۔ کہاں لے جائے گا۔ اور اس طرح تو پہلا سابقہ تھا۔ اس کا دل حلق میں دھڑکنے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ راستہ بھول گئی ہیں؟"

"جی۔۔۔۔ جی نہیں ــــ جی ہاں ــــ"

اجنبی مسکرایا ــــ "ابھی ابھی آپ اپنی امی کے پاس جانے کی دعا مانگ رہی تھیں۔ اگر ناگوار نہ ہو تو چلئے۔ میں پہنچائے دیتا ہوں۔"

"امی کہاں ہیں، وہ تو ایسے راستے پر چلی گئیں جہاں کوئی جا نہیں سکتا۔ جہاں سے کوئی آ نہیں سکتا ــــ"

"اوہ ــــ!"

بڑی حیران کن بات تھی۔ کون لڑکی ایسے موسم میں اس طرح ویران شاہراہ پر کھڑی آنسو بہا سکتی ہے۔ ظاہری پوزیشن بھی خاصی شریفانہ لگ رہی تھی ــــ بند آستینوں کا نیچا سا فراک۔ دوپٹے کا آنچل سر پر اور چہرے پر حوروں کا سا تقدس ــــ پاکیزہ اور حیا پرور۔ جیسے ایک بار کے بعد دوسری مرتبہ پلکیں اٹھانے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ گرد و پیش سے بے خبر مسلسل زمین کو تکے جا رہی تھی۔

اور اچانک ہواؤں کے جھکڑ کے ساتھ ہی بارش شروع ہو گئی۔

اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اجنبی کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"میں آپ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ کیا فائدہ کہ ہم دونوں بھیگ جائیں۔ چند قدم پر غریب خانہ ہے۔ تھوڑی سی تکلیف تو ہوگی گھبرائیے نہیں۔ میرے بھی چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ آئیے چلیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کہیں یہ بدنصیبی کا کوئی نیا شاخسانہ تو نہیں ــــ؟

یکایک بارش میں شدت آ گئی اور وہ مجبور ہونے لگی۔ جیسے ہی اس نے آگے قدم بڑھائے، کسی انجانی منزل کے لئے۔ اس نے محسوس کیا۔ اجنبی کے چہرے پر نامعلوم سی مسرت لو دے اٹھی ہے۔

ڈرائنگ روم میں شریلے اور بھاری قہقہے اڑ رہے تھے۔ کیرم کی کھٹا کھٹ میں پیالیوں کا کھنکتا ہوا ملا جلا شور عجیب لگ رہا تھا۔

طویل سنگی زینے اور چکردار برآمدے طے کر کے وہ دروازے کے پاس پھر ٹھٹھک گئی۔

"آئیے۔ بالکل نہ گھبرائیے۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ ابھی میں آپ کو اپنی امی اور اپنی بہن سے ملاؤں گا۔" اجنبی بے حد شفقت سے مسکرایا۔

پھر اس نے بند دروازے پر ہاتھ رکھا اور دونوں پٹ یکبارگی کھلتے چلے گئے۔

کئی آنکھیں ان کی طرف اٹھیں حسین و متحیر آنکھیں۔ اور

دوسرے لمحے وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمرے میں بالکل سنّاٹا چھاگیا ـــــ

"اف ـــ بھائی جان۔ آپ نے بڑی دیر لگا دی آج ـــ" پھر ایک سُریلی آواز سی سُنائی دی۔ دوسرے بھی کچھ کسمسائے۔ ورنہ خدا جانے کب تک پُراسرار سی خاموشی طاری رہتی۔

روبینہ کی نظروں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ دماغ میں ایسا شور گونج رہا تھا کہ بارش کی مہیب گرج بھی کہیں دُور سے پہنچتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں سُنا کہ اس کے ساتھی نے کیا کہا تھا۔

"آئیے۔ بیٹھیے بہن۔" ایک سرد ہاتھ نے اس کا کانپتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا۔ ورنہ میں تعارف بھی کرا دیتا۔" اجنبی ہونے سے پھر ہنس دیا۔

"جی ـــ مجھے ـــ مجھے روبینہ کہتے ہیں ـــ" اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پھر سب کو اپنی طرف دیکھتا پاکر جلدی سے سر جھکا لیا۔ ویسے یہ پُرمحبّت لڑکی اسے بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اسے چائے کی میز تک لے آئی۔ دوسرے بھی اطمینان سے بیٹھ گئے تھے۔ اُن میں ازسرِنو باتیں ہونے لگیں۔ قہقہے بکھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ خود کو سنبھال سکی۔ ایک عجیب سا احساس تھا۔ جیسے بلاارادہ وہ اپنوں ہی میں پہنچ چکی تھی۔ یہ سب چہرے مانوس لگ رہے تھے۔ اور وہ لڑکی جو گلابی لباس میں ملبوس گلاب کی ادھ کھلی کلی لگ رہی تھی۔ وہ تو جنم جنم کی جانی پہچانی معلوم ہو رہی تھی۔

"یہ جن کے ساتھ آپ آئی ہیں ہارون بھائی ہیں۔ ان سے چھوٹے محسن بھیّا۔ یہ مشہدی ہے اور مجھے عشرت کہتے ہیں۔" اس نے تعارف کرایا۔ روبینہ نے کسی کو دیکھا کسی کو نہیں دیکھا۔ سر ہلا کر رہ گئی۔

"کم ازکم یہی کہہ دیجئے کہ آپ کو ہم سے مل کر خوشی ہوئی یا غم ہوا۔" مشہدی بول پڑا۔

"عشرت بہن۔ سرراہے ملاقات کو اگر دوام عطا ہو جائے تو پھر مجھے جدا ہوتے ہوئے دکھ ہوگا۔" وہ اٹک اٹک کر کپکپاتی آواز میں بولی۔

"یا خدا۔ دوام نہیں چاہتیں آپ؟" عشرت نے حیرت سے پوچھا۔

"میں تو بارش کے رُکنے تک ....."

ہارون نے اسے جس حال میں دیکھا تھا اس سے اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوتی کہ وہ اس بھرے پُرے انسانوں کے جنگل میں اکیلی ہے۔

"عشرت" وہ جلدی سے بول پڑے۔ "انہیں امّی سے نہیں ملایا؟"

بڑے بڑے دالانوں سے گزرتے ہوئے وہ اسے اندرونی کمرے کی طرف لے گئی۔ اسے گوشے گوشے سے انسیت محسوس ہو رہی تھی۔

بڑے بڑے دالانوں سے گذرتے ہوئے وہ اسے اندرونی کمروں کی طرف لے گئی۔ اسے گوشے گوشے سے انسیت محسوس ہو رہی تھی۔ چپّہ چپّہ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ مکان اپنا مکین اپنے ـــ امّی بے حد پُرمحبت لگیں بالکل اس کی امی جیسی۔ آنکھوں میں غم آلود نرمی۔ قیافہ سے شفقت عیاں۔ ممتا کی خوشبو سے مہکتی ہوئی۔

"بھائی جان کی دوست ہیں۔" عشرت معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

نہ جانے امی کیا خیال کریں۔ ان کے پوچھنے سے پہلے ہی اس نے سب کچھ کہہ دیا۔

"جب مجھے نیلا میہ نے گھر سے نکال کر دروازہ بند کر دیا.....

مجھے ایسا لگا جیسے ابھی ابھی دل کی حرکت رک جائے گی۔ وہ میرا گھر تھا امی ـــ میرے پاپا اور امّی کا گھر۔ پاپا بہت سخت گیر تھے ہم ان سے ڈرتے رہتے تھے۔ امّی کو بھی ان کے سامنے منہ کھولنے کی ہمّت نہیں ہوتی تھی ـــ پھر پاپا ریس اور جوئے میں ہارنے لگے۔ امی کے سارے زیور گھر کی ایک ایک چیز اور جائیداد سب بک گئی۔ امی نے انہیں توجہ دلائی تو وہ بگڑ گئے۔ امی سے کہا کہ وہ گھر سے نکل جائیں۔ امی کہاں جاتیں۔ ان کا کون تھا۔ پھر امّی نے کبھی ان کے معاملات میں دخل نہیں دیا۔ وہ جو کچھ مانگتے گئے امی دیتی گئیں۔ ریس اور جوئے میں ہار کر پاپا شراب بھی پینے لگے۔"

وہ ایک سسکی لے کر رہ گئی۔ جیسے عہدِ ماضی کی یاد دل میں ٹیس بن کر اٹھی ہو۔ چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

" امّی نے اپنے دل پر بہت دکھ جھیلے ۔ ستم برداشت کئے ظلم سہے ۔ اور پھر ایک دن ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئیں ۔ اُن کے بعد پاپا پر خاموشی کے طویل دورے پڑنے لگے ۔ ذہنی توازن بگڑ گیا ۔!
نجانے کیا کیا سوچتے رہتے تھے ۔ اپنے ظلم و ستم یاد کرتے رہتے ۔ انہیں میں نے معاف کر دیا ۔ امّی نے بھی معاف کر دیا ہو گا ۔ مگر وہ خود اپنے آپ کو معاف نہ کر سکے ! اور پھر ایک دن ۔ پاپا بھی امّی کے پاس پہنچ گئے ——— ! انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا ۔ اُن کی مُنیّہ ——— کہاں جائے گی ؟ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے ۔ امّی ——— میرا تو گھر بھی چھوٹ گیا ! "

" بیٹی ! کسی کے دن یکساں نہیں رہتے " امّی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا " تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے ۔ اب تمہیں بھائی ، بہن اور ماں سب مل گئے ہیں ——— میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی ——— اور جاؤ گی کہاں ؟

دنیا میں سبھی رشتے خون کے نہیں ہوتے " وہ بولی ——— بعض انسانیت کے بھی ہوتے ہیں " عشرت نے کہا " یہاں تمہیں بھائیوں کا پیار ، ماں کی محبت اور ایک بہن کا خلوص ملے گا ——— کیا سب کو ٹھکرا دو گی ؟؟ ۔

اس خلوص و یگانگت پر وہ دل بھر رونا چاہتی تھی ۔ مگر نجانے کیا ہوا کہ دل نے مدبھری راگنیاں چھیڑ دیں ۔ وہ سب اسے پل بھر کے لئے بھی تنہا چھوڑنا نہیں چاہتے تھے ۔ نجانے کب اکیلی ہو ۔ دور ماضی کے غاروں میں بھٹکنے لگے ۔ ہارون کو وہ سب سے بڑا نجات دہندہ سمجھتی تھی ——— جنہیں تقدیر نے خضر کی صورت میں اس کے پاس بھیجا تھا ۔ اگر وہ نہ ملتے تو کیا ہوتا ——— ؟ ! ۔

اور محسن ——— جنہیں پہلی بار اس نے دیکھا تھا ۔ بند پیانو کے پٹس پر کہنی ٹیکے بیٹھے تھے ——— مشہدی ——— سنجھلا اور شریر سا لڑکا ——— جو دم بھر سکون سے نہ رہتا ۔ بڑی جلدی اس کا دوست بن گیا تھا ۔ نجانے کہاں کہاں کی اوٹ پٹانگ اڑایا کرتا ۔ اور سب سے بڑھ کر عشرت تھی ۔ ! بے حد پُر محبت اور مخلص لڑکی ——— جو مُنیّہ کو خود سے الگ نہیں سمجھتی تھی ۔ اور اس طرح ۔ اجنبیت

کا تصور اُٹھ گیا ۔ احساس بھی جاتا رہا ۔ اسے یہی محسوس ہوتا تھا ۔ وہ یہاں برسوں سے رہتی آئی ہے ۔ اور برسوں یہیں رہے گی ۔ !

اور امّی سے گھر کا چارج لے کر جب اس نے کھانے پینے کا انتظام سنبھالا تو گھر کی کایا ہی پلٹ گئی ——— ! مشہدی نے تب بھی پیچھا نہ چھوڑا تھا ۔ " آپ کی انہی خصوصیات کی وجہ سے بھائی جان کہہ رہے تھے ۔ کہ بھئی واہ ۔ کیا نقلی ہیرے کی سی لڑکی ہے ۔ ! " وہ بولا ۔

" نقلی ہیرا ——— اصلی نہیں ؟ " وہ منہ لٹکا کر بولی ۔

پتہ نہیں " مشہدی نے کہا " اور سنیئے ۔ چھوٹے بھیا نے جواب دیا کہ بھائی جان نقلی ہیرہ تو آپ کہیئے ۔ مجھے تو وہ گلے کا ہار معلوم ہوتی ہے ! "

مار بیٹھوں گی ۔ شدّو ——— ! " عشرت نے للکارا ۔ آپ کی تعریف کسی نے نہیں کی ۔ امّی البتہ بُرا سا منہ بنا رہی تھیں کہ کیا فضول لڑکی ہے ۔ گلاس کا گھڑا ہو جیسے "

عشرت کا منہ پھول گیا ۔

آپ چائے بنا کر لے آیئے گا ۔ ہم جاتے ہیں ! ——— "

آیئے آپا ۔ ہم چلیں ——— "

وہ اُسے لائبریری میں لے آیا ۔ ہارون کی خوش ذوقی کا پتہ یہاں آ کر چلتا تھا ۔ ہر قسم کی کتابیں ——— بڑی بڑی شیشے کی جھلکتی ہوئی الماریوں میں عرش سے فرش سے چُنی ہوئی تھیں ۔ !

یہ میں سب پڑھ چکا ! ——— وہ اکڑ کر بولا ———

" آپ کو لائبریری کا ایک خاص تحفہ دکھاؤں ؟ " اسنے ایک بڑے شاعر کی کتاب نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی ———

" اُوہو " وہ چہکی " بہت عمدہ کتاب ہے ——— " پھر وہ نروس ہو گئی ! " پڑھی تو میں نے بھی ہے مگر سمجھ میں نہیں آئی " !

" عامیوں کی سی باتیں نہ کیجئے ؟ " مشہدی بولا " ارے وہ کب ایسی چیزیں لکھتے ہیں جو ہم آپ جیسے دو دو ٹکے پیسوں والوں کی سمجھ میں آ جائیں ——— وہ تو روح القدوس سے اپنے کلام کی مراد پاتے ہوں گے ——— آپا ——— اُن کا اصلی حسن تو یہی سرّیت ہے !

وہ مرعوب ہونے لگی " ہاں بھیّا ——— تم کہیں ملے نہیں

اُن سے ؟"

کیوں نہیں ــــــ وہ گردن اکڑا کر بولا "کئی بار ملا ہوں

ایسی ایسی باریکیاں اُن کے "استعاروں" کی چھانٹ کر بیٹھیں کی تھیں کہ

مرعوب ہو کر رہ گئے ۔

"استعاروں ؟ ــــ" رُوبینہ مُسکرائی ۔

جی ہاں ! اشعار ہی کہنے کا ارادہ تھا ۔ مگر چونکہ بہت سے

شعر ہیں ۔ لہٰذا اشعاروں کہہ دیا ۔" وہ بھی اخلاقاً مُسکرایا ۔

تو پھر "شاعر صاحب نے کیا کہا ؟" اُس نے پوچھا ۔

"وہ کہنے کیا ۔ مجھ سے ملے ۔ مصافحہ کیا ۔ اور پھر کہنے لگے کہ بھیا

مشہدی صاحب ۔ علمیت اور قابلیت میں تو میں بھی آپ سے نہیں جیت سکتا

کیا کہنے ۔ کیا کہنے ۔ اسی نکٹے بے غیرت کو تو وہ عالم فاضل

بتاتے ــ" عشرت آندھی طوفان کی طرح کمرے میں آئی "جانے کب

تک ترسے گا ۔ ترس ترس کر رہ جائے گا ! ۔

نہیں ملے تم ۔ جھوٹ بک رہے ہو ؟" رُوبینہ حیران نظر آنے لگی

ایک دن خواب میں دیکھا یہ سب کچھ ۔ وہی بتا رہا تھا !" مشہدی

نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا "گڑیا بھابی جان اور چھوٹے بھیا سے پوچھ

آئی ہوں ۔ وہ بھی کہہ رہے تھے کہ میں نے نقلی ہیرا کہا نہ گلے کا ہار کہا

یاد رکھو شدّو ۔ جھوٹی بچّی لگائے گا تو بہت مار کھائے گا ! ــــ"

عشرت پھر بولی ۔

ارے ارے ۔ وہ تو میں بھول ہی گیا ۔ چھوٹے بھیّا نے کہا

تھا کہ بھابی اس طرح گھر کے سارے کام کرتی ہیں کہ بالکل گھر والی لگتی ہیں"

عشرت کو ہنسی آ گئی ۔ وہ اُسے مارنے جھپٹی ۔ اور مشہدی دو

چھلانگوں میں یہ جا وہ جا ۔

موسم دلکش تھا ۔ بارش برس کر کھل چکی تھی ۔ ننھے ننھے

تارے شرمائے شرمائے سے مسکرانے لگے تھے ۔ چاند کا بھیگا بھیگا چہرہ بادلوں کی

چاک چاک گُدڑ پٹے سے جھانکنے لگا ۔ نکھری ستھری چاندنی روپہلی چادر

کی طرح اونچے اونچے درختوں اور مٹی پر بچھتی چلی گئی ! ــــ ایسے

خواب ناک اور مہکتے ہوئے لمحے اسے بے حد پسند تھے ۔ ! عشرت سو چکی تھی

تب اس نے برآمدے میں قدم رکھے ۔ ! مالی سے باتیں کیجیے کوئی کھڑا تھا

ارمان ہوں گے ۔ اس نے سوچا اور آگے بڑھ گئی کہ جیسے

ہی محسن پر نظر پڑی ۔ وہ جہاں کی تہاں رک گئی !

"آؤ ۔ بینا ۔ کچھ باتیں کریں ۔ کتنا سہانا موسم ہے !" وہ

ادھر ہی چلے آئے ۔

اِس چودھویں کا چاند ۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے !"

تب تو تمہیں یہاں ہرگز نہ آنا چاہیئے تھا ۔

کیوں ـ ؟ ـ" وہ متحیّر نظر آنے لگی ! ۔

"تمہیں دیکھ کر وہ غریب پھر بدلی کا نقاب پہن لے گا !"

جی ! ـ ؟ ! ــ" اس کے چہرے پر ایسی سادگی تھی کہ محسن

اپنے مذاق پر شرمندہ سے ہو گئے ! ۔ گیارہ بج گئے تم سوئیں نہیں اب

تک ـــــ!"

نیند نہیں آئی ! ۔

اچھا ! ــ"

پھر خاموشی چھا گئی ۔ وہ مجوب ہو رہی تھی ۔ یوں بھی محسن سے

زیادہ بے تکلّف نہیں تھی ! نیلگوں آسمان میں ہولے ہولے چاند کی کشتی

تیر رہی تھی ۔ ہوا کی شوخیوں سے اس کے بالوں کی موٹی موٹی لٹیں پیشانی

پر جھومنے لگی تھیں ۔ نیند سے آنکھوں میں انجانے نشّے کا خمار گھولنے لگا تھا

ــــ نور کی کرنوں میں گھلی ملی وہ بھی ایک کرن ہی لگ رہی تھی ہلکے پھلکے

لباس میں لپٹی ــــ جیسے کوئی ساری رُوح بھٹک کر چلی آئی ہو ۔

محسن کی نگاہیں جھک گئیں ۔

اچانک اس کی نظریں بھی ادھر اٹھ گئیں ــ اور وہ گڑ

بڑا گئے ۔ "جانے اپنی طرف دیکھتا پاکر کیا سوچتی ؟ ۔

" معافی چاہتا ہوں ! ــ" وہ اور بوکھلائے ۔

کس بات کی معافی ـ ؟ ! ـ

میں تمہاری تنہائی میں مخل ہوا ۔

یہ تو کوئی معافی مانگنے والی بات نہیں ہے ! ۔

"تو پھر جانے دیجیے !"

رُوبینہ بے اختیار ہنس دی ۔

ایک نہ معلوم کشش اس نے محسن میں محسوس کی تھی ۔ وہ

ان کے بارے میں کیوں سوچنے لگی تھی ۔ اس پر احسانِ عظیم تو ہارون نے کیا تھا۔ عقیدت اور بیکراں احسان مندی کا جذبہ ہمیشہ اس کا سر اُن کے خلوص کے آگے سجدہ ریز رکھتا ۔ مگر وہ محبت جو جسم و روح کے لئے ناگزیر ہے۔ کسی کو اپنانے کی تمنا۔ کسی کے ہو جانے کی آرزو ـــــ ہارون اس تصور سے کوسوں دُور تھے ۔ اب تو اس کا گرد و پیش منت بداماں تھا۔ ہر ایک کو اس نے اپنا دردمند ہی پایا تھا۔ کسی نے اس کی پوزیشن اور گذرے ہوئے واقعات کا کبھی بھول کر بھی تذکرہ نہیں کیا ۔ وہ بھی بھول گئی ۔ محبت اور خلوص جو دلوں کے لئے زنجیر ہے چھوٹے سے دل میں محبت و عقیدت کا بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا ۔ اتنی متاثر اور مرعوب ہے اگر کوئی اس سے جان دینے کو بھی کہے دیتا تو دے دیتی !۔

ہارون ـــــ جن کے خلوص اور شفقت کو وہ ہمیشہ بھائی کا تقدس دیتی رہی تھی ۔ جیسے خواب میں بھی خیال نہ آسکا۔ پہلی بار ـــــ پہلی نظر میں چپکے سے انھوں نے اپنا دل اس کے قدموں میں رکھ دیا تھا ـ ! سنجیدہ ترین اور متانت کے پیکر ـــــ جن کے اصولوں نے ہونٹوں پر تالے ڈال رکھے تھے ۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ اچھا یا بُرا۔ دکھ ہو یا سکھ وہ سب کچھ اپنی ہی ذات پر جھیل لے جاتے ۔ اور اس طرح اپنے اس جانگسل احساس کو بھی دل کی تاریک ترین گھاٹیوں میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔

رُوبینہ ـــــ عشرت کے برابر ہی ہوگی ۔ اور وہ خود ـــــ اس سے کہیں بڑے ـــــ سب سے بڑے جنھیں ابا جی کے انتقال کے بعد گھر کے بزرگ کا درجہ دے دیا گیا تھا ۔ سیاہ و سفید کے مالک مرضی کے مختار ـــــ جن سے سبھی ڈرتے تھے ۔ اور جو خود بھی سب سے الگ تھلگ خود کو لئے دیئے رکھنے کے عادی تھے ۔ !

لیکن اب ایسا معلوم ہوتا تھا۔ اُن کی کتابِ زندگی نیا ورق اُلٹنے کے لئے روبینہ کے رہین منت رہی ہو۔ سنجیدگی کا بنا وٹی خول کہاں گرا۔ کب گرا ـــــ پہلی بار سب کے ساتھ چائے کی میز پر نظر آتے ۔ تو سب ہکا بکا رہ گئے ان کی چائے اور کھانا اُن ہی کے کمرے میں جاتا تھا !

خیریت تو ہے بھائی جان! مشہدی نے دیدے نچائے ۔

ہاں بھئی خیریت کیوں نہیں ہوتی ! ـــــ وہ اس طرح بولے کہ مشہدی اچھل پڑا ۔

میں سمجھ گیا ـــــ سعدی رحمتہ اللہ کی چائے کی کشش آپ کو یہاں کھینچ لائی ہے !"

سعدی رحمتہ اللہ ـــــ ؟" محسن نے سوالیہ انداز میں اُسے گھورا ؟ "

جی ۔ محترمہ روبینہ سعدیہ ـــــ نام کا ایک لفظ فرق میں تو دوسرا مغرب میں " وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا ۔ عشرت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

" فضول مت بکو ـــــ " امی نے للکارا ۔

" جی بہت اچھا ۔" وہ سعادت مندی سے بولا اور چپ سادھ لی ۔ سعدیہ مُسکرا رہی تھی !" چپ چاپ چائے بنائی اور ہارون کے آگے سرکا دی ـــــ مشہدی کھنکارا ـــــ اور عشرت پھر اُسے گھورنے لگی ۔ !

جو کچھ دوسروں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں ۔ وہ رُوبینہ کی نظروں سے تو پوشیدہ نہیں ہے ۔ محبت کی نگاہیں کب چھپتی ہیں ۔ روبینہ کے سلوک کو وہ سرچشمہ حیات سمجھ بیٹھے تھے ۔ اُن کی زندگی میں وہ پہلی ہستی تھی ۔ جس نے خیالوں کی دنیا میں ستارے سے نکھار دیئے تھے ۔! ـــــ دل کے خاموش ہنگاموں نے ایک حشر برپا کر رکھا تھا ! !

یہ کتنی تعجب انگیز بات تھی ۔ وہ تو بہت پہلے کسی اور کے ہو چکے تھے ۔! ناہید امی کی بھانجی تھی ۔ اور ہارون کی منگیتر ۔ بہت پہلے منگنی ہو چکی تھی ۔ اور جلد از جلد وہ اس گھر کی بہو بن کر آنے والی تھی۔ ہارون کے شب و روز عجیب سے اضطراب آفریں بے چینی میں گزرنے لگے ۔ امی سے کہنے کی ہمت نہیں ! ـــــ اور رُوبینہ اسے بھی احساس نہ تھا ۔ یہ انھیں پسند نہ تھا اس کی زندگی پھر کرب کے نذر ہو جائے! یہ تمنا سینے میں جوالامکھی کی طرح بھڑک اُٹھی تھی ۔ اگر روبینہ خود ہی محبت کا اظہار کر دے ۔ تب ۔

وہ اس سے کتنی محبت کرتے ہیں ۔ روبینہ دل میں ان کی بے پایاں عنایتوں سے دبی چلی گئی ۔ بڑا بھائی ہوتا بھی تو نہ کرتا ! ـــــ جب تک وہ گھر سے باہر رہتے ۔ آنکھیں دید کی متلاشی اور کان آواز کے منتظر رہتے ! وہ اسی طرح اپنے تشکر کا اظہار کرنی چاہتی تھی ۔ ورنہ

سب کچھ پتہ تھا۔ کہ ہارون ناہید کے ہیں۔ عشرت نے تفصیل سے اسے اپنی بھابی کے بارے میں بتایا تھا۔ مشہری کے البم میں اُس نے ناہید کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اور کئی بار عشرت کے ساتھ ناہید کے یہاں جا چکی تھی۔

صبح کے ناشتے کے بعد جب وہ سب ادھر اُدھر ہو گئے۔ تب امی نے ہارون کو گھیر لیا۔

کوئی خاص بات ہے؟ ——— امی ———! کچھ سوچ کر اُن پیشانی پر پسیج گئی۔

ہاں بیٹا! ——" امی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "تم دیکھ رہے ہو بڑھاپے کی زندگی اور صبح کے چراغ میں کوئی فرق نہیں۔ جانے کب ہوا کا ایک جھونکا گل کر دے .....

امی ——— یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ ابھی انشاءاللہ آپ بہت ———؟"

اب نہ جینے کی ہوس ہے نہ مرنے کا کھٹکا ——— اندیشہ یہی ہے کہ ہارون کہ شاید میری آرزو بھی میرے ساتھ قبر میں جائے گی!

نہیں نہیں ——— امی — آپ ———

مگر امی نے انھیں زبان بھی نہ کھولنے دی۔

" ہارون ——— میں چاہتی ہوں انہی گرمیوں میں ناہید کو لے آؤ۔ اب میں تمہارا کوئی عذر نہ سنوں گی!"

" مگر ——— امی ———!"

تمہاری ہر خوشی میری خوشی ہے۔ مگر اتنا سوچ لو ناہید کے علاوہ کوئی اور لڑکی میری بہو بن کر اس گھر میں نہیں آ سکتی!۔

" ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتا — امی ———!" ہارون نے کہا اور اٹھ کر چل دیئے! ———

امی نے طوفان بپا کر دیا ——— قہر و غضب کا پیکر لگ رہی تھیں ——— اُن کے معاملے میں کسی کو زبان ہلانے کی بھی مجال نہ تھی۔ محسن تک دم بخود تھے۔

بھائی جان نے شادی سے انکار کر دیا ——— عشرت جانے کیا سوچ رہی تھی! ——— اور روبینہ دہل رہی تھی۔ کہیں ان کا انکار ——— اس کی محبت میں تو پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ ڈر گئی ——— امی کا غیظ و غضب وہ بھی دیکھ رہی تھی ——— کیا صورت دکھائے گی انھیں ——— اگر اس کا اندیشہ سچ نکلا! ———

رات کے کھانے کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح کافی لے کر اُن کے کمرے میں گئی! ——— نیلوں خوابگوں روشنی میں ماحول اونگھتا ہوا لگ رہا تھا۔! ——— دریچوں کے باہر رات کے پہلے پہر آہستہ آہستہ گہرے ہوتے جا رہے تھے! پتوں میں ہوا کا سُریلا نغمہ گونج رہا تھا!

روبینہ — تم نے پھر تکلیف کی! ——— وہ کین چیئر پر نیم دراز تھے۔ چہرے سے پریشانی اور پراگندگی عیاں تھی۔ آپ کا کام کر کے تو مجھے خوشی ہوتی ہے! —

" کیوں ——؟ ———"

آپ ہی نے تو اس کا موقع فراہم کیا ہے ——— ورنہ میں نجانے کہاں کہاں بھٹکتی پھرتی!

بھولیں نہیں اب تک پُرانی بات ———؟ — ویسے روبینہ ——— " انہوں نے سگریٹ سلگائی اور پُر خیال انداز میں آہستہ آہستہ کش لینے لگے!۔

" میں سوچتا ہوں ——— میری تقدیر نے مجھے دھکیل کر ان راہوں پر بھیجا تھا ——— جہاں میری زندگی میری منتظر تھی! ——— روبینہ ——— ہماری راہیں الگ الگ نہیں ہیں ——— تمہارے بغیر ——— زندگی ——— میرے لئے ایک جبر مسلسل ہے ———"

" جی ———؟ ———" وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔

" میں جانتا ہوں — اظہار محبت ——— خودداری کے منافی ہے ——— مگر جن حالات سے میں دوچار ہوں ——— اُن سے بچنا ممکن نہیں ——— وہ لمحہ میرے لئے ازلی بھی تھا اور ابدی بھی — جب میں نے سوچا تھا ——— تمہارا ہاتھ تھام کر میں ——— منزل کی طرف بڑھتا رہوں گا ———"

" یہ ——— یہ سب آپ کیا کہہ رہے ہیں ———" روبینہ کے کان جلنے لگے۔ دل کی دھڑکن قابو سے باہر ہو رہی تھی۔ تو اس کا اندیشہ صحیح نکلا۔

" ربی ——— امی کا نادر حکم تم بھی سن چکی ہو ———

" علامہ —— آپ پر کوئی شعر نازل ہو رہا ہے؟ ——"
مشہدی نے اُسے مخاطب کیا —— وہ چونکی " میں تو بازی لگا کر کھیلوں گا"
محسن نے کہا —— بولو —— روبینہ —— کتنے کی بازی ۔

" ارے ہے - مجرا ہو گیا یہ تو —— " عشرت نے بڑی ہی

حیرت سے کہا ۔

" ہرگز نہیں " مشہدی نے سنجیدگی سے کہا " سعدی صاحب

فرماتے ہیں کہ —— اپنی خیر چاہتے ہو تو سر کی اور دل کی بازی کبھی نہ لگاؤ

—— اور سعدی صاحب نے یہ نہیں فرمایا کہ جب دماغ چل

جائے تو سر پر ٹھنڈا پانی ڈال لو " محسن نے اسے بناوٹی غصے سے گھورا ۔

" اچھا تو سعدی صاحب نے یہ بھی کہا ہے —— مجھے پتہ نہیں

" مشہدی بولا " —— بھیا تم دوڑ کر سر تو ٹھنڈا کر لو "

" مجھ سے اُلجھے گا تو قیمہ بنا کر رکھ دوں گی ! —— " عشرت بولی

" تو پھر دعوت ہی میں کھانے میں کباب بکینگے ! —— " مشہدی

نے خوش ہو کر کہا —— روبینہ کو ہنسی آ گئی ! "

" چلو آؤ —— " محسن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا

اور جھک کر رازداری کی " پارٹنر بنو گی ؟ —— "

" اچھا ! —— " وہ ہنسنے لگی !

" زندگی بھر کی —— " بے اختیار عشرت کے منہ سے

نکل گیا —— "

" ونڈرفل —— ! " مشہدی قلابازی کھا گیا ۔

محسن نے ہنسی سے بے تاب ہو کر تاش ہاتھ سے رکھ دیئے !

—— روبینہ کی جھینپی جھینپی شکل دیکھ کر وہ سب بے تحاشہ ہنس پڑے

" بڑی خراب ہو —— " روبینہ جھینپ رہی تھی ! ——

ایسی جھینپی جیسے کسی نے دل کا چور پکڑ لیا ہو ۔ اور جب اکیلے میں محسن

اُسے دیکھ کر مسکرائے تو پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ۔

" تم نے عشرت کی دعا پر آمین نہیں کہا —— ؟ " وہ

اب بھی ہنس رہے تھے ! - وہ چُپ رہی ۔

" کاش ! - ایسا ہو سکے ! —— " وہ بڑے جذباتی لہجے

میں بولے اور جھک کر اس کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا " روبینہ ! "

میرے انکار پر وہ خفا ہو گئیں —— روبینہ . یقین کرو - اگر میں نے

تمہیں دیکھا نہ ہوتا تو اُن کے فرمان پر بلا چون و چرا سر جھکا دیتا —— لیکن

اب یہ ناممکن ہے ! "

" خدا کے لئے ایسا نہ کیجئے گا ! —— " اس کے لب

کانپنے لگے " آپ نے ہمیشہ مجھے سہارا دیا ہے - تباہی سے بچایا

اور بربادی کے راستوں سے ہٹا کر سلامتی کی راہیں دکھائی ہیں - بھائی

جان - اب مجھے سہارا دیجئے - آپ سب کے بھائی ہیں - کیا میرے

بھائی نہیں ہیں —— میں نے آپ کو ہمیشہ یہی سمجھا ہے اور یہی

سمجھتی رہوں گی —— ! "

" روبینہ —— ؟ —— " سگریٹ اُن کے ہاتھ سے

چھوٹ گیا ۔

" بھائی جان - پھر میرا کیا حشر ہوگا - آپ نے یہ بھی نہیں

سوچا —— ؟ ! —— "

جب وہ وہاں سے واپس پلٹی تو پاؤں لڑکھڑا رہے تھے ۔

آنکھوں میں تاریکی چھا رہی تھی ! —— دل کسی صدمے سے دوچار شدید

اذیت اور ناقابلِ برداشت احساسات —— جیسے اس نے تاج محل کو

منہدم دیکھ لیا ہو —— ہارون کو وہ ایک دیوتا کی طرح چاہتی تھی ۔

—— اپنے احساسات کو اظہار کی زبان دے کر انھوں نے اپنی

عقیدت اور محبت کی بنیادیں ہلا دی تھیں ! —— "

" ہارون بھائی آپ آدمی ہی نکلے —— میں نے آپ

آپ کو انسان سمجھا تھا ! —— " وہ دل بھر کر رونا چاہتی تھی ۔

عشرت نے اُسے کئی آوازیں دیں —— مگر وہ سوتی بن گئی ۔

صبح کو اس کی طبیعت کچھ بھاری بھاری لگ رہی تھی ! ۔

ناشتہ کی میز پر ہارون نہیں تھے ۔ وہ چونک پڑی ۔ خود اُس کا بھی

جی چاہ رہا تھا کہ انہیں اپنی شکل نہ دکھائے —— امی اب بھی خاموش

تھیں —— غصہ اور فکر اُن کی پیشانی سے عیاں تھا ! ۔

پھر جیسے ہی وہ اندر گئیں —— مشہدی کارڈز چھپا کر بیٹھ گیا ۔

" آئیے —— " محسن اور عشرت کسی بات پر ہنس رہے

تھے —— ! وہ چُپ چاپ بیٹھی سوچے جا رہی تھی ! ۔

الشجاع

جب تم پُرنم آنکھوں اور لرزتے ہوئے لبوں سے امی کو اپنی داستانِ غم سنا رہی تھیں ۔ تب کوئی جذبہ مجھ میں بڑی شدت سے اُبھر آیا تھا۔ کاش میں اپنی رُوبی کے لئے کچھ کر سکتا ۔۔ کاش میں ۔۔۔۔ !"

اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اِن کے لبوں پر رکھ لیا۔

چُپ رہیئے ۔ مجھے کوئی خوشی راس نہیں آتی !

عشرت اور مشہدی کو دیکھ کر دونوں یوں چُپ ہوئے ۔ جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں !"

تفریح کے لئے جا رہے تھے " مشہدی بولا " ارادہ تھا آپ کو بھی لے لیں۔ مگر اب کیا ضرورت ہے !"

"کیوں ۔۔ ؟ " رُوبینہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

تت ۔۔ تفریح ۔۔ تو غالباً ہو چکی ۔۔ !" مشہدی ہکلایا۔

"دیکھا آپ نے ۔" رُوبینہ نے احتجاجی انداز میں محسن کو دیکھا۔

کیوں ۔۔ تم ہمیشہ رُوبینہ کو چھیڑتے رہتے ہو ۔۔" محسن نے نیلی پیلی آنکھوں سے اسے گھورا۔

جی ۔۔ ہمیشہ تو نہیں ۔۔۔ ویسے ہی اگر کبھی موقع مل جائے مشہدی بڑی سادگی سے بولا " مگر آپ کی طرفداری میری سمجھ میں نہیں آتی !"

"ایک دن اچھی طرح سے سمجھا دوں گا ! ۔۔" محسن نے ہنسی ضبط کر کے کہا۔

خدا وہ دن جلد لائے ۔۔ !" مشہدی نے بڑے خلوص سے دعا دی ۔۔"

ارے چلو بھی ۔ بھائی جان بور ہو رہے ہوں گے ! ۔۔"

عشرت نے اکتا کر کہا اور سب کو لے گئی ۔ وہ بھی چاندنی ہی رات تھی ۔۔۔ ذرہ ذرہ نور کی کرنوں کا غلاف اوڑھے محوِ خواب تھا ! ۔۔۔

کار دھیرے دھیرے سرکتی رہی ۔ دوسرے باتیں کر رہے تھے مگر رُوبینہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئی تھی ۔ ۔ یہ سڑک ۔ محلے ۔۔ اس کے جانے پہچانے تھے ۔ اس کے دل کی رگیں کھنچنے لگیں ۔

اللہ ۔۔۔ وہ بُڑبڑائی ۔ یوں اس کوچہ کے ہر ذرے سے آگاہ ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں ۔

دوسرے لمحے شفاف آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے ۔ اور بے اختیار اس نے ہاسکن کا شانہ دبوچ لیا ۔۔۔۔ خدا کے لئے ۔۔۔ ذرا دیر یہاں رک جایئے ! ۔۔۔"

کار رک گئی اور سب متحیرانہ اسے تکنے لگے ۔

کیا ہے ۔۔۔ رُوبی ! ۔۔" عشرت نے پوچھا۔

آشی ۔۔۔۔ " رُوبینہ کی حسرت بھری نگاہیں ایک خوبصورت کوٹھی پر لگی تھیں ! جس کے تمام دروازے ۔ کھڑکیاں بند تھے ۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا ۔ اور وسیع سرسبز لان میں چاندنی لہریں لے رہی تھی ! ۔

آشی " وہ خود فراموشی میں بولی " یہ کبھی ۔۔۔ میرا گھر تھا ۔۔۔۔ جہاں سے مجھے نکال کر لوگوں نے مجھ پر دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے تھے ۔ میرا کتنا جی چاہتا ہے ۔ ایک بار ۔۔۔ میں اپنے گھر کو دیکھ سکتی ! ۔۔"

آپ ذرا ذرا سی بات پر رونے لگتی ہیں ۔ ! مشہدی نے کہا ۔۔" آیئے ۔۔ دیکھ لیجئے ۔۔ میں جانتا ہوں ۔ اب یہاں ڈاکٹر مظہر رہتے ہیں ۔۔۔ بہت اچھے آدمی ہیں ! ۔۔۔ وہ ہماری خواہش نہیں ٹھکرائیں گے !"

لیکن اب ۔۔۔ رات کے گیارہ بجے ۔۔۔۔ !"

محسن نے کچھ کہنا چاہا ۔

چھوٹے بھیا ۔۔ ڈاکٹر ساری ساری رات جاگتے ہیں ۔

۔۔ آیئے ! ۔۔۔" اور مشہدی نے لان پار کر کے کال بیل پر انگلی رکھ دی ۔۔۔۔ ہارون کی کار سے اترتے ہی سب اتر گئے ! ۔

دُور کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی ۔ دوسرے لمحے ڈاکٹر مظہر اُن کے سامنے تھے ! ۔۔۔ انھیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کسی مریض کو لائے ہیں ۔ یا انھیں لینے آئے ہیں ! ۔۔۔ مگر اُن سب کی ہوائیاں اڑی ہوئی شکلیں دیکھ کر وہ بھی پریشانی نظر آنے لگے ! ۔۔

کتنی نامناسب بات ہے ۔ رات کو ایک شریف آدمی کے آرام میں خلل ڈال کر اس کا مکان دیکھنے کی آرزو کرنا ۔۔۔۔ ٥٥

سب احمقوں کی طرح ایک ایک کی صورتیں تک رہے تھے ۔!
روبینہ اپنی بے ضبطی پر بے حد شرمندہ تھی !۔
فرمائیے !۔۔۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟
۔۔۔" بالآخر انہوں نے اُن کو بوجھ ہی لیا ۔ یہ سب تو پاگل معلوم ہو رہے تھے !"
ڈاکٹر صاحب ۔۔" ہارون نے تذبذب لہجے میں کہا ۔"
دراصل ہم ایک ناممکن سی درخواست لے کر آپ کے پاس آئے ہیں "!
" بہرحال ۔۔ فرمائیے !۔۔۔" ڈاکٹر نے پوچھا ۔۔"
آپ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہوں !۔۔

اور درخواست کی غرض و غایت سن کر ڈاکٹر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔۔۔ پھر انھیں اپنے ساتھ لے لئے !۔۔ اندر قدم رکھتے ہی روبینہ کا رہا سہا صبر و قرار بھی رخصت ہو گیا۔۔ بالکل پاگلوں کی طرح وہ ایک ایک در و دیوار سے لپٹی ۔ یوں رو رو کر اُن سے باتیں کرتی رہی ۔ جیسے اُسے یقین ہو ۔ پتھر کی دیواریں ۔ لکڑی کے دروازے ۔ اس کی داستانِ غم سن رہے ہوں !۔۔

" یہ میرے پاپا کا کمرہ ہے ۔۔۔ یہاں امی رہتی تھیں ۔
۔۔۔ یہاں گل داؤدی کا پیڑ تھا ۔ اس کے پاس امی کی نماز کی چوکی رہتی تھی ۔۔۔ بھیا ۔۔ آئیے ۔۔۔ دیکھو ۔۔۔ کیسا اچھا گھر تھا میرا ۔۔۔ مجھے ایسا لگتا ہے ۔ اپنے کمرے سے پاپا نکل آئیں گے کسی طرف سے امی آجائیں گی ۔۔۔ یہاں میرے پاپا کی خوشبو ہے ۔ میری امی کی مہک ہے ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ یہاں کبھی آپ نے میرے پاپا اور ممی کی روحوں کو تو نہیں دیکھا ۔۔۔ مجھے دیکھنے ضرور آئے ہوں گے ۔۔ انھیں کیا معلوم ۔۔۔ روبی انھیں کسی کمرے میں نہ ملے گی !۔۔"

اور ڈاکٹر صاحب ستون کا سہارا لئے سینے پر دو ہاتھ لپیٹے بڑے متاثر انداز میں روبینہ کو دیکھے جا رہے تھے ۔۔۔ کوٹھی پر ایسی ویرانی برس رہی تھی ۔ جیسے ابھی ابھی کسی کا جنازہ اُٹھ چکا ہو !۔۔"

یہی اس کوٹھی کی پہلی مالکہ تھی ۔۔۔؟ ۔۔ منظر نے سرد سانس لی ۔۔۔ اور متاسفانہ انداز میں روبینہ کے چہرے پر نظر ڈالی ۔۔۔!

گھوم پھر کر وہ سب رات گئے گھر واپس آئے ۔ ڈاکٹر منظر کے اخلاق نے ان پر گہرا اثر چھوڑا تھا ۔ ہارون نے بڑی لجاجت سے انھیں اپنے یہاں مدعو کیا تھا ۔ اگر نہ مدعو کرتے ۔ وہ تب بھی آتے !۔۔۔ روبینہ فراموش کرنے والی ہستی نہ تھی ۔ محسن کو یہ دیکھ کر عجیب سا محسوس ہوا کہ روبینہ اُن کی خاطر میں بچھی جا رہی ہے! جانے ۔ محسن کو یہ اچھا نہ لگا ۔ انہوں نے ڈاکٹر منظر کو بھی اچھی نظر سے نہ دیکھا !۔۔ اُن کی آنکھوں میں کوئی خاص چمک تھی جب وہ روبینہ سے باتیں کر رہے تھے ۔!

آپ یہ کیوں سمجھتی ہے کہ وہ اب آپ کا گھر نہیں رہا ۔ جب دل چاہے تشریف لائیے !۔۔" وہ اُس سے کہہ رہے تھے !۔
آپ مجھے پاگل تو نہ کہیں گے ۔۔۔ مجھے اب بھی اپنے گھر سے محبت ہے ۔۔"
محبت پاگل پن نہیں ہے ۔۔۔ محترمہ !"
محسن کی سمجھ میں اُس خلوص کی وجہ نہ آسکی !۔۔
کیا تم پہلے سے ڈاکٹر صاحب کو جانتی تھیں !۔۔۔"
اُنہوں نے پوچھا ۔
بھلا میں کیوں جانتی ۔۔۔!!" وہ بُرا مان گئی ۔۔
اور جیسے جیسے ڈاکٹر صاحب کی آمد و رفت بڑھتی گئی ۔۔۔ محسن کی بے پایاں محبت پہ بے رخی کا کہر چھانے لگا!! ۔۔۔ روبینہ اُن کی سرد مہری علانیہ محسوس کر رہی تھی !!۔۔
نجانے کیوں خفا ہو گئے ہیں ۔ وہ چپکے سے اُن کے کمرے میں پہونچی ۔۔۔ محسن بید کی آرام کرسی پر نیم دراز تھے ۔ آنکھیں بند تھیں ۔ اور پیشانی پر سوچ کی گہری شکنیں تھیں ۔ روبینہ نے آنچل ان کے ماتھے پر لہرایا اور چونک کر سیدھے ہو بیٹھے
چائے لاؤں آپ کے لئے !۔۔۔"
شکریہ ! اس وقت کچھ بھی نہیں چاہ رہا ۔۔۔"
یہ آپ نے میرا شکریہ ادا کرنا کب سے سیکھ لیا ہے !۔۔"

وہ چپ رہے۔ اور بے رخی سے پیٹھ پھیر کر جلدی جلدی جوتے کی ڈوریاں باندھنے لگے۔

یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے ———؟" روبینہ نے انھیں جھنجھوڑ ڈالا "میں آپ کو یہ سلوک نہیں سہہ سکتی ! ——— بولیئے نا —!"

کچھ نہیں! ——— " وہ اٹھ کر کہیں جانے لگے،

کہیں آپ رات کو کھڑی چارپائی پر تو نہیں سو گئے تھے "

اس نے ان کا ہاتھ روک لیا ——" جب تک بتا نہ دیجئے گا —— جانے نہیں دوں گی! ——

کیا بتاؤں —— روبینہ —— کوئی بات بھی ہو —— میں تو تمہارا شکر گزار ہوں ——— تم نے بہت پہلے ہی میری آنکھیں کھول دیں! ——"

یہ آپ کیا بک رہے ہیں؟! —

اب تک بکواس کرتا رہا ہوں۔ اور ہمیشہ بکواس ہی کرتا رہوں گا! ———"

" یا اللہ ———" وہ دنگ رہ گئی —

ڈاکٹر صاحب بہت اچھے آدمی ہیں نا؟ ——" محسن نے اچانک پوچھا۔

ہاں " وہ کھل اٹھی " مجھ سے کہہ رہے تھے کہ جب چاہوں جا کر اپنا مکان دیکھ سکتی ہوں؟"

" صرف مکان ہی یا مکین بھی؟!"

" فضول باتیں مت کیجئے ——!" وہ بگڑ گئی! —

بہت اچھا ——" محسن نے زہرخند لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گئے۔ ! —

انہی دنوں ہی گھر میں انقلاب آ گیا —— امی نے ہارون کی مرضی پاتے ہی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور اچانک محسن کا ٹرانسفر ہو گیا ——— وہ بدستور خفا تھے —! عشرت کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ اکیلا مشہدی تھا جو لطیفے کہہ کہہ کر سب کو ہنسانے کی کوشش کرتا۔

روبینہ گم ہو چکی تھی ——— یہ لوگ —— جو خواہ مخواہ وفا کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ محبت کے راگنیاں سناتے ہیں خلوص کا ڈھونگ رچاتے ہیں —— سب جھوٹ ہے۔ دل ہی جھانکو تو خاک اڑتی ہے . . . .

کچھ دنوں ہارون کی شادی کی گہما گہمی رہی ——— وہ بھی ناہید کی پیاری سی شخصیت میں اپنے دکھ سمونے لگی تھی! اس کا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ محسن کے پیار پر اس کا بھرم قائم تھا۔ محسن کی محبت پر اس کے اعتماد کی دیواریں اٹھی تھیں۔ وہ سرد مہری اور بے رخی کے مہیب زلزلے میں کب کے منہدم ہو گئے تھے۔ ! اسے چڑا کر ہنستے!

بھابی اب تو لوگ خوش ہوں گے ——— اگر میں گھر سے دفع ہو گیا! ———"

" کون لوگ —؟ —" ناہید حیرت سے پوچھتی۔

" ہیں کچھ لوگ۔ جنھیں آپ نہیں جانتی! —"

" اور پھر انہوں نے رخت سفر باندھ ہی لیا۔"

" بیٹا —!۔ بالکل ہی بھول کے نہ بیٹھ جانا۔ دل پڑا رہے گا۔؟ امی نے کہا۔

یہاں یاد رکھنے کی چیز ہی کون سی ہے — امی —؟"

وہ بڑی زور سے ہنسے۔ اور یہ ہنسی روبینہ کے دل میں چبھ گئی۔

اجنبیت کی دیوار اونچی ہوتی گئی! جس کے اس پار روبینہ کے خدوخال بھی انھیں دیکھنا گوارا نہ تھا! ——— روبینہ —— جسے دل کی تمام گہرائیوں سے چاہتے تھے —! اور اب جن کی محبتیں عمر کے لئے وقف ہو کر رہ گئیں تھیں۔ خاموش اضطراب سے ان کا انتظار کرتی۔ گرمجوشی سے خیر مقدم کرتی روبینہ ؟! جو عام لڑکیوں سے مختلف نہ تھی! ——— دلچسپی کسی سے محبت کسی اور سے۔ اور شادی کسی تیسرے شخص سے ——!!

اور ایک دن تو قیامت ہی آ گئی جب ڈاکٹر مظہر نے عشرت کے لئے اپنا پیغام بھیج دیا؟ ——— روبینہ اور مظہر ——؟"

دو متبسم چہرے سیاہ بادل کی طرح بڑھتے اور گھپ اندھیرے میں کھو جاتے —!

روبینہ نے انکار نہیں کیا ——— اس کی علی مراد

بدی ہوتی ہوگی ——— اگر اسے محسن سے سچی پیار بھی محبت ہوتی تب ——— وہ محسن ہی سے کہہ سکتی تھی ! —

نفرت اور حقارت کے ملے جلے جذبات نے انھیں بالکل ہی بدل دیا تھا ——— نہ کسی سے ملے نہ کسی کو اپنے جانے کی اطلاع دی ——— چوکیدار نے اطلاع پہونچائی تھی چھوٹے صاحب چلے گئے!

گھر کا ماحول اسے پھاڑ کھانے کو دوڑتا ——— زندگی سے نفرت ہو کر رہ گئی ۔ مگر وہ خود کو گھسیٹے ہی گئی — کسی کے ٹکڑوں پر آنا پسند نہ تھا —! وہ اتنی تو نہیں گری کہ ——— محبت اور رحم کی بھیک ہرگز نہ مانگے گی ۔ چاہے جیتے جی موت کو گلے لگانا پڑے ——— ! ۔ امی کا حکم ان کی پسند اس کے لئے ناقابلِ ترمیم تھی ۔! ۔ جو کچھ کہا اس پر چپ چاپ سر جھکا دیا —

سہ پہر ٹھنڈی سی تھی ! ابھی ابھی عشرت اٹھ کر اندر چلی گئی تھی اس کے جاتے ہی باغ کے گیٹ پر ایک کار رکی ۔ اور مظہر اترے روبینہ کسی خیال میں گم اتنی ڈوبی ہوئی تھی کہ اس نے نہ کار کی آواز سنی نہ ان کی آہٹیں ۔ سبزے پر دبے قدموں چلتے وہ پاس آ گئے !

روبینہ گھٹنے تنے سے پشت ٹیکے ہاتھوں کے ہالے میں کسی کی تصویر لئے دیکھ رہی تھی !

مظہر جھکے اور دوسرے ہی لمحے یوں سیدھے کھڑے ہوئے جیسے جھٹکا لگا ہو ۔

محسن کی تصویر — ؟

اور اسی شام انھیں اپنے پیغام کا جواب ملا ——— شادی کی تاریخ تک طے کر دی گئی تھی !

یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا ! ——— کسی خیال سے ان کا چہرہ تمتما سا اٹھا ! — ہندوستانی لڑکی ۔ اتنی ہی بے بس ہوتی ہے نہ صرف اس کے جسم پر بلکہ روح پر بھی پہرے بٹھائے جاتے ہیں ۔ مگر وہ اف نہیں کر سکتی ! —

دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے ہارون کے خط کے پرزے کر کے ہوا کے دوش پر پھینک دیئے ! روبینہ نے ان سے ملنا جلنا بند کر دیا تھا ! اب اس کا کام ہی کیا تھا ۔ کبھی ناہید سے ادھر ادھر کی بکواس کر دی

کبھی عشرت نے کچھ پوچھا تو جواب دے دیا ۔ مشہدی کی دلچسپ حرکتیں بھی اسے بے جان لگتیں ۔!

"آپ ہر وقت مراقبہ میں رہتی ہیں آپا —"! وہ شاکی تھا !

ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر لبوں پر بکھرنے لگتی !

اپنے مقام کو دیکھ کر پہچانتی تھی ——— لاوارث ——— بے سہارا اور ٹھکرائی ہوئی روح ۔ ! ویسے امی نے شادی کے ساز و سامان میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی ! روبینہ یہ نہ سوچے بن ماں باپ کی لڑکی کے ساتھ امی نے عشرت کی برابری نہیں برتی ! —

وہ بھی سب کچھ دیکھ رہی تھی ۔ جیسے کسی لاش کو آنکھیں مل گئی ہوں ۔ جو اپنی ہی تجہیز و تکفین کا سارا انتظام دیکھے ۔ جسے بولنے کی طاقت نہ ہو — !

اچانک بے سان و گمان ——— صرف ایک دن قبل محسن بھی آ گئے ۔!

"مبارک ہو !" سنجانے کس سے کہہ کر ایک قہقہہ لگایا ——— "امی ۔ آپ تو شاید عشرت کی شادی بھی اس طرح نہ کرتیں جیسے ——— !"

"چپ رہو ۔ !" ہارون نے ناخوشگوار لہجے میں کہا —!!

کیا وہ عشرت سے کم ہے ؟! ۔

اور وہ گھومتے پھرتے وہ اس کے پاس آ کر رک گئے !

دیوار کے سہارے مسہری بچھی تھی ۔ زرد رنگ کے پلنگ بستر میں ایک زرد لنگن کی طرح وہ انھیں دکھائی دی ——— ان ڈور کھول کر وہ اندر آ گئے !

روبینہ کانپنے لگی تھی ۔

"آپ ۔ ۔ ۔ اب آئے ۔ ۔ ۔ ؟" وہ سر دبا گئی ! ۔

"جی ہاں" وہ مسکرائے ۔" میرا ارادہ تو آنے کا نہیں تھا مجھے تو ڈاکٹر صاحب نے تار دے کر بلایا ہے ۔

روبینہ کو ضبط دو بھر ہو گیا ۔

"آپ نے مجھے کس خطا کی سزا دی ہے ۔ مجھے بتا دیجئے پھر میں اس سزا کو بھی ہنستے ہنستے جھیل لوں گی !"

سزا ـ" انھوں نے جلا جھلسا قہقہہ لگایا ۔" یہ تو بڑا ہے۔ محترمہ روبینہ ۔ محبت کبھی اتنی آسانی سے نہیں پنپتی ۔ آپ خوش قسمت ہیں ۔ !"

اس کے آنسوؤں نے انھیں چراغ پا کر دیا ۔

" روبینہ ـــ یہ بہت حقیر اور شرمناک حربہ ہے ۔ میں تمہارے آنسوؤں سے پگھل نہیں سکتا ! تم جانتی تھیں تمہاری محبت میری زندگی تھی ـــ کون سی ایسی مجبوری تھی ۔ جس نے تمہیں اظہار سے باز رکھا ـــ اپنی مرضی کو تم نے امی کی پسند کا نام دیا ہے ۔ یہ میں خوب جانتا ہوں ـــ !"

خدا کے لئے مجھے اتنا بڑا الزام نہ دیجئے ۔"

" تم نے میرا میرے جذبات کا مذاق اڑایا ہے ۔ میری آرزوئیں پامال کر دیں ۔ مجھے زندگی سے موت کی طرف پھیر دیا ۔ کہدو کہ میں غلط کہہ رہا ہوں ـــ میں تو خود ہی تمہارے راستے سے ہٹ گیا تھا!"

جی ـــ؟ ۔ وہ رونا بھول کر ان کا منہ تکنے لگی ۔ محسن کا دل دھڑکنے لگا ـــ اب بھی کتنی پیاری لگ رہی ہے سوجھی ہوئی آنکھیں کپکپاتے ہوئے لب ۔ سرخ و سفید چہرے پر کالی گھٹاؤں کے سے بال ـــ انھوں نے اس کی طرف سے چہرہ پھیر لیا ـــ

" میں نے خود دیکھا تھا ـــ روبینہ ـــ مظہر صاحب کی پذیرائی تمہاری اصلی مسرت تھی ۔ اُن کی آمد پر تمہارا چہرہ پھول کی طرح تروتازہ ہو جاتا تھا ۔ اُن کی محبت میں تم نے میرے خلوص کو بھی فراموش کر دیا ۔ کہدو کہ یہ بھی غلط ہے ۔ !"

" غلط ہی تو ہے ۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی !" آپ یقین نہیں کریں گے ۔ کوئی یقین نہیں کرے گا ۔ ڈاکٹر صاحب سے مجھے اس لئے انس تھا کہ ۔ وہ میرے مکان کے باسی ہیں ۔ اس فرش پر ان کے قدم بھی پڑتے ہیں ۔ جہاں ایک وقت میرے ماں باپ بھی چل پھر چکے ہیں ۔ اُن کے لباس سے مجھے اپنے در و دیوار کی مہک آتی ہے ان کے چہرے میں مجھے اپنے بچھڑے ہوئے مانوس چہرے نظر آتے تھے وہ ۔ اس دیار سے آتے ہیں ۔ جو میرے لئے اجڑ چکا ۔ اپنی امی کی قسم ۔ پاپا کی قسم ۔ میں نے اس کے سوا کچھ اور نہیں سوچا ۔ !"

روبینہ ـــ ! محسن کا چہرہ پھٹے ہوئے کپڑے کی طرح بے رونق ہونے لگا !

" آپ کی محبت پر میرا ایمان تھا ۔ مگر آپ نے کبھی نہیں پوچھا ـــ روبی ... !" جب جیتے جی زندگی رخصت ہو جائے تو کیا ہوتا ہے ۔ آپ نے اپنوں کو ٹھکرا دیا ـــ انہوں نے ٹھکرائے ہوئے کو اپنا لیا ـــ اب آپ مجھ سے ۔ عہد شکنی کا شکوہ کیوں کر رہے ہیں؟"

روبی .... محسن سر تھام کر بیٹھ گئے !" یہ غلط فہمی مجھے بہت بھیانک سزا دے گی ۔ روبی یقین کرو نہ کرو مگر میں اتنا تمہیں بتا دوں ۔ اپنی حماقتوں کی سزائیں میں نے بہت بھگتی ہیں ۔! تم سے دور رہ کر میں ایک پل کے لئے بھی قرار نہ پا سکا ۔ ساری ساری رات جاگتا رہا ۔ روتا رہا ۔ روبی ۔ تم مجھے ہمیشہ یاد آتی رہی ہو ۔ سوچتا رہتا ہوں ۔ میری روبینہ تو ایسی نہ تھیں ۔ پھر اسے کیا ہو گیا تھا ۔ کاش! میں تم سے کہہ سکتا ! ـــ روبینہ ۔ اب کیا ہوگا؟ ـــ میں زندہ نہیں رہوں گا ۔ ـــ !"

اچانک شہدی اندر آیا ۔

" ارے چھوٹے بھیا ۔ آپ یہاں ہیں ـــ بھائی جان نے تلاش گمشدہ کا اشتہار دے دیا ہے " !

محسن کو طوعاً و کرہاً جانا پڑا ۔

اور وہ مردوں سے بدتر بستر پر گر پڑی ـــ موت مانگنے سے نہ آئی ـــ زندگی کھیلنے لگی ! کچھ ہوش نہ رہا تھا ۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے ـــ ! بھابی سرہانے بیٹھی پسینے میں بھیگے بال سنوارتی رہیں

محسن سے ضبط محال تھا ـــ کیا ان کی آنکھوں کے سامنے روبینہ دوسروں کی ہو جائے گی ـــ اس کا زندہ جنازہ کل اٹھ جائے گا ۔ ـــ !

خدا کی پناہ انہوں نے دہکتی ہوئی کنپٹیاں جکڑ لیں ـــ اب کچھ کہنے سننے کا وقت ہی نہ رہا تھا ! ـــ ساری رات وہ ٹہلتے رہے ۔ سوچتے رہے ! ـــ پتہ ہی نہ چلا ۔ کب رات گزری کب دن نکلا ـــ دن بھر عورتیں روبینہ کے کمرے میں گھسی رہیں ! اس سے ملنے کا موقع نہ مل سکا اور اب مل کر کرتے بھی کیا ۔؟

"ہائے! وہ گھڑیاں بھی گذر ہی گئیں؟ ـــ اور شہدی نے
کمرے میں جھانکا ـ!
"چھوٹے بھیا ـ آئیے ـ بارات آ گئی ـ بھائی جان بلا رہے
ہیں ـــ! ـ"
"بارات آ گئی ہے ـ!" وہ دل تھام کر دیوار سے لگ گئے!
"آؤ ـ محسن نے! سب آ چکے ہیں ـ تم کیا کر رہے ہو؟ ـــ
اب کی انسان اندر آئے؟ ـ"
"آ رہا ہوں ـ بھائی جان! ـ"
مظہر ان سے بڑی محبت سے ملے ـ ان کے ہونٹوں پر
ایک عجیب و غریب مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی ـ جس میں استہزا و
تفاخر ـــ تلاش کرنے پر بھی سادگی اور معصومیت کے سوا
کچھ بھی نہ تھا ـ
محسن کا چہرہ زرد تھا ـ آنکھوں کے اطراف سیاہی مائل حلقے
پڑ گئے تھے ـ رہ رہ کر پپڑی بندھے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر
رہے تھے ـ! ـ
انہوں نے صوفوں کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں
بند کر لیں! ـ
وہاں سب ہی اونچی آواز میں بول رہے تھے ـ ہنس رہے
تھے ـ وہ ابھی ابھی ان کے سامنے ہمیشہ کے لئے دوسرے گھر چلی جائے
گی! ـــ پھر ان کی زندگی میں باقی کیا بچے گا؟!
انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ جکڑ لئے ـ
پھر وہاں نکاح کی تقریب کا شور گونجنے لگا "
ڈاکٹر مظہر
جی نہیں ـــ" اچانک ـ محفل میں بم پھٹ گیا ـــ ڈاکٹر
مظہر ہنستے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے ـ
نکاح میرا نہیں ـــ بیرسٹر محسن کا ہوگا؟
ان کے اشارے کی مناسبت میں دو جنوں حیران آنکھیں
محسن کی طرف اٹھ گئیں! ـ
"آج کی بارات کا دولہا میں نہیں ـ محسن ہے!
محسن کے دل کی حرکت رکنے لگی ـ!
مظہر نے ان کا ہاتھ پکڑ کر مسند پر بٹھا دیا ـ اپنے گلے سے
پھول کے ہار اتار کر انہیں پہنا دیئے ـ اپنے ہاتھ سے سر پر سہرا باندھا
"ڈاکٹر صاحب ـ!" محسن نے کچھ کہنا چاہا ـ
"مجھے خوشی ہے میرے دوست! ـــ" وہ مسکرا کر وہاں
سے ہٹ گئے ـ!
اور دم بھر میں محسن کا نکاح روبینہ سے ہو گیا ـــ اور
پھر جب دلہا دلہن پھولوں سے ڈھکے ڈاکٹر مظہر سے ملنے آئے تو
انہوں نے چپکے سے روبینہ کے حنائی ہاتھ میں اپنا تحفہ دے دیا!
"بہن تمہاری کوٹھی تمہیں مبارک ہو ـ یہ میرا ناچیز
تحفہ ہے ـ! خدا تمہیں اور محسن صاحب کو ابدالآباد تک اپنے
مکان میں رہنا بسنا نصیب کرے ـ کیا ایک بھائی اتنا بھی نہ کرتا!
پھر ان کے دو گرم گرم آنسو روبینہ کے سر پر گرے ـــ
آنسو ـ جو قطرہ بھی ہیں اور موتی بھی!!!
●●

مسیح الزماں امروہوی

روپ بہروپ

بیٹھے بیٹھے ابھی چند ہی منٹ گزر پائے تھے کہ اچانک جب سر اٹھایا تو میری نظر ایک شخص کی طرف منعطف ہوئی جسے دیکھ کر پل بھر کے لئے تو مجھے قطعی یقین نہیں آیا۔ مگر جب میں نے غور سے اسے دیکھا تو نقوش کچھ جانے پہچانے محسوس ہوئے۔ شاید میں نے اسے کہیں دیکھا تھا۔ لیکن کہاں؟ کب؟۔ ذرا ذہن پر زور دیا تو دماغ میں ایک برق سی کوندی۔ ایک شعلہ سا لپکا۔ اور میں اسی پل تعجب و حیرت کے باعث ساکت و جامد ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ وہ حقیقت ہے۔ سچ ہے میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا سا لگا۔

• لوگ ہمیشہ ظاہری شان سے مرعوب ہوا کرتے ہیں مگر میں ایک بھکاری سے مرعوب ہو رہا تھا۔ حالانکہ اس کی شکل انتہائی کریہہ تھی مگر اس میں اس کا کیا قصور؟ یقیناً اس میں بھی ہم جیسی روح تھی۔ اور ہماری طرح اس کے دل میں بھی ارمان اور تمنائیں جنم لیتی ہوں گی۔

نجانے کتنی دیر میں اس کیفیت میں مبتلا رہتا۔ اگر قریب بیٹھی ہوئی باجی نے میری اس حیرت کی وجہ نہ پوچھی ہوتی۔ زبان سے تو میں کچھ نہ کہہ سکا جیسے میری قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ بس انگلی سے اس شخص کی طرف اشارہ کر دیا۔ پہلے پہل تو وہ اسے پہچان نہ سکیں لیکن اسے غور سے دیکھنے کے چند ثانئے بعد ان کی کیفیت بھی مجھ سے جدا نہ تھی۔ اسی پل ان کے چہرے کے زاویئے بدل گئے تھے۔ اب وہ ٹکٹکی باندھے اس شخص کی طرف دیکھے جا رہی تھیں چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔ اور پھر انہوں نے اپنی بے یقینی دور کرنے کے لئے اپنی آنکھوں کو غیر اختیاری طور پر کئی دفعہ مل کر دیکھا۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔ اور ایک ٹھوس حقیقت۔ بلاشبہ یہ وہی شخص تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش میرے ذہن سے ہٹ سے گئے تھے۔ اور کیسے نہ ہٹتے؟ چند روز پہلے ہی کا تو واقعہ تھا۔ اور جس طرح پیش آیا تھا۔

دو مہینے پہلے میں عالیہ آپا کی شادی میں شرکت کے بعد گھر اور باجی کو لئے واپس آ رہا تھا۔ ہم تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں بیٹھے تھے۔ اور گاڑی اس وقت ایک معمولی سے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ کمپارٹمنٹ میں خلاف توقع زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ تھی ہمارے علاوہ بس دو مسافر اور تھے ایک ادھیڑ عمر کا بیوپاری اور دوسرا اس کا چھوٹا بیٹا تھا۔

گاڑی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ باجی ایک گھریلو قسم کے رسالہ میں کھوئی ہوئی تھیں اور میں ایک مشہور ادیب کا نیا ناول پڑھ رہا تھا۔ دفعتاً ٹرین نے سیٹی دی۔ اور پھر حرکت میں آگئی۔ اس سے پہلے کہ ٹرین اسٹیشن کو چھوڑے۔ یکایک ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور کمپارٹمنٹ میں گھس آیا۔ چند سکنڈ وہ دروازے میں کھڑا اپنی بکھری سانسوں کو سمیٹتا رہا پھر اندر آکر فرش پر بیٹھ گیا اور میری نگاہیں بے اختیار اس کی طرف مرکوز ہوگئیں۔

عجیب حلیہ تھا اس کا — !

بڑے بڑے بال گرد سے اٹے اور الجھے ہوئے۔ آنکھوں میں کیچڑ سی بھری ہوئی۔ شیو کئی ہفتوں سے نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ صحت کافی اچھی تھی۔ اسی اعتبار سے چہرہ بھی مناسب تھا۔ لیکن گال کسی قدر اندر کو پچکے ہوئے تھے۔ منہ کچھ ٹیڑھا تھا۔ جو اس کی بھاری بھرکم جسامت پر بڑا بے ڈھنگا لگ رہا تھا۔ ہونٹوں کے گوشوں سے بچوں کی طرح رال بہہ رہی تھی جس کو وہ بار بار اپنے بازو سے صاف کر لیتا تھا۔ ناک بھی قدرے پچکی ہوئی تھی جیسے اس کا بانسہ ٹوٹ گیا ہو قد لمبا تھا۔ ایک بازو کا رخ پشت کی طرف تھا۔ اور خمیدہ ہونے کی وجہ سے دوسرے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے تھے۔ ایک میلی سی بنیان تھی جو برائے نام کوٹ اور پھٹے کرتے سے صاف جھانک رہی تھی اس پر ایک پھٹا اور سیکڑوں پیوند لگا کرتا تھا۔ جو گھٹنوں تک لٹک رہا تھا۔ اور اس کے اوپر خاکی زین کا کوٹ۔ جس کی سب جیبیں ادھڑی ہوئی تھیں۔ اور جابجا داغ پڑے ہوئے تھے۔ گردن پر ایک بوسیدہ چادر لپٹی ہوئی تھی۔ جس کی حالت ان سب سے بدتر تھی اور جو مفلر کا کام کر رہی تھی۔ جو نیکر وہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کا رنگ نہ معلوم کب کا اپنی اصلیت کھو چکا تھا۔ اور ٹانگیں منجمد کر دینے والی سردی کے باعث ہلکے ہلکے کپکپا رہی تھیں۔ سارے بال سردی سے کھڑے ہوگئے تھے پیروں میں ٹوٹے پھوٹے سلیپر تھے جو شاید کچرہ گھر سے اٹھا لائے گئے تھے۔ وہ ایک بھکاری تھا۔ افلاس کی مکمل تصویر۔

مجھے اس کی حالت پر ترس آیا اور بے اختیار بول اٹھا۔ "نیچے کیوں بیٹھے ہو؟ اوپر بیٹھ جاؤ" میرے دل میں انسانی ہمدردی کا جذبہ عود آیا تھا۔

چند ثانیے گھور کر اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ پھر خالی برتھ پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اور ننگی ٹانگیں گردن پر لپٹی چادر سے ڈھانپ لیں۔

اب میں نے ناول بند کر کے میز پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی باجی نے بھی رسالے سے نگاہیں ہٹا کر میری طرح اس پر جمادی تھیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سی قوت تھی جو اس کی طرف دیکھنے پر مجھے مجبور کر رہی تھی۔ گاڑی تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ اکڑوں بیٹھے ہوئے اسے نصف گھنٹے سے زائد گزر چکا تھا۔

اب وہ دھیرے دھیرے کچھ گنگنا رہا تھا۔ لیکن کوئی لفظ میری سمجھ میں نہ آیا۔ ساکن فضا میں اس کے گنگنانے اور ریل کی آواز ابھر رہی تھی —

"کیا — آپ میری کچھ مدد کریں گے؟" مکمل خاموشی میں ڈوبے ماحول میں اچانک بھکاری کی اونچی آواز ابھری۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ وہ بیوپاری سے مخاطب تھا۔

بیوپاری نے ایک نظر اس کے کپکپاتے جسم پر ڈالی اور دوسری نظر اپنی بیوی پر۔ جیسے اس کی خودمختاری کے تمام حقوق بیوی کے ہی نام محفوظ تھے۔ اور وہ اس کی اجازت کے بغیر ایک پیسہ بھی فقیر کو نہ دے سکتا تھا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے اپنا پرس نکالا۔ وہ کافی پھولا ہوا تھا۔ یقیناً اس میں کافی رقم تھی۔ اس نے اسے کھولا۔ میں نے صاف دیکھا۔ اس میں دس دس کے علاوہ سو سو کے بھی کئی نوٹ تھے۔ بیوپاری نے اس حصہ کو نظرانداز کر کے برابر کی جیب میں سے جس میں ریزگاری تھی کافی دیر بعد کچھ نکالا۔ اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ ایک پیسہ تھا — ایک دم بھکاری کے چہرے پر بڑے تلخ اور حقارت بھرے اثرات ابھرے اور اس نے وہ پیسہ کھڑکی کھول کر باہر پھینک دیا۔ میں بڑی زور سے چونکا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی انہونی بات سامنے آگئی ہو۔ چونکا تو میں اس کے مانگنے کے انداز پر بھی تھا۔ جو عام بھکاریوں سے قطعی مختلف تھا۔ اس کے مانگنے میں بھی ایک شان تھی۔ ایک منفرد انداز تھا۔ بھکاری کی اس حرکت سے بیوپاری کی پیشانی

پر سلوٹوں کا ایک جال سا ابھر آیا۔ یقیناً بھکاری کی یہ حرکت اسے سخت ناگوار گذری تھی۔ اور اس کی بیوی تو اس توہین پر اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھور رہی تھی

دفعتاً بھکاری نے اپنی قمیض کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک روپیہ کا مڑا تڑا نوٹ تھا۔ اس نے اسے بیوپاری کی طرف بڑھا دیا۔ اور تیکھے طنزیہ لہجہ میں بولا۔

" آپ امیروں سے تو میرا دل بڑا ہے۔ لیجئے یہ ایک روپیہ رکھ لیجئے۔ سمجھ لیجئے گا۔ ایک پیسہ خرچ کیا تھا۔ ننانوے کا نفع ہو گیا "

اس زہر میں ڈوبے طنز پر بیوپاری کے چہرے پر بیک وقت کئی رنگ ابھرے۔ ان میں غصہ تھا۔ خجالت تھی۔ اور جھنجھلاہٹ ــ اس نے اپنا رخ بدل لیا۔ اس کی بیوی نے اس کا ساتھ دیا۔ مگر وہ دل کی آگ بجھاتے بغیر نہ رہ سکی۔ جو بھکاری کی اس حرکت پر سلگ اٹھی تھی ۔

" کرر تو محنت سے پیسے کی ہووے ہے ۔ مُفت کے مال کی کیا پروا ــ ایک پیسہ نہ ہووے تو ریل کا ٹکس نہ ملے ہنڈیا پھیکی پڑی رہے ہنہ ۔ بھیک منگے نہ ہو کے ۔ کہیں کے راجہ ! "

اس کا جواب بھکاری نے صرف ایک پھیکی اور تلخ مسکراہٹ سے دیا ۔ جو مجھے بڑی بھیانک لگی ۔

نوٹ جیب میں رکھ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ۔ " میرا فقرہ آپ سن ہی چکے ہیں ۔ میرا خیال ہے اب اسے دہرانے کی ضرورت نہیں !

میں نے ایک دم ہڑبڑا کر کہا ۔ جی . . . ہاں . . . نہیں . . .

اور جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا ۔ باہر آیا تو اس میں ایک نوٹ دبا ہوا تھا ۔ میں نے نوٹ کی طرف دیکھے بغیر فوراً اس کی طرف بڑھا دیا تب ہی باجی نے میرے پہلو میں ٹہوکا دیا ۔ میں چونکا ۔ دیکھا ۔ میرے ہاتھ میں پانچ روپیہ کا نوٹ تھا ــ عموماً عورتیں کنجوس ہوتی ہیں ۔ اور یہ ایک بہت بڑی رقم تھی ۔ لیکن اس نے باجی کی یہ حرکت دیکھ لی ۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔ اور بولا ۔

" بہن جی کو شاید اتنے زیادہ روپیوں سے میری مدد کرنا گوارا نہیں ــ کوئی بات نہیں ، کسی کا دل میری مدد کرتے ہوئے دکھے ۔ یہ
اشتہار

میں پسند نہیں کرتا ۔ آپ نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیں "

اس کی گرفت پر باجی ایک دم شرمندہ ہو گئیں ۔ اور اس احساس کو مٹانے کے لئے بولیں ۔

میری اس حرکت کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا ۔ میرے خیال میں اس وقت تمہیں روپیہ سے زیادہ کپڑے کی ضرورت ہے ۔ لہٰذا میں روپیہ کی بجائے کپڑا دینا چاہتی تھی ۔ "

" اوہ ــ " اب بھکاری کے شرمندہ ہونے کی باری تھی ۔

" یہ لو ــ " باجی نے ایک گرم چادر نکالی ۔ جس کی قیمت پچیس تیس روپیہ سے ہرگز کم نہ تھی ۔ اور فوراً بھکاری کی طرف بڑھا دی اب میرے چونکنے کی باری تھی ۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اب باجی اپنی بات کو نبھا رہی ہیں ــ حقیقت تو یہ تھی کہ ہم اس کے انداز گفتگو سے اس حد تک مرعوب اور متاثر ہو گئے تھے ۔ گویا فقیر ہم تھے ۔ اور وہ ہم ــ میرا ذہن برابر اسی کے بارے میں سوچے جا رہا تھا ۔ میرا خیال تھا کہ کبھی وہ فرد ایک اہم شخصیت رہا ہو گا ۔ مگر وقت اور حالات نے اس کی یہ درگت بنا دی ہے ۔ گو حالت گر گئی تھی ۔ بدل گئی تھی تاہم بول چال کا رنگ وہی تھا ۔

" نہیں ــ یہ میں ہرگز نہیں لوں گا ۔ میرے مانگنے کے معیار کا درجہ اتنا بلند نہیں ۔ دوسرے ان کپڑوں پر یہ اچھا بھی نہ لگے گا ۔ اگر میں نے اسے استعمال کیا ۔ تو شاید بھیک سے بھی محروم ہو جاؤں گا " اس نے انکار کرتے ہوئے حقیقت بیانی سے کام لیا ۔

" تم اسے فروخت کر دینا " جوابی طور پر باجی کی سمجھ میں یہی بات آ سکی ۔ میں جانتا تھا ۔ کہ اب اپنی عادت کے مطابق باجی اسے ہرگز واپس نہیں لیں گی ۔

" آپ اسے استعمال میں رکھ کر زیادہ فائدہ اٹھا سکتی ہیں بیچوں گا تو اس کی آدھی قیمت بھی نہیں ملے گی " بھکاری جیسے بحث کرنے پر تلا ہوا تھا ۔ مگر باجی نے وہ قیمتی چادر بحث کرکے اسے دے ہی دی ۔ اب وہ میرا پانچ کا نوٹ لینے سے انکار کر رہا تھا

" دیکھو بھائی ــ میرا اصول ہے کہ جس نیت سے روپیہ نکالتا ہوں ۔ اسے اسی کے لئے استعمال کرتا ہوں ۔ یہ تمہارا مسئلہ

لگا تھا اب اسے بھی لوٹ سے میری عادت بھی باجی سے مختلف نہ تھی۔
اب انکار کی گنجائش نہیں رہی تھی اور بھکاری نے شکریہ ادا کر کے نوٹ اور چادر لے لی۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ پھر ہم میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ باجی پھر رسالے کے مطالعہ میں غرق ہو گئیں۔ میں ناول پڑھنے لگا۔ اور گڈو اوپر برتھ پر سو رہا تھا۔ بھکاری نے چادر سے سارے جسم کو لپیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ جس سے اس کا کانپنا بڑی حد تک ختم ہو گیا تھا۔ باجی نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ بھکاری کو اس حالت میں دیکھ کر ان کے چہرے پر طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔

بیوپاری اور اس کی بیوی اس طرف سے رخ پھیرے باتوں میں مشغول تھے۔

کئی اسٹیشن آئے اور گذر گئے۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ گہری خاموشی کا تسلط رہا۔ نہ کوئی اترا۔ نہ کوئی سوار ہوا۔ بھکاری بھی سیٹ پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔ اب مجھے بھوک محسوس ہونے لگی۔ میں نے ناول بند کر کے باجی کی طرف دیکھا وہ بدستور رسالے میں کھوئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں گڈو جو سو کر اٹھ گیا تھا۔ بولا۔

"باجی۔ بھوک لگی ہے!"

"اوہ۔ اچھا۔" باجی نے فوراً رسالہ بند کر دیا۔ اور کھڑے ہو کر گڈو کو برتھ سے اتارا۔ اس اثنا میں میں ناشتہ دان کھول چکا تھا اور کھانا نکال رہا تھا۔ کھانے میں کچھ زیادہ سامان نہ تھا۔ چھ پراٹھے تین انڈے۔ کچھ سبزی اور تھوڑا سا آلوؤں کا بھرتہ تھا جو ہم سب کے لئے کافی تھا۔ کھانا نکال کر میں نے دزدیدہ نگاہوں سے بھکاری کی طرف دیکھا وہ اب بھی اونگھ رہا تھا۔ اس کو اس حالت سے نکالنے کے لئے میں نے ناشتہ دان کی قلفیوں کو ایک دوسرے سے ٹکرایا۔ نتیجتاً اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ فوراً ہی باجی نے اٹھ پراٹھا ایک انڈا۔ اور تھوڑا سا بھرتہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایک لمحہ اس نے توقف کیا۔ پھر ممنون نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کو لے لیا۔ اور کھانے لگا۔ کھانے کے دوران میں برابر چور نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا

اور گڈو تو اسے گھورے جا رہا تھا۔ وہ ہماری ہی طرح کھا رہا تھا۔ اس کے کھانے کا انداز بھکاریوں سے قطعی مختلف تھا۔ کھانا ختم ہوا تو میں نے سگریٹ سلگایا۔ اور غیر ارادی طور پر لائٹر اور ایک سگریٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ جس کو اس نے متشکرانہ نگاہوں سے دیکھ کر اگلے ہی لمحے لے لیا۔

ویسے تو میں سگریٹ پی رہا تھا۔ لیکن ذہن برابر اسی منفرد بھکاری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس رنگ کا بھکاری میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا جس کے مانگنے میں بھی ایک شان تھی جیسے وہ بھیک لے کر بھیک دینے والے پر کوئی بڑا احسان کرتا ہو میں لاشعوری طور پر اس سے بے حد متاثر ہو گیا تھا لوگ ہمیشہ شخصیت اور ظاہری شان سے مرعوب ہوا کرتے ہیں۔ مگر میں ایک بھکاری سے مرعوب ہو رہا تھا۔ حالانکہ اس کی شکل انتہائی کریہہ تھی۔ مگر ساتھ ہی بیچارگی اور محرومیوں کے نقوش بھی نمایاں تھے۔ اور پھر اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ یقیناً اس میں بھی ہم جیسی روح تھی۔ ہماری طرح اس کے دل میں بھی ارمان اور تمنائیں جنم لیتی ہوں گی۔

میں برابر انھیں خیالوں میں الجھا رہا میری اس سوچ کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا۔ جب گاڑی یکلخت ٹھہر گئی۔ میں چونک پڑا۔ باہر دیکھا۔ یہی ہماری منزل تھی۔ میں گڈو کو گود میں لئے باجی کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ تب ہی بھکاری نے ہمیں سلام کیا۔ جب ہم پلیٹ فارم کو طے کر کے گیٹ کے قریب آتے تو اچانک باجی نے ناشتہ دان کی یاد دلائی جو میرے ہاتھ میں ہونا چاہئے تھا۔ یقیناً وہ کمپارٹمنٹ میں رہ گیا تھا۔ میں باجی اور گڈو کو ٹکٹ کلکٹر کے پاس چھوڑ کر تیزی سے کمپارٹمنٹ کی طرف دوڑا۔ گاڑی چلنے کے لئے سیٹی دے چکی تھی اپنے کمپارٹمنٹ کو پہچان کر میں فوراً اندر کی طرف دوڑا۔ ناشتہ دان بدستور موجود تھا۔ اسے اٹھا کر میں نے پلیٹ فارم پر آ کر اپنی سانس کو قابو میں کیا۔ لیکن تب ہی ایک آواز نے میری سانس کو وقتی طور سے منجمد کر دیا۔ آواز مانوس تھی۔ ایک دم پلٹ کر میں نے آواز والے شخص کو دیکھا۔ اور یوں اچھل پڑا جیسے رینگتے ہوئے کیچوے کو لکڑی سے چھو دیا گیا ہو۔ وہی بھکاری ایک بڈھے مرد سے گھگھیا گھگھیا کر

صغیر صدیقی　　پُراسرار کہانی

نوشتہ:- سی پولین

ترجمہ:- احمد صغیر صدیقی

ایویلین نے کہا ——

وہ عورت تو بس ان کتوں کے لئے وقف ہو کر رہ گئی ہے۔ انہیں روز سیر کرانے اور رات میں انہیں کھلانے کے علاوہ اب وہ کچھ اور نہیں کرتی۔

جس دن وہ کتے لائی تھی اس کے دوسرے دن اس نے بہت سے کپڑے دھوئے تھے۔ لیکن اس دن کے بعد سے اس نے پھر کسی کپڑے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

"کچھ نئی پڑوسن سے کچھ تعلقات پیدا ہوئے تمہارے کہ نہیں ——؟" ایڈ نے پوچھا ——

جواب میں ایویلین نے گود میں دھرے اون کے گولے کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔ بہت تھوڑے سے —— آج صبح کھانے کے بعد میں نے اس سے دو چار باتیں کی تھیں۔ میں اس وقت دراصل اپنے احاطے میں ٹہلنے نکل گئی تھی۔ اچھی خاصی سمجھدار عورت ہے پہلے شاید وہ لوگ کیلیفورنیا میں رہا کرتے تھے۔"

"اچھا —— تو تمہیں اپنی پڑوسن پسند آئی۔ کیوں؟ چلو اچھا ہے تمہارا جی اب تنہائی میں گھبرانے کا نہیں کم از کم۔"

"مگر میرا اس سے ملنا ہی کب ہوتا ہے۔ میری اس کی ملاقات بس اسی وقت ہوتی ہے جب وہ کپڑے سکھانے کے لئے باہر احاطے میں آتی ہے اور بس۔"

"ہوں؟"

"اور میرا تو خیال ہے کہ وہ کپڑوں کو الگنی پر ڈالتے وقت یقیناً جھلائی ہوئی ہوتی ہے میں نے کپڑوں کو سکھاتے وقت اس کے چہرے پر جھلاہٹ کے سائے دیکھے ہیں۔"

"تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟"

"سیدھی سی بات ہے۔ آدمی کے چہرے سے اس کے باطن کا اندازہ کر لینا کچھ مشکل تو نہیں۔ پھر قمیصیں بھی اس کے ہاں ڈھیر ساری ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے اس کا شوہر شاید بہت زیادہ صفائی پسند واقع ہوا ہے۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔" اس کے شوہر ایڈ نے اپنے سامنے اخبار کھول کر کرسی پر ٹانگیں سمیٹ لیں۔ ایویلین نے بُنائی شروع کرتے ہوئے سوچا۔ وہ ضرور کپڑوں کو دھو دھو کر تنگ ہو چکی ہے۔ پھر یہی نہیں اسے اِستری بھی کرنی پڑتی ہوگی —— میرے خدا وہ یقیناً اِس کام سے بُری طرح عاجز ہوگی۔

"اس نے تمہیں بتلایا نہیں کہ اس کا شوہر کیا کام کرتا ہے۔" اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے ایڈ نے پھر پوچھا۔

"وہ کوئی سیلزمین ہے —— چاقو، چھری کانٹوں وغیرہ کا۔"

"او ہو تو یہ بات ہے۔ سیلزمینوں کو صاف ستھرا رہنا ہی پڑتا ہے۔"

"ممکن ہے۔" ایویلین نے بُنے جانے والے سوئٹر پر نظریں جما دیں۔ جس کا صرف تھوڑا سا حصّہ تیار ہوا تھا۔ بھورے رنگ کا یہ سوئٹر ایویلین کو اچھا نہیں لگا۔ "ٹھیک ہے۔" میں اس میں خانے ڈال دوں گی۔ سُرخ سُرخ دھاریاں۔

"آپ نے کبھی اسے دیکھا ہے۔ میرا مطلب اس کے شوہر سے ہے؟" خیالوں سے

چونکتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ اتفاق نہیں ہوا" اس نے عینک اتار کر اس کا شیشہ صاف کیا۔ پھر اسے ناک پر جماتے ہوئے بولا۔

"تم نے تو دیکھا ہوگا؟"

"ہاں صبح صبح وہ بھی آپ ہی کی طرح باہر چلا جاتا ہے۔ اس کی کار ادھر ہی کھڑی ہوتی ہے جدھر ہمارا باورچی خانہ ہے۔ باورچی خانہ کی کھڑکی سے وہ کار صاف نظر آتی ہے۔"

"کیسا آدمی ہے؟" ایڈ نے اخبار کی ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔

"لمبا اور دبلا سا آدمی ہے۔ پتلے پتلے ہونٹ ہیں۔ زیادہ تر بھورے رنگ کا سوٹ پہنتا ہے۔ مجھے تو اس کپڑوں میں نہ جانے کیوں وہ کسی بھورے سانپ کی مانند نظر آتا ہے۔"

"چپ رہو" ایڈ نے ناگواری محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری عادت فضول رائے زنی کی ہے۔ اس سے گریز کیا کرو۔"

"بہتر ہے۔" وہ اون کے گولے اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں سونے جا رہی ہوں۔"

پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے خواب گاہ میں چلی گئی۔ وہاں کچھ دیر وہ اس کھڑکی کے سامنے کھڑی رہی جس سے اسے اپنی نئی پڑوسن کے مکان کا دروازہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ دروازہ سے روشنی چھن رہی تھی۔ گہرے رنگ کی سرخ روشنی۔

ہر روز اپنے باورچی خانہ کی کھڑکی سے ایولین اس سیلز مین کو جاتے ہوئے دیکھتی۔ ہر روز صبح دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ وہ اپنے صاف ستھرے بے داغ لباس میں نمودار ہوتا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا اٹیچی کیس ہوتا۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی کار میں جا بیٹھتا۔ چند ہی لمحوں بعد کار چل پڑتی اور وہ پارکنگ شیڈ یوں سنسان ہو جاتا جیسے وہاں کوئی کار کبھی کھڑی ہی نہیں ہوتی تھی۔

ایولین کے لئے اب اس کی نئی پڑوسن بھی کچھ زیادہ اجنبی نہیں رہی تھی۔ وہ اسے احاطہ میں آتے ہوئے اکثر دیکھتی۔ اس کی تنی ہوئی بھنویں۔ کپڑوں کو الگنی پر ڈالتے وقت اس کا جھنجھلایا ہوا انداز۔ اس کی تیز اور بپھری ہوئی چال۔ اس عورت کی غرضکہ بہت سی باتیں اب ایولین کے لئے نئی نہیں رہی تھیں۔ وہ اکثر اسے احاطے میں کپڑے سکھاتے وقت بڑبڑاتے ہوئے بھی سنتی۔ ایسی بڑبڑاہٹ جیسے کہ وہ خود سے مخاطب ہو۔ یہی نہیں اکثر راتوں میں اس نے اپنی پڑوسن کے مکان سے آنے والی عجیب سی آوازیں بھی سنی تھیں۔ ایسی آوازیں جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ یا بڑبڑا رہا ہو۔ ایولین کے دماغ میں کھٹکے کے لئے بہت سی باتیں گھومتی تھیں لیکن اس نے اپنے شوہر کو کچھ نہیں بتایا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں ایڈ برا نہ مانے۔

پھر ایک دن اسے اپنے شوہر ایڈ سے باتیں کرنی ہی پڑیں۔ پچھلے دو دنوں سے اس کے پڑوسی کی کار گیراج ہی میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے جب یہ بات ایڈ سے کہی تو اس نے حسب دستور اپنا اخبار نیچے جھکاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یقیناً بیمار ہو گیا ہوگا۔"

"ممکن ہے۔ مگر پھر اس کی بیوی بھی تو باہر نہیں دکھائی دے رہی ہے۔"

"ممکن ہے وہ دونوں ہی بیمار ہو گئے ہوں۔ ہو سکے تو تم جا کر دیکھ آؤ۔"

"نا۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟ یہ ایک اچھی بات ہے۔"

"نہ جانے وہ کیسے مجھے۔ میں نہیں جاتی۔"

پھر ایک دن اور گزر گیا۔ کار بدستور گیراج ہی میں دکھائی دے رہی تھی۔ ایولین کو وہ عورت بھی نہیں دکھائی دی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ گھر خالی پڑا ہو۔ مگر دوسرے دن اچانک وہ پھر احاطہ میں نمودار ہوئی اس بار بھی وہ کپڑے ہی سکھانے نکلی تھی۔ لیکن ایولین نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی۔ اسے کی اس عورت کے چہرے پر بڑا سکون نمایاں تھا۔

یہی نہیں وہ جس انداز میں کپڑوں کو الگنی پر ڈال رہی تھی اس سے بھی طمانیت عیاں تھی۔

آگے بڑھ کر ایولین اس جنگلے کے قریب جا کھڑی ہوئی جو احاطے کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا تھا۔

"اسے مخاطب کرتے ہوئے ایولین نے پوچھا۔" کیا بات ہے بہن۔ میں کئی دن سے تمہارے شوہر کی گاڑی گیراج ہی میں کھڑی دیکھ رہی ہوں۔"

جواب میں چند لمحوں تک وہ اسی طرح تکتی رہی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پھر چونکتے ہوئے بولی۔ "وہ...... وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔" رک کر اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔" وہ دراصل ٹرین سے چلے گئے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔" ایولین نے نرمی سے کہا۔ "ہم سمجھے تھے خدانخواستہ کچھ طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔"

"نہیں نہیں۔ وہ بیمار نہیں تھے۔"

یکایک وہ مڑ گئی۔ اور پھر چند لمحوں بعد اس کے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز ایولین کے کانوں سے ٹکرائی۔

"کمال ہے۔" ایولین نے سوچا اور شانے اچکائے۔

"ہمارا پڑوسی باہر گیا ہے دراصل"۔۔۔ اسی شام ایولین نے اپنے شوہر کو بتایا۔

"کیا تم گئی تھیں اس کے ہاں" ایڈ نے پوچھا۔

"نہیں۔ مگر میری اس کی بیوی سے بات چیت ہوئی تھی۔" ایولین نے اپنی سلائیاں اور اون کا گولا سنبھالتے ہوئے کہا۔ "آج سہ پہر وہ کار میں کہیں گئی بھی تھی۔"

ایڈ نے پڑھتے پڑھتے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"جانتے ہو۔ وہ اپنے ساتھ واپسی پر دو کتے ۔۔۔ دو بڑے بڑے شکاری کتے بھی لائی ہے"۔۔۔ اس وقت وہ دونوں کتے باہر احاطے ہی میں بندھے ہوئے ہیں۔"

"ممکن ہے ۔۔۔ شوہر کی غیر موجودگی میں وہ حفاظت کے خیال سے کتوں کو لے آئی ہو۔"

"ممکن ہے۔ کتے کافی لاغر سے دکھائی دیتے ہیں۔" ایولین نے آہستہ سے کہا۔ اس کا دماغ سوچ رہا تھا آخر یہ عورت کیا بلا ہے۔ آخر وہ کتے کیوں لائی ہے؟ پھر وہ آہستہ سے اٹھی اور باورچی خانے میں اس کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی جس سے سامنے مکان کا دروازہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ دروازے کی دراڑ سے اندر ہونے والی روشنی باہر پھوٹ رہی تھی۔ اسی لمحہ اسے ایک ہلکی سی غرّاہٹ سنائی دی۔ پھر یوں لگا جیسے کوئی جانور کوئی بڑی سی شے نگل رہا ہو۔ جیسے کوئی جانور کچھ کھا رہا ہو۔

پھر اندر ایک دم اندھیرا سا چھا گیا۔ وہ چند لمحوں تک وہیں کھڑی اندھیرے میں گھورتی رہی۔ پھر تھکے قدموں چلتی ہوئی اپنے بستر پر جا لیٹی۔

"جانتے ہو۔" دوسری شام اس نے اپنے شوہر کو پھر بتایا "وہ ہر سہ پہر کو کتوں کو کہیں گھمانے لے جاتی ہے۔ واپسی پر میں نے اسے ہمیشہ بے حد تھکا ہوا پایا ہے۔ کتے بھی تھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ خدا جانے انہیں دوڑاتی ہے یا کیا کرتی ہے۔ اور پھر ۔۔۔ جانتے ہو۔ پھر وہ انہیں رات میں ایک لمبی چوڑی ضیافت بھی دیتی ہے۔" کہتے کہتے اس کے تصور میں کتوں کی بھیانک شکلیں گھومنے لگیں۔ "آج جب وہ واپس آئے تھے تو ان کی زبانیں نکلی ہوئی تھیں۔ وہ بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ خود عورت بھی بے حد تھکی ہوئی لگتی تھی۔ آتے ہی اس نے انہیں کپڑے لٹکانے والے پول سے باندھ دیا تھا جہاں وہ بُری طرح لیٹ گئے تھے۔ آنکھیں بند کئے ہانپتے ہوئے۔"

"اس کا شوہر بھی ابھی تک نہیں آیا ہے۔ خدا جانے کتنے دن کے لئے باہر گیا ہے۔" ایڈ نے اخبار دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کچھ نہیں بتاتی۔ وہ تو بس ان کتوں کے لئے وقف ہو کر رہ گئی ہے۔ انہیں روز سیر کرانے اور اوقات میں انہیں کھلانے کے علاوہ اب وہ کچھ اور نہیں کرتی۔ اب وہ کپڑے بھی نہیں دھوتی شاید۔" ہنس کر اس نے کہا۔ "ہاں ایک بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گئی۔ جس دن وہ کتے لائی تھی اس کے دوسرے دن اس نے بہت سارے کپڑے دھوئے تھے۔ میرا خیال ہے اس دن کے بعد سے اس نے پھر کسی کپڑے کو شاید

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

وہ کون ہے؟

ابراهیم یوسف

افراد تمثیل:

انصار	ایک معمولی فرم کا مالک
بیگم	انصار کی بیوی
صوفیہ	انصار کی بہن
فاروق	پُراسرار آدمی
اصغری اور کلن	ملازم
منی	انصار کی اکلوتی بیٹی

منظر:

ایک خوشحال گھرانے کا سجا ہوا ڈرائنگ روم۔ خوبصورت قیمتی پردوں اور قیمتی تصاویر سے مالک کی خوش ذوقی اور نفاست کا اندازہ ہوتا ہے۔ صبح کا وقت ہے کلن اور اصغری کمرے کی صفائی کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد اصغری کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگتی ہے۔ کلن اصغری سے پوچھتا ہے ــــــــ

کلن:۔ "اے اصغری بیگم وہاں کیا تاک جھانک ہو رہی ہے۔"

اصغری:۔ (کلن کو اپنی طرف اشارہ سے بلاتے ہوئے) "آج پھر وہ سڑک پہ کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔"

کلن:۔ (ایک صوفے کو کپڑے سے جھٹکتے ہوئے) "دیکھنے دے تیری بلا سے۔ تجھے کیوں فکر پڑی ہے؟"

اصغری:۔ "آج تو اس نے بڑا ٹھاٹھ دار سوٹ پہن رکھا ہے۔ (کلن آکر کھڑکی میں سے دیکھتا ہے) وہ دیکھ نے ابھی ابھی لیٹر باکس کے پاس کھڑا تھا۔ اب درخت کی آڑ میں ہو گیا ہے۔"

کلن:۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون ہے؟ اور چھپ چھپ کر گھر کے آس پاس کیوں گھومتا رہتا ہے۔"

اصغری:۔ "مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔ اس دن بیگم صاحبہ منی کو لئے کھڑکی میں کھڑی تھیں تو کیسی پیار بھری نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

کلن:۔ "بیگم صاحبہ نے سن لیا تو یاد رکھنا کھال ادھیڑ دیں گی۔"

اصغری:۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ (کانا پھوسی کے انداز میں) میں نیچے پورچ میں کھڑی تھی۔ بیگم صاحبہ نے مجھ کو نہیں دیکھا تھا۔"

کلن:۔ "مجھے تو کچھ اور ہی شک ہے۔ (آہستہ سے) مجو پان والا کہہ رہا تھا کہ ایک دن صوفیہ بٹیا کالج جا رہی تھیں تو وہ ان کا سائیکل پہ پیچھا کر رہا تھا۔"

اصغری:۔ "صورت سے تو وہ کالج کا لڑکا دکھائی نہیں دیتا۔"

کلن:۔ "کالج کے چھوکروں کا کیا۔ بہروپیے ہوتے ہیں۔"

اصغری:۔ "پہلے پہلے تو صورت سے اُٹھائی گیر نظر آتا تھا۔ مگر

مگر اب تو سلیقہ کے کپڑے پہننے لگا ہے۔

کلن:- چل چھوڑا اپنی بلا سے (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) تو کمرے کی صفائی کر لے میں ناشتہ کی میز لگاتی ہوں۔

(کلن کمرے سے چلا جاتا ہے۔ اصغری کپڑے سے کھڑکی کے شیشے صاف کرنے لگتی ہے۔ اور بار بار کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد بیگم انصار کمرے میں آتی ہیں۔ اور اصغری کو کھڑکی میں سے باہر جھانکتے ہوئے دیکھ لیتی ہیں)

بیگم:- اے اصغری بیگم۔ کیا تاک جھانک ہو رہی ہے؟

اصغری:- (گھبرا کر) کچھ نہیں بیگم صاحبہ۔ وہ میں ——

بیگم:- (کھڑکی میں سے باہر دیکھ کر) تو یہ بات ہے۔ (پلٹ کر اصغری کو دیکھ کر) اصغری! یہ شریفوں کا مکان ہے میں کئی دن سے دیکھ رہی ہوں کہ تم اس شخص میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہو۔

اصغری:- بیگم صاحبہ قسم لے لیجئے میں تو اس شخص کو جانتی تک نہیں۔

بیگم:- دیکھو زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تم کو عشق بازی کرنا ہے تو پھر کوئی دوسرا گھر تلاش کر لو۔ (کچھ دیر رک کر) تم اس میں غیر معمولی دلچسپی کیوں لے رہی ہو۔

اصغری:- مجھے تو صرف اس قدر دلچسپی ہے کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔

بیگم:- (غصہ سے) اچھا جاؤ اپنا کام کرو۔ آئندہ سے تم کو اس کمرے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کلن اس کمرے کی صفائی کرے گا۔ (اصغری خاموشی سے کمرے سے جانے لگتی ہے) اور دیکھو (اصغری پلٹ کر دیکھتی ہے) اگر صاحب سو کر اٹھ گئے ہوں تو ان سے کہنا میں اس کمرے میں ہوں۔

اصغری بہت اچھا۔

(اصغری کمرے سے چلی جاتی ہے۔ بیگم انصار کمرے میں ٹہلنے لگتی ہیں۔ مگر بار بار کھڑکی میں سے باہر جھانکتی ہیں۔ کچھ دیر بعد انصار کمرے میں آتے ہوئے)

انصار:- کیا بات ہے؟

بیگم:- وہ کم بخت آج پھر نظر آ رہا ہے۔ ادھر چار پانچ دن سے نظر نہیں آیا تھا۔

انصار:- (انصار کھڑکی میں سے باہر دیکھ کر) اس مردود نے عجیب مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔ کئی مرتبہ پکڑوانے کی کوشش کی۔ مگر وہ جانے ایک دم کدھر غائب ہو جاتا ہے۔ ایک دن تو کلن چار بجے رات سے بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر اس روز وہ آیا ہی نہیں۔

(بیگم انصار پاس رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں جہاں سے وہ باہر دیکھ سکتی ہیں۔ انصار سگرٹ جلاتے ہیں۔ بیگم انصار کچھ دیر خاموش رہ کر)

بیگم:- اگر وہ کوئی اٹھائی گیرہ ہے تو ان چار پانچ مہینوں میں اس نے کوئی واردات کیوں نہیں کی۔

انصار:- صورت سے تو اٹھائی گیرہ نظر نہیں آتا۔ پہلے پہلے تو مجھے بھی شک ہوا تھا۔

بیگم:- میں کئی دن سے دیکھ رہی ہوں کہ اب سلیقے سے کپڑے پہننے لگا ہے۔ پہلے تو پھٹے پھٹے حال نظر آتا تھا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) عمر سے کالج کا طالب علم بھی نظر نہیں آتا۔

انصار (غور سے بیگم کو دیکھ کر) تمہارا خیال ہے کہ صوفیہ سے اس کا کوئی تعلق ہے؟

بیگم:- صوفیہ کو اس سے دلچسپی نہ ہو مگر ـــ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کلن کو مجھے پان والے نے بتایا تھا کہ وہ کئی مرتبہ صوفیہ کا پیچھا کرتے دیکھا گیا ہے۔

انصار:- پان والوں اور تانگے والوں کو ایسے اسکینڈل بنانے میں مزہ آتا ہے۔

بیگم:- میں نے کئی مرتبہ صوفیہ سے اس کے متعلق بات چیت کی ہے۔ مگر اس نے ہمیشہ اس کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ سڑکوں پر پھرنے والے شہدوں کی کمی نہیں ہے۔ (انصار سگرٹ کا کش لیتے ہیں اور

سوچتے رہتے ہیں۔ بیگم انصار باہر سڑک پر دیکھتی رہتی ہیں۔
پھر انصار سے) صوفیہ کا سائیکل پر کالج جانا بند کرا دیجئے۔

انصار:۔ یہی میں بھی سوچتا ہوں۔

بیگم:۔ آپ آفس جاتے ہی ہیں کار میں اسے چھوڑ آیا کیجئے۔

انصار:۔ یہ ممکن تو ہے مگر مجھے اکثر واپسی میں دیر ہو جاتی ہے۔

بیگم:۔ واپسی میں وہ ٹیکسی پر آجایا کرے گی۔ دو تین مہینوں کی تو بات ہے (کھڑکی میں سے باہر دیکھ کر) آپ کے آتے ہی وہ فرار ہو گیا۔

انصار (کھڑکی میں سے باہر دیکھتے ہوئے) میں سوچتا ہوں اب پولیس کو اطلاع کر دی جائے۔

بیگم:۔ اس میں بدنامی کے علاوہ اور کچھ ملنے والا نہیں ہے (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) مگر اس کا گھر کے آس پاس اس پراسرار طریقے سے پھرنا زندگی میں عجیب سی گھٹن پیدا کئے ہوئے ہے۔

انصار۔ (سوچتے ہوئے) تمہارا اصغری کے متعلق کیا خیال ہے۔

بیگم:۔ میں نے اکثر اس کے متعلق سوچا ہے۔ مگر وہ تو قسمیں کھاتی ہے کہ وہ اس کو نہ تو جانتی ہے اور نہ اس سے کوئی تعلق ہے۔

انصار:۔ کلن سے بات چیت کرو۔ شاید اسے کسی بات کا پتہ ہو۔

بیگم:۔ میں نے کئی مرتبہ ٹوہ لینے کی کوشش کی مگر وہ بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔

کلن:۔ (کمرے میں آکر) صاحب ناشتہ تیار ہے۔

انصار:۔ اچھا

بیگم:۔ (کلن کی طرف دیکھ کر) صوفیہ بٹیا نہا چکیں

کلن:۔ جی ہاں وہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔

بیگم:۔ (انصار کی طرف دیکھ کر) ابھی آپ کو دس پندرہ منٹ اور انتظار کرنا ہوگا۔ میں ذرا نہالوں۔

انصار:۔ ابھی تک آپ نہائی بھی نہیں؟

بیگم رات میں ممّی ذرا بے چین سی رہی۔ بہت دیر میں سوئی تھی اس میری آنکھ بھی دیر سے کھلی۔

انصار:۔ اچھا تو ذرا جلدی کیجیے مجھے بھی آج کچھ ضروری کام ہے۔

بیگم:۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) بس پندرہ منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

[بیگم انصار کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ کلن جانے کے لئے مڑتا ہے۔ انصار اسے جاتا ہوا دیکھ کر]

انصار:۔ کلن ـــ (کلن رک جاتا ہے) تم اس شخص کو جانتے ہو؟

کلن:۔ کس شخص کو سرکار؟

انصار:۔ یہی جو اس پراسرار طریقے سے گھر کے چکر لگاتا ہے۔

کلن:۔ نہیں سرکار میں اسے نہیں جانتا۔ میں خود حیران ہوں کہ آخر وہ کون ہے۔ اور اس کا مقصد کیا ہے؟

انصار:۔ تم اس گھر کے بہت پرانے نوکر ہو۔ میرے باپ کے وقتوں کے۔ اس گھر کی نیک نامی اور بدنامی کا تمہیں بھی اتنا ہی خیال ہونا چاہئے جتنا مجھ کو [کلن خاموش رہتا ہے۔ انصار سگرٹ کا کش لے کر] مجو پان والے کی خبر پر تم کو کہاں تک یقین ہے؟

کلن:۔ (سوچتے ہوئے) مجو نے بھی ہمدردی ہی میں کہا تھا سرکار۔ بلکہ ایک مرتبہ تو اس نے یہ بھی سوچا کہ اس کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دے مگر یہ سوچ کر کہ کہیں آپ ناراض نہ ہوں خاموش ہو گیا۔

انصار:۔ کیا صوفیہ میں تم نے کوئی تبدیلی دیکھی ہے؟

کلن:۔ نہیں سرکار۔ صوفیہ بٹیا کتنی نیک اور سمجھدار ہیں۔ یہ تو آپ خود بھی جانتے ہیں۔ اور وہ ایسے لفنگوں کو کیسے منہ لگا سکتی ہیں۔

انصار:۔ اور اصغری کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔

کلن:۔ ویسے ابھی تک اس میں ایسی کوئی بات تو نہیں دیکھی۔ اب دل کی بات خدا جانتا ہے (سوچتے ہوئے) مگر وہ تو خود اس شخص کو دیکھ کر سہم جاتی ہے۔

انصار:۔ کیوں سہم جاتی ہے (کلن خاموش رہتا ہے) اصغری کی تو شادی ہو گئی تھی؟

کلن:۔ جی ہاں مگر اس کا شوہر اسے طلاق دے کر کہیں باہر چلا گیا؟

انصار:۔ کہیں یہی اس کا شوہر نہ ہو۔

کلن:- مگر وہ یہاں ہے کہاں؟

انصار:- ممکن ہے واپس آگیا ہو۔

کلن:- تو وہ اب اصغری سے کیا چاہتا ہے؟

انصار:- ممکن ہے پھر اس سے تعلق پیدا کرنا چاہتا ہو۔ ایسے لوگوں میں یہ بات بُری نہیں سمجھی جاتی۔

کلن:- اگر ایسی بات ہوتی تو اصغری کہہ ضرور دیتی۔ وہ تو اپنے شوہر کی نفرت کی حد تک بُرائی کرتی ہے۔

انصار:- ممکن ہے اب وہ اس سے کوئی انتقام لینا چاہتا ہو، جیسے اس کا اغوا کرلینا یا کوئی اور انتقام ہو سکتا ہے۔ [کلن خاموش رہتا ہے۔ انصار سگرٹ کے کش لیتا رہتا ہے۔ اور باہر اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ باہر کھڑے شخص کی نقل و حرکت دیکھ رہا ہو۔ کلن کچھ دیر خاموش رہ کر]

کلن:- سرکار ایک عرض کرنا تھی۔ کئی دن سے سوچ رہا تھا۔

انصار:- (کلن کو دیکھ کر) ہاں ہاں کہو کیا بات ہے۔

کلن:- آپ اکیلے کہیں نہ آیا جایا کیجئے۔

انصار:- (مسکرا کر) کیوں کیا بات ہے؟

کلن:- جمن کے گینگ والے آپ سے خار کھائے بیٹھے ہیں۔

انصار:- کیوں؟

کلن:- ان کو پتہ چل گیا ہے کہ آپ ہی کی رپورٹ پر ان کے گھر پر پولیس نے چھاپہ مارا تھا اور جوا پکڑا گیا تھا۔ کہتے ہیں کئی ہزار کا نقصان ہوا ہے اور جمن الگ سزا بھگت رہا ہے۔

انصار:- تمہارا خیال ہے کہ وہ میرے ساتھ کوئی شرارت کریں گے۔

کلن:- بدمعاشوں سے کیا ممکن نہیں ہے — ممکن ہے یہ شخص —

انصار:- انہی کا کوئی آدمی ہو۔

کلن:- ہو سکتا ہے سرکار۔ ویسے میں اس کے گینگ کے لوگوں کو جانتا ہوں۔ یہ ان میں سے نہیں ہے۔

انصار:- تو پھر ڈر کاہے کا؟

کلن:- ممکن ہے باہر سے بلایا گیا ہو۔ اس قسم کے بدمعاشوں کا تعلق تو سارے ملک کے بدمعاشوں سے رہتا ہے۔

انصار:- (کسی قدر مشکوک نظروں سے کلن کو دیکھ کر) تم جمن کے گینگ والوں کو کہاں سے جانتے ہو؟

کلن:- سرکار محلے کی تو بات ہے۔ گھومتا پھرتا رہتا ہوں تو پتہ چل ہی جاتا ہے۔ پاس پڑوس والوں کو کون نہیں جانتا۔

انصار:- جمن سے تو تمہاری کچھ رشتہ داری بھی ہے۔

کلن:- بہت دور کی۔ لیکن اس کے کالے کرتوتوں کی وجہ سے میں نے اس سے قطع تعلق کرلیا ہے۔ برسوں سے ملنا جلنا بند ہے۔

صوفیہ:- (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) بھائی جان کمال ہے۔ ابھی تک آپ لوگوں کی صبح نہیں ہوئی۔

انصار:- (مسکرا کر) کیوں خیریت تو ہے۔

صوفیہ:- میں کب سے ناشتہ کی میز پر بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔

انصار:- (کلن کی طرف دیکھ کر) دیکھو بیگم صاحبہ نہا چکیں۔

صوفیہ:- اچھا تو ابھی بھابی صاحبہ نے غسل نہیں کیا۔ بھئی کمال ہے۔ (کلن کمرے سے چلا جاتا ہے۔) اب اس کے بعد شاید آپ کا نمبر آئے گا اور پھر ناشتہ کا۔ گویا لنچ کے وقت بریک فاسٹ۔

[انصار کھڑکی سے باہر دیکھتے ہیں]

انصار:- آج اس کی حرکتیں کچھ زیادہ پُراسرار ہیں۔

صوفیہ:- (کھڑکی کے پاس آ کر) کس کی؟

انصار:- اسی مردود کی — سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ کون ہے۔ اور اس پُراسرار طریقہ سے گھر کا طواف کرتے رہنے سے اس کا مقصد کیا ہے۔ (صوفیہ کھڑکی سے باہر دیکھتی ہے۔ انصار صوفیہ کو غور سے دیکھ کر) تم اس کو پہچانتی ہو؟

صوفیہ:- بس اسی حد تک جس حد تک آپ لوگ اسے پہچانتے ہیں۔

انصار:- سنا ہے کہ تمہارے کالج جاتے وقت وہ اکثر تمہارا پیچھا کرتا ہے۔

صوفیہ:- ایک مرتبہ ضرور شک ہوا تھا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ مگر پھر راستہ میں کہیں غائب ہو گیا۔

انصار:- تمہارے کالج کا تو کوئی طالب علم نہیں ہے۔

صوفیہ:- میں نے اسے کالج میں کبھی نہیں دیکھا۔

انصار:۔ (کچھ سوچ کر) اب تم سائیکل پر کالج جانا بند کر دو۔

صوفیہ:۔ (حیرت سے) کیوں؟

انصار:۔ یہ آدمی بہت مشکوک ہے۔ کہیں خدانخواستہ کچھ ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔ میں تمہیں گاڑی میں کالج چھوڑ آیا کروں گا۔ ٹیکسی پر واپس آ جایا کرنا۔

صوفیہ:۔ کمال ہے۔ ایسے فضول سے آدمی سے سارا گھر کا گھر خوف زدہ ہے۔ آپ پولیس کو اطلاع کیوں نہیں کر دیتے؟

انصار:۔ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ سوائے بدنامی کے۔

صوفیہ:۔ کمال ہے (مشکوک نظروں سے انصار کو دیکھ کر) کیسی بدنامی؟

انصار:۔ پولیس کی اُوٹ پٹانگ تحقیقات اور الٹے سیدھے سوالات کا کون جواب دیتا پھرے گا۔

صوفیہ:۔ بھابی صاحبہ کا کیا خیال ہے؟ شاید وہ بھی پولیس افسر کو اطلاع کرنے کے خلاف ہوں گی۔

انصار:۔ (مشکوک نظروں سے صوفیہ کو دیکھ کر) کیا مطلب؟

صوفیہ:۔ کمال ہے۔ اس میں مطلب کی کیا بات ہے۔ (مسکرا کر جیسے ٹال رہی ہو) آپ اکثر ان کے دماغ سے سوچتے ہیں۔

انصار:۔ گویا تمہارا مطلب ہے کہ میں ایک نمبر کا گدھا ہوں۔

بیگم:۔ (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) کون گدھا ہے۔

انصار:۔ میں — یعنی مسٹر انصار۔ پروپرائٹر انصار لمیٹڈ۔

بیگم:۔ (مسکرا کر) یہ نیا انکشاف ہے۔ (چند سیکنڈ رک کر) آیئے ناشتہ کی میز پر ہم اس کا فیصلہ کریں گے۔ ذرا پیٹ بھر جاتا ہے تو دماغ تیزی سے کام کرتا ہے۔ اس قدر اہم مسائل خالی پیٹ حل نہیں ہوا کرتے۔

صوفیہ:۔ بھابی آپ کو یاد ہوگا کہ ایک روز آپ ہی کہہ رہی تھیں کہ کھڑکی میں کھڑی تھیں تو وہ کس طرح مسکرا رہا تھا۔

بیگم:۔ ہاں اس روز تو میں سچ مچ ڈر گئی تھی۔

[انصار کے چہرے پر سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ چند سیکنڈ خاموش رہتے ہیں پھر آہستہ سے]

انصار:۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب پولیس کو اطلاع کر ہی دینا چاہیئے۔

بیگم:۔ مگر اس سے فائدہ — کم از کم یہ تو معلوم ہو کہ وہ کون ہے۔ اور کیا چاہتا ہے؟

انصار:۔ (ترش روئی سے) آخر تم پولیس سے اس قدر ڈرتی کیوں ہو؟

بیگم:۔ اس لئے کہ سوائے بدنامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور محلے والے بے پرکی اڑائیں گے۔

انصار:۔ قصہ ایک مرتبہ پاک ہو جانا چاہیئے۔ اس گھر کا کوئی نہ کوئی فرد کسی بڑی آفت میں پھنسنے والا ہے۔ ممکن ہے اصغری یا صوفیہ اغوا کر لی جائے۔ ممکن ہے میری جان خطرہ میں ہو۔ اور تمہیں دیکھ کر تو وہ مسکراتا ہے۔

بیگم:۔ (مسکرا کر) مسکرانے دیجئے۔ مجھے اغوا نہیں کرے گا۔

کلن:۔ (ایک دم کمرے میں داخل ہو کر گھبرائے ہوئے انداز میں) سرکار — وہ — وہ — (سب سوالیہ نظروں سے کلن کو دیکھتے ہیں) وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے سرکار!

انصار:۔ کون ملنا چاہتا ہے؟

کلن:۔ وہی پُراسرار آدمی — دروازے پر کھڑا ہے۔

انصار:۔ (چند سیکنڈ رک کر سوچتے ہوئے) اسے یہیں بلا لاؤ۔

[کلن کمرے سے چلا جاتا ہے۔ سب خاموش رہتے ہیں مگر سب کے چہروں پر عجیب سی کشمکش معلوم ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد ایک شخص کلن کے پیچھے پیچھے داخل ہوتا ہے۔ عمر ۳۰۔۳۵ سال کے درمیان ہے۔ اندر آ کر پہلے تو سب کے چہروں کو دیکھتا ہے۔ پھر کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ انصار کچھ دیر اسے غور سے دیکھتے رہتے ہیں — پھر کہتے ہیں۔ فرمائیے]

فاروق:۔ میرا نام فاروق ہے۔ (سب لوگ اسے دیکھتے رہتے ہیں) میں کئی دن سے آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ مگر سوچتا رہا کہ آپ مجھے بُرا آدمی سمجھتے ہوں گے۔ اس لئے ہمت نہیں پڑی مگر پھر آج ہمت کر ہی لی۔

انصار:۔ فرمائیے۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟

فاروق:۔ مہربانی ہے آپ کی۔ (پھر کمرے کا جائزہ لے کر) میں آپ سے

کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟

انصار:۔ جی نہیں فرمائیے۔

فاروق:۔ میں بہت ہی پریشان حال انسان تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن میں نے اپنی زندگی ہی ختم کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔

انصار:۔ یعنی خودکشی ــــ یہ انتہائی بزدلی ہے۔

فاروق:۔ انسان جب بالکل مایوس ہو جاتا ہے تو بزدل ہی ہو جاتا ہے۔ (کچھ دیر رک کر) میں نے کالج کی اچھی تعلیم حاصل کی ہے۔

انصار:۔ (دلچسپی لیتے ہوئے) اچھا۔

فاروق:۔ جی ہاں۔ ایم اے پاس ہوں۔ مگر اس سے میری قسمت نہیں بدلی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی معمولی نوکری ہی کے ذریعہ اپنا پیٹ ایمانداری سے بھر سکوں۔

انصار:۔ (مسکرا کر) بڑی پرانی اور پٹی پٹائی کہانی ہے۔

فاروق:۔ جی ہاں ــــ مگر ایک عالمگیر کہانی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) جانے اس کہانی کا اختتام کب ہوگا۔ (کچھ دیر رک کر) ہاں تو میں نے زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور پارک کی ایک بنچ پر سو گیا۔ جب صبح سو کر اٹھا تو پہلی نظر آپ کی چھوٹی بچی پر پڑی۔ (کمرے میں چاروں طرف دیکھ کر) وہ بچی کہاں ہے؟

انصار:۔ اپنے کمرے میں ہوگی۔

فاروق:۔ وہ بچی مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ معصوم۔ بھولی بھالی۔ بالکل فرشتہ سی۔ میں نے سوچا جس دنیا میں ایسی معصوم روحیں جنم لیتی ہیں وہ دنیا چھوڑ دینے کے لئے نہیں ہے بس ایک خیال دل میں پیدا ہوا۔ (کچھ دیر رک کر) معاف کیجئے گا۔ اس سے آگے کی کہانی کچھ زیادہ شریفانہ نہیں ہے۔

انصار:۔ کیا مطلب؟

فاروق:۔ جی میرا مطلب ہے کہ ــــ مگر میں آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ میرے پاس جو کچھ بھی بچی کچی رقم تھی اس سے سٹہ کھیلنے لگا۔ صرف آپ کی بچی کا نام لے کر (سب لوگ مسکراتے ہیں) اور صرف دو مہینوں میں خاصی رقم کمائی اور اب ایک دکان کھول لی ہے جس سے میں ایک خوشحال زندگی گزارنے لگا ہوں۔ آپ کی بچی کی معصوم مسکراہٹ نے میری زندگی اور دنیا ہی بدل دی۔

انصار:۔ (مسکرا کر) شکریہ

فاروق:۔ (شرماتے ہوئے جیب ایک ڈبیہ نکال کر) اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں یہ تحفہ۔

انصار:۔ شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔

فاروق:۔ آپ میرا دل نہ توڑیئے۔ میں بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں۔

انصار:۔ لیکن ــــ

فاروق:۔ (بات کاٹ کر) آپ کا مجھ پر یہ سب سے بڑا احسان ہوگا۔ میری زندگی کی یہ بڑی تمنا ہے کہ میں اس معصوم فرشتہ کو ــــ

بیگم:۔ (کلن کی طرف دیکھ کر) جاؤ کلن منی کو لے آؤ۔

[کلن کمرے سے چلا جاتا ہے]

صوفیہ:۔ (مسکرا کر) اب تو آپ ہمارے گھر کے بہانے سٹہ پر چکر نہیں لگائیں گے؟ ــــ

فاروق:۔ میں شرمندہ ہوں۔ میں تو صرف اس لئے چکر لگاتا تھا کہ اس بچی پر نظر پڑ جائے۔ میں سچ کہتا ہوں جس روز بھی صبح صبح میری نظر اس بچی پر پڑ جاتی ہے میں اس روز خاصا اچھا بزنس کر لیتا ہوں۔

صوفیہ:۔ کونسا بزنس ــــ؟ سٹہ کا؟

فاروق:۔ اب زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔ زندگی سے اکتا کر زندگی کو جوا سمجھا تھا۔ مگر اب زندگی کی قدر کرتا ہوں۔ اور ایمانداری کی زندگی سے مطمئن ہوں۔ اس معصوم بچی نے میری زندگی کو بدل دیا ہے۔

[کلن منی کو جس کی عمر تین چار سال کے قریب ہے لیکر کمرے میں آتا ہے۔ فاروق بڑی پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتا ہے۔ پہلے تو بچی کی طرف بڑھتا ہے پھر کچھ سوچ کر رک جاتا ہے اور سب کے چہروں کو دیکھنے لگتا ہے۔ اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ بچی حیرت سے سب کو دیکھتی ہے۔ انصار بچی کو فاروق کو دیتے ہوئے]

انصار:۔ منی یہ تمہارے انکل ہیں۔

منی:۔ انکل! — یہ ہمارے انکل ہیں۔

[فاروق ندیدوں کی طرح منی کو گود میں لے کر اسے پیار کرتا ہے۔ اور پھر تمام لوگوں کی موجودگی سے جیسے بے نیاز ہو کر ایک صوفہ پر بیٹھ جاتا ہے اور سونے کا خوبصورت ہار اس کے گلے میں ڈالتا ہے۔]

انصار:۔ (حیرت سے) آپ نے اس قدر قیمتی ہار —!

فاروق:۔ دیکھئے آپ نہ بولئے۔ میں اس کا انکل ہوں نا۔ (جیب سے ٹافی کا پیکٹ نکالتے ہوئے) لو بیٹی۔ یہ میٹھی میٹھی ٹافی کھاؤ — لے لو۔ شرماؤ نہیں۔ ہم تو تمہارے انکل ہیں

(پھر) تمہاری پیاری سی کیا نام ہے تمہارا؟

منی:۔ منی — پیکٹ لے کر شکریہ

[فاروق پھر محبت سے پیار کرتا ہے]

انصار:۔ منی۔ تم نے انکل سے چائے کے لئے نہیں پوچھا۔

منی:۔ انکل آپ چائے پیجئے گا۔

فاروق:۔ (منی کو لے کر کھڑے ہوتے ہوئے) ضرور۔ ضرور۔ تم کہہ رہی ہو تو ضرور پیوں گا۔

[سب لوگ ہنستے ہیں اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھتے ہیں]

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

صفحہ ۱۵ کا بقیہ ———— وہ عورت

ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔

"پھر" ایڈ نے ہنکاری بھرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے تم بھی اس کے ساتھ سیر کے لئے چلی جایا کرو۔"

"نا— میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ مجھے اس سے اور اس کے بھیانک کتوں سے خوف آتا ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ میں دبی سلائیاں وہیں چھوڑ دیں اور چلی گئی۔

کتے دن بدن موٹے اور توانا ہوتے جا رہے تھے۔ پس دوران ایولین کا سوئٹر بھی کافی تیار ہو چکا تھا۔ بھورے رنگ میں سرخ سرخ اون کی دھاریاں ڈالنے سے سوئٹر ایک غیر معمولی طور پر خوبصورت بن چکا تھا۔

"جانتے ہو" جمعہ کی شام کو اس نے اپنے شوہر ایڈ کو بتایا۔ "وہ آج ان کتوں کو موٹر میں بٹھا کر کہیں لے گئی تھی اور واپسی پر وہ تنہا تھی۔"

"اچھا—؟"

"ہاں۔ اس کے بعد اس نے گھر میں سے دو سوٹ کیس نکال کر گاڑی میں رکھے تھے — اور پھر جب سے وہ غائب ہے۔ میرا خیال ہے وہ مکان چھوڑ کر جا چکی ہے۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت نوجوان بھی تھا۔

"ہو سکتا ہے — ویسے کتوں پر خرچ بہت آتا ہے"

ایڈ نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "اتنا خرچ برداشت کرنا آسان نہیں۔ پھر سنا وہ کتوں کو ورزش کرا کے بھوکا بھی بناتی تھی۔ ایسی حالت میں تو خرچ آسمان پر جا پہنچا ہوگا۔ میرا خیال ہے اسی وجہ سے اسے کتوں کو ہٹانا پڑا ہوگا؟"

ایولین نے اون میں سے سلائیاں کھینچ کر نکال لیں۔ اس کا سوئٹر تیار ہو چکا تھا۔ پھر اس نے اسے احتیاط سے تہہ کر کے ایک جانب رکھ دیا۔

"آپ کا خیال غلط ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔

"میں سمجھا نہیں تمہارا مطلب؟" ایڈ نے چونک کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے۔ میرا خیال ہے" ایولین نے گھبرائے اور کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کتوں کی خوراک پر اس کی ایک پائی بھی خرچ نہیں ہوئی — وہ — وہ —

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" ایڈ نے بڑی طرح گھبرا کر ایولین کو دیکھا جو نہ جانے کیوں بری طرح کانپ رہی تھی۔ اور ایولین کی یہ حالت دیکھ کر ایڈ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور وہ ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا —!

رشیدہ رضویہ

سفرنامہ

کراچی پانی
بصرے کا دریا

عوامی یا قومی عدالت انقلابِ بغداد کے بعد قائم ہوئی تھی۔ اس کا جج عبدالکریم قاسم کا خالہ زاد بھائی فاضل عباس مہداوی تھا۔

فاضل جج فاضل عباس مہداوی کو پہلی مرتبہ میں نے جمہوریہ ہسپتال میں دیکھا تھا۔ "تحفتہ البغداد" وہ ظالم عراقی پھوڑا ہے۔ جو ناسور بن کر تمام جلد کو کاٹ دیتا ہے۔ آنکھ پہ اگر نکلا۔ تو پوری آنکھ کھا گیا۔ کان پہ نکلا تو بہرا کر گیا اور ناک پہ نکلا تو گڑھا کر گیا۔ یہ پھوڑا ایک قسم کے مچھر کے ڈنک سے پیدا ہوتا ہے۔ فریدہ کے ہاتھ پہ ایک پھنسی سی نکل آئی۔ تو خائف ہو کر میں اسے فوری ہسپتال "الجمہوریہ" لے گئی۔ ہسپتال اوپر سے لے کر نیچے تک تمام کا تمام سرخ رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ہم بھی سرخوں میں شامل ہو گئے۔ بغداد کے کچھ علاقے ایسے تھے جہاں سرخ لباس پہن کر خود کو کمیونسٹ ظاہر کر کے جانا پڑتا تھا۔ اور کچھ علاقے ایسے تھے جہاں سبز لباس پہن کر اور حزب البعث کا حامی بن کر جانا پڑتا۔ کبھی سرخ رنگ استعمال کرنا پڑتا۔ اور کبھی سبز!۔ دونوں ہی رنگ ایسے اثر انداز ہوئے کہ مجھے دونوں جماعتوں سے ہی انسیت ہو گئی۔

ہاں تو ہسپتال میں فریدہ کے ہاتھ کا علاج برقی شعاعیں تجویز ہوا۔ کراچی میں اس علاج پہ جانے کتنی رقم اڑ گئی۔ لیکن یہاں پندرہ روز کے کورس کے لئے محض ڈھائی روپے داخل کرنا پڑے۔ اسی ہسپتال کے ایک کمرہ میں ایک ادھیڑ عمر شخص اکثر اپنے ٹخنوں پہ برقی شعاعیں لیتا نظر آتا۔ ایک روز اس شخص نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں اس کے بھائی سے شادی کرنا پسند کروں گی؟

اگر کوئی پاکستانی شخص یہ بات کہتا۔ تو میں یہی تصور کرتی کہ بے وقوف بنا رہا ہے لطف اندوز ہونے کے لئے۔ اور تفریحاً ایسی بات کہہ رہا ہے۔ لیکن میں جانتی تھی۔ ایک عرب یہ بات پوری صداقت اور سنجیدگی سے کہتا ہے۔ لہٰذا عراقی لڑکیوں کی مانند کندھے اچکا کر کہا۔

"میرا قبیلہ اس کی اجازت نہ دے گا۔"

کیوں۔ تمہارا قبیلہ بہت اونچا ہے۔ اور ہم لوگ کمتر ہیں۔ اسلام ایسی تفریق کا قائل نہیں۔ اور پھر ہم کیا کسی سے کم ہیں؟ اُن صاحب نے ایک طویل قصیدہ اپنے خاندان کی تعریف میں پڑھ سنایا۔ اور نرس جو ان صاحب کی خوشامدوں میں لگی رہتی تھی۔ بڑے رشک اور حسرت سے مجھ سے کہنے لگی۔ اگر وہ میری جگہ ہوتی تو فوراً ہاں کر دیتی۔

"کیوں ۔۔۔؟"

● ہندوستانی سفیر مسٹر چوپڑہ کی خوبصورت بیوی نے پہلے تو تنقیدی نگاہوں سے میرا جائزہ لیا اور پھر دریافت کیا۔

"آپ دہلی سے کب آئی ہیں؟"

"جی! ہم پاکستانی ہیں۔"

"تو پھر یہ ہندوستانی لباس کیوں پہن رکھا ہے؟"

"جی۔ یہ شلوار قمیض یہ تو پاکستانی لباس ہے۔"

میرا یہ جواب مسز چوپڑہ کو پسند نہیں آیا۔ اور ہم دونوں کے درمیان تلخ مکالمات کا تبادلہ ہونے لگا۔

"وہ رئیس محکمۃ الشعب ہے" (قومی عدالت کا جج)

"پھر کیا ہوا؟" میں نے بے نیازی سے کندھے اچکا دیئے۔

اتنا بڑا آدمی ہے۔ یہ تو کبھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ مغرور آدمی ہے۔ تم خوش قسمت ہو۔ تمہیں اپنے بھائی کے لئے پسند کرتا ہے۔ ہاں کر دو۔ فائدے ہی فائدے رہیں گے" نرس۔ جس کا نام امل تھا مجھے ترغیب دینے لگی۔

"لیکن میری تو منگنی ہو چکی ہے عینی! ۔ اور مجھے اپنا منگیتر بہت پسند ہے۔ وہ میرا ابن عم ہے" میں نے برجستہ ایک بہانہ تراشا۔ فاضل جج کو معلوم ہوا۔ میں اپنے ابن عم سے منسوب ہوں تو خاموش ہو گئے۔ اور مجھے معاف کر دیا۔ ورنہ معاملہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتا۔ لیکن بنت عم اور ابن عم کے تصور اور روایت کا کل عرب میں احترام ہوتا ہے۔

فاضل جج کو دوسری مرتبہ میں نے مشرقی جرمنی کے سفارت خانہ کی جانب سے دکھائی جانے والی ایک فلم کی تقریب میں دیکھا۔ گیارہ نومبر کا دن میرے لئے بڑا معروف تھا۔ بغداد بھر کے سکھ اس دن بابا نانک کا جنم دن مناتے ہیں۔ چونکہ بابا نانک کی بیٹھک بغداد میں والد صاحب نے از سر نو تعمیر کرائی ہے۔ اور امرتسر کے دربار صاحب کے لئے ہر سال ہمارے ہاں سے چندہ جاتا ہے اس لئے بابا نانک کے جنم دن میں ہمیں ضرور شریک کیا جاتا ہے۔

گیارہ نومبر کی صبح دس بجے ہم ہندوستانی سفارت خانہ کے ایک افسر مسٹر سوڈھی کے گھر پہنچے۔ اور احترام سے سر ڈھانپ کر فرش پر بیٹھ گئے۔ گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہوا۔ بابا نانک اور گرو گوبند کی بانیاں پڑھی گئیں۔ جو کہ مسز سوڈھی اور مسز بیدی نے پڑھی تھیں، بیدی صاحب بھی ہندوستانی سفارت خانہ کے ایک سکھ افسر تھے۔

پاٹھ کے بعد بھیٹ ہو جاتی ہے۔ لان میں چائے کا انتظام تھا۔ ہندوستانی سفیر مسٹر چوپڑہ کی خوبصورت بیوی نے پہلے تو تنقیدی نگاہوں سے میرا جائزہ لیا۔ پھر دریافت کیا۔

"آپ دہلی سے کب آئی ہیں"

"جی۔ وہ بات یہ ہے کہ ہم پاکستانی ہیں"

"پھر یہ ہندوستانی لباس کیوں پہن رکھا ہے" وہ کچھ تنک سی گئیں۔

"جی یہ شلوار قمیض ــــ یہ تو پاکستانی لباس ہے۔"

میرا یہ جواب مسز چوپڑہ کو پسند نہ آیا۔ وہ کچھ تلخ سی ہو گئیں، اور ہم دونوں کے درمیان تلخ مکالمات کا تبادلہ ہونے لگا۔ اسی دوران میں سید نذیر حسین کہیں سے درمیان میں ٹپک پڑے۔

"اسے آپ یہاں کہاں؟" وہ تعجب سے بولے۔ اور میں مسز چوپڑہ کی بدکلامی بھول کر ان سے مصروف گفتگو ہو گئی۔ ان کی بیوی ہنوز بغداد نہ آئی تھی اور وہ بدستور بیوی کی موت کی بددعائیں مانگتے تھے۔

سید نذیر حسین سے نپٹنے کے بعد مشرقی جرمنی کے سفارت خانہ کی راہ لی اور وہاں فاضل جج کو فوجی وردی میں باڈی گارڈوں اور مداحین کے ہجوم میں دیکھا۔ لوگ ان کو دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجاتے اور زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ اور جج محترم سر کے خفیف اشارہ سے جواب دیتے۔ کیا ٹھاٹھ تھے جناب کے۔ واقعی بڑے آدمی بن گئے تھے۔ نگاہ مجھ پہ پڑی۔ تو دھیرے سے مسکرا کر آگے بڑھ گئے۔ جانے پہچانا یا نہیں۔ بہر حال میرے چہرہ پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کہ انسان سے عظیم ایک قوت ہے۔ جسے موت کہتے ہیں۔

اپریل ۱۹۵۷ء کے اسی بغداد کے ایک عشائیہ میں نوری السعید ملک فیصل۔ امیر عبد الالہ۔ عدنان مندریس۔ شاہ ایران اور شاہ حسین کو دیکھا۔ ان میں محض شاہ ایران اور شاہ حسین بقید حیات ہیں۔

"تم بھی ایک روز فنا ہو جاؤ گے۔ اپنی بڑائی کا اسقدر گھمنڈ نہ کرو۔" میں نے سامنے بیٹھے فاضل جج کو دیکھ کر سوچا اور پھر فلم دیکھنے لگی۔ جو "ہٹلر اور استعماریت" کے خلاف تھی۔ فلم کہیں شب کے بارہ بجے ختم ہوئی۔ اور اس فلم نے سخت بدمزہ کیا۔ کیونکہ اس میں بار بار خروشچوف کا ذکر آتا تھا۔ اور اشترا کی نظریات کی تبلیغ ہوتی تھی۔

اشتہار

فلم ختم ہوئی تو سب سے پہلے ہم بھائی بہن باہر نکلے ہمارے
پیچھے پیچھے فاضل جج مع باڈی گارڈز تھے۔ باہر کھڑا ہجوم پہلے
ہمیں دیکھ کر تالیاں بجانے لگا۔ پھر فاضل جج کو دیکھ کر۔ لوگوں
کی تالیوں اور نعروں کا جواب ہم نے بھی اسی انداز میں دیا۔
جس میں فاضل جج دیتے تھے۔

لوگوں کا خیال یہی تھا کہ ہم فاضل جج کے ساتھ ہیں۔
اور لطف کی بات تو یہ تھی کہ اس تقریب میں کوئی اور عام
پاکستانی تو درکنار۔ پاکستانی سفارت خانہ کا بڑے سے بڑا افسر
بھی مدعو نہ کیا گیا تھا۔

فاضل عباس مہداوی کو تیسری مرتبہ میں نے قومی عدالت
میں دیکھا۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۵۹ء کی شام سازش قتل کا مقدمہ
شروع ہوا۔ مقدمہ کا آغاز بسم اللہ کے بجائے دشنام طرازی سے
ہوا۔ شرق اوسط کے تمام رہنماؤں کو گالیاں دینے کے بعد
فرداً فرداً ہر ملزم پکارا گیا اور نام۔ عمر۔ پیشہ اور سکونت
وغیرہ دریافت کرنے کے بعد استفسار کیا گیا۔ آیا ملزمین کو جرم
کا اقبال ہے؟

۷۵ ملزمین میں سے محض تین یعنی ایاد سعید ثابت۔ سمیر
عبدالعزیز النجم اور شاکر ابراہیم حلیوہ نے سادگی و سچائی
سے اقرار جرم کر لیا۔ بقیہ نے اظہار برئیت کیا۔ ان میں تین
ڈاکٹر۔ ایک وکیل۔ ایک صحافی تھا۔ جن پر الزام یہ تھا کہ انہیں
میں حزب البعث کے اراکین میں اسلحہ تقسیم کیا تھا۔ یہ صحافی
اخبار الحریہ کے مدیر کا بیٹا تھا۔

ان کے علاوہ دو تاجر۔ پانچ انجینیر۔ دو فوجی سپاہی
تین ڈرائیور۔ تین ساہوکار۔ ایک بائیس سالہ طالبہ اور بقیہ
مختلف کالجوں کے نوجوان طلباء تھے۔

عدالت میں ملزمین اور مجرمین کو زبان تک ہلانے کی
اجازت نہ تھی۔ اگر ان کے وکلاء بھی لب کشائی کی کوشش کرتے
تو بری طرح ڈانٹ کھاتے۔ اس عدالت میں محض فاضل جج
فاضل عباس مہداوی بولتا تھا۔ وہ بیک وقت وکیل صفائی
الشماع

اور وکیل سرکاری بھی تھا۔ اور گویا ہارون الرشید کے تخت پہ
بھی بیٹھا تھا۔

مقدمہ برابر ایک ماہ تک چلتا رہا۔ اور فیصلہ پھانسی
و قید بامشقت پہ ہوا۔ پھانسی کے لئے آٹھ فروری ۱۹۶۰ء کا
دن مقرر کیا گیا۔ لیکن کریم قاسم نے پھانسی کی سزا کو دو تین
سال کی قید میں تبدیل کر کے اپنے قاتلوں کو معاف کر دیا۔

ہمارا وقت یہی ہنگامے دیکھتے گزر رہا تھا۔ عراق کے حالات
دگرگوں تھے۔ ہر لمحہ جان کا خطرہ رہتا تھا۔ آئے دن سڑکوں پہ گولیاں
چلتی رہتی تھیں۔ پاکستان کے خلاف سخت نفرت پھیلی تھی۔ لیکن ہم
خود کو عراقی کہتے تھے۔ کمیونسٹوں اور حزب البعث کے اراکین سے
ہماری یکساں دوستی تھی۔ اور دونوں سے ہی ہمدردی تھی۔ دونوں
جماعتیں اپنے اپنے طور پر حق بجانب تھیں۔ ہم بہن بھائی آزادی
سے شہر بھر میں گھومتے۔ حالانکہ اغوا کی وارداتیں بھی عام ہو گئی تھیں
اور فوجیوں کے ہاتھوں عورت کی عزت محفوظ نہ رہی تھی۔ غیر
عراقیوں نے گھروں سے باہر نکلنا ترک کر دیا تھا۔ شارع الرشید
پہ انگریز۔ فرانسیسی اور مصری کے بجائے روسی۔ چینی اور بلغاری
نظر آتے تھے۔ مغربی بلاک کے سفارت خانوں کا بھی حال کچھ اچھا نہ
تھا۔ ابتری اور انتشار سفارت خانوں میں بھی تھا۔ (باقی آئندہ)

ہم نے شاعر صاحب کے گھر کی اشیاء پر جو نظر ڈالی تو ہر شے شعر میں لت پت نظر آئی۔ پھر پتہ چلا کہ شاعر صاحب کی جو غزلیں بہت دنوں بعد مختلف رسالوں سے ناقابل اشاعت قرار پاکر واپس آتی ہیں انہیں وہ اپنے گھر کی چادروں پر چھپوا دیتے ہیں۔ تکیوں کے غلافوں پر چڑھا دیتے ہیں۔

ہم تکیوں کے ذریعے ادب کی ترقی کے مزید قائل ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بات پسند نہیں کہ ناقابل اشاعت اشعار بھی تکیوں پر چھاپے جائیں۔

"تکیہ کلام" سے یہاں ہماری مراد تکیہ کلام نہیں ہے جو بات چیت کے دوران بار بار مداخلت بے جا کرتا ہے۔ بلکہ یہاں "تکیہ کلام" سے مراد وہ کلام ہے جو تکیوں پر زیورِ طبع سے آراستہ ہوتا ہے۔ اور جس پر آپ اپنا سر رکھ کر سو جاتے ہیں۔ اور جو آپ کی نیندیں حلال کر دیتا ہے۔ پرسوں کی بات ہے کہ ہم نے ایک محفل میں غالب کا وہ شعر پڑھا کہ

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

اس شعر کو سن کر ایک صاحب پہلے تو چونکے پھر گہری سوچ میں غرق ہو گئے اور اپنا سر کھجاتے ہوئے بولے "اگر میرا حافظہ خراب نہیں ہے تو یہ شعر میں نے ضرور کہیں پڑھا ہے۔" ہم نے ان کی یادداشت کا امتحان لینے کی خاطر پوچھا۔

"تب تو سوچ کر بتائیے آپ نے یہ شعر کہاں پڑھا تھا؟"

وہ کچھ دیر سوچ کر بولے۔ "یہ شعر ہم نے رحمٰن خاں ٹھیکیدار کے تکیے کے غلاف پر پڑھا تھا۔ بھلا تمہیں یہ شعر کس طرح یاد ہو گیا۔ کیا تمہیں بھی اس تکیہ پر سونے کا اتفاق ہوا تھا۔"

ہم نے کہا۔ "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ شعر تو دیوان غالب میں موجود ہے۔ رحمٰن خاں ٹھیکیدار سے ہمارا کیا تعلق؟"

اس پر وہ بولے "بھئی دیوان غالب سے ہمارا کیا تعلق۔ ہم تو شعر و شاعری صرف تکیوں کے غلافوں پر پڑھ لیتے ہیں۔ جو شاعری آپ کو تکیوں کے غلافوں پر پڑھنے کو مل جاتی ہے اس کے لئے شعراء کے دواوین الٹنے پلٹنے کی کیا ضرورت ہے؟" ان صاحب کے جواب کو سن کر ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ جس زبان میں شعر و شاعری کی بہتات ہوتی ہے وہاں شعر و شاعری کا یہی حشر ہوتا ہے۔ شاعری کا پیمانۂ صبر اتنا لبریز ہو جاتا ہے کہ اشعار چھلک کر تکیوں پر گر جاتے ہیں۔ چاروں طرف بکھر جاتے ہیں، لاریوں کی پیشانیوں پر چپک جاتے ہیں۔ رکشاؤں کی پیٹھ پر بیٹھ جاتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ دسترخوانوں تک کی زینت بن جاتے ہیں۔ کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ ہم دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھے ہیں کہ اچانک دسترخوان پر چھپے ہوئے کسی شعر نے ہمیں چونکا دیا اور ہم کھانا کھانے کے بجائے سر دھنتے رہ گئے۔ بعض سخن فہم حضرات تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو دسترخوانوں پر "فارسی میڈیم" میں اشعار لکھواتے ہیں جیسے:

شکر بجا آر کہ مہمانِ تو
روزیِ خود می خورد از خوانِ تو

نتیجہ ان فارسی اشعار کی اشاعت کا یہ ہوتا ہے کہ مہمان کھانا کم کھاتے ہیں اور

یہ ہوتا ہے کہ اس شعر کے معنی و مفہوم سمجھنے کی کوشش زیادہ کرتے ہیں اور یوں تو جب وہ معنی و مفہوم کے چکر سے آزاد ہوتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے کہ میزبان نے سارا کھانا خود ہی کھا لیا ہے۔

دسترخوانوں کے اشعار کی بات چھوڑیئے کیونکہ اب ہم دسترخوانوں پر چنی جانے والی اشیاء خورد و نوش میں مختلف ملاوٹوں کے علاوہ اشعار کی ملاوٹ کے بھی عادی ہو گئے ہیں، اور یہاں یہ بات "تکیوں" اور ان کے "کلام" کی چل رہی ہے۔ اور ہم نے ایسے معرکۃ الآرا اشعار تکیوں پر دیکھے ہیں کہ اگر کوئی ان تکیوں پر سو جائے تو پھر زندگی بھر ان کی تکیوں پر سے اٹھنے کا نام نہ لے۔

ہمیں ایک بار سفر پر جانے کا اتفاق ہوا ایک تنہا سا کے ہاں مہمان ٹھہرے حسب روایت بستر ہم چونکہ ساتھ نہیں لے گئے اس لئے میزبان نے ہمارے بستر کا انتظام کیا۔ اب جو ہم بستر پر پہنچتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ تکیے پر نہایت جلی حروف میں یہ لکھا ہوا ہے کہ:

کسی کے حسن کا جادو بسا ہے تکیہ میں
جہانِ عارض و گیسو بسا ہے تکیہ میں

اب آپ سے کیا بتائیں کہ ہمارے حق میں یہ بستر، بستر مرگ ثابت ہوا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے ساختر شماری تک کرتے ہر بار یہی سوچتے رہے کہ آخر تکیہ میں کس کے حسن کا جادو ہے۔ آخر وہ کون مہ جبین ہے جس کا "جہانِ عارض و گیسو" اس تکیہ میں پنہاں ہے۔ بار بار تکیے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اس تکیے میں ہم میں وہ سارے آثار پیدا کر دیئے جو آغاز عشق کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ وفورِ عشق نے اتنا سر اٹھایا کہ ہم بار بار تکیے پر اپنا سر پٹکتے رہے بالآخر ہم نے فیصلہ کر لیا کہ صبح ہوگی تو ہم اس نازنین کو ضرور دیکھیں گے۔ جس کے حسن کا جادو اس تکیے کے توسط سے ہمارے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ صبح ہوئی تو ہم نے چوری چھپے اس نازنین کو دیکھ ہی لیا اور اس نازنین کے ڈیل ڈول اور وضع قطع کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ دراصل یہ شعر تکیہ پر نہیں بلکہ "گاؤ تکیے" پر لکھنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ان کے حسن کا "محمل" صرف گاؤ تکیہ ہی ہو سکتا تھا۔

اس واقعہ کے بعد سے تکیے کے اشعار پڑھنے سے خوف ہوتا ہے... ایمان اٹھ گیا بلکہ جب بھی کوئی منظوم تکیہ ہمارے سر کے نیچے آیا تو ہم نے چپکے سے اس کا غلاف اتار لیا کہ کون اپنی نیند حرام کرے۔ اگر آپ کو نیند آتی ہے تو آپ نے تکیوں کے وہ اشعار ضرور پڑھے ہوں گے جن پر سو کر آپ نہایت ڈراؤنے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار حاضر ہوں۔ عرض کیا ہے کہ۔ ؎

کونین تک سمیٹ لئے ہیں غلاف میں
ٹکڑے جگر کے ٹانک دیئے ہیں غلاف میں

خوابہائے دل نشیں کا اک جہاں آباد ہو
تکیہ جنت سے اٹھا لائیں اگر ارشاد ہو

چمن در چمن ہے غلاف آیئے تو
ذرا اس پہ آرام فرمایئے تو

غنچہ ہائے دل کھلے سر رکھ کے گستاخی معاف
گلشنِ امید کے سب پھول چن لایا غلاف

غور فرمایئے کہ ان اشعار پر کیا آپ "تکیہ" کر سکتے ہیں۔ گویا تکیہ نہ ہوا الہ دین کا چراغ ہوا کہ کونین تک اس میں سمٹ کر آ گئے ہیں۔

ہمیں یاد ہے کہ ہمارے ایک دوست کو "ادھورے خواب" دیکھنے کی بیماری تھی وہ تھوڑا سا خواب دیکھتے کہ بجلی فیل ہو جاتی ہے۔ اور وہ نیند سے چونک پڑتے تھے ایک دن ہم سے بولے "بھئی عجیب بات ہے کہ مجھے ادھورے خواب نظر آتے ہیں۔ آخر پورے خواب کیوں نظر نہیں آتے"۔ "میں خوابوں کے "ٹریلر" دیکھتے دیکھتے عاجز آ گیا ہوں"! ہم نے ان کے بستر کا معائنہ کیا تو ان کے تکیے پر ایسا شعر لکھا ہوا دیکھا جو "بحر" سے خارج ہے۔ اس پر ہم نے کہا بھئی! اس کا اصل راز یہ ہے کہ تم ایسے تکیے پر سو جاتے ہو جس پر بے بحر شعر لکھا ہے۔ اور اس تکیے کی کرامت سے تمہارے خواب بھی بحر سے خارج ہو جاتے ہیں اس شعر کو بدل دو تو تمہارے خوابوں کی صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔

یہ تو ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ ہمارے ایک اور دوست کا

قصہ ہے کہ انھیں عرصہ سے "بلڈپریشر" کی شکایت تھی۔ جب وہ بستر پر سو جاتے تو ان کا "بلڈپریشر" آسمان سے باتیں کرنے لگتا۔ جب وہ ایلوپیتھی سے سے فائدہ نہ ہوا تو ایک حکیم صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ حکیم صاحب نے ان کا بغور معائنہ کیا۔ ساری دکھتی رگیں پکڑی گئیں۔ زبان اتنی بار نکلوائی کہ وہ ہانپنے لگے۔ مگر اسی اثنا میں حکیم صاحب کی نظر تکیے پر پڑی، اور وہ تکیے کی جانب لپکے شعر کو غور سے پڑھا اور تنک کر بولے اس تکیے کو ابھی یہاں سے ہٹا دیجئے۔ بلڈ پریشر کی اصل جڑ تو اس تکیے سے پھوٹ رہی ہے۔ واہ صاحب واہ کمال کر دیا آپ نے۔ آپ کو بلڈ پریشر کی شکایت ہے اور آپ نے شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا شعر تکیہ پر طبع کروا رکھا ہے۔ جانتے ہو جوش کی شاعری میں کتنا جوش ہوتا ہے۔ جوش کے شعر پر آپ سو جائیں گے تو دورانِ خون نہیں بڑھے گا تو اور کیا ہوگا؟ اس تکیہ کو اسی وقت یہاں سے نکالئے خبردار جو آئندہ سے آپ نے جوش کے تکیے پر سر رکھا۔ اگر شعر والا ہونا ایسا ہی ضروری ہے تو داغ کے غلاف پر سو جائیے، جگر کے غلاف کو اپنے سر کے نیچے رکھیے۔ ان کے شعرا کا کلام آپ کے بلڈ پریشر کو کم کر دے گا۔ آپ کو فرحت ملیگی۔ بھوک زیادہ لگے گی۔ آپ کے جسم میں خون کی مقدار میں اضافہ ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ

حکیم صاحب کے اس مشورے کے بعد ہمارے دوست نے نہ صرف "جوش کا غلاف" بدل دیا بلکہ اب وہ جوش کے کلام کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتے ہیں کہ کہیں بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق نہ ہو جائے۔

لیکن تکیوں کے کلام کی ایک افادیت بھی ہوتی ہے جس کا راز صرف اہلِ دل ہی جانتے ہیں۔ راز یہ ہے کہ ایک صاحب کی شادی صرف تکیوں کے ان اشعار ہی کے باعث ہوئی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ یہ صاحب کہیں مہمان گئے ہوئے تھے۔ رات کو میزبان کے گھر میں سے انکے لئے جب بستر آیا تو اس میں ایک تکیہ بھی تھا جس پر یہ شعر لکھا تھا: ؎

شمیم طرۂ گیسوئے یار لایا ہوں
میں اپنے ساتھ چمن کی بہار لایا ہوں

آدمی چونکہ ہوشیار تھے اسی لئے اس غلاف کا مطلب سمجھ گئے۔

دوسرے دن بازار گئے اور ایک ریڈی میڈ غلاف خرید لائے جس پر یہ شعر لکھا تھا۔

اٹھا تو سر ٹیک دیا تکیے پہ بار بار
شب بھر گواہ یہ بھی مرے دردِ دل کا تھا

انھوں نے چپکے سے تکیہ کا پرانا غلاف اتارا اور اپنا غلاف اس پر چڑھا دیا۔ اب یہ تکیہ ان کا پیام لے کر اندر واپس ہوا۔ نہ جانے اس شعر نے اندر کیا کیا قیامت مچائی۔ مگر جب شام میں پھر تکیہ بستر پر واپس ہوا تو اس پر ایک نیا شعر لکھا تھا۔ ؎

مرا جذبِ دل میرے کام آ رہا ہے
اب ان کی طرف سے پیام آ رہا ہے

دوسرے دن ان صاحب نے یہ غلاف بھی اتار دیا اور پھر ایک ریڈی میڈ غلاف چڑھا دیا اس کے بول تھے۔ ؎

رات بھر دیدۂ غم ناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

غرض اس "تکیہ بردار" عشق نے وہ جوش مارا کہ سلام و پیام کا سلسلہ بڑھتا رہا۔ اور بالآخر ان دونوں کی شادی ہو گئی اور اب یہ دونوں ایک ہی شعر پر تکیہ کر رہے ہیں۔ لیکن اب ان کے تکیوں کے اشعار کی ماہیت قلبی تبدیل ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہم نے برسوں ان کی خوابگاہ میں جو تازہ تکیہ دیکھا تھا اس پر یہ شعر درج تھا۔ ؎

اس سیہ بخت کی راتیں بھی کوئی راتیں ہیں
خوابِ راحت بھی جسے خواب پریشاں ہو جائے

یہ تو خیر عام آدمیوں کے تکیوں کی بات تھی۔ اگر آپ کو دانشمندوں کے تکیوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ یقیناً دنگ رہ گئے ہونگے۔ ان تکیوں پر ایسے صوفیانہ اور فلسفیانہ اشعار لکھے جاتے ہیں کہ اچھا خاصا آدمی فلسفی بننے کی کوشش کر بیٹھے۔ مثلاً ایک اسکول قسم کے صاحب نے اپنے تکیے پر یہ شعر لکھوا رکھا تھا۔ ؎

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

سچ پوچھئے تو اس تکیے پر کوئی عام آدمی سو ہی نہیں سکتا ایسے فلسفیانہ شعر پر تو صرف ایک دانشمند ہی سو سکتا ہے اور اسے ایسے ہی فلسفیانہ تکیے زیب دیتے ہیں۔

آئیے اب ذرا شعراء کے تکیوں کی بات ہو جائے جن کیلئے شاعری

اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے۔ یعنی انکے تکیوں پر شعر ہوتے ہیں۔ اور حد تو یہ کہ ہم نے ایک شاعر صاحب کی مچھر دانی پر بھی شعروں کا جنگل اگا ہوا دیکھا ہے ہم نے ایک شاعر کے گھر میں ایک منظوم تکیہ دیکھا جس پر یہ شعر درج تھا۔

یار سوتا ہے بصد ناز بصد رعنائی
محوِ نظارہ ہوں بیدار کروں یا نہ کروں

ہم نے اس شعر کو پڑھکر کہا بھئی واہ کیا خوب شعر کہا ہے "کس کا شعر ہے؟"

ہمارے سوال کو سن کر انکا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ بولے معاف کیجئے میں دوسرے کے کلام پر تکیہ نہیں کرتا۔ یہ شعر میرا ذاتی ہے اور یہ بات میری خودداری کے خلاف ہے کہ میں دوسرے کے اشعار پہ سو جاؤں آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کوئی شاعر اپنے تکیے پر میر کا شعر لکھ مارے۔

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

ہم نے انکی ناراضگی دیکھکر معافی مانگ لی اور چپ ہو رہے بعد میں ان کے گھر کی اشیاء پر جو نظر ڈالی تو ہر شے شعر میں لت پت نظر آئی پھر بہت دنوں بعد پتہ چلا کہ ان شاعر صاحب کی جو غزلیں مختلف رسالوں سے "ناقابلِ اشاعت" قرار پاکر واپس آتی ہیں۔ انھیں وہ اپنے گھر کی چادروں پر چھپوا دیتے ہیں تکیہ کے غلافوں پر مڑھا دیتے ہیں۔ اور انھیں میز پوشوں زیور طبع سے آراستہ کرتے ہیں۔ ہم تکیوں کے ذریعے ادب کی ترقی کے ضرور قائل ہیں لیکن ہمیں یہ بات پسند نہیں کہ "ناقابلِ اشاعت" اشعار تکیوں پر چھاپے جائیں۔ پھر جب ہماری شاعری میں نئے رجحانات آرہے ہیں تو تکیوں میں بھی نئے رجحانات آنا نہایت ضروری ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی سخن فہم صاحب اپنے تکیے پر آزاد نظم لکھوالیں اگر تکیہ اس نظم کو قبول کرنے میں تنگیِ داماں کا شکوہ کرے تو اس نظم کو دو تین تکیوں پر شائع کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً نظم کا ایک بند تو ایک تکیہ پر ہوا اور اس کے نیچے یہ عبارت درج ہو کہ:۔

"براہِ کرم تکیہ اُلٹیے" اور تکیہ اُلٹنے پر بھی نہ بنے تو نیچے یہ عبارت لکھی جائے کہ باقی نظم ملاحظہ ہو گاؤ تکیہ نمبر (۱) پر اور گاؤ تکیہ بھی اس کی طوالت کو نہ برداشت کر سکے تو اسکے نیچے لکھا جائے باقی نظم ملاحظہ ہو فلاں تکیے کے غلاف پر اور جب یہ نظم ختم ہو جائے تو اسکے نیچے "غیر مطبوعہ" کے الفاظ کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ "منظوم تکیوں" کے شائقین اپنے تکیوں کو نئے رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی فرمائیں گے۔

سب سے آخر میں ہم اس مضمون کیلئے ان خاتون کے تہہ دل سے مشکور ہیں جن سے ہم نے تکیوں کے چند اشعار مانگے تو انھوں نے اپنے نوکر کو ہمارے گھر بھیجا۔ اس نوکر نے آتے ہی کہا کہ ہم سے کہا صاحب اپنے نوکر کو باہر بھیجیے تاکہ وہ تکیے کہ اشعار رکشہ میں سے اتار سکے"۔

ہم نے حیرت سے پوچھا: "تمہاری بیگم صاحبہ نے آخر اتنے اشعار کیوں بھیجے کہ انھیں رکشہ میں ڈال کر تمہیں یہاں لانا پڑا؟"

وہ بولا "صاحب! آپ نے بیگم صاحبہ سے تکیے کے اشعار مانگے تھے اور انہوں نے اپنے گھر کے سارے تکیے آپ کے پاس بھجوا دیئے ہیں۔ آپ ان تکیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد انھیں واپس بھیج دیجئے۔

پھر ہم اس دھوبی کے بھی ممنون ہیں جو گھاٹ پر کپڑے دھو رہا تھا ہم نے اس دھوبی کو دیکھا کہ وہ ایک کپڑا پانی میں سے نکالتا ہے، اسے کھولتا ہے پھر اپنی عینک آنکھوں پر لگاتا ہے۔ کپڑے پر کوئی عبارت پڑھتا ہے اور پھر اسی کپڑے کو پتھر پر زور زور سے پٹکنے لگتا ہے۔ ہم نے اسکی اس حرکت کا بغور مشاہدہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ بعض کپڑے تو زور سے پٹختا ہے اور بعض نہایت آہستگی اور سلیقہ سے دھوتا ہے۔

ہم نے پوچھا "بھئی! تم اس قدر کپڑے زور سے پٹختے ہو اور بعض نہایت آہستگی سے! آخر کیا راز ہے؟"

وہ بولا "صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میں ——
ہر غلاف کو دھونے سے پہلے اسے کھولتا ہوں اور اس پر لکھا ہوا شعر پڑھتا ہوں اگر شعر مجھے پسند نہ آئے تو اس غلاف کو پتھر پر زور زور سے پٹختا ہوں یعنی ادبی اصطلاح میں "ہوٹنگ" کرتا ہوں۔ اگر اتفاق سے کوئی شعر پسند آئے تو اسے نہایت سلیقہ سے دھوتا ہوں کیونکہ اچھا شعر ساری قوم کی امانت ہوتا ہے۔ ہم اس ادب دوست دھوبی اور اس کے گدھے کے بھی جو ان اشعار کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے پھرتا ہے ممنون ہیں کہ اس نے بعض اچھے اشعار ہمیں فراہم کئے جو اس مضمون میں شریک نہیں۔ ■■

اس عنوان کے تحت
اردو جرائد میں شائع ہونے والی بہترین تخلیقات
کا انتخاب شائع کیا جاتا ہے (ادارہ)

آمنہ ابوالحسن

سوال
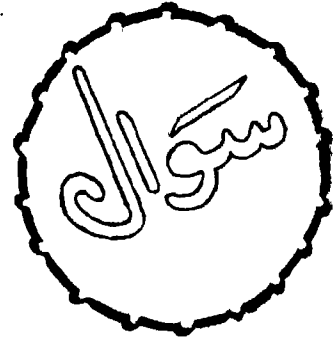
کرب کے احساس سے آنسو
اس کی ذات میں احساس کی طرح
ٹپکنے لگے — نہیں نہیں اس نے
خود کو یقین دلانا چاہا۔
ساہوکار جھوٹا ہے۔ میرے ماں باپ
مجھے بیچ نہیں سکتے۔ کبھی نہیں؟
مگر پھر —
یہ جشن — یہ خوشی؟

الشجاع

سوکھی ہوئی زمین کے سرے پر پھول پتوں سے خالی ننگ دھڑنگ درخت سے پرے شام کا سورج دھیرے دھیرے اوجھل ہو رہا تھا اور عبداللہ کے ستے ہوئے چہرے پر دہشت کے آثار شدید ہوتے جا رہے تھے کم ہوتی ہوئی روشنی اور پھیلتے ہوتے سایوں میں اس کے سوکھے ہوئے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور پھیلا ہوا منہ بے حد خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ کوٹھری کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے اس نے پانچویں بار آواز نکالی۔

"اختر کی ماں۔ اختر تیار ہو گئی یا نہیں — ؟"

اور اندھیری کوٹھری سے ہر بار ایک مسخ نقاہت بھری آواز آئی۔

"ہو رہی ہے۔ تیار ہو رہی ہے" اس آواز کے کرب سے قطع نظر خود ماحول میں ایک قسم کا کرب تھا۔ قحط کا۔ اناج کی عدم دستیابی کا کرب —

حدِ نگاہ تک بے برگ و بار درخت، سوکھی ہوئی خشک زمین، مرجھائے ہوئے بے رونق چہرے۔ سوکھے ہوئے بے جان جسم، آہ و بکا اور ان سب کے پس منظر سے ایک ہی ابھرتی ہوئی آواز۔ ایک ہی مطالبہ۔ روٹی — روٹی — روٹی — ؟

ہڈیوں کے پنجر جانور اور انسان جو بے حد متلاشی نظروں سے ایک دوسرے سے الجھ الجھ کر پوچھ رہے تھے۔ کچھ کھانے کو مل سکے گا۔ روکھا سوکھا۔ باسی تو اسی — مگر کسی کے لبوں پر اثباتی جواب نہ تھا۔ ہر آنکھ میں آنسو۔ ہر پیٹ میں بھوک۔ اور ہر ماتھے پر فکر کی گہری شکنیں تھیں۔ ایسے میں بستی کے نام نہاد ساہوکار کا عبداللہ کے گھر آنا اور اس کی بیٹی کی قیمت لگانا کتنا خوش نصیبی کا موقع تھا۔ پچھلے کئی دن سے بھوک کے خلاف جہاد کرتے کرتے اب عبداللہ خود بے حد نڈھال ہو گیا تھا۔ اس کے مویشی مر چکے تھے اور اب بچوں کی باری تھی۔ اب تک وہ بھی دوسروں کی طرح درخت کی جڑیں اور بوٹیاں ابال ابال کر اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا تھا۔ مگر جب ہر آدمی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے تو یہ بھی آخر کب تک ساتھ دیتیں۔ چنانچہ عبداللہ نے اپنی آن بان اور عزت کا لحاظ نہ کر کے ساہوکار کی مانگ قبول کر لی تھی حالانکہ پہلے پہلے وہ اس بات کو سن کر بھوک پیاس کی شدت میں بھی بکھر گیا تھا اور اس نے ساہوکار کا گلا پکڑ لیا تھا مگر پھر اسے یاد آیا کہ بچوں کو موت کے منہ سے بچانے کا فی الحال یہی ایک طریقہ ہو سکتا ہے اور تب فوراً وہ شرمندہ ہو گیا اور اس نے اپنا ہاتھ ساہوکار کے گلے سے کھینچ لیا اور بولا — "بھوکا انسان جانور سے کم نہیں ہوتا۔ مجھے معاف کر دو۔"

ساہوکار نے معنی خیز ہنسی کے ساتھ عبداللہ کے کان میں کہا۔ میں اختری کے لئے گودام کا منہ کھول سکتا ہوں اور سن لو کہ اس گودام کی تلاش میں پولیس پچھلے

کئی دن سے حیران و پریشان ہے مگر ـــ نہ یہ گودام پولیس کے لئے ہے نہ کالی کلوٹی لڑکیوں کے لئے۔ سن لیا نا ـــ ؟ " پھر وہ سڑ پڑ کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ اور عبداللہ نے سوچا۔ واقعی پہلے تو ساہوکار کی مہربانی ہے پھر اپنے اچھے نصیب ورنہ آج کل تو اناج سونے کے مول نہیں۔ سونا دے کر بھی لوگ اناج نہیں پا رہے ہیں۔ تب خوش خوش وہ لپکا ہوا فوراً اپنی بیوی کے پاس گیا اور دھیرے سے بولا " اختر کی ماں۔ اختر کا بیاہ قبول کرو۔"

اپنا لٹا ہوا چہرہ اور بجھی ہوئی ملگجی آنکھیں اوپر اٹھا کر اس کی بیوی نے تلخی سے کہا۔

" آگ لگے بیاہ کو۔ تن کو کپڑا پیٹ کو روٹی میسر نہیں اور چلے ہو بیاہ کی بات کرنے۔"

" ارے کپڑے کی بات چھوڑو جی۔ پیٹ کی روٹی کے لئے ہی تو یہ بیاہ کر رہا ہوں۔"

عورت نے زیادہ ناگواری کے انداز میں اپنے مرد کی جانب دیکھا اور زیادہ کڑوے لہجے میں بولی۔ " تو صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ بیٹی کو بیچ دینا چاہتے ہو۔ مگر۔ مول تول کا نام تو بیاہ نہیں ہو سکتا کبھی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آواز رندھ گئی اور اس نے اپنا سر ایک جھٹکے سے نیچے جھکا لیا۔

کھڑا ہوا عبداللہ ایک لخت اس کے بازو بیٹھ گیا۔ اس کے گھومے ہوئے چہرے کو اپنی طرف پلٹاتے ہوئے بولا۔

" تو تمہیں یہ گھمنڈ ہے کہ تم ہی ماں ہو۔ میں باپ نہیں "

" ہاں " عورت نے غصے اور حقارت سے کہا۔ " باپ قصائی نہیں ہوتے۔ مر سکتے ہیں لیکن اپنی اولاد کا سودا نہیں کر سکتے۔"

عبداللہ نے عورت کا سوکھا غصہ کی آگ میں جلتا چہرہ اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا اور کرخت آواز میں بولا۔

اختر کی ماں اختر کی قربانی سے ہم دوسرے بچوں کی زندگی بچا سکتے ہیں۔

عورت کی آنکھوں میں اپنے ننھے بچوں کے چیخے چلاتے روتے بسورتے، تڑپتے ہوئے چہرے گھوم گئے۔ اختر تو سمجھدار ہے سمجھانے پر سمجھ سکتی ہے۔ اس نے سوچا اور جھٹ آنسو پونچھ لئے اور یک لخت اپنے شوہر کی جانب گھوم کر نرمی سے بولی " ہاں ہاں۔ مگر کیا ـــ کب آئے گا ساہوکار۔ کب اختر کو اس کے ساتھ بھجوانا ہوگا "

" شام میں۔ جب سورج ڈھل جائے گا۔ سائے چڑھ جائیں گے جب تاریکی ہر شے پر ایک گہرا نقاب ڈال دے گی۔"

اور پھر لیا فاقہ زدہ دن کچھوے کی طرح رینگ رینگ کر ہی آگے بڑھا تھا۔ جھلنگی کھاٹ پر بے تابی سے کروٹیں بدلتی ہوئی اختر نے بڑی بے قراری سے ماں سے پوچھا " کب تک مجھے ساہوکار کے گھر رہنا ہوگا ماں۔ اور کیا کیا کرنا ہوگا وہاں۔ کام تو مجھے سب آتا ہے مگر کیا میں تم لوگوں سے پھر کبھی نہیں ملوں گی ـــ ؟ "

تو اس وقت ماں کے دل میں ایک خنجر سا لگ گیا مگر بظاہر مسکرا کر اور خود کو سنبھال کر اس نے کہا ـــ ڈرتی ہے پگلی۔ میری بیٹی ہو کر ڈرتی ہے۔ ارے میں نے کیسے کیسے موقعے ہنسی خوشی نہ برداشت کر لئے پھر تو تو خوب خوش رہے گی وہاں اور پھر جب تو لوٹے گی تو شاید تیرے ہاتھ میں سونے کے کنگن بھی ہوں۔ اور .... اور ... " ماں کی آواز رندھ گئی۔ مگر بھوک سے نڈھال اختر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ " سونے کے کنگن ؟ " اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور کوندے کی طرح اس لپک نے اس سولہ سالہ لڑکی کے سارے دبے ہوئے نقوش ابھار دیئے ـــ

" مگر مجھے۔ ساہوکار کی مونچھوں سے چڑ ہے ماں۔ بڑی گھن آتی "

" ہوتا ہے بیٹی۔ ہوتا ہے مگر یہ سب چیزیں نا قابل برداشت نہیں "

اور جب تک ماں اختر کو باتیں سمجھاتی رہی۔ زندگی کی مجبوریوں اور اونچ نیچ کی بابت واقف کراتی رہی تب تک عبداللہ بے قراری سے باہر ٹہلتا رہا۔ بار بار آنکھوں پر انگلیوں کا چھجہ بنا کر سورج کو تکتا رہا۔ زمین پر دھوپ کی لو ہ لیتا رہا۔ اب دن گزرا کہ اب ـــ

اسے اپنی بیوی اور بیٹی کی باتوں سے مطلق کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو فقط شام کا انتظار تھا۔ سورج ڈھلے گا۔ ساہوکار کی آمد کا سفید جوار اور موٹے چاول کا۔ کب سے اس نے چولہے پر رکھی ہانڈی کی کھٹ کھٹ بجنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ تب سے پہیلی کروٹیں بدلتی جوار کی موٹی روٹی کا نظارہ

نہیں کیا تھا۔ لہسن اور ہری مرچ کی چٹنی کی خوشبو نہیں سونگھی تھی۔ پیاز کے قتلے نہیں چبائے تھے۔ اور ایک وہی کیا۔ بستی کے متمول لوگوں تک کی یہی حالت تھی۔ لوگوں کے پاس پیسہ ہو تو ہو اناج نہیں تھا اور دعائیں۔ منتیں مرادیں کیا نہیں کی جا رہی تھیں۔ انسانی گناہوں کی معافی اور بخشش کی آرزو میں۔

ایسے میں ساہوکار کی مہربانی طماشبہ اندھیرے میں اجالے کی وہ کرن تھی جو کم از کم عبداللہ کے گھر سے فاقہ مستی کی سیاہی جلد ہی کھرچنے والی تھی

اب آفتاب کی آتشیں ٹکیہ شفق کے رنگ میں ڈوب چکی تھی اور نظروں سے اوجھل ہوا ہی چاہتی تھی۔ اور تاریکی سے خائف انسان تاریکی کا منتظر تھا۔ وقت گزاری کے لئے وہ ہر تھوڑی دیر بعد آواز دے کر اختیاط لوچھ لیتا کہ اختر تیار ہے یا نہیں۔ پھر دور سے ملگجے کی چھاتی سے تیز تیز قدموں کی مبہم چاپ سنائی دی اور یہ بتدریج واضح ہوتی گئی تھی کہ پژمردہ ماحول کے پس منظر سے ایک چاق و چوبند۔ چکنا چکنا چہرہ نمایاں ہوا اور اپنے دانت نکوس کر دبادبا سا گھگھیاتا ہوا قہقہہ لگا کر بولا۔ "کیوں ابھی دیر تو نہیں ہے؟"

عبداللہ کی نظریں اس حریص چہرے کو پھلانگ کر اردگرد کی آوارہ گردی میں مصروف ہو گئیں۔ ارے یہ تو خالی ہاتھ ہے۔ پھر؟

مگر عبداللہ کے سوال سے قبل اس کی بےچینی اور اس کے مطلب کو بھانپ کر ساہوکار خود بولا۔ "یکہ میں بوریاں آتی ہی ہوں گی۔ بوریاں نیچے اور لڑکی یکہ میں سوار۔ سمجھ گئے نا؟"

عبداللہ کے کھنچے ہوئے اعصاب مائل بہ سکون ہو گئے۔ اس نے اپنے خشک حلق کو تھوک سے تر کیا۔ پپڑیاں جمے ہوئے ہونٹوں پہ زبان پھیری اور لپک کر اندر ہو لیا۔ "اختر کی ماں۔ اختر کو باہر لاؤ"

ماں نے اپنے بہت سے آنسوؤں کو آنکھوں میں ہی روک کر ایک دبی ہوئی سسکی بھری اور اختر کو قریب کر کے اس کا ماتھا چوم کر اسے باہر دھکیلتی ہوئی بولی۔

"جاؤ بیٹی۔ خدا حافظ"

اختر کو گھر چھوڑ کر ساہوکار کے ساتھ جانے کا رنج تو بہت تھا۔ مگر سونے کے کنگن کی خوشی بھی۔ سو اس نے ذرا سے پس و پیش کے بعد باپ کا ہاتھ تھام لیا اور آگے بڑھ گئی۔

الشجاع

تبھی یکہ کوٹھری کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ یکے والے نے بوریاں اتار کر عبداللہ کی اندھیری کوٹھری میں پہنچائیں اور کوٹھری کے نوعمر اجالے کو یکے میں چھپا لیا۔

اور جب شام سرک کر سیاہی کے لبادے میں پوری طرح گھل مل گئی اور ستارے ہزاروں فاقہ زدوں کے سروں پہ ان کی بھوک پیاس اور تڑپ سے بےپرواہ جب جھلک لئے تو تھالی میں مٹھائی اور لڈو لئے ہوئے ساہوکار اختر کے پاس آیا اور میٹھی آواز میں بولا۔ "تمہیں مٹھائی پسند ہے نا اختر؟"

"ہاں مگر تم اپنی مونچھیں دور ہی رکھو۔"

اچھا اچھا۔ میں صبح اپنی مونچھیں منڈوا دوں گا مگر اب تو مجھے بخش دو"

مگر جیسے ہی وہ اختر کے پاس بیٹھنے لگا اختر کود کر پلنگ سے نیچے اتر گئی اور دور ہی سے اس نے معصومیت سے کہا۔

"پہلے لاؤ میرے سونے کے کنگن۔"

"سونے کے کنگن؟" ساہوکار نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ جو ماں نے تمہارے پاس رکھوائے ہیں۔"

"خوب" ساہوکار نے برا سا منہ بنایا اور پھر مصلحتاً ہنستا ہنستا بولا۔ "ہاں ہاں۔ سونے کے کنگن بھی بن جائیں گے مگر پہلے تم میری رانی تو بن لو"

"رانی؟" اختر نے حقارت سے کہا۔ "بکواس نہ کرو ساہوکار۔ میں رانی وانی بننے یہاں نہیں آئی۔ کام کرنے آئی ہوں۔ ماں نے مجھے ضرور کہا تھا کہ کچھ دن تمہارے ساتھ رہنا ہوگا۔ مگر تم سیدھے سیدھے کام بتاؤ ورنہ تمہاری مونچھیں تمہاری گردن سمیت تمہارے بدن سے الگ ہوں گی ہاں۔"

ارے میری بگلی۔ خفا ہو گئی۔ اری کام تو نوکر کرتے ہیں اور کوئی تم نوکر بننے یہاں آئی ہو۔ خوب ٹھاٹ سے رہو۔ حکم چلاؤ۔ تمہیں تو میں اپنے دل کی رانی بنانے یہاں لایا ہوں۔ مگر تمہاری ماں نے تمہارے ہاتھوں میں مہندی تک نہ لگائی۔ ساوکھو۔ عجب عورت ہے وہ بھی۔"

"اسے" اختر نے دھاڑ کر کہا۔ "تم بہت بڑھتے جا رہے ہو۔ اگر تم نے آگے میری ماں کو کچھ کہا تو یاد رکھنا۔"

ارے واہ۔ یہ تو خوب بات ہوئی یعنی باپ جیت اور لڑکی مست

سونے کا معمولی اناج گھسیٹ لیا اور اب اوپر سے رعب بھی گانٹھ رہی ہو۔ ارے ساہوکار ہوں ساہوکار۔ چاہوں تو تیرے باپ کو جیل بھی بھجوا سکتا ہوں۔ سمجھتی کیا ہے؟ کیا دو بورے اناج یوں ہی مفت دے دیتے؟ تیرے بدلے میں دیتے ہیں پھر تو مجھے آنکھیں کیوں دکھا رہی ہے آخر۔"

"کیا کیا۔ کیا کہا۔" اختر نے حیرت سے پوچھا۔ پھر اس نے ساہوکار کا گلا پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ "کیا میرے ماں باپ نے مجھے بیچ دیا ہے تجھے جو تو مجھے آنکھیں دکھانا چاہتا ہے اور واہی تباہی بکنا چاہتا ہے۔"

"ہاں ہاں" ساہوکار نے بھی اب غصے اور جھنجھلاہٹ سے کہا۔ "تیرا باپ تو اتنا لالچی ہے کہ اس نے صرف دو بوریوں کے لئے تجھے میرے ہاتھ بیچ دیا۔"

یہ سن کر اختر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جو کھانا اس نے ساہوکار کے گھر کچھ دیر پہلے کھایا تھا وہ اب الٹ الٹ کے آنے لگا۔ مٹھائی کی تھالی کو پاؤں سے ٹھوکر لگا کر اس نے سہمے ہوئے ساہوکار کو گریبان سے دبوچ لیا اور کھینچتی ہوئی بولی۔ "چل۔ چل تو میرے باپ کے سامنے۔ مجھے تیری بات کا یقین نہیں۔ وہاں چل کے کہنا یہ سب باتیں تب میں مانوں گی۔"

مگر پولیس پنچایت کے ڈر سے ساہوکار کی اتنے ہی میں گھگھی بندھ گئی۔

"ارے یہ تو بڑا دھوکا ہوگیا۔ تو تو بڑی طرار چھوکری نکلی۔ تیرے باپ نے مجھے ٹھگ لیا۔ ہائے میرا دو بوری اناج۔" وہ خود کو اختر کی مضبوط گرفت سے چھڑا کر پلنگ پر اوندھا گر گیا اور عورتوں کی طرح بسورنے لگا۔

پھڑپھڑاتی ہوئی اختر زخمی کبوتر کی طرح دروازہ کھول کر باہر نکلی اور بے خوف سیدھے سپاٹ راستے پر اپنے گھر کی سمت دوڑنے لگی۔

رات کی مہیب تاریکی۔ بچوں کی چیخ و پکار۔ عورتوں کی سسکیاں بھوک کو طرح طرح سے بہلاتے ہوئے انسانوں کے انجر پنجر اسے بالکل آسیبوں کی طرح لگے۔

انسان جس نے مشینیں ایجاد کیں وہ زمین کے سینے سے اناج کیوں نہیں اگا سکا۔ یہی سوچتے سوچتے بھاگم بھاگ وہ بالآخر اپنے گھر پہنچ گئی۔ ساہوکار کی توہین آمیز حرکتیں۔ اس کی نازیبا باتیں ابھی تک بجلی کی طرح اس کے جسم میں دوڑ رہی تھیں۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ وہ ساہوکار کا سر پتھر سے کچل دینا چاہتی تھی مگر پہلے اس بات کا اشتعا

یقین ضروری تھا کہ کیا اس کے ماں باپ نے اسے واقعی بیچ دیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسے اپنے ماں باپ سے شدید قسم کی نفرت محسوس ہوئی۔ بلکہ ساری دنیا سے ہی نفرت اور بیزاری۔ بھوک، جہالت، افلاس اس کے سوا دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔ مگر وہ تو ان سب حالتوں میں بھی خوش تھی۔ اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں مست مگن۔ پھر اس کے ماں باپ کو یہ کیا سوجھی۔

غصے میں اس نے بند دروازے کو پیٹ ڈالنا چاہا مگر چونکہ دروازہ خلاف معمول بند تھا۔ لہٰذا اس نے ضبط سے کام لے کر یہ جاننے کے لئے کہ اس کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ اس نے درزوں سے اپنی آنکھیں لگا دیں۔

طاق میں روشن بے حد مدھم چراغ کے اجالے میں اس نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ دو خوب پھولے ہوئے بورے مختلف قسم کے میلے کچیلے چیتھڑوں سے بمشکل چھپا دیئے گئے ہیں اور اس کے سارے بہن بھائی باپ کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگائے بڑے ہوشیار ہوشیار چوکنے سے بیٹھے ہیں اور تھالے میں کٹی ہوئی لہسن کی چٹنی خوشبو دے رہی ہے اور پیاز کی ڈلیاں چمک رہی ہیں اور ماں تھرتھراتے ہاتھوں سے موٹی موٹی جوار کی روٹیاں چھوروں کی طرح جلد جلد گڑھ رہی ہے۔

یک لخت اختر کا سارا وجود ایک چیخ میں تبدیل ہوگیا مگر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ زور سے بند کر لیا۔ اسے اپنے خاندان کی حرص پر غصہ تو آیا مگر تھوڑی دیر پہلے کی اپنی وہ حالت بھی یاد آئی جب وہ ساہوکار کے گھر سخت نفرت کے باوجود اس کے دیئے ہوئے کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی اور اس وقت سچ مچ اسے کوئی یاد نہ آیا تھا۔ نہ ماں باپ نہ بہن بھائی۔ مگر اب؟ کسی نامعلوم کرب کے احساس سے آنسو اس کی ذات میں آندھی کی طرح لپکنے لگے۔ وہ نڈھال نڈھال سی کنویں کی مینڈ پہ جا بیٹھی۔ نہیں نہیں۔ اس نے خود کو یقین دلانا چاہا۔ ساہوکار جھوٹا ہے۔ میرے ماں باپ نے میری ملازمت کے عوض اناج ضرور لیا ہوگا مگر وہ مجھے بیچ نہیں سکتے۔ کبھی۔ کبھی نہیں۔ مگر پھر یہ جشن۔ یہ خوشی۔؟

ذہن میں آنے والی پیچیدگیوں کے تحت وہ چپ چاپ بیٹھی دور کنویں کی تہ میں ہلکے ستاروں کی جھلک دیکھتی رہی۔

اندر اندر اس کے باپ نے سرگوشی کے انداز میں اپنے دوسرے

بچوں سے کہا "کم بختو۔ کھا پی کر ہیکڑی جتانے نہ چلے جانا۔ پولیس تھانہ ہو جائے گا۔ ساہوکار الگ مارا جائے گا۔ اور شاید اناج بھی ہم سے چھین لیا جائے۔ سمجھ رہے ہو نا۔"

مگر اتنا کہتے کہتے اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ جگمگاتی روٹیوں کا تھال پرے دھکیل کر وہ دیوانہ وار دروازے کی طرف لپکا۔ کون۔ کون۔؟

"تمہیں تو وحشت ہو گئی ہے۔ کوئی بھی تو نہیں۔" اس کی بیوی نے اسے لتاڑا۔ مگر سخت بھوک اور اشتہا کے باوجود سامنے رکھی ہوئی روٹیوں کو ہاتھ لگانے کو اس کا جی مطلق نہ چاہا۔ "بچو کھاؤ۔ پیٹ بھر کر کھاؤ۔" اس نے روندھے ہوئے گلے سے کہا اور خود تھوک سے حلق تر کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ "ذرا دیکھوں تو آس پاس کوئی تو نہیں۔"

"ہونہہ" عورت نے ایک ہنکار بھری۔ "اچھا کام نہیں کیا ہوتا۔ اب چین کہاں پاؤ گے۔" مگر اس کی بات سے بے خبر تاروں کی چھاؤں میں۔ کھلے آسمان کی دودھیا روشنی میں اختر کو کنوئیں کی منڈیر پہ بیٹھا دیکھ کر عبداللہ سٹپٹا گیا۔ "اختر بیٹی۔؟"

اختر نے معاملے کی صفائی کرنا چاہی لیکن شدید نفرت اور بے زاری اس پر غالب آ گئی۔

"میرے قریب نہ آؤ۔ قریب نہ آؤ۔" وہ چلا کر بولی۔ "مجھے کنوئیں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ لیکن اگر تم میرے نزدیک آ گئے تو میں کنوئیں سے نہیں ڈروں گی بابا۔"

"نہیں نہیں۔ ایسا نہ کرنا بیٹی۔ ایسا نہ کرنا۔" عبداللہ غمگین التجائی لہجے میں بولا اور اسے ہیک لخت تھام لینے کے لئے آگے بڑھا۔ مگر اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ اختر کو بالکل ساہوکار کے ہاتھوں کی طرح محسوس ہوئے اور نفرت و کراہت سے لرز کر اختر نے خود کو بے خوف کنوئیں کی نذر کر دیا۔

"اختر۔ اختر۔؟" عبداللہ کنوئیں کی سخت منڈیر پر سر پٹک پٹک کر دیر تک روتا رہا اور بچے خوشی خوشی اندر روٹی کھاتے رہے۔ رات نے اس کے غم کو تھپک تھپک کر سلا دیا مگر صبح ایک سوال کی طرح ہر ایک کے آگے تنی رہی۔ (شب خون الہ آباد)

صفحہ ۴۸ کا بقیہ - روپ بہروپ

بھیک مانگ رہا تھا۔

"بابا۔ اللہ کے نام پر۔۔ خدا بھلا کرے گا۔۔ اللہ کے نام پہ۔۔ ایک پیسہ۔!"

اس کی اس فقیرانہ شان کا دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ اب ایک عام بھکاری سے ذرا بھی مختلف نہ تھا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ اس بوڑھے نے جھلا کر دو پیسے کا سکہ اسے دیا۔ تو اس نے فوراً اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ اور میں وہیں ساکت و جامد کھڑا رہ گیا۔ ایک پل کے لئے میرے دل میں غصہ کی ایک لہر ابھری۔ مگر اسی لمحہ مجھے یہ خیال آیا کہ اس زمانہ میں زندگی کے اسٹیج پہ ہر شخص ایک اداکار ہے۔ بھکاری بھی انھیں میں سے ایک ہے۔ جو وقت اور ماحول کو دیکھ کر ہی اپنی فنکارانہ چابکدستی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اس کے بعد میں باجی کے پاس آیا اور انھیں یہ چشم دید واقعہ سنایا تو انھیں یقین ہی نہ آیا۔

چند روز بعد ایک گھریلو فلم دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ میں نے سیٹیں ایک دن پہلے ریزرو کرا لی تھیں۔ کیونکہ فلم بہت رش لے رہی تھی۔ وقت پہ ہم پہنچ گئے اور بالکونی میں آن کر بیٹھے۔ اس وقت ہال روشنی تھی۔ میں باجی سے باتیں کرنے لگا۔ تب ہی اچانک میری نظر ایک شخص پر پڑی۔ وہ شخص اگلی قطار میں ہماری طرف منہ کئے نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ اس کے بدن پر سرج کا بہترین سوٹ تھا گلے میں نکٹائی۔ پیروں میں قیمتی جوتے تھے۔ بالوں کو بڑے ڈھنگ سے سنوارا گیا تھا۔ چہرہ سرخ و سپید تھا۔ ہاتھ میں سگار دبا ہوا تھا میں اس کو دیکھ کر چند ہی لمحوں بعد بڑی زور سے چونکا۔ اب میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ گو اس نے چند روز پہلے کا زرد مدقوق اور کریہہ چہرے والا میک اپ اتار دیا تھا۔ مگر اس کو پہچاننے کے لئے اس کی جلی ہوئی گردن اور قدرے ٹیڑھا ہاتھ کافی تھا۔۔ یہ وہی دیلی والا بھکاری تھا۔!

مخدوم محی الدین

سڑکے

یہاں کیا ہے ؟
اِس راہ میں
کچھ نہیں
درد و افلاس کی چھاؤں والے
درختوں کی شاخوں میں
لٹکے ہوئے
آم کے چیتھڑے

اپنا شہر

یہ شہر اپنا
عجب شہر ہے کہ
راتوں میں
سڑک پہ چلئے تو
سرگوشیاں سی کرتا ہے
وہ لا کے زخم دکھاتا ہے
رازِ دل کی طرح
دریچے بند
گلی چپ
نڈھال دیواریں
کواڑ مہر بہ لب
گھروں میں میتیں ٹھہری ہوئی ہیں برسوں سے
کرائے پہ

(صبا حیدرآباد دکن)

وحید اختر

موت کی جستجو

چہرے روحوں کی بے مائگی
ذہن کی تیرگی کے سیہ آئنے
سرد آنکھوں کے تاریک روزن میں دبکا ہوا اک خلا
ایک سناٹا ہونٹوں کے بستہ مکاں میں ہے سویا ہوا
روح کو جہدِ تحصیلِ زر کھا گئی
ذہن کی روشنی نا امیدی کی ظلمت میں دھندلا گئی
آنکھیں ناکامیوں کے کھنڈر میں مکاں کے تصور سے عاری ہوئیں
ہونٹ کشکولِ دریوزہ گر بن کے لفظوں کی عصمت کی دوکاں بنے
اور اب کچھ نہیں
اور اب کچھ نہیں
ایک دیوانہ گر خواہشِ زیست ہے
خال و خط، دست و پا
سینہ و سر، شکم اور زیرِ شکم
ایک دیوانہ گر خواہشِ زیست اعضا میں دوڑی ہوئی
ایک بے معنی، بے کار، پا بیچ ہوسِ جسم کے تانے بانے کو تھامے ہوئے
صرف ایک لمحے کی آمد کا ہے انتظار
جب کہ ذہنوں کے، روحوں کے آئینے
آنکھوں میں دبکا خلا
اور ہونٹوں سے لپٹا سکوت
ایک بار خواہشِ زیست سے کہیں
زیست ہم پر ہمیشہ سے الزام ہے
ہم نہ زندہ رہے ہیں کبھی اور نہ زندہ ہیں اب
ایک دیوانہ گر خواہشِ مرگ ہی تھی ہمارے لئے زندگی

(شب خون الہ آباد)

بازگشت

گزشتہ شمارے میں جو سوالات شائع ہوئے تھے ان میں جناب ایس ایم وصی کراچی کا سوال سب سے بہتر اور انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اعلان کے مطابق اس ماہ سے ان کے نام ایک سال کے لئے الشجاع جاری کر دیا گیا ہے۔ (ادارہ)

<u>وجاہت عثمانی۔ چاٹگام</u>

س:۔ سید جمال الدین افغانی کی موت کے سلسلے میں بعض مورخوں کی رائے ہے کہ سید صاحب کی موت طبعی نہیں تھی بلکہ سلطان عبدالحمید نے ذاتی اختلافات کی بناء پر ان کو زہر دلوا دیا تھا۔ اور ان کی موت کے بعد بعجلت ان کی تدفین عمل میں آئی اور سلطان کی خواہش تھی کہ سید صاحب کی قبر کا نشان بھی باقی نہ رہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج:۔ وجاہت صاحب! سید جمال الدین افغانی پر جو کتابیں اور مضامین ہماری نظر سے گزرے ہیں ان میں سلطان عبدالحمید پر کھل کر کسی نے کوئی الزام عائد نہیں کیا ہے صرف شبہ کا اظہار کیا ہے اور اس شبہ کو تقویت اس بات سے حاصل ہوتی ہے کہ سلطان اور سید صاحب کے تعلقات ترکی کے قیام کے دوران بہت زیادہ خراب ہو گئے تھے اور سید صاحب کی عمر کا آخری حصہ ایک گمنام قیدی کی حیثیت سے گزرا۔ کہا جاتا ہے کہ سید صاحب نے علاج کے سلسلے میں ترکی سے باہر جانے کی کئی بار خواہش کی لیکن سلطان عبدالحمید نے آپ کو اجازت نہیں دی۔ اور سرکاری ڈاکٹر جمیل پاشا ان کا علاج کرتے رہے۔ سید صاحب سرطان کے مریض تھے۔ اس کے علاج کے سلسلے میں تین بار ان کی گردن پر عمل جراحی کیا گیا۔ آخری آپریشن کے چند دن بعد ۹ مارچ ۱۸۹۷ کو سید صاحب کا انتقال ہو گیا اور اسی بناء پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ سلطان نے آخری آپریشن کے موقع پر ان کو زہر دلوا دیا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ سید صاحب کا جسد خاکی قبرستان شیوخ (شیخ مزاراتی) میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔ اور آپ کی قبر پر کوئی واضح نشان نہ تھا۔ یہ سید صاحب کی بے پناہ مقبولیت [illegible] سلطان عبدالحمید کے بعد ترکوں نے سید صاحب کی قبر تلاش کر لی اور [illegible] پر سنگ مرمر کا کتبہ نصب کرایا جو آج بھی موجود ہے۔

<u>[illegible] عثمانی۔ ڈھاکے</u>

س: [illegible] ادب [illegible] چاہتی ہوں کہ اچھے نقاد [illegible] ہمارے اکثر اساتذہ بزعم خود بہت بڑے نقاد ہیں اور اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتے۔ اس لئے ان سے کسی رہبری کی توقع فضول ہے۔ ملتمس ہوں کہ آپ چند ایسے نقادوں کے نام لکھ دیں جو بقول حسن فاروقی "منشیانہ تنقید" نہ کرتے ہوں اور جن کی تنقیدی تخلیقات کے مطالعے سے تنقیدی شعور کو جلا ہو۔

ج:۔ محترمہ! یوں تو نقادوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن آپ خاص طور پر سید احتشام حسین، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر احسن فاروقی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ مجتبےٰ حسین اور نئے نقادوں میں خلیل الرحمٰن اعظمی جمیل جالبی اور ڈاکٹر محمد حسن کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کیجئے۔ بالغ نظری، ژرف نگاہی، وسعت مطالعہ اور متوازن تنقیدی شعور کی بناء پر ان نقادوں کی حیثیت مسلم الثبوت ہے۔ اور ان کی تحریریں علمی ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔

<u>بیگم مسیح صدیقی ڈھاکے</u>

س:۔ محترم۔ ایک سوال پیش ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کا جواب غیر جانبدارانہ ہو۔ فسانہ آزاد کے بارے میں ممتاز انشا پردازوں کی متفقہ رائے ہے کہ یہ "ادب برائے ادب" کی نمائندہ ہے اور ادب برائے زندگی کی نفی کرتی ہے سوال یہ ہے کہ پھر کیا وجہ ہے کہ اس کتاب کا شمار آج بھی ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔

ج:۔ محترمہ۔ یہ ایک طویل بحث ہے اور اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہم آپ کے سوال کے جواب میں اسی لئے خود اظہار خیال کے بجائے ایک نوجوان نقاد کی رائے درج کر رہے ہیں تاکہ ہم پر جانبداری کا الزام عائد نہ ہو۔

"سرشار کے ہاں کبھی طنز کے پردے میں کبھی کھل کر زندگی کی ان قدروں پر اظہار خیال ملتا ہے۔ جن پر بدلتی ہوئی دنیا نے تناقص اور تضاد کی کیفیتیں پیدا کر دی تھیں۔ یہاں اس بحث کی گنجائش نہیں کہ مقصد ادب میں کس طرح داخل ہوتا ہے اور دونوں میں کس طرح ایک رشتہ قائم ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فسانہ آزاد ناول کی فنی خصوصیات کے لحاظ سے ناقص ہے لیکن زندگی کے مظاہر ہونے کی حیثیت سے بلند پایہ ہے۔

S. 1796
/ ...ber 1967
ASH—SHUJA
A TIMES PRESS PUB...ION
Mansfield Street Sadar, K...hi-3.
Phone No. 55212